مَنازِلُ العِرفان

في تفسيرِ القرآنِ الكريم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث

حضرت مولانا سید عبد الستّار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جلد دوم

ابتداء سورۃ البقرہ تا سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۱۰

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ⊙ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منازل العرفان
فی
تفسیر القرآن الکریم

جلد دوم

ابتدا سورۃ البقرہ تا سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۱۰

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ • کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین منازل العرفان جلد دوئم

سورۂ بقرہ

(تا آیت ۲۱۰)

سُورَةُ الْبَقَرَة

مدنيةٌ آیاتہا ٢٨٦ رکوعہا ٤٠

سورۂ بقرہ مدنی ہے، اس میں دوسو چھیاسی (٢٨٦) آیتیں، اور چالیس (٤٠) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ البقرۃ ہے، جو اس سورت کی آیت نمبر ٦٧ میں موجود ہے۔ بقرۃ گائے کو کہتے ہیں، اس سورت میں مشہور قصہ گائے کا ہے، اسی سے سورت کا نام ماُ خوذ ہے۔ اس کے علاوہ علماء وائمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی جو ایک گھناؤنا اور غیر شرعی عمل تھا، اس پر تنبیہ اور تردید کرنا مقصود تھا، جس کی پاداش میں انہیں سخت توبہ کا حکم ملا: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ اس واقعہ میں انہیں سزا بہت سخت ملی ہے، جس میں دیگر اقوام کے لئے درس عبرت بھی ہے۔ واللہ اعلم

وجہ تسمیہ:

قرآن حکیم کی سورتوں کے نام توقیفی ہوتے ہیں۔ عقل وقیاس کی رسائی ان تک نہیں ہوسکتی، لیکن پھر بھی عام طور پر سورت کا نام تین طریقوں سے رکھا جاتا ہے:

(١) استقراء وتتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی کلمات یا حروف ہوتے ہیں، جیسے طٰهٰ. یٰسٓ. قٓ. صٓ. نٓ وغیرہ۔

(٢) اور کبھی سورت کی پہلی آیت کا مشہور کلمہ سورت کا نام ہوتا ہے، جیسے: الفیل، القریش، الکفرون، الکوثر، الفتح، الفلق، الناس۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ سورت کا نام اُس مشہور واقعہ (قصہ) سے ماٗخوذ ہوتا ہے جو اس سورت میں بیان ہوا ہو، جیسے: البقرة، آل عمران، المائدة، الكهف وغیرہ۔

تعدادِ آیات، کلمات وحروف:

یہ سورتِ مبارکہ (۲۸٦) دوسو چھیاسی آیات، (٦۲۲۱) چھ ہزار دوسو اکیس کلمات، اور (۲۵۵۰۰) پچیس ہزار پانچ سو حروف پر مشتمل ہے، اور اس میں چالیس (۴۰) رکوع ہیں۔ اور اسم جلالہ ''اللہ'' (۲۸۲) مرتبہ اس مبارک سورت کی زینت وافتخار ہے۔

نزول:

اس سورت کا نزول سورة المطفّفين کے بعد ہے۔ سورة المطفّفين باعتبارِ نزول کے چھیاسی (۸٦) مکی سورتوں میں آخری سورت ہے، جبکہ سورة البقرة مدنی (۲۸) سورتوں میں پہلی سورت ہے۔ لوحِ محفوظ کی ترتیب میں سورة البقرة کا دوسرا نمبر ہے، كمافي المصاحف، اور نزولی ترتیب میں اس کا ستاسیواں (۸۷) نمبر ہے۔

سورة البقرة مدینہ میں سب سے پہلے نازل ہونے والی، سب سے بڑی طویل اور جامع سورت ہے، بالاتفاق مدنی ہے۔ (۲۸) مدنی سورتوں میں سب سے پہلی سورت باعتبارِ نزول سورة البقرة ہے، اور سب سے آخری سورة النصر ہے۔ (۸٦) مکی سورتوں میں باعتبارِ نزول پہلی سورة العلق (اقرأ) ہے، جبکہ آخری سورة المطفّفين ہے۔

باعتبارِ نزول سورة البقرة ستاسیویں (۸۷) سورت ہے۔ اس کا نزول تدریجی ہے۔ حرمتِ سود کے متعلق آیتوں کا نزول فتحِ مکہ کے بعد ہے، اور ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ﴾ والی آیت کا نزول حجۃ الوداع کے موقعہ پر ہوا، اور اسی کے ساتھ سورة المائدة کی آیت ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ کا نزول ہوا تھا۔

ربط ومناسبت:

اساتذۂ کرام سے سنا تھا کہ قرآن حکیم کی سورتوں میں ربط ومناسبت کبھی خصوصی اور کبھی عمومی طور پر تلاش کرنا پڑتا ہے، مگر سورة الفاتحة اور سورة الإخلاص کا ہر سورت کے ساتھ قدرتی عمومی طور پر ربط موجود ہے۔ سورت فاتحہ تمام قرآن کا اجمالی متن ہے، باقی ہر سورت اس کی شرح ہے۔ سورة الإخلاص خالص توحید ذاتی

وصفاتی کے بیان میں ہے۔ یہ پورے قرآن کا مرکزی موضوع ہے، اور ہر سورت اس کی ظل اور سایہ ہے۔

دوسرا ربط یہ ہے کہ فاتحہ میں ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تلقین ہے کہ مجھ سے مانگو، اور درخواست کرو! میں قبول کروں گا۔ پس سورتِ بقرہ میں قبولیت کا اظہار ہوا کہ میں نے تمہاری التجاء قبول فرما کر صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے تمہاری ہدایت کا راستہ آسان فرمایا، وہ یہ ہے کہ ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ یعنی قرآن حکیم۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں ہزار اوامر، ہزار نواہی، ہزار اخبار، پانچ سو کے قریب احکام، متعدد ضرب الامثال، صداقت کتبِ سماوی، ایمانِ مجمل، ایمانِ مفصل، تقویٰ بجمیع انواعہٖ، اثباتِ آخرت، قانونِ مجازات، طہارتِ ظاہری، صفاء باطنی، اقسامِ کفر، علاماتِ مؤمنین، نفاق اور اس کی علامات، یہودیت اور منافقت کے مکروہ چہروں سے کشفِ نقاب، یہودیت کے اصلی خدوخال، اور اس کے چالیس کے قریب مکروفریب اور سرکشیوں کا بیان ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، خلافتُ اللہ فی الارض کے اسباب ومنافع، اور ہمہ گیر فوائد کا بیان، علم کے فضائل وبرکات، علوی وسفلی مخلوقات کا تذکرہ، علمُ المخاصمہ، تذکیر بایام اللہ، تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بمابعد الموت، جنت ودوزخ، ثواب وعقاب، معجزات، صداقتِ نبوّت، مسائل وبرکات، نماز، روزہ، حج وعمرہ، زکوٰۃ، صدقات، کمالاتِ قدرت، جہاد فی سبیل اللہ، فضائلِ کعبۃ اللہ، استقبالِ قبلہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام معمارِ کعبہ ودیگر انبیاء کا تذکرہ، طالوت، حضرت داوٗد علیہ السلام، حضرت عزیر علیہ السلام کا قصہ، طلاق، نکاح، عدّت، عتق، محرّماتِ شرعیہ وحدودِ شرعیہ، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ، سیاستِ شرعیہ، حرمتِ ربا، احکامِ بیع وشراء وکتابت ووثائق، متفرق ایمانیات وشرعیات اور دیگر بہت سے مسائل وواقعات کا بیان ہے۔

الغرض! یہ سورت اسلامی اعمال ومسائل کا بجا طور پر انسائیکلوپیڈیا ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس کی طرف اس مبارک سورت نے صراحۃً، دلالۃً یا اشارۃً رہنمائی نہ کی ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس سورت کی تعلیم پر بارہ سال کا عرصہ صرف کیا، پھر شکرانہ کے طور پر اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھانا کھلایا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آٹھ سال مسلسل جدوجہد کر کے اس سورت کی تفسیر ومعارف حاصل کر لئے۔

شانِ نزول:

تیرہ سالہ مکی زندگی میں مسلمانون نے قریش کی شدید اور ناقابل برداشت مخالفت اور ایذا رسانیاں اور طرح

طرح کے مصائب برداشت کر لیے ہیں۔ اس پورے عرصے میں مسلمان ''فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا'' [البقرة:۱۰۹] (معاف کرو، اور درگزر سے کام لو) کا ثبوت نہایت عزم وحوصلہ کے ساتھ دیتے رہے۔ لیکن انہیں مقابلہ اور جہاد بالسیف کا حکم نہ ملا، کیونکہ وہ نہایت قلّت اور بے سروسامانی کے عالم میں تھے۔ عقبۂ اولی اور ثانیہ کے بعد جب وہ آہستہ آہستہ مدینہ منورہ ہجرت کرتے گئے، تو کفارِ مکہ اور قریش کی مخالفت میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ اس پورے عرصہ میں مدینہ کے یہود مسلمانوں کے خلاف ہر سازش میں کفارِ مکہ کے ساتھ رہے۔

سرورِ عالم ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے، تو یہاں کے انصار نے ہر قسم کی نصرت کی پیشکش کی، مدینہ طیبہ میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا، اور اسلام کی ترقی اور استحکام کا عمل شروع ہو کر روز بروز اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہودِ مدینہ نے حسبِ سابق پسِ پردہ مشرکین مکہ کے ساتھ اپنا رابطہ جاری رکھا، ہر طرح سے مالی معاونت کی، اور اسلحہ وجنگی ساز وسامان کے ذریعہ ان کی مدد کا عہد وپیمان کر کے انہیں مستحکم کیا، کیونکہ یہود قوم کو اپنے اقتدار کا سورج مسلسل غروب ہوتا نظر آ رہا تھا، اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ مستقبل میں ان کا حشر نہایت ناگفتہ بہ ہوگا۔

میثاقِ مدینہ کے باوجود وہ کبھی کھلم کھلا، اور بیشتر اوقات اندرونی سازشوں اور منافقانہ طور وطریقے پر سازشیں کرتے رہے۔ آئے روز کفارِ قریش کو کسی نہ کسی طرح کوئی نئی شرارت سوچ کر مخالفت کا سبق اور گُر سکھانے، اور مارِ آستین بن کر سینکڑوں لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے لگے۔ اس طرح مدینہ میں یہودیوں نے اسلام کے خلاف سازشوں اور شرارتوں کا آغاز کیا۔ نفاق کی تخم ریزی کر کے اچھے خاصے لوگوں کو ورغلا کر انہیں حق ویقین سے دور رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہے، اور خالی الذہن لوگوں کے دلوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی۔ عملی طور پر ایک طرف سے کفارِ مکہ اور یہود مدینہ، جبکہ دوسری طرف سے (ان کا ہراول دستہ) منافقین نے بیک وقت اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف مختلف محاذوں سے سرد جنگ کی ابتداء کر کے کسی بڑے معرکہ کے لئے راہ ہموار کی۔

یہودی قوم نے کفار مکہ کو حقیقت جاننے کے باوجود منافقانہ طور پر پہلے سے باور کرایا تھا کہ ملتِ ابراہیمی دراصل تمہارے اور ہمارے نظریات کا مجموعہ اور معجون مرکب ہے، اور تمہارا عقیدہ ونظریہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نظریہ وعقیدہ ہے۔ ﴿وَيَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَاۤءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا﴾ [النساء: ۵۱] (اور کافروں کو کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں سے زیادہ راہ راست پر ہیں) مشرکوں کو مسلمانوں پر ترجیح دے کر کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

قدیم زمانے میں ''حضرت تبع'' جس کا نام اُسعد حمیری تھا، یمن کے بادشاہ تھے، اور مذہبا یہودی تھے، انہی نے سب سے پہلے سفید ریشم کا غلاف کعبۃ اللہ پر چڑھایا تھا، انہی تبع نے یہود مدینہ کو یہاں مدینہ منورہ میں آباد کیا تھا، اور کہا تھا کہ پیغمبر آخر زمان حضرت محمد ﷺ کا دارالہجرت یہی مدینہ ہے۔ میں ابھی سے اُن پر ایمان لا کر تمہیں ان کی نصرت کا حکم دیتا ہوں، اور ایک تحریر لکھ کر وہاں کے لوگوں کے حوالہ کی تھی کہ جس وقت خاتم الانبیاء ﷺ یہاں تشریف لائیں تو یہ تحریر ان کی خدمت میں پیش کرنا۔ یہود مسلسل سرور عالم ﷺ کی تشریف آوری کے انتظار میں رہے، لیکن جیسے ہی آپ ﷺ تشریف لے آئے، تو کفار مکہ کے بعد سب سے پہلے انہوں نے آپ ﷺ کی مخالفت کر کے اللہ تعالیٰ سے لعنت و پھٹکار کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَ هُمْ مَا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ [البقرة: ۸۹] (تو جب تشریف لائے ان کے پاس وہ جانے پہچانے تو ان سے منکر ہو گئے)۔

تو سورۂ بقرہ کا نزول ایسے وقت میں شروع ہوا جب تینوں طرف سے مشرکین مکہ، یہود مدینہ، منافقین مدینہ، تینوں گروہ مل کر اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت پر اُتر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے دشمنان اسلام کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے، اور سورة البقرة کے ذریعہ ان کے تمام مکروفریب کی قلعی کھول کر انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

فضائلِ سورت بقرہ:

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا: سورة البقرة قرآن حکیم کی کوہان اور بلندی ہے، اس کی ایک ایک آیت کے ساتھ اسّی (۸۰) فرشتے نازل ہوتے تھے۔ اس کی ایک عظیم آیت، آیت الکرسی عرش عظیم کے نیچے کے خزانے سے نازل ہوئی ہے، اور اس سورت کے ساتھ ملائی گئی سورة یٰس ہے، جو قرآن پاک کا دل ہے، جو شخص ثواب اور رضاء الٰہی کی نیت سے اس کی تلاوت کرے گا، اس کے گناہ معاف ہوں گے، اور اس (سورة یٰس) کو قریب الموت لوگوں کے پاس پڑھا کرو، ان کی جان کنی آسان ہوگی۔ [أحمد، قرطبي، ابن كثير]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس گھر میں سورة البقرة پڑھی جائے، وہاں شیطان داخل نہیں ہوسکتا۔ [قرطبي، مستدرك، ابن كثير، نسائي]

ایک مرتبہ مدینہ منورہ کے لوگوں نے حضرت خاتم الانبیاء ﷺ سے عرض کیا کہ گزشتہ رات ہم نے دیکھا کہ ساری رات ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کا گھر نور کا بقعہ بنا رہا، اور مسلسل روشن رہا۔ سرور عالم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: شاید رات بھر وہ سورۃ البقرۃ پڑھتے ہوں گے۔ جب ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: سچ ہے کہ میں رات بھر سورۃ البقرۃ پڑھتا رہا۔ [ابن کثیر، قرطبي]

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: قیامت کے روز قرآن کریم اور اس پر عمل کرنے والوں کو لایا جائے گا، ان کے آگے آگے سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران ہوں گی۔ [مسلم]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ سورۃ البقرۃ کو سیکھو، کیونکہ اس کا سیکھنا باعثِ برکت ہے، اور اس کو ترک کرنا باعثِ حسرت ہے۔ پھر فرمایا: زَهْرَاوَيْن (البقرۃ، آل عمران) پڑھا کرو! کیونکہ یہ دونوں روشن چمکدار ستارے ہیں۔ [مسلم، مستدرک]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیات اور آیۃ الکرسی اور دو آیت اس کے بعد کی، اور تین آیات سب سے آخر کی، مجموعی طور پر یہ دس آیات رات کے وقت پڑھ لے، اس گھر میں اس رات کوئی شیطان نہیں جا سکتا، اور اس گھر والوں کو صبح تک کوئی جن، چور اور دشمن کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا، وہ ہر شر سے محفوظ رہے گا۔ [قرطبي، ابن کثیر]

مزید فضائل سورۃ آل عمران کے ضمن میں بیان کریں گے۔ اِن شاء اللہ

حروفِ مقطعاتِ قرآنیہ کا تفصیلی بیان:

قرآن کریم کا تحدی و چیلنج کسی عرب یا عجم یا کسی خاص قوم، خاص علاقہ اور خاص زمانہ کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ قیامت تک کے پورے جن وانس اور پورے عالم کے لئے ہے، فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ [بني إسرائيل: ۸۸] (تم فرماؤ اگر آدمی اور جن سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کا مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں)۔

اسی وجہ سے یہ حروفِ مقطعات مکی و مدنی دونوں قسم کی سورتوں کے شروع میں لائے گئے ہیں، تاکہ کوئی ملحد و منکرِ قرآن، کوئی مَن مانی نہ کر سکے، نیچری، چکڑالوی، پرویزی، قادیانی جیسے ملحدوں کے لئے کسی قسم کی حجت و بہانہ باقی نہ رہے۔ الحمدللہ

حروفِ مقطعات رسمُ الخط، یعنی کتابت کے لحاظ سے مرکب شکل میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں، مگر پڑھنے میں

انہیں الگ الگ کر کے پڑھا جاتا ہے، جیسے کہ "حٰمٓ عٓسٓقٓ" مرکب معلوم ہوتا ہے، مگر اس طرح پڑھا جاتا ہے حا، میم، عین، سین، قاف، اسی وجہ سے انہیں مقطعات، یعنی جدا جدا پڑھے ہوئے کہا جاتا ہے۔

حروفِ مقطعات کُل پانچ قسم کے ہیں: وحدانی، جیسے: صٓ، ثنائی، جیسے: یٰسٓ، ثلاثی، جیسے الٓرٰ، رباعی، جیسے: الٓمٓصٓ، خماسی، جیسے: کٓھٰیٰعٓصٓ، اس سے زائد نہیں ہے۔

یہ کُل ۲۹ سورتوں کے شروع میں ہیں۔ مکرّرات حذف کرنے کے بعد چودہ ہی رہ جاتے ہیں، جو کہ مجموعی حروفِ تہجی کے نصف ہیں، مثلاً: الٓمّٓ چھ سورتوں کے شروع میں، الٓرٰ پانچ سورتوں کے شروع میں، طٰسٓمٓ دو سورتوں کے شروع میں، حٰمٓ چھ سورتوں کے شروع میں، "الٓمٓصٓ، الٓمٓرٰ، کٓھٰیٰعٓصٓ، طٰهٰ، طٰسٓ، یٰسٓ، صٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ، قٓ، نٓ، " یہ سارے ایک ایک مرتبہ، بغیر تکرار کے، ایک ایک سورتوں کے شروع میں واقع ہیں۔

کلامِ عرب میں حروفِ ہجا بشمول ہمزہ والف ۲۹ ہیں۔ اگر ہمزہ والف کو ایک مانا جائے تو حروف ۲۸ ہوں گے۔ ان کے نصف ۱۴ حروف کو ۲۹ سورتوں کے شروع میں لیا گیا ہے، جن کا مجموعہ نص حکیم قاطع لہ سرّ ہے۔
ان چودہ حروف میں بلحاظِ صفات جتنی قسم کے حروف ہیں، یعنی مہموسہ، مجہورہ، شدیدہ اور رخوہ وغیرہ، ہر ایک کے نصف حروف لئے گئے ہیں۔ یہ چودہ حروف مکرّر وغیر مکرّر قرآن مجید کی سورتوں کے شروع میں اس ترتیب سے واقع ہیں:

"الف" ۱۳ مرتبہ	"را" ۶ مرتبہ	"عین" ۲ مرتبہ	"قاف" ۲ مرتبہ
"لام" ۱۳ مرتبہ	"کاف" ا یک مرتبہ	"طاء" ۴ مرتبہ	"حاء" ۷ مرتبہ
"میم" ۱۷ مرتبہ	"ھا" ۲ مرتبہ	"سین" ۵ مرتبہ	
"صاد" ۳ مرتبہ	"یاء" ۲ مرتبہ	"نون" ایک مرتبہ	

یہ کُل ۷۸ حروف مکرّر شمار ہوئے۔

مہموسہ کے ۱۰ حروف میں سے ۵، مجہورہ کے ۱۸ حروف میں سے ۹، شدیدہ کے ۸ حروف میں سے ۴، رخوہ کے بیس حروف میں سے ۱۰ حروف لئے گئے ہیں۔ اور پھر ان حروف کو وحدانی، ثنائی، ثلاثی، رباعی، خماسی، ذکر کر کے قرآنی بلاغت واعجاز کو نہایت بلند وبالا واضح کیا گیا ہے۔ پھر آیتوں اور سورتوں کو اس تطبیق کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے کہ انسانی سوچ اور عقل کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں ہے۔ وحدانی حروف مستقل آیت شمار نہیں ہوتے۔ ثنائی میں "طٰهٰ، یٰسٓ اور حٰمٓ " مستقل آیات ہیں، جبکہ "طٰسٓ" ثنائی ہوتے ہوئے بھی آیت شمار نہیں ہے۔ ثلاثیات

میں "الٓمٓ .طٰسٓمٓ " مستقل آیات شمار ہوتے ہیں، جبکہ "الٓرٰ " مستقل آیت نہیں ہے۔ رباعیات میں "الٓمٓصٓ" مستقل آیت ہے، اور "الٓمٓرٰ " مستقل آیت نہیں ہے، جبکہ حروف دونوں کے برابر ہیں۔ خماسیات میں "کٓھٰیٰعٓصٓ" ایک مستقل آیت ہے جبکہ " حٰمٓ عٓسٓقٓ " دو آیت ہیں۔

حروفِ مقطعات کے مفہوم و معانی کے متعلق مشہور مذاہب دو ہیں: پہلا مذہب جمہور الصحابۃ والتابعین و اکثر مفسرین و محدثین کرام کا ہے۔ دوسرا مذہب متکلمین و بعض مفسرین و ائمہٗ لغت وغیرہ حضرات کا ہے۔

(۱) جمہور علماء کرام فرماتے ہیں کہ ان کے معانی و مطالب سوائے ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے اور کسی کو معلوم نہیں ہیں، اور یہ مخفی راز اور پوشیدہ حقائق غیر معلوم المراد اَسرار ہیں بین اللہ و بین رسولہ اور یہ متشابہات قرآنیہ میں داخل ہیں، بلکہ درجہٗ اول کے متشابہات ہیں، جن کے نہ لغوی معنی معلوم ہیں، اور نہ مرادِ متکلم کا پتہ ہے، کُلُّهَا فِي خِفَاءٍ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر کتاب میں کچھ پوشیدہ اسرار ہوتے ہیں، قرآن کریم کے اسرار یہی مقطعات ہیں، یہی حضرت فاروق اعظم، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن مسعود، و دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے ہے۔ اور ابو جعفر ابن جریر طبری، علامہ ابن کثیر، امام قرطبی، حافظ سیوطی، اور اکثر محدثین امام عامر شعبی، حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم و دیگر ائمہٗ حدیث حضرات نے بھی یہی فرمایا کہ یہ حروف از قبیل اَسرار غیر معلوم المعنی ہیں، اور یہ خالص مخفی اَسرار قرار پائے۔

تو ان کے معانی و مطالب پر غور کرنا کوئی سنجیدہ اور بہتر اقدام نہیں ہوگا، اور اُمت کو ان کے معانی تلاش کرنے سے روک دیا گیا ہے، ورنہ سرورِ عالم ﷺ عمومی یا خصوصی طور پر ضرور ان کے معانی و مطالب بیان فرماتے، اور اُمت کی رہنمائی کرتے۔ لہٰذا دیگر متشابہات کی طرح ان کی تلاوت کی جائے، اور بغیر کسی چوں و چرا کے یقین کے ساتھ ان پر ایمان لایا جائے، اور ان کے مطالب و معانی میں غور و خوض ترک کیا جائے، جیسا کہ اکثر کتبِ تفسیر میں ان حروفِ مقطعات کے ساتھ یہ عبارت درج ہے: واللہ أعلم بمراده۔

البتہ! ان علماء کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ حروف ہمارے فائدے سے خالی نہیں ہیں۔ اول ان پر ایمان لانا۔ دوم ان کی تلاوت کرنا، نیز معنوی اور روحانی فوائد کا ہمارے لئے ثابت ہونا اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں، مگر وہ غیب سے ہمیں پہنچتے ہیں۔ الحمد للہ

(۲) دوسرا مذہب متکلمین وغیرہ حضرات کا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح دیگر علماء امت امکانی (تأویلی) درجے میں ان مقطعات کے معانی ومطالب کو معلوم کر سکتے ہیں، چنانچہ یہ حضرات تأویل کے طور پر مختلف معانی و مطالب بیان کرتے ہیں۔

فائدہ:

دراصل متکلمین وغیرہ حضرات سے جو معانی منقول ہیں، ان سے صرف تسہیل وتنبیہ اور تمثیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی منشاء ومراد بھی یہی ہے۔ اس لئے ان کو غلط اور بیجا کہنا تحقیقِ علماء کے خلاف ہے، کیونکہ ان تأویلی معانی کے بیان کرنے والوں میں رئیس المفسرین حبر الامت صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں۔

مقطعات کے تأویلی معانی میں چند اقوال:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں ان **راسخين في العلم** میں سے ہوں، جو حروفِ مقطعات کے اسرار معلوم کر سکتے ہیں۔

(۱) چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ حروف اسماء الٰہی ہیں، جیسا کہ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے "**كتاب الأسماء و الصفات**" میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور اس کی سند کو صحیح بتایا ہے۔ [**مظهري**] حضرت علی کرم اللہ وجہہ دعاء کر کے کہتے تھے: "**يا كٓهيٰعٓصٓ اغفر لي**"۔ [**ابن ماجه**] ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: "**كٓهيٰعٓصٓ**" کے معنی یہ ہیں کہ: "وہ جس کو چاہے پناہ دے"، اس کے مقابلے میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ [**مظهري**]

(۲) قتادہ، سدی، کلبی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ حروف قرآن مجید کے نام ہیں، کیونکہ "الٓمّٓ" مبتداء ہے "**ذٰلِكَ الْكِتٰبُ**" اس کی خبر ہے، مبتداء وخبر میں حمل کی وجہ سے اتحاد ہوتا ہے۔

(۳) امام اخفشؒ حروفِ مقطعات کو قسم کے معنی پر محمول کرتے ہیں۔

(۴) سعید بن جبیرؒ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: "**الٓمّٓ: بمعنى أنا الله أعلم**" ہے۔

(۵) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: **الف** سے اللہ جل جلالہ، **لام** سے جبرئیل علیہ السلام، **میم** سے **محمد** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا۔

(٦) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی نے فرمایا: الفٓ سے مراد آلاءُ اللہ، لامٓ سے مراد لطف اللہ، میمٓ سے مراد مجدُ اللہ یا ملکُ اللہ ہے۔ اسی طرح الفٓ سے مراد اللہ، لامٓ سے مراد لطیف، میمٓ سے مراد ملک ہے، وغیر ذٰلک۔

(٧) سعید بن جبیرؓ نے فرمایا: الرٰ، حٰمٓ، نٓ، ان کا مجموعہ بنتا ہے الرحمٰن (جل جلالہ)۔

(٨) بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ حروف جن سورتوں کے شروع میں لائے گئے ہیں، یہ ان سورتوں کے نام ہیں، اور اشتراک فی الاسماء کوئی مضر نہیں ہے۔ غور فرمائیں!

(٩) بعض علماء کے نزدیک یہ متعلقہ سورتوں کے اجمالی معانی ہیں، باقی سورت ان کی تفصیل ہے۔

(١٠) بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ علم الاعداد ہیں، جن سے قوموں کے عروج وزوال اور ان کی آبادی و بربادی اور مدتِ بقاء وغیرہ کی طرف اشارات ہیں۔ اسی طرح مختلف علماء سے دیگر مختلف توجیہات بھی منقول ہیں۔ واللہ اعلم

فائدہ:

تفسیر روح المعانی میں فخر المتأخرین حضرت آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حروفِ مقطعات ربّ العٰلمین عزّ سلطانہ کی طرف سے اُسرار و مخفی رموز ہیں، مگر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ ان عالی مرتبت علماء و صلحاء پر بھی منکشف ہوتے ہیں، جو من جانب اللہ تعالیٰ علومِ نبوت کے حقیقی وارث بنائے گئے ہیں۔

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ مقطعات قرآن کریم کے اُسرار و رموز میں سے ہیں، جو صرف ربّ العزّت سبحانہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین راز و نیاز کے قبیلے سے ہیں۔ عام لوگ انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ البتہ! سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کامل متبعین میں سے اللہ ربّ العزّت جسے چاہے اس پر یہ مخفی خزانے منکشف فرماتے ہیں، جیسے رئیس المفسرین حبر الامۃ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام تفسیر حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا منکشف ہونا بھی منقول ہے۔

(١١) قطرب، فراء، زمخشری، بیضاوی، ابن تیمیہ، مبرد اور حافظ مزی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ علماء کے نزدیک یہ حروف مقطعات تحدّی (چیلنج) کی خاطر لائے گئے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ان حروف کے ذریعے منکرینِ قرآن، عرب کے شعراء، فصحاء، بلغاء اور ادباء سب کو چیلنج کیا جارہا ہے کہ دیکھو! تمہارے کلام کی ہیولیٰ، شکل وصورت اور ترتیب انہی حروف سے مرکب ہے۔ یہ قرآن نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارا گیا ہے، جو امی (ناخواندہ) ہیں۔ تم لوگ بڑے خطیب، فصیح و بلیغ [illegible] و صنعت کلام پر ہر طرح قادر و ماہر ہوں، باوجود قدرت ومہارت کے کلامِ الٰہی کی ایک مختصر سورت

کی ادنیٰ مثال ونمونہ پیش کرنے اور بنانے سے عاجز ہو۔ چنانچہ تم سارے فصحاء وبلغاء، جن وانس اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز نظر آتے ہو۔ ہم نے تمہاری زبان کے ۲۸ حروف میں سے ۱۴ تمہارے لئے چھوڑ دیئے، آؤ میدان میں! سارے مل کر آؤ! ﴿وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ﴾[البقرۃ:۲۳] (اور بلالو اپنے مددگاروں کو) اپنے باطل معبودوں کو لے کر آؤ! ان سے مدد واستمداد طلب کر کے آؤ، اور پوری قوت کے ساتھ میدان میں اترو۔ اس کلامِ الٰہی کا توڑ تو کیا، اس جیسی ایک آیت پیش کرو، تو تمہاری جیت ہوگی، اور تم کامیاب رہوگے۔ نہیں! تو تسلیم کرو کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے، بلکہ خالق القویٰ والقدر کا کلام ہے۔ اگر کسی بشر کا ہوتا تو تم سارے بشر مل کر اس کا بآسانی معارضہ کر سکتے، اور سراسر عاجز نہ ہوتے، اور نہ ہی ہتھیار پھینکتے۔

خلاصۂ کلام:

راجح قول جمہور کا ہے، باقی امکانی تاویلات یا تو جزوی ہیں، جو پورے حروف پر منطبق نہیں ہوسکتیں، یا پھر محض عقلی اور امکانی ہیں، جنہیں نقل کی تائید حاصل نہیں ہے۔ البتہ! یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ نزاع حقیقی نہیں ہے، بلکہ لفظی ہے، جسے تعبیری بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ جمہور علماء مقطعات کو اسرار (راز) کہہ کر ان کے معانی کو طوق بشر سے خارج سمجھتے ہیں۔ ان کا مقصد قطعیت کا انکار ہے، کہ اصلی وقطعی معانی سوائے حق تعالیٰ کے اور کسی کو معلوم نہیں، اور وہ حضرات کسی تاویلی اور امکانی معانی کے ہرگز منکر نہیں ہیں، اور جو لوگ کسی مصلحتِ شرعی کے تحت تاویلات اور امکانی معانی کا سہارا لے کر انہیں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ معانی قطعی نہیں ہیں، بلکہ امکانی احتمالی اور ظنی ہیں۔ پس جس چیز کا اثبات ہے، اس کی نفی نہیں کی گئی، اور جس بات کی نفی کی گئی ہے، اس کا کسی نے اثبات نہیں کیا ہے۔

ہاں! اس کا امکان، بلکہ یقین ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ سب کچھ معلوم تھا، مگر مصلحت کے تحت آپ نے ان کی تفسیر وتشریح کو نظر انداز فرمایا، اس لئے کہ ان کے نہ بتانے سے ضروریاتِ دین میں کوئی خلل اور حرج واقع نہیں ہوتا۔ اسی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ صراحت نہیں فرمائی، جس طرح خالق حکمت کی حکمت کا تقاضا اخفاء تھا۔ آپؐ نے بھی اسی حکمت کے تحت اخفاء پر اکتفاء فرمایا، جیسے کہ اسم اعظم، ساعتِ قبولیت جمعہ، لیلۃ القدر کے اخفاء میں بڑی بڑی حکمتیں اور فوائد ہیں، حروف مقطعات بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ واللہ اعلم

☆☆☆

﴿اَلْجُزْءُ الْاَوَّلُ﴾

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ
الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾

ترجمہ: الٓمّٓ ① یہ ذی شان کتاب! ذرا شک نہیں اس میں، یہ ہدایت ہے پرہیز گاروں کیلئے ② وہ جو ایمان لائے ہیں غیب پر، اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز، اور ہم نے جو کچھ انہیں روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ③ اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے آپ پر، اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے، اور آخرت پر بھی وہ یقین کرتے ہیں ④ وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے ربّ (کی توفیق) سے، اور وہی دونوں جہان میں (بامراد) کامیاب ہیں ⑤

معارف ومنازل

دراصل یہاں چار جملے الگ الگ ہیں۔ ہر بعد والا جملہ پہلے جملے کے لئے بمنزلۂ برہان ودلیل ہے۔ پس "الٓمّٓ" پہلا جملہ ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ چیلنج پیش کرنے والا اور معجز کلام انہیں حروف سے مرکب ہے، جن سے عرب کے کلام مرکب ہوتے ہیں۔ پھر باوجود اس مساوات کے کوئی بھی اس کے مقابلے میں کوئی کلام نہیں لا سکا۔ انہیں بار بار جگایا گیا۔ دعوت مبارزہ دی گئی، مگر وہ اس میدان میں اتر نہ سکے، اور اسے سر نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے چیدہ چیدہ بلغاء وفصحاء اور شعراء نے عجز ودرماندگی کے عالم میں ہتھیار ڈال دیئے، اور عاجز رہ گئے۔ یہ قرآن کریم کے اعجاز کی صریح دلیل ہے کہ یہ کتاب ربّ العزّت کا کلام ہے، کسی بشر کا نہیں، اور یہ قوتِ بشری سے نہایت بلند وبالا ہے۔

پھر ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ دوسرا جملہ ہے، جو اعجازِ قرآنی کو خوب ثابت کرتا ہے۔ یعنی دراصل کتاب یہی ہے، کوئی اور نہیں! اس کے مقابلے کی قطعاً کوئی کتاب نہیں، اور قرآن کے مقابلے میں ہر قسم کی کتاب نہ ہونے کے برابر ہے، کالعدم اور ہیچ ہے۔

﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ یہ تیسرا جملہ ہے، جو اس کے کمال اور بلندی کی دلیل ہے، یعنی جس کسی کو ذرا بھی عقلِ سلیم اور فہمِ مستقیم ہو، وہ اس کی خوبیوں، ترتیبِ مضامین، طرزِ بیان، بلندی عبارت اور فصاحت وبلاغت کو دیکھ کر بلا تأمل

یقین کرلیتا ہے کہ واقعی یہ عیب ونقائص اور ہر قسم کی کمزوریوں سے بالاتر کلام ہے۔ جس طرح کئی فصحاء وبلغاء محض اسے سن کر چیخ اٹھے تھے کہ: "مَاهٰذَاقَوْلُ الْبَشَرِ" (یہ کسی انسان کا قول نہیں ہے) جس کے جامع، مربوط، منظم اور بے مثال، نادر وعجیب ترتیب پر سرسری غور وفکر کرنے کے بعد لبید شاعر، اور اس جیسے دیگر بڑے بڑے نامور شعراء وبلغاء مقابلہ سے دستبردار ہو کر اس کی حقانیت وصداقت کے معترف ہوئے، اور ایمان لے آئے۔ جب ماہر وبلیغ، صاحبِ فطرتِ سلیمہ لوگوں نے قرآن حکیم کی حقانیت تسلیم کرلی، تو یہی واضح ثبوت ہے کہ یہ کتاب ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بلند وبالا ہے، جس طرح دوپہر کو آفتاب عالمتاب کے انوار وروشنی میں کسی منصف مزاج شخص کو شک وشبہ نہیں ہوتا، اسی طرح اس بے عیب کلامِ الٰہی میں بھی کسی قسم کا کسی کو اشتباہ نہیں ہوگا۔

اگر کوئی شخص قرآن کریم کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کرے، اور اس کے مضامین کا بغور جائزہ لے، تو وہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں پائے گا کہ جس میں عقلِ سلیم کو تردّد ہو، فرمایا: ﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ [النساء: ۸۲] (اور اگر وہ غیرِ خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے)۔

پھر اس کی حقانیت کا مزید اندازہ اس سے لگالیں کہ کٹر، متعصب یہودی، نصرانی اور مجوسی لوگ ہزاروں بغض وعناد کے باوجود اگرچہ ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوئے، مگر قرآن کریم میں کوئی عیب یا کمی نہ دکھا سکے، سوائے انکار اور ہٹ دھرمی کے۔

سارے جہاں کے ماہرین، ناقدین اور عقلاء آج تک ربّ کائنات عزّ شانہ کی مخلوقات میں کوئی نقص، عیب اور کمزوری نکالنے سے عاجز رہے۔ فرمایا: ﴿مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾ [الملک: ۴] (تو رحمٰن کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے، تو نگاہ اٹھا کر دیکھ تجھے کوئی رخنہ نظر آتا ہے، پھر دوبارہ نگاہ اٹھا، نظر تیری طرف ناکام پلٹ آئے گی تھکی ماندی)۔ تو کلامِ الٰہی جو تمام عیوب سے نہایت بلند وبالا اور باعظمت ہے، یہ منکرین توحید ورسالت اور یہ معاندین اس میں کیا نقص یا عیب نکال سکیں گے؟ کیونکہ یہ چیز ان کی دسترس سے باہر ہے، اور وہ ہمیشہ کے لئے عاجز ہی رہیں گے۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یہ چوتھا جملہ ہے۔ یعنی جس کتاب سے لوگوں کو ہدایت حاصل ہو، اور خلق خدا کے پرانے گندے عقائد تبدیل ہوں، اور ہزاروں سال کے باطل نظریات ختم ہوں، اور غیر مہذب ونا ہموار معاشرہ سراسر

تبدیل ہو، بے حیائی اور دیگر تمام ظلمتوں کا استیصال ہو، اور چاردانگ عالم میں بغیر خون خرابہ نورانی عدل وانصاف پر مبنی انقلاب رونما ہو۔

الغرض! تمام برائیوں کی جگہ اعلیٰ دینی اقدار عام ہوں، تو واقعی ایسی روشن و بے عیب جامع کتاب ہی تمام ہدایتوں، برکتوں، کا سرچشمہ قرار پاسکتی ہے۔ کسی کمزور، معیوب کتاب میں یہ بلند و پسندیدہ اقدار کیسے پیدا ہوسکتی ہیں؟ کیونکہ کوئی فاتر العقل مخبوط الحواس انسان بھی کسی مشکوک کتاب کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھ سکتا! چہ جائیکہ عقلمند، صحیح الفطرت انسان سے یہ امید کی جاسکے۔

خلاصۂ ترجمہ:

﴿ذٰلِكَ﴾ اشارہ بعید کے لئے ہے۔ یہاں پر ہمارے ہاتھوں میں موجود قرآن کریم کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج، زید بن اسلم، سعید بن جبیر، مقاتل اور سدی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں ''ذٰلِكَ'' کے معنیٰ ''ھذا'' کے ہیں۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے قائم مقام عربی زبان میں اکثر استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں ابوعبیدہؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ''ذٰلِكَ'' اصل میں تو دور کے اشارے کے لئے ہے، جس کے معنی ہیں ''وہ'' لیکن کبھی نزدیک کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں ''یہ'' یہاں بھی اسی معنی میں ہے۔

ہم نے ترجمہ میں ان دونوں (وہ، اور یہ) نزدیک اور دور دونوں معانی کا لحاظ کر کے یوں کہا کہ: ''یہ ذی شان کتاب''۔ ذی شان کا لفظ بُعدِ رتبی پر دلالت کرتا ہے۔ چونکہ کتبِ سماویہ تورات وانجیل و زبور میں قرآن مجید کا تذکرہ موجود ہے، اسی طرح سے پہلے سورۃ المزمل میں (جو کہ مکی ہے) وعدہ موجود ہے: ﴿اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾[المزمل:۵] (ہم تم ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں)۔ نیز تمام انبیاء علیہم السلام خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل شدہ کتاب قرآن حکیم کی پیشگی اطلاع دے چکے ہیں۔ اسی مناسبت سے ''ذٰلِكَ'' سے اشارہ بھی قرین قیاس ہے۔ اب ترجمہ یہ ہوگا: ''یہ وہ ذی شان کامل موعود کتاب ہے، جس کی پہلے خبر دی جاچکی ہے اور اس کی آمد کی اطلاع بہت پہلے مل چکی ہے''۔

''كِتٰب'' کے لغوی معنی ہیں: ''جمع کرنا''، یعنی مکتوب۔ قرآن کریم کو کتاب اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ تمام کتبِ الٰہیہ اور صُحُفِ سماویہ کے ہر قسم کے علوم ومعارف اور مضامین کو جمع کرنے والا ہے، لہٰذا اب ''ذٰلِكَ

الْكِتٰبُ '' کا ترجمہ یہ ہوگا: ''یہی کتاب حقیقت میں کتاب ہے''۔یعنی سو فیصد کامل کتاب ہے، اور سراسر مبنی برحقیقت ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ خود لفظِ ''کتاب'' میں اس کی ضمنی اور لطیف دلیل بھی موجود ہے، یعنی چونکہ یہ کتاب تمام کتبِ الٰہیہ سماویہ کی جامع ہے، اس لئے یہ حقیقی، اصلی اور برحق کتاب ہے، اور اسی وجہ سے یہ ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بالاتر اور مقدس ہے۔

﴿لَارَيْبَ﴾ میں ''لَا'' نفی جنس نکرہ پر داخل ہے، تو یہاں نفی استغراقی کے معنی مراد ہوں گے کہ اس میں کسی قسم کا ذرہ بھر کوئی شک وشبہ نہیں ہے، جیسے سورت سجدہ میں فرمایا:﴿الۗمّۗ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَارَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾[السجدة:۲] (بیشک یہ قرآن تمام جہانوں کے پالنے والے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے میں کچھ شک نہیں)۔بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہاں نفی بمعنی نہی کے ہے، یعنی اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہ کرو۔[مظهري، ابن كثير وغيره]

''لَارَيْبَ فِيْهِ'' کے جملے میں ہر قسم کے شکوک کی نفی ہے۔شک کرنے والوں کی نفی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ شانہ کی وحدانیت، نیز رسالتِ رُسُل، وقوعِ قیامت، مجازاتِ اعمال، صداقت وحقانیتِ قرآن، نیز احکامِ شریعت وغیرہ میں شک کرنے والے لوگ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں اور کفار ومشرک اور منافق وفساق وفجار اور بدعقیدہ لوگ، خاص کر مغربی ذہنیت رکھنے والے لوگ قیامت تک بکثرت شکوک وشبہات کا شکار رہیں گے، اور تکذیب وانکارِ حق ان کا مستقل پیشہ وشعار ہی رہے گا، بلکہ وہ اتنی کثرت سے ہوں گے کہ اہلِ حق اور متقی لوگ ان کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر، یا اس سے بھی کم ہوں گے۔تو یہاں نفی صرف شک کی ہے، نہ کہ شک کرنے والوں کی۔

لفظِ ''كُتِبَ'' کے معانی:

قرآن کریم میں لفظِ کتاب درج ذیل چند معانی میں مستعمل ہے:

(۱) بمعنی فرض، جیسے:﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾[البقرة:۱۸۳] (تم پر روزے فرض کئے گئے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾[البقرة:۱۷۸] (تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو)۔

(۲) بمعنی حجۃ وبرہان، جیسے:﴿فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾[الصفت:۱۵۳] (تو اپنی کتاب لاؤ! اگر تم سچے ہو)۔

(۳) بمعنی اجل ومدت، جیسے:﴿وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتٰبٌ مَّعْلُوْمٌ﴾[الحجر:۴]

(اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہیں کی، مگر اس کا وقت مرقوم ومعین تھا)۔

(۴) بمعنی مکاتبت، جیسے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا﴾ [النور: ۳۳] (اور جو غلام تم سے مکاتبت چاہیں اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کرلو)۔

اس مقام پر کتاب سے مراد باتفاقِ المفسرین قرآن کریم ہی ہے، قرآن کریم کے متعدد نام جو قرآن و حدیث میں وارد ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) الكتب (۲) القرآن (۳) الفرقان (۴) الذكر (۵) الذكرى (۶) التذكرة (۷) التنزيل (۸) الحكم (۹) الموعظة (۱۰) المحكم (۱۱) الحكمة (۱۲) الحكيم (۱۳) الشفاء (۱۴) الهدى (۱۵) الهادي (۱۶) الفضل (۱۷) الرحمة (۱۸) الروح (۱۹) القصص (۲۰) البيان (۲۱) التبيان (۲۲) المبين (۲۳) البصائر (۲۴) النور (۲۵) المثاني (۲۶) النجوم (۲۷) النعمة (۲۸) البرهان (۲۹) البشير (۳۰) النذير (۳۱) القيم (۳۲) المهيمن (۳۳) العزيز (۳۴) الكريم (۳۵) العظيم (۳۶) المبارك (۳۷) حبل الله (۳۸) حق اليقين (۳۹) أحسن الحديث (۴۰) أحسن الكلام (۴۱) الحديث (۴۲) القول الفصل (۴۳) الصراط المستقيم (۴۴) العصمة (۴۵) الحق

فائدہ:

جاننا چاہئے کہ کسی کلام میں اشتباہ ہونے کی دو صورتیں ہیں: اول یا تو خود اس کلام میں کوئی غلطی اور خرابی ہو، دوم یہ کہ سننے والے کے فہم میں کوئی خلل ہو۔ پہلی صورت میں محلِ رَیب وہ کلام ہے، اور دوسری صورت میں محلِ رَیب سمجھنے والے کا فہم ہے، کیونکہ کلام برحق ہے، مگر سمجھنے والا اس کو سمجھنے اور جاننے سے قاصر ہے۔ کئی بیوقوف لوگوں کو اپنی نافہمی کی وجہ سے بدیہی اور نفس الامری اشیاء بھی مشکوک معلوم ہوتی ہیں، جیسے کہ صفرا کے مریض کو ہر چیز زرد رنگ میں، اور میٹھی چیز تلخ معلوم ہوتی ہے، حالانکہ قصور اس کے اِدراک کا ہے۔ شاعر نے کہا ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم	چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

صاحب قصیدہ بردہ نے فرمایا:

قد تنکر العین ضوء الشمس من رمد ★ وینکر الفم طعم الماء من سقم

پس آیتِ کریمہ میں پہلی صورت کی نفی فرمائی، نہ کہ دوسری صورت کی، کیونکہ دوسری صورت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، جیسے کہ مشاہدہ اس پر گواہ ہے۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (ہدایت ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے، پرہیز گاروں کے لئے)۔ ہدایت کہتے ہیں مہربانی وشفقت کے ساتھ رہنمائی کرنے کو۔ ''محض إرائة الطريق'' یعنی کسی مطلوب کی طرف راستہ بتانا یا ''إيصال إلى المطلوب'' یعنی کسی کو مطلب تک پہنچانا، دونوں کا نام ہدایت ہے۔ پہلا ناقص، جبکہ دوسرا کامل کہلاتا ہے۔ ہدایت کا استعمال خیر کے کاموں میں ہوتا ہے۔ البتہ! بعض صورتوں میں مجازاً تہدید وتحکم کے طور پر شر میں بھی ہوتا ہے، جیسے: ﴿فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ﴾ [الصفت: ۲۳] (پھر انہیں دوزخ کا رستہ دکھاؤ)۔

درجاتِ ہدایت:

ہدایت کی انواع واقسام بے شمار ہیں، مگر اس کے درجات چار ہیں:

پہلا درجہ: ہدایت کا یہ درجہ عام ہے، جو تمام حیوانات، نباتات، جمادات، وغیرہ سب میں پایا جاتا ہے، یعنی قوائے ظاہرہ وباطنہ کا عطا ہونا، مثلاً اعضاء، حواس اور قوائے شعوریہ عقلیہ کا ملنا، تاکہ ان کے ذریعہ مصالح ومقاصد کی تکمیل ہوسکے۔ اس موقعہ پر یہ خیال نہ کیا جائے کہ ان بے جان اور بے شعور چیزوں کا ہدایت سے کیا تعلق؟ کیونکہ قرآن کریم کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی اپنی بساط کے مطابق حیات واحساس بھی رکھتا ہے، اور عقل وشعور بھی، اگرچہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الإسراء: ۴۴] (اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے)۔ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ﴾ [النور: ۴۱] (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور پر پھیلائے ہوئے جانور بھی۔ اور سب اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں (سب) خدا کو معلوم ہے)۔

ان آیات سے یہی معلوم ہوا کہ ساری کائنات میں حیات وروح ہے، اور احساس وشعور، ادراک وزندگی

ہے۔البتہ! بعض چیزوں میں یہ جوہر نہایت خفیف ہے،جس کا احساس عام طور پر نہیں ہوسکتا،اور بعض میں کچھ زیادہ اور واضح ہے۔فرمایا:﴿اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾[طٰهٰ:۵۰](جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی،پھر راہ دکھائی)﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی﴾[الأعلى:۳](اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرایا (پھر اس کو) راستہ بتایا)۔اس عمومی درجے کا نام فطری ہدایت ہے۔

دوسرا درجہ: ہدایت کا دوسرا درجہ اس سے اوپر کا ہے،جس سے صلاح وفساد،اور حق وباطل کے درمیان امتیاز ہوجاتا ہے۔یہ درجہ انسان اور جنات کو عطا ہوا ہے،جو ذوی العقول کہلاتے ہیں۔انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے ذریعے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے،اور اس سے مسلم وکافر کی تفریق قائم ہوجاتی ہے۔فرمایا:﴿وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ﴾ [البلد:۱۰](اور اس کو (خیر وشر کے) دونوں راستے بھی دکھادیئے)۔اور فرمایا:﴿اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾[الدهر:۳] (اور) اسے راستہ بھی دکھادیا۔(اب) وہ خواہ شکر گزار ہو،خواہ ناشکرا)۔

تیسرا درجہ: ہدایت کا تیسرا درجہ (جو درجہ دوئم سے بھی اعلیٰ وارفع ہوتا ہے) مؤمنین اور متقین کے ساتھ مخصوص ہے۔یہ ہدایت براہِ راست اللہ تعالیٰ کی توفیق ومرضی سے حاصل ہوتی ہے،اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بندوں میں ایسی توفیق اور ایسے اسباب وذرائع پیدا فرماتے ہیں،جن کے ذریعے تمام طاعات سہل وآسان،اور ان کی خلاف ورزی دشوار اور نہایت سخت معلوم ہوتی ہے،یعنی اعمالِ صالحہ کو طبیعت ثانیہ کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔آیت کریمہ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ اسی طرح﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾[الإسراء:۹] (یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے) میں اسی مرتبہ کا بیان ہے،اور یہ درجہ نہایت اعلیٰ وعمدہ ہے۔

چوتھا درجہ: ہدایت کا چوتھا اور آخری مرتبہ سچے خواب،وحی،الہام کے ذریعے اور باطن کی صفائی کے ذریعے کشف واسرار اور غیبی رازوں کا انکشاف ہے،جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صلحاء واولیاء کے ساتھ مخصوص ہے،جیسے آیت کریمہ:﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾[الانعام:۹۰] (یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی تھی،تو تم انہیں کی ہدایت کی پیروی کرو)۔﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنکبوت:۶۹] (اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی،ہم اُن کو ضرور اپنے راستے دکھادیں گے)۔

اس درجہ کی وسعت لامحدود ہے،اور اصلی ترقی کا میدان یہی ہے،اور اعمالِ صالحہ،خصالِ حمیدہ،فضائلِ

عالیہ وسعیدہ کی بدولت اس میں ترقی اور ہر وقت زیادتی ہوتی رہتی ہے۔فرمایا:﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ [محمد: ۱۷] (اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے)۔ ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾[الأنفال: ۲] (اور جب ان پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھی جائیں تو ایمان بڑھ جاتا ہے)

اسی طرح قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ہدایت کا تذکرہ ہے۔ہدایت اپنی تمام مشتقات کے ساتھ قرآن کریم میں تین سو چھ (۳۰۶) مرتبہ مذکور ہے۔اتنی کثرت کے ساتھ قرآن کریم میں کسی کلمہ کا مذکور ہونا اس کی اہمیت وعظمت کی علامت ہوتی ہے،اور ہدایت کا یہی قیمتی درجہ درحقیقت عابد ومعبود کے درمیان محکم ومضبوط رشتہ ہے،اور یہ مقام خوش قسمت لوگوں کو حاصل ہوگا،تو معلوم ہوا کہ درجۂ چہارم کے لوگ احسان (کأنک تراہ أو یراک) کے اعلیٰ منصب پر فائز رہیں گے،جو کہ بڑا مقام اور بڑی سعادت وکرامت ہے۔

اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہدایت کے درجات مختلف ہیں۔لہٰذا اب ہدایت کے متعلق آیاتِ قرآنیہ میں کوئی تعارض نہیں رہا،کہ کہیں تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دیتا ہے،اور کہیں یہ فرمایا کہ ظالم اور فاسق،نیز کافر ومنافق کو ہدایت نہیں دیتا،کیونکہ ہدایتِ عامہ تو سب کو ملتی ہے،مگر ہدایتِ خاصہ خواص کے ساتھ مخصوص ہے۔نیز قرآن کریم میں جہاں انبیاء کرام علیہم السلام کو ہادی فرمایا گیا،وہ ہدایت کے دوسرے درجہ کے لحاظ سے فرمایا گیا ہے۔بقیہ درجات میں بجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا دخل نہیں ہوتا ہے،وہ سب براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نصیب ہوتے ہیں،جیسے ارشاد ہے:﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ﴾۔[القصص: ۵۶] (بیشک آپ جس کو خود چاہو ہدایت تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت تک پہنچا دیتا ہے)۔

قرآن حکیم متقیوں کے لئے ہدایت:

غور کریں کہ ہدایت اس کتاب کی حقیقت،اس کتاب کی طبیعت،اس کتاب کی فطرت اور اس کتاب کی ماہیت ہے۔لیکن کن لوگوں کے لئے؟ جن لوگوں کے لئے وہ نور،ہدایت،رہنما اور حق کو واضح کرنے والی ہے!

﴿لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے) یہ دل کا تقویٰ ہی ہے،جس سے انسان اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کا اہل بنتا ہے۔تقویٰ ہی سے دل کے تالے کھلتے ہیں،تب یہ کتابِ برحق دل میں داخل ہوتی،اور اپنا رول ادا کرتی ہے۔تقویٰ ہی دل کو تیار کرتا ہے کہ وہ کتابِ الٰہی سے ہدایت اخذ کرے،اس کی تعلیمات کو قبول کرے،اس کی ہر دعوت پر لبیک کہے،اور یہ بغیر تقویٰ کے ممکن نہیں۔

التقویٰ "وقایہ" سے ہے، بمعنی "محفوظ رکھنا"۔ اصطلاحِ شریعت میں تقویٰ کے معنی ہیں: "ایسی غلط چیزوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا جو آخرت میں نقصان دہ یا تباہ کن ثابت ہوں"۔ تقویٰ کے بنیادی ستون دو ہیں: "اَلْإِقْبَالُ عَلَى الْآخِرَةِ وَالْإِعْرَاضُ عَنِ الدُّنْيَا"۔ اگر کوئی ہزار مرتبہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو، ہزار حج وعمرہ، ذکر واذکار اور دیگر طاعات بجالاتا ہو، وہ متقی شمار نہیں ہوگا جب تک تارکُ الدنیا نہ ہو، کیونکہ حبِّ عاجلہ، محبتِ دنیا تقویٰ کے لئے زہر قاتل ہے، حبِّ مال وجاہ، محبتِ عاجلہ اور تقویٰ پانی اور آگ کی طرح ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ☆ این خیال ست ومحال ست وجنون

درجاتِ تقویٰ:

بعض علماء کرام نے تقویٰ کے سات مراتب شمار کئے ہیں، مگر مشہور مراتب ودرجاتِ تقویٰ کے تین ہیں: ادنیٰ، اوسط، اعلیٰ۔

پہلا درجہ: یعنی ادنیٰ تقویٰ یہ ہے کہ انسان شرک کی تمام اقسام سے پاک ہو، کیونکہ ﴿اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ [الفتح:۲۶] کے یہی معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا ہے، اور کلمہ (کلمۃ التقویٰ) کے معنی ہیں: "براءۃ عن الشرک" (شرک سے براءت)۔

دوسرا اور درمیانی درجہ: یہ ہے کہ انسان کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے، اور چھوٹے گناہوں پر اصرار نہ کرے، اور ہمیشہ توبہ کرتا رہے۔

تیسرا اور اعلیٰ درجہ: یہ ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔ جمیع خطرات اور خیالات سے آئینۂ دل کو صاف کر کے ہمہ تن جمالِ جہاں آراء میں محو اور مشغول ہو۔ دراصل حقیقی تقویٰ یہی ہے۔ اس مرتبہ کے متقی انبیاء کرام علیہم السلام واولیاء وصلحاء ہوتے ہیں، یہ مقام ہر کس وناکس کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ پس ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ [آل عمران:۱۰۲] (اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے) اور ﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ [مزمل:۸] (اور سب سے الگ ہو کر پورے کے پورے اسی کے ہو رہو) سے یہی آخری مرتبہ مراد ہے، اور زیر نظر آیت ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ میں تقویٰ کے تینوں مراتب مراد ہیں۔ پھر یہ مراتب باعتبار تحلي بالفضائل وتخلي عن الرَّذائل لامحدود درجات وبے شمار مراتب پر محیط وحاوی ہوجاتے ہیں، جن کی بہت بڑی فہرست ہے۔

تقوٰی کی اہمیت وضرورت:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تقوٰی کے کیا معنی ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا: ''کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے، جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں؟ توانہوں نے جواب دیا: ہاں! توحضرت ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر آپ نے وہاں کیا کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے دامن سمیٹ لیا، اور پوری کوشش کی کہ کانٹے میرے کپڑوں میں نہ الجھنے پائیں۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تقوٰی اسی کو کہتے ہیں کہ دنیا میں پھیلے ہوئے کفر وشرک، معاصی، حرام، گمراہی، بدعت اور دیگر خرابیوں سے انسان خود کو بچائے، اور صحیح سالم آگے نکلے، اور جو ایسا بچ کر نکلے گا وہی متقی کہلائے گا۔

چیست تقوٰی از ہزاران معصیت ☆ پاک داشتن جامۂ ایمان وتن

قرآن حکیم هدى للناس، هدى للعٰلمين، والی عمومی صفت کے ساتھ موصوف ہے، لیکن متقین کے ساتھ تخصیص کا سبب یہ ہے کہ غیر متقی قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کرتا، کیونکہ غیر مؤمن جب اللہ تعالیٰ کی سلطنت عامہ کا منکر ہے، تو وہ قرآن حکیم سے سوائے خسارہ اور نقصان کے کیا کچھ پائے گا؟ فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَايَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّاخَسَارًا﴾ [الإسراء:۸۲] (اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے، اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے)۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی تشریح سے یہی معلوم ہوا کہ تقوٰی صرف التزام طاعات کا نام نہیں، بلکہ ''اجتناب عن المعاصي والمنهيات'' ہی تقوٰی کے معنی میں معتبر ومضمر ہے، کیونکہ تقوٰی کے لغوی معنی ہیں: ''بچنا اور پرہیز کرنا''۔ پس چند اذکار وطاعات، صدقات، تہجد، اشراق، تسبیحات، نوافل اور خیرات کے بجالانے سے آدمی متقی نہیں بنتا، جب تک وہ معاصی ومنکرات سے کنارہ کش نہ ہو، خاص کر باطل اور برے عقائد سے، اور حرام وغیرِ شرعی معاملات سے۔ لہٰذا لاکھوں عبادات کی ادائیگی ایک طرف، اور ادنیٰ گناہ کا ارتکاب دوسری طرف۔

اگر پوری زندگی اور تمام تر اعمال شرعی قوانین کے مطابق ہوں، تو آدمی متقی بن سکتا ہے، لیکن اگر معاصی و منکرات کی ملاوٹ اعمال میں (خصوصاً معاملات میں) ظاہر ہوئی، تو تقوٰی کی عمارت زمین بوس ہوسکتی ہے، اور طاعات کے بدن سے تقوٰی کی روح نکل کر سارے اعمال غیرِ مؤثر ہوسکتے ہیں۔ واللہ اعلم

حقیقی تقویٰ کا حصول بڑا سخت اور مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان اسے حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ یہ خواص کا شعار ہوتا ہے، کیونکہ تقویٰ کا تعلق زیادہ تر ترکِ معاصی، ترکِ محرمات اور ترکِ منکرات سے ہوتا ہے۔ طاعات و عبادات کا بجالانا اگرچہ تقویٰ کے لئے ضروری ہے، مگر یہ عام طور پر تقویٰ کا کمزور حصہ کہلاتا ہے، اور امر بالمعروف کے ساتھ منسلک ہے، نہی عن المنکر کا حصہ نہیں ہے۔ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ امر بالمعروف اور التزامِ طاعات وعبادات بہ نسبت نہی عن المنکر اور ترکِ معاصی کے نہایت سہل ہے۔

ایک عالم دین زندگی بھر التزامِ طاعات کی تبلیغ کرے، اور زور شور سے لوگوں کو نصیحت کرے، لوگ برا ہرگز نہیں مانیں گے، اور مخالفت بھی نہیں کریں گے، بلکہ ساتھ دینے پر آمادہ ہوجائیں گے، لیکن یہی عالم اگر ترکِ معاصی، شرک، بدعت، محرّمات، بدعات اور غلط رسوم وغیرہ کے خلاف آواز بلند کر کے نہی عن المنکرات کا فریضہ بجالانے کی جرأت کرے، تو مخالفت کے طوفان اٹھیں گے، طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہوجائیں گی، اور لوگ پوری قوت کے ساتھ مخالفت کر کے اس عالم کے خلاف بغاوت کریں گے۔

یہ چیز اَظہر من الشّمس ہے کہ اکثر مسجدوں میں ائمۂ مساجد جو حق گو اور راست گو ہوتے ہیں، وہ زیادہ عرصہ مسجدوں میں گزارا نہیں کر سکتے، بار بار ائمۂ مساجد کی تبدیلی عمل میں آتی ہے، عوام الناس اکثر وبیشتر مادر پدر آزاد ہوتے ہیں اِلّا ماشاءاللہ، چند لوگ مخلص دیندار ہوتے ہیں، زیادہ تر عوام الناس انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

آج کل کے آزاد معاشرے میں بڑے بڑے جید اور حقانی علماء باوجود تقویٰ اور حق گوئی کے صرف اس وجہ سے معتوب ہوتے ہیں کہ وہ امر بالمعروف کی بہ نسبت اہم ترین پہلو نہی عن المنکر پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی مذہبی تنظیم صرف امر بالمعروف کا بیڑا اٹھائے اور نہی عن المنکر کو نظر انداز کرے، تو وہ عوام میں مقبولیت حاصل کرتی ہے اور لوگ اس کا ہر محاذ پر استقبال کرتے ہیں، لیکن اگر یہ تنظیم گندے معاشرے کی گندگیوں اور بے دین لوگوں کی برائیوں کے خلاف آواز بلند کرے، تو لوگ ہرگز نہیں مانیں گے، اور بے سروپا مخالفتوں کا بازار گرم کریں گے، تجربہ شرط ہے۔

متقین کی صفات:

ان آیات کریمہ میں اللہ ربّ العزّت نے متقین کی چھ صفات بیان فرمائی ہیں:

(۱) اِیمان بالغیب۔ (۲) اِقامتِ صلوٰۃ۔ (۳) اِنفاق فی سبیل اللہ۔

(۴) قرآن کریم پر اِیمان۔ (۵) سابقہ کتبِ سماویہ پر اِیمان۔ (۶) اِیمان بالآخرت۔

مذکورہ بالا صفاتِ ستہ کی تشریح:

(۱) ﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (وہ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں) یعنی رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات وتصریحات کے مطابق، نہ کہ اپنے ظن وگمان وہم وتخمین سے۔

﴿يُؤْمِنُوْنَ﴾ ایمانیات کے دائرے کے اندر جتنی چیزیں بھی ہیں سب کو تصریحات نبوی کے مطابق قبول کرنا ضروری ہیں۔ کسی اور راہ سے آیا ہوا علم اس دائرہ میں بالکل نامقبول ہے۔ ایمان کی کیفیت نفسی، شک، ریب، تردّد اور تذبذب کی بالکل ضد ہے۔ ایمان سے ان امور کے برعکس دماغ کو سکون، دل کو اطمینان اور روح کو تسلی نصیب ہوتی ہے۔

دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی صاحب ایمان متقی کو خودکشی کرتے نہیں پایا گیا، ایمان کے بغیر دل میں بے کلی اور بے چینی ہی رہتی ہے، لیکن ایمان والے کو سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی یہ ڈھارس بندھی رہتی ہے کہ وہ بڑا سہارا اور مضبوط آسرا رکھتا ہے، ﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، اَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ یعنی اعتماد علی اللہ جو اصلی سرمایہ ہے۔

﴿بِالْغَيْبِ﴾ یعنی ایسے عالَم پر ایمان رکھتے ہیں جو محسوسات اور معقولات سے ماوراء ہے، جس کی بابت خبریں (اطلاع) صرف پیغمبر کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

''غیب'' لغت میں شہود کی ضد ہے، ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے پوشیدہ ہو، یا نظر ومشاہدہ سے باہر ہو۔ استعمل في كلّ غائب عن الحاسة۔ [راغب] یہ لغوی معنی تھے غیب کے۔ آیت کریمہ میں غیب سے مراد ائمہ تفسیر نے وہ عالم لیا ہے جو کہ حواس وعقل سے ماوراء ہے، اور جس کی بابت جو کچھ بھی علم ہوتا ہے، وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے توسط سے ہوتا ہے، مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ، صفاتِ الٰہیہ، حشر ونشر، جنت ودوزخ، پل صراط، میزان اور ملائکہ وغیرہ اور یہ تفسیر خود جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: ''وَأَمَّا الْغَيْبُ فَمَا غَابَ عَنِ الْعِبَادِ مِنْ أَمْرِ الْجَنَّةِ وَأَمْرِ النَّارِ مَا ذَكَرَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِي الْقُرْاٰنِ''۔ [ابن جریر عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ من الصحابۃ] ''وَهُوَ قَوْلُ جُمْهُوْرِ الْمُفَسِّرِيْنَ اَنَّ الْغَيْبَ هُوَ الَّذِيْ يَكُوْنُ غَائِبًا عَنِ الْحَاسَّةِ''۔ [کبیر]

غیب کی منقول تفسیر اختصار کے ساتھ یہی ہے کہ: ''مَا غَابَ عَنِ الْحَوَاسِّ كُلِّهَا''۔ لیکن اسے ذرا سی وسعت دینے سے اس کے اندر پیغمبر ﷺ کے سارے علوم داخل ہو جاتے ہیں، اور پیغمبر اعظم ﷺ نے جن امور

سے وحی جلی یا وحی خفی کی روشنی میں لوگوں کو روکا ہے، اس سے باریک باریک برائیوں کا اجتناب امت کے نقطۂ نظر سے داخلِ غیب ہونا صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ وحی الٰہی کی خوردبین، شراب، سود، زنا، حرام وغیرہ کی خرابیوں اور مفاسد کو جس طرح اپنی گرفت میں لے آتی ہے، وہ انسان کے لئے غیب ہی کا حکم رکھتی ہے، لیکن جب غیب کی حقیقت یہ معلوم ہوگئی کہ وہ شہود یا علم کے مقابلہ کی چیز ہے، تو ظاہر ہے کہ جس طرح ہر شخص کا علم و مشاہدہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اسی نسبت سے ہر ایک کا غیب بھی دوسرے سے جداگانہ ہوتا ہے۔ طبیب کے لئے مرض و مریض سے متعلق بہت سے امور شہود میں ہوتے ہیں، جو دوسروں کے لئے غیب کے حکم میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر فن کا ماہر ایسی چیزیں جانتا ہے، جو عام آدمی کے لئے غیب یا خفاء میں ہوتی ہیں۔ گویا جس شخص کا دائرۂ علم جس قدر وسیع ہوگا اسی نسبت سے اس کا دائرۂ غیب چھوٹا ہوگا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ پر چونکہ ہر چیز روشن و عیاں ہے، اس لئے کوئی چیز اس کے لئے غیب میں داخل ہی نہیں، اور اس لئے اسے جب **عالم الغیب و الشهادة** کہا جاتا ہے، تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو سب بندوں کے لئے غیب میں ہوتی ہیں۔

غیب کی اضافت یہاں صرف بندوں کی جانب ہوتی ہے، ورنہ حق تعالیٰ شانہ کے لئے جس طرح دور و نزدیک، آسان و دشوار، بڑا اور چھوٹا سب یکساں ہیں، اور ان کے باہمی فرق بے معنی ہیں، اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کے لئے غیب و شہود بالکل یکساں اور ایک ہی ہے۔ "وَيُقَالُ لِشَيْءٍ غَيْبٌ وَغَائِبٌ بِاعْتِبَارِهٖ بِالْاِنْسَانِ لَا بِاللّٰهِ تعالىٰ فَاِنَّهٗ لَا يَغِيْبُهٗ شَيْءٌ" [راغب] یہیں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ دوسرے تمام انسانوں سے داناتر اور عالم تر ہیں، اور ان کا دائرۂ ادراک و معرفت دوسری ساری مخلوقات سے وسیع تر ہے، اس لئے قدرتاً انہیں بے شمار ایسی مخفیات کا علم ہوتا ہے جو کہ غیر انبیاء کے لئے مجہول ہوتی ہیں، لیکن اس ساری وسعت کے باوجود کہیں نہ کہیں کسی منزل پر پہنچ کر ان کے علم کی بھی انتہاء ہوجاتی ہے، اور دائرۂ غیب ان کا بھی شروع ہوجاتا ہے۔

غیب پر ایمان لانا تو آیت میں متقین کی سب سے پہلی علامت بیان کی گئی ہے۔ اب اگر خدانخواستہ کسی کا غیب ہے نہیں، تو وہ ایمان کس چیز پر لائے گا؟ انبیاء علیہم السلام سارے متقیوں کے سردار و پیشوا ہوتے ہیں، ان کا ایمان بھی اگر مغیبات و مخفیات پر نہ ہوگا، تو اور کس پر ہوگا؟ ہاں! البتہ ان کا غیب انہیں کے ظرف و مرتبہ و بساط کے موافق ہوتا ہے، ہمارا جیسا ان کا غیب نہیں ہوتا۔ دین کا مغز کہئے، یا ایمان کی روح، یہی عالمِ غیب کا عقیدہ ہے، یعنی یہ اعتقاد کہ اس مادی عالم اور حسی کائنات سے ماوراء ایک اور عالم بھی ضرور ہے۔

جو اس عالم کے وجود کا قائل نہیں تو وہ سرے سے مذہب ہی کا قائل نہیں، اور سب سے بڑا غیب تو خود باری تعالیٰ ہے، جو فی الواقع سب سے بڑھ کر روشن وعیاں ہے، مگر سب سے زیادہ مخفی ونہاں ہے۔ بڑے سے بڑے عالم و عارف کے لئے بھی اس کے مرتبۂ علم ومعرفت کے بعد پھر غیب کی حدود کا آغاز ہوتا ہے، اور جو لوگ انبیاء علیہم السلام کو عالم الغیب مانتے ہیں، وہ سراسر غلطی پر ہیں، انہیں چاہئے کہ اپنے ایمان کی فکر کریں۔ اس مسئلے کی مزید تحقیق سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

ایمان کی حقیقت اور اس کی تشریح:

ایمان کی تعریف کو قرآن کریم نے ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کر دیا ہے۔ لفظِ ایمان اور غیب کے معنی سمجھ لئے جائیں، تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آجاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، اسی لئے محسوسات ومشاہدات پر کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی کسی کپڑے کو سفید یا سیاہ کہہ رہا ہے، اور دوسرا شخص اس کی تصدیق کرتا ہے، اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے، ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بناء پر ہے، اور اصطلاحِ شریعت میں خبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر مشاہدہ کے محض رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے۔ کبھی نبی کو دیکھا، اور اس چیز کو نہیں دیکھا، جیسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، اور کبھی نہ نبی کو دیکھا، نہ اس چیز کو، مگر تسلیم کر لیا، جیسے باقی امت ہے۔

لفظِ ''غیب'' لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواسِ خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں۔ نہ وہ آنکھوں سے نظر آئیں، نہ کان سے سنائی دیں۔ نہ ناک سے سونگھ کر، یا زبان سے چکھ کر ان کا علم ہو سکے، اور نہ ہی ہاتھ سے چھو کر ان کو معلوم کیا جا سکے، (جیسا کہ پہلے بیان ہوا)۔

قرآن کریم میں لفظِ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں، جن کی خبر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم عقل اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں ربّ العزّت کی ذات وصفات، تقدیری امور، جنت، دوزخ، حشر و نشر، پلِ صراط، میزان، فرشتے، آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء علیہم السلام آجاتے ہیں۔ تفصیل اسی سورۂ بقرہ کے اختتام پر ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' میں بیان کیا جائے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔ گویا شروع سورت میں ایمانِ مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخر میں ایمانِ مفصل کا تذکرہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے جناب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک صحبت میں حاضر ہوا، اوراس پر آپ کی نبوت آفتاب سے زیادہ واضح اور ظاہر ہوئی، تو اس کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا، اور آپ کی تصدیق کرنا قابلِ تعریف نہیں ہے، بلکہ ایمان تو اس شخص کا قابل تعریف اور لائقِ مدح وثناء ہے جو نادیدہ آپ پر ایمان لائے، مجھے اس قادر مطلق خدا کی قسم! جس کا کوئی شریک نہیں، کوئی شخص ایمان میں اس سے بہتر وافضل نہیں ہوسکتا، جو بن دیکھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کرتا ہے، پھر انہوں نے استشہاداً یہ آیتیں پڑھیں، یعنی الٓمٓ سے الْمُفْلِحُوْنَ تک۔[مظهري]

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے، جس کے آخر میں یہ الفاظ نقل ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب خوارق ومعجزات دیکھتے رہتے ہیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، تو اور کون لائے گا؟ پھر آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا ایمان عجیب ہوگا، جنہوں نے مجھے نہیں دیکھا، میرے بعد آئیں گے، لیکن میرا نام سن کر صدق دل سے مجھ پر ایمان لائیں گے، وہ میرے بھائی ہیں، تم میرے صحابہ ہو۔ [طبراني كبير]

ایمان کی شرعی اور اصطلاحی تعریف:

"اَلْاِیْمَانُ ھُوَ تَصْدِیْقُ مَاعُلِمَ مَجِیْئُ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ بِہٖ ضَرُوْرَۃً تفصیلاً فِیْمَا عُلِمَ تفصیلاً وَاجْمَالاً فِیْمَاعُلِمَ اِجْمَالاً"۔[فتح الملهم] (یعنی ہر اس چیز کی تصدیق کرنا جس کے بارے میں قطعی طور پر یقین ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو لے کر تشریف لائے ہیں، اور یہ بات ضرورۃً بداہۃً معلوم ہو)۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس چیز کو لانا محتاجِ مناظرہ اور محتاجِ بحث نہ ہو (کسی دلیل وحجت کے بغیر)، بلکہ ہر آدمی بداہۃً یہ سمجھتا ہو کہ یہ باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ یہ چیز اگر اجمالاً ہو، تو اس پر اجمالی ایمان کافی ہے، اور جو تفصیلی طور پر معلوم ہو، اس پر تفصیلی ایمان لانا ضروری ہے۔

ایمان دراصل تصدیق، یعنی ماننے اور تسلیم وانقیاد ہی کا نام ہے، کیونکہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے، اس لئے جہاں تک جاننے کا تعلق ہے، وہ تو ابلیس وشیطان اور تمام کفار کو بھی حاصل ہے، بلکہ اکثر کفار کبھی اس کا اقرار بھی کرتے ہیں، اور بیشتر کفار کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدق کا یقین بھی تھا، مگر چونکہ وہ مانتے نہیں تھے، اس لئے وہ مومن شمار نہیں ہوئے، جیسے یہود ونصاریٰ، اور ہرقل روم، وغیرہ وغیرہ۔

ایمان واسلام کے درمیان فرق:

ایمان کا محل قلب ہے، قرآن حکیم کی متعدد آیتوں میں ایمان کو قلب کے ساتھ جوڑا گیا ہے، جیسے کہ ارشاد فرمایا: ﴿وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ [النحل:۱۰۶] (اوراس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو)۔ اسلام کا محل بھی قلب ہے، مگر سارے اعضاء وجوارح کی شمولیت کے ساتھ۔ پھرلغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اورقرآن وحدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدونِ اسلام کے، اور اسلام بدونِ ایمان کے معتبر نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محض دل میں تصدیق کرلینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں ہے، جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت وفرماں برداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمان برداری کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں ہے، جب تک دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق نہ ہو۔

جب اسلام، یعنی ظاہری اقرار وفرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان، یعنی ایقان وتصدیق نہ ہو، تو قرآنی تعلیمات کی رُو سے اس کو نفاق کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ خطرناک اور شدید جرم قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح ایمان، یعنی تصدیقِ قلبی کے ساتھ اگر اقرار واطاعت نہ ہو، تو اس کو بھی قرآنی اصطلاح میں کفر ہی قرار دیا گیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ﴾ [البقرة:۱۴۶] (وہ ان (پیغمبر آخرالزماں) کو اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں)۔ یعنی کفار، یہود ونصاریٰ سردار عالم ﷺ اور آپ کی حقانیت (رسالت) کو ایسے یقینی طریقے پر جانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ [النمل:۱۴] (اور بے انصافی اور غرور سے ان سے انکار کیا)۔ یعنی یہ لوگ ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ ان کے دلوں میں اُن کا یقین کامل ہے، اور ان کا یہ انکار محض ظلم وتکبر کی وجہ سے ہے۔

عمدۃ المحققین رئیس المحدثین حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہے، فرق صرف ابتداء اور انتہاء میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے، اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے، اور اسلام ظاہرِ عمل سے شروع ہوکر قلب پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے۔ اگر تصدیقِ قلبی ظاہری اقرار واطاعت تک نہ پہنچے، وہ تصدیق ہرگز ایمان شمار نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح اگر ظاہری اطاعت واقرار تصدیقِ قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام

معتبر نہیں۔ (انوار الباری) حضرت امام غزالیؒ اور امام سبکیؒ و دیگر محققین کا بھی یہی خیال ہے۔ حضرت امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے مسامرہ میں اسی پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے۔

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾ متقین کی پہلی علامت یہ ارشاد ہوئی ہے کہ وہ عقیدۂ غیب کے قائل ہیں، دوسری علامت یہ بیان ہو رہی ہے کہ عملی زندگی میں وہ نماز کے پابند ہیں۔ صلوٰۃ کے لفظی معنی دعاء کے ہیں، اصطلاحِ شریعت میں ایک مخصوص ہیئت کے معروف نورانی طریقۂ عبادت کا نام ہے، اور یہ نام بھی اسی سے پڑا کہ دعاء ہی اس عبادت کا جزوِ اعظم ہے، "اَلصَّلٰوةُ هِيَ الْعِبَادَةُ الْمَخْصُوْصَةُ الَّتِيْ اَصْلُهَا الدُّعَاءُ"۔ [راغب]

محققین نے کہا ہے کہ نماز تو سراسر دعاء ہے، زبان سے دعاء، دل سے بھی دعاء، اور اعضاء ظاہرہ سے بھی دعاء۔ قرآن حکیم میں یہ حکم کہیں نہیں کہ نماز پڑھا کرو، بلکہ جب بھی فرمان ہوا تو یہی حکم ہوا کہ نماز قائم کرو۔ "اِقَامَةُ الشَّيْءِ تَوْفِيَةُ حَقِّهٖ"۔ [راغب] اقامتِ صلوٰۃ اور اداءِ صلوٰۃ میں بہت بڑا فرق ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ خواص کا وظیفہ ہے، جبکہ اداءِ صلوٰۃ عامۃ المؤمنین کا وظیفہ ہے، کماھو المشاھدہ۔

نماز قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مکمل طہارت کے ساتھ، تمام تر ظاہری، باطنی اور صوری و معنوی ہر طرح سے آداب و رغبت اور محبت کے ساتھ، اس کے حقوق کی ادائیگی بجالائی جائے۔ ظاہری حقوق یہ ہیں کہ سنت نبوی کے مطابق تمام ارکان و آداب کو بجالانا، اور باطنی حقوق یہ ہیں کہ رغبت و انابت، شوق و محبت، خشوع و خضوع اور انکساری کے ساتھ ارحم الراحمین کے حضور سرِ تسلیم خم کرنا، اور جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ کی کیفیت کے ساتھ، واحد لاشریک لہ کے حضور سجدہ ریز ہونا۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ☆ ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

سجدہ نہایت اہم اور گرانقدر و قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر کسی کو یہ سعادت احسان کے درجے میں نصیب ہو، تو زہے سعادت! احسان کا مطلب یہ ہے کہ نمازی پر یہ کیفیت طاری ہو کہ "کأنک تراہ" گویا اپنے محبوب حقیقی کو دیکھ رہے ہو، اور اس کے ساتھ ہم کلام ہو، اس کے حضور ہاتھ باندھ کر اس کی عظمتوں پر جان نثاری کے ساتھ مشاہدۂ ذات میں مستغرق و بے خود ہو، ورنہ کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ "فإنہ یراک" کہ تیرا پروردگار تجھے دیکھ رہا ہے، اور تیرے تمام تر ظاہری و باطنی جذبات ملاحظہ فرما رہا ہے، وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ کی کیفیت چل رہی ہے، اور ایک عاشقانہ راز و نیاز کا سلسلہ جاری ہے۔

پس اس ذوق وشوق اور محبوبانہ انداز میں جو نماز ادا ہوتی ہو، وہی حقیقت میں دین کا ستون، اور مؤمن کی معراج قرار پائے گی، ''اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ''۔[الحدیث]

واضح ہو کہ تمام شرعی قوانین واحکام کی فرضیت نزولِ وحی اور حضرت جبریل امین علیہ السلام کے توسط اور آمد کے ساتھ مربوط ہے، جبکہ نماز کی فرضیت ایک نرالے، جداگانہ اور ممتاز طریقے پر ہورہی ہے کہ خود جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ربّ العزّت اپنے حضور عرشِ معلٰی پر بلا کر یہ ابدی اور باعظمت عبادت تحفہ وبخشش کے طور پر عطا فرما رہے ہیں، اور انہیں انتہائی قرب سے مقرب فرما کر عنایت وبخشش فرما رہے ہیں۔

دیگر تمام عبادات اوپر سے نیچے اتریں، اور نماز کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نیچے سے اوپر بلایا گیا۔ دیگر عبادتوں کی وحی زمین پر ہوئی، اور نماز کی وحی آسمانوں سے اوپر عرش پر ہوئی۔ دیگر عبادتوں میں فرشتہ واسطہ ہے، جبکہ نماز کی فرضیت براہ راست خلوت وقرب کے عالم میں ہے۔ اس سے وہ مطلب بآسانی سمجھ میں آگیا کہ اَلصَّلٰوۃُ عَمُوْدُ الْاِسْلَامِ وَمِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔[الحدیث] اور یہ محض تشبیہ وتمثیل نہیں، بلکہ واقعی حقیقت ہے کہ نمازی کو نماز میں معراج ہوتی ہے، اگر وہ کاملین میں سے ہو، تو اسے ابھی فوری احساس ہوگا، اور اگر نمازی ناقص لوگوں میں سے ہو تو اسے بعد ازمرگ احساس ہوگا، مگر معراج بہر حال ثابت ہے۔

معراج میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو برکات، کرامات اور روحانی سربلندیاں عطا ہوئی ہیں ان کا خلاصہ تین چیزیں ہیں:

(۱) مشاہدۂ حق، جیسا کہ قرآن کریم نے کہا: ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى﴾ [النجم:۱۱] (یعنی قلب نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا، جھوٹا نہیں تھا۔

(۲) دومؔ انتہائی قرب، جسے قرآن کریم نے واضح کیا: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ [النجم:۹] (پھر قریب ہوئے، اور آگے بڑھے تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم)۔

(۳) سومؔ مکالمۂ حق، چنانچہ التحیات میں اسی مکالمہ کی حکایت کی جاتی ہے، جو قیام قیامت تک اَبدالدہر تشہد میں دہرایا جائے گا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل سے ہر نمازی کو یہ تینوں مقامات دن میں پانچ مرتبہ نماز میں عطا ہوتے ہیں:

(۱) مشاہدہ تو حدیث میں ارشاد ہے کہ بحالتِ قیام بندہ کی نظر اللہ تعالیٰ جل شانہ کے مقدس چہرہ پر ہوتی ہے، جیسا بھی چہرہ اس کی شان کے مناسب ہے۔

(۲) قرب کی انتہاء ہو جاتی ہے، کیونکہ بنصِ حدیث اللہ تعالیٰ شانہ کے قدموں پر بندہ کا سر پڑا ہوا ہوتا ہے، جیسے بھی قدم اس کی شان کے مناسب ہیں۔

(۳) کلام تو ہر رکعت میں میسر ہوتا ہے، کیونکہ ہر رکعت میں فاتحہ شریف لازم ہے، اور سورت فاتحہ کے بارے میں حدیث میں صریح ارشاد ہے کہ اس کے ہر ایک جملہ کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہاتھ در ہاتھ دیا جاتا ہے۔

بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے تو وہ فوراً فرماتے ہیں: حَمِدَنِي عَبْدِيْ۔

بندہ کہتا ہے: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو وہ فوراً فرماتے ہیں: اَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ۔

بندہ کہتا ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو وہ فوراً فرماتے ہیں: مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ۔

بندہ کہتا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو وہ فوراً فرماتے ہیں: هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ۔

بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اِلٰى آخرِ السورۃ، تو وہ فوراً فرماتے ہیں: هٰذَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَنِيْ۔

نیز یوں بھی تلاوتِ قرآن نماز میں فرض ہے، اور تلاوتِ قرآن بنصِ حدیث اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا ہے۔

پس جبکہ نماز میں قرب بھی انتہائی ہے، مشاہدہ بھی حقیقی ہے، اور کلام بھی آمنے سامنے جاری ہے، تو یہی تین چیزیں معراج کی روحیں تھیں، تو پھر نماز کو مؤمن کی معراج فرمانا محض تشبیہ واستعارہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ جبکہ معراج کی سب حقیقتیں واقعیت کے ساتھ نماز میں موجود ہیں، جس کو اہلِ مشاہدہ تو دنیا ہی میں محسوس کر لیتے ہیں، اور اہلِ مراقبہ معرفت کے درجہ میں پہچان لیتے ہیں، اور اہلِ مجاہدہ ایمان رکھتے ہیں، جن کے مشاہدہ کا وقت مشاہدۂ موت کے بعد آتا ہے۔ اس وقت انہیں محسوس ہوگا کہ حقیقتاً ہم نے دنیا میں بسلسلۂ نماز اللہ تعالیٰ سے کلام بھی کیا تھا، جس کا حظ اثر ہم میں اب راسخ نظر آ رہا ہے۔ اس کا قرب بھی ہمیں انتہائی ہوا تھا، جس کی ٹھنڈک اب ہم محسوس کر رہے ہیں، اور اس کا مشاہدہ بھی ہم کرتے تھے، جس کا اُنس اس وقت ہم میں رچا ہوا ہے، اور اب ہم اس معرفت، بلکہ استحضار پر ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کی تجلیات ہمارے سامنے آ جائیں، تو ہم فوراً پہچان لیں گے کہ وہی تجلّی ہے جو روزانہ پانچ وقت ہماری روحوں پر کھلا کرتی تھی، اور ہم اس سے سیراب (وابستہ) ہوتے تھے۔

چنانچہ حدیث حشر سے واضح ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ مسلمانوں کے سامنے ایک خاص (اجنبی) صوت میں متجلی ہوں گے، اور فرمائیں گے: اَنَا الرَّحْمٰنُ (میں رحمٰن ہوں) تو یہ سارے کہہ دیں گے کہ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ) ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ پھر ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ کے وعدہ کے مطابق پنڈلی والی تجلی منکشف ہوگی، توسب سجدے میں گر پڑیں گے، اور اس کے رحمٰن ہونے کا اعتراف کریں گے۔

اس سے واضح ہے کہ کوئی نہ کوئی جلوۂ حق ان کا متعارف اور پہچانا ہوا ہوگا، جب ہی تو ایک جلوہ سے وحشت اور ایک سے اُنس کا اظہار کریں گے۔ پنڈلی والے جلوہ کو سب پہچان جائیں گے، اور سب سجدے میں گر جائیں گے۔ شاید یہ پنڈلی کی تجلی وہی ہو جس کے نچلے حصے (قدم) پر یہ لوگ سجدے میں روزانہ پیشانی رگڑا کرتے تھے، اور ان کا سر اللہ تعالیٰ کے قدموں پر پڑتا تھا، اسی لئے اسے ہر شخص پہچان لے گا کہ عبادتاً روزانہ اسی تجلی کے سامنے سربسجود ہوا کرتا تھا، اور اس تجلی سے روح نے کافی مناسبت پیدا کرلی تھی۔

خلاصہ یہ کہ عوام الناس اگر قدمِ الٰہی کا یہاں مشاہدہ نہیں کرسکتے، تو یہ بھی نہیں کہ وہ اس قدم اور ساق کو بالکل پہچانتے ہی نہیں ہیں، اسی پر مکالمۂ الٰہی اور قربِ حق کو بھی قیاس کرلیا جائے۔

غرض یہ کہ نماز میں یہ مکالمۂ حق اور یہ انتہائی قرب اور یہ مشاہدہ تجلی قدم، کوئی استعارہ وتشبیہ نہیں، بلکہ واقعہ اور حقیقت ہے، اور یہی تینوں چیزیں معراج کی روح ہیں، اس لئے ہر مؤمن کو حقیقتاً روزانہ پانچ مرتبہ نماز میں معراج ہوتی ہے۔ [اقتباس از خطبات حکیم الاسلام]

فائدہ:

یہ بات ذہن میں رہے کہ مردہ نماز جس میں روح وحیات نہ ہو، جو تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک غفلت اور لاپرواہی سے ادا کی جائے، ایسی نماز کو معراج المؤمنین کا ہرگز مرتبہ وشرف حاصل نہ ہوگا، اور تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ کا مقام بھی حاصل نہ ہوگا۔

غرض یہ کہ ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم الخلیل علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک اور سید الملائکہ ''حضرت جبرئیل امین'' علیہ السلام سے لے کر عام فرشتوں تک، نماز کا ایک خاص اور جامع نظام ہمارے سامنے ہے۔

نماز کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کتنے مستعد اور بیتاب نظر آتے ہیں؟ اپنے ربّ جل شانہ سے درخواست کررہے ہیں: ﴿رَبِّ اجْعَلْنِىْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ﴾ [ابراھیم: ۴۰] (یاربّ! مجھے بھی نماز قائم کرنے

والا بنا دیجئے، اور میری اولاد میں سے بھی)۔اور جب اپنے لختِ جگر سیدنا اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ کو وادی" غیر ذی زرع" میں کعبۃ اللہ شریف کے پاس اللہ ربّ العزّت کے سپرد کرتے ہیں، تو یوں دعاء کرتے ہیں:

﴿رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ﴾[ابراھیم:۳۷] (اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد کو آپ کے حرمت والے گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں لابسایا ہے جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی، ہمارے پروردگار! تا کہ یہ نماز قائم کریں۔لہٰذا لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے کشش پیدا کردیجئے)۔(ابراہیم کی یہ تمام التجاء وتڑپ صرف نماز ہی کے لئے ہے،"لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ" کا "لام" تعلیل کے لئے ہے۔

اس بابرکت نماز کی اقامت کے لئے کتنی ظاہری وباطنی طہارتوں کا التزام ہورہا ہے؟ اور اسی کی خاطر مسجدیں تعمیر ہورہی ہیں، الگ شہر بنائے جارہے ہیں، مؤذن، خدام، ائمہ مساجد اور خطباء کا انتظام ہورہا ہے۔ایک مربوط اور جامع نظام کے تحت نمازِ باجماعت کا اہتمام ہورہا ہے، جہاں بیک وقت ایک ہی امام کی اقتداء میں لاکھوں نمازی بڑے ضبط واتفاق اور بے مثال اجتماعی یگانگت اور ترتیب کے ساتھ اپنے رب کے حضور تضرّع وعاجزی کے ساتھ سجدہ ریز ہوکر عبادت میں مصروف نظر آتے ہیں۔کئی غیر مسلم اس روح پرور منظر کو دیکھ کر بلا تامل دائرۂ اسلام میں داخل ہوچکے ہیں۔

پھر مزید برآں یہ کہ نماز کے طفیل نمازی مسلمانوں میں تہذیبِ اخلاق، شوقِ عمل، تہذیبِ نفس، سیاستِ مدن، اور دیگراَن گنت اور عمدہ صفات، فضائل ومحامد نماز ہی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں، اور تمام انفرادی، اجتماعی، سماجی اور معاشرتی برائیاں یکسر ختم ہوجاتی ہیں۔قرنِ اوّل نے اس صلاح واصلاح، عدل وانصاف کو نمازوں کی بدولت اٹھایا، اور چاردانگ عالم میں پھیلایا کہ اولوالعزم بادشاہوں نے بھی فقر وتواضع کو شعار بناکر وہ بے مثال حکمرانی کے فرائض انجام دیئے، جنہیں آسمانی فرشتوں نے سراہا، ان کی تحسین کی اور رہتی دنیا تک ان کے کارنامے اوراقِ تاریخ کی زینت بنے۔

ایک مسلم حکمران کا حیرت انگیز واقعہ:

خیر القرون سے سینکڑوں سال بعد مکہ ومدینہ سے ہزاروں میل دور ہندوستان کے حکمران بادشاہ شمس الدین التمش جو کہ تقویٰ، دیانت، صداقت، عدل وانصاف کے پیکر ونمونہ مانے جاتے ہیں، بادشاہت میں فقیرانہ وضع قطع

کے ساتھ کبھی نماز بغیر جماعت اور بغیر صفِ اول میں کھڑے ہوکر پڑھنے میں اطمینان وسکون نہیں پاتے تھے، اور کبھی بغیر وضوء، تاجدار نبوت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر نہیں لاتے تھے، قصرِ شاہی (حجرۂ فقیری) میں کبھی اذان کی سماعت نہیں ہوتی تھی، بلکہ اذان سے بہت پہلے مسجد میں پہنچتے تھے، اور پہلی صف میں بیٹھ کر اذان سنتے تھے۔

اسی دوران قطبِ زمانہ خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوتا ہے، وفات سے قبل حضرت خواجہؒ وصیت فرماتے ہیں کہ جنازہ ایسا شخص پڑھائے جو ہمیشہ عفیف اور پاکدامن رہا ہو۔ کسی غیر محرم عورت کی طرف نہ دیکھا ہو، اور نمازِ عصر کی چار سنتیں اس سے کبھی قضا نہ ہوئی ہوں، ہمیشہ باجماعت نمازیں پڑھی ہوں، اور تکبیر اولیٰ میں شریک رہا ہو۔

اس وقت جنازہ کی تیاری ہورہی تھی، بادشاہِ وقت بھی موجود ہیں، وصیت کا اعلان ہوا، صفوں میں سکوت طاری ہوگیا، بادشاہ انتظار کرتے رہے کہ کوئی عظیم ہستی یہ سعادت حاصل کرلے، جب انتظار طویل ہوا، اور کسی شخصیت نے جرأت نہیں کی، تو بادشاہ (التمشؒ) یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے: ''میری خواہش تھی کہ کوئی میرے حال سے واقف نہ ہو خواجہ کی وصیت وحکم کیسے ٹالدوں، مشیت ایزدی یہی ہے''، یہ کہا، اور آگے بڑھ کر نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ تھے ہمارے مسلمان حکمران۔ ؎

آں مسلمانان کہ میری کردہ اند ☆ درشہنشاہی فقیری کردہ اند

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے ☆ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

بڑے صدمے کی بات ہے کہ آج ہمارے حکمرانوں کو کلمہ طیبہ کا صحیح تلفظ تک نہیں آتا۔ نماز تو دور کی بات ہے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ انہیں یاد نہیں، کبھی اللہ تعالیٰ شانہ کے نام کے ساتھ بڑے فخر کے ساتھ ''علیہ السلام'' پڑھتے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

خلاصۃ الکلام:

قرآن کریم نے زیر نظر آیت کریمہ میں نماز کے متعلق ﴿يُقِيْمُوْنَ﴾ فرما کر اقامتِ صلوٰۃ پر تنبیہ فرمائی۔ دوسرے مقام پر لفظ ''دَآئِمُوْنَ'' اور کلمہ ''يُحَافِظُوْنَ'' ذکر فرمایا ہے، جیسے کہ ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ [المعارج: ۲۳] (جو اپنی نماز کے پابند ہیں)۔ چند آیتوں کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ [المعارج: ۳۴] (اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں)۔

یہ تینوں کلمات اپنے مفہوم کے اعتبار سے بڑے اہم اور بنیادی کلمات ہیں۔ ان تینوں کا مطلب مداومت اور

محافظتِ اقامتِ صلوٰۃ ہے، جن کا واضح مطلب یہ ہوا کہ مؤمنین متقین کی صفات یہ ہیں کہ وہ نماز کو اس کی حقیقی ہیئت اور واقعی کیفیت کے ساتھ اس کے آداب وشرائط سنن وواجبات کے ساتھ ہمیشہ پابندیٔ اوقات کی رعایت کے ساتھ کماحقہ، عاجزی اور ذوق وشوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور یہ چیز محض فعلِ صلوٰۃ سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ پورے حدود واحکام کی بجاآوری سے حاصل ہوتی ہے، کیونکہ ایک تو نماز کی ظاہری شکل وصورت ہے، دوسری چیز نماز کی روح ہے۔ اصل چیز نماز کی روح ہوتی ہے، نہ کہ اس کی صورت۔ اگر صورت تمام ہو، مگر روح سے نماز خالی ہو، تو شرعاً اسے نماز قائم کرنا نہیں کہتے، اور وہ بے جان، مردہ اور نہ ہونے کے برابر ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک شخص نے تین مرتبہ نماز ادا کی، ہر مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے یہ کہہ کر تنبیہ فرمائی کہ جاؤ نماز پڑھو، تم نے صحیح نماز نہیں پڑھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی نماز روح نماز سے خالی تھی۔ [بخاری]

آج کل ہم سب کی نمازیں مردہ وبے جان نمازیں ہیں، اِلّا ماشاءاللہ۔ جب ہی تو ہم نماز کے برکات وفوائد سے محروم ہیں۔ ہزاروں نمازوں کے باوجود منکرات وفواحش اور طرح طرح کے معاصی میں مبتلا ہیں۔ اگر کوئی صرف ایک روز کی پنجگانہ نمازوں کو آداب وشرائط، خشوع وخضوع کی رعایت کے ساتھ ادا کرے، تو شاید اس کی زندگی میں انقلاب برپا ہو۔ ہمارے یہ صوم وصلوٰۃ، حج وزکوٰۃ روحانی انقلاب سے اس لئے خالی ہیں کہ ان میں روحِ عبادت مفقود ہے۔ یہ سب فعلِ نماز واداءِ نماز تک محدود ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کا نام ونشان تک نہیں۔ اگر ہم صحیح معنوں میں نمازی ہوتے، تو آج ہماری دنیا کا وہ نقشہ نہ ہوتا جو آج ہے، بلکہ کچھ اور ہوتا۔

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ یہ متقین کی تیسری صفت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اس کی رضاء میں خرچ کرتے ہیں۔

رزق کا لفظ کلامِ عرب میں بڑا وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آجاتی ہیں، خواہ ظاہری ومادی ہوں، مثلاً مال وسرمایہ، صحت واولاد، یا معنوی وروحانی ہوں، مثلاً علم وحکمت، معرفت وعرفان وغیرہ۔ اَلرِّزْقُ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ الْحَظُّ، اِسْمٌ لِكُلِّ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ۔ [کبیر، معالم] يُقَالُ لِلْعَطَاءِ الْجَارِيْ تَارَةً دُنْيَوِيًّا كَانَ اَمْ اُخْرَوِيًّا وَلِلنَّصِيْبِ تَارَةً۔ [راغب]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ [الواقعۃ: ۸۲] (اور اپنا حصہ یہ رکھتے ہو کہ جھٹلاتے ہو)۔ یہاں بھی بمعنی حظ ونصیب کے ہے۔

رزق کا اطلاق عام طور پر حلال اور حرام دونوں پر ہوتا ہے۔ ''رَزَقْنٰهُمْ'' کے صیغہ میں ہر رزق کو اپنی جانب منسوب کر کے بتا دیا کہ ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [النحل:۵۳] کہ جو نعمت ظاہری و باطنی مادی و روحانی، جتنی اور جس قسم کی بھی تمہیں ملتی ہے، سب کچھ منعمِ حقیقی کی بخشش و عطاء اور ذرہ نوازی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ انسان کی اپنی کوئی چیز نہیں ہوتی، وہ محض چوکیدار و نگہبان ہے۔ دنیا سے جاتے وقت خالی ہاتھ بصد احتیاج راہی ملکِ بقاء ہو جاتا ہے۔ تمام رزق و روزی دوسروں کے لئے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ اس کا اپنا ہوتا، تو ساتھ لے کر چلا جاتا، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ اس کا حصہ پورے سرمایہ میں وہی رہا جو کھایا پیا، پہنا، یا ذخیرۂ آخرت بنا کر تندرست زندگی میں بخوشی و رغبت اگلے جہاں کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق جمع کیا۔

حضرت ذوالقرنین علیہ السلام نے موت سے پہلے وصیت کی تھی کہ میرا جنازہ اٹھا کر پورے شہر میں پھراؤ، کفن سے دونوں ہاتھ باہر نکال کر اعلان کرتے جاؤ کہ پورے جہاں کا بادشاہ دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہے، اس میں اور ایک نادار فقیر میں کوئی فرق نہیں رہا۔

﴿يُنْفِقُوْنَ﴾ فرما کر واضح کیا کہ متقیوں کا حلال مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کے حکموں کے مطابق جائز و صحیح مصارف میں خرچ ہوتا ہے، اور کسی غیر شرعی مصرف میں خرچ نہیں ہوتا، کیونکہ متقی لوگ حلال کمائی کر کے ہمیشہ حلال میں صرف کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اگر کسی کا مال غیر شرعی مصرف میں خرچ ہوا، تو یہ حرام مال شمار ہوگا، اور خرچ کرنے والا تقویٰ کے منصب سے بہت دور شمار ہوگا۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حلال مال کبھی غیر شرعی امور میں خرچ نہیں ہوتا، اور حرام مال ہرگز شرعی مصرف پر نہیں خرچ ہوگا۔ نیز متقی کبھی غلط نہیں کماتا، اور غلط خرچ بھی نہیں کرتا، جبکہ غیر متقی کبھی صحیح نہیں کماتا، اور صحیح خرچ بھی نہیں کرتا۔ ﴿كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [الروم:۳۲] (ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہے)۔ متقیوں کی علامت یہ بتائی گئی کہ وہ مصارفِ خیر میں اخلاص کے ساتھ رضاءِ الٰہی کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔ بخل بھی نہیں کرتے، اور غلط کاموں میں نام و نمود، ریاء اور دکھلاوا وغیرہ کے پیش نظر بھی خرچ نہیں کرتے، اور جو لوگ غیر شرعی امور مثلاً قومیت، عصبیت، شادی بیاہ، منگنی اور دیگر مواقع میں پانی کی طرح مال خرچ کرتے ہیں، وہ تقویٰ کے منصب سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ ''مالِ حرام بجائے حرام'' کے مصداق ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہ انفاق فی سبیل اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضاء میں ہر چیز، مثلاً مال یا علم و حکمت خرچ کرنے کے بے

شمار مصارف ہیں۔ متقی لوگ اپنے نورِ باطنی ونورِ ایمانی کے طفیل ان تمام مصارف ومواقع سے باخبر رہتے ہیں، اور انہی مواقعِ خیر میں سب کچھ خرچ کرتے ہیں۔ صفتِ انفاق متقیوں کا خاصہ اور طرّۂ امتیاز ہے، کیونکہ مال خرچ کرنا بہت ہی دشوار اور مشکل کام ہے۔ وضوء ونماز، ذکر واذکار وتسبیحات ایک حد تک نہایت سہل بھی ہیں، اور مرغوب بھی، مگر مال خرچ کرنا ایک حد تک مشکل بھی ہے، اور مبغوض بھی۔ اِلَّا مَنْ وَفَّقَهُ اللهُ وَسَلَّطَهُ عَلَى الْاِنْفَاقِ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُعْطِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔

اسی بنیادِ سابق کے پیشِ نظر بعض علماءِ محققین نے تقویٰ کی یہ تعریف کی ہے: "اَلتَّقْوٰى اَنْ لَّا يَرَاكَ اللهُ حَيْثُ نَهَاكَ وَلَا يَفْقِدَكَ حَيْثُ اَمَرَكَ"۔ [کبیر] یعنی تیرا ربّ تجھے وہاں نہ دیکھے، جہاں جانے سے اس نے تجھے روکا، اور اس مقام سے تجھے غیر حاضر نہ پائے، جہاں پر حاضر ہونے کا اس نے تجھے حکم دیا ہے۔ یہ تقویٰ کی ایک عمدہ اور جامع تعریف ہے۔

اُخص الخواص کا معاملہ......

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے زکوٰۃ کے متعلق پوچھا، تو کہنے لگے: اُخص الخواص کے ہاتھ میں آج جو کچھ مال آیا، وہ شام تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ جب وہ مال ایک دن تک نہیں رکھتے، تو کیا زکوٰۃ دیدیں؟ سارا مال زکوٰۃ کی مد میں صرف ہوتا ہے، جیسے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم ہدیہ بھیجا تھا، شام تک سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سارا مال اہلِ مدینہ میں تقسیم فرمایا، خود روزہ رکھا تھا، افطار کے وقت باندی سے کہا: پانی لاؤ افطار کروں، باندی نے کہا کہ اگر آپ ایک درہم اپنے افطار کے لئے رکھ لیتیں، تو میں دکان سے کھجور لے آتی۔ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آپ نے یاددہانی نہیں کرائی، مجھے اپنا خیال نہیں آیا، اور مَیں کیوں اپنے نفس کی خبر گیری کروں؟

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صوبہ حمص کے لوگوں سے کہا کہ اپنے علاقے کے فقراء اور مسکینوں کی فہرست لکھ کر بھیجو، تاکہ بیت المال سے ان کے وظائف جاری کروں۔ انہوں نے سرِفہرست وہاں کے گورنر سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا نام لکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے ایک ہزار دینار کسی سپاہی کے ہاتھ بھیج دیئے، وہ اپنے غریب خانہ (جھونپڑی) کے باہر بیٹھے تھے۔ سپاہی نے ان کی خدمت میں دینار پیش کئے، وہ بڑے پریشان ہو کر زور سے "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھنے لگے، ان کی بیوی یہ سن کر پریشان ہوئی، اور کہنے لگی: کیا (خدانخواستہ)

امیر المؤمنین وفات پا گئے ہیں؟ کہنے لگے: نہیں، بلکہ ایک ہزار دینار بھیج کر مجھے شدید پریشانی سے دوچار فرما دیا ہے، گورنر کی بیوی نے انہیں تسلی دے کر کہا: آپ غم نہ کریں، یہ پیسے مجھے دیدیں، شام تک تقسیم کر کے آپ کی پریشانی ختم کردوں گی، چنانچہ تقسیم شروع کر کے عصر سے پہلے فارغ ہوئے، پھر میاں بیوی دونوں نے شکرانہ کی نماز ادا کی، اور خوش ہوئے۔ یہ تھے ہمارے اُخص الخواص، جنہوں نے بادشاہت میں فقر کا دامن نہیں چھوڑا۔

دوسرا درجہ خواص کا ہے، وہ چالیسواں حصہ اپنے پاس رکھتے ہیں، انتالیس حصے پابندی سے زکوٰۃ میں دے دیتے ہیں۔ تیسرا درجہ عوام الناس کا ہے، وہ انتالیس حصے اپنے لئے رکھتے ہیں، صرف چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دے دیتے ہیں۔ اور جولوگ اس چالیسویں حصہ میں بھی بخل کر کے سرے سے زکوٰۃ ہی نہیں دیتے، وہ تو شاید بندگی کے دائرے سے خارج شمار ہوتے ہوں گے۔ ربّ العزّت سبحانہ انہیں ہدایت دے۔ آمین

انفاق فی سبیل اللہ کی قسمیں:

انفاق فی سبیل اللہ کی سات قسمیں ہیں:

(۱) زکوٰۃ (۲) صدقۂ فطر (۳) ہر قسم کے خیرات وصدقات (۴) وقف، مساجد، مدارس، یتیم خانہ، مہمان خانہ وغیرہ (۵) حج وعمرہ (۶) جہاد فی سبیل اللہ (۷) اہل وعیال کے اخراجات، رشتہ داروں عزیزوں پر انفاق وغیرہ۔

انفاق فی سبیل اللہ کا فلسفہ:

اللہ تعالیٰ حکیم وخبیر نے کائنات کی مختلف مخلوقات کو بے شمار مختلف رنگوں اور کیفیتوں میں پیدا فرما کر اپنی قدرتِ کاملہ پر گواہ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس جہاں کی بقاء کے لئے ایک مربوط تکوینی نظام کا بھی انتظام فرمایا ہے۔ تیسرے نمبر پر اس جہاں کے اختتام پر ایک قانونِ مجازات، یعنی محاسبہ کا نظام پیدا فرمایا ہے، جس میں اس کی صفتِ عدل وقضاء کا جوہر آشکارا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت کا نام "ایجاد" ہے۔ اس میں کسی بھی مخلوق کی رعایت اور تصور کا دخل نہیں ہوگا، وہ اول سے آخر تک تکوینی ہے۔

دوسری صفت کا نام "ابقاء" ہے، جس کے ذریعہ اس جہاں اور اس کے مختلف رنگوں کو برقرار رکھا جائے گا۔ اس دوسری صفت میں اللہ تعالیٰ شانہ نے بہت سی باتوں میں اشرف المخلوقات انسان کو بڑے بڑے فرائض اور اختیارات سونپ دیئے ہیں، تاکہ اس کے مکلّف ہونے کا مقصد معطل نہ ہو، کیونکہ بغیر اختیار کے کسی مخلوق کو مکلّف نہیں بنایا جاسکتا، پھر اس نظامِ عالم کی خوشحالی وبقاء کے لئے انسانوں کو مختلف پیشے، اور زندگی کی مختلف محنتیں سکھائیں، اور

بتلائیں﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾[بقرہ: ۳۱] (اور آدم کو سارے نام بتادیئے) میں اسی طرف اشارہ ہے۔

صنعت وحرفت، مالداری، زراعت، مزدوری، تعلیم، تعمیر، ملازمت، تجارت، قانون، عدل وانصاف، فوج وسپاہ، یہ سارے تنظیمی امور ہیں، جو انسانوں کے سپرد ہیں، تاکہ دنیا کا نظام صحیح خطوط پر قائم رہے، اور ہر قسم کا تمدن پیدا ہو، اور کسی قسم کی تخریب وبدنظمی پیدا نہ ہو۔ اسی نظام کا ایک حصہ یہ ہے کہ ہر قسم کا تمدن پیدا کرنے، اور اسے باقی رکھنے کے لئے اسی زاویہ اور اسی شعبے کے لوگ پیدا ہوں۔

اگر سارے لوگ غریب اور محتاج ہوں، کوئی امیر نہ ہو، یا سارے امیر ہوں، کوئی فقیر ومحتاج نہ ہو، تو یہ نظام سالوں نہیں مہینوں میں درہم برہم ہوگا۔ اس لئے قدرت نے اپنی حکمت کے تحت دونوں سلسلے جاری فرمائے، اور دونوں طبقوں میں ایک مربوط نظام بھی جاری فرمایا، کہ مزدور بیچارہ کام کرے، اور سرمایہ دار اسے اجرت ادا کرے۔ یہ نظام بھی چلے، اور ربط بھی رہے۔ اس سلسلے میں جو غریب مریض یا بیوہ، یا نابالغ یتیم، یا معذور ہوں جو مزدوری اور محنت بھی نہیں کر سکتے، تو سرمایہ دار انہیں زکوٰۃ خیرات، صدقات دیا کریں، تاکہ مال کی صفائی ہو، اور شکر بھی ہو، اور غریب پروری کے ثواب کے ساتھ نظامِ تمدن کا ارتباط بھی۔ واللہ اعلم

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ متقین کی چوتھی صفت یہ ہے کہ ایمان بالغیب، اقامۃ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ ساتھ وہ بلاتفریق ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر، اور اسی طرح تمام آسمانی کتب وصحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں، جو کہ ربّ العزّت نے مختلف پیغمبروں پر، مختلف زمانوں، مختلف ملکوں اور مختلف قوموں میں نازل فرمائیں۔ یہ ایمان بالکتب وبالرسل اگرچہ ایمان بالغیب کا حصہ ہے، اور ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ میں داخل ہے، لیکن اس کی اہمیت اور عظمتِ شان کی خاطر تخصیص بعد التعمیم کے طور پر مستقل علیحدہ ذکر فرمایا۔

﴿بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ کا کلمہ اپنے عمومی معنی کے لحاظ سے وحی جلی، وحی خفی، بلکہ وحی الٰہی کی تمام اقسام کو شامل ہے، اور آیت کریمہ اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے عرب کے مؤمنوں اور یہودیت ونصرانیت کو چھوڑ کر دینِ اسلام قبول کرنے والے سارے اہلِ کتاب مؤمنوں کو بھی شامل ہے۔ البتہ! جو اہلِ کتاب قرآن پر اور صاحب قرآن محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے ہیں، وہ ہزار دفعہ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ پر ایمان لائیں، ہرگز مسلمان شمار نہیں ہوں گے، کیونکہ اس آخری برحق دین پر ایمان لانا قیامت تک آنے والے ہر قسم کے لوگوں پر فرض ہے، اور

قرآنی تعلیمات کے ہوتے ہوئے کسی بھی شخص کو گزشتہ آسمانی کتابوں کے احکامات پر عمل کرنے کی گنجائش واجازت نہیں۔ گو کہ ایمان لانا ساری کتابوں پر فرض ہے، مگر اتباع صرف قرآن حکیم ہی کی ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَاوَسِعَهٗ اِلَّا اِتِّبَاعِىْ“۔ [مشکوٰۃ]

﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ تمام آسمانی کتب پر ایمان لانا فرض ہے۔ یہ وہ کتبِ سماویہ ہیں، جنہیں اصلی حقیقی غیر محرّف آسمانی کتب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ موجودہ انجیل، تورات، بائبل اور دیگر کتب یہ سراسر محرّف اور تبدیل شدہ ہیں۔ ہمیں یہی حکم ہے کہ ان کی نہ تصدیق کریں، اور نہ ہی تکذیب، کیونکہ کچھ اصلی باتیں اور کچھ نقلی و بے بنیاد باتیں شامل کرکے انہیں ترتیب دیا گیا ہے۔

امریکہ، جرمنی، فرانس، برطانیہ، افریقہ، بھارت اور آسٹریلیا وغیرہ ممالک میں جو تورات وانجیل کے موجودہ نسخے ہیں، وہ سراسر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح جن زبانوں میں ان کا جو ترجمہ ہوا ہے ان میں بھی بہت نمایاں تفاوت اور اختلاف ہے۔ بخلاف قرآن حکیم کے، کہ آپ افریقہ میں اس کا جو نسخہ پائیں گے، دنیا کے دوسرے کونے انڈونیشیا میں بھی وہی نسخہ ہوگا۔ دونوں میں زیادتی تو درکنار، ایک زبر، زیر یا پیش کا فرق بھی نہیں ہوگا۔ اگر کہیں چھپائی کی کوئی غلطی ہو، تو فوراً پتہ چلے گا، کیونکہ دنیا میں کروڑوں کے حساب سے قرآن پاک کے قراء وحفاظ موجود ہیں، جبکہ بائبل کا روئے زمین پر ایک حافظ بھی نہیں، اور یہ حقیقت ہے۔

موجودہ بائبل، امرقس، یوحنا، لوقا، متیٰ، وغیرہ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے، تو آپ ہرگز یہ محسوس نہیں کریں گے کہ یہ کوئی آسمانی کتابیں ہیں، کیونکہ ہزاروں تضادات کے علاوہ ان میں ذات باری تعالیٰ عزّ شانہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں ایسے غلیظ اور ناشائستہ مضامین وکلمات موجود ہیں، جنہیں ایک عام بازاری آدمی بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، مثلاً یہ کلمات: ”خداوند زمین پر انسانی پیدائش کرنے سے پچھتایا، اور دلگیر ہوا، پچھتاتے پچھتاتے میں تھک گیا“۔ پھر لکھا ہے: ”یعقوب صبح تک تمام رات خدا کے ساتھ کشتی کرتا رہا“۔ پھر لکھا ہے: ”خداوند یہودا سے پیدا ہوا“۔ [پیدائش کتاب برسیا، کتاب یسعیاہ، اعمال] وغیرہ۔

یہ ”مشتے نمونہ ازخروار“ ہے، اگر آپ پوری کتاب کا بغور مطالعہ کریں گے، تو بے شمار افتراء، جھوٹ، گستاخیوں سے تنگ آکر شاید ایسی کتاب کو نذر آتش کئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ الوہیت کا ایک بھیانک غلط تصور، توہین و افتراء کا ایک مجرمانہ طومار آپ کے سامنے پیش ہوگا، جسے کوئی ادنیٰ جاہل بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

پھر انبیاء ورُسل علیہم السلام، برحق پیغمبروں کے متعلق جو بے بنیاد، استہزاء اور توہین آمیز کلمات جو بائبل کے اوراق میں نظر آئیں گے، وہ الأمان والحفیظ!!.....لکھا ہے: ''نوح علیہ السلام شراب پی کر مست ہو گئے، لوط (علیہ السلام) نے شراب پی کر اپنی بیٹیوں کے ساتھ (العیاذ باللہ!) زنا کیا، ہارون (علیہ السلام) نے زیورات کا بت بنا کر بنی اسرائیل سے اس کا پوجا کروایا''، وغیرہ۔

اند کے با تو بگوئیم و لے میترسیم ☆ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

صحیح آسمانی دین اور آسمانی کتابوں کی تعلیمات کی واحد مقصود بالذات غرض اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات کی تقدیس وتنزیہ اور عظمت شان کا اثبات ہوتا ہے، اور اس کی بلندی کمالات اور ارتفاع وعلوِ شان اور ہمہ گیر قدرتوں کا بیان ہوتا ہے۔ دوسرے درجہ میں برگزیدہ وپسندیدہ انبیاء ورُسل علیہم السلام کی عظمت و پاکیزگی اور عصمت کا اثبات اس کے ساتھ قیامت، جنت ودوزخ، حشر ونشر اور قانونِ مجازات وغیرہ کا باقاعدہ تذکرہ ہوتا ہے۔ نیز دیگر عقائد وایمانیات اور مذہبی، دینی، اخلاقی اقدار کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ بسط وتفصیل کے ساتھ بیان ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے ان مذکورہ مضامین پر ایسے حکیمانہ اور محققانہ انداز میں بڑے ادب واحترام اور نہایت سنجیدگی سے دُرفشانی کی ہے، جس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ ذات وصفات کے متعلق ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ اور سورت اخلاص میں تمام بنیادی عقائد اور حقائق کو جس وضاحت سے بیان فرمایا ہے، اس کی نظیر نہیں۔ اگر کوئی صاحب باطن سورت اخلاص کو سوز وگداز کے ساتھ تلاوت کرے، تو امید ہے کہ در ودیوار، شجر وحجر جھوم کر اس کے ساتھ نغمہ خوانی میں شریک ہوں، اور نغمۂ توحید پر جان نثار ہوں۔

بہرصورت! اسلام میں داخل ہونے کے لئے جس طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق ضروری ہے، اسی طرح گزشتہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے ادیان کی تصدیق لازمی ہے، کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مشن (دینی پروگرام) ایک ہی ہوتا ہے، اس لئے کسی ایک کی تصدیق سب کی تصدیق، اور کسی ایک کی تکذیب سب کی تکذیب کے مرادف ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ [البقرة:٢٨٥] (ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے)۔

اس آیت کریمہ میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کی واضح دلیل ہے، کیونکہ اس آیت کی رُو سے جس وحی پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہے، یا سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام پر۔ آنحضرت

پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے، اور نبوت کا دروازہ قیامت تک بند ہو گیا ہے۔ نہ کوئی برحق نبی آئے گا، اور نہ ہی کوئی وحی نازل ہوگی۔ آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ اگر جاری ہوتا، تو آیت کریمہ کی ترتیب یوں ہوتی: ﴿ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ مَا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾ قرآن کریم میں جب اس بات کا ذکر ہوا، تو ﴿ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ کے ساتھ ہوا، اور بس وہی آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ متقین کی پانچویں صفت ہے۔

''اَلْاٰخِرَة '' سے مراد ''دار الآخرۃ'' اور عالمِ آخرت، یعنی وہ عالم جو موجودہ سلسلۂ زندگی کے بعد شروع ہوگا۔ اسے آخرت اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ وہ اس ناسوتی زندگی کے بعد آئے گا (دنیا کے خاتمہ کے بعد آنے والا جہان) قرآن کریم میں کہیں صرف ''الآخرۃ '' کہیں ''دار الآخرۃ'' مذکور ہے، مراد دونوں کی ایک ہی ہے۔ جب دوسری جگہ یہ ''دَارُ الْاٰخِرَةِ '' کے ساتھ مذکور ہے، تو اس سے آخری وحی مراد لینا سراسر بہتان اور افتراء، بلکہ مکمل جھوٹ اور تحریفِ قرآن ہے، جیسے کہ مرزا قادیانی ملعون نے افتراء کیا ہے۔ اس منحوس کو کلمہ ''دار'' نظر نہیں آیا، یا قصداً اس نے ''اَلْاٰخِرَة '' سے آخری وحی مراد لی۔ فلعنة الله عليه وعلى متبعيه

﴿ يُوْقِنُوْنَ ﴾ بمعنی ''إیقان'' کے ہیں، لیکن یہ معنی ہرگز نہیں کہ محض عقل کسی عقیدہ کو استدلالاً مان لے، یا دماغ سرسری طور پر کسی چیز کو تسلیم کرے، بلکہ یقینِ کامل یہ ہے کہ اس مسئلہ پر دل وجان سے اعتقاد جم جائے، اور عقل، جذبات اور ارادہ سب پر تیقن چھا جائے، اور شک وگمان اور وہم وخیال کا وہاں کوئی گزر نہ ہو۔ اَلْيَقِيْنُ مِنْ صِفَةِ الْعِلْمِ فَوْقَ الْمَعْرِفَةِ وَالدِّرَايَةِ وَاَخَوَاتِهَا۔ [راغب] اَلْاِيْقَانُ اِتْقَانُ الْعِلْمِ بِانْتِفَاءِ الشَّكِّ وَالشُّبْهَةِ۔ [کشاف] یقین کا مرتبہ ویسے ہی علم سے بلند تھا، پھر ''بِالْاٰخِرَةِ '' کے تقدم ''يُوْقِنُوْنَ '' کے تاخر، اور ''هُمْ '' ضمیرِ منفصل کے تقدم سے کئی درجہ حصر وتاکید حاصل ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان متقین کے نزدیک آخرت اتنی اہم ہے گویا وہ اسی پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی عقیدہ ان کے قلوب میں رچا بسا رہتا ہے، جسے وہ کبھی نظر انداز اور فراموش نہیں کر سکتے، انہیں قیامت اور اس کا حساب و کتاب ہر وقت مستحضر رہتا ہے۔

عقیدۂ آخرت کی ضرورت واہمیت:

آخرت کا عقیدہ بڑا انقلابی عقیدہ ہے۔ اس کے ساتھ قانونِ مجازات، احتساب، جزاوسزا کا علم وایقان وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عقیدہ ایمان بالغیب کے تحت اگرچہ آچکا تھا، مگر اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے مستقل الگ

اہتمامًا لشانہ ذکر فرمایا گیا، کیونکہ ایمان کے مقتضیات پر عمل کا جذبہ اسی عقیدۂ آخرت ہی سے ابھرتا ہے۔

یہی وہ عظیم الشان مرکزی عقیدہ ہے، جو سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء علیہم السلام اور ان کی شریعتوں کا متفقہ انقلابی محور رہا ہے، اور اسی عقیدہ نے لوگوں کے اعمال واخلاق، کردار وگفتار اور عقیدہ وغیرہ کے سنوارنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے، اور مسلمانوں کی زندگی کا دھارا تبدیل کر کے انہیں حیرت انگیز ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

جن قوموں کی زندگی میں صرف دنیا کی عیش وعشرت اور ناز وتنعم کا عقیدہ رچا ہوا ہے، وہ ﴿عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [الروم:٧] ہیں، وہ عقیدۂ آخرت، حیات بعد الموت، مجازات جزا وسزا کے عقیدہ سے محروم اور منکر ہیں، اس لئے ان کے لئے سچ وجھوٹ، حلال وحرام اور جائز وناجائز سب یکساں اور برابر ہیں۔ ظلم وزیادتی، قتل وغارت، عصمت دری، بے حیائی وغیرہ سب جرائم ان کے لئے جائز اور مباح ہیں۔

ایک جنگلی درندہ صرف اپنے پیٹ کی خاطر دوسرے جانور کی جان لے لیتا ہے، اور اسے کھا کر اپنا پیٹ پالتا ہے، مگر آخرت کے منکر عیاش لوگ اپنے عیش وطرب اور تکمیلِ خواہشات کی خاطر بڑے بڑے شہروں اور آبادیوں پر بمباری، گولہ باری کر کے سکون محسوس کرتے ہیں۔ لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کی نیند سلا کر اطمینان وخوشی حاصل کرتے ہیں۔ اگر آخرت پر، یا حیات بعد الممات پر قانونِ مکافات وضابطۂ مجازات پر ان کا ایمان ہوتا، تو ان کا ہرگز یہ کردار نہ ہوتا، جسے آج کرۂ ارض مشاہدہ کر رہا ہے۔

ہمارے مسلمان سلاطین وبادشاہوں کے نیک اعمال، عدل وانصاف اور مردم نوازی تاریخ عالم کے اوراق کی جو زینت بنی ہوئی ہے، اس کی وجہ فقط یہی ایمان بالآخرۃ اور عقیدۂ آخرت ہی ہے۔ دیکھو! بسا اوقات تنہائیوں میں جہاں حکومت اور قانون کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے، اور کوئی متنفس دیکھنے والا بھی نہیں ہوتا، مگر احتساب ومحاسبہ اور عقیدۂ آخرت کا خوف وہاں جنگلوں میں بھی خواہشات پر چلنے اور نفسانی امنگوں کے پورا کرنے سے ہمیں روکتا ہے۔

نفس وشیطان ہزار مرتبہ یہ باور کرائیں کہ یہ برا کام انجام دو، تمہیں دیکھنے والا کوئی نہیں، مگر متقی مسلمان شرم محسوس کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ حقیقی دیکھنے والا مجھے دیکھ رہا ہے، اور یومِ آخرت کو مجھ سے ضرور محاسبہ فرمائے گا، وہ اسی عقیدہ پر گناہ کا عمل چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا خوف، فکرِ آخرت اور تصورِ احتساب وہ بنیادی فارمولے اور ضابطے ہیں، جن سے سارے جرائم ختم

ہو سکتے ہیں، اور جن سے پورا معاشرہ جنت کا منظر پیش کرے گا۔قرونِ اولیٰ کی تاریخ اس پر گواہ ہے، جہاں نہ باقاعدہ فوج تھی، نہ فورس، نہ پولیس اور نہ تھانوں کی کثرت، مگر جرائم ندارد۔آج فورسوں کی بھرمار اور حیران کن کثرت کے باوجود معاشرہ جہنم کا منظر پیش کررہا ہے۔امریکہ جیسے ملکوں میں جو تہذیب کے علمبردار مانے جاتے ہیں، ہر پانچ منٹ پر ڈکیتی اور ہر دومنٹ پر زنا بالجبر کا دوردورہ ہے۔سعودی عرب جیسے ملکوں میں پورے ہفتے میں ایک ڈکیتی یا زنا بالجبر نہیں ہوتا۔ایک حد تک اگرچہ قانون کی بالادستی کارفرما ہے، مگر اصل چیز ایمان بالآخرت، خوفِ خدا اور تقویٰ ہے۔

ہم روزمرہ مشاہدہ کررہے ہیں کہ جن ممالک میں احتساب کا قانون زندہ اور موجود ہے، وہاں نظم ونسق مثالی ہوتا ہے۔امن وسلامتی کا دوردورہ ہوتا ہے۔تمام جرائم مسدود ہوکر نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔اس کے برعکس جن ممالک میں قانون نہیں ہوتا، یا قانون تو ہوتا ہے، مگر اس پر عمل نہیں ہوتا، تو لوگ مکافات ومجازاتِ عمل سے خائف نہیں ہوتے، اور نتیجتاً وہ ممالک نہایت بدنام اور پستی وزوال پذیر ہوتے ہیں۔نظم ونسق کا نام ونشان نہیں ہوتا۔امن وامان تباہ ہوکر طوائف الملوکی کا دوردورہ ہوتا ہے۔سالانہ بجٹ پیش ہونے سے پہلے پہلے پورا بجٹ درندہ صفت انسانوں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔وہ اپنے آپ کو جنگل کے شیر ضرور کہتے ہوں گے، مگر ''این چنین شیرے خدا کے آفرید'' کا مصداق ہوں گے۔تو بنیادی طور پر عقیدۂ آخرت تمام خوبیوں اور حسنات کی بنیاد ہوتا ہے، اسی کی بدولت متقی مسلمان فرشتوں کے برابر درجہ ومقام حاصل کرتا ہے۔واللہ اعلم

﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں، اور یہی لوگ مکمل فلاح پانے والے ہیں)۔

''فلاح'' کلامِ عرب میں بڑے وسیع معنی کے لئے آتا ہے۔دنیا وآخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔امام لغت زبیدیؒ کا قول ہے کہ ائمۂ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ کلامِ عرب میں جامعیتِ خیر کے لئے ''فلاح'' سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں، ''لَيْسَ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ كَلِمَةٌ اَجْمَعُ مِنْ لَفْظَةِ الْفَلَاحِ لِخَيْرَيِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ كَمَا قَالَ اَئِمَّةُ اللِّسَانِ''۔[تاج العروس] سورۃ الفاتحۃ میں بندے نے ہدایت کی درخواست پیش کی ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ '' دعا قبول ہوئی۔کتابِ ہدایت نازل ہوئی ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ''۔اب ارشاد ہوا کہ فلاں فلاں علامتیں جن میں موجود ہوں وہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔

☆ ☆ ☆

متقین کی چھ علامات:

﴿اُولٰئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ان ہدایت یافتہ لوگوں کی خصوصیات (علامات) جو بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱)﴿الْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی زندہ دل، باضمیر لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے۔

(۲)﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ان کا اعتقاد اس مادی دنیا سے پرے ایک عالم غیب پر ہوتا ہے، وہ بن دیکھے مغیبات پر پورا ایمان لاتے ہیں۔

(۳)﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ ان کے تعلق مع اللہ تعالیٰ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ عملاً وہ اقامت صلوٰۃ کے پابند ہوتے ہیں۔

(۴)﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے فرمان کے مطابق خیر کے مصارف پر خرچ کرتے ہیں۔

(۵)﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ یہ رسول ﷺ کے رسولِ برحق اور بہترین معلم وہادی ہونے، اور قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔

(۶) ﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ پورے سلسلۂ وحی ونظامِ نبوت کی تصدیق کرتے ہیں۔

(۷) ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ یوم آخرت اور روزِ جزاء پر کامل اعتقاد ویقین رکھتے ہیں۔

یہی دنیا وآخرت، دونوں جہانوں میں بامراد وبامقصد اور فلاح پانے والے ہیں۔ دنیا کی فلاح یہ ہے کہ انہیں ہدایت جیسی نعمت نصیب ہوئی، آخرت کی فلاح جہنم سے ابدی نجات ہے۔ پھر دائمی جنتی نعمتوں کا حصول، نیز حضرت باری تعالیٰ کا قرب ورضا اور دیدارِ الٰہی کا حصول، پس معلوم ہونا چاہئے کہ علاماتِ ستہ مع الایمان کا جو ثمرہ ونتیجہ روزِ قیامت سامنے آئے گا، وہ یہی ابدی دائمی فوز وفلاح ہی ہوگا۔

فلاح کے مراتب ودرجات:

فلاح کے مراتب ودرجات جو محققین علماء امت نے بیان کئے ہیں، یعنی وہ خوش قسمت لوگ جن کو فلاح وفوز حاصل ہو، انہیں سعید وسعداء (نیک بخت) کہتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم مقربین وسابقین کی، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾

[الواقعة:۱۱] (جو سبقت لے جانے والے ہیں، وہ تو ہیں ہی سبقت لے جانے والے)۔

دوسری قسم اُصحاب الیمین، جن کو اُصحاب المیمنہ و متصدقین بھی کہتے ہیں۔ پھر مقربین کی بھی دو قسمیں ہیں:

اول "مجتبیٰ" دوم "منیب"، جیسے ارشاد ہے: ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ [الشوریٰ:۱۳] (اللہ جس کو چاہتا ہے چن کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اور جو کوئی اس سے لولگا تا ہے اسے اپنے پاس پہنچادیتا ہے)۔ اہلِ سلوک مجتبیٰ کو محبوب (مراد) اور منیب کو محبّ (مرید) کہتے ہیں، اور کبھی مجذوب اور سالک بھی کہتے ہیں۔ یہ لوگ انبیاء و صدّیقین ہیں۔ اسی طرح اُصحاب الیمین کی بھی کئی قسمیں ہیں:

☆ اول: "اہلِ فضل و ثواب" کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مقصود کو پہنچتے ہیں، اور اسی امید پر ایمان و اعمال صالحہ عمل میں لاتے ہیں۔

☆ دوم: "اہلِ عفو" کہ جن کے اچھے اعمال میں کچھ بُرے اعمال بھی شامل ہیں، مگر یا تو ان کی قوت ایمانی اور نورِ معرفت اور رجاءِ صادق سے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کو معاف کردیتا ہے، یا توبہ اور اس کے مقابلہ میں گریہ وزاری اور اعمال صالحہ سے وہ داغ مٹ جاتا ہے، چنانچہ ارشادِ خداندی ہے: ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ﴾ [التوبة:۱۰۲] (انہوں نے اچھے برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا، قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے) اس آیت کا مصداق یہی لوگ ہیں۔ اور ﴿فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ [الفرقان:۷۰] (تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو خدا نیکیوں سے بدل دے گا۔ انہی کے حق میں فرمایا ہے۔

☆ سوم: معذبین، جنہیں بقدرِ گناہ عذاب ہوگا، اور یہ عذاب کبھی تو دنیا ہی میں بصورتِ مالی نقصان و بدنی بیماری و خواری و پریشانی اور ہر قسم کے رنج و غم کی صورت میں ہوگا، اور اس عذابِ دنیوی کے بدلے گناہوں سے صاف و پاک ہوجائے گا، جیسے کہ آیات و احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اور کبھی مؤمن کی روح پر ایک عجیب وحشت و دہشت اور سخت بے چینی اور تأسف لاحق حال ہوجاتا ہے، سو وہ بھی اس کا کفارہ ہوجاتا ہے، اور کبھی آخرت میں وہ برے اعمال آگ، سانپ اور بچھو کی صورت میں ظہور کر کے اس کی روح کو صدمہ پہنچاتے ہیں، اور جب ایک مدت تک اس تکلیف کو پالیتا ہے، تو پھر روح منور ہوجاتی ہے، جنت میں آرام پاتی ہے، اور انبیاء و اولیاء اور ملائکہ کی شفاعت سے خلاصی ہوجاتی ہے۔ ان پانچ گروہوں کا حال ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اور ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ اسی طرح ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں آگیا۔ [حقانی]

''الٓمّٓ'' سے ''الْمُفْلِحُوْنَ'' تک پکے سچے خوش قسمت مسلمانوں کا ذکر تھا، جنہوں نے زبان اور دل سے تصدیق واقرار کیا، اعمالِ صالحہ بجالائے، اور منہیات ومعاصی سے کنارہ کشی اختیار کی، جن کا راستہ سورۃ الفاتحۃ کی آیت ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں طلب کیا گیا تھا، اور آئندہ دو آیتوں میں ان باغیوں کا بیان ہے، جنہوں نے بدقسمتی سے نہ صرف یہ کہ زبان ودل سے دینِ مبین اور توحیدِ الٰہی اور کتابِ ہدایت کا انکار کر کے کھلم کھلا کافر رہے، بلکہ عناد وضد کی حد تک کفر وجحود اختیار کیا، جن کے راستے سے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ﴾ میں پناہ مانگی گئی تھی، ''وَبِضِدِّهَا تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ خَتَمَ
اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞

ترجمہ: بیشک! وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا یکساں، ان کے لئے کہ آپ انہیں (کفر کے خطرناک انجام سے) ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے (ان کے انکار وتکذیب کے باعث) ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے ⑦

معارف ومنازل

یہاں ہم متقین اور منکرین کی صفات اور تصاویر میں مکمل تقابل پاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ کتابِ الٰہی متقین کے لئے ہدایت ہے، جبکہ منکرین کے لئے (بہ سبب انکار) خسارہ ونقصان ہے، تب ہی تو اِنذار وعدمِ اِنذار ان کے لئے برابر ہے۔ ہدایت، نماز، زکوٰۃ، تقویٰ اور صدقات کے دریچے متقین کے لئے کھلے ہیں، جبکہ منکرین کے لئے بالکل بند ہیں۔

ایمان بالرُّسل وبالکتب السماویہ اور یقین بالآخرۃ متقین کے لئے طُرّۂ امتیاز اور صفاتِ لازمہ قرار پائے، جبکہ منکرین نے ان سارے اقدار کی تکذیب کی، اسی بنیاد پر متقین نے ابدی فلاح وسعادت پائی، اور منکرین کو ابدی شقاوت کے علاوہ کچھ بھی نہ ملا۔ اب مخلصین متقین کے بیان کے بعد منکرین وکاذبین کا بیان ہو رہا ہے، جن کی دو قسمیں ہیں: اول وہ جو ظاہراً وباطناً منکرینِ حق ہیں۔ دوم وہ جو ظاہراً مسلمان اور باطناً منکر ہیں۔ پہلی قسم کفار جبکہ دوسری قسم

منافقین کہلاتے ہیں۔ پوری کائنات میں ایمان سے بڑھ کر کوئی پسندیدہ اور قیمتی چیز نہیں ہے، اور کفر جیسی مذموم و ناپاک کوئی چیز نہیں، "قولہ تعالی: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ [التوبة:۲۸] (بیشک مشرک لوگ ناپاک ہیں)۔ اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ دنیا کے سارے کافروں پر ایک ادنیٰ موحد مسلمان بھاری اور قیمتی ہے، اربوں کھربوں کافر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ادنیٰ مسلمان کے برابر نہیں ہوسکتے۔ [الحدیث]

کفر کی اقسام:

ایمان واسلام چونکہ برحق ہیں، اور حق میں تعدد کی گنجائش نہیں۔ حق ہمیشہ ایک ہوتا ہے، لہٰذا ایمان وحق کی متعدد اقسام نہیں ہوتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اعمال وحسنات کے اعتبار سے سارے مسلمان ایک جیسے برابر نہیں ہوتے، بخلاف باطل (کفر) کے، کہ اس میں ہر قسم کا تعدد اور اس کی کئی اقسام ہوتی ہیں، اسی بناء پر کتبِ تفسیر وعقائد میں کفر کی سرسری اقسام جو بیان ہوئی ہیں، وہ دس ہیں: (۱) کفرِ انکار (۲) کفرِ جحود (۳) کفرِ عناد (۴) کفرِ نفاق (۵) کفرِ جہالت (۶) کفرِ شک (۷) کفرِ اِلحاد (۸) کفرِ زندقہ، (۹) کفرِ تاویل، (۱۰) کفرِ عمل۔

(۱) کفرِ انکار:

کفرِ انکار کے معنی ہیں: زبان اور قلب دونوں سے شریعت کی قطعی چیزوں کا انکار کرنا ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [الآیة] سے یہی قسم مراد ہے، جیسے عام کفار۔

(۲) کفرِ جحود:

کفرِ جحود یہ ہے کہ آدمی دل سے پہچانتا ہے، اور سمجھتا بھی ہے کہ بات صحیح، سچی اور برحق ہے، مگر وہ زبان سے اقرار نہیں کرتا۔ مشرکینِ مکہ کا کفر اسی قسم کا تھا، اسی طرح فرعونیوں کے بارے میں ہے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ [النمل:۱۴] (اور بے انصافی اور غرور سے انہوں نے انکار کیا)۔ وہ دل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برحق سمجھتے تھے، مگر زبان سے انکار ہی کرتے تھے۔ یہی حال کفارِ قریش ابوجہل وغیرہ کا تھا۔ یہ انکار ظلم اور تعدی کی بناء پر تھا، اسی طرح یہود ونصاریٰ اور ابلیس لعین کا کفر بھی کفرِ جحود ہی کا حصہ رہا ہے، اور رہے گا۔

ہمارے زمانہ کے مستشرقین عیسائی بڑے عالم ہوتے ہیں، جن میں سے بعض نے قرآن کریم کے علوم اور احادیث پر عمدہ عمدہ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً "رستم سلیم باز" نے مجلة الأحكام کی شرح لکھی ہے، اور ایک عیسائی

مؤلف نے "المعجم المفهرس لألفاظ الحديث" ۸ جلدوں میں، اور اسی طرح "المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم"، اور ایک عیسائی مؤلف نے امام غزالیؒ کی کتاب (احیاء العلوم) کی شرح لکھی ہے، اسی طرح "المنجد فی اللغة" اور "دائرة المعارف بستانی" ۱۵ جلدوں میں، یہ سارے عیسائی ہیں، مگر اسلام سے برگشتہ اور محروم رہے۔ ان سب کا کفر جحودی ہی ہے۔

(۳) کفر عناد:

کفر عناد یہ ہے کہ دل سے پہچانتا بھی ہے، زبان سے اقرار بھی کرتا ہے کہ دینِ اسلام برحق ہے، مگر قبول نہیں کرتا۔ مطلب یہ کہ جانتا ہے، مانتا نہیں ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غمگسار چچا ابوطالب ایسے ہی تھے، انہوں نے سب کچھ جانتے ہوئے اسلام قبول نہیں کیا، وہ محض اس ڈر سے مسلمان نہیں ہوئے کہ مجھے عورتیں ملامت کریں گی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر چند انہیں سمجھایا، مگر وہ بدقسمت ثابت ہوئے۔

(۴) کفر نفاق:

کفر نفاق کا تذکرہ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾ میں آرہا ہے، اور یہ نفاق بڑے خطرناک قسم کے کفر کا نام ہے، کہ زبان سے اقرار بھی ہے، ظاہری اعمال (نماز، روزہ، زکوٰۃ، وغیرہ) بھی ادا کرتا ہے، مگر دل میں بجائے تصدیق کے تکذیب وانکار ہے۔ پھر یہ نفاق دو قسم پر ہے: اعتقادی نفاق، عملی نفاق۔ قسم اوّل کا شمار کفر میں ہے، جبکہ قسم دوم کا شمار فسق میں ہے، جس کا بیان آخر میں آنے والا ہے، یعنی عملی کفر کا۔ یہ چاروں اقسام کفرِ حقیقی کی ہیں، ان میں سے ہر ایک ابدی خلود فی النار کا سبب ہے، اور ان کا مرتکب ہر قسم کی رحمتِ الٰہی اور شفاعتِ نبوی سے محروم ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء:۱۱۶] (بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک کیا جائے، اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا) مشرک کی بخشش کسی صورت میں نہیں ہوگی۔ البتہ! دیگر ہر قسم کے کبیرہ گناہوں کی مغفرت ممکن ہے، اس سلسلہ میں شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان قابلِ دید ہے۔

(۵) کفر شک:

کفر شک بھی کفر کی ایک قسم ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ﴾ [التوبة: ۴۵] (اور ان کے دل شک میں پڑے ہیں، تو وہ اپنے شک میں ڈانواں ڈول ہیں)۔ ﴿بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ﴾ [الدخان: ۹] (بلکہ

وہ شک میں پڑے کھیل رہے ہیں)۔ یہ لوگ شک میں کھیل رہے ہیں، ایسے لوگوں کے پاس نہ تصدیق ہے، نہ تکذیب، بلکہ شک وتردد ہے، اور یہ سراسر کفر ہی ہے، کیونکہ شک ضد ہے یقین کی، اور ایمان کے لئے یقین کا ہونا لازمی ہے۔

(٦) کفر جہالت:

کفر جہالت یہ وہ لوگ کرتے ہیں جو علم کو عبث سمجھتے ہیں۔ قصداً علم حاصل نہیں کرتے، اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا: ﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل:۷۵] (بلکہ ان کے اکثر جانتے نہیں)۔

(۷،۸،۹) کفرِ تاویل، کفرِ الحاد، کفرِ زندقہ:

کفرِ تاویل میں کفر الحاد اور کفر زندقہ بھی داخل ہیں۔ یہ وہ کافر، ملحد اور زندیق لوگ ہیں، جو قرآن وحدیث کے مضامین وکلمات کی ایسی بے سروپا غلط تاویل کرتے ہیں، جو تحریف کے زمرے میں آتی ہے، جیسے قادیانی مرزا غلام کے ماننے والے مرتد ہیں، جن کی تاویلی تحریفات اتنی بکثرت ہیں، جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح منکرینِ حدیث، پرویزی جماعت جو اللہ تعالیٰ سے مراد قانون لیتے ہیں، اور نماز کو ورزش، اور زکوٰۃ کو ٹیکس کہتے ہیں، جنت ودوزخ، فرشتوں اور جنات کا انکار کرتے ہیں، اور دیگر بے شمار غلط تاویلات کے ذریعے اکثر وبیشتر اجماعی مسائل کا انکار کرتے ہیں، اور جہاد جیسے فریضہ کو حرام اور دہشت گردی قرار دیتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سارے غیر اسلامی فرقے یا اشخاص ہیں، جو قطعی الثبوت مسلمہ اجماعی مسائل میں تحریف کے مرتکب ہیں، یا انہیں نہیں مانتے، اور یہ پہلے بیان ہوا تھا کہ ایمان کے لئے تو ان تمام باتوں کو قبول کرنا ضروری ہے جن کا ثبوت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قطعیت کے ساتھ ہو، لیکن کفر کے لئے تمام قطعی باتوں کا انکار ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف ایک ہی قطعی بات کے انکار سے (یا ایسی غلط تاویل سے جس سے کسی حکم کا انکار لازم آتا ہو) بھی آدمی کافر ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں رسالہ ''اِکفار الملحدین'' حضرت کشمیری نور اللہ مرقدہ کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

یاد رہے! اسلام بمنزلۂ صحت وتندرستی کے ہے، کفر ایک مرض اور بیماری ہے۔ ایک شخص کو ہم تندرست اس وقت کہہ سکتے ہیں، جب اس میں کسی قسم کا مرض نہ ہو، اور کسی شخص کو مریض کہنے کے لئے ضروری نہیں کہ تمام بیماریاں اس میں موجود ہوں، بلکہ ایک معمولی مرض کی موجودگی سے بھی اُسے مریض شمار کرسکتے ہیں۔ اگر کوئی صرف زکام کا شکار ہو، تو اسے بیمار شمار کیا جائے گا۔

الغرض! کفرِ تأویل سے مراد یہ ہے کہ نصوص قرآنیہ، یا احادیث کا ایسا مطلب لیا جائے جو نہ رحمت عالم ﷺ سے منقول ہو، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے، اور نہ سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم سے ثابت ہو، یا وہ تأویلی معنی جو ان برگزیدہ ہستیوں کی تصریحات کی نفی کرتا ہو، اور ان کے فرمودات کے خلاف ہو، ایسی تأویل کفر الحاد وزندقہ میں شامل ہوگی، جیسے کہ سرسید احمد خان نے بہشت کے معنی مسرت اور خوشی بیان کی ہے۔ دوزخ کو غم اور پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔ خوشی ومسرت نیک اعمال کا صلہ ہے۔ رنج وغم برے اعمال کا نتیجہ شمار ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک جنت ودوزخ کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ یہ بھی ملحدانہ کفریہ عقیدہ ہے، سرسید کے اور بھی بے شمار خرافات ہیں۔ نعوذ باللہ منہ

(۱۰) کفرِ عمل:

کفرِ عمل دراصل کفر کے لغوی معنی یعنی ناشکری، ناسپاسی کے مترادف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نعمت کی قدر دانی کے بجائے اس کی ناشکری کی جائے۔ کسی صحابیؓ نے سرور عالم ﷺ سے عورتوں کا کثرت کے ساتھ جہنم میں داخل ہونے کا سبب دریافت کیا، تو آپ ﷺ نے اس کا سبب کفران العشیر، یعنی خاوند کی ناشکری بتایا، کیونکہ اکثر عورتیں اس قسم کے کفر میں مبتلا ہوتی ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے: "تَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ"۔ [بخاری]

خاوند بیچارہ سوسال تک بھی بالفرض! انہیں راحت وآرام مہیا کرتا رہے، اگر ایک مرتبہ بھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی معمولی بات ہوگئی، یا معمولی فرمائش نظر انداز ہوگئی، تو سمجھو کہ بیچارے خاوند پر قیامت آگئی۔ صورِ اسرافیل سے پہلے یہ قیامت صغریٰ برپا کرتی ہے، کہ میں نے اس گھر میں آکر کبھی سکون نہیں پایا، بیک جنبشِ قلم سوسالہ احسانات پر پانی پھیر کر کہتی ہے: "مَارَئَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ"۔ [متفق علیہ] (میں نے تجھ سے کبھی بھی خیر نہیں دیکھی)۔

اسی طرح ترکِ نماز وصوم، ترکِ حج وزکوٰۃ، اور دیگر لوازم وفرائض شرعیہ کا ترک، یا منہیات ومعاصی کا ارتکاب، مثلاً زنا، شراب، جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی کا ارتکاب، اور محرمات شرعیہ وغیرہ بھی کفرِ عملی کا حصہ شمار ہوں گے۔ اس کو کفر اور فسق دونوں سے تعبیر کر سکتے ہیں، مگر یہ اعتقادی کفر کا حصہ نہیں، صرف عملی کفر وفسق ہی شمار ہوگا۔ مزید تفصیل اپنے موقعہ پر۔ واللہ اعلم

کفار کی دو قسمیں ہیں:

آیت کریمہ میں ﴿كَفَرُوْا﴾ کا کلمہ اپنے عموم پر ہے۔ عرب کے مشرک کافروں کو بھی شامل ہے، اور یہودی و

عیسائی اہلِ کتاب کافروں کو بھی، پھر یہ کفار دو قسم پر ہیں:

پہلا طبقہ زمانۂ رسالت سے لے کر قیامت تک آنے والے وہ کفار جن کے قلوب پر حق سبحانہ نے مہر لگائی ہے، ان کے ایمان لانے کی کوئی امید نہیں۔

دوسرا طبقہ زمانۂ رسالت سے قیامت تک آنے والے وہ کفار جن کے قلوب پر مہر نہیں لگائی گئی، چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً جزوی طور پر ہر زمانے میں اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ صفتِ اِنذار اگرچہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی خاصیت ہے، اور آپؐ کی طرف منسوب ہے، مگر قیامت تک آنے والے آپ ﷺ کے ورثاء، خلفاء، نائبین اور علماء کرام کو بالواسطہ شامل ہے، کیونکہ عملِ اِنذار و تبشیر قیامت تک جاری رہے گا، اور آپ ﷺ نے ”بَشِّرُوْا وَ لَاتُنَفِّرُوْا یَسِّرُوْا وَ لَاتُعَسِّرُوْا“ کا جو پیغام امت کو دیا تھا، اس کا تعلق صرف آپ ﷺ کے زمانہ کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ آپ کا یہ حکم اور دیگر عمومی احکام قیامت تک کے لئے ہوتے ہیں، تو ﴿ءَاَنْذَرْتَهُمْ﴾ بمعنی ”اَنْذَرْتُمُوْهُم“ ہوگا۔

پس ﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ کا تعلق کفار کے طبقۂ اول کے ساتھ ہے، جو کہ مہر زدہ ہیں۔ قسم دوم کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہوگا، جیسا کہ ظاہر ہے۔ آیت کریمہ کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ سارے انسان مکلف ہیں، مرفوع القلم کوئی نہیں، ہاں! معدودے چند، جیسے نابالغ، یا مجنون و مخبوط الحواس، وغیرہ۔

اس شبہ کا (کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی ان ک دلوں پر مہر ثبت کردی ہے تو یہ اپنے ایمان لانے اور کفر کرنے میں معذور ہیں) دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر انسان کی پیدائشی فطرت و استعداد اسلام ہے۔ [بخاری]

سوئم یہ کہ انسان اپنے افعال کا خود کاسب ہے، اور وہ با اختیار ہے۔

چہارم یہ کہ وہ اپنے اختیار کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے اسی عمل کے مطابق افعال (تخلیق) کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

پنجم یہ کہ اللہ تعالیٰ شانہ اپنے علمِ محیط کی بناء پر اگر آئندہ آنے والی کسی بات کی اطلاع دیتا ہے، تو یہ اطلاع محض اخبار کے درجہ میں ہوگی، وہ کسی انسانی عمل کی علت یا تخلیق نہیں ہوگی۔

• ششم یہ کہ انسان اپنے ارادے سے جو خیر یا شر کا عمل انجام دے گا، اس کے اچھے برے نتیجہ کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، کوئی اور نہیں۔

ہفتم یہ کہ انسان کی تخلیقی (پیدائشی) فطرت اگرچہ اسلام ہے، مگر وہ قضاء مبرم کی طرح نہیں ”فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِه

اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ۔ [بخاري] حدیث کے الفاظ یہی پیغام دے رہے ہیں کہ یہ فطری اسلام ہر قسم کی خیانت وکفر میں تبدیل ہوسکتا ہے، اور انسان اپنی مرضی واختیار سے اگر چاہے تو اس مبارک فطری استعداد کو ضائع بھی کرسکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہے گا، کہ کافر انسان سرکشی اور طغیانی کی وجہ سے اس مقام پر پہنچ کر دم لے گا کہ گناہوں اور سرکشیوں کی وجہ سے اس کے دل ودماغ پر مہر لگ جائے گی۔ یہ مہر پیدائشی نہیں (غیر اختیاری پیدائشی) بلکہ اختیاری، کسبی اور عملی شمار ہوگی۔ پس اس کا فاعل اور کاسب وہ خود ہوگا۔ البتہ! خلق کی نسبت حضرت حق سبحانہ جل جلالہ کی طرف ہوگی۔

مطلب واضح ہے کہ ''خَتَمَ اللّٰہُ'' کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر کاسب وفاعل خود کافر ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اس ختم کا دفاع کرسکتا تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنے قلب پر ہدایت کے بجائے یہ منحوس مہر خود لگوائی، ﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [النحل:۱۱۸] فرمایا: ﴿فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ [فصلت:۱۷] اَیْ خَیَّرَهُمْ بَیْنَ الْهِدَایَةِ وَالضَّلَالَةِ فَاخْتَارُوا الضَّلَالَةَ وَهُمْ مُكَلَّفُوْنَ۔ اسی وجہ سے ان کے لئے اِنذار کا حکم باقی ہے، وہ اگرچہ ایمان نہیں لائیں گے، مگر مکلف ہر حال میں رہیں گے، تاکہ ان پر مکمل اتمامِ حجت ہو، اور ڈرانے والوں کو تبلیغ کا اجر وثواب بدستور جاری رہے۔

تو آیت کریمہ میں ﴿سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ﴾ فرمایا ہے سَوَاءٌ عَلَیْکَ نہیں فرمایا، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کے نزول کے بعد بھی بدستور تبلیغ فرماتے رہے، کیونکہ دعوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بنیادی حق ہے، اور رفعِ درجات کے ساتھ اس کا بڑا اہم اجر وثواب بھی ہے، خواہ کوئی قبول کرے، یا نہ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کسی کے قبول کرنے کے ساتھ ہرگز معلق نہیں ہے۔ اور یہ خاصیت سارے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے خلفاء وجانشین حضرات کی دعوت کی ہے، تو یہاں تسلی کے طور پر کہا جارہا ہے کہ نہ قرآن حکیم کی ہدایت میں کسی کمی کا امکان ہے، اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت وتبلیغ کا کوئی قصور ہے۔

پس لوگوں کا ایمان وہدایت قبول نہ کرنا ان کی سرکشی وضلالت کی وجہ سے ہے، جنہوں نے اپنی سرکشی کی بناء پر اسلام اور دینی وفطری استعداد ضائع کردی، اس لئے اب اس پر یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جب خود اللہ تعالیٰ شانہ نے ہی ان کے دلوں پر مہر ثبت کردی ہے، اور ظاہری وباطنی حواس کو ماؤف وناکارہ کردیا ہے، تو یہ اپنے ایمان نہ لانے اور کفر کرنے میں معذور ہوگئے، اور مکلف ہی نہ رہے، کیونکہ مکلف ہونے کے لئے قدرت شرط ہے، اور وہ یہاں مفقود

ہے، پھران کو عذاب کیسا؟ ان ساری باتوں کا جواب ہوگیا۔اب کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں! جیسے کوئی ماہرڈاکٹر یا طبیب کسی مرض کی تشخیص کر کے یہ بتائے کہ یہ مرض اپنی انتہاء کو پہنچا ہوا ہے، اب یہ مریض لاعلاج ہے، یہ نہیں بچ سکتا، چنانچہ دو تین دن میں مریض فوت ہوا، تو مریض کی موت کا سبب ڈاکٹر نہیں، ڈاکٹر نے اسے نہیں مروایا، اور نہ ہی ڈاکٹر کے کہنے سے وہ مرگیا، بلکہ اس کی موت کا سبب اس کی غفلت ولا پرواہی، اور اس کی بد پرہیزی و بے احتیاطی ہے۔ڈاکٹر نے محض حقائق کو دیکھ کر اس کی موت کی خبر دے دی۔اسی طرح ان ظالموں کے ایمان نہ لانے کا سبب اللہ تعالیٰ کی خبر اور مہر قلبی نہیں، بلکہ ان کا کفر وعناد، ہٹ دھرمی اور مسلسل حق سے بیزاری ہے، جس سے بطور عذاب ونتیجہ ان کے قلوب سیاہ ہو گئے، اور فطری استعداد ختم ہوگئی۔

یہ قانون وضابطہ محض یہاں نہیں ہے، بلکہ دینی ودنیوی بہت سے امور میں رائج ہے۔ایک ماہر استاذ اپنے شاگرد کی غفلت ولا پرواہی دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ تو امتحان میں فیل ہوگا۔ایک ماہر انجینئر کسی مکان اور پل کو دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ منہدم ہوجائے گا، وغیر ذلک۔

واضح ہو کہ لوگ تجربہ اور علمِ ریاضی کی بنیاد پر دائمی نقشہ اوقاتِ صلوٰۃ، طلوع وغروب تیار کرتے ہیں، تو کیا سورج پر وہ حکمران ہیں، یا وہ سورج کو مجبور کئے ہوئے ہیں، کہ ہمارے نقشہ کے مطابق وہ طلوع وغروب کا پابند ہو؟ ہرگز نہیں۔سورج کا طلوع وغروب اپنا ہے، وہ کسی کے کہنے پر نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ محیط کی بناء پر قبل از وقت خبر دے دی ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی اپنے عمل واختیار کے ساتھ، ربّ العزّت نے ان کا اختیار سلب نہیں فرمایا، جس طرح ایک انسان بد پرہیزی کر کے اپنی صحت کو تباہ کرتا ہے، تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے، نہ کہ کوئی اور، اسی طرح ایک کافر اپنی پیدائشی فطرت اسلامی کو شرک ونفاق اور دیگر گناہوں سے تباہ کرتا ہے، حتیٰ کہ روحانی صحت کو فناء کر کے اپنے حواس پر مہر لگواتا ہے، تو اس کا ذمہ دار بھی وہ خود ہے، کوئی اور نہیں۔

ایک بنیادی ضابطہ سلب توفیق:

یہ موجودہ دنیا دار العمل ہے، دار الجزاء نہیں ہے۔انسانوں کے سارے اعمال کی اصل جزاوسزا تو آخرت میں ملے گی، مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی مل جاتی ہے، پھر یہ دنیا کی سزا بعض اوقات یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ اصلاحِ حال اور ہدایت کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، انسان آخرت کے محاسبہ سے بے فکر ہو کر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کی برائی کا احساس بھی اس کے دل سے جاتا رہتا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا ☆ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

علماء کرام نے ارشاد فرمایا ہے: ”اِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّیِّئَةِ السَّیِّئَةُ بَعْدَهَا وَاِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةُ بَعْدَهَا“۔ یعنی گناہ کی ایک دنیوی سزا یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے، جسے گناہ بالائے گناہ کہتے ہیں۔ دراصل یہ شقاوت کا پیش خیمہ ہوتا ہے (نعوذ باللہ)۔ جس طرح نیکی کا نقد بدلہ دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے، یعنی نیکی پر نیکی، دراصل یہ سعادت کا پیش خیمہ ہوتا ہے، ہمیں اللہ ربّ العزّت نصیب کرے۔ آمین

حدیث شریف میں آیا ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے (جیسے ترکِ صلوٰۃ، ترکِ جمعہ، یا اور کوئی گناہ) تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، اس طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ اور سخت ہو جاتا ہے، پھر نیکی بدی کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیکیوں سے نفرت اور گناہوں کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی ہے ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الأعراف:۱۷۹] (ان کے دل ہیں، لیکن ان سے سمجھتے نہیں ہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں، مگر ان سے دیکھتے نہیں ہیں، اور ان کے کان ہیں، پر ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ بالکل چارپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں)۔ یہ دل کی سیاہی پورے اعضائے بدن آنکھوں، دماغ اور کانوں وغیرہ تک پھیل کر سب کا احاطہ کر کے انہیں ناکارہ، بے حس اور ماؤف بنا کر رکھ دیتی ہے۔

قوتِ بصارت، قوتِ فہم و بصیرت اور قوت سماعت سب پر آفت نازل ہوگی، اور جیتا جاگتا سمجھدار عاقل انسان جانوروں سے نیچے گر کر ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ﴾ [التین:۵] (پھر ہم اسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں) کے گڑھے میں گرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی کو ﴿بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ﴾ [المطففین:۱۴] (بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے) سے تعبیر فرمایا۔ [ترمذی، مشکوٰۃ]

اگر گناہ گار نے اول و دوم نقطے پر توبہ کر لی، تو معافی کا واضح امکان ہے، کیونکہ غفور و رحیم عزّ شانہ اکثر و بیشتر توبہ قبول فرما کر کبھی رد نہیں فرماتے۔ [قرطبی] اگر توبہ کی توفیق سلب ہوئی، تو حسب مراتب نتیجہ بہت ہی برا ہوگا، اور

معاملہ (العیاذ باللہ) بغاوت وکفر تک پہنچ جائے گا۔ (نعوذ باللہ)

حدیث شریف میں ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے مخلوق کو ظلمت میں پیدا فرمایا، پھر ان پر اپنا نور ڈالا، پس جس شخص پر وہ نور پڑ گیا، اس نے ہدایت پائی، اور جس پر وہ نور نہ پڑا، وہ گمراہ ہوا، اور میں اس لئے کہتا ہوں کہ احکامِ ازلیہ پر قلم خشک ہو گیا۔ [ترمذي، أحمد]

پس معلوم ہوا کہ کسی چیز کی معرفت وشناخت کے عمومی اسباب تین ہیں: (۱) حواسِ ظاہرہ (۲) حواس باطنہ بشمولِ عقل وفہم (۳) خبرِ صادق۔

منکرینِ توحید کفار نے اپنے گناہوں اور سرکشی کی وجہ سے حواس باطنہ خود ضائع کر کے اپنے قلوب وعقل پر مہر لگوائی۔ مخبرِ صادق کی باتوں کو سمجھنے اور یقین کرنے کا ذریعہ سماعت ہے، انہوں نے یہ بھی اپنی سرکشی کی بنیاد پر ضائع کر دی، اور اپنے کانوں پر بھی مہر لگوائی۔

تیسرا سبب بصارت ہے، انہوں نے اس کو بھی ضائع کیا۔ مظاہرِ قدرت اور معجزات کے دیکھنے کا اہتمام نہیں کیا، تو ان کی آنکھوں پر بطورِ عذاب وتہدید پردہ پڑ گیا، جب افہام وتفہیم کے سارے دروازے بند ہو گئے، تو ہدایت کس طرح حاصل ہو؟ کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ تو نتیجہ یہی نکلا کہ: ''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' جیسے کہ ارشاد ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ [الأعراف:۱۷۹] (ان کے دل ہیں، لیکن ان سے سمجھتے نہیں ہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں، مگر ان سے دیکھتے نہیں ہیں، اور ان کے کان ہیں، پر ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ بالکل چارپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔)

فائدہ:

مہر ایسی چیز پر لگائی جاتی ہے، جس پر ہر طرف سے تصرف ہو سکے۔ پس مہر اس کو ہر طرف سے بند کر دیتی ہے، چونکہ دل اور کان ہر طرف سے ادراک اور سماعت کر سکتے ہیں، اور ان دونوں کے لئے کوئی خاص جہت بھی متعین نہیں ہے، اس لئے ان پر مہر لگانا فرمایا، اور آنکھ کی جہت چونکہ مخصوص ہے، صرف آمنے سامنے سے دیکھتی ہے، تو اس پر ﴿غِشَاوَةٌ﴾ پردہ کا حکم لگایا، کہ صرف سامنے سے پردہ لگایا گیا ہے۔

پھر قلوب جمع ہے ''سمع'' واحد ہے، اور اَبصار پھر جمع کا صیغہ ہے، چونکہ قلب کی حالت تو ہر شخص کی الگ الگ

ہے، لہٰذا بہت لوگوں کی وجہ سے اسے جمع لایا گیا، اور کان اگرچہ ہر انسان کے دو ہیں، مگر ان دونوں کی سماعت اکٹھی ہوتی ہے، ان کا مرکز ایک ہے، لہٰذا اس کو واحد ذکر فرمایا گیا، اور آنکھیں دو الگ الگ ہیں۔ ان دونوں سے اکٹھا بھی کام لیا جاسکتا ہے، اور ایک بند کر کے کسی ایک سے بھی دیکھا جاسکتا ہے، تو حالات مختلف ہوئے، لہٰذا ان کیلئے جمع کا لفظ استعمال ہوا۔ یہ ایک جزئی توجیہہ ہے، ہر جگہ کارآمد نہیں ہے، کیونکہ دوسرے مقام پر اس کے خلاف وارد ہے، مثلاً: ﴿وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ [الجاثية: ۲۳] (اور مہر لگادی ہے اس کے کان اور دل پر، اور پردہ لگایا ہے اس کی آنکھوں پر)۔

❀ ❀ ❀

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ⑧ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ⑨ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ
مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ
قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫

ترجمہ: اور بعض لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر، حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں ⑧ وہ دھوکہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کو، اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے، اور حقیقت میں وہ نہیں دھوکا دیتے مگر اپنی جانوں کو، اور وہ سمجھتے بھی نہیں ⑨ ان کے دلوں میں بیماری ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں ⑩ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد مت کرو، تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح ہی کرنے والے ہیں ⑪ خبردار! بلاشبہ یہی لوگ مفسد ہیں، لیکن نہیں سمجھتے ہیں ⑫

معارف ومنازل

ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ پہلا گروہ، وہ ہے جو ظاہراً و باطناً ہدایت کو قبول کرتا ہے، وہ مؤمن اور متقی لوگوں کا گروہ ہے۔ سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال بیان ہوا ہے، دوسرا گروہ، وہ ہے جو ظاہراً و باطناً ہدایتِ الٰہی کا انکار کرتا ہے، وہ کافروں کا گروہ ہے۔ اگلی دو آیات میں ان کا حال بیان

ہو چکا ہے، اب ان تیرہ آیات میں تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ ہے، جو ظاہر میں تو ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں، مگر ان کے باطن میں کفر کی تاریکی موجزن ہے۔ آئندہ تیرہ آیتوں میں ان کی خرابیاں، مکر وفریب، چالبازی اور سازشوں کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مثالوں کے ذریعہ سارا معاملہ ذکر فرمایا ہے۔

اس طبقہ کے حالات قرآن کریم میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ سورت منافقون کے نام سے مستقل ایک سورت انہی گمراہوں کے نام پر ہے۔ سورۂ براءت اور دیگر کئی سورتوں میں بھی ان کی چالبازی، مکرو فریب، دورخی ہونا، حیلہ بازی اور مختلف قسم کی سازشوں کو بیان کرکے ان کا پردہ چاک کیا گیا ہے، اور ان سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے، اور ہر موقعہ پر ان کی شرارتوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تعلیمِ امت کی خاطر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی: "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوذُبِکَ مِنَ الشِّرْکِ وَالشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْأَخْلَاقِ"۔ [الحدیث] یہ نہایت جامع دعاء ہے، اسے پڑھا کریں۔

مکہ مکرمہ میں جب تک اسلام کی دعوت جاری رہی، تو مشرکینِ مکہ کے ساتھ ہر محاذ پر یہ سلسلہ چلتا رہا، وہ کھلم کھلا اسلام کو قبول کر لیتے، یا اس کو رد کرتے تھے، وہاں نفاق کا نام ونشان تک نہ تھا، مگر مدینہ طیبہ کی ہجرت کے بعد یہ نیا خطرناک شعبہ کفر، یعنی نفاق کا ظہور ہوا، یہاں کے منافق خالص یہود تھے، اور کچھ دوسرے لوگ، جو کہ یہود سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کے گماشتہ اور حلیف تھے، وہ اسلام کی قوت وشوکت کو دیکھ کر اپنے دنیوی مفادات واغراض کی خاطر ظاہراً مسلمان ہوئے، تاکہ ان کی جان، مال، اولاد وعیال محفوظ ہوں، اور انہیں مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ ملتا رہے، مگر اندرونی طور پر کفار ومشرکین کے ساتھ رہے۔ پوری تفصیل ابن کثیر رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے، وہاں دیکھی جائے۔

یہاں کے منافق چالبازی اور مکر وفریب کے ساتھ ظاہراً مسلمانوں کی صفوں میں شامل رہے۔ ایک قسم منافقین وہ تھے، جو دل سے اسلام کے بالکل منکر تھے، مگر محض فتنہ پردازی کی خاطر مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے، تاکہ مارِ آستین کا کردار ادا کرسکیں۔

دوسری قسم کے منافقین وہ تھے جو ہوا کا رخ دیکھتے رہتے، مسلمانوں کا کبھی غلبہ دیکھا، تو ادھر جھک جاتے، اور دوسری صورت ہوتی، تو اُدھر کا رخ کر لیتے، یعنی ڈانواں ڈول رہتے۔ دونوں طرف اپنے مفادات کے تحفظ وحصول کی فکر میں منہمک رہتے، اور دونوں طرف رابطہ رکھنے کو دانشمندی خیال کرتے تھے، ﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ

وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ﴾[النساء:۱۴۳] (یہ کفروایمان کے درمیان ڈانوڈول ہیں، نہ پورے طور پر مسلمانوں کی طرف ہیں، اور نہ کافروں کی طرف) کے گرداب میں گھومتے تھے۔

تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو نہ اسلام سے مطمئن تھے، اور نہ جاہلیت سے، مگر خاندان کے اکثر وبیشتر لوگوں کے مسلمان ہوجانے کی وجہ سے مجبوراً ان کو بھی مسلمان ہونا پڑا، اور چوتھی قسم ایسے لوگ بھی تھے، جو اسلام کو برحق سمجھتے تھے، مگر اپنے پرانے رسم ورواج اور طور وطریق کو چھوڑنے پر آمادہ وتیار نہیں تھے، اور اسلامی طور وطریق، اسلامی اعمال واخلاق کو اپنانے اور قبول کرنے پر بھی تیار نہ تھے۔

شروع شروع میں تو منافقین کی ان تمام قسموں کے آثار کی ابتداء تھی، اسی لئے سورتِ بقرہ میں صرف اشاروں پر اکتفاء کیا گیا، آگے جوں جوں حالات صاف اور واضح ہوتے گئے، اتنی ہی تفصیل سے سورۂ توبہ اور سورۂ منافقون وغیرہ میں وضاحت کے ساتھ ان کی خباثتوں کی قلعی کھلتی رہی۔

یہ بات واضح ہو کہ مدینہ کے کچھ قبائل نے ہجرت سے پہلے عبداللہ بن اُبی بن سلول رئیس المنافقین کی سرداری اور قیادت پر ایک قومی جرگے میں اتفاق کیا تھا، اور اس کی تاج پوشی کے لئے کوئی وقت بھی مقرر کیا تھا، اتنے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ نبوت مدینہ کے افق پر طلوع ہوا، تو وہ سارے منصوبے خاک میں مل گئے، اور اس منحوس کی پوری حیثیت اور سرداری کا سورج غروب ہوا، جس پر حسد کی بھڑکتی آگ میں جھلس کر اس نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے خلاف طرح طرح کے غلط منصوبے اور سازشیں شروع کیں۔

چونکہ کھلم کھلا مخالفت کرنا اس کے بس سے باہر تھا، اس لئے درپردہ ہر قسم کے ہتھکنڈوں پر اتر آیا، اور تادمِ مرگ اپنی شرارتوں اور اندرونی مخالفتوں میں سرگرم رہا، اور اس سلسلے میں منافقین کی ایک بڑی جماعت تیار کر کے اس کی قیادت کرتا رہا، اور غزوۂ اُحد کے موقعہ پر عین معرکہ کے وقت اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ درمیان راستے سے پلٹ کر واپس ہوا، جس سے مسلمانوں کا رعب ودبدبہ کمزور پڑ گیا، اور بددلی سی پیدا ہوگئی، اسی موقعہ پر ان آیات کا نزول ہوا، اور اس کا سارا کرتا دھرتا طشت از بام ہوگیا۔

فائدہ:

یہاں سلسلۂ ایمانیات میں صرف دو باتوں کا ذکر ہے، یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت، شاید یہ اس لئے کہ سارے ایمانیات کی فہرست میں یہی دو چیزیں مقصودِ اعظم اور مہتم بالشان ہیں، یا اس لئے کہ ایمانیات میں سے صرف

اول اور آخر ذکر کرنے سے درمیانی چیزیں خود بخود آ جائیں گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافقوں کی چار خصلتیں ذکر فرمائیں:
(۱) جھوٹ بولنا (۲) وعدہ خلافی کرنا (۳) امانتوں میں خیانت کرنا (۴) بلاوجہ معمولی باتوں پر جھگڑا اور بدکلامی کرنا۔
[بخاري] اگر ان آیات کریمہ کو غور سے دیکھا جائے تو منافقین کی دیگر ناپاک خصلتوں کے علاوہ یہ چاروں خصلتیں نمایاں اور واضح ہیں۔ ان آیات میں منافقین کی چاروں خصلتوں کا مع جوابات وتنبیہات پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہے۔

ان کی پہلی خصلت جھوٹ، فریب و چالبازی، دوسری خصلت کفر ونفاق والامرض اور اس کی زیادتی، تیسری عادت فساد فی الارض، چوتھی خصلت جہالت وغرور اور بے جا حماقت واستہزاء، پانچویں صفت مؤمنین وصادقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن وتشنیع، آئندہ انہیں باتوں پر مفصل کلام ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

عام طور پر لوگ گمراہی اور بے راہ روی کو بے علمی اور جہالت کا ثمرہ ونتیجہ قرار دیتے ہیں، مگر درحقیقت گمراہی کے اسباب، جہالت کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں، مثلاً: غرور، ضد، مفاد پرستی، عناد اور ہٹ دھرمی وغیرہ۔ منافقین جو کہ اکثر وبیشتر یہودی یا یہودی نواز اور یہود کے حلیف تھے، ان کا کفر وگمراہی جہالت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ضد وعناد پر مبنی ہوتا تھا، وہ ایک نہیں، بلکہ بے شمار روحانی امراض میں مبتلا تھے، جس طرح عام کفار ومشرکین کے قلوب ماؤف ونا کارہ رہے، اور ان کے قویٰ واستعداد ضائع اور نا کارہ رہے، ان کی سماعت، بصارت اور بصیرت کا پورا نظام معطل رہا، اس سے کئی درجہ زیادہ منافقین ان مہلک وخطرناک بیماریوں کا شکار رہتے تھے، وہ تمام فطری قوتوں کو برباد کر کے شکوک وشبہات کے گرداب میں مستغرق ہوئے، ان حقائق کی پوری تفصیل سورۃ المائدۃ، سورۃ التوبۃ اور سورۃ المنافقون میں آنے والی ہے۔

بعض علماء کرام نے مستقل تصانیف میں نفاق اور اس کی حقیقت کو واضح کیا ہے، اور چالیس سے زائد ان کی شرارتوں کو نمبروار بیان کیا ہے۔ یہ ایک مستقل مضمون ہے۔ فتدبر

جسمانی اور روحانی بیماریوں کا مختصر بیان:

انسان کے لئے صحت وتندرستی ایک بنیادی فطری چیز ہے، جبکہ بیماری ومرض عارضی ہے، اس عارضی مرض کے لئے بہت سے اسباب قدرت نے پیدا کئے ہیں، پھر جو امراض جسمانی ہیں ان کے اسباب بھی مادی اور جسمانی

ہیں، جبکہ روحانی بیماریوں کے اسباب روحانی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی امراض کا علاج روحانی، اور جسمانی امراض کا علاج مادی اشیاء کے ذریعہ ممکن ہے۔

یہ امراض (روحانی وجسمانی) ابتدائی، وسطانی، اور انتہائی تین درجات پر منقسم ہوتے ہیں: بعض ابتدائی امراض اتنے مہلک نہیں ہوتے، جس طرح انتہائی امراض خطرناک ہوتے ہیں، کہ کسی قسم کا علاج قبول نہیں کرتے ہیں۔ ہرچند علاج مؤثر ہو، مگر شفاء مفقود ہوتی ہے، اگر جسمانی مرض مہلک اور پیچیدہ ہو تو اس کا انجام جسمانی ہلاکت اور موت ہی ہوگا، لیکن روحانی بیماریوں کا اختتام وانجام ابدی موت، یعنی دائمی عذاب اور خسران ہی ہوگا۔ منافق بیک وقت دونوں بیماریوں کا شکار رہتا ہے، اس کو جسمانی صحت اور روحانی صحت دونوں سے محروم رکھا گیا ہے، وہ بیک وقت دونوں بیماریوں میں مبتلا رہتا ہے، آخرت کی تباہی تو ویسے ہی اس کے مقدر میں ہے، مگر دنیا میں بھی وہ ہمیشہ بیمار اور خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں میرے نفاق کا راز کھل نہ جائے، اسی لئے تو وہ ہر بات پر قسموں کا انبار لگا تا رہتا ہے، اور اپنے عیبوں کو چھپانے کی خاطر اتنا سرگرداں رہتا ہے کہ اسے کبھی کہیں آرام نصیب نہیں ہوتا، مگر وحی الٰہی ہمیشہ ہر محاذ پر اس کا تعاقب کرکے اسے شرمندہ اور رسوا کردیتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سورۃ التوبۃ کا اصلی نام سورۃ الفاضحۃ (رسواکنندہ) اسی لئے ہے کہ اس سورت نے نفاق کے تمام تر پوشیدہ گوشوں سے پردہ اٹھا کر منافقوں کو ہمیشہ کے لئے رسوا و بےنقاب کردیا۔ مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی، جب بھی ایمانیات اور نزولِ آیات کا سلسلہ بڑھتا گیا، ان کے مرض میں بھی اضافہ ہوتا گیا، جب بھی مسلمانوں کو فتح ونصرت نصیب ہوئی، ان کا مرض زیادہ ہوا، اور مشرکین کو جب بھی شکست اور پسپائی ہوئی، تو یہ اور بیمار ہوئے، جب بھی ان کے مخفی و پوشیدہ نفاق وفریب کا پردہ چاک ہوا، تو ان کے مرض میں اضافہ ہوا۔

یہی مطلب ہے ﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ کا۔ انہیں شب و روز، یعنی روزمرہ زندگی میں کہیں چین و سکون میسر نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ سِل ودِق جیسے مرض میں بیتاب ومبتلا رہے، اور ان کا مرض بڑھتا رہا، تو فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾۔ "النَّاس" اصل میں "أناس" تھا، ہمزہ کو حذف کرکے اس کی جگہ الف لام لائے، یہ اسم جمع ہوگیا، اس کی جمع "أَنَاسِيَ" ہے، جو دوسری جگہ مذکور ہے: ﴿لِنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَا اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ

كَثِيْرًا﴾ [الفرقان: ۴۹] (تا کہ اس سے شہرِ مردہ (یعنی زمینِ افتادہ) کو زندہ کردیں، اور پھر اسے بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو جو ہم نے پیدا کئے ہیں پلاتے ہیں)۔

لفظ إنسان اپنے مشتقات کے ساتھ قرآن حکیم میں تین سواڑسٹھ (۳۶۸) مرتبہ مذکور ہے، الناس یا إنسان کے معانی لغویہ، یہ ہیں: محبت، ظاہر، متحرک اور خزانہ وغیرہ، چونکہ جنّات کے برعکس یہ ظاہر ہے، اور ہمیشہ متحرک بھی ہے، اور قدرتی کمالات (علم، عقل، معرفت، وحکمت وغیرہ) کا خزانہ بھی ہے، تو انسان کہلایا۔ [متفرقات]

؎وماسمي الإنسان إلا لأنسه ★ ولا القلب إلا أنه يتقلب

''خداع'' کے معنی دھوکہ، مکر، فریب اور چالبازی کے ہیں ''خدع الضب'' سے لیا گیا ہے، پہاڑ کا غار اگر دوسری طرف سے بند ہو، تو عرب اسے ''جحر'' کہتے ہیں۔ اگر دوطرفہ سوراخ کھلا ہو، تو اسے ''نفق'' کہتے ہیں۔ نِفاق اسی نَفق سے مأخوذ ہے، اسی معنی کا لحاظ کرتے ہوئے منافق کو ''ذوالوجهين'' کہتے ہیں، جس کے ظاہری و باطنی دورخ ہوتے ہیں، وہ ضبّ کی طرح شکاری کو دھوکہ دیتا ہے، ایک طرف سے غار میں داخل ہوا، دوسری طرف سے نکل گیا، منافق بھی اسی طرح ہے۔

منافقوں کی خودفریبی اور حماقت:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللهَ﴾ وہ اپنے زعمِ باطل میں خداوند تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، کیونکہ وہ اپنے آپ کو بہت ہوشیار اور ذہین خیال کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان سادہ لوح اہلِ ایمان کو دھوکہ دے کر اپنے لئے ہر قسم کی مراعات اور فوائد حاصل کرتے رہیں گے، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی طرف سے آنے والی وحی سے کوئی خطرہ اس لئے محسوس نہیں کرتے کہ انہیں ذاتِ باری تعالیٰ پر ایمان ہی نہیں، ورنہ وہ ضرور اس طرح کرنے سے باز آجاتے، اور یقین کرتے کہ ہمارے کفر و نفاق کی قلعی دیر یا بزود وحی الٰہی کے ذریعہ کھل جائے گی، اور ہمارے چہرے قیامت سے پہلے دنیا ہی میں سیاہ ہوجائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ربّ العزّت عزّ شانہ نے نہایت مختصر وقت میں ان کے چہرے سیاہ کردیئے۔

جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مؤمنوں کی عزّت افزائی:

اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات میں مؤمنین ایک عظیم حقیقت، اور اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے فضل و کرم اور عزّت افزائی کا بخوبی مشاہدہ کرسکتے ہیں، کہ ایک ایسی حقیقت جسے قرآن کریم نے بار بار تاکید کے ساتھ بیان

فرمایا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ اور اہلِ ایمان کے باہمی ربط کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ ان کی صف کو اپنی صف، ان کے معاملے کو اپنا معاملہ، اور ان کے حال کو اپنا حال قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ انہیں اپنے سے ملا لیتا ہے، انہیں اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیتا ہے۔ ان کے دشمن کو اپنا دشمن قرار دیتا ہے، اور جو سازشیں وہ ان کے خلاف کرتے ہیں، ان کا رخ اپنی طرف کر لیتا ہے۔

کتنا معزز، بلند فضل اور انعام ہے؟ اس کے نتیجے میں اہلِ ایمان کا مقام انتہائی بلند ہو جاتا ہے، اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس کائنات میں ایمان کی حقیقت سب سے عظیم، اور سب سے معزز ہے۔ اس سے مؤمن کے دل میں اتنی طمانینت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ربّ العزّت جل شانہ اس کے معاملے کو اپنا معاملہ، اس کی جنگ کو اپنی جنگ، اور اس کے ساتھ خداع وفریب کو اپنے ساتھ خداع، اور اس کے دشمن کو اپنا دشمن قرار دے رہا ہے۔ وہ اسے اپنی صف میں شامل کر رہا ہے، اور اپنے قربِ خاص تک اسے بلند کر رہا ہے۔ اس کے بعد منافقوں کے مکر وکید، ان کی فریب دہی، اور ان کی معمولی اذیت رسانی کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟

اسی کے ساتھ ساتھ یہ ان لوگوں کے لئے ایک خوفناک وعید اور تہدید بھی ہے، جو اہلِ ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، اور انہیں اذیتیں پہنچاتے ہیں، تو ان کو اس بات کی تہدید ہے کہ ان کی یہ جنگ صرف اہلِ ایمان سے نہیں ہے، بلکہ ان کی جنگ فی الحقیقۃ حضرت ربّ العزّت قوی وجبار وقہار جل شانہ سے ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ شانہ کے دوستوں سے جنگ کر کے فی الواقع اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں۔ فرمایا: "مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ"۔ [الحدیث]

وہ اس طرح کی کمینہ حرکات کا ارادہ کر کے اصل میں ربّ العزّت جل شانہ کے عذاب، اس کے بطش شدید اور انتقام کو دعوت دے رہے ہیں۔ اس حقیقت کے دونوں پہلو اس لائق ہیں کہ اہلِ ایمان ہر وقت، ہر موقعہ ان پر غور و فکر کریں، اور پوری طمانینت وثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق پر رواں دواں رہیں، اور سازش کرنے والوں کی سازشوں، فریب کاروں کی فریب دہی، شریروں کی شرارتوں، اور ایذا رسانیوں کی مطلق پرواہ نہ کریں۔

یہ بھی واضح ہوا کہ جو کوئی اہل ایمان کے ساتھ فریب کاری، چالبازی اور مکر وحیلہ کرتا ہے، وہ ربّ العزّت قہار و جبار کے بطش وانتقام کو دعوت دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا عذاب دنیا یا آخرت یا دونوں میں اسے تباہ وبرباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ پیغمبرِ اعظم ﷺ کی اطاعت اللہ ربّ العزّت کی اطاعت شمار ہوتی ہے، اور اس

کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی شمار ہوگی، یہی حال اہلِ ایمان مؤمنوں کا بھی ہے کہ ان کے ساتھ خداع وفریب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خداع وفریب شمار ہوگا۔

﴿وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ وہ (منافق) دھوکہ نہیں دے رہے ہیں، مگر صرف اپنے آپ کو، اور وہ نہیں جانتے، یہ کتنے غافل بیوقوف ہیں کہ خود کو تباہ کر رہے ہیں، اور اپنے آپ کو عذاب الٰہی کی بھٹی میں گرا رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں، بقول شیخ سعدیؒ ؎

یکے بر سر شاخ و بن میبرید ☆ خداوند بستان نگہ کرد و دید
بگفتا کہ این شخص بدمی کند ☆ نہ با من کہ بانفس خودمی کند

بعینہٖ اسی طرح یہ غافل وناداں لوگ اہلِ ایمان کو نقصان پہنچانے کے بجائے خود اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، اور دھوکہ دے رہے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اہلِ ایمان ربّ العزّت جل شانہ کے آغوش رحمت کی پناہ میں ہیں، انہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمارے خداع کا وبال الٹا ہمیں بھسم کر کے رکھ دے گا۔ جب ہمارے نفاق اور کفر و سرکشی کا راز بذریعۂ وحی کھل جائے گا، تو ''راہِ گریختن وجائے ماندن'' ہمارے لئے مشکل ہوجائے گا۔ نہ ادھر کے رہیں گے، نہ ادھر کے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾ یہ ان کے مکر و فریب کے سبب وعلّت کی نشاندہی ہورہی ہے۔

''مرض'' کا معنی بیماری، بیماری جس طرح جسمانی ہوتی ہے، یعنی جو انسانی بدن کو حدِ اعتدال سے خارج کردے، اسی طرح روحانی مرض وہ ہے جو روح پر آفت نازل ہونے کے بعد روحِ انسانی کو حدِ اعتدال سے خارج کردے، مثلاً جہالت، شرک، کفر، نفاق، حسد، بغض، کینہ اور کبر وغرور، وغیرہ۔

جس طرح مرضِ جسمانی سے جسم ناکارہ اور آفت زدہ ہوجاتا ہے، اسی طرح روحانی امراض روح کے لئے تباہ کن ہوتے ہیں۔ پھر اگر صحیح علاج عمل میں نہیں آیا، تو یہ دونوں مرض آہستہ آہستہ بڑھتے رہتے ہیں، اور ترقی کر کے آخری مرحلے میں پہنچ کر لاعلاج ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ جسمانی مرض کا نتیجہ موت کی شکل میں، اور روحانی مرض کا نتیجہ ابدی شقاوت یعنی دوزخ کی شکل میں ظاہر ہوجائے گا۔

یہ ربّ العزّت جل شانہ کی سنت اور قانون ہے کہ کائنات کی ہر چیز، خواہ اجسام وجواہر کے قبیل سے ہو، یا

اعراض وکیفیات میں سے ہو، ہر چیز لحہ بہ لحہ بڑھتی رہتی ہے، اور ترقی کرتے ہوئے ابتدائی درجہ، پھر وسطانی درجہ، پھر وہاں سے انتہائی درجے تک پہنچ جاتی ہے۔تمام انسان، حیوانات، نباتات وغیرہ کو دیکھیں! مثلاً مرض، بیماری، غم، پریشانی، خوشحالی، راحت اور نیک وبرے اعمال وغیرہ، سب میں یہ قانونِ فطرت جاری ہے۔کہیں ایمان واعمالِ صالحہ میں اضافہ اور ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کہیں کفر ونفاق وبدعملیوں میں مسلسل اضافہ اور ترقی نمایاں ہے۔

قرآن حکیم نے دونوں پہلوؤں کو بسط وتفصیل کے ساتھ متعدد سورتوں اور آیات میں مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ [التوبة:۱۲۵] (سو جو ایمان والے ہیں ان کا ایمان تو زیادہ کیا، اور وہ خوش ہوتے ہیں، اور جن کے دلوں میں مرض ہے، ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا، اور وہ مرے بھی تو کافر کے کافر)۔

جب مشرک وکافر کا شرک بسیط ثابت ہوا، تو اس کے متعلق ارشاد ہوا: ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (اور ان کے لئے بڑا عذاب تیار ہے)۔ منافق کا کفر کئی معاصی سے مرکب ہے: کفر، نفاق، جھوٹ، خداع، وعدہ خلافی، خیانت، فتنہ، فساد، غرور، بغض اور حسد وغیرہ، اس لئے ان کے متعلق عذابِ عظیم کے علاوہ ''عذاب الیم'' اور سخت ترین اور ناقابلِ برداشت عذاب کا اعلان ہوا۔دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا﴾ [النساء:۱۴۵] (کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجے میں ہوں گے۔اور تم ان کا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے)۔أعاذنا اللہ وجمیع المؤمنین اٰمین۔

اسباب وعلاماتِ نفاق:

سوال: وہ اسباب کیا اور کون سے ہیں، جن کی وجہ سے آدمی منافق بنتا، اور نفاق اختیار کرتا ہے؟

جواب: علماء کرام نے اس سلسلے میں پانچ اسباب بیان کئے ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ سے بے خوفی اور لوگوں سے خوف۔(۲) حبِّ جاہ وشہرت اور حصولِ عزت۔(۳) حبِّ مال اور طمع ولالچ۔(۴) بزدلی اور بے مروتی اور مفادات کی غلامی۔(۵) شکوک وشبہات اور وہم وتردّد۔

اس کے ساتھ نفاق کی علامات جو قرآن کریم اور احادیث مبارکہ نے بیان کی ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں۔البتہ نفاق کی موٹی موٹی علامتیں اور خصلتیں تقریباً گیارہ ہیں، مثلاً: جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، فساد وشرارت، دھوکہ دہی،

چالبازی، خودپسندی، کبروغرور، شماتت، یعنی مسلمانوں کی پریشانی وتکلیفوں پرخوش ہونا، اسی طرح ان کی خوشی و کامیابیوں پر پریشان اور مغموم ہونا، استہزا بالمؤمنین، ظاہر وباطن کا ایک نہ ہونا، یعنی اخلاص کا فقدان، حسد وبغض میں ڈوبا ہوا ہونا، حق وباطل میں قصداً یا حماقتہً فرق نہ کرنا، یعنی حق سے دشمنی اور باطل سے محبت ودوستی وغیرہ۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت ہو یا عداوت اس کا مرکز ومنبع قلب ہے۔ قلب اگر صاف ستھرا نورانی ہو، تو حسنات اور نیکیوں کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے۔ گناہ خواہ کسی بھی قسم کا ہو دل میں تاریکی اور نفرت پیدا کرتا ہے، اگرچہ وہ مسلمان کا دل کیوں نہ ہو۔

انسانی قلب کو سلطان البدن کی حیثیت حاصل ہے:

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی رُو سے قلبِ انسانی کو سلطان البدن کی حیثیت ومرتبہ حاصل ہے، اور یہی قلب، ایمان ومعرفت اور کفر وضلالت دونوں کا مرکز ومنبع بھی ہے۔ یہ قلب ساکن نہیں، سکون اس کی موت کا نام ہے۔ یہ رات دن متحرک ہے، اس کی رفتار نہایت حیران کن ہے۔ اس کی سرعتِ رفتار چھتیس سے چالیس میل فی گھنٹہ ہے۔ یہ قدیم حکماء کا خیال ہے، موجودہ ماہرین اس کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ بتاتے ہیں، باعتبار خون کے، نہ کہ باعتبار خیالات کے، کیونکہ اس کے خیالات کی رفتار کو آج تک معلوم نہیں کیا جاسکا ہے۔ بہر حال آپ خوشی وغمی کا بآسانی ادراک کرسکتے ہیں۔ ایک ہی منٹ میں یہ خوش بھی ہے، اور پریشان بھی۔ ایک منٹ کے عرصہ میں اس کے خیالات کہاں سے کہاں تک پہنچتے ہیں، اور کتنی بلندیوں تک ہزاروں چیزوں پر اس کی دسترس اور پرواز ہوتی ہے۔ زمین سے آسمانوں تک، اور اس سے بھی ماورا۔

ایمان ہو یا کفر ونفاق، اعمالِ صالحہ ہوں یا معاصی، عدل وظلم، صلاح وفساد، غرض ہر قسم کی خیر وشر کا مرکز ومنبع یہی قلبِ انسانی ہے۔ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا کہ انسانی قلب کے دو خانے ہیں: ایک میں خیر (فرشتہ)، دوسرے میں شر (شیطانی) موجود ہے۔ جب یہ دل معرفت وتوحید کے نور سے منور وروشن ہوگا، تو سارے اعضاء اس کی فرمان برداری کریں گے، اور تمام اعضاء سے اعمالِ خیر کا صدور ہوگا، اور اس کا نام قلبِ سلیم ہوگا۔ اگر یہ قلب توحید و معرفت سے خالی ہوا، تو ظلمتوں اور شیاطین کا گھر ہوگا۔

پس اس کا نام قلبِ سقیم ہوگا ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ کا مصداق ہوگا، اور اس کے حکم پر اعضاء بدن تمام جہاں کو ظلمتوں، بدعملیوں، ظلم وستم اور کفر ومعاصی سے بھر دیں گے۔ مؤمن کے بارے میں آیا ہے: "اِنَّ الْمُؤْمِنَ

لَا يَنْجَسُ"۔[بخاري] کافر کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾[التوبة:۲۸]

نجاست ہو یا طہارت اس کا تعلق دل اور باطن کے ساتھ ہے۔قرآن کریم نے قلبِ انسانی کو ایک سو بتیس مرتبہ ذکر فرمایا ہے، اور ہر مقام پر تقریباً ایمان وکفر، خیر وشر، صلاح وفساد، انصاف وظلم، روشنی وتاریکی اور دیگر ہزاروں اعمال کی نسبت قلب کی طرف کر کے قلب ہی کو تمام چیزوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ خیر وشر کی نسبت قلب ہی کی طرف ہے، یہی قلب مرکزِ ایمان اور اعمالِ صالحہ بھی ہے، اور مرکزِ کفر ونفاق اور اعمالِ سیئہ بھی۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ"۔[بخاري] (خبر دار! انسانی بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا رکھا ہوا ہے، اگر وہ صحیح وتندرست رہا، تو سارا بدن اور بدنی اعضاء صحیح اور تندرست رہیں گے، اگر وہ فاسد، ناکارہ وبیمار رہا، تو بدن کے سارے اعضاء بیمار وناکارہ اور بے مقصد رہیں گے، سنو! وہ چیز انسانی قلب ہے)۔

مؤمن کا قلبِ سلیم خوبیوں، نیکیوں، ہر قسم کے انوار وبرکات اور خیر وصلاح سے بھرا ہوگا، کیونکہ وہ عرش الرحمن کا مصداق ہے، جبکہ کافر، منافق، فاسق وفاجر کا قلب ظلمتوں، خباثتوں، معاصی اور فساد سے بھرا ہوا ہوگا، کیونکہ وہ شیاطین کا مستقر وبیٹھک ہے، کیونکہ معاصیوں، خباثتوں، ظلمتوں سے بھرا ہوا دل کتے، گدھے، کوے اور چوہے کے دل سے بدتر خبیث وناپاک اور بے شعور ہوگا، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا:﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾۔[الأعراف:١٧٩] (وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں)۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (اور جب ان منافقین سے کہا جاتا ہے کہ زمین (ملک) میں فساد نہ پھیلاؤ)۔فساد ضد ہے صلاح کی، یہ دونوں استعمال میں اکثر افعال کے ساتھ مخصوص ہیں، لیکن عرف عام میں ہر قسم کے کام، اور ہر چیز پر ان کا اطلاق ہوتا ہے۔جو بھی کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور اعتدال کے مطابق ہو، اس کو صلاح کہتے ہیں، اور جو کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور اعتدال کے خلاف ہو، اسے فساد کہتے ہیں۔پس صلاح پسندیدہ، محمود اور خیر ہے، اور فساد مذموم اور حرام ہے۔

منافق لوگ چالبازی، مکر وخیانت، حسد وبغض کی بناء پر مسلمانوں کے عیوب نکالتے تھے، اور جھوٹ بول کر مخالفین کو ان کے خلاف بغاوت وجنگ پر اکساتے تھے، اور فضاء کو ہر وقت مسموم (زہریلا) اور مذموم بناتے تھے۔ طرح طرح کی بداعتادی میں لگے رہتے تھے۔کبھی مسلمانوں کے آپس میں غلط خیالات پیدا کرنے کی کوشش کرتے

تھے۔عام لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے تھے،اور قرآن اور صاحبِ قرآن کے خلاف صبح وشام پروپیگنڈہ کرتے تھے،مسلمانوں پر استہزاء کر کے انہیں بیوقوف وناداں کہا کرتے تھے،وغیرہ وغیرہ۔

جب ان سے کہا جاتا کہ اس قسم کا فساد پھیلا کر حالات خراب نہ کرو،تو جواب دیتے:

﴿قَالُوٓا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ﴾ (ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں) ہم لوگوں میں میل جول محبت وآشتی پیدا کرنے والے ہیں،وہ "اِنَّمَا" تاکید کے ساتھ کہتے کہ ہم خیر خواہی کرنے والے ہیں۔یہ سب کچھ جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے،محض ہٹ دھرمی کے طور پر کہا کرتے تھے۔

ربّ العزّت علیم بذات الصدور نے ان کے اس کرتوت اور غلط بیانی کی پُرزور تردید فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿اَلَآ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ﴾ (سنو! یہ لوگ فسادی ہی ہیں،لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے)۔یہ اتنے نکمّے،بے عقل وبے شعور ہیں کہ نیکی وگناہ،اصلاح وفساد میں فرق نہیں کرتے۔ربّ العزّت نے جس بلیغ وعجیب طرز پر ان کی تردید فرمائی ہے،یہ اپنی مثال آپ ہے۔یہ جملہ مستانفہ ہے۔شروع میں "اَلا" حرفِ تنبیہ ہے۔پھر کلمہ "اِنَّ" تاکید کے لئے ہے۔اِنَّ کی خبر معرف باللام اور اسم وخبر کے درمیان "ھم" ضمیرِ فصل کی آئی،اور ﴿وَلٰكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ﴾ کو استدراک کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

نزولِ قرآن کے زمانہ سے لے کر آج تک جتنے باطل گمراہ فرقے وجود میں آئے،جن کے عقائد واعمال کتاب وسنت کی تعلیمات کے خلاف ہیں،ان کے بانی بھی منافقوں کی طرح یہی کہتے رہے،اور کہہ رہے ہیں کہ ہم مصلحین ہیں۔انہوں نے طرح طرح کے خوبصورت اور پسندیدہ نام اپنے لئے تجویز کئے،اور لوگوں کی اصلاح و فلاح کا رٹ لگا کر سادہ لوح مسلمانوں کو بیوقوف بناتے رہے۔

دراصل یہ سارے مفسدین ہی ہیں،جو اصلاح وخیر کے دعویدار ہیں،وہ شعوری یا لاشعوری طور پر بالکل اسی طرح ہیں جیسے زمانۂ رسالت میں مدینہ کے منافق ہوتے تھے۔پس جو لوگ خیر وشر،ایمان ونفاق اور صلاح وفساد کی پہچان سے تہی دامن ہوں،یا نفاق واخلاص کی شناخت سے بے بہرہ ومحروم ہوں،ان کے قلب ونظر کو اگر بیمار نہ کہا جائے،تو کیا کہا جائے؟ آج بھی ایسے مخبوط الحواس بیوقوفوں کی کوئی کمی نہیں ہے،ان سے کہیں زیادہ بیوقوف وہ لوگ ہیں،جو ان کے نقشِ قدم پر رواں دواں ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے شر سے بچائے۔آمین

آنکس کہ نداند وبگوید کہ بداند ☆ درجہل مرکب ابدالدھر بماند

تمام منافق اسی قسم کے ہیں۔ سارے جہلِ مرکب کے شکار ہیں، جس کا کوئی علاج نہیں۔ البتہ! جہلِ بسیط کا علاج ہوسکتا ہے۔

ع آنکس کہ نداند وبگوید کہ نداند......

جہل بسیط یہ ہے کہ آدمی اپنی کم علمی کا اقرار کرے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ
اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اور جب انہیں کہا جائے کہ ایمان لاؤ (اخلاص کے ساتھ) جیسے ایمان لائے (اور) لوگ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) تو کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف؟ خبردار! بیشک وہی بیوقوف ہیں، مگر وہ نہیں جانتے ﴿۱۳﴾

معارف ومنازل

یہاں سے منافقین کی پانچویں خصلت کا بیان ہے کہ وہ خود کو عقلمند کہتے تھے، اور سچے پکے جان نثار مخلص و صادق مسلمانوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کو بیوقوف سمجھتے تھے۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ فسادی لوگ مصلحین کو فسادی یا بیوقوف سمجھتے ہیں۔ فرعون جیسے مفسد ومدّعی الوہیت نے بھی جناب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا تھا:

﴿وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِىۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰى وَلۡيَدۡعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اَنۡ يُّبَدِّلَ دِيۡنَكُمۡ اَوۡ اَنۡ يُّظۡهِرَ فِى الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ﴾ [الغافر: ۲۶] (اور فرعون بولا کہ مجھے چھوڑو کہ موسیٰ کو قتل کردوں، اور وہ اپنے پروردگار کو بلالے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ (کہیں) تمہارے دین کو نہ بدل دے، یا ملک میں فساد (نہ) پیدا کردے)۔

دیکھیں! مفسدین کا سردار فرعون، مصلحین وصادقین کے سردار سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فسادی بتلا رہا ہے، اور اس کا مذاق اڑا رہا ہے (نعوذ باللہ)۔ مدینہ کے منافق اپنے پیشرو فرعون کے نقش قدم پر چل کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے مخلصین صادقین کو بیوقوف کہہ رہے ہیں، اور ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

آیت کا مطلب ہے کہ جب ان سے کہا جائے (کہنے والا حق سبحانہ وتعالیٰ ہے، یا حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تینوں معنی صحیح ہیں) کہ تم دورخی، دوغلا پن، یعنی نفاق چھوڑ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے حقیقی ایمان لاؤ،

اپنے ظاہر و باطن کی تفریق و چالبازی مٹاؤ "مخلصین له الدین" کے پروگرام پر گامزن ہو جاؤ، جو کہ صحیح حقیقی ایمان ہے، اور در اصل یہی ایمان مقبول اور مدارِ نجات بھی ہے، تو منافقین استہزاءً کہتے ہیں کہ کیا ہم ان (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم) ناداں بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں، اور اپنی بے عقلی کا ثبوت پیش کریں؟ کیونکہ وہ منافق دنیا کی چند روز عیش و عشرت کو اصلی زندگی سمجھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیوقوف سمجھتے تھے، جنہوں نے ابدی زندگی کا انتخاب کر کے چند روزہ فانی زندگی کی قربانی دی تھی، اور اپنے اصلی آبائی وطن مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر صرف اسلام کی خاطر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے۔

مزید برآن اپنے اہل و عیال، گھر بار، عزیز و رشتہ داروں کو اور ہر قسم کا مال و سرمایہ چھوڑ گئے تھے، اور خالی ہاتھ مدینہ منورہ پہنچے تھے، اور مدینہ پہنچ کر یہاں کوئی دنیاوی کاروبار شروع نہیں کیا، بلکہ سروں کو ہتھیلی پر رکھ کر جہادی معرکوں میں تاریخی اور مثالی جان نثاری کا ثبوت پیش کیا، اور جام شہادت نوش فرماتے گئے، اور صبح و شام دربارِ رسالت میں بھوکے پیاسے رہ کر دین سیکھتے رہے، کبھی دنیا کی محبت نے انہیں اپنی طرف کھینچ کر فیضانِ نبوت سے غافل نہیں کیا۔

دوسری طرف حضرات انصار رضی اللہ عنہم نے جانی و مالی قربانیوں سے بے مثال نقوش اوراقِ تاریخ میں ثبت کئے۔ ایک ایسی دینی فضاء قائم کی جسے نیلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھا تھا، اور انسانی تاریخ نے کبھی نہ لکھا تھا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ مؤاخاة قائم ہونے پر مجھے اپنے گھر لے گئے، اور کہنے لگے کہ میں پورے انصار میں مالدار ہوں، آپ میرے مال کا آدھا لے لیں، اور میری دو بیویوں میں سے (اس وقت تک پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا) ایک اپنے لئے منتخب کر لیں، میں اسے طلاق دے دیتا ہوں، عدت گزارنے کے بعد آپ اس سے شادی کریں۔ [بخاري] میں نے ان کی بے مثال جان نثاری و ایثار کو سراہا، اور اس طرح کرنے سے انکار کیا۔

یہ تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہیں اللہ رب العزت نے نمونہ کے طور پر پیش کر کے فرمایا: ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (اے منافقو! اگر تمہیں ایمان لانا ہے، تو ایسے لوگوں کو نمونہ بنا کر ان کی طرح ایمان لاؤ)۔ دوسری جگہ یہود سے بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان نمونہ و معیارِ حق ہے، ان کی طرح تمہیں اخلاص کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے، ارشاد ہے: ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ [البقرة:١٣٧] (تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو، تو ہدایت یاب ہو جائیں)۔

☆☆☆

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ حق، اور پوری امت کیلئے نمونہ ہیں:

اہلِ سنت والجماعت کا مذہب و مسلک یہی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بحیثیت مجموعی من حیث الطبقہ بلا استثناء، عدول و پاکباز معیارِ حق اور محفوظ ہیں۔ علماءِ حدیث جنہوں نے احادیث کی صحت کے سلسلے میں بڑی محنتیں کی ہیں، اور بڑی خدمات انجام دی ہیں، ایک حدیث کے رُواۃ کے سلسلے میں ہزاروں میل پیدل سفر کر کے راویوں کے حالات، ان کے صدق و دیانت، امانت و تقویٰ، حافظہ و یادداشت کی تحقیق کی، تب کسی حدیث کی صحت کا فتویٰ صادر کیا، اگر کسی راوی میں معمولی عیب یا کوئی فروگزاشت محسوس کی، یا راوی غیر معروف مجہول معلوم ہوا، تو ایسے راویوں کی روایت سے اجتناب کیا، مگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق تمام ائمہ ناقدین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ: "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ وَلَاتَضُرُّ جَهَالَتُهُمْ فِي الرِّوَايَةِ"۔ یہ پورا طبقہ عدول و پاکباز ہے۔

ان کی عدالت کسی امامِ حدیث کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ حضرت شارع علیہ السلام نے اوپر سے ان کی عدالت کا ثبوت حاصل کرلیا، اور انہیں ہر قسم کی تنقید سے بالاتر قرار دے کر پوری امت کے اعمال کی صحت و فساد کے لئے کسوٹی قرار دیا۔ کسی بھی عمل کی صحت و فساد، اور کھرے کھوٹے کی پہچان و شناخت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال ہی سے ہوگی، اور احکامِ شریعت کے سلسلے میں ان کے اجماع و اتفاق سے کسی بھی مجتہد و صاحبِ مذہب کے لئے اختلاف و انحراف کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

کوئی مدعیٔ حق و دیانت ہزار درجہ کسی عمل کے جواز کا ثبوت پیش کرے، اجتہاد و استنباط کا بڑا ہی میدان طے کرے، اور پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنے کی کوشش کرے، مگر یہ عمل اس وقت قبولیت کا شرف حاصل کر سکے گا، جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی، اور خیر القرون کی منظوری اسے حاصل ہوگی، مثال کے طور پر ربیع الاول کا جلوس ہو، یا صلوٰۃ و سلام قبل الاذان، یا میت کو دفناتے وقت قبر پر اذان، وغیرہ جب خیر القرون میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں اس کا وجود اور تصور تک نہیں، تو ہر حال میں اسے منگھڑت، اور چودھویں صدی کی بدعتِ مذمومہ، اور خلاف شریعت کہنا پڑے گا، اور ہر کسی "ایرے غیرے" کو شریعت بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، کیونکہ اسلام کوئی فیکٹری نہیں ہے، جہاں ہر بدعتی مشرک کو پرزے بنانے کی اجازت ہو، بلکہ ثابت شدہ دینی اقدار پر چلنے کا نام اسلام ہے۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر اس کی تکمیل کا اعلان ہو چکا ہے۔ مزید اس میں کسی ترمیم اور کمی بیشی کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی۔ اگر کوئی کتاب و سنت کا دشمن اس میں (اسلام میں) کسی قسم کی کمی زیادتی کا قولاً، فعلاً اور عملاً اقدام کرے

گا، تو وہ ضرور یہود ونصاریٰ کا ایجنٹ وگماشتہ متصور ہوگا، اور ابلیس لعین کا خلیفہ ونائب شمار ہوگا۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ☆ پس بہر دستے نباید داد دست

گر بصورت آدمی انسان بدے ☆ احمد و بوجہل ہم یکسان شدے

کسی مدعی نبوت، یا مدعی ولایت، یا مدعی عشق ومحبت کی ظاہری شکل وصورت سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔
یہود کے نمائندے نے خوبصورت متشرع، عابد وزاہد اور اچھی شکل وصورت میں آکر سعودی شہر ریاض میں امام و خطیب کے فرائض انجام دیئے ہیں، کسی نے اسے نہیں پہچانا۔ ہزاروں لوگ بطور عقیدتمند اس کے ہاتھوں پر بیعت ہوگئے، اور پھر انہیں مدعیانِ علم وتقویٰ نے پانچ سو سال سے تین براعظموں پر قائم خلافت عثمانیہ ترکیہ کو تار تار کر کے ٹکڑے کر کے رکھ دیا، یہ وہی زمانہ تھا کہ برصغیر ہند وپاک میں انگریزوں کا اقتدار تھا، جہاں نئی نئی نبوتوں اور جدید جدید ولایتوں، اور عاشقوں کا دور دورہ تھا۔

یہ وہی تھے جنھوں نے اپنے بابا اور محسن انگریزوں کو خوش کرنے کی خاطر حرمتِ جہاد کا فتویٰ دیا تھا، اور انگریزی اقتدار کو اسلامی اقتدار قرار دے کر "إعلام الأعلام بأن هندوستان دار الإسلام" تصنیف کی تھی۔ کوئی شمس العلماء بنا، کوئی اعلیٰ حضرت، کوئی خان بہادر، اور کسی نے سر کا خطاب حاصل کرلیا تھا، بڑے بڑے وظائف ومراعات حاصل کئے تھے، جن کے پسماندگان آج تک کھاتے پیتے عیش کررہے ہیں، اور ہر میدان میں محفوظ ومقبول ہیں۔

اسی طرح رحمت عالم ﷺ نے آنے والے فتنوں کے متعلق امت کو آگاہ فرمایا، کہ امت کے اندر تہتر فرقے پیدا ہوں گے، جو کہ سب جہنمی اور باطل ہوں گے، سوائے ایک فرقہ ناجیہ کے، یہی ایک فرقہ اصلی، صحیح اور اہل حق مؤمنوں کا ہوگا، اور ناجی کہلائے گا۔

چونکہ دنیا میں اصول ہے کہ ہر شخص اور ہر طبقہ اپنے آپ کو اصلی قرار دے کر دوسرے لوگوں کو باطل پر گمان کرتا ہے، جب تک اوپر سے کوئی یقین دہانی یا مخصوص علامت نہ ہو، حق وباطل کی پہچان میں دشواری ہوگی، اسی بناء پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! اس ایک ناجی اور برحق جماعت کی علامت کیا ہوگی؟ سید کائنات ﷺ نے ایسی جامع وہمہ گیر نشانی بتائی، جس سے تمام شکوک وشبہات ختم ہوگئے، اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ جماعت کی برتری ومعیارِ حق ہونا واضح ہوگیا، اور سید عالم ﷺ نے انہیں اپنی ذات سے ملا کر گویا اعلان فرمایا کہ میں ان کا ہوں اور وہ میرے ہیں، ان کے عمل اور میرے عمل میں اتحاد ہے، ان کی اتباع میری اتباع، اور ان کی مخالفت میری

مخالفت ہوگی۔وہ ہر میدان میں میرا نمونہ ہیں،ان کے اعمال میں میرے اعمال کا عکس نمایاں ہوگا۔توفرمایا: "مَاأَنَاعَلَيْهِ وَاَصْحَابِیْ"۔پوری جماعت کے اشتراک کاحکم ثابت فرمایا۔

دیکھیں! یہاں کتاب وسنت پرعمل کاذکرنہیں فرمایا، بلکہ اس خوش قسمت جماعت کانام لے کرانہیں پوری امت کے لئے مقتداءومتبوع ثابت فرمایاکہ ہرشخص اپنےعمل کوبجائے کتاب وسنت کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال کے آئینہ میں دیکھے۔یہ جماعت کبھی ضلالت وگمراہی پرنہیں ہوگی،اور کبھی حق سے منحرف بھی نہیں ہوگی،کیونکہ یہ جماعت منتخب من اللہ ہے،اوراللہ تعالیٰ کے انتخاب میں غلطی کاکوئی امکان نہیں ہوتا۔

گویاپوری امت کوقیامت تک کسوٹی اورمعیارقراردیاکہ اپنے عقائداوراعمال کواس جماعت کے عقائدو اعمال پرپیش کرو۔اصلی نقلی کھرّےکھوٹے کابآسانی فرق معلوم ہوگا،اورحق وباطل میں بخوبی امتیازحاصل ہوگا،فرمایا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾[یوسف:۱۰۸] (کہہ دومیرارستہ تویہ ہے میں خداکی طرف بلاتاہوں(ازروئےیقین وبرہان)سمجھ بوجھ کرمیں بھی(لوگوں کوخداکی طرف بلاتاہوں)اورمیرے پیروبھی)۔

قولہ تعالیٰ:﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾[الفتح:۱۰](جولوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ خداسے بیعت کرتے ہیں۔خداکاہاتھ ان کے ہاتھوں پرہے)۔﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾[الفتح:۱۸](اےپیغمبر!)جب مؤمن آپ سے درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے توخداان سے خوش ہوا)۔قولہ تعالیٰ:﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾[الفتح:۲۹] (محمد صلی اللہ علیہ وسلم خداکے پیغمبرہیں،اورجولوگ ان کے ساتھ ہیں)۔قولہ تعالیٰ:﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ﴾ [ھود:۱۱۲] (سو(اےپیغمبر!)جیساتم کوحکم ہوتاہے(اس پر)تم اورجولوگ تمہارے ساتھ تائب ہوئے ہیں قائم رہو)۔قولہ تعالیٰ:﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[الانفال:۶۴] (اے نبی! خداتم کواورمؤمنوں کوجوتمہارے پیروہیں کافی ہے)۔قولہ تعالیٰ:﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [المائدۃ:۱۱۹](خداان سے خوش ہے،اوروہ خداسے خوش ہیں)۔قولہ تعالیٰ:﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى﴾[الحجرات:۳](خدانے ان کے دل تقویٰ کے لئے آزمالئے ہیں)وغیر ذٰلک من الآیات۔اس سلسلے میں احادیث بہت ہی بکثرت اوربےشمارہیں۔

مؤرخ کبیر حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ﴿كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ كما أمن أبو بكر وعمر وعثمان وعلي۔ رضوان الله عليهم أجمعين۔ [عزيزي، درمنثور]

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں "الناس" میں یہ نکتہ ہے کہ منافقین سے کہا جا رہا ہے کہ تم بھی ﴿النَّاس﴾ کی طرح ایمان لاؤ، یعنی انسان بنو، انسانوں کی طرح ایمان لاؤ، کیونکہ انسان کہلانے کے مستحق وہی لوگ ہیں، جنہیں حقیقی ایمان کی سعادت حاصل ہے، اور جو لوگ ایمان کی نعمت سے محروم ہیں، وہ حقیقت میں انسان ہی نہیں، بلکہ قرآن حکیم کی اصطلاح میں وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ فرمایا: ﴿أُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾۔ [الأعراف:۱۷۹] (وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں)۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ﴾ (خبردار! آگاہ رہو درحقیقت یہی منافق اور بیوقوف (ناعاقبت اندیش) ہی ہیں) وہ اس لئے کہ سَفِيه دراصل اس کو کہتے ہیں جو اپنے خیر وشر، نفع ونقصان سے بے خبر ہو، کیونکہ ابدی زندگی اور دائمی راحت وسکون، نیز رضاء الٰہی کے عوض چار روزہ فانی زندگی کا انتخاب کرنا عقلمندوں کا شیوہ نہیں، یہ ناعاقبت اندیش، بے عقل وبے سوچ لوگوں کا کام ہے، جو کہ منافقین ہیں "لَا يَشْعُرُوْنَ . لَا يَعْقِلُوْنَ . لَا يَعْلَمُوْنَ . لَا يَفْقَهُوْنَ" جیسی صفات کے حامل ہیں، اور گدھے جیسے جانور سے بھی بدتر ہیں۔ انسانیت دور کی بات ہے، یہ حیوانات سے بھی پست ہیں۔ آگے ربّ العزّت عزّ شانہ نے مزید ان کا پردہ چاک کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ جب مؤمنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور (پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے) تو ہم ہنسی کیا کرتے ہیں ﴿۱۴﴾ ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے، اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت وسرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں ﴿۱۵﴾

معارف ومنازل

جب یہ منافقین ایمانداروں سے ملتے ہیں تو خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں، تاکہ مسلمان

انہیں اپنا بھائی سمجھیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جب یہ اپنے شیطانوں (سرغنہ، سردار) کے پاس جاتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، یہ تو ہم محض مسلمانوں کا مذاق اڑا رہے ہیں، یعنی ہم ظاہری طور پر ان کے ساتھ ربط و تعلق جوڑتے ہیں۔ انہیں بیوقوف بناتے ہیں، ان سے ہر قسم کے اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔ ان سے راز کی باتیں معلوم کرتے ہیں۔ درحقیقت باطنی طور پر اپنے پرانے کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں، اور تمہارے ساتھ ہیں، ہم کبھی تمہیں اور اپنے آباء واجداد کے مسلک کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ نے جواب دیا:

﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے نفاق واستہزاء کی سزاء دے کر انہیں مزید ڈھیل (مہلت) دیتا ہے۔ وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں اندھے ہورہے ہیں (دلی اور باطنی اندھاپن مراد ہے)۔

اس سے قبل "خداع" کی نسبت، اور یہاں استہزاء کی نسبت جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، یا تو عام متشابہات کے قبیل سے ہوگا، یا "يَسْتَهْزِئُ أي يجازيهم" کے معنی پر ہوگا۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: استہزاء بمعنی انتقام کے ہے، یا مشاکلت کے معنی میں ہوگا، جیسے: ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوری: ۴۰] (برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے)۔ ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا﴾ [النمل: ۵۰] (انہوں نے ایک چال چلی، اور ہم نے بھی ایک چال چلی)۔ وہ اس طرح کہ اہل عرب کا محاورہ ہے کہ جب کوئی کام کسی فعل کی سزا دینے کے لئے کیا جائے تو اس کی تعبیر بھی اسی لفظ سے کردیتے ہیں، جس لفظ سے اس فعل کی تعبیر کی گئی ہو، جیسے ابھی واضح ہوا۔

نفاق وکفر اور شرک کا سلسلہ قیامت تک رہے گا:

جب خیر القرون کے زمانہ میں، جو برکتوں اور عظمتوں کا زمانہ تھا، وہاں بھی شرک وکفر اور نفاق کا خاتمہ نہیں ہوسکا، اب ہمارے اس شر القرون کے زمانے میں یہ سلسلہ کیسے ختم ہوسکتا ہے؟ بتقاضۂ قربِ قیامت ان خباثتوں کا مزید عروج ہوگا، اسی عروج کا ہم آج مشاہدہ بھی کررہے ہیں۔ صحیح بخاری ودیگر کتب حدیث میں جو روایت موجود ہے کہ نفاق کا سلسلہ زمانۂ رسالت کے بعد ختم ہوگیا۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آئندہ نفاق نہیں ہوگا، بلکہ یہ مراد ہے کہ نفاقِ اعتقادی جو بذریعۂ وحی معلوم ہوتا تھا، وہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ آئندہ وحی نازل نہیں ہوگی، تو اس کے ذریعہ سے اعتقادی نفاق کا علم بھی ہمیں حاصل نہیں ہوگا، مگر نفاق کی قسم دوم (عملی نفاق) وہ وحی پر موقوف نہیں ہے، اس کی چند علامات ہیں، اور وہ اپنی علامتوں کی وجہ

سے بالکل صریح اور واضح ہے، جس کو ہر شخص شناخت کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، نفاق کا جو سلسلہ اب چل رہا ہے، شاید کسی زمانہ میں اس عموم و کثرت کے ساتھ نہ تھا، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نظر نہیں آتا، جس میں نفاق نہ ہو، ایسا کوئی عمل نہیں جو نفاق کی لعنت سے خالی ہو، اِلّا ماشاء اللہ! دینی، مذہبی، علمی، تبلیغی جیسے بابرکت شعبوں میں بھی یہ مرض سرایت کر رہا ہے، اور عام ہو رہا ہے۔ کیا یہ کوئی ہاتھی یا اونٹ ہے، جسے دور سے نظر آنا چاہئے، بلکہ جھوٹ، غلط بیانی، خیانت فی الامور یا فی الحقوق، وعدہ خلافی، حق تلفی، فتنہ وفساد، یہ وہ امور ہیں، جن پر نفاق کا قلعہ تعمیر ہوا ہے۔ اسلاف کے زمانے کے لوگ اگر کبھی اپنے علم وعقیدہ اور عمل میں ذرہ برابر بھی تفریق محسوس کرتے، تو فوراً نادم ہو کر روتے ہوئے کہتے ''توبہ، توبہ'' کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ہم نفاق میں چلے گئے۔

امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جامع صحیح میں باب قائم کرتے ہیں: ''بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ اَنْ یَّحْبَطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ لَا یَشْعُرُ'' ((وَقَالَ اِبْرَاهِیْمُ التَّیْمِیُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِیْ عَلٰی عَمَلِیْ اِلَّا خَشِیْتُ اَنْ اَکُوْنَ مُکَذِّبًا وَقَالَ ابْنُ اَبِیْ مُلَیْکَةَ اَدْرَکْتُ ثَلَاثِیْنَ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہ علیہ وسلم کُلُّهُمْ یَخَافُ النِّفَاقَ عَلٰی نَفْسِهٖ))۔ [بخاري ص: ۱۲]

حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما جن کا درجہ انبیاء علیہم السلام کے بعد ہے، حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ جنہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مخصوص منافقین کے نام بتائے تھے، یہ دونوں اکابران کے دروازے پر جاتے اور پوچھتے ہیں: اے حذیفہ! صحیح بتاؤ تمہاری فہرست میں ہمارے نام تو نہیں؟

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا ہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں، پس کوئی فائدہ نہیں دیا ان کو ان کی اس تجارت نے، اور نہیں تھے (نہیں ہوئے) وہ ہدایت یافتہ ﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

ہر انسان کی پیدائش اسلام پر ہوتی ہے۔ ہر شخص کی فطرت اسلام ہے، اور گمراہی عارضی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے، تو قیمتی سرمایہ عمر اور دیگر تمام اسباب ظاہری وباطنی حواس وغیرہ اسے مہیا کرتا ہے، کہ یہ تمہاری پونجی، سرمایہ اور رأس المال ہے۔ اس سے ایمان

واعمالِ صالحہ خرید لو، اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں راحت وسکون، اور ہر قسم کی خوشحالی حاصل رہے گی۔ عمر کا یہ سرمایہ برف کی مانند ہے، اس کو دوسرے سرمایہ کی طرح ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا۔ شب وروز، بلکہ ہر گھنٹہ یہ پگھل کر بہہ رہا ہوتا ہے۔ اگر پگھلنے سے پہلے قیمتی اشیاء ایمان واعمالِ صالحہ خرید کر ذخیرہ بنالیا گیا، تو یہ عمر والا سرمایہ کارآمد اور نفع بخش رہا، اور ابدی سعادت کا راستہ ہموار ہوگیا، لیکن اگر غفلت میں، یا دیدہ ودانستہ یہ گرانمایہ عمرِ عزیز (سرمایۂ تجارت) کفروشرک، نفاق ومعاصی، لہوولعب کی نذر ہوئی، اور انہیں برے اعمال میں ضائع کیا گیا، تو ابدی خسارہ اور ہمیشہ کی تباہی کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، اسی کو غیر منافع بخش تجارت اور خسارے سے تعبیر فرمایا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ کارخانۂ جہاں اور اس میں آباد انسان کی عمر کی مثال یہ ہے کہ ایک بہت بڑا وسیع وعریض بلند وبالا محل ہو، جسے سونے، چاندی، موتی اور جواہرات کی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہو، اور ہر قسم کی آرائشوں اور طرح طرح کی آسائشوں اور سہولتوں کے ساتھ تیار کیا گیا ہو، مگر اس کی بنیاد کو برف کی اینٹوں پر رکھا گیا ہو، تو یہ عمدہ محل دیر یا بزود بنیادی اینٹوں کے پگھلنے کے ساتھ دھڑام کے ساتھ زمین بوس ہوکر تباہ ہوجائے گا۔ یہی مثال گرانمایہ عمرِ عزیز کی ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا: صبح اُٹھ کر لوگ بازاروں کا رخ کرتے ہیں، پس کسی کی تجارت نفع بخش رہتی ہے، ایمان واعمال کے ذریعہ دوزخ سے نجات، اور جنت کا استحقاق حاصل ہوجاتا ہے۔ بعضوں کی تجارت خسارے کی نذر ہوکر جنت سے محروم اور جہنم کا استحقاق لازم آجاتا ہے۔ یہ ہے سراسر خسارہ ومحرومی۔ [مشکوۃ]

سرمایۂ حیات:

خلاصہ یہ ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو آخرت کی تجارت کے لئے تین قیمتی سامان دیئے ہیں: (۱) عمر (۲) عقل (۳) عمل۔

☆عمر کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِیْرُ﴾ [الفاطر: ۳۷] (کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو سوچنا چاہتا سوچ لیتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا)۔

☆عمل کے متعلق فرمایا: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملک: ۲] (اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھا عمل کرتا ہے)۔

اسی طرح تقریباً قرآن کریم میں عمل کا تذکرہ تین سو ساٹھ مقامات پر ہے۔

☆عقل کے متعلق ارشاد ہے: جہنمی قیامت کے روز خود اقرار کر کے کہیں گے: ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [الملک:۱۰] (اور کہیں گے اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے)۔ جہنم میں ڈالے جانے پر دوزخی خود کہیں گے کہ اگر ہم تھوڑی سی عقل رکھتے، یعنی عقل سے کام لیتے، تو آج برے ٹھکانے میں نہ آتے (تفصیل سورۃالملک میں دیکھیں)۔

تجارت کے لئے ضروری ہے کہ جو چیز جس مقصد کے لئے ہو، اس کو ٹھیک اسی جگہ پر صرف کیا جائے۔ یہ قیمتی عمر جس کی ایک ساعت گزر جائے، تو اربوں روپیہ کے بدلے اسے واپس نہیں خریدا جا سکتا۔ اگر اس نعمت کی قدر شناسی ہو، تو اس کے لمحات سے ابدی جنت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر نہیں، تو ابدی شقاوت ہی متعین ہے، جسے خسارے سے تعبیر فرمایا۔ جب یہ تینوں چیزیں غلط اور بے مقصد کام (کفر و شرک، نفاق) پر صرف ہوں، تو سمجھو سارا سرمایہ ضائع ہو گیا۔ پھر لطف یہ کہ یہ سارا سرمایہ ربّ العزّت سبحانہ نے مفت بغیر کسی قیمت کے عطا فرمایا ہے، اور حقیقت میں وہی اس سرمایہ کا مالک بھی ہے۔ اس کے باوجود ارشاد فرمایا کہ آؤ! میرے ساتھ تجارت کرو۔ میں اس کے بدلے تمہیں جنت اور ابدی راحت دیدوں گا۔

ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ [التوبة:۱۱۱] (خدا نے مؤمنوں سے ان کی جانیں، اور ان کے مال خرید لیے ہیں (اور اس کے) عوض ان کے لیے بہشت (تیار کی) ہے)۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الصف:۱۰] (اے مؤمنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ''عذابِ الیم'' سے خلاصی دے)۔

اسی تجارت کے طفیل مؤمنوں نے فوز و فلاح حاصل کی، جبکہ کفار و منافقین اس تجارت سے منحرف ہو کر عذابِ عظیم کے مستحق ہو گئے، حالانکہ تجارتی سرمایہ دونوں میں ایک جیسا مشترک ہے، مگر فرق استعمال کرنے، اور نہ کرنے کا ہے۔

قرآن کریم نے دوسری جگہ ان کے بارے میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [المنافقون:۳] (یہ اس لئے کہ یہ (پہلے تو) ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی)۔ یہ بدبخت یا تو ابتداء سے منافق تھے، یا ظاہری ایمان کے ہوتے ہوئے پھر کافر رہے۔ ایمان کے چمنستان سے نکل کر گمراہی کی خار دار وادی میں گرے، اور ایمان و طہارت کے وسیع میدان سے نکل کر خوف و ضلالت کے

اندھیروں میں آ گئے۔ کفر و نفاق کے متعلق ابتدائی آیتوں میں ہم نے تصریح کی ہے کہ منافق کئی قسم کے تھے، ایک وہ جو ﴿وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ سرے سے ایمان ہی نہیں لائے، محض جھوٹ بول کر ایمان کا اقرار کیا۔ دوسرے وہ جو ﴿اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ کے مصداق رہے، لہٰذا کوئی تعارض باقی نہیں رہا۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۝۱۷ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۝۱۸

ترجمہ: ان منافقوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی زائل کر دی (روشنی سلب ہوئی) اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۝۱۷ وہ بہرے، گونگے، اور اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے۝۱۸

معارف و منازل

یہاں سے اختتامِ رکوع تک چار آیتوں میں منافقین کے بارے میں دو مثالوں کا بیان ہے۔ پہلی مثال ناری (آگ) ہے، جبکہ دوسری مثال مائی (پانی) ہے۔

دو مثالیں اس لئے ہیں کہ منافقین میں دو طرح کے لوگ تھے: ایک وہ جو اپنے کفر میں پختہ اور پکے تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی اغراض و مقاصد کی خاطر کرتے تھے، حقیقی ایمان و اسلام سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ دوسرے لوگ وہ تھے جو کبھی اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہو جاتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض و دیگر امور انہیں اسلام قبول کرنے سے منع کرتے تھے، وہ ایک تذبذب اور تردّد و بے یقینی کا شکار رہتے تھے۔ پہلی مثال پہلے لوگوں کے لئے ہے، اور دوسری مثال دوسرے لوگوں کے لئے ہے۔

کسی مسئلہ میں مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاملہ واضح اور قریب الفہم ہو جائے، کیونکہ مثال بیان کرنے کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ کسی باریک چیز کو انسانوں کے ذہن کے قریب تر کیا جائے، اور عقلی چیز کو محسوس بنا دیا جائے۔ مثال کے ذریعے کہیں کسی چیز سے نفرت دلانا مقصود ہوتا ہے، اور کہیں کسی چیز کو ثابت کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

علماء یہود کی قباحت اس طرح بیان ہوئی: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعة:۵] (ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو) یہاں اس مثال میں منافقین کی قساوتِ قلب اور

حیرانی، نیز برکاتِ اسلام سے ان کی محرومی اور ناکامی کا بیان واثبات ہے، جنہوں نے فطری اسلامی استعداد کو ضائع کر کے اسلام کے عوض کفر خریدا، اس طرح ان کی تجارت سراسر نقصان کا شکار ہوئی، ﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى وَالۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَةِ﴾[البقرة:١٧٥] (وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی، اور بخشش چھوڑ کر عذاب خریدا)۔ دنیا وآخرت دونوں کی رسوائی ان کی قسمت میں آئی، جو تاجر سونے کے عوض مٹی خریدتا ہو، اور ایمان کے بدلے کفر، اور جنت کے عوض دوزخ، وہ کتنا نادان ہوگا؟

﴿مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا﴾ یہاں "الَّذِى" الذین کے معنی میں ہے، اور یہ کلامِ عرب میں عام رائج ہے۔ "نَارًا" سے مراد آگ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ شانہ نے ایمان کی روشنی کی مثال آگ سے دی ہے، کیونکہ انسان، بلکہ ہر قسم کی مخلوقات کے لئے روشنی بہت ہی ضروری ہے، بغیر روشنی کے زندگی وبال بن جاتی ہے۔ پھر آگ خاص کر ضروریاتِ زندگی کے اہم اجزاء میں سے ہے۔ موجودہ زمانہ میں بجلی کی بڑی اہمیت وضرورت ہے، جبکہ قدیم زمانے میں اس کا وجود نہ تھا، وہاں رات کو روشنی کے لئے آگ، اور دن کو روشنی کے لئے سورج ہوتا تھا۔ البتہ! بسا اوقات لوگ چاند کی روشنی سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ بہت سے علماء کرام نے چاند کی روشنی میں کتابیں لکھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے چار سال کے عرصے میں راتوں کو چاند کی روشنی میں "تاریخ کبیر" کی تالیف مکمل کر لی۔ چاند اور سورج کی روشنی قیامت تک برقرار رہے گی۔ قیامت کے بعد سورج، چاند اور ستاروں کی روشنی نہیں ہوگی، بلکہ تمام مادی روشنیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہاں صرف روحانی روشنیوں کا تابناک، روح پرور اور خوش منظر روشنیوں کا ابدی، دائمی اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگا۔ ایمان کی روشنی، قرآن کی روشنی، حج، صوم، زکوٰۃ کی روشنی، علمِ دین اور دیگر طاعات واعمالِ صالحہ کے بے حساب انوار وبرکات وغیرہ کی روشنی، جبکہ اسی حساب سے کفر ونفاق وبدعات ومعاصی اور مختلف گناہوں کی مختلف ظلمتیں اور تاریکیاں ہوں گی، جیسے کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ﴾ (اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے)۔ اور مؤمنوں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ﴾[البقرة:٢٥٧] (ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتے ہیں)۔ اسی طرح سورۃ النور میں ارشاد ہے: ﴿نُوۡرٌ عَلٰى نُوۡرٍ﴾[النور:٣٥] روشنی پر روشنی (ہو رہی ہے)۔

تو ایمان وعمل کی روشنی سے ہر طرف انوار پھیل جائیں گے۔ جس قدر مسلمانوں کے پاس ایمان وعمل ہوگا،

اسی قدر اس کی روشنی ہوگی، اور کافروں کے عمل کے مطابق تاریکی ہوگی۔ برزخ، قبر، میدانِ محشر، پلِ صراط ہر مقام پر ظلمتوں اور تاریکیوں کا دور دورہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ جب وہاں مؤمن چلیں گے، تو کفار ومنافق بول اٹھیں گے کہ تم لوگ کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ ہم بھی تمہاری روشنی پر چل کر یہ مرحلہ طے کرلیں۔﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ﴾[الحديد: ۱۴] ربّ العزّت سبحانہ ان کے درمیان ایک دیوار حائل فرمائیں گے، وہ کفار شرمندہ وناکارہ رہیں گے، اور کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔ حکم ہوگا:﴿قِيلَ ارْجِعُوْا وَرَاءَ كُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾[الحديد: ۱۳] (تو ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے کو لوٹ جاؤ، اور (وہاں) نور تلاش کرو)۔ پس کفار ومنافقین، مؤمنوں کی روشنی سے محروم رہیں گے، اور کسی قسم کا نور نہیں پاسکیں گے۔

تو آگ کو ایمان سے تشبیہ دی گئی، جیسے کہ آگ میں روشنی اور حرارت ہے، اسی طرح ایمان کی روشنی وحرارت (شجاعت عدالت، حکمت) کا حال ہے۔ اگر آگ میں کوئی اجنبی چیز ڈال دی جائے، تو آگ اسے جلا کر بھسم کر کے رکھ دے گی، یہی حال ایمان کا ہے، کہ اپنے اجنبی ضد کفر ونفاق کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے، بشرطیکہ ایمان خالص اور اخلاص والا ہو۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ناری مثال دیکر شمسی قمری مثال کیوں نہیں دی؟ تو جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند انسان کے بس سے خارج اور بلند وبالا ہیں، اس لئے ان کی مثال نہیں دی۔ مگر آگ انسان کے بس میں ہے، جب چاہے جلائے، جب چاہے بجھائے، تو آگ کی مثال مناسب اور موزوں ہے۔ بعض علماء کرام نے کہا ہے کہ چونکہ منافقوں کو آگ (آخرت کی آگ) کے ساتھ مناسبت ہے، اس لئے یہاں آگ کی مثال دی گئی۔ واللہ اعلم

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ یعنی ان منافقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے روشنی حاصل کرنے کی خاطر رات کی تاریکی میں آگ جلائی، اور جب اس کی روشنی ہر طرف خوب چمکی اور پھیل گئی، تو فوراً آگ بجھ گئی، اور وہ شخص ہکا بکا پریشان اور حیران رہ گیا۔ ان منافقوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان کا وہ نور اور استعدادِ فطرت (جو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں ودیعت رکھی ہے) ذرا چمکا تھا، یعنی ہر خیر وشر کو پہچاننے، اور سعادت وشقاوت پر مطلع ہونے کا وقت آیا تھا، تو ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بجھا دیا، یعنی ان کے نفاق اور تعصب وعناد اور حبِّ مال وجاہ کی ظلمت خیز آندھی نے اس چراغِ فطرت کو یکسر گُل کر دیا، حالانکہ یہ صحیح، سلامت اور حواس والے تھے۔ اب یہ بہرے ہیں، کسی ہادی کی بات نہیں سنتے، اور ساتھ گونگے بھی ہیں کہ اپنے مرضِ روحانی کو کسی حکیم کے سامنے بیان نہیں کرسکتے، اور نابینا، اندھے بھی ہیں، کہ معجزات اور مظاہرِ قدرت کو دیکھ کر راہِ ہدایت پر نہیں آسکتے۔ لہٰذا انہیں

ہدایت کسی طرح ہاتھ نہیں آسکتی۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ انہوں نے آگ جلائی، جس سے آس پاس میں روشنی پھیل گئی، یعنی دنیا میں کلمۂ توحید کو آڑ بنا کر غنائم، حفظِ جان وعیال ومال وغیرہ فوائد خوب حاصل کر لئے، مگر مرتے ہی یہ چراغ گل ہو گیا، تو اعمالِ بد، نفاق اور جہل مرکب اور قبر (برزخ) کی تاریکیوں میں گر کر کفِ افسوس ملتے رہے۔ اب نہ اکتسابِ ایمان وحسنات کا کوئی ذریعہ باقی رہا، نہ وہاں سے رجوع کر کے پھر دوبارہ دنیا میں آسکتے ہیں۔

﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ جیسے:﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ نور روشنی کے گم ہونے اور سلب ہونے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اسی طرح ہے، جیسے:﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ کی ہے۔ ختم کی نسبت کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا، کیونکہ روشنی کے بجھ جانے، اور دلوں پر مہر لگانے، اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے ظاہری اسباب وعلل اگرچہ کفر ونفاق اور سرکشی وعناد ہی ہیں، مگر ہر چیز کی تخلیق خواہ شر ہو یا خیر، اور ہدایت ہو یا گمراہی، سارے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہر چیز کا خالق وپیدا کنندہ ہے، اور حقیقی مسبّبُ الاسباب بھی ہے، اس لئے یہ نسبت حقیقی بھی ہے، اور اصلی بھی۔﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾[الدھر:۳۰] (اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو خدائے ربّ العالمین چاہے)۔ البتہ انسان اپنے ارادے اور اختیار سے خیر وشر کے انتخاب پر خود مختار ہے، اس لئے کبھی کبھی افعال کی نسبت اسی کی طرف بہ سببِ اختیار منتقل ہو جاتی ہے، ورنہ خالق تو ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس بارے میں تفصیل گزر چکی، وہاں دیکھ لی جائے۔

گر گزندت رسد زخلق مرنج ☆ کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج
از خدادان خلاف دشمن ودوست ☆ کہ دل ہر دو در تصرف اوست
گرچہ تیر از کمان ہمے گزرد ☆ از کماندار بیند اہل خرد
(سعدیؒ)

تشبیہ، تمثیل اور نظیر کا فرق:

مثال وہ قول ہے جو دوسرے قول کے مشابہ ہو، اور ایک سے دوسرے کی حالت ووصف کھل کر واضح ہو جائے، گویا دوسرے کی تصویر اول کے ذریعہ سے نظر کے سامنے آجائے۔[راغب] مثل ہمیشہ (بیشتر) کلامِ مرکب میں ہوتا ہے، اور تشبیہ کلامِ مفرد میں، یعنی بیشتر تشبیہ کا تعلق مفرد کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے: "زید کالأسد" کبھی

احیاناً مرکب میں بھی ہوتا ہے۔علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ مطول میں لکھتے ہیں کہ مثل کا ممثل لہ کے افراد میں سے ہونا ضروری ہے، اور نظیر کے لئے یہ شرط نہیں ہے، بلکہ نظیر منظر لہ کے افراد میں سے نہیں ہوتی۔صحیح بخاری ''حدیثِ ہرقل'' میں ہے: ''ثم كتب هرقل إلى صاحب له برومية وكان نظيره في العلم''۔یہ عبارت اسی معنی کی عکاس ہے۔

البتہ! یہ ضروری ہے کہ مثال وتمثیل میں ندرت، یا عظمت، یا کسی حقارت واُعجوبہ کا ہونا ضروری ہے۔

عظمت کی مثال قوله تعالى:﴿ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ ﴾[النور:۳۵] یہاں عظمت کے معنی میں ہے۔

ندرت کی مثال قوله تعالى:﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ﴾[الرعد:۳۵] یہاں ندرت کے معنی میں ہے۔

ذلت کی مثال قوله تعالى:﴿ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ﴾[العنكبوت:۴۱] یہاں ذلت (ضعف) کے معنی میں ہے۔

حقارت کی مثال قوله تعالى:﴿ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾[الجمعة:۵] یہاں حقارت کے معنی مراد ہے، اسی طرح پورے قرآن کریم میں مختلف معانی کے ساتھ بقول امام رازیؒ وامام جصاصؒ کے ایک ہزار مثالیں موجود ہیں۔البتہ! یہ یاد رہے کہ مثال واُمثلہ کے لئے ''ضرب'' کا کلمہ جو اکثر وبیشتر مذکور ہوتا ہے، عام طور پر لوگ اسے معمہ سمجھتے ہیں۔ان شاء اللہ عنقریب اس کا مطلب بیان ہوگا۔فانتظر حتی یأتیک البیان

منافقین دس اندھیروں میں ہوں گے:

خلاصہ یہ کہ جب وہ عارضی آگ اور عارضی روشنی بجھ کر ہمیشہ کے لئے سلب ہوگئی، تو انہیں بے انتہاء اندھیروں میں چھوڑ گئی، کیونکہ یہ روشنی عارضی تھی، جب وہ منقطع ہوگئی، تو وہ اپنی اختیار کردہ برائیوں کے بہت سے اندھیروں میں پھنس گئے۔

﴿وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ﴾ اس مقام پر جن اندھیروں کا ذکر ہے، جن میں منافقین سرگرداں وپریشاں ہیں، ان کی بہت سی قسمیں ہیں:وہ ساری کی ساری ان پر صادق ہیں:

پہلا اندھیرا کفر کا ہے۔قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اسلام وایمان کو نور سے تعبیر فرمایا ہے، اور کفر کو ظلمت وتاریکی کہتا رہا ہے، کیونکہ کفر سے بڑھ کر کوئی تاریکی نہیں ہے۔

دوسرا اندھیرا مکر وفریب وچالبازی کا ہے، جو کہ منافقین کی مخصوص صفت وعلامت ہے۔

تیسرا اندھیرا دروغ گوئی غلط بیانی کا ہے، جو کہ منافقین کی بنیادی خصلت رہی ہے۔

چوتھا اندھیرا طعن وتشنیع کا اندھیرا ہے، جو یہ لوگ اہلِ ایمان پر مسلسل کرتے رہتے تھے۔

پانچواں اندھیرا جہلِ مرکب کا بھیانک اندھیرا ہے، جہل مرکب منافقین کا شعار ہے۔

جہالت دو قسم پر ہے:

☆جہلِ بسیط ☆اور جہلِ مرکب۔

اگر کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہو، یہ جہلِ بسیط ہے، ایسا شخص جب بھی متعلقہ چیز سے واقفیت حاصل کرلے گا، تو وہ اس جہل سے نکل جائے گا۔

دوسرا جہلِ مرکب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلط بات کو صحیح سمجھے، برے اور باطل عقیدہ کو اچھا سمجھے، یہ جہالت بڑی خطرناک ہے، کیونکہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، ایسا شخص نہ غلط کو غلط سمجھے گا، اور نہ صحیح کو صحیح، اس جہالت کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ لاعلاج مرض کی طرح ہے، یہی جہلِ مرکب ہے، جس کے ہوتے ہوئے فسادی لوگ بھی اپنے آپ کو ''مصلحون'' کہتے رہے۔

چھٹا اندھیرا معاصی اور نفسانی خواہشات وشہوات کا اندھیرا ہے، یہ منافقین کی رات دن کی خوراک وغذا شمار ہوتا تھا، اسی بنیاد پر وہ شیاطین کے شاگرد رہے، بقول حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے۔

ساتواں اندھیرا قبر کی تباہ کن تاریکی اور اندھیرا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے: ''ان ھٰذہ القبور مملؤۃ ظلمۃ علی أھلھا''۔ [مسلم] اگر نورِ ایمان کسی کو نصیب نہ ہوا، تو اس کی قبر کی ظلمت وتاریکی مثالی ہوگی۔ نعوذ باللہ منہا۔

آٹھواں اندھیرا پلِ صراط کا ہوگا، یہ تمام اندھیروں کا جامع اور خلاصہ ہوگا، جیسا کہ پہلے گزرا۔

نواں اندھیرا جہنم کا ہوگا۔

دسواں اندھیرا جہنم کے نچلے طبقے، یعنی درکِ اسفل کا ہوگا۔ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ۱۴۵] (کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجے میں ہوں گے)۔

اللہ ربّ العزّت کی شان دیکھیے کہ اس جہاں اور اس کی مخلوقات کو ہزاروں اضداد سے مرکب پیدا فرمایا۔

اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہے، اور برگزیدہ لوگ پیغمبروں کے بعد مؤمنین مخلصین ہیں، جن کی معرفت وشعار تقویٰ اور نورِ ایمانی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ لوگ کفار ومنافقین کے لئے دس ظلمتوں کی نشاندہی ہوئی، اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مؤمنین مخلصین کے لئے دس انوار روشنیوں کو ثابت فرمایا، جن میں پہلا نور کلمۂ طیبہ کا ہے، اور آخری نور دخولِ جنت کے بعد ہوگا، اور وہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی رؤیت اور زیارت کا ہے، جو کہ جنت میں ہوگا۔ (تفسیر عزیزی سے اقتباس)

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ
اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑳

ع

ترجمہ: یا ان کی مثال آسمان کی طرف سے اترنے والی اس زوردار بارش کی ہے، جس میں تاریکیاں، گرج اور بجلی کی چمک ہے، یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں، بادل کی کڑک سے موت کے ڈر سے، اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ⑲ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے، جب وہ ان کیلئے روشنی کرتی ہے، تو وہ اس میں چلتے ہیں، اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو کھڑے ہوجاتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو لے جائے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ⑳

معارف ومنازل

یہ دوسری مثال ان منافقین کی ہے، جن کا کفر راسخ نہیں ہے، بلکہ وہ تذبذب اور تردّد کے شکار ہیں۔ یہ قسم اول کی طرح ''صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ'' نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں ''لَا يَرْجِعُوْنَ'' کا حکم بھی وارد نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ تردّد وشبہات کے گرداب سے نکل کر ایمان اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ واللہ اعلم

﴿صَيِّب﴾ تیز بارش کو کہتے ہیں۔ ظلمت بہت سی تاریکیاں، رات کی تاریکی، بادل کی تاریکی اور بارش کے قطرات کی تاریکی۔ ﴿سَمَاء﴾ سے مراد آسمان ہے، لیکن یہاں بادل مراد ہے، کیونکہ ہر بلندی پر ''سماء'' کا

اطلاق ہوسکتا ہے۔ ﴿رَعْدٌ﴾ گرج، یہاں مراد وہ فرشتہ ہے جوکہ بادلوں پر مامور ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یہود نے سرور عالم ﷺ سے پوچھا کہ رعد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''بادلوں پر مامور فرشتہ ہے''۔ [ترمذي] قرآن کریم نے فرمایا: ﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ﴾ [الرعد:١٣] (اور رعد اور فرشتے سب اس کے خوف سے اس کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں)۔ ﴿بَرْقٌ﴾ سے بجلی اور فرشتہ کا چابک مراد ہے۔ ﴿صَوَاعِق﴾ سے کڑک، زور دار آواز مراد ہے، جوکہ تباہ کن ہے۔ قرآن مجید نے فرمایا: ﴿فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ [الزمر:٦٨] (جو لوگ آسمان میں ہیں، اور جو زمین میں ہیں سب بے ہوش ہوکر گر پڑیں گے) صَعِقَ بمعنی موت کے ہے؛ لأن الصاعقة من أسباب الموت۔

فائدہ:

وحی اور پانی میں عجیب مشابہت:

یہ دوسری مثال مائی ہے، جس میں اسلام (وحی الٰہی) کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، جس طرح پانی سببِ حیات وبقاء ہے، اسی طرح روحانی حیات وبقاء وحی الٰہی پر موقوف ہے۔ پانی کی چند ایسی صفتیں جو وحی کے ساتھ نمایاں ہیں، مثلاً:

﴿١﴾ پانی ذریعۂ حیات ہے۔ **قوله تعالىٰ:** ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ [الأنبياء:٣٠] (اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے؟) اسی طرح وحی بھی سببِ حیاتِ روحانی ہے، بلکہ وحی کے طفیل دنیوی زندگی بھی سدھر جاتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ مؤمن کی زندگی کافر کی زندگی سے بدرجہا عمدہ و پاکیزہ اور محفوظ ہے۔

﴿٢﴾ پانی کے ذریعے مردہ زمین سرسبز وزندہ ہوجاتی ہے، جس طرح وحی کے ذریعے مردہ اور ناکارہ قلوب زندہ ہوکر کارآمد بن جاتے ہیں۔

﴿٣﴾ پانی عموماً پستی اور نشیبی زمین کا رخ کرتا ہے۔

ع ہر کجا پستی ست آب آنجا رود......

پانی اپنی طبعی رغبت کے ساتھ کبھی بلندی پر راغب نہیں ہوتا، یہی حال وحی الٰہی کا بھی ہے کہ اسے متواضع اور منکسر المزاج لوگ قبول کرتے ہیں۔ متکبر، مغرور، اونچی گردن والے لوگوں تک چنداں وحی کا گزر نہیں ہوتا، اور نہ ہی

وحی کو قبول کرتے ہیں۔

﴿۴﴾ پانی کی یہ خاصیت ہے کہ سخت پیاس کو بجھا دیتا ہے، اور باطنی حرارت کو ختم کر دیتا ہے، یہی کیفیت وحی الٰہی کی بھی ہے، کہ معاصی کی حرارت کو باطن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر گناہ میں جہنم کی حرارت وگرمی موجود ہوتی ہے، اسی وجہ سے جہنم گناہگاروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

﴿۵﴾ پانی آگ کا دشمن ہے، پانی گرم ہونے کے باوجود آگ کو بجھا دیتا ہے، یہی کیفیت وحی الٰہی کی بھی ہے، جس سے جہنم کی آگ بجھ جاتی ہے۔

﴿۶﴾ پانی کا نزول اوپر آسمانوں سے ہوتا ہے، اسی طرح وحی الٰہی بھی اوپر سے آتی ہے۔

﴿۷﴾ پانی ظاہری طہارت کا سبب ہے، جبکہ وحی الٰہی ظاہر وباطن دونوں طہارتوں کا سبب ہے۔

﴿۸﴾ پانی بہ نسبت دیگر اشیاء کے بلا قیمت مفت مہیا ہوتا ہے، یہی حال وحی الٰہی کا بھی ہے۔

﴿۹﴾ پانی خود رقیق اور پتلا ہے، اور ہر چیز میں رقت ونرمی پیدا کرتا ہے، اسی طرح وحیِ الٰہی سخت سے سخت پتھر جیسے دلوں کو نرم کرتی ہے۔

﴿۱۰﴾ پانی کبھی لذیذ شیرین ہوتا ہے، کبھی تلخ اور کڑوا، اسی طرح مؤمن کیلئے وحی لذیذ وشیرین ہے، جبکہ کافر ومنافق کے لئے کڑوی اور تلخ ہوتی ہے۔ مؤمن اسے دل وجان سے قبول کرتا ہے، جبکہ کافر اس سے دور بھاگتا ہے۔

قرآن کریم نے فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَاهُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَايَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الإسراء: ۸۲] (اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے، اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے)۔

آیت کریمہ کا مطلب وتفسیر یہ ہے کہ منافقوں کی مثال اوپر آسمان (بادل) کی طرف سے زوردار برسنے والی بارش کی ہے کہ جس میں سراسر خلقت کا نفع ہے، اگرچہ بظاہر اس میں رعد، بجلی، کڑک، اور کئی طرح کے اندھیرے بھی ہوتے ہیں، یعنی اعمال کی مشقت، مگر جس طرح انسانی طبائع اس کڑک اور بجلی کی چمک سے گھبرا جاتی ہیں، اور کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہیں، آنکھوں کو بند کرتے ہیں، کہ خطرناک آواز سنائی نہ دے، کہیں کانوں کے پردے پھٹ نہ جائیں، اور آنکھیں بھی ضائع ہونے سے محفوظ رہیں۔ بسا اوقات کسی دیوار یا مکان کا سہارا لے کر چھپ جاتے ہیں، اسی طرح یہ منافقین اس آسمانی بارش (وحی الٰہی) سے جو ابدی زندگی اور خوشحالی کا پانی ہے، یعنی اسلام اور قرآن

مجید، اوراس کے مواعظِ حسنہ واعمالِ سعیدہ، حمیدہ اور وعد و وعید، جن کی چمک اور کڑک بجلی کی آواز و چمک سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے کانوں میں انگلیاں دے ڈالتے ہیں، تا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مواعظِ حسنہ اور قرآن کریم کی تلاوت نہ سنیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح آنے والی مصیبتوں سے جو دنیا وآخرت میں حبِّ شہوات اور چندروزہ لذّتوں کے سبب پیش آنے والی ہیں، کسی طرح بچ جائیں (کیونکہ یہ لوگ تذبذب اور شبہات میں گرے ہوئے ہیں)۔

مگر ہادیٔ برحق کی تلخ دواء پیئے بغیر جس میں سراسر روحانی شفاء ہے، اس مرض الموت سے کوئی نجات نہیں، کیونکہ ربّ العزّت سبحانہ کا جملہ مخلوق پر بالخصوص کفار ومنافقین پر قدرتِ الٰہی کا پورا احاطہ اور گرفت یقینی ہے۔ کوئی کہاں بھاگ کر جاسکتا ہے؟ اور نہ کوئی محفوظ قلعہ کسی کو پناہ دے سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی زبردست لشکر کسی کو بچاسکتا ہے۔

ہاں! بچنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح اس تلخ دواء کو پی کر نفس کشی ومجاہدہ اپنا کر اور چارروزہ لذّتوں اور شہوتوں کو چھوڑ کر مال وجاہ کی چاہتوں سے دور ہوجائے تب یہ ابدی سعادت حاصل ہوسکتی ہے۔ ان تدبیروں کے بغیر کوئی نجات ممکن نہیں۔

آگے ارشاد ہے کہ جس طرح بارش میں بجلی کی چمک سے آنکھیں چندھیا جاتی، اور بند ہوجاتی ہیں، اور جب بجلی کی چمک سے روشنی ہوتی ہے، تو انسان چند قدم چلنے لگتا ہے۔ اگر چمک بند ہوجاتی ہے، تو خوف ودہشت اور کچھ نظر نہ آنے کی وجہ سے رک جاتا ہے، یہی حال ان منافقین کا ہے، کہ برقِ قرآن اور نورِ ایمان سے ان کی آنکھیں چندھیاتی اور خیرہ ہوجاتی ہیں، اور اس برحق روشنی کی ان کی آنکھوں میں برداشت نہیں ہوتی ہے۔

جب اسلام کی بجلی چمکتی ہے، یعنی کچھ فوائد اور ظاہری منافع مالِ غنیمت وغیرہ کا حصول ممکن ہوتا ہے، تو مسلمانوں کا ساتھ دے کر چلنا شروع کردیتے ہیں ﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا﴾ کہتے رہتے ہیں، اور جب انہیں جہاد جیسے عمل و دیگر اسلامی اعمال کا حکم ہوتا ہے، تو ان کے قلوب اور حواس پر تاریکی چھا جاتی ہے، یا یہ کہا جائے کہ مالِ غنیمت دستیاب نہیں ہوتا، تو تاریکی ان پر مسلط ہوجاتی ہے، تو ''قَامُوْا'' یہ کھڑے ہوجاتے ہیں، ٹھہر جاتے ہیں۔ ساتھ چلنے کی ہمت نہیں کرتے ہیں، یہ حد درجہ کے خودغرض اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔

پرندوں میں ایک احمق پرندہ ایسا بھی ہے، بلکہ خرگوش بھی کہ جب شکاری اس کے قریب پہنچتا ہے، تو وہ آنکھیں بند کرتا ہے، کہ جس طرح میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں، شاید وہ بھی مجھے نہیں دیکھ رہا، پس آسانی سے شکار ہوجاتا

ہے۔ان منافقین کا یہی خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ ہمیں نہیں دیکھ رہا، اس وجہ سے تو ہم محفوظ ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی مصلحت، حلم وبردباری اور رحمتِ تامہ کے تحت مجرم کو تحفظ وڈھیل دیتا ہے، جلدی نہیں پکڑتا۔

ارشادفرمایا:

﴿وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ﴾ (اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں (کی شنوائی) اور آنکھوں (کی بینائی دونوں) کو زائل کردیتا)، کیونکہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

؎ تو مشو مغرور بر حلم خدا ☆ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

(مثنوی)

کوئی مجرم اللہ تعالیٰ سبحانہ کی گرفت وپکڑ سے باہر نہیں، مگر اس کا حلم بے مثال ہے، وہ بڑے سے بڑے مجرموں کو اتنی ڈھیل دیتا ہے کہ مظلوم بیچارے غم کے مارے پگھل جاتے ہیں، کہ ان مجرموں کی جلدی پکڑ کیوں نہیں ہوتی؟

مؤمنوں کے انوار اور ظاہری وباطنی روشنی:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سب توحید والوں کو قیامت کے دن نور ملے گا، جب منافقوں کا نور بجھ جائے گا، تو موحد ڈر کر کہیں گے: ﴿رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ [التحریم:٨] (اے اللہ تعالیٰ ہمارے نور کو پورا فرما)۔[ابن ابی حاتم] سید کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض مؤمنوں کو مدینہ طیبہ سے لے کر عدن تک نور ملے گا۔بعض کو اس سے کم، یہاں تک کہ بعض کو اتنا کم کہ صرف پاؤں رکھنے کی جگہ ہی روشن ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایمان والوں کو ان کے اعمال کے مطابق نور ملے گا، بعض لوگوں کو پہاڑوں کے برابر ملے گا، بعض کو کھجور کے درخت کے برابر، بعض کو قدِ آدم کے برابر، کسی کو صرف اتنا کہ اس کا انگوٹھا ہی روشن ہو، کبھی بجھ جاتا ہو، کبھی روشن ہوجاتا ہو، جس کی روشنی میں پلِ صراط کو عبور کریں گے، اور سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کا نور اس کے انگوٹھے پر ہوگا، کبھی چمک اٹھے گا، کبھی بجھ جائے گا۔[ابن کثیر]

بہر حال! قرآن کا نور، نمازوں کا نور اور دیگر عبادتوں کے انوار سارے مل کر ایمان وتوحید کے نور کے ساتھ جمع ہوجائیں گے، تو نور علی نور کی کیفیت پیدا ہوجائے گی، جس کا تذکرہ سورۂ نور میں مفصل آنے والا ہے۔ ان شاء اللہ

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: اے لوگو! اپنے ربّ کی عبادت کیا کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تاکہ تم پرہیز گار (متقی) ہو جاؤ ﴿۲۱﴾ جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور آسمان کی چھت بنادی، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے تمہارے کھانے کے لیے پھل نکالے، تو پھر کسی کو بھی خدا تعالیٰ کا شریک نہ بناؤ، حالانکہ تم جانتے بھی ہو ﴿۲۲﴾

ربط و مناسبت:

دوسرے رکوع کے اختتام تک خصوصیت کے ساتھ مؤمنین، اور ان کی اکثر صفات کا بیان ہوا، پھر دو آیتوں میں کفار کے احوال بیان ہوئے، اور تیرہ آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ منافقین کے احوال بیان ہوئے، اس کے ساتھ ناری اور آبی مثالوں کے ذریعے منافقین کا انجام بیان ہوا، اب تیسرے رکوع میں عمومی خطاب ہے، جو قیامت تک آنے والی انسانیت کو شامل ہے۔

مختصر موضوع:

اس رکوع میں پانچ مضامین (احکام) کا بیان ہے:

(۱)......توحیدِ باری تعالیٰ سبحانہ (۲)......رسالت الرسول صلے اللہ علیہ وسلم (۳)......حقانیتِ قرآن کریم۔
(۴)......قیامت (معاد) کا بیان۔ (۵)......عبادت کا بیان، اور اس کا اختصاص ذاتِ باری تعالیٰ سبحانہ کے ساتھ۔

معارف و منازل

عبادت کے لغوی معنی یہ ہیں: "اَلْعِبَادَۃُ فِی اللُّغَۃِ الطَّاعَۃُ مَعَ الْخُضُوْعِ وَفِی الشَّرْعِ عِبَارَۃٌ عَمَّا یَجْمَعُ کَمَالَ الْمَحَبَّۃِ وَالْخُضُوْعِ وَالْخَوْفِ"۔ عبادت نام ہے محبت، خشوع و خضوع اور خوف کے مجموعے کا، یعنی مسلمان محبت و شوق (ظاہری و باطنی عجز و نیاز) کے ساتھ معبودِ برحق جل جلالہٗ کی اطاعت اس بناء پر بجالاتا ہے کہ اس کی ناراضگی کا خوف رکھتا ہے، اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

''رَبّ'' پرورش کرنے والا، پروردگار، مالک، صاحب، رَبَّ یَرُبُّ کا مصدر ہے، جس کے معنی تربیت کے

ہیں، پھر مبالغہ کے لیے ''زیدعدل'' کی طرح بطورِ وصف استعمال کیا جانے لگا، اور بعض کا قول ہے کہ ''بـرّ'' کی طرح صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ امام راغبؒ کا بیان ہے کہ ربّ مصدر ہے، جو فاعل کے لیے مستعار ہے۔ تربیت کی تعریف امامِ موصوف نے ان الفاظ میں کی ہے: ''هُوَ اِنْشَاءُ الشَّيْئِ حَالاً فَحَالاً اِلٰى حَدِّ التَّمَامِ وَ الْكَمَالِ''۔ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے، ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ [لغات القرآن] تفصیل سورۂ فاتحہ میں دیکھی جائے۔

''اَنْدَادًا'' مقابل، ہمسر، برابر ''نِـدّ'' کی جمع ہے۔ ''نـدّ'' اس کو کہتے ہیں جو کسی شئی کی ذات اور جوہر میں شریک ہو، نداور مثل میں فرق یہ ہے کہ مثل عام ہے، اور ند خاص ہے۔ مثل کا استعمال ہر قسم کی شرکت میں ہوتا ہے، لیکن ند کا استعمال صرف ذاتی شرکت ہی کے بارے میں ہوسکتا ہے۔ [لغات القرآن]

مذکورہ آیاتِ کریمہ کی اجمالی تشریح:

فرمایا کہ یہ سارا عالم علویات وسفلیات کے ساتھ بمنزلہ ایک کشادہ، خوبصورت اور عمدہ مکان کے ہے۔ آسمان اس کی بلندو بالا چھت ہے، اور زمین اس کا فرش ہے، اور سورج، چاند، نجوم وکواکب اس گھر کے شمع اور چراغ ہیں۔ بے شمار اور قسم قسم کے ماکولات ومشروبات فروٹ، پھل، میوے اس کے دسترخواں پر چنے ہوئے ہیں، عالم کے تمام شجر وحجر، جڑی بوٹیاں، پھول، پودے، حیوانات، چرند پرند اور طرح طرح کے عمدہ نفیس ملبوسات ومراکب، سواریاں وغیرہ انسان کی خدمت ومنفعت واستمتاع کے لیے حاضر ومسخر اور تیار ہیں، اور یہ مکان اپنے لاکھوں منافع کے ساتھ انسان (بنی آدم) کی رہائشگاہ ہے۔ پس جس ذات پاک واحد لاشریک لہٗ نے یہ تمام نعمتیں پیدا کیں، اور مفت، بلا قیمت وبلا معاوضہ انسان کو عطا فرمائیں، تو وہی قابلِ پرستش ہے، اور ہر قسم کی عبادتوں کی خصوصیت کے ساتھ بلاشرکتِ غیر حقدار ولائق ہے، جب ان بے شمار نعمتوں کے پیدا کرنے اور مہیا کرنے میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے تو اس کی عبادت اور بندگی میں دوسروں کو شریک کرنے کی کہاں، کیسے اور کس طرح گنجائش ہے؟ ہرگز، ہرگز، ہرگز نہیں۔

یہ بات اَظہر من الشمس ہے کہ انسان کائنات کی ہر چیز کا محتاج ہے، مگر کائنات کی کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کی محتاج ہو یا اس کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی ہو، کسی مرحلے میں انسان کا نام ونشان اور وجود ہی معدوم تھا، جیسے کہ فرمایا: ﴿لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ [الدھر: ۱] (وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا) جبکہ کائنات کی ہر چیز اپنی جگہ

پر موجود تھی، یعنی مکان موجود تھا، مگر مکین پردۂ خفاء میں معدوم تھا، اب اگر سارے انسان معدوم اور ختم ہوجائیں، تو آسمان، سورج، چاند اور ستاروں کا کچھ نہیں بگڑتا، اگر ایک بھی انسان نہ رہے، تو زمین کا کچھ بھی نقصان نہ ہوگا۔ پہاڑ، درخت، سبزہ، جنگلات، دریا اپنی اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ انسان کے کام کی نہ ہو، اور انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ بامقصد پیدا شدہ انسان جب کسی چیز کے کام کا نہیں، تو پھر اس کی تخلیق کس مقصد کے لیے ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے بے مقصد کسی مخلوق کی (خاص کر اشرف المخلوقات انسان) تخلیق نہیں فرمائی۔ ﴿رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ [آل عمران:۱۹۱] (اے پروردگار! تونے اس (مخلوق) کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو اس کا ایک ہی نتیجہ متعین ہوا کہ انسان جب کسی چیز کے کام کا نہیں، تو وہ صرف اور صرف خالقِ کائنات کے کام کا ہوگا، اور یہ واضح ہے کہ خالق عزّ شانہ غنی ہے، اس کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں، اور نہ ہی وہ کسی چیز کا محتاج ہے، وہ کیا چیز ہوگی جو وہ انسان سے طلب کرتا ہے؟ ہاں! وہ صرف ایسی چیز ہوگی، جو اس کے خزانے میں نہیں، اسی کو انسان سے طلب کیا جارہا ہے، وہ ہے عجز و نیاز اور طاعت و بندگی۔

چار چیز آوردہ ام شاہا کہ در گنج تو نیست ☆ بندگی و عاجزی عذر و گناہ آوردہ ام

تو انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ معبودِ برحق کے حضور جھکے، اپنی ذلت اس کے سامنے پیش کرے، اور تادمِ مرگ اس کی عبادت نہایت اخلاص و توحید کے ساتھ بجالائے، اور انتہائی ذلت کے ساتھ اپنے دلی جذبات کو محبت کے ساتھ پیش کرلے، اور اس طرح کہے: اے اللہ! جیسے تیری عزّت و عظمت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے، تیرے حضور میں وہ ذلت و نیاز پیش کرتا ہوں کہ اس ذلت کی بھی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ میں تیرے سامنے انتہائی پستی کے عالم میں سربسجود ہو کر پیشانی رگڑتا ہوں، تاکہ میری تخلیق کا مقصد پورا ہو، اور تیری رضا مجھے حاصل ہو، و بس۔

سوال: یہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کیوں ہے؟ اور اس کا اصلی معیار کیا ہے؟

جواب: اس کی تفصیل آئندہ آنے والی ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ عبادت نفع و نقصان اور عظیم بے بدل نعمتوں کی بناء پر کی جاتی ہے، جس ہستی کے قبضے میں انسان کا ہر نفع و نقصان ہو، اور اس کی بے حساب ظاہری و باطنی نعمتوں کا صبح و شام سلسلہ جاری ہو، اور اس کا دستِ قدرت اتنا وسیع ہو، جس کی وسعت پوری کائنات سے زیادہ، اور اس پر محیط ہو، زندگی و موت دنیا و آخرت کی تمام نعمتیں اس کے قبضے میں ہوں۔ ایک ادنیٰ نعمت سے لے کر اعلیٰ نعمتوں

تک سب کو دینے والا صرف وہی ہو، اس کے بغیر اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی بڑی سے بڑی عظیم ہستی کوئی نعمت دینے والی نہ ہو، بلکہ سب اس کے دست نگر و محتاج ہوں، تو عقلِ سلیم کا تقاضا اور انصاف کا فیصلہ یہی ہوگا کہ ہر قسم کی عبادتوں کا صرف اور صرف وہی حقدار و سزاوار ہوگا۔ باقی ساری مخلوق جب کہ خود محتاج ہو، کسی عبادت کی حقدار نہیں ہوگی۔

پس کوئی عاجز و محتاج ہستی اگرچہ ماتحت الاسباب کسی اطاعت کی سزاوار ہو، وہ الگ بات ہے، مگر کسی ادنیٰ عبادت کا کوئی حقدار نہ ہوگا، حتی کہ اگر کوئی کسی اولوالعزم پیغمبر کو نفع ونقصان کا مالک تصور کرے گا، تو یہ صریح شرک شمار ہوگا، اور ایسے لوگ جہنمی شمار ہوں گے، جنہوں نے ایسا عقیدہ رکھا ہو۔ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَالَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـئًا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ ۞ اُفٍّ لَّـكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ [الأنبياء:٦٧] (ابراہیم نے) کہا: پھر تم خدا کو چھوڑ کر کیوں ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو نہ تمہیں کچھ فائدہ دے سکیں، اور نہ نقصان پہنچا سکیں؟ تف ہے تم پر، اور جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان پر بھی، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟) پھر فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَنۡ يَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ؕ وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡـئًا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ﴾ [الحج:٧٣] (جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے، اگرچہ اس کے لئے سب مجتمع ہو جائیں۔ اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (یعنی عابد اور معبود دونوں) گئے گزرے ہیں)۔

اسی طرح نہایت واضح فرمان ہے: ﴿قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوۡ كُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ لَاسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَيۡرِ ۖ ۛۚ وَمَا مَسَّنِىَ السُّوۡٓءُ ۛۚ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ وَّبَشِيۡرٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ﴾ [الأعراف:١٨٨] (کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا، اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں تو مؤمنوں کو ڈرانے والا، اور خوشخبری سنانے والا ہوں)۔

مذکورہ آیت میں بتلایا گیا ہے کہ بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، نہ اپنے ''اندر اختیار مستقل'' رکھتا ہے، نہ علم محیط۔ سید الانبیاء مولائے کُل صلی اللہ علیہ وسلم جو علومِ اولین وآخرین کے حامل اور خزائن ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے، ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہے کہ میں دوسروں کو کیا، خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا، نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں، مگر جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے اُتنے ہی پر میرا قابو ہے، اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا، تو بہت سی وہ

بھلائیاں اور کامیابیاں حاصل کر لیتا، جو علمِ غیب نہ ہونے کی وجہ سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں، نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھ کو پیش نہ آیا کرتی، مثلاً: ''اِفک'' کے واقعہ میں کتنے دنوں تک حضور اکرم ﷺ کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب و قلق رہا۔

حجۃ الوداع میں صاف ہی فرمادیا: ''لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمَاسُقْتُ الْهَدْیَ''۔ [بخاری]

اگر میں پہلے سے اُس چیز کو جانتا ہوتا جو بعد میں پیش آئی، تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا۔ اسی قسم کے بیسیوں واقعات ہیں، جن کی روک تھام ''علمِ محیط'' رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب واقعہ یہ ہے کہ ''حدیثِ جبریل'' کی بعض روایات میں آپ ﷺ نے تصریحاً فرمایا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جبرئیل امین کو نہیں پہچانا۔ یہ واقعہ بتصریحِ محدثین بالکل آخری عمر مبارک کا ہے۔ اس میں قیامت کے سوال پر ''ماالمسئول عنہا بأعلم من السائل'' ارشاد فرمایا ہے، گویا بتلادیا گیا کہ ''علمِ محیط'' خداوند تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، اور علمِ غیب تو درکنار، محسوسات و مبصرات کا پورا علم بھی خدا تعالیٰ ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت نہ چاہے تو محسوسات کا بھی اِدراک نہیں کر سکتے۔

بہرحال! اس آیت میں کھل کر بتلادیا گیا کہ ''علمِ محیط'' یا ''اختیارِ مستقل'' نبوت کے لوازم میں سے نہیں ہے، جیسا کہ بعض جہلا سمجھتے تھے۔ ہاں! شریعت کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے، کامل ہونا چاہئے، اور تکوینیات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے پیشوا ﷺ تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ ﷺ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں، جن کا احصاء کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔ [عثمانی]

﴿یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ اس کلمہ سے بندوں کو عبادت کا حکم دیا جا رہا ہے۔

عبادت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) تکوینی (غیر اختیاری)۔ (۲) تشریعی (اختیاری)۔

تکوینی/جبری:

آسمان سے لے کر زمین تک تمام مخلوقات تکوینی جبری عبادت میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو کرنا چاہے، اسے کوئی ٹال نہیں سکتا، اور کائنات کا کوئی ذرّہ اس کی عبادت سے انحراف نہیں کر سکتا، مجال نہیں، کوئی مخلوق اس کی

عبادت سے غافل ہو۔فرمایا:﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾[مریم:۹۳] (جو بھی آسمانوں اورزمین میں ہیں سب خدا کے روبرو بندے ہوکر آئیں گے)۔﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾[الإسراء:۴۴] (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے،لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے)۔

دوم عبادتِ تشریعی/ اختیاری:

یعنی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے حکم دیا جارہا ہے کہ فلاں عمل (عبادت) بجالاؤ،اور فلاں عمل (شرک وکفر) اختیار نہ کرو۔﴿اُعْبُدُوْا﴾ سے یہی حکم اثبات کے ساتھ، اور ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ سے یہی تشریعی حکم نفی کے ساتھ مقصود ہے۔

جب ربّ العزّت سبحانہ تشریعی حکم کے ذریعے عبادت کا حکم صادر فرماتا ہے،تو اسے معلوم ہے کہ عبادت و بندگی کرنا آسان نہیں ہے،تو ساتھ چھ نہایت عظیم انعامات کا ذکر فرمایا ہے کہ اگر ان چھ اہم انعامات کا بغور تصور کروگے،تو بندگی وعبادت کرنا تمہارے لیے آسان ہوجائے گا،کیونکہ انعام واحسان بندگی کی ہر مشکل کو آسان بنانے کا ذریعہ اور سبب ہے۔

﴿اُعْبُدُوْا﴾ اور ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا﴾ دونوں حکم بمنزلۂ دعویٰ کے ہیں،اور انعاماتِ ستہ ان کے لئے دلیل شمار ہوں گے۔

پہلی نعمت:

ربوبیت ہے،یعنی ربوبیت ''اعبدوا'' کے لئے علت ہے،کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مربی ''ربّ العلمین'' ہے،اگر اس کی پرورش ایک لمحہ کے لئے منقطع ہوجائے تو کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی،تو کیا ایسی ذات عبادت کی حقدار نہیں ہے؟ ربوبیت کو سب سے پہلے ذکر فرمایا،اس سے یہ نکتہ طے ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش سے پہلے پرورش کا سامان پیدا کردیا،کہ انسانی پیدائش سے پہلے آسمان وزمین، ہوا،روشنی،سورج و چانداور کھانے پینے کے لئے پانی،اور ہر قسم کی خوراک مہیا فرمائی۔انسان کی بقاء وخوشحالی کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی،وہ سب مرحمت فرمائیں۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات میں صفتِ ربوبیت سب سے مقدم اور اہم ہے،اسی لئے قرآن کریم

میں اس صفتِ عالیہ کا نوسو (۹۰۰) مقامات پر تذکرہ ہے۔ دیگر کسی بھی ذاتی مخصوص صفت کا اتنی کثرت کے ساتھ تذکرہ نہیں۔ اسم ذات ''اللہ'' کے بعد اسی ربوبیت کا نمبر ہے۔

دوسری نعمت:

خالقیت ہے، جسے ﴿خَلَقَكُمْ﴾ سے بیان فرمایا کہ خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے خود تمہیں پیدا فرمایا، انسان کو اپنے وجود ونفس کے ساتھ خاص تعلق ہوتا ہے، اس لئے نفس کو پہلے ذکر فرمایا، پھر ماں باپ کا ذکر ہوا، اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ وجود انسانی تمام دنیوی نعمتوں سے اشرف بھی ہے، اور اہم وضروری بھی۔ اس نعمت کے ساتھ کوئی بھی نعمت ہمسری اور برابری نہیں کرسکتی۔ سارا جہاں ایک طرف، اور وجود کی نعمت دوسری طرف، تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ تم صرف اس کی عبادت کرو، کیونکہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا۔ اگر وہ کرم نہ فرماتا، تو تم فنا کی دنیا سے وجود کی دنیا میں کیسے آسکتے؟ پھر اس نے کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ تمہیں پیدا کر کے تمہارے آرام وآسائش وخوشحالی اور حیات وبقاء کے سامان بھی فراہم کیے۔

اگر وہ تمہیں صرف پیدا کر کے چھوڑ دیتا، اور اپنے بے پناہ لطف وکرم سے تمہارے اُکل وشرب، رزق و روزی کا انتظام نہ فرماتا، تو تم پیدا ہوتے ہی ہلاک ہوجاتے، اور جبکہ تمہارا وجود اسی ذات پاک کے کرم وعنایت کا صدقہ ہے، اور تمہاری زندگی وبقاء بھی اسی کی نظرِ رحمت وشفقت کی محتاج ہے، اور کسی دوسری مخلوق کا اس میں کوئی حصہ و شراکت نہیں ہے، تو جب تخلیق وربوبیت میں وہ اکیلا، تنہا، واحد لاشریک لہٗ ہے، تو اُلوہیت میں کون اس کا شریک ہوسکتا ہے؟ جب تمہیں لَاخَالِقَ اِلَّاھُوَ وَلَارَبَّ اِلَّاھُوَ کو تسلیم کرنے میں کسی انکار کی گنجائش نہیں، تو لامحالہ لَااِلٰهَ اِلَّاھُوَ وَلَامَعْبُوْدَ اِلَّاھُوَ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ (جس کا کھائے اسی کا گُن گائے)۔

تیسری نعمت:

تیسری چیز یہ ہے کہ انسان کا زمین سے تعلق تیسرے نمبر پر ہے کہ وہ زمین کی مٹی سے پیدا ہے، اس پر اس کی زندگی اور بود وباش ہے۔ مرنے کے بعد دوبارہ زمین کی آغوش میں اسے جانا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ [طٰهٰ:۵۵] اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا، اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے، اور اسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے)۔ پھر فرمایا: ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَاۗءً وَّ اَمْوَاتًا﴾ [المرسلات:۲۶] (کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا (یعنی) زندوں اور مردوں کو)۔

یہ زمین انسان کا محض مسکن ہی نہیں، بلکہ رزق وروزی، موت وحیات سب کچھ زمین کی بدولت ہے، وہ بمنزلة الأم ہے۔

چوتھی نعمت:

انسان کا چوتھے نمبر پر تعلق آسمانوں کے ساتھ ہے، تمام برکات وفیوض، خواہ روحانی ہوں، یا مادی، سب کا مرکز آسمان ہی ہے۔ آفتابِ عالمتاب کی روشنی اور گرمی، چاند وستاروں کے انوار وبرکات، اور دیگر ان گنت فوائد اوپر آسمان سے نزول کرتے ہیں، بلکہ زمین کی مکمل آبادی کا مرکز آسمان ہی ہے، جو کہ بمنزلة الأب ہے۔

پانچویں نعمت:

پانچویں نمبر پر بارانِ رحمت، بارشوں کا سلسلہ ہے۔ زمین ایک مردہ اور بے جان کرّہ ہے۔ انسانی حیات و خوشحالی، نیز بقاء وآبادی کا مستقر اگرچہ کرّۂ ارض ہے، مگر بارش اور پانی کے بغیر اس بانجھ زمین سے کسی بھی چیز کی کوئی پیداوار ممکن نہیں ہے ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ﴾ [الأنبياء: ٣٠] (اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے؟)

چھٹی نعمت:

چھٹے نمبر پر انسانی خوشحالی کا تعلق ہزاروں قسم کے فواکہ، میوہ جات اور بے شمار ماکولات ومشروبات کے ساتھ وابستہ ہے۔ ﴿وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ [البقرة: ٢٢] (جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا، اور آسمان کو چھت بنایا، اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لیے انواع و اقسام کے میوے پیدا کیے)۔

لہٰذا زمینی پیداوار کا تعلق آسمان وزمین اور پانی تینوں کے ساتھ ہے، اور ان میں سے ہر ایک عظیم نعمت خداوندی ہے۔ اب نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ ان چھ نعمتوں کو بغور دیکھو! دل کی گہرائیوں سے مطالعہ کرو، اور منعمِ حقیقی کے لطف وکرم کا بغور وفکر مطالعہ کر کے خوب اندازہ لگاؤ، اور خوب سمجھ لو کہ ان نعمتوں کا بنانے والا، اور تمہیں مفت مہیا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں، لہٰذا تمہاری انکساری اور عبادت وبندگی کا صرف اور صرف وہی حقدار ہے، اور کوئی نہیں۔ پھر تم کہاں اور کدھر شترِ بے مہار بن کر جا رہے ہو؟ عقل سے کام لے لو۔ ان نعمتوں کے ساتھ ساتھ آخرت کی ابدی اور بے حساب نعمتوں کا مؤمن وموحد بن کر استحقاق حاصل کرو۔

زمین فرش (مسطح) ہے، یا کروی؟

یہاں پر دو چیزیں فلسفیانہ لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں، کہ قرآن کریم نے زمین کو فرش بیان کیا ہے، تو کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ زمین گول نہیں ہے، بلکہ شریعت اور حکمت، یعنی فلسفہ دونوں زمین کے گول ہونے پر متفق ہیں، تو بعض لوگ فرش کے معنی اگر یہ سمجھیں کہ زمین گول نہیں ہے، یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ زمین کو فرش سے تشبیہ دی گئی ہے، نہ کہ عینِ فرش کہا گیا ہے۔ اگر دیکھا جائے، تو فرش پر آدمی بیٹھ سکتا ہے، آسانی سے چل سکتا ہے، سوسکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر اللہ تعالیٰ شانہ زمین کو فرش نہ بناتا، تو زمین پر زندگی کی بے شمار چیزیں ممکن نہ ہوتیں، اور یہ واضح ہے کہ گول چیز اگر بہت وسیع وفراخ ہو، تو اس کے بعض حصے مسطح ہو سکتے ہیں، اور سطح وفرش کی طرح چوکور بھی ہو سکتے ہیں، اس لئے اسے فرش کہا جاسکتا ہے۔

شرعی وفلسفی نقطۂ نگاہ سے اگر زمین گول نہ ہوتی، تو طلوع وغروب میں فرق نہ ہوتا، سورج طلوع یا غروب ہوتا، تو بیک وقت بغیر کسی تقدیم وتاخیر کے پوری دنیا میں اس کا ظہور ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے، تو واضح ہے کہ زمین گول ہی ہے۔ دیکھیں! یہ مشاہدہ ہے کہ مشرقی حصے میں طلوع وغروب مقدم ہوتے ہیں، مغربی حصے پر دن ہوتا ہے، جبکہ دوسرے حصے میں رات ہوتی ہے، کہیں چاشت، کہیں ظہر، کہیں عصر اور کہیں مغرب وعشاء ہوتا ہے۔ عمدۃ المحققین حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ تفسیر فتح العزیز میں بیان کرتے ہیں کہ فقہی مسئلہ ہے کہ اگر دو حقیقی بھائی ہوں، اور ان کا دوسرا کوئی وارث نہ ہو، تو ان میں سے جو پہلے وفات پائے گا وہ مورث شمار ہوگا، دوسرا وارث شمار ہوگا۔

فقہاء کرام کہتے ہیں کہ اگر ایک بھائی چین میں، اور دوسرا اندلس میں رہتا ہو، تو چین مشرق سے اور اندلس مغرب سے قریب ہے، یہ دونوں مقام الگ الگ ہیں، اور ان کے طلوع وغروب بھی الگ الگ ہیں، اور دونوں بھائیوں کا ایک ہی دن عین طلوع آفتاب کے وقت انتقال ہوگیا، تو بظاہر دونوں ایک ہی وقت پر مر گئے ہیں، تو اس صورت میں تو کوئی وارث نہیں ہے۔ اگر آگے پیچھے مریں، تو پھر وارث بنتے ہیں۔

تو فقہاء کرام اس پر متفق ہیں کہ اس وقت چین والا بھائی پہلے مرا، اور اندلس میں رہنے والا بھائی بعد میں مرا، تو چین والا مورث بنا، اور اندلس والا وارث قرار پایا، اور یہ ظاہر ہے کہ فقہاء کرام کی نظر وسوچ کس قدر عمیق ہے؟ رحمھم اللہ تعالیٰ۔

اور یہ مسئلہ واضح ہے، خصوصاً ہمارے اس ترقی یافتہ زمانے میں، کہ اگر انڈونیشیا کا مسلمان غروبِ آفتاب

کے ساتھ روزہ کا افطار کر کے ٹیلیفون پر مراکش اور قرطبہ کے مسلمان بھائی سے کہے کہ تمہارے ہاں اس وقت کیا ٹائم ہے؟ تو جواب ملے گا کہ دن کے دس بجے، جبکہ وہاں کے افطار میں دس گھنٹے باقی ہوں گے، کیونکہ ہر ہزار میل کے فاصلے پر پورا ایک گھنٹہ طلوع وغروب کا فرق ظاہر اور تسلیم شدہ ہے۔

آج کل کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ تمام عالمِ اسلام کے یا ایک ہی مسلمان ملک کے مختلف صوبوں اور دور دراز علاقوں میں (جہاں ہزار میل کا فاصلہ ہو) روزہ اور عید ایک ہی دن میں ہو، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا، اور ممکن بھی نہیں۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے: ﴿فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَـصُمۡهُ﴾ [البقرة:١٨٥] (تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہئے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے)۔ اور حدیث شریف میں بھی یہ فرمان ہے: "صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ"۔ [صحاح ستة] (یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو)۔

نسائی شریف میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اگر خود نہ دیکھ سکو، تو اگر دو آدمی دیکھ لیں، تب بھی روزہ رکھو، اور روزہ کھولو۔ پس مشرق والوں کو اگر نظر نہ آئے، اور مغرب والوں کو نظر آجائے، تو دیکھنے والے اور نہ دیکھنے والے اپنے اپنے طرز پر عمل کریں۔

بلغار ایک علاقہ ہے، وہاں جب سورج غروب ہوتا ہے، تو کچھ مختصر وقت کے بعد صبح صادق کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں۔ فقہاء کرام کہتے ہیں کہ جس کسی نے نمازِ عشاء کا وقت ہی نہیں پایا، تو اس کے ذمہ چار ہی نمازیں ہیں۔ عشاء کی نماز اس پر فرض نہیں ہے۔ اولادِ آدم "ربعِ مسکون" یعنی دنیا کے شمالی حصے پر آباد ہے، پوری دنیا کا خطِ استواء جو انڈونیشیا سے گزرتا ہے، اس سے شمال کی جانب میں نوے (٩٠) درجہ پر قطب کے قریب چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہے، حالی نے فرمایا۔

سویڈن میں اور ناروے میں جاؤ ☆ وہاں ایک دن چھ مہینے کا پاؤ

(مسدس)

آدمی ٦٦ درجہ پر رہ سکتا ہے، اگر آدمی اس سے آگے چلا جائے، تو سردی کی وجہ سے مر جائے گا۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ یہاں نہ روزہ ہے، نہ نماز ہے۔

مگر دوسرا قول یہ ہے کہ دیگر عام ملکوں کے وقت کی پابندی کرے، روزہ اور نماز ادا کرے، مثلاً: عام ملکوں میں دیکھے کہ رات اور دن کتنے گھنٹے کے ہیں؟ تو چھ ماہ والے دن میں بارہ گھنٹے، روزہ رکھیں، اور بارہ گھنٹے کھائیں

پئیں۔مزید تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھیں۔

یاد رہے! کہ ایسے علاقوں میں آدمی جا تو نہیں سکتا، مگر فقہاء کرام نے (فرض) کر کے مسئلہ واضح کر دیا ہے، تاکہ انسان اگر کسی مشین کے ذریعہ چلا بھی جائے، تو مسئلہ واضح ہو۔[دروس القرآن]

حضرت کریب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ مجھے حضرت ام فضل رضی اللہ عنہا (والدہ ابن عباس) نے ملکِ شام بھیجا، جب میں شام کے سفر سے مدینہ منورہ واپس آیا، تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: وہاں رمضان شریف کا چاند کب دیکھا گیا؟ میں نے بتلایا: فلاں دن، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم نے تو ایک دن بعد میں دیکھا، اور ہم نے ایک دن بعد روزہ رکھا، تو کریبؒ نے کہا: "صَامَ مُعَاوِيَةُ وَصَامَ النَّاسُ" کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور لوگوں نے روزہ رکھا، تو اس کے بعد کریب نے آپ سے پوچھا کہ اگر شام کے اعتبار سے تیس روزے پورے ہو جائیں، تو کیا آپ عید منائیں گے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لَا نُفْطِرُ حَتّٰى نَرَاهُ۔ کہ جب تک ہم چاند نہ دیکھیں گے، روزہ افطار نہیں کریں گے۔[مسلم] یہ ہے امتِ محمدیہ کے سب سے بڑے عالم حبر الامت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتوی۔(رضي الله عنه ورضي عن الله)

﴿وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ یہاں حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے، یا بادل سے؟ قرآن پاک میں دونوں الفاظ ہیں، فرمایا:﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾[الواقعة:۶۹] (بھلا دیکھو تو کہ جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا ہے یا ہم نازل کرتے ہیں؟)۔

بارش آسمان سے برستی ہے، یا بادل سے؟

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بادلوں کا تذکرہ ہے کہ جنہیں ہوائیں اڑا کر جمع کرتی ہیں، اور پھیلا کر پانی برساتی ہیں، اسی طرح متعدد مقامات میں آسمانوں سے پانی کے برسانے کا بھی تذکرہ ہے، تو اس میں تین توجیہات ہو سکتی ہیں:

(۱) درحقیقت دونوں طرح سے پانی کے اتارنے کا ذکر مبنی برحقیقت ہے، کیونکہ آسمان، بادل اور چھت کو بھی عربی میں "سماء" کہتے ہیں، قولہ تعالی:﴿فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ﴾ [الحج:۱۵] یہاں سماء سے بالاتفاق چھت (بلندی) مراد لی گئی ہے۔

(۲) اگر سماء سے آسمان مراد ہو تو یہ بھی درست ہے، دیکھیں سائنس والے کھلے اور واضح اسباب معلوم کر سکتے ہیں، اور جو اسباب پوشیدہ ہیں وہ صرف خداوند تعالیٰ کو معلوم ہیں، ان تک سائنسدانوں کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ بادل اور بارش میں ضرور آسمان کو دخل ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ سورج کی شعائیں سمندر سے بخارات بناتی ہیں، جو اوپر جا کر بادل بن جاتے ہیں، لہٰذا اگر آسمان نہ ہوتا، تو سورج بھی نہ ہوتا پھر بادل کہاں ہوتے؟

ایک روایت میں نقل ہے کہ بارش میں آسمان کے پانی کا بھی تعلق ہے، مثلاً آبِ زمزم میں دوسرے پانی شامل کر دیں، تو سارا متبرک ہو جاتا ہے، اسی طرح بارش کے پانی میں آسمان کا پانی شامل کیا جاتا ہے، تا کہ برکت ہو جائے۔ اس بارے میں حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ شاید اگر بارش میں آسمانی پانی شامل نہ ہوتا، تو جتنی بھی بارشیں ہوتیں زمین سے کوئی چیز نہ اُگتی۔

(۳) یعنی یہ بات تسلیم ہو کہ بارش صرف بادل سے ہو، تو کیا یہ خود بخود برستی ہے، یا اسے کوئی حکم دیتا ہے، اور یہ چیز ہمارے مشاہدے میں بھی ہے کہ بعض اوقات کئی گھنٹے، کئی دن بادل ہوتے ہیں، مگر بارش نہیں برستی، اور اگر برستی ہے، تو رکتی نہیں، اور پھر کسی کی مرضی کی جگہ پر نہیں برستی، بلکہ جہاں اسے حکم ہوتا ہے وہیں برستی ہے۔

معلوم ہو گیا کہ یہ بادل محض علامت ہے، اور اسے چلانے والی اور حکم دینے والی کوئی مخفی طاقت ہے، جس کی مرضی اور حکم پر بادل نمودار ہو کر برسنے اور نہ برسنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ زمین میں جتنے کام ہوتے ہیں، ان کا صدر دفتر سدرۃ المنتہیٰ پر ہے، وہیں سے سارے احکامات جاری ہوتے ہیں، اور بسا اوقات لوگوں کی بدعملی اور شامت کی وجہ سے یہ سلسلہ رک بھی جاتا ہے۔ [ترمذی] یہاں تک کہ لوگ استغفار، دعاء، نمازِ استسقاء کا عمل شروع کرتے ہیں۔ [دروس القرآن]

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نسلِ انسانی کے لئے مرد عورت دونوں کا اختلاط ضروری ہے، تنہا مرد اور تنہا عورت کافی نہیں ہے، اسی طرح زمین آسمان میں میاں بیوی جیسا تعلق ہے، آسمان نے پانی برسایا، زمین نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا، ان دونوں کے اختلاط سے ہزاروں قسم کے پھل اور کھانے کی چیزیں پیدا ہو گئیں۔ یہی ان کی نسل کہلاتی ہے۔ [احیاء العلوم]

وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا

شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۲۳ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ۝۲۴

ترجمہ: اور اگر ہو تم شک میں اس کتاب کے اندر جو ہم نے اتاری ہے اپنے خاص بندے پر، تو بنالاؤ ایک چھوٹی سی سورت اس جیسی، اور بلالاؤ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے معبودوں اور دوستوں کو، اگر تم سچے ہو۝۲۳ پھر اگر تم یہ کام نہیں کر سکتے اور ہرگز نہیں کر سکتے، تو پھر تم اس آگ سے بچو جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۝۲۴

ربط ومناسبت:

اس سے پہلے کلمۂ طیبہ کے پہلے بنیادی جزء "لا إله إلا الله" کا بیان ہوا، اب یہاں سے دوسرے بنیادی جزء "محمد رسول الله" (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بیان شروع ہو رہا ہے، یعنی توحیدِ الٰہی کے بعد مسئلۂ رسالت کا بیان شروع ہوا۔

یہاں چند چیزیں قابلِ غور ہیں:

(۱) حقیقتِ نبوت (۳) حقانیتِ نبوت (۵) مقام وشرفِ نبوت (۷) اغراضِ نبوت

(۲) ضرورتِ نبوت (۴) خصوصیاتِ نبوت (۶) برکاتِ نبوت (۸) معجزاتِ نبوت

ان امورِ ثمانیہ کا اگر مکمل کما حقہ بیان کیا جائے، تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا، لہٰذا چند مختصر اشارات پر اکتفاء کر کے تفصیل کے لئے کسی دوسرے مقام کا انتخاب بہتر ہوگا۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کیلئے ☆ جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

انسان کی تخلیق محض توحید اور عبادت کے لئے ہے، کسی اور چیز کے لئے نہیں، پس خالقِ کائنات جل شانہ کی رحمت اور حکمت کے خلاف ہوگا کہ انسان کی پیدائش کے بعد اسے بغیر کسی ہدایت ورہنمائی کے یوں ہی بے یار ومددگار چھوڑ دیا جائے، جب اسے ایک اعلیٰ مقصد کے لیے پیدا فرمایا گیا ہے، تو ربّ العزّت کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اس کی ہدایت ورہنمائی کے لئے ایک خاص ضابطہ وقانون وضع ہو، جس پر چل کر انسان اپنا قبلہ درست کرنے کے بعد آنے والے جہاں کی کامیابی تک مکمل رسائی حاصل کرے۔

تو قانون بنانے کے لئے ایک مضبوط رکاوٹ یہ ہوئی کہ ربّ العزّت سبحانہ کی ذات نہایت بلند ہے، اور

انسان نہایت پست و بے حوصلہ ہے، پس براہِ راست اللہ تعالیٰ کا رابطہ انسان کے ساتھ مشکل، بلکہ غیر ممکن رہا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہوئی کہ درمیانی واسطہ اس قسم کا ہو کہ اس کو طرفین (یعنی خالق ومخلوق) کے ساتھ بیک وقت ربط و مناسبت ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت وصول کر کے انسانوں تک اس کو پہنچادے، یعنی ایک حیثیت سے وہ ربّ العزّت سبحانہ سے ملے، دوسری جہت سے انسانوں تک وہ پیغام پہنچائے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی ہستی کو نبی اور رسول کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اختتام پذیر ہوا۔

امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اَلنَّبِیُّ مَنْ قَالَ اللہُ تَعَالٰی اَرْسَلْتُکَ اِلٰی قَوْمٍ اَوْ اِلَی النَّاسِ کَافَّۃً'' یعنی نبی وہ ہستی ہے، جسے اللہ تعالیٰ فرمائے: ''میں نے تجھے ایک قوم، یا قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے بھیجا ہے''۔ دیگر سارے انبیاء علیہم السلام مخصوص زمانہ، مخصوص علاقہ اور مخصوص قوموں کے لئے مبعوث کیے گئے، آخری نبی خاتم الانبیاء سرورِ کائنات رحمۃ للعلمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ملائکہ، جن، وانس ساری مخلوقات کے لئے ہوئی۔ قیامت تک سارے جہاں کے لئے آپؐ مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ کے بعد کسی قسم کا برحق نبی نہیں ہوگا، سوائے ''دجّالون کذّابون اور شیاطین'' کے، جیسا کہ صحیح احادیث نے تیس کے قریب کذّابون دجّالون کی نشانہ ہی کی ہے۔

قربِ قیامت میں جناب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے، تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شریعت پر عمل پیرا ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے امتی حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا فرمائیں گے، اور آپ کی شریعت کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں گے۔ ان کا اپنا مخصوص کوئی حکم نافذ نہیں ہوگا۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ نبوت کا عہدہ شرعی حیثیت سے نہایت بلند و بالا عہدہ ہے، اس سے بڑھ کر کوئی دینی عہدہ نہیں، اور یہ عہدہ خالص وہبی ہے، کسی کسب ومحنت سے ہرگز کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا، اور اس کا اکتساب فیض براہ راست ربّ العزّت سبحانہ کے ساتھ مربوط و متعلق ہے۔ نبی ہرگز کسی انسان سے اکتساب نہیں کرتا۔

نیز نبی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عہدۂ نبوت کے ملنے سے پہلے اور بعد میں صغیرہ وکبیرہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہو، اور یہ بات عقل ونقل دونوں سے ثابت شدہ و مسلّم ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ نبی کا ہر قول، فعل بلکہ اشارہ بھی امت کے لئے حکم اور واجب الاتباع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلّم ہے کہ کوئی نبی دنیا کے کسی استاد کا شاگرد نہیں ہوتا، اُمّی ہونا اس کی خصوصی اور امتیازی صفت ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ نہ لکھنا جانتا ہے، نہ پڑھنا، وہ کسی سے پڑھا ہوا نہیں ہوتا، اور وہ حسین وجمیل اور انتہائی اعلیٰ درجہ کا ذہین، عقلمند، دوراندیش، تارکِ دنیا، متقی پرہیزگار، سخی

جواد، بخشش کرنے والا، رحیم وکریم، عابدوزاہد، عفوودرگزرکرنے والا، بے پناہ حیادار، صاحبِ معجزات، نہایت اونچے درجے کا عالم، بہادر، شجاع، حکمت ودانائی کا پیکر، محنتی، غرض یہ کہ جتنے اوصافِ حمیدہ، خصائلِ عالیہ اوراخلاقِ حسنہ ہیں وہ سب کا جامع وسرچشمہ ہوتا ہے، اوروہ تمام رزائل، اوصافِ ذمیمہ اور اخلاقِ رزیلہ، اور ہر قسم کے خلافِ عقل و شرافت جوعیوب ونقائص ہوں گے، ان سب سے بیگانہ وپاک ہوگا۔

ذرّہ بھر کا داغ ودھبہ اس کے دامن پر نہیں ہوتا، وہ ہرغیرشرعی عمل سے پاک وصاف ہوتا ہے۔وہ صاحبِ انصاف، سنجیدہ اورمنصف ہوتا ہے، کہ دو ماہ کی عمر میں رضاعت کے دوران اپنے دودھ شریک بھائی کے لیے پستانِ مادر کا لحاظ رکھتے ہوئے منہ بھی نہیں لگاتا، کبروغرور، وحسد بغض وعداوت، اوردیگر ہزاروں روحانی بیماریوں سے اس طرح پاک ہوتا ہے جیسے شیشہ یا برف۔ اللّٰهم صلّ وسلّم وبارك على سيّدنا محمّدنبي الرحمة وعلى جميع إخوانه من النَّبيين و المرسلين صلوٰة الله و سلامه عليهم أجمعين۔

قرآن کریم کے متعلق یہ تاریخی دعویٰ ہے کہ یہ کتابِ ہدایت خالقِ کائنات کے علم وقدرت کا نتیجہ ہے، جسے ربّ العزّت سبحانہ نے اپنے برگزیدہ وخاص بندہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا۔ یہ کسی انسانی علم وقدرت کا کوئی شاہکار نہیں ہے۔ یہ جس ہستی پر نازل ہوا وہ محض اُمّی ناخواندہ ہے۔ النبی الاُمّی ان کی خصوصی امتیازی صفت ہے۔اس کا فیصلہ بھی اسی امتیازی معیار پر ہوگا کہ اگراس کتاب کا کل یامعمولی جزء انسانی قدرت سے بن سکتا ہے، تب تو یہ ایک انسانی کتاب ہوگی، اور معجزہ نہیں ہوسکتا، اوراگرانسانوں کی مجموعی قوت اس کی چھوٹی سی سورة (سورة الکوثر جوایک سطر سے زیادہ نہیں ہے) نہیں بناسکتی، تواس کے معجزہ، اوراللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے، اور کلام اللہ ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔

قرآن کریم نے اسی معیار کی بنیاد پراپنے اِعجاز اورکلامِ الٰہی ہونے کے متعلق عرب کے شعراء، فصحاء، ادباء اور بلغاء کوچیلنج دیا، اورفرمایا: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّانَزَّلْنَاعَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْابِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [البقرة:۲۳] (اوراگرتم اس (کتاب) کے بارے میں ذرابھی شک میں ہوجوہم نے اپنے بندے پراتارا ہےتواس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنالاؤ۔اوراگرسچے ہو تو اللہ کے سوااپنے تمام مددگاروں کو بلالو)۔اورساتھ فرمایا: ''وَلَنْ تَفْعَلُوْا'' (اور ہرگزنہیں کرسکوگے)۔دوسری آیت میں اس سے بھی زوردار الفاظ میں فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَاالْقُرْاٰنِ

لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾[الإسراء:۸۸] (کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں)۔

اس آیت میں اس معاند قوم کو خطاب کیا گیا ہے، جس کو اپنی ادبی قابلیت اور فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا، اور جو قرآن کریم کے منکر اور اوّل درجہ کے بدخواہ، اور دشمن تھے۔ قرآن کریم کے دعویٰ کو توڑنا ان کے لیے ہر چیز سے زیادہ اہم اور ضروری تھا، اور یہ اعلان صاحب قرآن ﷺ کی زبان سے کر دیا گیا کہ ساری عمر میں آپ نے نہ کوئی تعلیم پائی تھی، نہ کسی وقت ان کی شعر و شاعری کا کوئی چرچا ہوا، نہ ہی انہوں نے کوئی ادبی تعلیم پائی، اور نہ ہی شعر و شاعری یا فصاحت و بلاغت کی کوئی مشق ان کو حاصل تھی، اور نہ ہی چالیس سال کی طویل زندگانی میں ماہرینِ زبان شعراء و بلغاء کی مجالس (محافل) میں ان کی کوئی خاص شہرت تھی، بلکہ وہ اُمّی اور ناخواندہ تھے۔

اس چیلنج اور جرأت مندانہ اعلان نے مخالفینِ اسلام و قرآن کی ادبی غیرت اور مخالفانہ جوش کو یقیناً اس زور سے بھڑکایا کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ نہایت آسانی اور بے ضرر طریقے سے قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کو قرآن جیسی صرف ایک سطر کی عبارت بنا کر شکست دے سکتے تھے، اور یہ شکست بھی نمایاں ہوتی، اور اس کا مقصد سو فیصد حاصل ہو جاتا، کیونکہ خود قرآن کا دعویٰ تھا کہ اگر ایسا کر سکے تو پھر قرآن کلامِ الٰہی نہ ہوگا، اور صاحبِ قرآن ﷺ خدا کے رسول بھی نہ ہوں گے۔

مگر انہوں نے اپنے ادبی ذوق اور ادبی فطرت کی بنیاد پر قرآن کی نظیر لانے کو ناممکن سمجھا، اس لیے فتح اور کامیابی کا یہ آسان راستہ انہوں نے چھوڑ کر دوسرا دشوار گزار راستہ اختیار کیا، یعنی قرآن کے مقابلے میں انہوں نے جنگ و جدال کا ایسا طولانی طوفانی سلسلہ قائم کیا، جس کے لیے ان کو بے پناہ جانی و مالی قربانیاں دینی پڑیں، اور بعضوں کو ملک اور وطن ترک کرنا پڑا، اگرچہ اس راہ میں بھی ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

زبان و قلم کی معمولی جنبش کے آسان ترین راستہ کو چھوڑ کر تلوار اور خونریزی کا راستہ اختیار کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے پاس قرآن حکیم کے چیلنج کا جواب نہ تھا، اور یہ وہ لوگ تھے کہ اس وقت سے لے کر اب تک، اور آئندہ قیامِ قیامت تک ان کے زورِ بیان، فصاحت و بلاغت کا کوئی ہمسر نہ تھا، اور نہ ہوگا۔ یہ قرآن حکیم کے اِعجاز کی بلاغی دلیل ہے، یہ دلیل نہایت عام فہم اور صاف واضح ہے، اور یہ سلسلہ قیامت تک کے منکرینِ قرآن کی ہر قسم کی کوششوں، اور ان کے علمی، ادبی، عزم و حوصلوں پر بوجھ ہے۔ فللّٰہ الحمد و لہ الشکر۔ [علوم القرآن]

معارف ومنازل

اِعجازِ قرآنی کی تفصیل:

مطلب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلیٰ ترین اور ابدی معجزہ بتلا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمہ گیر رسالت اور سچائی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات تو ہزاروں میں ہیں، بقولِ بعض علماء دس ہزار کے قریب ہیں (کیونکہ قرآن کی ہر آیت ایک مستقل معجزہ ہے) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات بڑے حیرت انگیز ہیں، لیکن ان سب میں سے اس مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمی انقلابی معجزہ قرآن کریم کے ذکر پر اکتفاء کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے، اور اس معجزہ کو انبیاء کرام علیہم السلام کے عام معجزات میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

عام دستور یہ ہے کہ ہر نبی و رسول کے ہاتھ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے کچھ معجزات ظاہر فرماتے ہیں، مگر یہ معجزات ان رسولوں کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتے ہیں، پھر انہی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں، یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کی وفات کے بعد باقی نہیں رہتے، مگر قرآن حکیم ایک دائمی انقلابی اور ایسا علمی معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے، اس اجمالی بیان کے بعد ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن کریم کا اِعجاز کن کن وجوہ سے ہے۔

اگر قرآن کریم کے تمام اِعجازی پہلوؤں پر بحث کی جائے، تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا، کیونکہ اِعجازی وجوہات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ یہاں اختصار کے ساتھ چند ایک کے بیان پر اکتفاء کرنا بہتر ہوگا، یعنی ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ کے مضمون پر۔

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ چودہ سو برس کے عرصہ میں قرآن کریم کی زبردست تحدّی و چیلنج کے باوجود سارے جہاں کے ادباء، بلغاء، شعراء اور علماء قرآن کریم کی، یا اس کی کسی آیت، یا سورۃ کی مثال پیش نہیں کر سکے، اور کیوں ساری دنیا کے دانشور اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہو گئے؟ یہی باتیں تفصیل طلب ہیں، جو درج ذیل ہیں:

☆ پہلی وجہ: سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کو کیوں معجزہ کہا گیا؟ دوسرا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کی فہرست خاصی طویل ہے، جن میں معراج، اور معجزہ شق القمر جیسے معجزات بھی ہیں، ان سارے معجزات کے بارے میں معاندین کفار کو کوئی تحدی و چیلنج نہیں دیا گیا، بلکہ صرف قرآن حکیم کی ہم پلہ مثال لانے کو چیلنج بنا کر پیش کیا گیا اس کی حکمت کیا ہے؟ محققین علماء کرام اسرارِ شریعت بیان کرنے والے حضرات نے فرمایا ہے کہ معجزہ قرآن پر صداقت

رسالت موقوف ہے، اس لئے اس کی تخصیص کی گئی، چونکہ معجزہ نبوت پر دلیل ہوتا ہے، اور ہر معجزہ کا موقوف علیہ رسالت ہی ہے، یہاں قرآن مجید کی حقانیت وعظمت چونکہ نبوت کا موقوف علیہ تسلیم ہوا ہے، اور نبوت اسی کی حقانیت پر موقوف ہے۔ اگر قرآن کریم کلامُ اللہ ثابت ہوتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بخود رسول اللہ مبعوث من اللہ ہوں گے۔

☆ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ معجزہ قرآن پورے جہاں کے لیے انقلابی اور قیامت تک رہنے والا ہے، اس لیے تحدی میں اس کی تخصیص ہوگئی، بخلاف دوسرے معجزات کے کہ ان میں یہ صفت نہیں ہے۔

☆ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ معجزۂ قرآنی علمی ہے، بخلاف دوسرے معجزات کے کہ وہ علمی نہیں ہیں۔

☆ چوتھی وجہ یہ ہے علومِ اولین وآخرین (تمام انبیاء علیہم السلام) کا ذخیرہ قرآن حکیم ہے، بخلاف دوسرے معجزات کے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دیگر تمام معجزات جزئی ہیں، بخلاف قرآن حکیم کے، کہ ازل سے لے کر ابد تک، دخول جنت تک کے سارے حقائق ومعارف قرآن کریم کے ساتھ وابستہ ومتعلق ہیں۔ وغیر ذلک من الوجوهات واللہ أعلم۔

قرآن حکیم نے معاندین سے ہرگز یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کی کوئی ایسی ہم پلہ مثال بنا کر پیش کرو جو ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل ہو، یا چھ ہزار دو سو چھتیس آیتوں والی مثال ہو، یا بڑی سے بڑی سورۃ البقرہ کی نظیر لاؤ، اگر ایسا معارضہ ہوتا تو عرب وعجم کے دانشور کہہ سکتے تھے کہ ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، بلکہ انہیں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی جلدی نہیں، تمہیں مکمل وقت دیا جاتا ہے، جب چاہو، اور جس طرح بن پڑے خود میدان میں آؤ۔ انس وجن، عرب وعجم اور اپنے گواہاں (معبودانِ باطلہ) وغیرہ کے تعاون ومشوروں کو جمع کر کے آؤ! قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورۃ ''الکوثر'' جو دس کلمات اور بیالیس حروف پر مشتمل ہے، اس کی مثال ونظیر پیش کرو۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دعوت دی کہ اس مختصر سورت کی مثال پیش کر کے اپنی جیت کا اعلان کرا دو۔ یہ سورت کریمہ بہت بڑے عرصے تک بابِ کعبہ شریف کی زینت بنی رہی، اور معاندین غور وفکر کی نظروں سے دیکھتے گئے، اور میدانِ مبارزہ سے دم دبا کر بھاگتے رہے۔

بالآخر یہ ناز اُفصح الشعراء جو فی البدیہہ ایک ہزار شعر ایک ہی مجلس میں ترتیب دینے، اور فر فر کہنے پر قادر تھے، جس کی شہرت اتنی عام تھی کہ پورے عرب میں ملکُ الشعراء کے نام سے مانے جاتے تھے، یعنی ''لبید بن ربیعہ بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربيعة العامري''، وہ آئے، اور بڑے طمطراق اور شاعرانہ جذبہ کے ساتھ

آئے، اس وقت قریش کے سارے صنادید، سردار بشمول ابوجہل حاضر تھے، اورانہوں نے لبید کی جرأت وجذبات کو ابھارنے کی کوشش کی، اور بڑے گھمنڈ وغرور سے آپس میں کہنے لگے کہ آج ہماری فتح کا جشن ہوگا، اور ہماری جیت کی شہرت وآواز پورے عرب میں پھیل جائے گی۔ لات ومنات وعزّیٰ کی حرمت وعزّت پر چار چاند لگ جائیں گے۔ یہ منظر قابلِ دید تھا۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ (کاتبِ سورۃ کوثر شریف) دور کھڑے ہوکر نظارہ دیکھ رہے تھے، اور ہادی برحق کے ربّ ذوالجلال کی طرف سے مدد ونصرت کی تمناء میں آنسو بہا رہے تھے، سارا مجمع انتظار کررہا تھا، سفید چادروں میں ملبوس لبید بن ربیعہ پہنچ گئے، ہاتھ میں چھڑی تھی، اور گلے میں تلوار تھی۔ چاروں طرف سے خدام وصنادید کا لشکر تھا، لبید جب بابِ کعبہ پر پہنچے، تو چھڑی اوپر اٹھا کر ''سورت کوثر'' پررکھ کر اس کی تلاوت کی، اور اس طرح پڑھا: ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ ③ ماهٰذَاقَوْلُ الْبَشَرِ﴾ یہ آخری جملہ اپنی زبان سے بول کر ایمان لے آیا۔ پہلے لبید کہلاتے تھے، اب حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہلانے لگے۔ سارے مجمع پر ندامت، شرمندگی اور خاموشی چھاگئی۔ اسی وقت یہ ارادہ کیا کہ بقیہ زندگی قرآن ہی کی تلاوت کروں گا، کوئی شعر نہیں کہوں گا۔

حضرت سرورِ عالم نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا لَبِيْدُبْنُ رَبِيْعَةَ اَلَا كُلُّ شَيْئٍ مَاخَلَااللّٰهَ بَاطِلُ، وَ كُلُّ نَعِيْمٍ لَامَحَالَةَزَائِلُ''۔ [بخاري]

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت لبید رضی اللہ عنہ سے شعر کہنے کا مطالبہ فرمایا، کہنے لگے: امیر المؤمنین! جب سے میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا، شعر وشاعری کو ہمیشہ کے لیے ترک کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے ڈھائی ہزار درہم ان کا وظیفہ جاری فرمایا۔ ۷۷ سال کی عمر میں خلافت عثمانی میں بمقام کوفہ وفات پائی۔ رضي الله عنه [اسد الغابة، الكامل، بداية وغيره]

اس قرآنی چیلنج نے کفارِ قریش کے قلوب میں جو آگ بھڑکائی تھی، وہ بڑی قابل دید اور مقامِ عبرت بنی رہی، ساتھ ساتھ ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ کی پیشین گوئی سن کر، وہ مزید تڑپ اٹھے، اور غیظ وغضب کی سراسیمگی میں آگ بگولہ ہوکر بعضوں کے تو حواس ناکارہ ہوگئے، پیچ وتاب کھاتے ہوئے اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے اتنے شرمندہ اور مایوس ہوگئے، جس کی کوئی حد نہیں۔ اس واقعہ نے ان کے زخموں پر نمک

پاشی کر کے انہیں مکمل شرمندہ اور تباہ و برباد کیا۔ یہ ناعاقبت اندیش، کفر و ضلالت میں ڈوبی ہوئی، حواس باختہ اور جان و مال کی بازی لگانے والی قوم، بے انتہا قربانی دینے والی، اپنی جواں اولاد، مایہ ناز، بہادر سپوت، قیمتی سرمایہ واثاثہ، اور دیگر سب کچھ حضرت سرور عالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں جھونک کر اس طرح شرمندگی اور ذلت سے دوچار ہوئے، اور سب کچھ گنوا کر تباہ کیا۔ ؎

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے ☆ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

ضد وعناد کا کوئی علاج نہیں:

شاید کسی کا یہ خیال ہو کہ کفارِ قریش جہالت و ناسمجھی کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے منکر رہے، اور قرآن حکیم کو کلامِ الٰہی ماننے سے اس لئے ہچکچاہٹ اور شک وشبہ محسوس کیا کہ یہ کلامِ ازلی ان کی عقل و سوچ سے بالاتر تھا، وغیرہ۔ دراصل یہ دونوں نظریے ظاہر کے خلاف ہیں، کیونکہ تاریخی واقعات سے بغیر چون و چرا کے پتہ چلتا ہے کہ ان کا کفر واسلام دشمنی محض ضد وعناد پر مبنی تھا۔

صنادیدِ قریش نے کبھی یہ بھی طے کیا تھا کہ چوری چھپکے، راتوں کی تاریکی میں، انفرادی کبھی اجتماعی صورت میں قرآن پاک کی سماعت کریں، تاکہ کچھ اندازہ معلوم ہو، چنانچہ ابوجہل، عتبہ، اخنس بن شریق، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث اور عاص بن وائل وغیرہ مختلف اوقات میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب آکر قرآن مجید سنتے رہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر وبیشتر راتوں کو جہر (اونچی آواز) سے نمازوں (تہجد) میں بڑے پیارے انداز میں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ اکٹھے بیٹھ کر مذاکرات کرتے، تو برملا اعتراف کرتے تھے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے، کسی بشر کا کلام نہیں ہے، اتنی بات کہنے کے بعد پھر وہ منحرف ہوتے، اور مخالفت پر کمربستہ ہو کر انکار کرتے تھے۔

آج کی دُنیا کا اُس وقت کی دُنیا کے ساتھ حکیمانہ موازنہ:

مکی زندگی میں جس وقت پوری قریشی قوم اور اس کے ہمنوا قرآن کریم کی حقانیت کے منکر رہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ قرآن مجید کا تدریجاً نزول ہو رہا تھا، اور قرآن کریم صرف مکہ المکرمۃ کی فضاء میں جلوہ افروز رہا، باقی دنیا اس کے فیوض و برکات سے نابلد اور بے خبر رہی، اور نزول کے مدارج میں صرف اس کے جزوی کلمات ومعانی اور علمی علوم و معارف کا چرچا رہا۔ اس کی ہمہ گیر عالمگیر انقلابی فیوض و برکات کا نام ونشان تک افق پر موجود نہ تھا، اور یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کسی وقت آسمان کے چاروں افق پر اس کے انوار و برکات پھیل کر پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں

لیں گے۔ پورے عالم سے ہر قسم کی ظلمتوں اور ناانصافیوں کو مٹا کر ختم کر دیں گے، اور دنیا کے ایک معتد بہ حصے پر توحیدِ الٰہی کی شمعیں روشن کر کے بچھڑے ہوئے انسانوں کو معبودِ حقیقی سے ملا کر دم لیں گے۔

مکی زندگی اسی کشمکش میں گزری، کہ مسلمان قوم نے ایک حجرہ میں نماز پڑھنے پر اکتفاء کیا، اور اپنی جرأت و ہمت کو روز افزوں آگے بڑھنے پر تیار و بیدار رکھا، جس کے نتیجے میں وہ درخشاں و تابناک دور شروع ہوا کہ قرآن کا نزول مکمل ہو گیا، اور اس کا انقلابی دور شروع ہوا، جس کے فیوض و برکات چاردانگ عالم میں پھیل گئے، اور ایسے زرین، قیمتی اور سنہرے اصول وضع ہو گئے کہ آسمان کے چاروں افق جگمگا اٹھے، اور آسمانی فرشتوں کو خلافتِ الٰہیہ کا سنہرا دور و زمانہ نظر آنے لگا۔

خلافتِ راشدہ اور کچھ اس کے بعد والے خلفاء و ملوک اور علماء و صلحاء، محدّثین و مفسرین اور سلاطین و امراء نے وہ وہ کارنامے انجام دیئے کہ تاریخِ عالم ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو قرآن مکہ مکرمہ کی گلی کوچوں میں محبوس تھا، وہ تمام جہاں کے سارے براعظموں پر بادشاہی کرنے لگا، یہاں تک کہ دنیا کا رنگ بدل گیا، اور ہزاروں بے مثال روحانی ترقیوں کے ساتھ مادی ترقیوں کا وہ حیران کن دور شروع ہوا، جو آج آپ کے سامنے ہے، جس کی پیش گوئی فرما کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا: "أُوْتِيتُ مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الأَرْضِ يا مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الأَرْضِ بِيَدِيْ"۔ [بخاري، مسلم] اس طرح زمانۂ رسالت میں اور اس کے بعد کے دور میں بے مثال حیران کن روحانی ترقیوں کا وہ لازوال عالمگیر سلسلہ شروع ہوا کہ زمین و آسمان نے تخلیقِ کائنات کے بعد اس کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔

اسی طرح دوسری طرف معدنی اور مادّی ترقیوں کا جو سلسلہ چلا، اور آئے دن بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آج کی دنیا ہر شعبہ و ہر میدان میں عجیب و غریب ترقیوں، ایجادات و مصنوعات کا جو نظارہ پیش کر رہی ہے، گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں اس کا عشرِ عشیر بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ آج انسان سطحِ زمین سے اوپر اُڑ کر چاند و سورج اور آسمانی کہکشاؤں پر پہنچنے، اور انہیں مسخر کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کرۂ ارضی کے ایک حصے پر بیٹھ کر دوسرے حصے پر کمند ڈالنے کی تدبیر سوچ رہا ہے۔ ایجادات و مصنوعات کی وہ پریشان کن بھرمار ہے کہ ایک بٹن دبانے سے شاید پورا عالم راکھ کا ڈھیر بن جائے، اور قیامت سے پہلے مصنوعی قیامت قائم ہو جائے، ایسا لگتا ہے کہ سارا جہاں گولہ بارود کے ڈھیر کے سائے میں جی رہا ہے۔ گویا یہ منکرِ قیامت انسان خود اپنے لیے قیامت کا راستہ ہموار کر رہا ہے۔

دنیا اپنی محیر العقول مادّی ترقی میں یہاں تک آ گئی ہے، اور گامزن ہے کہ مشرق سے مغرب، اور جنوب سے شمال تک پورے معمورہ کے حکمران اُلوہیت اور خدائی کے دعویدار نظر آتے ہیں، وہ اس طرح اپنے انجام سے غافل و بے خبر رہتے ہیں، جس طرح نمرود، فرعون، شدّاد وغیرہ بے لگام حکمران اپنے اپنے زمانہ میں بے خبر رہتے تھے۔ دینی علوم، مذہبی اقدار اور اسلامی شعائر چاروں طرف سے زوال پذیر اور علماء، صلحاء، اتقیاء، معتوب و مغضوب معلوم ہوتے ہیں۔ ہر طرف اور ہر محاذ پر نام نہاد روشن خیال مسلمان بھی یورپ کی چوکھٹ پر سجدہ کر رہے ہیں، اور ان کی محفلوں اور تعلیمی اداروں میں یورپ کا طوطا بول رہا ہے، اور احکام نافذ کر رہا ہے۔

مگر یاد رکھیں! یہ سارے کاغذ اور پلاسٹک کے پھول ہیں۔ ان میں نہ مہک ہے، نہ خوشبو اور نہ ہی نورانیت۔ بیشک! تیرا ربّ گھات میں ہے، فرمایا: ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ [الفجر: ۱۴] (بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے)۔

اس ترقی یافتہ دور میں بھی تیرے ربّ کا عالمگیر چیلنج اب بھی بدستور موجزن و باقی ہے، جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے تھا کہ: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ [البقرة: ۲۳] (اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ) آؤ میدان میں حاضر کروا اپنے دانشوروں، سائنسدان، پروفیسروں، ڈاکٹروں، مددگاروں وغیرہ کو، اور بنا لاؤ نظامِ حیات، قانونِ فطرت، عالمگیر ضابطۂ اخلاق، کامل و جامع قانونِ مساوات، مکمل و ہمہ گیر قانونِ انصاف، جو سارے انسانوں اور زندگی کے تمام شعبوں، ساری مخلوقات اور تمام حیوانات، شجر و حجر سب کے لئے مفید اور فائدہ مند ہو، تو ہرگز نہیں لا سکو گے، اور نہیں بنا سکو گے۔ یہ تمہارے بس کی چیز نہیں، جس طرح مکھی یا مچھر جیسی ادنیٰ اور حقیر مخلوق پیدا کرنا تمہاری قدرت سے باہر ہے، اور تم سراسر عاجز ہو، اسی طرح قرآنِ حکیم جیسی کتاب جس میں قیامت تک کی مخلوقات کی فلاح و کامیابی کا جامع قانونِ عدل، اور عالمی ضابطۂ حیات ہے، تم ہرگز دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکو گے۔

پس تمہاری نجات و فلاح اسی میں ہے کہ بغیرِ حیلہ و حجت، اور بلا چون و چرا اُسے قبول کر کے ابدی عذابِ الیم، اور جہنم کی تباہ کن آگ سے بچو، اور اپنے بچنے کی تدبیر کرو، ورنہ تمہارا حشر وہی ہوگا جو تم سے پہلے حکمرانوں، انسانوں اور قوموں کا ہوا، ﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ﴾ [الصافات: ۳۴] (ہم مجرم لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں)۔ کا زور آور تازیانۂ عبرت ہر وقت تمہارے سروں پر گھوم رہا ہے۔ ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ۲۴] (ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر

ہوں گے، وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے)۔اس زبردست آگ سے بچو، جس کا ایندھن انسان اور پتھر بنیں گے۔ وہ آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا تیز ہے، یہ پتھر یا تو عام پتھر ہوں گے، جس کی آگ لکڑیوں اور کوئلہ کی آگ سے سخت ہوتی ہے، یا یہ پتھر ان کے پتھر سے تراشے ہوئے معبود ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ کفار کے قلوب مراد ہیں، جو پتھر کی طرح یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں، قولہ تعالیٰ: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ [البقرۃ:۷۴] (پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، گویا وہ پتھر ہیں، یا ان سے بھی زیادہ سخت)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ﴾ [الھمزۃ:۷] (وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، جو دلوں پر جا لپٹے گی)۔ وہ دل جو پتھر کی طرح سخت اور سیاہ تھے۔ نعوذ باللہ منہ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے: ’’اُوْقِدَ عَلَى النَّارِ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى اِحْمَرَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى ابْيَضَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى اسْوَدَّتْ فَهِيَ سَوْدَاءُ مُظْلِمَةٌ‘‘۔ [ترمذي]

یعنی جہنم کی آگ ایک ہزار برس بھڑکائی گئی، یہاں تک کہ سرخ ہوگئی، پھر ایک ہزار برس تک بھڑکائی گئی، یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی، پھر ایک ہزار برس تک بھڑکائی گئی، یہاں تک کہ وہ سیاہ ہوگئی، ابھی وہ سیاہ تاریک ہے۔

یہ آگ کافروں کے لیے ہے، جن کے دل پتھر کی طرح سخت اور سیاہ تھے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گناہگار مسلمان اپنے برے اعمال کی وجہ سے اس قسم کی تیز آگ میں نہیں ڈالے جائیں گے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور دیگر محققین کا بھی یہی فتویٰ اور رائے ہے۔

❁❁❁

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ
وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: اور آپ خوشخبری سنا دیں اُن لوگوں کو جو ایمان لائے، اور اچھے عمل کیے، کہ بیشک ان کے لیے باغات ہیں۔ جن میں نہریں بہتی ہیں۔ جب بھی وہ ان بہشتوں میں پھلوں سے روزی دیئے جائیں گے تو کہیں گے۔ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے روزی دی گئی، اور ان کو اس میں دیئے جائیں گے ایک دوسرے کے مشابہ پھل، اور ان کے

لئے ان بہشتوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۲۵﴾

معارف ومنازل

اس مقام پر بھی ربّ العزّت جل شانہ نے ترہیب وترغیب کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے، جہنمیوں کے انجامِ بدکو بیان کرنے کے بعد متصلاً ایمانداروں کے انجامِ خیر کا تذکرہ فرمایا، اور انہیں دائمی وابدی نعمتوں کی بشارت سنائی۔

فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم توحید الٰہی کے پرستاروں، رسالت کے پروانوں اور قرآن حکیم کے جان نثاروں کو اپنے ربّ رحیم کی طرف سے نعیمِ مقیم کی بشارت سناؤ، جنھوں نے ایمان باللہ وبالرسول وبالقرآن وبالیوم الآخر کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ کی دولت سمیٹ کر اپنے پروردگار کے سارے احکام بجالائے ﴿اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ کہ ربّ العزّت سبحانہ نے ان کے لیے گھنے جنتی باغات تیار کئے ہیں، جن کے نیچے بہت سی نہریں جاری ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ [المرسلات: ۴۲] (بے شک پرہیزگار سایوں اور چشموں میں ہوں گے، اور میووں میں جوان کو مرغوب ہوں)۔ قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [الکهف: ۱۰۷]

حضرت حکیم بن معاویہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ فِی الْجَنَّةِ بَحْرَ الْمَاءِ وَبَحْرَ الْعَسَلِ وَبَحْرَ اللَّبَنِ وَبَحْرَ الْخَمْرِ ثُمَّ تَشَقَّقُ الْاَنْهٰرُ مِنْهَا بَعْدُ﴾ [الترمذي والدارمي]

شبِ معراج کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملے، اس وقت وہ جنت میں ایک درخت کا سہارا لے کر بیٹھے تھے، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جنت کا رقبہ موجود ہے، جوں جوں انسان عمل کرتا ہے، ویسے ہی یہاں اس کے لئے عمارت بنتی جاتی ہے، فرمایا: ہر ایک چیز ایک عمل کی شکل میں ہے، کوئی عمل نہر بنتا ہے، پھر کوئی شرابِ طہور، کوئی نہرِ زنجبیل، کوئی نہرِ سلسبیل، کوئی شہد، کوئی دودھ، کوئی شرابِ خالص، غرض جس طرح اعمال ہوں گے، اسی شکل میں یہاں کی نہریں بنیں گی۔ کوئی عمل درخت بنے گا۔ پھر درخت بھی مختلف قسم کے ہوں گے، اور ان کے پھل بھی مختلف ہوں گے۔ ذائقہ ولذت بھی مختلف ہوں گے، کوئی عمل مکان کی شکل میں ہوگا، کوئی قالین کی شکل میں ہوگا، تو کوئی تخت کی شکل میں ہوگا، علیٰ ہذا القیاس ہر قسم کے اعمال مختلف اشکال میں ہوں گے، اسی بناء پر اعمالِ صالحہ کو تقریباً ہر جگہ جمع کے صیغہ کے ساتھ لایا گیا ہے، اور ایمان کو ہر جگہ واحد کے صیغہ سے ذکر فرمایا گیا ہے۔

بنیادی چیزیں بھی یہی دونوں ہیں جو ہر جگہ مذکور ہوتی رہی ہیں، پوچھا گیا کہ جنت میں درخت کس عمل سے

بنتے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''سبحان الله و الحمدلله و لا إله إلا الله و الله أكبر'' پڑھنے سے جنت میں درخت بنتے ہیں۔ حضرت ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ جب آدمی ''سبحان الله'' إلخ کہتا ہے، تو ایک نورانی جسم بن کر عرشِ معلیٰ پر جاتا ہے، اور عرشِ معلیٰ پر چکر لگاتا ہے، اور شہد کی مکھی کی طرح گنگناتا ہے، اور وہ گنگنانا کیا ہوتا ہے؟ وہ اس پڑھنے والی کی تعریف (تعارف) کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جنت میں تمام عبادتیں ختم (منقطع) ہوجاتی ہیں، صرف دو عبادتیں باقی رہتی ہیں:

(۱) تلاوت قرآن کریم، کیونکہ جنتی درجات قرآن کی تلاوت پر بنتے ہیں کمافي الحديث: ''اِقْرَأْ وَ رَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَؤُهَا''۔ اور جنت کے درجات قرآنی آیتوں کے مطابق ہیں، نہ زیادہ اور نہ کم۔

(۲) دوسرا ذکر اللہ۔ صحیح مسلم میں ہے کہ دنیاوی زندگی سانس کے ساتھ وابستہ ہے۔ جنت کی زندگی ذکر اللہ سے وابستہ ہوگی، وہاں یہی ذکر اللہ سانس کا قائم مقام ہوگا، جس طرح یہاں بلا تکلف ہے، وہاں ذکر اللہ بلا تکلف جاری رہے گا، تو ذکر اللہ کو دوام و بقاء حاصل رہے گا، اور وہی جنتیوں کے لئے سببِ بقاء و سرور ہوگا۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد:۲۸] (خبردار! خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں)۔ [حاوي الأرواح لابن القيم]

اس کے علاوہ دیگر بہت سے وظائف اور بدنی اعمال وغیرہ پر جنتی درجات اور جنتی مکانات کے بننے اور حصول کا تذکرہ احادیث میں وارد ہے، مثلاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ ملک الموت سے دریافت فرماتا ہے، تو نے جب میرے بندے کی آنکھوں کی ٹھنڈک، اور اس کے کلیجہ کا ٹکڑا چھین لیا (روح قبض کیا) تو اس کا ردِعمل کیا تھا؟ ملک الموت کہتے ہیں: اے اللہ! اس نے تیری تعریف کی، اور ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ، اور اس کا نام ''بيت الحمد'' رکھو۔ [ابن کثیر]

اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو شخص سورۃ اخلاص کی تلاوت کرے گا، اس کے لئے جنت میں محل تیار ہوگا''۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: ''من بنى لِلّٰهِ مَسجدًا بَنَى الله لَهُ بَيْتًا مِثْلَهُ فِي الجنة''۔ [ابن کثیر، مشکوۃ] جو شخص محض رضاء الٰہی کی خاطر مسجد تعمیر کرے گا اللہ سبحانہ وتعالیٰ جنت میں بعینہٖ اُس جیسا اس کے لئے مکان بنائے گا۔ الحمدلله رب العلمين و هو الحق المبين۔

☆ ☆ ☆

﴿كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾

مذکورہ آیت مبارکہ کے چند معانی ہو سکتے ہیں:

(۱) جب بھی جنتیوں کو جنت میں مختلف پھلوں سے رزق کھانے کو دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے: یہ تو وہی ہے، جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا، کیونکہ وہ پھل ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک دفعہ جنتیوں کو پھل پیش کیے جانے کے بعد جب دوسری دفعہ ان سے ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے، تو جنتی کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہیں، جو ہمیں اس سے پہلے جنت میں دیئے گئے تھے، مگر جب انہیں تناول فرمائیں گے، تو ان کا ذائقہ ولذّت پہلے پھلوں سے بہت ہی مختلف ہوگا۔

(۲) دوسرا معنی یہ ہے کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے، اور جنتی انہیں دیکھ کر دنیا کے پھلوں پر انہیں قیاس کریں گے، مگر ان دو قسم کے پھلوں میں ذائقہ کے اعتبار سے بڑا تفاوت ہوگا۔

(۳) تیسرا معنی یہ ہے کہ جب بہشت میں جنتیوں کو پھل پیش کیے جائیں گے، تو وہ لوگ کہیں گے کہ یہ ہمارے ان اعمالِ صالحہ کی بدولت ہمیں میسر ہیں، جن اعمالِ صالحہ کی لذت اور سرور ہمیں دنیوی زندگی میں حاصل رہا۔ واللہ اعلم

اس تنوع اور تشابہ کی حکمت:

حضرت باری تعالیٰ سبحانہ کی عظیم صفت، یعنی چیزوں کی شکل وصورت میں مشابہت اور خصوصیات میں تنوع! یہ اس قادرِ مطلق کی صفت کی نمایاں خصوصیت ہے، اس بات کو اگر سامنے رکھیں، تو یہ کائنات اپنے مظاہر سے زیادہ اپنی حقیقت کی رو سے عظیم نظر آئے گی، اس عظیم حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہم صرف انسان کو بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں، دیکھئے! انسان کی تخلیق، سر، جسم، گوشت، خون، ہڈی، رگ، پٹھے، اعضا، دو آنکھیں، دو کان، ایک منہ، ایک زبان اور ناک کو دیکھا جائے، تو سب کے سب ایک انسان جیسے ہیں، زندہ خلیات میں ایک جیسے ہیں، اور شکل و مادّہ کی ترکیب میں بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، لیکن صفات وخصوصیات اور طبیعت وصلاحیت میں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔

انسان اپنے تمام تخلیقی مادّوں کی مشابہت کے باوجود ایک دوسرے میں نمایاں امتیازی فرق رکھتے ہیں۔ یہ فرق کبھی اتنا زیادہ ہوتا ہے جتنا کہ زمین وآسمان کے مابین ہے۔ کھربوں انسانوں میں یہ عمومی تنوع اور حیران کن

کمالات وصفات، عقل کی پرواز سے باہر ہیں، حالانکہ بنیاد سب میں ایک ہی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی تمام صنعتوں میں اتنا تنوع ہے کہ جس کے سوچنے سے سر چکرانے لگتا ہے۔ یہ تنوع کبھی نوع اور جنس میں ہوتا ہے، کبھی اشکال وعلامات میں ہوتا ہے، اور کبھی خصوصیات اور صفات میں ہوتا ہے۔ جبکہ ان سب کی ابتداء اس واحد خلیہ سے ہوتی ہے، جو تخلیق میں ایک جیسا ہوتا ہے۔

یہ ہیں حضرت باری تعالیٰ کی صفت کے آثار، اور اس کی قدرت کی آیات۔ اب کوئی ہے جو اس کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی بندگی نہ کرے، اور یہ سب کچھ اس کے دستِ اعجاز کے واضح آثار ہیں، جو ان تمام چیزوں میں آنکھوں سے نظر آتی ہیں، اور ان چیزوں میں بھی جو آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، تو اب کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک اور ہمسر ٹھہرائے؟ یہ رنگارنگ نعمتیں، جن پر نظر ٹکٹکی باندھ کر رک جاتی ہے، یہ پاکیزہ پھل میوے اور یہ بہت سے ملتے جلتے پھل، جن کے بارے میں جنتی خیال کریں گے کہ وہ اس سے قبل بھی انہیں دیئے گئے تھے، یہ دنیا کے پھل تھے، اور نام اور شکل میں جنت کے پھلوں کے بعینہٖ مشابہ تھے، اور جنت میں ان جیسے پھلوں کو پاکر انہیں خیال ہوگا کہ وہ دنیا میں انہیں کھا چکے ہیں، یا یہ جنت ہی کے پھل ہوں گے، جو انہیں اس سے قبل جنت میں دیئے جا چکے تھے، اور اب ان کے مشابہ پھل جنت میں دوبارہ دیئے جائیں گے۔

یہ ظاہری مشابہت اور داخلی تنوع ہر بار ایک الگ لطف پیدا کرے گا، اور اس سے ایک لذیذ، شیریں، خوش طبعی، سرور وکیف، کامل خوشنودی اور حسین فرحت کی فضاء پروان چڑھے گی، ہر اچانک لطف کے بعد مزید کا یک لطف، ہر بار ظاہری مشابہت کا سامنا، اور ہر بار اس بات کا انکشاف کہ یہ تو بالکل نئی چیز ہے۔ اس آیت کریمہ میں جنت کی ایک جزئی نعمت کے استعمال کی کیفیت کا بیان ہوا، یہاں جنتی نعمتوں کا بالاستیعاب بیان کرنا مقصود نہیں۔

قرآن کریم کا طرزِ بیان بڑا ہی متنوع ہوتا ہے، وہ ایک حقیقت کے تمام پہلوؤں کو ایک جگہ بیان نہیں کرتا، بلکہ متفرق جزئیات کی شکل میں متعدد مختلف مقامات پر انہیں بیان کرتا ہے، تاکہ قارئین، سامعین، شائقین بار بار ان واقعات سے محظوظ ہوں، اور انہیں ہر بار تفریحِ خاطر جیسی سرور وخوشی حاصل رہے، کیونکہ مشک وعنبر اور عمدہ خوشبو کو بار بار سونگھنے سے دماغ کو جو فرحت وسرور حاصل ہوتا ہے، وہ ایک مرتبہ سونگھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ تفصیل سورۃ الرحمن، اور سورۃ الواقعہ میں ہے، جو ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

جنت کی ہر نعمت اصلی بھی ہے، اور دائمی بھی۔ دنیا کی نعمتیں فانی بھی ہیں، اور ہزاروں نقائص سے بھرپور بھی۔

جنتی نعمتوں کا اندازہ صرف ربّ العزّت سبحانہ کو معلوم ہے، جبکہ پیغمبر ﷺ نے صرف اتنا ارشاد فرمایا: ’’مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ‘‘۔[متفق علیه براویة أبي هريرة] یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اپنے بندوں کے لیے ایسی ایسی نعمتیں تیار کی ہیں کہ انہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی کے دل پر اس کا وہم وخیال گزرا۔ اگر دلیل چاہتے ہو تو یہ ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [الم سجدة:۱۷] (کوئی متنفس نہیں جانتا کہ اُن کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے)۔ یعنی کوئی نفس نہیں جانتا جو آنکھوں کی ٹھنڈک (کنایہ ہے فرحت وسرور سے) ان کے لئے وہاں چھپائی گئی ہے، جسے دیکھ کر جنتیوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، اور وہ دنیوی رنج و بیماری، اور ہر قسم کی پریشانیوں کو یکسر بھول جائیں گے، یہ سب کچھ ان کے ایمان واعمالِ صالحہ کا عوض وبدلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ شانہ ہم سب کو یہ سعادت نصیب فرمائے۔ آمین

﴿وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَٰجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ اور وہاں جنت میں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ اکثر کے نزدیک مراد جنتی حوریں ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ازواج سے مراد یہی تمہاری بوڑھیاں اندھی چُندھی ہیں، وہاں دنیا کی آلائشوں، نجاستوں اور دیگر ہر قسم کے ظاہری و باطنی نقائص وعیوب سے پاک کردی جائیں گی۔

’’مُطَهَّرَةٌ‘‘ پاک وصاف، پیشاب بول وبراز، حیض ونفاس، بلغم، تھوک، سنک، منی، مذی، ودی، ہر قسم کی آلائش، میل کچیل، اسی طرح بدزبانی بداخلاقی، بغض وحسد، غلط اشارے، طنز ومذاق، بدگمانی بدظنی وغیرہ چیزوں کا وہاں تذکرہ تو درکنار، نام ونشان تک نہیں ہوگا۔ قوله تعالىٰ: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ﴾ [الأعراف:۴۳] (اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے ہم سب نکال ڈالیں گے)۔ جنت کے دروازے پر ایک عجیب وغریب مشک وعنبر جیسی ایک نہر ہے، جنتی دخول سے پہلے اس نہر سے غسل کر کے آگے گزریں گے، دنیوی غل وغش اور ہر قسم کے ظاہری باطنی عیوب ونقائص سے پاک وصاف معصوم ہو کر گزریں گے۔ [درمنثور وغیرہ]

’’تطہیر‘‘ کا لفظ جیسا کہ اجسام کے پاک کرنے میں استعمال ہوتا ہے، ایسا ہی اس کا استعمال افعال واخلاق کی درستگی پر بھی ہوتا ہے۔ لفظ ’’مطهرة‘‘ میں ’’طاهرة‘‘ کی بنسبت مبالغہ زیادہ ہے، کیونکہ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود انہیں پاک کیا ہے۔ انسان فطری طور پر مدنی الطبع ہے، وہ متمدن زندگی کا طالب رہتا ہے، اگر اسے تمام جہاں کی نعمتیں میسر ہوں پھر بھی وہ بغیر رفیقۂ حیات (جوڑی) کے سکون وخوشی محسوس نہیں کرتا، اس لئے قرآن کریم جابجا

جنتی نعمتوں کے ساتھ جنت کی حوروں اور خدام کا تذکرہ کرتا ہے، تاکہ مسلمانوں میں عملِ صالح کا جذبہ وشوق ابھر جائے، اور وہ مکمل بندگی کو اپنائیں۔ جنت کیا ہے؟ وہ سراسر خوشحالی، ناز و تنعم، پاکیزہ نعمتوں اور پاکیزہ حوروں اور ہر اعتبار سے لاکھوں بے شمار طہارتوں کا ایک عظیم الشان ماحول ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد ☆ کسے را با کسے کارے نباشد

اس سلسلے میں ''سورۃ الدہر'' کے تفسیری فوائد میں کچھ کارآمد باتیں لکھی جائیں گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر جنت کی کوئی عورت زمین پر جھانک لے، تو آسمان سے زمین تک اس کی چمک اور خوشبو پھیل جائے، اور سارا جہاں اس کی مہک سے معطر ہو جائے، اور جنتی حور کے سر کا دوپٹہ (خمار) دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے قیمتی ہے۔ [متفق علیہ] اگر جنتی حور اپنے منہ کا لعاب سمندر میں ڈال دے، تو سمندر کا کھارا پانی شہد کی طرح شیریں ہو جائے۔ [متفق علیہ] جنتی حوروں کے بدن پر ستر جوڑے ریشمی لباس کے ہوں گے، جن سے ان کی پنڈلیوں کا مغز (گودا) نظر آئے گا۔ [مشکوٰۃ]

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم میں اپنی سند سے روایت کیا ہے (بروایت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ) کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو گروہ جنت میں پہلے داخل ہوگا، وہ ایسا چمکتا ہوا ہوگا، جیسا کہ چودہویں رات کا چاند، اور اس کے بعد جو گروہ داخل ہوگا، وہ ایسا چمکتا دمکتا ہوگا جیسے آسمان میں سب سے زیادہ چمکتا ہوا ستارہ، جنتی پیشاب پاخانہ تھوک، سنک اور دیگر ہر قسم کی تمام آلائشوں سے پاک وصاف ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی، پسینہ مشک کی خوشبو کا، ان کی انگیٹھیاں خوشبو کی ہوں گی، اور بیویاں ان کی حورعین (نہایت خوبصورت، حسین، بڑی آنکھوں والی) ہوں گی، اور ان سب کے اخلاق ایک جیسے ہوں گے۔ یعنی سب سے ملے جلے ہوں گے، جیسے ایک شخص خود اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے، اور بغض نہیں رکھتا، اور ایک سی تمنائیں ہوتی ہیں، ایسے ہی وہ سب کے سب ہوں گے، اور ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے قد کے برابر، یعنی ساٹھ ہاتھ کا ہوگا۔ [متفق علیہ]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اول گروہ کے چہرے چودہویں رات کے چاند جیسے ہوں گے، دوسرے گروہ کے چہرے آسمان کے روشن ستارے جیسے ہوں گے، ہر شخص کی دو بیویاں ہوں گی، اور ہر ایک کے جسم پر ستر جوڑے ہوں گے، اور بوجہ نفاست (حسن ونزاکت) کے ان کی پنڈلیوں کی ہڈی کا گودا گوشت، خون اور لباس کے اوپر سے نظر آئے گا۔ [متفق علیہ]

قرآن حکیم نے فرمایا:﴿وَحُوۡرٌ عِیۡنٌ ﴿۲۲﴾ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُؤِ الۡمَکۡنُوۡنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ [الواقعة] (اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں جیسے (حفاظت سے) تہہ کئے ہوئے، اپنے غلاف کے اندر صاف شفاف موتی کے دانے، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جو وہ کرتے تھے)۔

قولہ تعالیٰ:﴿اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰہُنَّ اِنۡشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلۡنٰہُنَّ اَبۡکَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتۡرَابًا ﴿۳۷﴾﴾[الواقعة] یعنی (ہم نے پیدا کیا ان عورتوں کو ایک اچھی پیدائش پر، پھر کیا ان کو کنواریاں، پیار دینے والیاں، ہم عمر)۔ قولہ تعالیٰ: ﴿کَاَنَّہُنَّ الۡیَاقُوۡتُ وَ الۡمَرۡجَانُ﴾[الرحمن:۵۸]قولہ تعالیٰ:﴿کَاَنَّہُنَّ بَیۡضٌ مَّکۡنُوۡنٌ ﴿۴۹﴾﴾ [الصافات] یعنی لعل و یاقوت اور شتر مرغ کے انڈے کی طرح جاذبِ نظر، خوش رنگ وخوبصورت وحسین، جن کے صرف دیکھنے اور نظارے سے سیری نہ ہو۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحن اللہ العظیم

فائدہ جلیلہ:

جنتی حوروں کی کثرت اور تعدد، حسن و جمال اور بے پناہ خوب صورتی و تروتازگی، اور دیگر بے شمار خوبیوں کو دیکھ کر اور سن کر دنیاوی بیبیاں بیساختہ چیخ اٹھتی ہیں کہ ہمارا کیسا ماحول ہوگا؟ اور ہم کس باغ کے گلاب کے پھول ہوں گی؟ ہمارے حسن و جمال اور خوبصورتی کا کیا انداز ہوگا؟ جب مردوں کے لئے حوروں کا تذکرہ ہوتا ہے، تو ہمارے متعلق کیوں خاموشی ہے؟ ہمارے متعلق کیوں کسی خاص چیز کا تذکرہ نہیں؟ تو ان کی تسلی کی خاطر عرض ہے کہ انہیں بھی ربّ العزّت کے حکم پر ان کے ایمان وتقویٰ، اعمالِ صالحہ اور شرعی حیاء و پردہ کی بدولت ان سب جنتی نعمتوں سے نوازا جائے گا، جن نعمتوں سے مردوں کو نوازا جاتا ہے۔ جنتی غلمان بکھرے ہوئے خوبصورت موتیوں کی طرح کے ہزاروں پاکیزہ خدام ان کی خدمات پر مامور رہیں گے۔

ان جنتی حوروں کی حیثیت دنیوی سوکنوں کی طرح نہیں ہوگی، بلکہ دنیوی پاکباز بیوی کی حیثیت ملکہ صاحبہ کی ہوگی۔ تمام حوروں پر اس کو برتری کا شرف حاصل رہے گا، اور اس کو سربراہ کی عزّت وحیثیت حاصل رہے گی، اور لطف کی بات یہ کہ وہاں بغض وعناد، حسد وکینہ کا نام ونشان نہیں ہوگا۔ جنتی حوروں کا دنیوی بیگمات کے ساتھ ایسا تعلق ہوگا، جس طرح حقیقی بہنوں کی محبت و تعلق، پھر کسی طعنۂ طنز وتشنیع اور حسد وعناد کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔

جنتی زندگی کو کسی بھی طرح دنیوی زندگی پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، وہاں معصومیت، محبت و پیار ہی کا راج ہوگا۔ الحمد للہ۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ دنیوی جنتی عورتیں حوروں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوں گی۔ دنیوی عورتیں جنتی

حوروں سے ستر ہزار درجہ افضل وخوبصورت ہوں گی۔ [تذکرة للقرطبي] اوران کا حسن حوروں سے کئی گنا زیادہ ہوگا، کیونکہ دنیوی عورتوں کے حسن وجمال میں، عبادات وطاعات اور اعمالِ صالحہ کا رنگ نمایاں ہوگا، اور یہی اصل میں شرف وعزت کا سبب ہوگا۔ واللہ اعلم

دنیا میں کسی نعمت کے میسر آنے کے ساتھ ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ یہ کسی وقت چھن بھی سکتی ہے، یا ختم ہوسکتی ہے، اسی پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جنتی نعمتیں ابدی دائمی ہیں، وہاں کی زندگی بھی دائمی وابدی ہوگی، اور ہر قسم کی نعمتیں بھی۔ ہر لحہ نعمتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا، اور خوشیاں بڑھتی رہیں گی، نہ کسی چیز کے زوال کا خطرہ درپیش ہوگا، نہ کمی ونقصان کا، اور نہ ہی ختم ہونے کا کوئی تصور ہوگا، ہر چیز پر دوام وبقاء کی مہر لگ جائے گی، فرمایا:

﴿وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ یہ خلود ابدی ہوگا۔ الحمدللہ

دنیا کی زندگی عارضی ہے، جو موت آنے پر ختم ہوگی۔ آخرت کی زندگی ابدی ہے، اس پر کسی قسم کا فنا نہیں، نہ وہاں موت ہوگی، اور نہ نیند، یہی وجہ ہے کہ جنتی زندگی میں نیند نہیں ہے، وہاں ہر وقت بیداری ہی بیداری ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب جنتی اور دوزخی اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں گے، تو جنتی دل میں سوچیں گے کہ کہیں موت کی وجہ سے یہ نعمت ہم سے چھن نہ جائے، اور دوزخی سوچیں گے کہ شاید موت کی وجہ سے ہم اس عذاب سے نجات پالیں۔ "يُؤْتٰى بِالْمَوْتِ فِيْ صُوْرَةِ كَبْشٍ" (موت کو ایک دنبے کی شکل میں لایا جائے گا) وہ دنبہ پکار اٹھے گا کہ دونوں گروہ جنتی اور دوزخی سن لو! میں موت ہوں، آج مجھے ذبح کیا جارہا ہے، اور آج کے بعد موت ختم ہوگئی، تو فرشتہ اعلان کرے گا: خُلُوْدٌ لَا خُرُوْجَ۔ کہتے ہیں، اس فقرے سے اہلِ جنت کو اس قدر خوشی ہوگی پہلے ایسی خوشی کبھی نہ ہوئی ہوگی، اور اہلِ نار ایک بے انتہاء تباہ کن پریشانی میں ڈوب جائیں گے، اسی کے ساتھ "تُغْلَقُ اَبْوَابُ جَهَنَّمَ"۔ (جہنم کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کیے جائیں گے)۔

قرآن کریم نے فرمایا: ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝﴾ [الهمزة] (وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، جو دلوں پر جالپٹے گی (اور) وہ اس میں بند کر دیئے جائیں گے (یعنی آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں)۔ یہ دروازے جب بند ہوں گے، تو ہمیشہ کے لئے بند ہوں گے، پھر کبھی بھی نہیں کھلیں گے۔

رہا جہنم کا وہ طبقہ جس میں خلود نہیں ہے، وہ صرف نافرمان گناہ گار مؤمنین کے لئے ہے، وہ ہمیشہ کے لئے بند

نہیں ہوگا، اس کے دروازے حسب مراتب واحوال کھلتے رہیں گے، اور بند ہوتے جائیں گے۔ مختلف قسم کی شفاعتیں ہوں گی، جن کے ذریعہ گناہ گار مسلمان دوزخ سے آزادی حاصل کرتے رہیں گے۔

اسی طرح سزا کی مدت ومیعاد پوری ہونے کے بعد جہنم سے گناہگاروں کے خروج کا سلسلہ جاری رہے گا، جس طرح دنیا کے جیلوں، عقوبت خانوں میں ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ ایک نماز عمداً چھوڑنے کی سزا جہنم میں ننانوے سال کی ہوگی، اسی طرح یتیم، نادار، عوام الناس کے مال کھانے پر ہزاروں سال تک مجرموں کو جہنم میں رہنا ہوگا، جبکہ سودی کاروبار کرنے والوں، اور ذخیرہ اندوزوں کی سزا اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ [فضائل اعمال]

بعض روایات میں ہے کہ موت کو ایک دنبے کی شکل میں لایا جائے گا، جس کو جنتی اور دوزخی دیکھ کر پہچان لیں گے، کیونکہ سب نے اس کو دیکھا ہے۔

پھر حضرت یحیٰ بن زکریا علیہم السلام کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے مبارک ہاتھ سے اسے ذبح کردیں، چنانچہ وہ میدان میں تشریف لاکر موت کو اپنے ہاتھ سے ذبح کریں گے، اور ساتھ ہی اعلان فرمائیں گے کہ موت ہمیشہ کے لئے ذبح ہوکر ختم کردی گئی، آئندہ نہ جنت میں اس کا وجود ہوگا، اور نہ ہی جہنم میں۔ اس اعلان کے ساتھ جنتیوں کی خوشی قابل دید ہوگی، اور جہنمی مایوس ہوکر غم وپریشانی میں مکمل ڈوب جائیں گے۔

۞ ۞ ۞

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا
مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا اس بات سے کہ بیان کرے مثال مچھر کی، یا اس سے بڑی (جسامت میں یا حقارت میں) چیز کی۔ سو جو لوگ مؤمن ہیں وہ تو یقیناً جانتے ہیں (یقین کرتے ہیں) کہ یہ مثال بہت ہی موقع کی ہے، ان کے رب کی جانب سے، اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہوچکے ہیں، وہ یہی کہتے رہیں گے کہ کیا مطلب تھا اللہ تعالیٰ کا اس حقیر مثال سے؟ گمراہ کردیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہت سوں کو، اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہت سوں کو، اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے مگر بدکاروں کو ﴿۲۶﴾

ربط ومناسبت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے من جانب اللہ ہونے کی واضح دلیل بیان فرمائی کہ اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی نہیں تو تم سب مل کر ایک مختصر سورت بناڈالو! مگر وہ ہزار کوششوں کے باوجود نہ بناسکے، اور نہ ہی اب تک کوئی بناسکا، اور نہ ہی آئندہ قیامت تک کوئی بناسکے گا۔

جب کفار ومنافقین کے پاس اس چیلنج کا جواب نہ تھا، وہ سارے شرمندہ وعاجز رہے، توانہوں نے ’’ڈوبتے کو تنکے کا سہارا‘‘ کے بمصداق یہ معارضہ پیش کیا، یا اپنے فاسد خیال کے مطابق قرآن حکیم میں نقص نکالا کہ اگر قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا، تو کہاں اتنا بڑا عظیم خدا، اور کہاں اتنی چھوٹی سی چیز مچھر، یا مکھی، یا مکڑی کی مثال دینا؟

شانِ نزول:

یہود، مشرکین، منافقین یہ تینوں فاسقین قرآن کریم کے متعلق یہ اعتراض پیش کرتے تھے کہ قرآن کریم میں بعض معمولی، خسیس اور نہایت حقیر چیزوں کا ذکر ہے، جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کے کلام کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ کہیں مچھر کا ذکر ہے، کہیں مکھی اور مکڑی کا، حالانکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ بادشاہوں کا بادشاہ، اور مالکِ کُل ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس کی طرح اس کا کلام بھی ارفع واعلیٰ ہو، اور عظیم الشان چیزوں کے بیان پر مشتمل ہو۔ عام محاورہ میں کہتے ہیں: ’’کلام الملوک ملوک الکلام‘‘ بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جس طرح حق تعالیٰ کی شان بلند وبالا ہے، اسی طرح اس کا کلام بھی بلند وبالا ہونا چاہئے، اور اس میں گدھے، کتے، مچھر، مکھی، مکڑی جیسی ادنیٰ وحقیر چیزوں کا ذکر نہیں ہونا چاہئے۔ اس اعتراض کے جواب میں ربّ العزّت نے مذکورہ آیتِ مبارکہ نازل فرمائی۔

معارف ومنازل

جاننا چاہئے کہ قرآن حکیم کے بنیادی علوم ومعارف میں سے ایک علم ضربُ الامثال ہے۔ ضربُ الامثال کا مطلب یہ ہے کہ ایک غیر محسوس چیز کو محسوس بنایا جائے۔ حضرت امام جصاصؒ، امام رازیؒ اور دیگر محققین فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں ایک ہزار ضربُ الامثال مذکور ہیں۔ ضربُ الامثال کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک معقول چیز کو موجود چیز کے ذریعے مخاطب کے ذہن میں ڈالا جائے، جس سے ایک چیز کی صورت دوسری کے ذریعے نظر کے سامنے آجائے، جیسے کہ پہلے آیت کریمہ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ کے تحت بیان ہوا۔

☆ ☆ ☆

ضرب الامثال اور کلمہ ضرب کے معانی:

قرآن حکیم نے جہاں کوئی مثال بیان فرمائی اُسے ''ضرب الامثال'' کہا، چونکہ لوگوں کے ذہن میں ضرب کا مشہور معنی ''مارنا'' راسخ ہو چکا ہے، اس لئے ضربُ الامثال کے کلمہ سے انہیں اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ امثال کے ساتھ کلمۂ ضرب کا الحاق کیوں اور کیسے ہوا؟ تو مختصراً عرض ہے کہ ضرب صرف مارنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا استعمال متعدد معانی میں ہوتا ہے۔ انہی میں سے ایک مشہور معنی ''ضرب الامثال ہے''۔ اس میں معنی ضرب (مارنا) کا لحاظ نہیں ہوتا۔ ضرب کا استعمال درجِ ذیل معانی میں ہوسکتا ہے:

(۱) الضرب بمعنی مارنا، قوله تعالى: ﴿فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ [محمد: ۴] أي: قَطْعَ الرِّقَابِ بِالضَّرْبِ۔

(۲) الضرب بمعنی احاطہ، إلصاق، قوله تعالى: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ [البقرة: ۶۱] أي أَحَاطَتْ وَأُلْصِقَتْ۔

(۳) الضرب بیان کرنا، ظاہر کرنا، پیش کرنا، قوله تعالى: ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ﴾۔ [العنکبوت: ۴۳]

(۴) الضرب پردہ، حائل، دیوار، قوله تعالى: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ﴾ أي حَاجِزٍ، حائل۔ [الحديد: ۱۳]

(۵) الضرب کھڑا کرنا، گاڑنا، قول العرب: ضَرَبَ النَّاسُ خِيَامَهُمْ لوگوں نے خیمے گاڑ دیئے۔

(۶) الضرب بجانا، يقال: ضرب الدف یعنی بجانا، اس کا ترجمہ دف مارنے سے غلط ہوگا۔

(۷) الضرب چلنا، سفر کرنا، مسافت طے کرنا، قوله تعالى: ﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ [النساء: ۱۰۱] أي سَافَرْتُمْ۔

(۸) الضرب الإلقاء یعنی ڈالنا، پھیلانا، قوله تعالى: ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ﴾ [النور: ۳۱] (وہ ڈالدیں (پھیلادیں) اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر)۔

(۹) الضرب والضروب بمعني أنواع وأقسام قولهم: وَلِلأَمْوَالِ ضُرُوبٌ أي أَنْوَاعٌ مُتَعَدِّدَة۔

(۱۰) الضرب للعدد، حدیث بخاری میں ہے: ''اَلحَامُ فَحْلُ الإِبِلِ يَضْرِبُ الضِّرَابَ الْمَعْدُوْدَ (العشرة) فَإِذَا قَضَى ضِرَابَهُ (العشرة) وَدَعُوْهُ لِلطَّوَاغِيتِ وَاعْفُوهُ مِنَ الْحَمْلِ فَلَمْ يُحْمَلْ عَلَيْهِ وَسَمَّوْهُ

اَلْخَاتَمُ"۔[بخاري تفسير سورة المائدة]

(۱۱) الضرب مالِ غنیمت میں سہم مقرر کرنا، وضَرَبَ لَہ بسَهمِہ[بخاري] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنگِ بدر میں شریک نہ ہوسکے، اس کے باوجود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالِ غنیمت میں ان کو شریک فرمایا (حصہ دے دیا) تمام تفصیل کا خلاصہ یہ نکلا کہ "ضرب" اصل میں ایک چیز کو دوسرے پر واقع کرنے کو کہتے ہیں، جیسے: "ضرب المثل، ضرب اللَّبِن (خِشت) ضرب الخاتم"۔ حدیث میں ہے: "یضرب (الشیطان) عَلٰی کلّ عقدة علیک لیل طویل و في الحدیث أیضا حتی ضرب الناس بعطن۔[بخاري] اس کے علاوہ ضرب کے دیگر بہت سے معانی بھی ہیں۔

حیاء کی حقیقت واقسام:

قال الراغب: "الحیاء انقباض النفس عن القبائح وترکھا لذلک"۔[مفردات] یعنی برائیوں سے شرمندہ ہوکر دوری اختیار کرنے کا نام حیاء ہے۔

پھر حیاء کی چار مشہور قسمیں ہیں: (۱) طبعی۔(۲) عرفی۔(۳) عقلی۔(۴) شرعی۔

☆ حیاءِ طبعی:

اس کا دوسرا نام حیاءِ فطری بھی ہے۔ یہ قسم مسلم غیر مسلم سب میں پائی جاتی ہے، کیونکہ یہ فطرت وجبلت کا خاصہ ہے۔ حیاءِ طبعی وہ ہے جس کا سبب انسان کی اپنی طبعیت ہو، اور حیاء نہ کرنے سے دل ہی دل میں اپنے آپ کو قابلِ ملامت سمجھتا ہو، اور ایک شرمندگی محسوس ہو، جیسے اپنی برائیوں کو تنہائی میں یاد کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرنا، اور خجالت ہونا، یا تنہائی میں برہنہ ہوکر بیٹھنا۔

☆ حیاءِ عرفی:

عرف عام رواج اور معاشرہ کا نام ہے، حیاءِ عرفی وہ ہے جس کا سبب عرف اور رواج ہو، اور ترکِ حیاء کی صورت میں انسان عرفاً ورواجاً قابلِ ملامت ہو، جیسے بغیر قمیص کے یا ننگے سر لوگوں کی محفل میں بیٹھنا، یا کھڑے کھڑے کھانا پینا وغیرہ۔

☆ حیاءِ عقلی:

وہ ہے جس کا سبب کوئی امرِ عقلی ہو، اور ترکِ حیاء میں عقلمندوں کے نزدیک وقابلِ ملامت ہو، جیسے عام محفلوں

میں غلط حرکتیں کرنا۔

☆ **حیاءِ شرعی:**

وہ ہے جس کا سبب کوئی امرِ شرعی ہو، اور حیاء نہ کرنے سے شرعاً قابلِ ملامت و مستحقِ مذمت ہو، جیسے غیر محرم عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا، وغیرہ۔

عمدۃ المحققین حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق انیق دربارۂ حیاء

حضرت کشمیری سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیاء ایک ملکہ (قوۃ) کا نام ہے جو انسان کی طبیعت میں پایا جاتا ہے، اور یہ نہایت پسندیدہ صفت ہے، اس لیے وہ ذاتی طور پر ایک ہی صفت ہے، مگر نسبت کے اعتبار سے اس کی یہ تقسیم کی جاتی ہے۔ یعنی اگر امورِ شرعیہ کی طرف اس کی نسبت ہو، تو حیاء شرعی ہے، اگر امورِ عقلیہ کی طرف اس کی نسبت ہو، تو حیاء عقلی ہے، اگر امورِ عرفیہ کی طرف اس کی نسبت ہو، تو حیاء عرفی ہے، اور اگر امورِ طبعیہ فطریہ کی طرف نسبت کرو، تو حیاء طبعی ہے۔ [فیض الباري]

اس تفصیل کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ حیاءِ عقلی و حیاءِ شرعی دونوں متحد ہیں، اور ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، کیونکہ نتیجہ و ثمرہ دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی جو چیز شرعاً مذموم اور قابلِ ملامت ہے، وہ عقلاً مذموم اور قابلِ ملامت ہے۔ اسی طرح جو چیز عقل کی رُو سے مذموم ہے، وہ شرعاً بھی مذموم اور قابلِ ملامت ہے، کیونکہ شریعت کے تمام احکام، اصولی ہوں یا فروعی، عقائد ہوں یا اعمال، بدنی ہوں یا مالی، یا مشترک، یہ تمام کے تمام عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کے عین مطابق ہیں، یہ ناممکن ہے کہ ایک چیز شرعاً قبیح ہو، مثلاً شراب، جوا، یا جھوٹ و بہتان، لیکن عقلاً قبیح نہ ہو، یا کوئی چیز عقلاً بری اور قبیح ہو، اور شرعاً اچھی اور مستحسن ہو، مگر اعتبار عقلِ سلیم اور قلبِ سلیم کا ہوگا۔ عقولِ فاسدہ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ عقولِ فاسدہ خیر و شر، اسی طرح حسن و قبیح کی پہچان و معرفت سے سراسر محروم ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جن کے قلوب مردہ اور عقول فاسد ہیں، وہ غیر شرعی غیر عقلی امور کو بہتر سمجھتے ہیں، اور جرائم پر فخر کرتے ہیں، اور ان کے ترک کو حیاء سے تعبیر کرتے ہیں، جو سراسر حماقت اور نادانی ہے، اور ان کا یہ عمل عجز و کمزوری اور سراسر بزدلی ہے۔ مثلاً آج کی مادر پدر آزاد عورت برقع پہننے سے شرم محسوس کرتی ہے، یا آج کا مغرب زدہ نوجوان نماز پڑھنے اور داڑھی رکھنے سے شرم محسوس کرتا ہے، اسی طرح بدعتی لوگ تیجا، رسم قل، ساتویں، گیارہویں، چہلم وغیرہ

کو خلافِ شریعت اور خلافِ سنت جانتے ہوئے بھی مجبوراً ترک نہیں کرتے ہیں۔اس کو بدنامی اور احباب کے طعن وتشنیع سے بچنے کی خاطر انجام دیتے ہیں، اور ترک سے شرم محسوس کرتے ہیں۔

یہ سب عقیدہ وایمان کی کمزوری ہے، بزدلی ہے، اس کو حیاء وشرم کہنا حیاء کی توہین ہے۔یہ عجیب حیاء ہے کہ خدا سے بے خوفی ہو، اور لوگوں سے خوف ہو۔لا حول ولا قوۃ إلا باللہ العلي العظیم۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی ☆ مجھے بتاؤ سہی اور کافری کیا ہے

منافق کئی قسم کے ہوتے تھے۔منافقوں کا ایک طبقہ وہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں لوگوں کی رضامندی کے طالب رہتے تھے۔حقیقی مؤمن اللہ تعالیٰ کی رضا کا طلبگار رہتا ہے، خواہ سارے جہاں کی ناراضگی کا خطرہ کیوں نہ ہو، جیسے کسی صاحب دل نے کہا ہے۔

سارا جہاں ناراض ہو پروانہ چاہیئے ☆ مدنظر تو مرضی جاناں چاہیے

بس اس نظر سے دیکھ کر تو کر یہ فیصلہ ☆ کہ کیا کیا تو کرنا چاہیئے کیا کیا نہ چاہیے

اگر اک تو نہیں میرا تو کوئی شئ نہیں میری ☆ جو تو میرا تو سب میرا زمین میری فلک میرا

نتیجہ یہ نکلا کہ حیاء نام ہے ترکِ قبیح کا، نہ کہ ترکِ سنت، اور ترکِ امورِ شرعیہ کا۔اسی طرح امورِ شرعیہ کا التزام حیاء ہے، اور ان کا ترک بے حیائی اور بزدلی ہے۔عورت کی بے پردگی بے حیائی کا حصہ ہے، اور پردہ عین حیاء ہے، نوجوانوں کا داڑھی رکھنا حیاء ہے، اور نہ رکھنا بے حیائی اور بزدلی میں شمار ہے، کیونکہ امرِ شرعی کا ترک ہے، علیٰ ہذا القیاس، اور یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ امورِ شرعیہ میں کوئی قبیح نہیں، سب مستحسن ہیں۔البتہ! امورِ عرفیہ میں مستحسن وصحیح بھی ہیں، اور مذموم وقبیح بھی، کیونکہ معاشرہ شرعی بھی ہوسکتا ہے، اور غیر شرعی بھی، جیسے ہمارا موجودہ معاشرہ ہے، جو کہ غیر شرعی ہے، اس کی بناء شرعی امور پر نہیں، یورپی انگریزوں کے اصولِ معاشرہ پر مبنی ہے۔نعوذ باللہ منہ.

اللہ تعالیٰ جل شانہ سے حیاء کرنے کا مطلب:

صحیحین کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حیاء کرتا ہے، اور حیاء کو پسند بھی کرتا ہے، اسی طرح بے حیائی اور ہر قسم کے معاصی کو بری نگاہ سے دیکھتا، اور ناپسند کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان معاصی پر سخت سزا تجویز فرمائی ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ غیور بھی ہے، اس وجہ سے وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے اور بندیاں بے حیائی والا کام کریں۔اسی خاطر اس نے فواحش ومنکرات پر پابندی عائد کی ہے۔اللہ تعالیٰ حق اور صاف بات بتانے سے کبھی نہیں شرماتا۔یہ اس

کی ہمہ گیر رحمت وشفقت، اور بے پناہ حکمتوں کا تقاضا ہے کہ ہر برائی سے اپنے بندوں کو مطلع فرمائے، اور معاصی کے برے اور تباہ کن انجام سے انہیں خبردار کردے۔

جاننا چاہئے کہ حیاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مجازًا ہے، اور یہ متشابہات میں سے ہے، اس پر کلام ہو چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ سفید ریش بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ حیاء کرتے ہیں، اور اسے معاف فرماتے ہیں۔ [مشکوۃ وغیرہ]

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! تمہارا پروردگار بہت حیاء کرنے والا ہے، جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے، تو اس کو شرم آتی ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔ [ترمذي، أبو داؤد]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِسۡتَحۡیُوۡا مِنَ اللهِ حَقَّ الۡحَیَاءِ قَالُوۡا یَارَسُوۡلَ اللهِ اِنَّا نَسۡتَحۡیٖ مِنَ اللهِ تَعَالٰی قَالَ لَیۡسَ ذٰلِکُمۡ وَلٰکِنۡ مَنِ اسۡتَحۡیٰ مِنَ اللهِ حَقَّ الۡحَیَاءِ فَلۡیَحۡفَظِ الرَّاۡسَ وَمَا وَعٰی وَلۡیَحۡفَظِ الۡبَطۡنَ وَمَاحَوٰی وَلۡیَذۡکُرِ الۡمَوۡتَ وَالۡبِلٰی وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ تَرَکَ زِیۡنَةَ الدُّنۡیَا فَمَنۡ فَعَلَ ذٰلِکَ فَقَدِ اسۡتَحۡیٰ مِنَ اللهِ حَقَّ الۡحَیَاءِ''. اھ[رواه الترمذي]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرکے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے حیاء کرو، جیسے شرمانے کا حق ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم تو اللہ تعالیٰ سے شرماتے ہیں۔ فرمایا: ایسے نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے حیاء کے حق کے ساتھ شرمانے کا مطلب یہ ہے کہ دماغ کو برے خیالات سے، اور پیٹ کو بری چیزوں (حرام) سے محفوظ رکھا جائے، اور مرنے گلنے کو یاد کیا جائے۔ آخرت کی زندگی جس کے پیش نظر ہوگی، وہ دنیا کی زینت کو ترک کرے گا، اور جو شخص یہ کام کرلے، تو سمجھو کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے شرمانے کا حق ادا کیا۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہوا کہ دماغ وفکر خالص ہو، اس میں غیر شرعی خیالات کا گزر نہ ہو، پیٹ میں حرام بھرنے سے اجتناب ہو، بار بار ہاذم اللذّات (موت) کو یاد کرنے کا مشغلہ ہو، جو ہر گناہ سے بچنے کا سبب ہے، اور دنیوی لذتوں سے مکمل دوری اور صحیح معنوں میں إقبال علی الآخرۃ کا عمل جاری ہو، حقیقی حیاء انہیں چیزوں پر موقوف ہے، اور یہی حیاء تمام گناہوں سے بچنے کا اصلی بنیادی سبب بھی ہے۔ ماقبل میں بیان ہوا کہ حیاءِ عقلی وحیاءِ شرعی دونوں متحد ہیں، اس سلسلے میں اصحابِ باطن حضرات نے اس کی دس اقسام بیان کی ہیں:

(۱) حیاءِ جنایۃ (۲) حیاءِ تقصیر (۳) حیاءِ اجلال (۴) حیاءِ کرم (۵) حیاءِ حشمت (۶) حیاءِ احتقار، وصغرِ نفس

(۷) حیاءِ محبت (۸) حیاءِ عبودی (۹) حیاءِ شرف وعزّت (۱۰) حیاءِ بنفسہ۔ [انوار القرآن]

☆ حیاءِ جنایۃ:

جیسے حضرت آدم علیہ السلام جنت میں قصور کر کے بھاگنے لگے، تو حق تعالیٰ نے پوچھا: اَفِرَارًا مِنِّی یَا آدَمُ؟ عرض کیا: لَا یَا رَبِّ بَلْ حَیَاءً مِنْکَ۔ آپ سے شرما کر بھاگ رہا ہوں۔

☆ حیاءِ تقصیر:

جیسے فرشتے اور انبیاء علیہم السلام باوجود ہمہ وقت عبادت واطاعت کے قیامت کے روز اپنی تقصیر کا اعتراف کر کے کہیں گے: سُبْحَانَکَ مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ وَمَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ۔

☆ حیاءِ اجلال:

یعنی اللہ تعالیٰ کے جلال سے بندہ شرمائے، جتنی اللہ تعالیٰ کے جلال کی معرفت ہوگی، حیاء بھی اتنی ہی ہوگی۔

☆ حیاءِ کرم:

جیسے حضرت زینب ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا ولیمہ کھانے کے بعد بھی کچھ لوگ بیٹھے رہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے اٹھ جانے کا انتظار کرتے رہے، مگر مکارمِ اخلاق (کرم) کی وجہ سے شرمائے، ﴿اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ [الأحزاب:۵۳]

☆ حیاءِ حشمت:

جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ داماد ہونے کی وجہ سے مذی کا حکم پوچھنے سے شرمائے۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم پوچھ کے مجھے اطلاع کردو۔ [بخاري]

☆ حیاءِ احتقارِ نفس:

اپنے نفس کی تحقیر کے پیش نظر اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے پر شرم وحیاء محسوس کرنا، کبھی کسی عام بڑی ہستی سے بھی مانگنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔

☆ حیاءِ محبت:

عاشق کا اپنے محبوب سے شرمانا، جس کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔

☆ **حیاءِ عبودیت:**

اللہ ربّ العزّت کی عظمت وکبریائی کے ساتھ بندہ اپنی نااہلی کا موازنہ کرتے ہوئے محبت وخوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ عبادات بجالاتا رہے۔

☆ **حیاءِ شرف وعزّت:**

بڑے مرتبہ والے ہستی کا کسی کو کچھ دیتے وقت شرم محسوس کرنا، یعنی اس عطیہ کو حقیر اور اپنی شان کے خلاف سمجھنا، یا جس کو دے رہا ہے اس سے شرم محسوس کرنا۔

☆ **حیاءِ بنفسہ:**

اپنی حیثیت اور مرتبہ سے کم درجہ کوئی کام کرے، انسان خود اپنے نفس سے شرمائے کہ یہ کام میرے لائق نہیں ہے، تو وہ دوسروں سے بدرجۂ اولیٰ شرمائے گا۔

آیت کریمہ کا مطلب اور اس کی وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ کی وضاحت اور سمجھانے کی خاطر کوئی حقیر سے حقیر تر، اور کسی انتہائی ذلیل چیز کی مثال پیش کی جائے۔ تو اس میں کوئی عیب اور گناہ نہیں ہے، اور نہ معمولی اور حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کرنے سے مثال دینے والے کی شان وعظمت میں کوئی کمی واقع ہوسکتی ہے، کیونکہ مثال سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ غیر محسوس چیز کو محسوس بنایا جائے، اور کسی مشکل مسئلہ کو آسان بنایا جائے، خواہ مثال جس نوعیت کی ہو، اس میں کلام نہیں ہوتا۔

عرب حضرات مثال کو چراغ اور مصابیح سے تشبیہ دیتے ہیں، اس لیے کہ جس طرح چراغ سے روشنی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح مثال سے مسئلہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ صاحب حاجت کے لئے روشنی اہم ہوتی ہے، نہ کہ چراغ۔ پس چراغ سونے کا ہو یا مٹی کا، اس میں کلام نہیں ہوتا، وہ روشنی کا آلہ ہے۔ آلہ مقصود نہیں ہوتا، کوئی الحمد شریف کو سونے کے قلم سے لکھے، یا لکڑی کے قلم سے فرق نہیں ہے، مقصود کلام اللہ ہے۔

کسی دینی حقیقت کی توضیح کے لیے مثال کی غایت یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو ذہن کے سامنے زیادہ کھول کر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ لے آئے، اب یہ مقصد جس مثال سے پورا ہوسکے اس کو بہترین کہا جائے گا، خواہ وہ چیز بجائے خود حقیر ہی ہو، جیسے مچھر، بظاہر ایک حقیر مخلوق ہے، اور جہاں کسی مخلوق کی حقارت بیان کرنا مقصود ہو، وہاں موزوں مثال ظاہر ہے کہ مچھر ہی کی ہوگی۔

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ﴾ [آل عمران: ۱۹۰] (بے بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کی باہم بدلیوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے)۔ یہ وسیع وعریض کائنات جس کے طول وعرض اور عجیب وغریب، نادر وبیش قیمت مخلوقات تک کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے، یہاں اگر ہزاروں کیڑے مکوڑے، اور ہر طرح کے خسیس وحقیر مخلوقات کی کثرت ہے، وہاں دیوہیکل اور عظیم وجسیم مخلوقات (بری وبحری) کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ حکیمِ مطلق اپنی حکمت کے تحت اگر کسی بڑی مخلوق کی تمثیل بیان فرماتے ہیں، تو مقصد بڑے بڑے عقلمند ودانشوروں کی بیداری، اور انہیں سمجھانا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ علم وہنر اور انسانی عقل سے بے بہرہ لوگوں کو اُن جیسے حقیر وذلیل اشیاء کی مثال دے کر سمجھایا جائے۔

قرآن کریم میں بڑے بڑے حیوانات تک کا تذکرہ ہے، ہاتھی اونٹ، خچر، گدھے، کتے، شیر، مچھلی وغیرہ۔ اسی طرح مچھر، مکھی، مکڑی، چیونٹی وغیرہ۔ کبھی کسی کافر نے ان بڑے جانوروں کا نام سنکر اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان نہیں کی، اور قرآن حکیم کی صداقت کا اقرار نہیں کیا، مگر مچھر اور مکھی کا نام سنتے ہی مخمصے اور پریشانی میں ڈوب گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حقیر چیزوں کے بیان میں ان کے حقیر وذلیل معبودوں کی تذلیل مضمر ہے، اس لئے وہ تڑپ کر سراسیمگی میں کہتے رہے کہ یہ مثال باری تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے، اگرچہ یہ نفس الامر (واقع) کے عین مطابق ہے، کیونکہ ہر حیثیت کے انسان کے لئے اسی حیثیت کی مثال مناسب ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ یہ گھٹیا چیزیں ہوں، یا ان سے بھی گئی گزری چیزیں، ان کی مثال دینے میں کوئی عیب نہیں ہے، کیونکہ مثالوں سے تمہارے معبودانِ باطلہ کی کمزوری اور حقارت کو واضح کرنا مقصود ہے، جو ان گھٹیا چیزوں سے بھی گھٹیا اور کمزور ترین ہیں فرمایا: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ﴾ [الحج: ۷۳] عابد ومعبود، دونوں انتہائی درجہ کے کمزور ولاچار ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿کَمَثَلِ الۡعَنۡکَبُوۡتِ اتَّخَذَتۡ بَیۡتًا وَاِنَّ اَوۡہَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ﴾ [العنکبوت: ۴۱] (اُن کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک (طرح کا) گھر بناتی ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ تمام گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے)۔

لہٰذا یہ مثالیں بالکل مناسب اور عین حقیقت ہیں۔ کلامِ عرب کی فصاحت وبلاغت کے عین مطابق ہیں، اور مقتضاءِ حال کے ساتھ برابر ہیں، کسی جوہری اور سنار کے ساتھ سونے، اور جواہرات کا تذکرہ مناسب رہتا ہے، اور بیچارے لوہارے کے ساتھ خبث الحدید کا مذاکرہ ہونا چاہئے، نہ کہ جواہرات کا۔

اسی بنیاد پر بےعمل احبارِ یہود کی تشبیہ گدھے کے ساتھ، اور جو شخص امام کے پیچھے نماز میں امام سے پہلے رکوع وسجدہ کرے، اس کو گدھے سے تشبیہ دی گئی، اور رشوت خور شخص کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ ﴿كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾ [الأعراف:۱۷۶] (تو اس کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے، اور یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے)۔ اور قرآن پڑھنے والے مؤمن کو ترنج جیسے میٹھے اور خوشبودار پھل کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ [مشکوٰۃ]

﴿مثلًا مَّابَعُوْضَةً فَمَافَوْقَهَا﴾ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صناعِ عالم اور خلّاق علیم کی بنائی ہوئی کوئی شئی بھی درحقیقت حقیر اور بے حقیقت نہیں ہے، بلکہ جو چیز بظاہر جتنی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہوگی اسی قدر اس کا بیان کمال علم، کمال اطلاع اور کمالِ حکمت پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ ﴿مَثَلًا مَّا﴾ مثلًا کا لفظ خود نکرہ تھا، "ما" کے اضافہ نے اس کے وصفِ تنکیر کو اور بڑھا دیا۔ ﴿فَمَافَوْقَهَا﴾ یعنی مچھر سے بھی بڑھ کر ہو، اپنے جثہ کے صغر یا ظاہری بے حقیقتی حقارت کے اعتبار سے۔ مثالوں میں فکر وتدبر کرنے والوں کے لئے ہدایت کا عمدہ سامان ہوتا ہے، اور حمقاء وجہلاء کے لئے یہ مثالیں اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔

مثالوں میں عموماً اس چیز کے ساتھ مناسبت کا لحاظ ہوتا ہے، جس کے لئے مثال دی جاتی ہے، نہ کہ مثال دینے والے کی۔ جب کسی چیز کی حقارت وکمزوری بیان کرنا ہوتا ہے، تو عرش وکرسی، چاند وسورج یا آسمان وزمین اور شیر یا ہاتھی کو مثال میں پیش نہیں کیا جاتا، بلکہ مچھر، مکھی اور چیونٹی ہی کو پیش کرنا فصاحت وبلاغت ہوگا۔ جب قرآن حکیم بتوں کی درماندگی اور حقارت بیان کر رہا ہوتا ہے، تو مثال میں انہی کی مناسبت کو مدِ نظر رکھ کر خسیس وذلیل اشیاء کی مثال پیش کر کے اپنی عمدہ فصاحت وبلاغت پر تنبیہ کرے گا، اور یہی اس کا کمال ہوگا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ نے ایک ضعیف وناتواں مچھر کی مثال دی، کیونکہ اس کی بناوٹ بالکل ہاتھی کی شکل کی طرح ہے۔ مچھر کی بھی سونڈھ ہوتی ہے۔ حضرت شیخ شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہاتھی کی کھال بہت سخت اور موٹی ہے۔ مچھر جب اپنی سونڈھ ہاتھی کے جسم پر مارتا ہے، تو وہ اس طرح داخل ہوتی ہے جس طرح کسی کی انگلی حلوے میں داخل ہو۔ کیا قدرت ہے ربّ العلمین کی؟ اور مچھر جیسی ضعیف مخلوقات میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں؟ بعض صفات میں بڑی بڑی مخلوقات کا ہم پلہ جانور ہے۔

دیکھیں! اس کی سونڈھ اور اس کی بے پناہ تیزی، اس کے بال وپر، خون وہڈیاں، کلیجہ، پھیپڑہ، دل، شرائیں،

رگیں اور رگوں میں خون کی گردش، چھ ٹانگیں، چار آنکھیں اور ہڈیوں میں مغز، چابکدستی، سریلی آواز اور نظر کی تیزی، رات کی تاریکی میں اسے سب کچھ نظر آتا ہے، دن کی روشنی میں آرام کرتا ہے۔ شعوری طور پر زیرک و چالاک ہوشیار رہتا ہے۔ اس کی سونڈھ میں زہر کا مادہ ہے، پرواز کا تیز بھی ہے، اور با قاعدہ اس کے معدہ اور رودے ہیں، فضلات پھینکتا ہے۔ سر اور دماغ و دیگر اعضاء سب اس میں تخلیق شدہ ہیں۔ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ؎

یامن یریٰ مدّالبعوض جناحها ★ في ظلمة الليل اليهيم الاليل

ویریٰ نیاط عروقهافي نحرها ★ والمخ في تلک العظام النخل

أُمنن علي بتوبة تمحوبها ★ ماکان مني في الزمان الاول

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے وصیت کی تھی کہ میری موت کے بعد میری قبر پر یہ ابیات لکھے جائیں۔ [ابن خلکان] اس لئے مذکورہ اشعار ان کی قبر پر لکھے گئے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ سبحانہ نے مچھر کی مثال دے کر ایک اعتبار سے مشرکین کے معبودانِ باطلہ کی حقارت و ذلت پر انہیں تنبیہ فرمائی، تو دوسری طرف سے انہیں خبردار کیا کہ تم اپنے ایک بڑے بت پرست اور طاقتور پیشوا ''نمرود بن کنعان'' کے انجام سے سبق سیکھو! جس عالی مقام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تمہارا مقابلہ ومبارزہ چل رہا ہے، ان کے دادا ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تمہارے دادا نمرود بن کنعان کا بھی اسی طرح کا مقابلہ ہوا تھا، پھر کیا ہوا کہ روئے زمین پر حکمرانی کرنے والا نمرود، اور اس کے لشکر پر ربّ العزّت نے انہی کمزور اور ضعیف مچھروں کا دستہ بھیجا، جنہوں نے نمرود جیسے حکمران کو صفحہ ہستی سے مٹا کر نیست و نابود کیا۔ کیا بعید ہے کہ تمہاری تباہی بھی انہیں مچھروں کے ذریعہ ہو، یا مچھروں جیسی ضعیف وناتواں کسی اور مخلوق کے ذریعے ہو، بیشک تمہارا پروردگار ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

﴿ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ ''اَلْحَقُّ''، حق کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں، اور اس کا استعمال چار طرح پر ہوتا ہے:

(۱) اس ذات کے لیے جو اپنی حکمت کے اقتضاء کی بناء پر کسی شے کا ایجاد فرمائے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ کو اسی لئے حق کہا جاتا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ﴾ [الانعام: ۶۲] پھر (قیامت کے دن تمام) لوگ اپنے مالک برحق خدا تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔) قولہ تعالیٰ: ﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ

الْحَقُّ ﴾ [یونس: ۳۲] (سو یہی ہے اللہ تعالیٰ تمہارا پروردگار حق)۔

(۲) ''وہ چیز جو حکمت کے مقتضیٰ کے مطابق ایجاد کی گئی ہو'' اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کُل افعال حق ہیں، ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ [یونس: ۵] (وہی ہے جس نے بنایا سورج کو روشن اور چاند کو اجالا، اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو، یہ سب اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا، مگر حق کے ساتھ) یعنی سورج کی چمک اور چاند کی دمک اور اس کی منزلوں کا تقرر، تاکہ برسوں کا حساب اور شمار معلوم ہو سکے، یہ سب حکمتِ الٰہی کے مقتضیٰ کے مطابق بنایا گیا ہے، اس لئے سب حق ہے۔

(۳) ''کسی شے کے مطابق وہ اعتقاد رکھنا جو نفس الامر کے مطابق ہو'' چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کا اعتقاد حق ہے، ارشاد ہے: ﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ﴾ [بقرة: ۲۱۳] (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے سے ایمان والوں کو اس حق بات کی ہدایت فرمائی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے) یا ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ [بقرة: ۲۶] (پس جو لوگ ایمان لائے وہ یقین کرتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے)۔

(۴) ''وہ قول یا فعل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح کہ اس کا ہونا ضروری ہے'' اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو کہ جس مقدار اور جس وقت میں اس کا ہونا واجب ہے، چنانچہ قولِ حق اور فعلِ حق اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ﴾ [سجدة: ۱۳] (لیکن بات میری طرف سے ثابت ہو گئی کہ مجھ کو دوزخ بھرنی ہے)۔ اسی طرح حق کا استعمال واجب کے لئے، نیز لازم و ذمہ کے لئے بھی ہے، وغیر ذلک من المعاني الكثيرة۔ [لغات القرآن]

﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [الآیۃ] (سو ایماندار لوگ یقین کرتے ہیں) اور بخوبی جانتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں بے معنی نہیں ہیں، بلکہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ ان کا بیان عینِ حکمت ہے، کیونکہ مثال میں یہ ضروری ہے کہ وہ ممثل لہ کے مناسب و برابر ہو، نہ کہ مثال بیان کرنے والے کے، اور یہ عقلمند فصحاء بلغاء کے کلام کے عین مطابق ہے۔ یہاں ''يَعْلَمُوْنَ'' سے مراد علمِ یقینی ہے۔ ''فَاَمَّا الَّذِيْنَ'' تا ''هُمُ الْخٰسِرُوْنَ'' محض اخبار نہیں ہے، بلکہ یہاں سے مومنین کی مدح، اور کفار کی مذمت و تنقیص کا بیان مقصود ہے، کیونکہ مومن کی شان یہ ہے کہ

وہ اپنے ایمان واطاعت کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو مانتا، اور اس پر بغیر دلیل وحجت کے عمل پیرا رہتا ہے۔

وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے حکموں کو عقل وادراک کے ترازو میں تولنے کی ہمت نہیں کرتا۔ ہزاروں شرعی احکام پر بے چون وچرا مسلمان بڑے شوق سے عمل پیرا ہیں۔ مگر آج تک انہوں نے علماء کرام سے ان کی حکمت اور دلیل طلب نہیں کی۔ قرنِ اوّل میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بغیر حیلہ وحجت سرورِ عالم ﷺ کے ہر حکم واشارہ پر شوق ومحبت اور جان نثاری کے ساتھ عمل پیرا رہے۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے ہر اشارے پر سروں کو ہتھیلی پر رکھ کر قربانیاں پیش کیں، اور کسی بھی حکمِ شرعی کی دلیل اور وجوہات معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اور نہ ہی وہ کسی معجزہ کے انتظار میں رہے۔ یہی تو وہ بنیاد ہے کہ انہیں معیارِ حق کا مقام ومرتبہ حاصل ہوا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک ادنیٰ صحابی کا ایمان قیامت تک آنے والے سارے مسلمانوں کے ایمانوں پر بھاری ہے۔ اگر ایک صحابی کے ایمان کو ساری امت کے مسلمانوں پر تقسیم کیا جائے تو سب کی سعادت ونجات کے لئے کافی ہوگا۔

مسلمان قوم کا ہر زمانے میں یہی فیصلہ رہا ہے، اور رہے گا کہ اقرار توحید ورسالت کے بعد وہ اپنے رب عزّ مجدہٗ کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کر کے بے چون وچرا عمل پیرا رہے گی۔ بخلاف کفار ومنافقین اور یہود ونصاریٰ اور دیگر نافرمان قوموں کے، وہ اللہ ربّ العزّت اور سید عالم ﷺ کے ہر حکم پر یا تو اعتراض کرتے ہیں، یا کھلم کھلا مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ انہوں نے شق القمر جیسے عالمی آفاقی معجزہ کو مشاہدہ کر کے بھی تسلیم نہیں کیا، تو آیتِ کریمہ میں ان کے متعلق "فَيَقُولُونَ" کہہ کر یہی واضح کیا گیا کہ ان کی قسمت میں انکار وہٹ دھرمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [الآیۃ] قرآنِ حکیم نے متعدد مقامات میں کفر کو مرض بتا کر واضح فرمایا ہے کہ کفر تمام بیماریوں کی جڑ ہے، جس طرح کہ دنیا کی محبت تمام معاصی کی جڑ ہے۔ کفار کے دلوں میں پہلے سے معاصی وگمراہی کے جراثیم موجود تھے، موجودہ مثال سے ان کا مرض اور بڑھ گیا، ایک تو اس وجہ سے کہ ان کے کفر وانکار میں اضافہ ہوا۔

دوسرا یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مثال وتمثیل کا مذاق اڑایا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ کسی بھی حکمِ شرعی کا استخفاف ومذاق کفر ہے، اس کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں، یہاں ان کی حماقت وگمراہی، اور کبر وغرور ہی اصلی سبب ہیں۔ قرآن حکیم نسخۂ ہدایت وشفاء ہے، مؤمنوں کی طبیعت میں ہر قسم کی ہدایت کے اسباب موجود تھے۔ قرآن کریم نے ان کی ہدایت بڑھادی، جبکہ کفار لاعلاج مریض تھے، یہ نسخۂ شفاء ان کو راس نہیں آیا، کیونکہ فاسق علاج ومعالجہ سے اس لئے

محروم رہتا ہے کہ اس کو علاجِ روحانی کی طلب نہیں، اور استعداد بھی نہیں۔

فلسفہ کے شیخ ابوعلی ابن سینا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورج کی روشنی سے کپڑوں میں چمک اور سفیدی پیدا ہوتی ہے، جبکہ دھوبی کے بدن پر الٹا اثر ہوتا ہے، وہ استعداد نہ ہونے کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے۔

قرآن کے انوار نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں چمک اور صنادیدِ قریش کے قلوب پر سیاہ دھبے پیدا کئے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [بنی اسرائیل: ۸۲] (اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے، اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ [التوبة] (سو جو ایمان والے ہیں ان کا تو ایمان زیادہ کیا، اور وہ خوش ہوتے ہیں، اور جن کے دلوں میں مرض ہے، ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا، اور وہ مرے بھی تو کافر کے کافر)۔

فسق کسے کہتے ہیں؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟

اَلْفِسْقُ وَهُوَ الْخُرُوْجُ عَنْ حَدِّ الْاِعْتِدَالِ۔ (حدِ اعتدال سے خارج ہونے کا نام فسق ہے) شرعی اصطلاح میں فاسق اس کو کہتے ہیں جو احکامِ الٰہیہ کی قیود سے نکل جائے۔ اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صغائر پر اصرار کرے، بغیر توبہ کے، اور متوسط درجہ یہ ہے کہ کبائر کا ارتکاب کرے، اگر لاپرواہی اور کھلم کھلا مرتکب کبائر ہو، تو فسق کے ساتھ فاجر بھی کہلائے گا، اور آخری درجہ فسق کا کفر ہی ہے۔ ''فَكُلُّ كَافِرٍ فَاسِقٌ وَلَا عَكْسَ''۔ یہ جمہور اہلسنت والجماعت کا مذہب ہے۔

خوارج مرتکبِ کبائر کو کافر، اور مخلّد في النار مانتے ہیں۔ جبکہ معتزلہ اُسے کافر نہیں کہتے۔ البتہ! ابدی دوزخی مانتے ہیں، اور ایمان سے خارج قرار نہیں دیتے ہیں۔ اہلسنت کہتے ہیں: فاسق گناہ گار ضرور ہے، مگر مخلّد في النار نہیں ہے، اور اسلام سے خارج بھی نہیں ہے۔ گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخل ہوگا۔

آیت کریمہ میں فاسقوں کی تین خصلتوں کا ذکر ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ عہد کرنے کے بعد عہد شکنی، اور خروج عن الحق۔

(۲) ان شرعی تعلقات کوتوڑنا جن کے ملانے اور جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۳) زمین میں فساد پھیلانا، اور مفسدانہ روش اختیار کرنا۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

ترجمہ: جولوگ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ تعالیٰ سے (ازل میں) کر چکے تھے مضبوط باندھ لیے کے بعد۔ اور کاٹتے رہتے ہیں ان تعلقات کو جنہیں اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور فساد کرتے رہتے ہیں ملک میں، حقیقت میں بھی یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ۝۲۷

معارف ومنازل

"عهد" سے ہوسکتا ہے کہ وہی "عهد" ازلی ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾۔ [الاعراف: ۱۷۲] والا عہد مراد ہو۔ یا وہ عہد جو انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتبِ سماویہ کے اتارنے سے ہوتا ہے، کہ بندوں کی طرف سے بطورِ عبودیت یہ اقرار ہوتا ہے کہ ہم ان چیزوں کو مانیں گے۔ ملانے والے تعلقات سے مراد وہ تمام تعلقات ہوسکتے ہیں جو شرعی طور پر مقرر کئے گئے ہیں، خواہ وہ بندے اور پروردگار کا تعلق ہو، یا نسلی اور رشتہ داری (قرابت) کے تعلقات ہوں، یا انبیاء علیہم السلام علماء اور صلحاء کے تعلقات ہوں، یا بنی نوعِ انسان کے ساتھ تعلقات ہوں، یا ہر طرح کی ہمدردی اور رواداری کے تعلقات ہوں۔

غرض! ہر قسم کے تمام وہ تعلقات مراد لئے جاسکتے ہیں جن کو شریعت نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے، اسی طرح شرارت اور فساد بھی عام ہے، خواہ قتل وغارت گری اور ظلم ہو، یا لوگوں کو اسلام اور ایمان یا اعمال سے روکنا ہو، یا اسلام کے خلاف سازش ہو، یا بدامنی پھیلانا ہو، یا معاصی کو ترویج دینا ہو۔ غرض یہ کہ پاکیزہ اور اسلامی معاشرہ کے خلاف ہر برے کردار کا نام فساد ہی ہوگا۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ [الروم: ۴۱] (خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے)۔

جب نماز میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو تو کہتے ہیں: "فسدت الصلوة" نماز فاسد ہوگئی۔ اگر کوئی عمدہ طعام۔ یا صاف ستھرا پانی خراب ہو تو کہتے ہیں: "فسدالطعام وفسدالماء"۔ یہ فساد ہر چیز میں ہوسکتا ہے، اور یہ فساد

عموماً کسی خارجی چیز یا سبب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ فساد صلاح کی ضد ہے، اس کی تفصیل پہلے گزر چکی۔

اللہ تعالیٰ رحم فرمائے! معاشرہ کی اصلاح جو شرعی اسلامی اقدار و اعمال پر مبنی تھی، وہ رفتہ رفتہ معاصی کی کثرت و بہتات کی وجہ سے نایاب ہو کر ختم ہوگئی، غیروں یعنی یہود و نصاریٰ کی تقلید و نقل سے آج ہمارا پورا معاشرہ محض فاسد نہیں، بلکہ سراسر باطل اور غیر اسلامی ہے۔ ستم یہ کہ اسلامی معاشرہ کے فقدان پر کسی کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے، اور غیر شرعی معاشرہ پر کوئی دکھ و افسوس بھی نہیں ہے۔ سب لوگ اس پر راضی اور خوش ہیں، اِلّا ماشاء اللہ۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ☆ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

نقضِ میثاق و شکستِ توبہ ہا ☆ موجبِ لعنت شود در انتہاء (رومی مثنوی)

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ
يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ
ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

ع

ترجمہ: کیونکر انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کا، حالانکہ تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے ﴿٢٨﴾ وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے، سب کا سب۔ پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف، تو ٹھیک ٹھیک بنا دیا انہیں سات آسمان، اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے ﴿٢٩﴾

ربط و مناسبت:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ سے لے کر ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ تک کا تعلق ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ کے ساتھ ہے، یعنی اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو، جو تمہارے لئے لازمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود کی نعمت عطا کی، پھر موت کا طاری کرنا، اور دوبارہ تمہیں زندہ کرنا، اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، پھر اسی ذاتِ پاک نے تمہاری بقاء اور خوشحالی کا سامان تمہیں مہیا کیا، یعنی زمین کی تمام نعمتیں تمہیں مہیا کیں۔

صرف یہی نہیں، بلکہ بے شمار مادی و روحانی نعمتوں سے بھی تمہیں نوازا۔ ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [النحل: ۵۳] (اور جو نعمتیں تم کو میسر ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں)۔ اور ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [ابراھیم: ۳۴] (اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو)۔ ﴿وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ

ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ﴾ [لقمان: ۲۰] (اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی ہیں)۔ اسی طرح ﴿ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَاسَاَلْتُمُوْهُ ﴾ [ابراھیم: ۳۴] (اور جو کچھ تم نے مانگا سب میں سے تم کو عنایت کیا)۔ پس تم صرف اس کی عبادت کرو، کیونکہ خاص وہی ان تمام نعمتوں کا خالق و مالک اور عطا کنندہ ہے، تمہارا پیدا کنندہ بھی وہی ہے، اور بے شمار نعمتوں سے نواز نے والا بھی ہے۔ پس اگر تم سب مل کر اس کی نعمتوں کو شمار کرنے لگ جاؤ تم تھک جاؤ گے، اور عاجز ہو کر گنتی چھوڑ دو گے، کیونکہ تم متناہی اوقات میں غیر متناہی انعامات کا حساب نہیں کر سکو گے۔

معارف ومنازل

کلمہ ''کیف'' قرآن حکیم میں تراسی مرتبہ مختلف معانی میں مستعمل اور مذکور ہے۔ اس مقام پر تعجب یا زجر و توبیخ کے لئے موزون ہے، گویا کفار سے ازراہِ حیرت و تعجب پوچھا جا رہا ہے کہ اتنی آفاقی اور انفسی، ظاہری اور باطنی دلیلوں اور نعمتوں کے باجود وہ کفر کی جرأت کیسے کر رہے ہیں؟ اور اتنی نعمتوں، بخششوں کے باوجود کفر و ناشکری اختیار کرنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ (واضح ہو کہ کفر کی چاروں اقسام کا مکمل بیان شروع میں گزر چکا، وہاں دیکھا جائے)۔

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ایمان کی مختصر تعریف یہ کرتے ہیں کہ: ''حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے پر اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں کو ماننا اور تسلیم کرنا''۔ پس کفر کی مختصر تعریف یہ ہوگی کہ: ''انہی امور میں سے کسی ایک بات کا، یا سب کا انکار کرنا''۔ کیونکہ ایمان اور کفر آپس میں اضداد ہیں، جیسے پہلے بیان ہوا۔ آیت کریمہ میں جن نعمتوں کا تذکرہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری نعمتیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سبحانہ کی پیدا کردہ ہیں، اور اسی پاک ذات نے بن مانگے ان عظیم نعمتوں سے اپنے بندوں کو نوازا ہے۔ جب وہ ان نعمتوں کے پیدا کرنے اور عطا کرنے میں اکیلا واحد لاشریک ہے، تو عبادت میں بھی وہی واحد لاشریک لہٗ ہی رہے گا۔

اس مقام پر دو چیزیں قابلِ غور ہیں:

اول یہ کہ یہاں اگر اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات کا بیان مقصود ہے، تو پھر موت کا ذکر کیوں ہوا؟ کیا موت کوئی نعمت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ موت انسان کو فانی زندگی سے نکال کر ابدی زندگی اور دائمی حیات کی طرف لے جاتی ہے تو یہ موت ہزاروں نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔ البتہ! یہ ملحوظِ نظر ہو کہ موت کا نعمت ہونا صرف مسلمانوں کے

لئے ہے، کفار و منافقین کے لئے نہیں، جیسا کہ معلوم ہے۔

دوسری قابلِ غور چیز یہ ہے کہ یہاں دو موتوں، اور دو زندگیوں کا ذکر ہے، اگر قبر کی زندگی بھی مانی جائے، تو تین زندگیاں اور تین موتیں لازم آئیں گی، اور یہ آیت کریمہ کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ سے قبر کی زندگی (برزخی زندگی) مراد ہے، کیونکہ اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ پھر تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ یہاں "ثم" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو کہ تعقیب اور تاخیر کے لئے آتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا اس زندہ ہونے کے بعد ہوگا، لیکن اس کے بعد فوراً نہیں، بلکہ دیر کے بعد، اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے، جبکہ قبر کی زندگی کو تسلیم کیا جائے۔ اگر کہا جائے کہ ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ سے مراد حشر کی زندگی ہے، تو پھر "ثم" کے استعمال کا محل معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ جب قبروں سے اہلِ قبور اٹھائے جائیں گے، تو فوراً بارگاہِ الٰہی میں پہنچیں گے، کسی کو ٹال مٹول یا تاخیر کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہ سب بحث اس وقت ہے، جبکہ یہاں زندگی اور موت کے عدد کا حصر مقصود ہو، حالانکہ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ حصر مقصود نہیں ہے، کیونکہ احادیثِ صحیحہ میں تین چار دفعہ تک موت و حیات کا تکرار ثابت ہے۔

بہر حال! اس آیت سے کسی طرح حیات قبر کا انکار ثابت نہیں ہوتا، تمام اہلسنت کا یہی مذہب ہے کہ قبر کی زندگی برحق ہے، اور متعدد احادیثِ صحیحہ (جو حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں) حیاتِ قبر کو ثابت کرتی ہیں۔ البتہ! یہ امر متحقق ہے کہ برزخی زندگی دنیوی زندگی کی طرح نہیں ہے، لہٰذا یقین کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ عالمِ برزخ ایک مستقل عالم ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے: "اَلْقَبْرُ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ فَإِنْ نَجَامِنْهُ" إلخ [أحمد، ترمذي، ابن ماجه، حاكم] اسی طرح: "اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ"۔ [ترمذي، طبراني عن أبي هريرة وأبي سعيد، مشكوة]

میت اگر نیک آدمی ہو تو "قَدِّمُونِي" کہتا رہے گا، اور اگر منافق یا کچھ اور ہو، تو "ویل ویل" کہتا رہے گا، اسی طرح منکر نکیر کو صحیح جواب متقی مؤمن جب عرض کرے گا، تو وہ اسے "نَمْ صَالِحًا" کہیں گے۔ دوسری روایت میں ہے: "نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوسِ"۔ یہ سب روایات مشکوۃ میں ہیں۔

جب برزخ میں راحت و استراحت، اسی طرح عذاب و عقاب لازمی ہیں، تو یہ حیات کے لوازمات میں سے ہیں۔ البتہ! یہ بات قابلِ غور ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات تمام انسانوں کی حیات سے بلند ہے، صدیقین، پھر شہداء،

صالحین، علماء، حفاظ، قراء، متقی، مؤمنین اور دیگر عوام الناس، یہ تمام برزخی زندگی کے مدارج و مراتب میں ہوں گے۔ اسی طرح کفار و منافقین، فساق و فجار بھی ہیں۔ جامع ترمذی میں مرفوع حدیث ہے کہ ایک صحابی نے کسی قبر کے پاس اپنا خیمہ نصب کیا، وہاں نیچے قبر سے سورۃ الملک پڑھنے کی آواز آتی رہتی تھی۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: هِيَ الْمُنْجِيَةُ هِيَ الْمَانِعَةُ۔ (سورۃ الملک عذابِ قبر کو دفع کرتی، اور نجات دلاتی ہے)۔

محققین مفسرین فرماتے ہیں کہ جس طرح نیند زندگی اور موت کے درمیان ایک واسطہ ہے، اسی طرح برزخی حیات دنیا اور آخرت کے درمیان واسطہ ہے، اور یہ برزخی زندگی بعینہٖ نیند کی طرح اور نیند کی کیفیت میں ہے، جس طرح سونے والا شخص خواب میں راحت و خوشی اور دکھ و تکلیف دونوں کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح جنتی مؤمن برزخ میں اور دوزخی فاسق برزخ میں دونوں کا، یعنی ثواب و عذاب کا مشاہدہ کرتے رہیں گے، گویا کہ برزخی زندگی دنیوی زندگی کا تکملہ ہے۔ اسی وجہ سے ورثاء و احباب کے بھیجے ہوئے تحائف (صدقات، استغفار اور دعوات وغیرہ) بدستور میت کو برزخ میں پہنچتے رہتے ہیں۔

اسی طرح برزخی زندگی آخرت کی زندگی کا مقدمہ ہے، اسی وجہ سے آخرت کے انعامات، راحت و سکون مؤمنوں کو اور عذاب و عقاب فاسقوں کو پہنچتے رہتے ہیں، چونکہ مکمل حساب و کتاب آخرت میں ہوگا، اور مستقل دخولِ جنت، اسی طرح دخولِ نار مستقل حساب پر موقوف ہونے کی وجہ سے برزخ میں نہیں ہوں گے۔ البتہ! مقدمہ کے طور پر برزخی زندگی میں خوشی و غم جزوی طور پر جاری رہیں گے، اور اسی جزوی راحت و سکون (مؤمن کے لئے) اسی طرح عذاب و سموم (فاسق کے لئے) کے متعلق بکثرت احادیث میں مروی ہیں، کہ برزخ کے اندر جنت، اور دوزخ کی جانب سے دریچے (دروازے) کھول دیئے جائیں گے۔ مؤمن کے لئے روح و ریحان، اور فاسق کے لئے حرّ و سموم کی ہواؤں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برزخ عالمِ آخرت کے دروازہ پر ہے۔ [مشکوٰۃ المصابیح]

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾۔ اس سے پہلے نعمتِ وجود کا ذکر فرمایا، اب ان بے شمار فضائل و نعمتوں کا تذکرہ فرما رہے ہیں، جن کی بدولت نعمتِ وجود و حیات کی بقاء و ترقی اور عروج ممکن ہے۔

فرمایا: تمہیں وجود و حیات دے کر یونہی مہمل بے یار و مددگار نہیں چھوڑا، بلکہ تمہاری تخلیق سے پیشتر ایک وسیع و عریض جہاں تمہاری سکونت و رہائش کی خاطر تخلیق فرمایا، اور اس میں تمہاری راحت، خوشحالی اور ترقی کی خاطر بے شمار قسم کی ہزاروں لاکھوں رنگ برنگ نعمتوں کا سلسلہ جاری رکھا، اور تمہیں اتنی قیمتی نعمتوں سے نوازا کہ اگر تم ساری

زندگی ان نعمتوں کی گنتی وشمار میں صرف کردو، تم عاجز ہوں گے، اور ہماری نعمتوں کا شمار مکمل نہ ہوگا۔

یاد رکھو! کہ یہ علویات وسفلیات، یہ جواہر واعراض، اور یہ کوہ وجبال، یہ شمس وقمر اور ستارے، یہ جمادات و نباتات، اور یہ ہر قسم کے حیوانات، غرض یہ سارا جہاں تمہارے لئے ہے، تم سر پرست اور مخدوم ہو، اور یہ پوری کائنات خادم وفرماں بردار ہے۔ مجال نہیں کہ اس منظم ومحکم جہاں کی کوئی چیز، کوئی پرزہ تمہاری خدمت بجالانے سے سرِ موانحراف کرے، یا اپنے انداز ورفتار میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کر کے تمہارے لئے باعثِ پریشانی بنے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں۔ مگر تم ہی تو ہو شترِ بے مہار، ناقدرو ناشناس اور نمک حرام، کہ جس نے اپنے مربی، خالق ومالک کو چھوڑ کر اپنے غلام، خدمت گار، نوکر (چاند، سورج، پتھر، آگ، پانی) اور دیگر مختلف مخلوقات کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوکر مخلوقات کی پوجا شروع کی، اور کافر ہو گئے۔

یہ مخدومِ جہاں (انسان) کتنا حقیر وذلیل ہوا؟ جو اپنے خدام کو سجدہ شروع کیا، کبھی وہ قرآن پاک پر تنقید کرنے سے نہیں شرمایا کہ وہ (قرآن) حقیر وذلیل مچھروں اور مکھیوں کی مثال کیوں پیش کرتا ہے؟ آج وہ خود مچھر و مکھی کی طرح ذلیل ہوکر ہر آستانے پر جھکتا اور گرتا ہے۔ اس کی مثال اس عورت سے مختلف نہیں کہ اس کے شوہر نے اس کے لئے عالیشان محل تیار کیا، اس کے چاروں طرف ہر قسم کی نعمتوں کا انبار لگایا، اور اس محل کی ملکہ کے لئے چار پانچ جوان خدمتگار نوکر مقرر کئے، پس کیا ہوا کہ اس ناعاقبت اندیش اور بیوقوف عورت نے اپنے محترم شوہر کی مرضی کے خلاف اس کے نوکروں کے ساتھ محبت وآشنائی شروع کر کے خود اپنی تباہی وبربادی کا فیصلہ کیا۔

پس جو نتیجہ سامنے آئے گا، اس کا ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ ناشکر، ناعاقبت اندیش، نافرمان، کافر، منافق اور فاسق کو اسی پر قیاس کریں کہ تمام نعمتوں، حکمتوں اور قدرتوں کے مالک کو چھوڑ کر مکھی ومچھر سے حقیر وذلیل بے جان اور مردہ پتھروں کی چوکھٹ پر سجدہ شروع کیا۔ **لاحول ولاقوۃ إلا باللہ العلي العظیم۔**

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّافِي الْاَرْضِ﴾۔ یعنی تمہارے فائدے کے لئے کائناتِ ارضی کی تمام چیزوں کو پیدا فرمایا۔ اس عبارت میں حصر مقصود نہیں ہے، بلکہ اہم اور قریبی چیزوں کا جزوی طور پر بیان مقصود ہے، کیونکہ آسمان، ستارے، شمس وقمر وغیرہ علویات، اسی طرح سمندر اور سمندروں میں بے شمار مخلوقات، نیز سمندری پہاڑ اور بہت بڑے عجیب وغریب نباتات، جمادات اور موتی وجواہرات سب کے سب انسان کے لئے ہیں، اور پوری کائنات انسانی فوائد ومنافع سے متعلق اور وابستہ ہے۔

﴿مَا فِي الْاَرْضِ﴾ کی مختصر چیزیں جو انسانی مفاد کے لئے ہیں، مثلاً پہاڑ، نباتات۔ دس ہزار کے قریب پہاڑی جڑی بوٹیاں۔ ماہرینِ نباتات نے صرف گلاب کی اقسام سولہ سو چونسٹھ دریافت کی ہیں۔ دو ہزار کے قریب سیب کی اقسام، اور ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگ مختلف ڈیزائنوں میں پھول دریافت ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں دنیا میں سب سے زیادہ پھولوں کی اقسام اسپین میں ہیں، اس کے بعد امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں دستیاب ہیں۔ واللہ اعلم

اسی طرح کوہ وجبال کا جاذبِ نظر سلسلہ، جو مختلف رنگوں میں اطراف میں پھیلا ہوا ہے، مختلف نزاکتوں اور طراوتوں کے ساتھ چلنے والی ہوائیں، سمندر اور دیگر بے شمار شیریں دریا، نہریں، چشمے، ہزاروں اقسام کے درخت اور فروٹ، پھل میوے، جنہیں کوئی شمار نہیں کرسکتا۔ حیوانات، وہ بھی ہزاروں میں چرند، پرند، وہ بھی نہایت کثرت میں، وغیرہ طرح طرح کی بری، بحری اور سمندری مخلوقات، یہ سب انسان کے لئے پیدا فرما کر اسے خلافت کا تاج پہنایا۔

نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے ☆ جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

(اقبال)

اس کائنات میں شرطیہ طور پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کے لئے نہ ہو، حتی کہ موذی جانور (کیڑے مکوڑے) بھی انسانی فائدے کے لئے ہیں۔ بعض چیزوں میں اگر جسمانی فائدہ بظاہر ہمیں نظر نہیں آتا، وہاں ضرور روحانی فوائد موجود ہوں گے، کہ ان چیزوں سے حق تعالیٰ کی قدرت ومعرفت اور شناخت کا یقیناً تعلق ہوگا، ایسی چیزوں کے دیکھنے میں توحید کا راز مضمر ہوگا، جس کے اپنانے اور تسلیم وانقیاد سے آخرت کی ابدی سعادت حاصل ہوسکتی ہے۔ الحمدللہ

البتہ! یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض چیزوں کے فوائد بدیہی اور واضح ہیں، جنہیں ہر انسان محض سرسری توجہ سے معلوم کرسکتا ہے، اور بعض چیزوں کے فوائد نظری ہیں، جو نظر وفکر اور شرعی اصول وضوابط پر موقوف ہیں، وہاں ضروری ہے کہ آدمی خودسری کی غلطی کا شکار نہ ہو، قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے زرّین اصول وقواعد سے رہنمائی و ہدایت حاصل کرے، کیونکہ ایسی چیزوں کے فوائد ونقصانات تک عقل کی رسائی نہیں ہوتی، بلکہ ایسی چیزیں عقل کے دائرۂ پرواز سے نہایت بلند ہوتی ہیں، سو ایسی چیزوں کے لئے وحی الٰہی کے دامن سے وابستہ رہنا ضروری ہوگا۔

قرآن حکیم نے پوری کائنات کے عقلمندوں کے بڑے سردار أفضل الخلق، أكمل العلم، أعقل الخلائق سردار دو جہاں ﷺ کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾

مَا كُنتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشوریٰ:۵۲] (اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے (قرآن) بھیجا ہے۔تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے،اور نہ ایمان کو۔لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں)۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ﴾ [الآیة]''استوی ''ماضی کا صیغہ ہے،مصدر ''استواء'' سے ماخوذ ہے۔''استویٰ'' بمعنی ''اس نے قصد کیا،اس نے قرار پکڑا،وہ قائم ہوا،وہ سنبھل گیا،وہ چڑھا،وہ سیدھا بیٹھا،وہ سیدھا ہوا'' وغیرہ۔

''استویٰ'' کے جب دو فاعل ہوتے ہیں،تو اس کے معنی دونوں کے مساوی اور برابر ہونے کے آتے ہیں، جیسے: ''اِسْتَوَى اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ'' یعنی (رات دن برابر ہوگئے)،یا منفی میں،جیسے:﴿لَا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ﴾ [المائدة:۱۰۰] یعنی (پاک اور ناپاک برابر نہیں ہیں)۔اور اگر فاعل نہ ہوں،تو سنبھلنے درست ہونے اور سیدھے رہنے کے معنی ہوتے ہیں،جیسے:﴿فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى﴾ [النجم:۷] (پھر سیدھا بیٹھا،اور وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا)۔اور﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى﴾ [القصص:۱۴] (جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا)۔اس صورت میں ''استواء'' کے معنی میں کسی شیٔ کا اعتدالِ ذاتی مراد ہے۔

جب اس کا تعدیہ ''علی'' کے ساتھ ہوتا ہے،تو اس کے معنی چڑھنے قرار پکڑنے اور قائم ہونے کے آتے ہیں،جیسے:﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ﴾[ھو:۴۴] (اور وہ کشتی پہاڑ پر ٹھہری) اور﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾ [الزخرف:۱۳] (تاکہ تم اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھو)۔اور جب اس کا تعدیہ ''اِلیٰ'' کے ساتھ ہوتا ہے،تو اس کے معنی قصد کرنے اور پہنچنے کے ہوتے ہیں،جیسے:﴿ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ﴾ (پھر قصد کیا آسمان کی طرف)۔

متشابہات کے آداب:

اللہ تعالیٰ شانہ کے استواء علی العرش کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن وحدیث میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات میں بھی بیان کئے گئے ہیں،اور مخلوق کے اوصاف میں بھی ان کا ذکر ہوا ہے،جیسے:''حي،سمیع،بصیر،ناظر،فاعل'' یہ الفاظ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے بھی استعمال کئے گئے ہیں، اور بندہ کے لئے بھی،مگر استعمال کی حیثیت الگ الگ ہے۔کسی مخلوق کو سمیع وبصیر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس

دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔اب یہاں دو چیزیں ہوئیں: ایک تو وہ آلہ جو سننے اور دیکھنے کا مبداء اور ذریعہ ہے، یعنی کان اور آنکھ۔ دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض وغایت۔یعنی وہ خاص علم جو آنکھ سے دیکھنے اور کان کے سننے سے حاصل ہوتا ہے۔

پس جب مخلوق کو سمیع وبصیر کہا جائے گا، تو اس کے حق میں یہ مبداء اور غایت دونوں چیزیں معتبر ہوں گی، جن کی کیفیات ہم کو واضح معلوم ہیں، لیکن یہی الفاظ اور ان جیسے دیگر کئی الفاظ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے متعلق استعمال کئے جائیں گے، تو یقیناً ان سے وہ مبادی اور کیفیاتِ جسمانیہ نہیں مراد لئے جاسکتے، جو مخلوق کے خواص میں داخل ہیں، اور جن سے جنابِ باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ قطعاً منزہ ہے۔البتہ! یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ سمع وبصر وغیرہ کا مبداء اس ذاتِ اقدس میں بدرجۂ اُتم کامل ومکمل موجود ہے، اور اس کا نتیجہ، یعنی وہ علم جو رؤیت وسماع سے حاصل ہوتا ہے اس کو بدرجۂ کمال حاصل ہے۔

رہا یہ کہ وہ مبداء کیسا ہے؟ اور دیکھنے اور سننے کی کیا کیفیت ہے؟ تو ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کا دیکھنا، اور سننا مخلوق کی طرح نہیں؟ ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ﴾ [الشوری:۱۱] (نہیں ہے اس کی طرح کا کوئی)۔غرض اسی طرح اس کی تمام صفات کو سمجھنا چاہئے کہ اس کے لئے ہر صفت باعتبار اپنے اصل مبداء وغایت کے ثابت ہے، مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی جاسکتی، اور نہ کسی آسمانی شریعت نے کبھی انسان کو اس پر مجبور کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ان حقائق میں غور وخوض کرے، جو اس کی عقل وادراک کی دسترس سے باہر ہیں، اور بیکار اپنے عقل ودماغ کو پریشان کرے۔

اسی اصول پر "استواء علی العرش" کو بھی سمجھ لیجئے کہ "عرش" کے معنی تخت اور بلند مقام کے ہیں، اور "استواء" کا ترجمہ اکثر محققین نے "تمکن واستقرار" یعنی قرار پکڑنے، اور قائم ہونے سے کیا ہے۔مطلب یہ کہ تختِ حکومت پر اس طرح قابض ہونا کہ نہ اس کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ حیطۂ اقتدار سے باہر ہو، اور نہ قبضہ وتسلط میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت اور گڑبڑ ہو۔غرض سب کام اور سارا انتظام درست ہو، اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبداء اور ظاہری صورت ہوتی ہے، اور ایک حقیقت یا غرض وغایت، یعنی ملک پر پورا تسلط اور اقتدار اور نفوذ و تصرف کی قدرت حاصل ہونا۔

سو حق تعالیٰ شانہ کے "استواء علی العرش" میں یہ حقیقت اور غرض وغایت بدرجۂ کمال موجود ہے کہ

تمام مخلوقات اور ساری کائنات پر پورا پورا تسلط واقتدار اور مالکانہ وشاہانہ تصرف ونفوذ بے روک ٹوک صرف اسی ذاتِ واحد کو حاصل ہے، جیسے کہ فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًاۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الاعراف: ۵۴] (پھر عرش پر جا ٹھہرا، وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے۔ اور اسی نے سورج اور چاند ستاروں کو پیدا کیا، سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو! سب مخلوق بھی اسی کی ہے، اور حکم بھی (اسی کا ہے)۔ یہ خدا ربّ العالمین بڑی برکت والا ہے)۔

اور آیت شریفہ: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ﴾ [یونس: ۳] (پھر قائم ہوا عرش پر تدبیر کرتا ہے کام کی۔ کوئی سفارش نہیں کرسکتا مگر اس کی اجازت کے بعد)۔ اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ﴾ [السجدۃ: ۴] (پھر قائم ہوا عرش پر، کوئی نہیں تمہارا اس کے سوا حمایتی اور نہ سفارشی، پھر تم کیوں یاد نہیں کرتے)۔

اسی طرح فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ [الحدید: ۴] (وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر قائم ہوا تخت (عرش معلیٰ) پر۔

غرض یہ کہ استوی علی العرش قرآن کریم میں سات سورتوں میں مذکور ہے، یعنی "أعراف، یونس، رعد، طه، فرقان، سجده، حدید"۔ ان ساتوں مقامات میں استویٰ کا صلہ "علی" آیا ہے، تو معلوم ہوا کہ پوری کائنات پر ملک اسی ذاتِ واحد لاشریک لہٗ کو حاصل ہے۔

رہا استواء علی العرش کا مبدأ، اور اس کی ظاہری صورت وکیفیت۔ پس دیگر صفات سمع وبصر وغیرہ کی طرح یقیناً اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی کہ اس میں مخلوق کی صفت اور حدوث کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ پھر وہ کیونکر ہے اور کس طرح ہے؟ تو اس کی کیفیت کے لئے اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ [الشوری: ۱۱] (نہیں ہے اس کی طرح کا کوئی)۔ ہمارا کیا مایۂ علمی؟ کہ اس کی کیفیت معلوم کرسکیں۔ ﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ [طٰه: ۱۱۰] (جو کچھ ان کے آگے ہے، اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، وہ اس کو جانتا ہے، اور وہ (اپنے) علم سے خدا (کے علم) پر احاطہ نہیں کرسکتے)۔

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "اَلْاِسْتِوَاءُ غَیْرُ مَجْهُوْلٍ وَ الْكَیْفُ غَیْرُ مَعْقُوْلٍ و

الْاِقْرَارُ بِهٖ اِيْمَانٌ وَالْجُحُوْدُ بِهٖ كُفْرٌ"۔[رواه ابن مردويه والالكائي في كتاب السنة۔روح المعانی]
استواء معلوم ہے، اوراس کی کیفیت عقل سے بالاتر ہے(عقل میں نہیں آسکتی)اس کا اقرار ایمان اور انکار کفر ہے،
اور سوال کرنا بدعت ہے(امام مالک رحمۃ اللہ علیہ)۔

قاضی ابوالعلاء صاعد بن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاعتقاد میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے: "لَايَنْبَغِيْ لِاَحَدٍاَنْ يَّنْطِقَ فِي اللهِ تعالىٰ بِشَيْئٍ مِنْ ذَاتِهٖ وَلٰكِنْ يَصِفُهٗ بِمَاوَصَفَ سُبْحَانَهٗ بِهٖ نَفْسَهٗ وَلَايَقُوْلُ فِيْهِ بِرَأْيِهٖ شَيْئًاتَبَارَكَ اللهُ تَعَالٰى رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ"۔[لغات القران بحوالہ روح المعانی ج: ۱۲] (کسی کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ حق تعالیٰ سبحانہ کے بارے میں اس کی ذات کے متعلق ذرا بھی زبان کھولے، بلکہ اسی طرح بیان کرے کہ جس طرح خوداللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمایا ہے، اپنی رائے سے کچھ نہ کہے۔ (بڑی برکت والا ہے، اللہ تعالیٰ سبحانہ جو ربّ ہے سارے جہانوں کا)۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ☆ وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبپایان رسید عمر ☆ ماہمچنان دراول وصف تو ماندہ ایم
(سعدیؒ)

قرآن کریم کی آیات کی تین اقسام ہیں: محکمات، متشابہات، مقطعات۔

(۱) محکمات وہ ہیں کہ جن کے معانی اور مطالب واضح ہوں، جن میں کسی قسم کا خفاء نہ ہو، جیسے: ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ﴾ [البقرة:۴۳] (نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں)۔

(۲) متشابہات وہ ہیں کہ جن کے معانی معلوم ہوں، مگر مراد و مطلب معلوم نہ ہو، جیسے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ:۵] (رحمٰن نے عرش پر استواء فرمایا)۔

(۳) مقطعات وہ ہیں کہ ان کے معانی و مطالب دونوں معلوم نہ ہوں، جیسے: الٓمّٓ وغیرہ۔ پس متشابہات کا حکم یہ ہے کہ بلاچوں وچرا، بغیر تحقیق وتفتیش ان پر ایمان لانا فرض ہے، یہی حکم مقطعات کا بھی ہے، جس کی تفصیل سورۃ البقرۃ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے متعلق اہم وضاحت:

واضح ہو کہ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ بذریعۂ وحی جلی (قرآن کریم) اور وحی خفی (حدیث شریف) اپنے

بندوں کوصرف ان باتوں کی مکمل تفصیلات بتلاتے ہیں، جن میں احکامِ شریعت کے مسائل وجزئیات مندرج ہوں، یعنی ان تفصیلات میں کوئی دینی شرعی ضروری مسائل کا تعلق ہو، یانہ بتلانے کی صورت میں کوئی دینی نقصان ہو۔ آسمانوں اورزمینوں کی تخلیقی پیدائشی ترتیب کے ساتھ کوئی شرعی مسئلہ وابستہ نہیں ہے، لہٰذاعلماء محققین حضرات یہی فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ بظاہر پورے قرآن مجید میں تین مقامات پرمذکور ہے۔

اول یہی آیت کریمہ، دوم سورۃالسجدہ کی آیت ۲، سوئم۔ سورۃالنازعات آیت ۳۰۔موجودہ آیت کریمہ میں زمین کی پیدائش پہلے، اور ''ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ'' سے آسمانوں کی پیدائش کاذکردوسرے مرحلہ پر ہے۔سورۃالسجدۃ میں زمین کی پیدائش پہلے ہے، اورآسمانوں کی پیدائش اس کے بعد ہے، اورزمین کی پیدائش چارروز میں، جبکہ آسمانوں کی پیدائش کے لئے دوروزمقررہوئے۔سورۃالنازعات میں آسمانوں کی پیدائش پہلے، اور زمین بچھانا پھیلانا دوسرے منافع کے ساتھ یہ آسمانوں کے بعد ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ سب سے پہلے زمین کاغیرمرتب مطلق مادّہ تیارکیاگیا، اس پردودن صرف ہوئے۔دوسرے مرحلے میں ساتوں آسمانوں کی تخلیق ہوئی، اس پربھی دوروزصرف ہوئے، تیسرے مرحلے پرپھرزمین کی طرف توجہ فرماتے ہوئے اس کوموجودہ شکل وصورت میں جبال وانہار، اوردیگر بے شمار منافع وفوائد کے ساتھ ترتیب دے کرہموارفرمایا، اس پربھی دوروزصرف ہوئے۔

یہی جمہورعلماء کرام کاقول بھی ہے، اورتینوں آیتوں میں تطبیق بھی ہے۔حافظ ابن کثیررحمہ اللہ نے فرمایا کہ عقل کاتقاضا بھی یہی ہے کہ تعمیرات کی ابتداء(بنیاد) نیچے کی طرف سے کی جاتی ہے، اورچھت کی تعمیر آخرمیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی تعمیرات سب اسی طرزوطریق پرانجام دی جاتی ہیں۔

السماء یا السمٰوٰت:

لفظ ''سمٰوٰت'' جمع ہے، اس کاواحد ''سماء'' ہے۔یہ کلمہ اپنے مشتقات کے ساتھ قرآن کریم میں ایک سو بیس(۱۲۰) مقامات پرمذکور ہے۔لغت میں ہراوپرکی بلندوبالا چیزکو ''سماء'' کہتے ہیں، مثلاً فضاء، بادل، افق، چھت سب پر ''سماء'' کااطلاق ہوتاہے۔

یہاں سماء سے صرف آسمان ہی مراد ہے، یعنی یہ بلندوبالا نیلی چھت جوبغیرستونوں کے قائم ہے، کرۂ ارضی کے کسی بھی حصے سے دیکھاجائے ایسامحسوس ہوتاہے کہ اس کاکنارہ کوئی نہیں۔قرآن کریم اورگزشتہ تمام آسمانی

کتابوں نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے قدرتِ الٰہی کا عظیم شاہکار اور بے مثال تخلیق قرار دیا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سالوں کے گزرنے کے باوجود یہ اپنے ارتفاع و بلندی، اور بے مثال حسن و خوبصورتی کے ساتھ قائم ہے، نہ اس میں شگاف و سوراخ، نہ کوئی کجی ورخنہ اور نہ ہی کوئی اور عیب و نقصان پیدا ہوا۔ ﴿مَاتَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ﴾۔ [الملک:۳] (تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں پاؤ گے)۔

پھر نظامِ شمسی کے ساتھ اس کی خوبصورتی و حسن کا یہ عالم کہ کھربوں قمقمے، کواکب و سیاروں سے آراستہ فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ جَعَلۡنَافِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًاوَّزَیَّنّٰهَالِلنّٰظِرِیۡنَ﴾ [الحجر:۱۶] (اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدۡ زَیَّنَّاالسَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَجَعَلۡنٰهَارُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ﴾ [الملک:۵] (اور ہم نے قریب والے آسمان کو روشن چراغوں سے سجا رکھا ہے، اور ان کو شیطانوں پر پتھر برسانے کا ذریعہ بھی بنایا ہے)۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر تصریح کی ہے کہ آسمان سات ہیں۔ اگر اہلِ ہیئت آسمانوں کو نو قرار دیں گے، تو یہ ان کی اصطلاح ہے۔ وہ عرش و کرسی کو ملا کر نو کی تعداد پوری کرتے ہیں۔ (اس سلسلے میں سورۃ الملک کی تفسیر میں تفصیل قدرے زیادہ ہے)۔ البتہ! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ سات زمینوں کا کہیں بھی ذکر نہیں فرمایا، صرف ایک مقام پر سورۃ الطلاق میں ﴿وَمِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ﴾ [الطلاق:۱۲] فرما کر اشارہ کر دیا کہ آسمانوں کی طرح زمین بھی سات ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف صحیح اور حسن احادیث مبارکہ میں تفصیلاً زمینوں کے سات ہونے کا بیان بکثرت موجود ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے تواتر کا قول نقل کیا ہے۔ [البدایة والنهایة جلد أول]

ایک خاص حدیث حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو کہ عشرہ مبشرہ میں شمار ہیں، روایت کرتے ہیں کہ جو شخص کسی کی ایک بالشت برابر زمین ظلم سے قبضہ کرے گا، اللہ ربّ العزّت سبحانہ قیامت کے روز اسے سات زمینوں کا طوق پہنائیں گے۔ [متفق علیه] اسی معنی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا و حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی مرفوع روایت نقل کی ہیں۔

﴿وَهُوَبِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ﴾ (اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَهُوَعَلِیۡمٌ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ﴾ [الحدید:۶] (وہ دل کے بھیدوں تک سے واقف ہے)۔ معبودِ برحق کی صفت ذاتی یہی ہونی

چاہئے کہ اس کا علم کائنات کے ہر ہر ذرہ پر محیط ہو، تب ہی تو وہ حسنات کے ہر ذرہ پر ثواب، اور معاصی کے ہر ذرہ پر عقاب دینے پر قادر ہوگا۔ اسی طرح مخلوقات کو رزق و روزی پہنچانے کے لئے بھی معبودِ حقیقی میں علمِ محیط کا ہونا ضروری ہے۔ علیٰ ہذا القیاس باقی تنظیمی، تکوینی اور تشریعی امور و جزئیات سارے علمِ محیط پر مبنی، اور اسی پر صفتِ توحید کا قیام ہے۔ [حجۃ اللہ البالغۃ]

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اور جب کہ آپ کے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، وہ بولے کیا تو زمین میں ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے، اور خونریزیاں کیا کرے؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کہتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ﴿۳۰﴾

معارف ومنازل

یہاں سے ربّ العزّت تیسری (معنوی) نعمت کی یاد دلاتا ہے۔ اس سے پہلے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا فرمایا، اور تمہارے لئے زمین و آسمان، اور ان کی سب چیزوں کو بنایا ہے، اور اس نے تمہارے دادا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو وہ عزّت و حرمت بخشی کہ فرشتوں کو ان کی پیدائش سے پہلے خبر کردی تھی کہ ہم زمین پر اپنا نائب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہتے ہیں، کہ اس کے اور اس کی اولاد انبیاء علیہم السلام کی معرفت و توسط سے ہم اپنے احکام جاری کریں گے۔ جب فرشتوں نے یہ سنا تو معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بڑے برگزیدہ ہوں گے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ان کی پیدائش سے پہلے ان کی منادی کی گئی۔ دوسرا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نائب ہو کر زمین پر حکومت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کریں گے۔

فرشتوں نے کیوں یہ سوال کیا؟

ملائکہ کو معلوم تھا کہ اس نائب کا خمیر اور مادّہ ایسے مختلف الطبع متضاد عناصر سے ہوگا کہ ان میں ایک عمدہ قوت عقلیہ، اور دو بُری قوتوں قوتِ شہویہ و قوتِ غضبیہ کی ترکیب لازمی ہوگی، اور یہ دونوں قوتیں نہایت قبیح اور مذموم ہیں۔

قوتِ شہویہ کا تقاضا بے حیائی اور زنا کاری کے سوا کچھ نہیں ہے، اس سے کائنات میں فساد پھیلے گا، اور نظام درہم برہم ہوگا، اور قوتِ غضبیہ سے خونریزی، قتل و غارت وغیرہ جرائم کا بازار گرم ہوگا، تب انہوں نے بحیثیت اظہار مافی الضمیر، نہ کہ بطورِ حسد یا اعتراض، نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا: یا ربّ العلمین! جب اس کا یہ حال و مآل ہوگا، تو پھر اس کو خلیفہ بنانا، اور اسے نیابت کا عہدہ عطا کرنے میں کیا حکمت ہے؟ رہی تیری تسبیح وتقدیس (سبحان الله وبحمده، سبوح قدوس رب الملئكة والروح، سبحان ذي الملك والملكوت سبحان ذي العزة والعظمة والجبروت سبحان الملك الحي الذي لاينام ولايموت سبحان ذي الجلال والإكرام) وغیرہ اس کے لئے ہم ملائکہ ہر وقت تیار اور ثناء خواں ہیں، جو کہ ہر قسم کی قوتِ شہویہ و غضبیہ سے پاک ہیں، اور نہ ہی ان چیزوں کا ہمارے اندر کوئی مادّہ موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اجمالی اور حاکمانہ جواب دے کر فرمایا کہ اس میں جو عظیم حکمت ہے، وہ تمہیں ہرگز معلوم نہیں فرمایا: ﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ﴾ یعنی تم خلافتِ الٰہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازمات سے ناواقف ہو، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ہماری طرح کی ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، کوئی اور نہیں۔ انسان کی قوتِ شہویہ اور غضبیہ کو دیکھ کر تم نے فیصلہ کیا کہ نسلِ آدم علیہ السلام کہیں ایسا نہ ہو کہ انہی قوتوں کے ذریعے نظامِ عالم کو تہہ و بالا کردے، اور تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں قوتوں، یعنی شہویہ وغضبیہ کو ترکیب دے کر جب مہذب کرلیا جائے (افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال پر رکھا جائے) تو ان سے عدل و انصاف، عفت و شجاعت اور حکمت وغیرہ صفاتِ حمیدہ پیدا ہوجاتی ہیں، اور یہی چیز خلافتِ الٰہیہ کے لئے اصلی بنیاد کہلائے گی، کیونکہ یہ امور نفس کشی، ریاضت اور مجاہدہ کے بعد حاصل ہوں گے، خاص کر نفس و خواہشات کے خلاف ہر وقت اقدام کرنے سے یہ امور ان کو حاصل ہوں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ فرشتوں کی عبادت و اطاعت، اور ہر قسم کی فرمانبرداری ان کی طبعی جبلی فطری تقاضوں پر مبنی ہوتی ہے، اور یہ کسی برتری کا سبب نہیں بن سکتے۔ بخلاف انسان اور اس کی طبیعت کے کہ جس میں غضب و شہوت کی استعداد کی موجودگی کے ساتھ ہر قسم کا مجاہدہ و ریاضت کرکے قوتِ غضبیہ شہویہ کے خلاف نیکیاں کرنا، اور اعمالِ صالحہ انجام دینا، یہ ہر طرح کی برتری و عظمت کے لئے کھلم کھلا اور واضح دلیل ہے۔

☆☆☆

خلاصہ یہ ہے کہ فرشتوں نے دو وجوہ کی بنیاد پر یہ سوال کیا:

(۱) فرشتہ اگر گناہ نہ کرے، تو یہ اس کی برتری کی علامت نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی طبیعت میں گناہ کی استعداد ہی نہیں، مگر بنی آدم قوتِ شہویہ اور غضبیہ، نیز ہر قسم کے گناہوں کی استعداد کے باوجود اگر گناہ نہیں کرے گا، تو یہ اس کا کمال شمار ہوگا، اس کی برتری کی علامت سمجھی جائے گی، اور خلافت کا استحقاق بھی۔ چونکہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتوں نے صرف جنات، اور ان کی زندگی کا ملاحظہ کیا تھا۔ جنات میں سوائے شر وفساد کے اور کچھ نظر نہیں آیا، پس انہوں نے انسانوں کو جنات پر قیاس کر کے بنی آدم کے لئے صرف شر وفساد ہی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ کسی خیر وصلاح کا ذکر تک نہیں کیا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ تخلیقِ آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ: "لَنْ یَخْلُقَ اللّٰہُ خَلْقًا اَکْرَمَ عَلَیْہِ مِنَّا وَ لَا اَعْلَمَ عِنْدَہٗ مِنَّا"۔ [ابن جریر] یعنی ہم سے افضل واعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ ہرگز پیدا نہیں فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے علم وارادہ میں ابتداءِ آفرینش ارض وسماء کے ساتھ یہ محقق اور واضح تھا کہ ایک ایسی برتر مخلوق پیدا کرنا ہے، جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل اور اعلم ہوگی، (کیونکہ جنت کی مستحق یہی مخلوق ہوگی، نہ کہ فرشتے اور جنت و دوزخ کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہو چکی تھی)۔ پس اسی بنیاد پر فرشتوں سے کہا گیا، یعنی بطورِ مشورہ نہیں، بلکہ ان کا امتحان مقصود تھا، اور ان کے جواب کو منظرِ عام پر لانا تھا، ورنہ اللہ تعالیٰ کو ان کے جوابات اور دیگر تمام خیالات کا پہلے سے علم تھا کہ وہ اس طرح جواب عرض کریں گے۔

فرشتوں کے مختصر حالات:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "خُلِقَتِ الْمَلٰئِکَۃُ مِنْ نُوْرٍ وَ خُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ وَ خُلِقَ اٰدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَکُمْ"۔ [مسلم، مجمع الزوائد]

قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿١٥﴾﴾ [الرحمٰن] (اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا، اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا)۔ خالق جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش مشتِ خاک سے فرشتوں کو نور سے، اور جنات کو شعلہ زن آگ سے پیدا فرمایا۔ کائنات میں ذوی العقول اور مکلف مخلوقات یہی تینوں ہیں، اور ان ہی تینوں پر عالمِ تکوین و عالمِ تشریع کا دار و مدار ہے، اور کرۂ ارضی و سماوات کی دیگر تمام مخلوقات ان ہی تینوں کے زیر اثر اور تابع ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آسمانوں میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں ہر وقت کوئی فرشتہ سجدہ میں یا قیام میں یا رکوع میں نہ ہو، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آسمانوں میں کہیں بھی ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں پر کسی فرشتہ کی پیشانی، یا اس کے قدم نہ ہوں، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ﴾ [الصافات:۱۶۶] (اور ہم صف باندھے رہتے ہیں اور (خدائے) پاک (ذات) کا ذکر کرتے رہتے ہیں)۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَطَّتِ السَّمَاءُ وَحَقَّ لَهَا اَنْ تَئِطَّ مَا مِنْهَا مَوْضِعُ اَرْبَعِ اَصَابِعَ اِلَّا وَعَلَيْهِ مَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهُ۔ [ترمذي، ابن ماجه، مستدرك، مسند أحمد، إحياء العلوم]

ترجمہ: آسمان چرچراتا ہے، اور اسے حق ہے کہ چرچرائے، اس میں چار انگل کی جگہ بھی ایسی نہیں، مگر اس پر کوئی نہ کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے موجود ہے، یعنی سجدہ میں ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ فِی الْجَنَّةِ نَهْرًا مَا يَدْخُلُهُ جِبْرِيْلُ مِنْ دَخْلَةٍ فَيَخْرُجُ فَيَنْتَفِضُ اِلَّا خَلَقَ اللهُ مِنْ كُلِّ قَطْرَةٍ تَقْطُرُ مِنْهُ مَلَكًا"۔ (جنت میں ایک نہر ہے، حضرت جبرائیل علیہ السلام جب بھی اس میں داخل ہو کر باہر نکلتے ہیں، اور اپنے بدن کو جھاڑتے ہیں، تو اس گرنے والے ہر قطرہ سے حق سبحانہ وتعالیٰ ایک فرشتہ پیدا فرماتے ہیں۔ [كنز العمال، فيض القدير، كتاب العظمة ابو الشيخ]

چار مقرب فرشتے:

فرشتوں کے سردار چار مقرب عظیم فرشتے ہیں:

حضرت اسرافیل علیہ السلام:

سب سے بڑا عظیم الجثہ، عظیم المرتبہ، ربّ العزت سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک مقرب و صاحب حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں، جن کی ڈیوٹی عرشِ معلی کے ساتھ ہے، یہی مقدس فرشتہ حضرت اسرافیل علیہ السلام احکام و فرامین ایزدی وحی وغیرہ دیگر فرشتوں تک پہنچانے والے ہیں۔ انہی کی پیشانی پر لوحِ محفوظ رکھا ہوا یا لکھا ہوا ہے۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے براہِ راست وحی اخذ کرتے ہیں۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بتاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت اسرافیل علیہ السلام مذکورہ (فرشتوں) کو امور اور انتظامات کی اطلاع بھی فرماتے ہیں، اور صاحب صور بھی ہیں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام:

دوسرا مقرب فرشتہ جن کے چھ سو پر ہیں، اور اسرافیل علیہ السلام کے بعد جن کا منزلہ ورتبہ ہے، وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں، جو کہ صاحب وحی سے مشہور ہیں، جن کی مدح وتعریف قرآن مجید میں واضح ونمایاں ہے، اور الروح، وروح القدس کے لقب سے مشہور ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہواؤں، لشکروں، امتوں، وحی الی الانبیاء وغیرہ امور پر مقرر ہیں۔

حضرت میکائیل علیہ السلام:

تیسرے درجے میں حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت میکائیل علیہ السلام، جنگلوں، نباتات، بارش، بادلوں، ارزاق وغیرہ امور پر تعینات ہیں۔

حضرت عزرائیل علیہ السلام:

چوتھے درجہ میں حضرت عزرائیل (ملک الموت) علیہ السلام ہیں۔ حضرت ملک الموت ارواح قبض کرنے پر مأمور ہیں، (انسانی، حیوانی، جنات کی ارواح) کہتے ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے بعد ساری مخلوقات سے پہلے ان ہی چاروں فرشتوں کی پیدائش ہوئی، اور قیامت کے ساتھ ساری مخلوقات کے بعد ہی ان چاروں کی موت کا فیصلہ ہوگا، اور نفخۂ ثانیہ کے ساتھ سب سے پہلے دوبارہ ان ہی کی پیدائش ہوگی، اور یہ بات یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے تمام مخلوقات کے پورے نظام، اور ساری کائنات کے سارے امورِ تکوینیہ انہیں مقدس فرشتوں کے سپرد فرمائے ہیں۔ دنیا یا آخرت کا کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس میں فرشتوں کا عمل دخل نہ ہو، تقریباً سارا نظام انہیں کے حکموں، فرمانوں اور اشاروں پر رواں دواں ہے۔

یہ فرشتے ہر قسم کے معاصی اور نافرمانیوں سے معصوم اور پاک ہیں۔ ان کے نفوسِ قدسیہ میں خواہشات اور دیگر کسی قسم کے جسمانی وروحانی امراض کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ ذکورت وانوثت، اور روزمرہ کی موت وفناء سے مبرّا اور آزاد ہیں۔ اکل وشرب، اور دیگر نفسانی خواہشات سے آزاد ہیں۔ اعلیٰ درجے کے دانا، دانشمند عقل والے ہیں، غیظ وغضب سے مکمل پاک ومنزہ ہیں۔ ہر قسم کی شکل وصورت اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

اعمالِ حسنہ اور نیک وصالح انسانوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ اعمالِ سیئہ اور ہر قسم کی خیانت ومداہنت، برائیوں اور برے انسانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے اجسام لطیف نورانی ہیں۔ ان کی سیر وسیاحت آمدورفت کا سلسلہ ہر لمحہ آسمانوں، زمینوں، دریاؤں، سمندروں، فضاؤں میں جاری وساری رہتا ہے۔ ان کی رفتار بجلی کی طرح

نہایت تیز ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ آسماں سے زمین تک کا سفر منٹوں میں طے کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں کُلی و جزئی حالات و کیفیات اگر فرشتوں کے متعلق معلوم کرنا ہو، تو قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی تذکرہ، حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الحبائک، ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی الروح وغیرہ کتب کی مراجعت کی جائے۔ واللہ أعلم

خلافت بمعنی نیابت کے ہے، چونکہ کائنات کا حاکمِ مطلق مالک وخالق حق سبحانہ وتعالیٰ ہی ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ (کہو کہ اے خدا! (اے) بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے) [آل عمران: ۲٦]

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ [الأعراف: ۵۴] (دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے)

﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ [الحدید: ۲] (آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، وہی زندگی اور موت دیتا ہے)۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ [الأنعام: ۵۷] (حکم اسی کے لئے ہے)۔ ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ [الملک: ۱] (وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، بڑی برکت والا ہے)۔

جب اقتدارِ اعلیٰ حق سبحانہ وتعالیٰ کا ہے، تو خلافت اس کا ایک گرانقدر عطیہ ہی ہے۔ یہ امرِ وہبی اور تحفۂ خاص ہے، اس میں کسی محنت یا جدوجہد کا دخل نہیں ہے۔ خلیفہ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی اور احکامِ شرعیہ کا نفاذ کرے، اس کو کسی بھی حکمِ شرعی کی تنفیذ واجراء میں غفلت وسستی یا کمی بیشی کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، اور وہ کسی بھی حکمِ شرعی کو نظر انداز کرنے کا مجاز نہیں ہوگا، جس اہم اور اعلیٰ مقصد کے لئے ربّ العزت نے انسان کو پیدا فرمایا، اسے خلافت کا تاج پہنا کر خلافت کی عظیم خلعت کے ساتھ سرفراز فرمایا، اور پوری کائنات کو اس کی تسخیر میں دے دیا، تو اس منصب کا حقیقی واجبی حق یہی اس کے ذمہ پر لگایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر اس کے احکام کے اجراء و نفاذ کا عمل بجالائے۔

چونکہ کائنات انسان کے لئے ہے، اور انسان خالقِ کائنات کی عبادت واطاعت کے لئے ہے، تو خلیفہ اسی مقصد پر رہنمائی اور ہدایت کے لئے ہوگا۔ جب کائنات انسان کے لئے تخلیق ہوئی، تو انسان خیر وشر کا مجموعہ قرار پایا، اور اس کی جبلت وفطرت پر اس کو منصبِ خلافت کے ساتھ نوازا گیا، اور یہی دونوں بنیادی چیزیں، یعنی خیر وشر کا

اجتماع منصبِ خلافت کا معیار قرار پاگئے۔

فرشتوں کی فطرت میں صرف خیر ہی کا مادّہ ہے، شر کا کوئی وجود ہی نہیں، جبکہ تیسری مخلوق جنات میں خیر کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے، اور شر ہی کا ان میں غلبہ ہے، اور کائنات کا گوشہ گوشہ، چپہ چپہ ہر ذرہ میں خیر و شر، صلاح وفساد، حق وباطل، نور وظلمت، ایمان وکفر وغیرہ ہر قسم کی اضداد کا عنصر اور اختلاط کا دور دورہ ہے، گویا کائنات مجموعۃ الاضداد کا نام ہے، تو اس کی سرپرستی ونیابت صرف وہ مخلوق انجام دے سکتی ہے جس کی طبیعت میں کائنات کی طرح ہر قسم کی خیر و شر کا امتزاج ہو، نہ کہ وہ مخلوق (فرشتہ اور جنات) جن میں خیر، یا شر میں سے کوئی ایک صفت ہو۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ لمبی چوڑی، کائنات جو چاروں طرف اور اوپر نیچے پھیلی ہوئی ہے، جس میں بے انتہا طویل وعریض آسمان کا خیمہ تنا ہوا ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، زمین وآسمان کے درمیان ہزاروں قسم کی مخلوقات پھیلی پڑی آباد ہیں، جمادات اور ان کی ہزاروں قسمیں، نباتات اور ان کی ہزاروں اقسام، حیوانات اور ان کی ہزاروں قسمیں، دریا اور خشکی کے بے شمار جانوروں کی اقسام، نیز ہزاروں قسم کے حشرات الارض، کیڑے مکوڑے، یہ سارے زمین وآسمان کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ کائناتی موجودات کی مختصر فہرست ہے، جسے عام اصطلاح میں عالمِ کبیر یا اُکبر کے نام سے یاد کرتے ہیں، اسی عالمِ کبیر کے اندر ایک دوسرا عالمِ صغیر کا بڑے اہتمام اور خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ہوتا ہے، یعنی حضرت انسان، جس کی خاطر کائنات کی تخلیق ہوئی، اس انسان کے مختصر چھوٹے جسم وجثہ میں عالمِ کبیر کے تمام ممکنہ موجودہ اجزاء کا عنصر موجود ہے، اور ہم بلاشک وشبہ اور بدون کسی تردید کے کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ عالمِ اکبر میں ہے وہی سب کچھ اس عالمِ اصغر میں موجود ہے۔ جو عالمِ کبیر کروڑوں میلوں پر مشتمل ومحیط ہے، وہ ایک چھوٹی سی ڈبیہ، یعنی انسانی بدن میں بند ہے، جس طرح کہا کرتے ہیں کہ دریا کو کوزہ میں بند کرلیا گیا، تو عالمِ کبیر کو اسی طرح انسان کے صغیر جسم وجثہ میں بند رکھا گیا، اور یہ مخصوص صفت سوائے انسان کے دیگر کسی بھی مخلوق میں ناممکن اور ناپید ہے۔ اس کی گنجائش نہ فرشتوں میں ہے، اور نہ ہی جنات میں ہے۔

اس کے علاوہ بنیادی صفات، یعنی علم وعمل اور بِر وتقویٰ، علمِ معاشرہ، علمِ معاش، عدل ومساوات، طہارت و عبادات، سیاست، اخلاق، تجارت، ذراعت، نظامِ ملت وملک وغیرہ، اور دیگر بہت سے امور جو تخلیقِ کائنات کے روزِ اول سے آج تک پورے عالم میں جاری وساری ہیں، یہ تمام انسانی جدوجہد اور محنتوں کا نتیجہ اور پیداوار ہیں۔ یہ

وہ امورِ غریبہ اور فوائدِ عظیمہ ہیں، جنہیں انجام دینا فرشتوں کے لئے نہایت دشوار ہے۔ فرشتوں کو کسی کی صحت و مرض، موت و حیات، غم و خوشی، بھوک و پیاس، بیداری اور نیند، عزّت و ذلّت اور فقر و فاقہ کا کبھی کوئی اندازہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ چیزیں ان کی فطرت میں شامل نہیں ہیں، تو وہ ان چیزوں کے متعلق امورِ خلافت کیا انجام دیں گے؟

اسی طرح نسلی سلسلہ اور رشتہ داری و صلہ رحمی کے متعلق امور و اقدار، ازدواجی تعلقات اور رشتوں، قومیتوں، قرابتوں کے ہزاروں روزمرہ کے مسائل، جنہیں ایک انسان سرانجام دے سکتا ہے، اور ان کا حق ادا کر سکتا ہے، ان امور کی انجام دہی میں کوئی بھی مخلوق اس معیار پر نہیں اتر سکتی، سوائے حضرت انسان کے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ عبادات اور طاعات کی رُو سے فرشتوں پر متقی کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ تقویٰ کے معنی ہیں: ''گناہوں سے بچنا''، اور گناہوں پر آمادہ کرنے والا چونکہ نفس ہے، اور فرشتوں میں اس کا فقدان ہے، جہاں نفسانی خواہشات نہ ہوں، وہاں کبھی تقویٰ متحقق نہ ہوگا۔ اگر فرشتے اپنی تخلیق سے لے کر قیامِ قیامت تک رکوع و سجود، قیام اور قعود، تسبیحات اور اذکار میں مشغول رہیں گے، تو پھر بھی انہیں متقی نہیں کہا جا سکتا، اور اس سلسلۂ عبادات پر انہیں عبادت گزار انسانوں پر برتری حاصل نہیں رہے گی، کیونکہ ان کی عبادتیں فطری اور طبعی تقاضوں کی بنیاد پر ہیں، جن میں مخالفتِ نفس اور نفس کشی و مجاہدہ اور خلافِ نفس امور کا ذرّہ بھر تعلق نہیں ہوتا۔

پس اسی نفس کشی اور خلافِ نفس عبادات کی بجا آوری کے پیشِ نظر ایک متقی مسلمان کی دو رکعت نماز فرشتوں کی سینکڑوں نمازوں سے افضل ہے۔ مثال کے طور پر دیکھا جائے کہ ایک چار سالہ بچہ اگر گناہ نہیں کرتا، یہ کوئی کمال نہیں ہے، کیونکہ وہاں نفسانی خواہشات کا فقدان ہے، لیکن اگر کوئی عاقل بالغ شخص گناہوں سے بچتا، اور پرہیز کرتا ہے، تو یہ کمال بھی ہے، اور تقویٰ بھی، کیونکہ یہاں خواہشات اور دواعی سب موجود ہیں، اور یہ اجتناب، خلافِ نفس اور نفس کشی کے سوا کچھ نہیں ہے، تو فرشتے معصوم ہیں، اور گناہ کے تصور سے بھی پاک ہیں، یہی وجہ ہے کہ بے مثال لاکھوں طاعات و تسبیحات اور اذکار و عبادات کے باوجود جنتی نعمتوں سے محروم ہیں، ان کے لئے نہ جنت ہے، نہ حور و غلمان، اور نہ ہی رؤیت و دیدارِ الٰہی عزّ شانہ، وغیرہ۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب التذکرہ'' میں حدیث نقل کی ہے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الْاٰدَمِیَاتِ اَفْضَلُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ بِسَبْعِیْنَ اَلْفَ ضِعْفٍ۔ [تذکرۃ للقرطبی] یعنی دنیاوی عورتیں (جنتی) حورعین سے ستر ہزار درجہ افضل ہیں۔ یہ افضلیت نماز روزہ، حج عمرہ، زکوٰۃ، علم و عمل و دیگر طاعات کی بناء پر ہے، کیونکہ حورعین کے

پاس یہ سرمایہ نہیں ہے، تو فرشتوں کو بھی اسی پر قیاس کریں، کیونکہ فرشتوں کے اعمال ان کی فطرت وطبائع کے تقاضوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں، تو ریاضت ونفس کشی، مخالفتِ نفس اور خواہشات کو دبا کر اعمالِ صالحہ کو بجالانا، اور تمام منہیات کو ترک کرنا، یہ صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہی اصلی تقویٰ ہے۔ اور یہ چیز فرشتوں میں نہیں ہے۔

پس انسان اگر چہ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے فرشتوں سے بہت ہی پیچھے ہے (کیونکہ فرشتے نافرماں نہیں ہوتے)، مگر ربّ العزّت سبحانہ نے انہیں ایک تحفہ وبخشش ایسا عطا فرمایا ہے، جس کی نہ مثال ہے، نہ بدل، وہ ہے انابت اور توبۂ نصوح، جس کی بدولت پہاڑوں جتنے گناہ معاف ہوسکتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ"۔ [ترمذی] فللہ الحمد والمنة۔

بہر حال! فرشتوں کا مقصد صرف استغفار اور تخلیقِ آدم کی حکمت تک محدود رہا، کیونکہ وہ ہر قسم کے گناہوں، حسد اور اعتراض وغیرہ نافرمانیوں سے پاک ہیں، اور کفر وشرک ونفاق سے بھی پاک ہوتے ہیں، اور ہر قسم کے عقاب وعذاب سے بھی آزاد ہیں، مگر انہوں نے انسان کی صفتِ مَلکیت (طہارت) کو نظر انداز کر کے صرف صفت بہیمیت (قوتِ شہویہ وغضبیہ) کو دیکھ کر یہ کہا: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ [الآیۃ]

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں! یہی دو صفتیں (شہویہ وغضبیہ) اگر چہ بظاہر نقصان دہ اور مذموم ہیں، مگر در حقیقت ان ہی دونوں صفات کا شمار عظیم ترین نعمتوں میں ہوتا ہے، کیونکہ انسان کی روحانی ترقی اور سیر الی اللہ ووصول الی اللہ کے اصلی سبب یہی دو ہیں، اسی قوتِ شہویہ کی بدولت تو عشقِ الٰہی کے مدارج طے کئے جاتے ہیں، اگر یہ قوتِ شہویہ نہ ہو (فرشتوں میں نہیں ہے) تو محبت وسلوک کا میدان شاید طے نہ ہو۔ مزید برآں قوتِ غضبیہ ہر دفاع اور پیش قدمی کا اصلی بنیادی سبب ہی ہے، کہ اسی کی بدولت نفس وشیطان اور کفار ومنافقین کے ساتھ معرکۂ جہاد جاری رہتا ہے، اور اسلامی زندگی میں اگر ہزاروں برکات وثمرات وفوائد ظاہر ہوسکتے ہیں، تو اسی قوتِ غضبیہ کی بدولت، جسے فرشتوں نے معیوب اور ناقص تصور کیا تھا، اسی نکتۂ عجیبہ پر عارف رومی رحمہ اللہ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ؎

شہوت دنیا مثال مزبل ست ☆ کہ از وحمام تقویٰ روشن ست

دنیاوی شہوت اگر چہ کوڑا کرکٹ ہے، مگر اسی کی آگ سے تقویٰ کا حمام روشن اور گرم ہے۔

خلافت وشریعت متحد ہے، یا مختلف؟

در حقیقت خلافت وشریعت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ دنیا کے پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام ہیں، اور وہی اس

کائنات میں اولین شریعت کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام کمالات اور بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا، اور پھر وہی کمالات اور خوبیاں وراثت کے طور پر آپؑ کی اولاد میں منتقل ہوتی گئیں۔ خلافت ہو یا شریعت ان کی ابتداء آپؑ سے ہوئی، اور تکمیل حضرت خاتم الانبیاء جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوئی، گویا کہ ہندوستان پہلا دارالنبوت اور دار الخلافت ہے۔ مکہ ومدینہ شرفهما اللہ آخری دارالنبوت اور دارالخلافت ہیں، کیونکہ آدم علیہ السلام کا نزول وہبوط کوہِ ہمالیہ کے دامن ہندوستان میں ہوا تھا۔ یہاں سے حضرت آدم علیہ السلام نے تقریباً ایک سو بیس (۱۲۰) حج کئے، جن میں چالیس حج پیدل اور بقایا سواری پر۔

حضرت آدم علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے جو صفات وکمال ودیعت فرمائے، ان میں سرِ فہرست قوتِ عقلیہ، قوتِ شہویہ، قوتِ غضبیہ ہیں۔ آخری دو کو عام طور پر لوگ قوتِ بہیمیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرشتوں میں قوتِ عقلیہ علیٰ وجہ الاتم موجود ہے، جبکہ باقی دونوں سے وہ بری الذمہ ہیں۔ پس وہ اگر شب وروز عبادت واذکار میں مصروف رہیں گے، تو ان کی یہ طاعت، اضطراری اور غیر ارادی (طبعی) شمار ہوگی۔

ان کی عبادتوں کو بنی آدم کے سانس کی طرح غیر اختیاری طبعی سمجھنا چاہئے۔ یہ کوئی نمایاں برتری اور کمال نہیں، کیونکہ اس کے ساتھ کوئی رکاوٹ وموانع متصادم نہیں ہوتے (جیسے انسان صبح شام کھاتے پیتے سوتے ہیں، یہ ان کی طبعی تقاضوں کی تکمیل ہے، ان میں کسی برتری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) بخلاف انسان کے، کہ وہ اگر عبادات وطاعات انجام دیتا ہے، تو بہت سی نفسانی خواہشات اور دیگر موانع اور طبعی تقاضوں کے خلاف کرتا ہے، چونکہ کائنات کی مکمل تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی، اور کائنات جن موجودات واضداد کا نام ہے، اس کی اصلاح اور نظام چلانے کے لئے ایک ایسے خلیفہ کی ضرورت تھی، جس کی طبیعت وجبلت کے ساتھ ان مختلف اضداد کی مناسبت ہو، مثلاً حیات وممات، عدل ومساوات، تعلیم، صنعت، حرفت، کسب ومحنت، مزدوری، صحت وبیماری، زراعت، تجارت اور اخوت وصلہ رحمی، وغیرہ ان امور کے انجام دینے میں تنہا عقل ہرگز کافی نہیں ہے، جب تک اس کی کابینہ میں قوتِ شہویہ وقوتِ غضبیہ کی شمولیت نہ ہو۔ جب کائنات مجموعۃ الاضداد کا نام ہوا، جہاں بے شمار نیکیوں کا سلسلہ جاری ہے، وہاں ان سے کئی گنا زیادہ مفاسد وخرابیوں کا بھی دور دورہ ہے، انہیں مفاسد وفتنوں سے دنیا کو پاک کرنے کی خاطر تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے۔ اگر یہ مفاسد نہ ہوتے تو انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد اور شریعتِ سماویہ و کتبِ الٰہیہ کے نزول کی ضرورت نہ ہوتی۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ
الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ
اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو سارے نام سکھا دیئے۔ پھر پیش کیا ان کو فرشتوں پر۔ پس کہا مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ انہوں نے کہا: پاک ہے تیری ذات، نہیں ہے ہمارے پاس علم، مگر وہ جو تو نے ہمیں سکھلا یا ہے، بیشک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! بتلا دے ان کو ان چیزوں کے نام، پس جب اس نے ان کو ان چیزوں کے نام بتلا دیئے تو فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو، اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو، اور جس کو تم چھپاتے ہو ﴿۳۳﴾

معارف ومنازل

سابق جواب ﴿اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ربّ العزت سبحانہ کی طرف سے فرشتوں کو اجمالی اور حاکمانہ تھا، اب یہاں ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ سے حکیمانہ طرز پر تفصیلی جواب دیا جارہا ہے۔ اس مقام پر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلہ میں جو تفصیلی روایت نقل کی ہے، اس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش:

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا فیصلہ فرمایا، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ زمین کے مختلف حصوں سے ایک مٹھی مٹی جمع کر کے وادی نعمان (جو کہ عرفات کے نزدیک طائف کے راستے پر واقع ہے) میں خمیر کر کے حضرت آدم علیہ السلام کا مجسمہ تیار کریں۔ جب جبرئیل علیہ السلام نے زمین سے مٹی کو اُٹھانا چاہا، تو زمین نے آہ وفغاں شروع کی، اور اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیا، یہ رحم دل فرشتہ خالی ہاتھ واپس ہوا، پھر میکائیل علیہ السلام اور تیسرے نمبر پر اسرافیل علیہ السلام بھی بھیجے گئے، حسبِ سابق زمین کے آہ وبکا کے سبب انہیں بھی واپس جانا پڑا، چوتھے نمبر پر عزرائیل علیہ السلام بھیجے گئے، تو زمین نے ہر چند آہ وبکا کی، مگر ملک الموت نے کوئی پروا

نہیں کی، اور یہ کہتے ہوئے مٹی اٹھائی کہ میں ربّ العزت کے حکم پر عمل کرنے کا پابند ہوں، میں اپنا فریضہ ہر حال میں ادا کروں گا، مجھے کسی کی آہ وبکا کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے روحوں کے قبض کرنے کا کام اسی واسطے اس کو سونپا، اور فرمایا کہ اس مشتِ خاک کو وہاں (جہاں خانۂ کعبہ فی الحال موجود ہے) جمع کرو۔

اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس مٹی کا گارا بنائیں، اور چالیس روز اس پر مینہ برسا، انتالیس دن غم اور رنج والم کا مینہ برسا، اور ایک دن خوشی کا، اسی سبب انسانوں کی مسرت وخوشی نہایت مختصر ہے، اور تکلیف و پریشانی از حد زیادہ ہے، پھر اس گارے کیچڑ کو خشک کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [الرحمن: ۱۴] (اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا)۔ پھر مکہ وطائف کے درمیان میدان عرفات کے قریب وادی نعمان میں اس کو رکھا گیا۔ حضرت حق سبحانہ نے اپنے دستِ قدرت سے اس کا قالب (جثہ، شکل وصورت) تیار کرکے اسے کھڑا رکھا، جب یہ مٹی پختہ ٹھیکری کی طرح آواز دینے لگی، تو اللہ تعالیٰ نے اس جسدِ خاکی میں روح پھونکی اور وہ یکا یک گوشت، پوست، ہڈی، خون، پٹھے، جوڑوں والا انسان بن گیا، اور ارادہ، حسن، عقل، شعور، اور وجدانی جذبات وکیفیات کا حامل سمیع وبصیر انسان نظر آنے لگا۔

فائدہ:

حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر جس مٹی سے گوندھا گیا تھا، وہ مٹی ایک ایسی خاصیت پر مشتمل تھی، جو ہر قسم کی تبدیلی (مزاج وطبیعت وغیرہ) قبول کرلینے والی تھی، اور کرۂ ارضی کے سفید، سرخ، سخت، نرم اور ہر قسم کی خاصیت اس مٹی میں شامل تھی، جس کا اثر واضح طور پر تمام افرادِ بنی آدم میں ظاہر ہے۔ [تفسیر عزیزی، باختصار]

قرآن کریم میں کہیں یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ تعلیمِ اسماء فرشتوں سے الگ کسی تنہائی میں دی گئی، اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ تعلیم سب کے لئے عام ہو، مگر حضرت آدم علیہ السلام اپنی طبعی اور فطری استعداد کی وجہ سے سب کچھ سیکھ گئے ہوں، اور فرشتے اس مخصوص علم کو بوجہِ عدمِ استعداد کے نہ سمجھ سکے، اور نہ سیکھ سکے ہوں۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہاں کوئی ظاہری تعلیم مراد نہ ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں (بطورِ الہامی تخلیق) ان اسماء کا علم ابتدائے آفرینش سے ودیعت کردیا گیا ہو، جسے عام طور پر فطری پیدائشی الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے کہ انسان کا بچہ ابتداءِ ولادت میں ماں کا دودھ پینا اور پستانوں کا چوسنا جانتا ہے، یا بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی قریبی پانی میں تیرنا شروع کرتا ہے۔

قرآن حکیم نے دوسری جگہ اسی فطری الہام کو تعلیم سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد ہے: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ [الرحمن:۴] (اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اس کو بولنا سکھایا)۔ یہ بات واضح ہے کہ یہاں علم سے مروجہ تعلیم مقصود نہیں ہے، بلکہ الہامی فطری تعلیم ہی مراد ہے، کماھو الظاھر۔

﴿اَلْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [الآیة] کسی مرفوع روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اسماء کا مصداق کیا ہے؟ اور یہ اسماء کن کن مسمیات کے اسماء ہیں؟ لہٰذا بطورِ تاویل مختلف علماء کرام سے منقول ہوئے۔ شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اسماء سے اسماء وصفاتِ الٰہیہ عزّ شانہ مراد لیتے ہیں، اسی کو حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں راجح اور پسندیدہ قول قرار دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک راجح قول یہی ہے کہ اسماء سے، اسماء حسنی اور ان کے مظاہر ہی مراد ہیں۔

اس باریک مسئلہ میں چند مقدمات ذکر کرنے کے بعد خود بخود یہ مفہوم متعین ہوگا:

(۱) فرشتوں کی پیدائش آسمان وزمین کی تخلیق کے ساتھ ہے۔

(۲) فرشتوں کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے ہزاروں سال مقدم ہے۔

(۳) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے ہزاروں سال جنات کی تخلیق مقدم ہے۔

(۴) جنات ہزاروں سال قبل از آدم علیہ السلام زمین پر آباد رہے، اور حکومت کی۔ جنات بنی آدم کی طرح اُکل و شرب، موت وحیات، صحت وسقم، تذکیر وتانیث، ولادت، توالد وتناسل، وغیرہ صفات رکھتے ہیں۔ اس عرصہ میں جنات نے زمین میں ہر قسم کا ظلم، زیادتی، کفر ومعاصی، فسق وفساد بکثرت شروع کیا، تب آسمانی فرشتوں نے انہیں عذاب دے کر کچھ کو قتل کیا، باقی ماندہ کو جنگلوں، صحراؤں، دریاؤں اور جزائر میں بھگا کر منتشر کیا۔

(۵) تخلیقِ کائنات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر نظامِ عالم کے مختلف شعبوں، مثلاً پانی، دریا، بادل، بارش، حیوانات، جمادات اور نباتات کی نگرانی اور تحفظ پر فرشتوں کو مأمور فرما کر انہیں ڈیوٹی اور تدبیر سپرد فرمائی، یہ تمام امورِ تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ظہور پزیر اور مقرر ہوئے، من جملہ ان امور سے جنات کی خبر گیری، اور ان کی زندگی کا سارا نظام فرشتوں کے حوالے کیا گیا۔

پس تخلیقِ کائنات کے ساتھ فرشتوں کو ان کی ڈیوٹی سپرد ہو چکی، تو انہیں ان تمام اشیاء کے نام اور فوائد وخواص بھی بتلائے گئے، جن پر انہیں مأمور رکھا گیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انہیں اشیاءِ عالم پر مأمور تو رکھا جائے، اور انہیں ان اشیاء اور ان کے خواص کی تعلیم ومعرفت سے بے خبر رکھا جائے؟ یہ سراسر عقل ونقل کے خلاف ہوگا، کہ ان کی ڈیوٹی تو

ہو، اور یہ اشیاء مہمل ہوں، فرشتوں کو ان کے ناموں تک سے بھی بے خبر رکھا گیا ہو۔ پس قرینِ قیاس یہی ہوگا کہ تخلیقِ کائنات کے ساتھ فرشتوں کو مامور بنا کر تمام نظام پر انہیں مطلع کیا گیا، تاکہ وہ پورے نظام پر حاوی رہ کر انہیں خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دے سکیں۔

البتہ! یہ ماننا پڑے گا کہ فرشتوں کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ ہاں! انہیں اسماءِ حسنیٰ اور ان کے مظاہر وحقائق سے بے خبر اس لئے رکھا گیا تھا کہ ان پر انہیں مامور نہیں رکھا گیا تھا، کیونکہ وہ ان کی ڈیوٹی سے وراء الوراء ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ یہ مظاہر بتائے، تو حضرت آدم علیہ السلام نے حسبِ استعداد ان کو حاصل کرلیا، جبکہ فرشتے استعداد نہ ہونے کی وجہ سے انہیں یاد نہ کرسکے، اور ان اسماءِ حسنیٰ کی معرفت میں وہ آدم علیہ السلام سے پیچھے رہ گئے، کیونکہ اسماءِ حسنیٰ کے مظاہر کا ایک پہلو جو "تَخَلَّقُوْا بِاَخلَاقِ اللّٰہِ" کا حصہ ہے، وہ فرشتوں میں استعداد نہ ہونے کی وجہ سے مفقود ہے۔ **تأمل فإنه دقيق و لعلك لا تجد هذا التحقيق عند غيرنا۔**

بعض علماء نے کہا کہ اس سے مراد لغات و اَلسنہ ہیں۔ قیامت تک آنے والی لغات وزبانوں کا واضع اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور یہی اسماء مراد ہیں۔ علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما "الأسماء" سے "الأشياء" ہی مراد لیتے ہیں، مثلاً انسان، جانور، رات دن، کوہ وجبال، بادل، برق وباراں اور شجر وحجر، وغیرہ مخلوقات سے لے کر ادنیٰ چیز (برتن اور چمچ) تک کی چیزیں مراد ہیں۔ ان کے نام اور فوائد نقصانات، خصوصیات، کیفیات، منافع، مضرات، وغیرہ وغیرہ۔ یہی قول جمہور علماء کا بھی ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسماء سے فرشتے مراد ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انسانوں کے مختلف طبقات، اقوام وغیرہ مراد ہیں۔ ویسے تو قرآن مجید کے بیان کردہ ہر اجمال کی تفصیل حدیث شریف میں ہے، مگر یہاں کوئی مرفوع روایت منقول نہیں ہے۔ واللہ اعلم

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو چونکہ جنت سے نکل کر وہاں پر آنا، اور قیام کرنا تھا، جہاں ان کی تخلیق ہوئی، یعنی کرۂ ارضی پر، تو زمینی مخلوقات کے ساتھ صبح وشام، ہر لحہ ان کو تعلق قائم رکھنا لازمی اور ضروری ہوا، پس اسماء سے یہی زمینی مخلوقات (مسمیات) اور ان کے فوائد، نقصانات، علامات، خواص اور کیفیات وغیرہ کا علم مراد لینا قرینِ قیاس ہوگا، اور یہ چیز فرشتوں کے بس کی نہیں ہے۔ فرشتہ کیا جانے کہ بھوک کیا ہے؟ پیاس کی حقیقت کیا ہے؟ اور نفسانی جذبات کیا ہیں؟ نکاح کیا ہے؟ طلاق کیا ہے؟ استراحت ونیند کسے کہتے ہیں؟ مرض کیا ہے؟ اس کا علاج

کیسے ہوگا؟ ''وغیر ذلک من الأمور والحوادث المستلزمة للأسماء والمسميات''۔

یادرہے! کہ خلافت ونیابت کے لئے ان تمام علوم کا جاننا اور معلوم کرنا ضروری ہے، جب یہ علوم ومعارف فرشتوں کے سامنے پیش ہوئے، اور انہیں تنبیہ کے ساتھ بتایا گیا کہ ان چیزوں کے نام خواص، آثار، وفوائد وغیرہ بتائیں! اگر تم سچے ہو اپنے دعویٰ میں، کہ تم سے دنیا میں کوئی بڑا عالم اور بابرکت معلم ہستی اور کوئی نہیں ہے۔ پس انہوں نے بلاغبار، کسی ضد وعناد کے بغیر بخوشی اعتراف کیا کہ ہمیں ان چیزوں کا علم حاصل نہیں ہے۔ ہم صرف وہی کچھ جانتے ہیں جو ہمیں بتایا گیا ہے، اور جس کی تعلیم دی گئی ہے۔ اے اللہ! تو ہی حقیقی جاننے والا اور حکمت والا ہے، اور تیری ذات ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ہے۔

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ علم کسبی بھی ہوتا ہے، اور وہبی بھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم کی فضیلت بے علم عابد پر زیادہ ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ علماء وطلبا اگر مطالعہ، تدریس وعظ ونصیحت کے شروع میں ''سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ'' پڑھا کریں، تو شرح صدر حاصل ہوگا۔

﴿قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ﴾ (فرمایا: اے آدم (علیہ السلام) فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتادو)۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلادو، یعنی لفظ ''اَنْۢبِـُٔوْنِيْ'' ارشاد فرمایا، کہ مجھے بتادو (امتحان مقصود تھا)، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا، تو لفظ ''اَنْۢبِئْهُمْ'' ارشاد فرمایا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں، یعنی معلم بن کر انہیں سکھائیں۔ تو آدم علیہ السلام نے استاد کی حیثیت سے انہیں بتلادیا، اور فرشتوں نے بحیثیت شاگرد اُن سے یہ اسماء سیکھ لئے۔ یہی چیز حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت و برتری پر حجت بنی۔

﴿فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ﴾ [الآية] جب آدم علیہ السلام نے انہیں ان چیزوں کے نام بتادیئے) تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہم نے تم سے یہی کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کی سب مخفی چیزیں ہمیں معلوم ہیں، اور میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس سے مراد ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ﴾ کا مضمون ہے، جسے فرشتوں نے برملا اظہار کر کے کہا تھا، اور ''وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ'' سے مراد

فرشتوں کا وہ قول ہے، جوانہوں نے آپس میں چپکے سے کہا تھا کہ: ''اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ بزرگ کوئی مخلوق پیدا نہیں فرمائے گا''۔[انوارالقران وغیرہ]

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جسد خاکی جب وادی نعمان میں کھڑا کیا گیا تھا، تو ابلیس ادھر سے گزرا، اور کہا کہ اس کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ پھر اس میں منہ کے راستے سے داخل ہوکر پیچھے کے راستہ سے باہر آیا، اور کہا کہ یہ مخلوق جو اندر سے (پیٹ مراد ہے) خالی ہے، کسی چیز سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکے گی، کیونکہ یہ اندر سے خالی ہے، اور اس کا پھسلانا میرے لئے بہت آسان ہے، پھر جو فرشتے ان کے ساتھ تھے ان سے ابلیس نے کہا کہ اگر اس کو تم سے افضل بنایا گیا، اور تمہیں اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا، تو بولو تم کیا کروگے؟ فرشتوں نے یک زبان ہوکر کہا: ہم اپنے ربّ جلیل کی اطاعت کریں گے۔ تو ابلیس نے اپنے دل میں کہا: خدا کی قسم! اگر (مجھے) اس پر مسلط کیا گیا، تو میں اسے تباہ و برباد کرکے چھوڑوں گا، اور اگر یہ مجھ پر مسلط ہوا، تو میں ہرگز اس کی کوئی بات نہیں مانوں گا، اور سرکشی کے سوا کچھ نہیں کروں گا۔ تو باری تعالیٰ عزّ شانہ نے فرمایا:

﴿وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ﴾ یعنی فرشتوں نے جو ہماری اطاعت وفرمانبرداری ظاہر کی، اسے ہم جانتے ہیں، اور شیطان مردود لعین نے جو کبر وسرکشی اور معصیت اپنے دل میں چھپا رکھی، اس سے بھی ہم واقف ہیں۔

فائدہ:

اس آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام جو انسانوں میں سب سے افضل اور خاص بندے ہیں وہ خاص اور افضل فرشتوں سے بھی اعلیٰ وافضل وبرگزیدہ ہیں۔

فرشتوں میں افضل وہ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے قاصد بن کر پیام رسانی کرتے ہیں۔ اہلسنت والجماعت کا یہی مذہب ہے، اور یہ جو علماء کرام نے کہا ہے کہ خواص بشر، یعنی اولیاء، اتقیاء، صلحاء، عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ یہ بات قرآن کریم سے ثابت نہیں۔ البتہ! احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بعض فرشتوں سے افضل ہے۔ [ابن ماجۃ]

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذرّیت کو پیدا فرمایا، تو ملائکہ نے عرض کیا: اے ربّ کریم! یہ تیرے بندے کھاتے پیتے، نکاح

کرتے اور سواری کرتے ہیں، اور ہم سب کے سب ان چیزوں سے پاک وصاف ہیں، تو انہیں دنیا کے ساتھ مخصوص کردے، اور ہمیں آخرت عطا فرما! تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بھلا! جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا (یعنی آدم علیہ السلام) اور اپنی روح کو اس میں پھونکا، تو اس مخلوق کو کس طرح اس مخلوق کے ساتھ برابر کردوں گا جو میرے حکم "کُن" کے کہتے ہی فوراً پیدا ہوگئی؟ (یعنی ملائکہ)۔ [رواه البيهقي في شعب الإيمان]

یہ بات قابلِ غور ہے کہ فرشتوں کے لئے نہ جنت ہے، نہ اس کی نعمتیں۔ اسی طرح حور وغلمان، اور جنت میں مؤمن بنی آدم اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے مشرف ہوں گے، جیسے فرمایا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [القيمة: ۲۳] (اس روز بہت سے چہرے رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محوِ دیدار ہوں گے)۔ اور کثرت کے ساتھ احادیثِ صحیحہ اس پر شاہد عدل ہیں۔ اور فرشتے اس نعمتِ عظمیٰ وغنیمتِ کبریٰ سے محروم رہیں گے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواصِ بشر ملائکہ سے افضل ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت جنت میں اولیاء کرام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کیونکہ اس رؤیت سے تمام جنتی مؤمن مشرف ہوں گے۔ البتہ! درجات کے تفاوت سے رؤیت میں تفاوت ہوگا، چنانچہ بعض کو تو صبح وشام نصیب ہوگی، اور بعض کو ہر جمعہ، بعض کو سال کے اندازہ پر ایک مرتبہ، اور بعض کو اس سے زیادہ مدت میں رؤیت نصیب ہوگی، تو اس سے عام ملائکہ پر تمام مؤمنین کی افضلیت لازم آتی ہے، خواہ وہ دنیوی اعمال کے لحاظ سے فاسق ہی ہوں، کیونکہ سب مؤمن خواہ فاسق وفاجر ہوں یا مطیع وفرمانبردار، عذاب بھگتنے کے بعد آخر کار جنت میں تو جائیں گے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال: ۷] (تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا)۔

سید کائنات ﷺ نے فرمایا: "مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَيْرٍ اَوْ مِنْ اِيْمَانٍ"۔ یعنی (جو شخص "لا اله الا الله" کہے، اور اس کے دل میں گیہوں کے دانہ برابر خیر یا ایمان ہو، تو وہ جہنم سے خلاصی پائے گا"۔ [متفق عليه من حديث أنس وأبي سعيد الخدري ﷺ] ایک دوسری روایت میں ہے کہ: "جو شخص لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہے، اور پھر اسی پر اس کی موت آجائے، تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوجائے گا، اگرچہ زنا اور چوری کرے، اگرچہ زنا اور چوری کرے، اگرچہ زنا اور چوری کرے، خواہ ابوذر (جندب ابن جنادہ رضی اللہ عنہ) ناراض ہی ہو، یہ شخص ضرور جنت میں جائے گا"۔ [متفق عليه واللفظ لمسلم عن أبي ذر الغفاري رضي الله عنه]

ظاہر ہے کہ فاسق کا معصوم سے افضل ہونا، نہ توعقلاً جائز ہے، اور نہ شرعاً، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ كَالۡمُجۡرِمِیۡنَ﴾ [القلم:۳۵] (کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح (نعمتوں سے) محروم کردیں گے؟)۔ اسی طرح ارشاد ہے:﴿اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ كَالۡفُجَّارِ﴾ [سورۃ ص:۲۸] (جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، کیا ان کو ہم ان کی طرح کردیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں، یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کردیں گے؟)۔

تو میں اس اشکال کے جواب میں کہتا ہوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ فساق عقاب وسزا کے بعد مغفرت پاکر جنت میں جائیں گے، اور وہ عذاب یا تو دنیا کی مصیبتوں سے کٹ جائے گا یا عذاب قبر وحشر اور دوزخ میں کٹ جائے گا، یا دنیا میں توبہ کرلیں گے، تو بلا عقاب چلے جائیں گے، اور بعض کو محض فضلِ باری تعالیٰ شاملِ حال ہوگا، نہ توبہ کریں گے، نہ عقاب ہوگا، اور جب مغفرت ہوگئی، تو نہ فسق رہے گا، نہ معصیت، بلکہ اولیاء، متقین اور صلحاء میں جاملیں گے، اگرچہ اولیاءِ کرام باعتبارِ مراتب ان سے زیادہ ہوں، تو اب مغفرت کے بعد نہ کوئی معصیت رہے گی، نہ فسق اور نہ ہی کوئی اور عیب۔ لہٰذا ان کی افضلیت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ [مظهري]

خلافتِ ارضی، دنیا کی ترقی وخوشحالی اور تعمیری مقاصد کے لئے جتنے وسائل، ذرائع وکمالات اور اقدار کی ضرورت تھی، وہ سب کے سب بشمولِ علوم ومعارف حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے فعلاً واستعداداً حضرت آدم علیہ السلام کے وجودِ مسعود میں ودیعت فرمائے، پھر انہیں اشرف وافضل مخلوق اور قابل واکمل خلیفہ کی حیثیت سے فرشتوں کے سامنے پیش کیا، تو ان کی عظیم علمی حیثیت کو دیکھ کر فرشتوں نے ان کی برتری کا بخوشی اعتراف کیا، پس انہیں آدم علیہ السلام کے حضور سجدۂ تعظیمی کا حکم ملا، جس کا بیان یہ ہے:

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی وَاسۡتَكۡبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس سب فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا، اور بڑا بنا (کبر وغرور کیا) اور تھا وہ کافروں میں سے ﴿۳۴﴾

معارف ومنازل

سجود کے معنی لغت میں ''تذلل'' یعنی فروتنی کے ہیں، اور اصطلاحِ شرع میں سجود کے معنی ''عبادت کے قصد سے زمین پر پیشانی رکھنے کے ہیں''۔ فرشتوں کو جس سجدہ کا حکم ہوا تھا یا تو اس سے مراد سجدۂ شرعیہ ہے، تو اس

وقت حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی مسجود ہوگا، اور حضرت آدم علیہ السلام کو محض عزت بڑھانے، اور ان کی فضیلت کا اقرار کرانے کے لئے قبلہ بنادیا گیا تھا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حدیث جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے سجدۂ شرعی مراد ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب ابن آدم سجدہ کی آیت پڑھتا ہے، اور سجدہ کرتا ہے، تو شیطان ایک گوشہ میں الگ جا کر روتا، اور کہتا ہے کہ افسوس! ابن آدم کو سجدہ کا حکم ملا، اس نے سجدہ کرکے جنت خرید لی، اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا، تو میں نے نافرمانی کی، اور حکم نہ مانا، میں جہنم میں جاؤں گا۔

اس تقدیر پر "لاٰدم" میں لام "إلی" کے معنی میں ہوگا، اور معنی یہ ہوگا کہ: "آدم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوکر (اس کی طرف) منہ کرکے ہمیں سجدہ کرو"۔ "فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ اِلٰی اٰدَمَ کَمَا یَسْجُدُ الْمُصَلِّیْ لِلّٰهِ اِلَی الْکَعْبَةِ"۔ جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے شعر میں ہے:

ألیس أول من صلی لقبلتكم ★ وأعرف الناس بالقرآن والسنن

یا یہ کہا جائے کہ فرشتوں سے چونکہ بظاہر حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے پر ایک اعتراض صادر ہوا تھا، اس لئے بطورِ توبہ کے ایک سجدہ ان کے ذمہ واجب ہوا، تو اس سجدہ کا سببِ بعید حضرت آدم علیہ السلام ہوئے، اس لئے "لاٰدم" فرمایا۔ تو اب آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ: "حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے ہمیں سجدہ کرو"۔ اس تقدیر پر "لاٰدم" میں لام سببیت کا ہوگا، جیسے کہ "صَلِّ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ"۔ (نماز پڑھ سورج ڈھلنے کے سبب) اس میں لام سببیت کا ہے۔

یا یہ کہا جائے کہ سجدۂ لغویہ مراد ہے، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے تحیہ کیا تھا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ قول صحیح تر، اور پختہ ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اس سجدہ میں فرشتوں نے زمین پر پیشانی نہیں رکھی تھی، بلکہ آدم علیہ السلام کے سامنے تعظیم کے لئے جھک گئے تھے، اور یہ سجدہ تعظیمی اس وقت نزولِ احکامِ شرع سے پہلے کا ہے۔ اب شریعتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں جس طرح غیر اللہ کے لئے سجدہ، خواہ کسی بڑی ہستی کے لئے ہو، یا عام کسی ادنیٰ چیز یا شخص کے لئے ہو، مطلقاً حرام ہے۔

قرآن کریم نے اعلان فرمایا: ﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ [فصلت: ۳۷] (تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو، اور نہ چاند کو، بلکہ خدا ہی کو سجدہ کرو، جس

نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے، اگر تم کو اس کی عبادت منظور ہے)۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا: "لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا"۔ [مشکوۃ]
جب کسی مخلوق کے لئے سجدہ جائز کی اجازت وگنجائش نہیں ہے، تو ہر قسم کا سجدہ لغیر اللہ ممنوع وحرام قرار پایا، اور یہ غایت تذلّل وعاجزی والا سجدہ (عبادت) صرف حضرت حق سبحانہ کے ساتھ مختص ومخصوص ہے۔ الحمد للہ رب العلمین

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ﴾ [الأعراف:١١] (پھر فرشتوں کو حکم دیا آدم کے آگے سجدہ کرو تو (سب نے) سجدہ کیا، لیکن ابلیس کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں (شامل) نہ ہوا)۔

اسی طرح قولہ تعالی: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ﴾ [الحجر:٣١] (تو فرشتے تو سب کے سب سجدے میں گر پڑے، مگر شیطان کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کردیا)۔

سورۃ الکہف میں ارشاد ہے: ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ [الکہف:٥٠] (اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس (نے نہ کیا) وہ جنات میں سے تھا، تو اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہوگیا)۔ اسی طرح ارشاد ہے: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [ص:٧٤] (پس سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے گھمنڈ کر کے نہ مانا (اور وہ علمِ الٰہی میں پہلے ہی) کافروں میں سے تھا)۔

امرِ الٰہی، یعنی سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ:

اللہ تعالیٰ اگرچہ عالمُ الغیب، اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے، اور ماضی، حال اور استقبال سب اس کے لئے یکساں ہیں، مگر اس نے امتحان وآزمائش کے لئے ابلیس (شیطان) سے سوال کیا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ [الأعراف:١٢] (خدا نے فرمایا) جب میں نے تجھ کو حکم دیا تو کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا؟۔ ابلیس نے جواب دیا: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ [الأعراف:١٢] (اس نے کہا کہ میں اس سے افضل ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے، اور اسے مٹی سے بنایا ہے)۔

شیطان کا مقصد یہ تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں، اس لئے کہ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے، اور آگ بلندی و

رفعت چاہتی ہے، اور آدم مخلوقِ خاکی ہے۔ بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت؟ اے خدایا! پھر یہ تیرا حکم کہ ناری خاکی کو سجدہ کرے، کیا انصاف پر مبنی ہے؟ میں ہر حالت میں آدم سے بہتر ہوں، لہٰذا وہ مجھے سجدہ کرے، نہ کہ میں اس کے سامنے سربسجود ہوں، مگر بد بخت شیطان اپنے غرور وتکبر میں یہ بھول گیا کہ جب میں اور آدم دونوں خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں، تو مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی، مگر وہ اپنی تمکنت اور گھمنڈ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر رہا کہ مرتبہ کی بلندی وپستی اس مادّہ کی بنا پر نہیں ہے، جس سے کسی مخلوق کا خمیر تیار کیا گیا ہے، بلکہ اس کی اُن صفات پر مبنی ہے، جو خالقِ کائنات نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

فرمایا: جب تم نے اپنی جہالت وسرکشی کی بنیاد پر بندگی کے تمام آداب واقدار کی خلاف ورزی کی تو تُو اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ودائمی ہلاکت کا مستحق بنا، اور یہی تیرے غرور وسرکشی کی قدرتی پاداش ہے۔ پس جاؤ! میری رحمتوں سے محروم ہو کر ابدی ذلّت کی وادی میں غرق ہو جاؤ!۔

ابلیس کی طلبِ مہلت:

ابلیس کی درخواست اور اس کی منظوری کا فرمانِ الٰہی، قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ۝۱۴
قَالَ اِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ۝۱۵ قَالَ فَبِمَاۤ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ۝۱۶ ثُمَّ
لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ‌ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ
شٰكِرِيۡنَ۝۱۷ قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا‌ ؕ لَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ
اَجۡمَعِيۡنَ۝۱۸ ﴾ [الأعراف] (اس نے کہا: مجھے اس دن تک مہلت دیدے جس دن لوگوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ اللہ نے فرمایا: تجھے مہلت دے دی گئی۔ کہنے لگا: اب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، اس لئے میں قسم کھاتا ہوں کہ ان (انسانوں) کی گھات لگا کر تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ رہوں گا۔ پھر میں ان پر حملے کروں گا، ان کے سامنے سے بھی، اور ان کے پیچھے سے بھی، اور ان کی دائیں طرف سے بھی، اور ان کی بائیں طرف سے بھی، اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔ اللہ نے کہا: نکل جا یہاں سے، ذلیل اور مردار ہو کر، ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا (وہ بھی تیرا ساتھی ہوگا) اور میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا)۔

ابلیس نے جب دیکھا کہ خالقِ کائنات کے حکم کی خلاف ورزی، تکبر ورعونت اور خدا تعالیٰ پر ظلم کے الزام نے مجھ کو ہمیشہ کے لئے ربّ العلمین کی آغوشِ رحمت اور فیضانِ کرم سے مردود ومبغوض، اور جنت سے محروم کر دیا، تو

توبہ اور ندامت کی بجائے اللہ تعالیٰ شانہ سے اس نے یہ استدعاء کی کہ تاقیامِ قیامت مجھ کو مہلت عطا فرما، اور اس طویل مدتِ حیات کے لئے میری زندگی کی رسی کو دراز کردے۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا، لہٰذا اس کی درخواست منظور کرلی گئی، اور اُسے مہلت دے دی گئی۔ یہ سن کر اب اس نے پھر ایک مرتبہ اپنی شیطنت کا مکمل مظاہرہ کیا، اور کہنے لگا: جب تو نے مجھ کو راندۂ درگاہ کرہی دیا، تو جس آدم کی وجہ سے مجھے یہ ابدی رسوائی و ذلّت نصیب ہوئی، میں بھی اپنی پوری قوت اور طاقت سے اولادِ آدم کی راہ ماردوں گا، اور ان کے پس وپیش، اردگرد پر چار جانب سے ان کو گمراہ کرتا رہوں گا، اور ان کی اکثریت کو تیرا ناسپاس اور ناشکر بنا کر چھوڑوں گا۔ البتہ! تیرے مخلص بندے میرے اغواء کے تیر سے متأثر نہ ہوسکیں گے اور ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم کو اس کی کیا پرواہ؟ ہماری فطرت کا قانون ''مکافاتِ عمل''، ''وپاداشِ عمل'' اٹل پختہ قانون ہے، پس ''جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا''۔ اور جو بنی آدم مجھ سے روگردانی کرکے تیری پیروی کرے گا، وہ تیرے ہی ساتھ عذابِ الٰہی (جہنم) کا سزاوار ہوگا۔ جا! اپنی ذلّت و رسوائی اور شومیٔ قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہوجا، اور اپنی اور اپنے پیروؤں (ماننے والوں) کی ابدی لعنت (جہنم) کا منتظر رہ۔

فائدہ:

اللہ تعالیٰ شانہ نے سجدہ کا جو حکم دیا تھا، وہ فرشتوں کو دیا تھا، اور ابلیس جب فرشتوں کی جنس میں داخل نہیں، تو پھر اس پر عتابِ الٰہی کیوں ہوا؟ اور وہ نافرمانی کا مرتکب کیوں قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ابلیس ملائکہ کی جنس سے نہ تھا، قرآن کریم میں تصریح ہے: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ [الکھف: ۵۰] (وہ جنات میں سے تھا، پس اپنے ربّ کے حکم سے نکل گیا)۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا، تو اس وقت وہ اس مجلس میں موجود تھا، اور وہ بھی دیگر مخلوقات کی طرح اس حکم کا مخاطب تھا، اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ فرمایا، اور اس سے دریافت کیا کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو اس نے یہ جواب نہیں دیا کہ مجھے امر نہیں ہوا، کیونکہ میرا شمار فرشتوں میں نہیں ہے، بلکہ ازراہِ گھمنڈ وغرور کہا: کہ میں آدم سے بہتر ہوں، اس لئے سجدہ سے باز رہا۔ یہی اصلی جواب ہے۔ کماھو الظاھر۔

ایک قابلِ ذکر بات:

یہاں یہ مسئلہ قابلِ ذکر ہے کہ جب ابلیس جنت سے مردود ہوکر نکلا، یا نکال دیا گیا، تو پھر اس نے حضرت آدم

وحواء علیہا السلام کو کس طرح بہکایا، اور دھوکہ دیا؟ علماء کرام مفسرین حضرات سے اس کے دو جواب منقول ہیں، اور وہ دونوں کسی تأویل کے بغیر چسپاں ہیں:

(۱) اگرچہ ابلیس کو جنت سے نکال دیا گیا، لیکن پھر بھی اس کا ایک گنہگار اور نابکار مخلوق کی حیثیت میں جنت کے اندر داخل ہونا اس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے، اس لئے اس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدم وحواء علیہما السلام سے یہ گفتگو کی، اور جھوٹی قسمیں کھا کر ان کو لغزش میں ڈال دیا۔ آیت ﴿اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا﴾ [البقرۃ: ۳۸] (سب جنت سے نیچے اترو) اسی کی تائید کرتی ہے، کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اس کا جنت میں داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

(۲) جنت سے باہر رہ کر اندر وسوسہ ڈالنے کا حیلہ چلایا، جس طرح ایک آواز ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعے زیادہ سے زیادہ دور تک جا سکتی ہے، یا جس طرح وائرلیس میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل دور تک پہنچایا جا سکتا ہے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ قربت یا بالمشافہہ مخاطبت کے بغیر ہی شیطان کا وسوسہ نفسِ انسانی تک پہنچ جائے، اور اس پر اثر انداز ہو۔ تب واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ شیطان نے جنت سے باہر رہ کر حضرت آدم وحواء علیہما السلام کے قلوب میں یہ وسوسہ ڈالا، اور ان کو بہکانے کی کوشش کی، آیت ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ [الأعراف: ۲۰] (پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا) سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بائبل وغیرہ میں اس واقعہ کے متعلق جو منگھڑت، بے بنیاد اور غیر موزوں واقعات مذکور ہیں، مثلاً سانپ یا طاؤس کا قصہ، یا اسی قسم کی اور باتیں، جو قرآن کریم اور صحیح روایات میں نہیں پائی جاتیں، یہ سب اسرائیلیات ہیں، اور بے اصل ہیں، جنہیں بہت سے لوگوں نے نقل کیا، اور اعتماد کر کے کتبِ تفسیر میں لکھ دیا، ان بے بنیاد باتوں کی پشت پر نہ علمِ یقین اور علمِ صحیح (وحی الٰہی) کی سند ہے، اور نہ عقل وتاریخ کی شہادت۔

۞ ۞ ۞

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶

ترجمہ: اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو! اور تم دونوں اس میں سے وسعت اور کشاد

گی سے کھاؤ۔ جہاں سے بھی چاہو، اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، پس ہو جاؤ گے، تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ۝۳۵ پس پھسلایا ان دونوں کو شیطان نے اس سے، پس ان کو نکالا اس نعمت سے جس کے اندر وہ تھے، اور ہم نے کہا: اتر جاؤ! بعض تمہارے بعض کے لئے دشمن ہیں، اور تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے، اور ایک مدت تک نفع اٹھانے کا موقع ہے ۝۳۶

معارف ومنازل

﴿هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ اس درخت کا تعین قرآن حکیم نے نہیں بتایا، اور کسی مرفوع حدیث میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس کو اپنے عموم پر چھوڑا جائے۔ یہی قول امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ البتہ! دوسرے علماء نے مختلف قرائن سے اس کی تعیین کی ہے۔ حضرت ابن مسعود، ابن عباس، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم اور جعدہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ انگور کا درخت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو مالک اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے گندم کا درخت بتایا، اور یہی سب سے مشہور قول ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے بعض صحابہؓ سے روایت کی کہ یہ درخت انجیر کا تھا۔ امام سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ بعضوں نے کھجور کا درخت بتایا، بعضوں نے سنگترہ کا۔ واللہ اعلم

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنا مشاہدہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے مصر میں اتنا بڑا سنگترہ دیکھا، جسے دو ٹکڑے کر کے بڑی مشکل سے اونٹ پر لادا گیا۔ وغیر ذلک من الأقوال والراجح هو الأول۔ [قرطبي وغيره]

سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کا قیامِ جنت اور حضرت حواء کی زوجیت:

حضرت آدم علیہ السلام ایک عرصہ تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے، مگر اپنی زندگی اور راحت وسکون میں ایک وحشت اور خلاء محسوس کرتے تھے، اور ان کی طبیعت اور فطرت کسی مونس وہمدم کی جویا نظر آتی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت حواء کو پیدا فرمایا، اور حضرت آدم علیہ السلام ان کو اپنا ہمدم ورفیق پا کر بے حد مسرور ہوئے، اور اطمینانِ قلب محسوس کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوائؑ کو اجازت تھی کہ وہ جنت میں رہیں سہیں۔ اور اس کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائیں، مگر ایک درخت کو معین کر کے بتایا گیا کہ اس کو نہ کھائیں، بلکہ اس کے پاس تک نہ جائیں۔

حضرت آدم وحواء علیہما السلام کا جنت سے نکلنا:

اب ابلیس کو ایک اور موقعہ ہاتھ آیا، اور اس نے حضرت آدم وحواء علیہما السلام کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجرہ "شجرۃ الخلد" ہے، اس کا میوہ کھانا جنت میں ابدی وسرمدی آرام وسکونت اور قربِ الٰہی کا ضامن ہے۔ اور قسمیں

کھا کران کو باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوں۔ یہ سن کر حضرت آدم علیہ السلام کے بشری و انسانی خواص میں سب سے پہلے نسیان (بھول چوک) نے ظہور کیا، اور وہ فراموش کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم، حکمِ امتناعی تھا، نہ کہ مُربّیانہ مشورہ، اور آخر کار جنت کے دائمی قیام اور قربِ الٰہی کے عزم میں لغزش پیدا کر دی، اور انہوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا، اس کا کھانا ہی تھا کہ بشری لوازم ابھرنے لگے، دیکھا تو ننگے ہیں، لباس سے محروم، جلدی جلدی (آدم وحواء علیہما السلام) دونوں پتوں سے ستر ڈھانکنے لگے، گویا انسانی تمدن کا یہ آغاز تھا، کہ اس نے تن ڈھانکنے کے لئے سب سے پہلے درخت کے پتوں کو استعمال کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا کہ رب العزت جلّ شانہ کا عتاب نازل ہوا۔ آدم علیہ السلام سے باز پرس شروع ہوئی کہ ممانعت کے باوجود یہ عدولِ حکمی کیسی؟ آدم علیہ السلام آخر آدم تھے، مقبول بارگاہِ الٰہی تھے، اس لئے شیطان کی طرح مناظرہ نہیں کیا، اپنی غلطی کو تاویلات کے پردے میں چھپانے کی سعی نامشکور سے باز رہے، ندامت اور شرمساری کے ساتھ اقرار کیا کہ غلطی ضرور ہوئی، لیکن اس کا سبب تمرّد اور سرکشی نہیں ہے، بلکہ بشریت کی بھول چوک اس کا باعث بنی ہے، تاہم غلطی تو ہے، اس لئے توبہ واستغفار کرتے ہوئے عفو و درگزر کا خواستگار ہوں۔ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ﴾ [الأعراف: ۲۳] (دونوں عرض کرنے لگے کہ پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا، تو ہم تباہ ہو جائیں گے)۔

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے اس عذر کو قبول فرما لیا، اور معافی دے دی، مگر وقت آ گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام خداوند تعالیٰ کی زمین پر ''حقِ خلافت'' ادا کریں، اس لئے بتقاضائے حکمت ساتھ ہی یہ فیصلہ سنایا کہ تم کو اور تمہاری اولاد کو ایک معین وقت تک زمین پر قیام کرنا ہوگا۔ تمہارا دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامانِ عداوت وحسد کے ساتھ وہاں موجود رہے گا، اور تم کو اس طرح ملکوتی اور طاغوتی دو متضاد طاقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوگی۔ تم اور تمہاری اولاد اگر مخلص بندے اور سچے نائب ثابت ہوئے، تو تمہارا اصلی وطن ''جنت'' ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملکیت میں دے دیا جائے گا، لہٰذا تم اور حواء دونوں یہاں سے فوراً جاؤ، اور میری زمین پر جا کر بسر کرو، اور اپنی مقررہ زندگی تک حقِ عبودیت ادا کرتے رہو۔ [قصص القرآن]

حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کا سبب:

آئندہ سطور میں ہم ذکر کریں گے کہ اَکلِ شجرہ حضرت آدم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی تھی، چونکہ اجتہادی غلطی کا

تعلق قصد وعزم کے ساتھ مربوط ہے، اس لئے محققین علماء نے اسے پسند نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ نسیان سے ہوا، جیسے ارشاد ربانی ہے: ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ [طٰہٰ:۱۱۵] (مگر وہ (اسے) بھول گئے، اور ہم نے ان میں صبر وثبات نہ دیکھا)۔

یہ بات واضح ہے کہ نسیان معاف ہے، اور نسیان کے ساتھ کھانے سے حکمِ عدولی نہ ہوگی، جس طرح رمضان شریف میں اگر بھول کر کھا پی لیا جائے، تو روزہ نہیں ٹوٹتا، روزہ بھی باقی رہتا ہے، اور گناہ بھی نہیں ہوتا۔ اگر گناہ تسلیم ہو تو پھر اس آیت کریمہ کا مطلب کیا ہوگا؟ فرمایا: ﴿ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ﴾ [طٰہٰ:۱۲۲] (پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی، اور سیدھی راہ بتائی)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اگر جرم کیا ہوتا، تو ''مجتبیٰ'' کیسے بنتے؟ توبہ ایک الگ عبادت ہے، اس کے لئے جرم کا صادر ہونا ضروری نہیں ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ہر روز ستر مرتبہ استغفار پڑھتا ہوں۔ [متفق علیہ] کیا یہ ستر مرتبہ کا استغفار کسی گناہ کی وجہ سے ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ بطورِ عبادت وإنابت ہے۔

ابوالبشر، سیّدنا حضرت آدم علیہ السلام:

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ سیدنا آدم علیہ السلام کا ہے، جو ''سورۃ بقرۃ، أعراف، إسراء، کہف اور طٰہٰ'' میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ، اور سورۃ حجر وصٓ میں فقط ذکرِ صفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور سورۃ آل عمران، مائدۃ، مریم اور یسٓ میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ اور نام قرآن مجید میں پچیس مرتبہ پچیس آیتوں اور نو سورتوں میں مذکور ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ۵ آل عمران میں ۲ مرتبہ، سورۃ المائدۃ میں ایک، سورۃ الأعراف میں ۷، سورۃ الإسراء میں ۲، سورۃ الکہف ومریم میں ایک ایک، سورۃ طٰہٰ میں ۵، سورۃ یسٓ میں ایک مرتبہ، جبکہ سورۃ الحجر وصٓ میں صفات کے ساتھ ان کا تذکرہ ہے۔

حافظ بدرالدین عینی رحمہ اللہ عمدۃ القاری جلد ہفتم میں رقمطراز ہیں کہ آپ علیہ السلام کی کنیت ابومحمد ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ اور کسی کو کنیت سے یاد نہیں کیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت رسالت مآب حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اظہارِ شرف کے لئے ''ابومحمد'' ہوگی۔ (مناسبت نہایت واضح اور ظاہر ہے)۔

لفظِ ''آدم'' کے متعلق علماءِ لغت میں اختلاف ہے، کہ یہ عجمی ہے یا عربی۔ ابومنصور جوالیقیؒ نے کتاب المعرب میں تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام اسماء عجمی ہیں۔ البتہ! چار نام اس سے مستثنیٰ ہیں: آدم، صالح، شعیب، محمد علیہم الصلوۃ والسلام۔ جوہریؒ نے بھی اس کو عربی نام بتایا ہے۔ عربی ہونے کی صورت میں اس کا اشتقاق یا تو ''اُدیم'' سے ہے، کیونکہ وہ "أديم أرض" یعنی صفحۂ زمین سے پیدا کئے گئے ہیں۔

چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور ترمذی کی حدیث صحیح میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سطحِ زمین کے چپہ چپہ سے ایک مشت خاک لے کر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی، یہی وجہ ہے کہ بنی آدم مختلف رنگ وروپ کے پیدا ہوئے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ''آدم'' کا اشتقاق اُدمۃٌ سے ہے، جس کے معنی گندم گوں ہونے کے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ اَدْم، اور اُدْمۃٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی موافقت اور شرکت کے ہیں، چونکہ ان کا خمیر مٹی اور پانی سے ملا کر کیا گیا ہے، اس لئے ان کا نام آدم ہوا۔

بعض کے نزدیک اَدَمَۃ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ''قابلِ تقلید ولائقِ اتباع'' کے ہیں۔ عربی ہونے کی صورت میں یہ "أفعَل" کے وزن پر ہوگا، علمیت اور وزنِ فعل کی وجہ سے غیر منصرف ہوگا۔ بعض علماء آدم کو سریانی لفظ بتاتے ہیں۔ اہلِ کتاب اس کو الف کے مدّ اور دال کے طول کے ساتھ ''آدام'' بروزن فاعال پڑھتے ہیں۔ ابواسحاق ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ عبرانی زبان میں ''آدام'' خاک کو کہتے ہیں، اسی مناسبت سے ان کا نام آدم خاکی ہوا، اور دوسرا الف حذف کر دیا گیا، اس اعتبار سے ثعلبیؒ کے نزدیک یہ لفظ عبرانی ہوا۔ [عمدة القاري]

حضرت آدم علیہ السلام پہلے نبی اور رسول تھے۔ نبی اس ہستی کو کہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہو، اور رسول اس نبی کو کہا جاتا ہے جس پر نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو۔ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت رسالتماب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد دریافت کی، تو آپؐ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ پھر سوال کیا: ان میں رسول کتنے ہیں؟ فرمایا: تین سو تیرہ۔ میں نے عرض کیا: ان میں اوّل کون ہیں؟ فرمایا: آدم۔ میں نے کہا: آدم نبی مرسل تھے؟ فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، پھر ان میں روح پھونکی، پھر اپنے سامنے ان کو درست کیا۔

حافظ بدرالدین عینیؒ نے شرح بخاری میں نوح علیہ السلام کے تذکرہ میں حدیثِ شفاعت پر بحث کرتے ہوئے صاف لکھا ہے: "اَلصَّحِيْحُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ رَسُوْلٌ وَ قَدْ نَزَلَ عَلَيْهِ جِبْرَئِيْلُ وَ اَنْزَلَ عَلَيْهِ صُحُفًا وَ عَلَّمَ اَوْلَادَهُ الشَّرَائِعَ"۔

یعنی صحیح یہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی اور رسول تھے، آپؑ پر جبریل علیہ السلام نازل ہوئے، اور آپؑ پر صحیفے اتارے گئے، اور آپؑ نے اپنی اولاد کو شریعت کی تعلیم دی۔ [عمدة القاري]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ابلیس کے کہنے پر حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے ایک بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا تھا، یہ محض افتراء بے بنیاد اور بے سند بات ہے۔ اسی طرح سانپ اور مور کا قصہ، اسی قسم کی اور باتیں جو قرآن عظیم اور حدیثوں میں موجود نہیں ہیں، یہ سب اسرائیلی افسانے ہیں، لہٰذا انہیں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔ [البداية والنهاية]

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کو ہوئی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"خير يوم طلعت عليه الشمس يوم الجمعة فيه خُلق أدم وفيه أدخل الجنة وفيه أخرج منها ولا تقوم الساعة إلا في يوم الجمعة"۔ [رواه مسلم]

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے روز بعد العصر قبل المغرب ہوئی۔ ایک ہزار سال یا نو سو ساٹھ سال بعد مکۃ المکرمۃ میں آپؑ کی وفات ہوئی۔ تجہیز و تکفین میں حضرت جبریل علیہ السلام فرشتوں کے جم غفیر کے ساتھ حاضر ہوئے۔ نمازِ جنازہ حضرت شیث علیہ السلام نے، اور بقولِ بعض حضرت جبریل علیہ السلام نے پڑھائی۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ دو مرتبہ نمازِ جنازہ کا اہتمام ہوا: ایک مرتبہ حضرت شیث علیہ السلام (جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ اور جانشین تھے) نے امامت کی۔ دوسری مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام نے فرشتوں کے ساتھ مل کر امامت کی، اور چار تکبیریں کہیں۔ تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ بعض مورخین نے چار سو لکھا ہے، پہلا قول راجح ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات حضرت حواء علیہا السلام کی وفات سے پہلے ہے۔ حضرت حواء علیہا السلام کی وفات ایک سال بعد ہے۔ ان کی قبر جدہ کے مشہور قبرستان کے قریب اب بھی نمایاں اور موجود ہے۔ جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر منیٰ شریف میں واقع مسجد خیف کی چار دیواری کے صحن میں واقع غیر نمایاں ہے۔ جو لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر جبلِ ابوقبیس اور کوہِ صفاء کے درمیان بتاتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قبر بھی مسجد خیف میں حضرت آدم علیہ السلام کی قبر کے پہلو میں ہے۔ واللہ اعلم

بعض مؤرخین نے کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر "سراندیب" ہندوستان میں ہے۔ بعضوں نے جبل أبو قبيس، اور بعض نے بیت المقدس بتایا ہے۔ مگر راجح مسجد خیف منیٰ والا قول ہے۔ [ابن كثير، البداية]

یہ بات کتبِ تاریخ میں عموماً بغیر کسی اختلاف کے شہرت کے درجہ میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب جنت سے نکل کر کرۂ ارضی پر قدم رکھا، تو انہیں ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ نے کعبۃ اللہ شریف کی تعمیر کا حکم دے دیا، انہوں نے فرشتوں کی معیت وتعاون واشتراک سے کعبہ شریف کی تعمیر مکمل کر لی، اور کعبہ کے مشرقی کونے میں حجر اسود نصب کیا، جسے حضرت جبریل علیہ السلام جنت سے لائے، جو برف کی طرح سفید تھا، پھر انسانوں کے گناہوں سے وہ سیاہ ہو گیا، اور مسلسل بلا ناغہ فریضہ حج ادا کرتے رہے۔

البتہ! یہ بات قدرے اختلافی اور غیر واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے مستقل سکونت اور رہائش کس علاقہ، اور کس سرزمین میں اختیار کی؟ اس سلسلے میں "سراندیب" اور "حجاز" یعنی شامیوں کے متعلق اقوال موجود ہیں۔

حضرت ہابیل علیہ السلام کی قبر کے متعلق بعض مؤرخین کا قول ہے کہ وہ دمشق (شام) کے مضافات میں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قیام شام کے مضافات میں بھی رہا۔ بہر حال! قرآن وسنت نے اس کی نشاندہی کہیں بھی نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم

فائدہ:

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے دن ہوئی، مگر راجح قول یہ ہے کہ یہ جمعہ تخلیقِ سماوات وارض کے "ستۃ أیام" سے غیر معینہ مدت ہزاروں لاکھوں سال بعد ہے۔ کچھ لوگوں نے جو یہ لکھا اور کہا ہے کہ ہفتہ سے جمعرات تک آسمانوں اور زمینوں کی چھ روز میں تخلیق مکمل ہوئی، اور اسی ہفتہ کے جمعہ کو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، غلط اور بے بنیاد ہے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے زمینوں پر جنات کا بود وباش اور راج قائم رہا۔ جنات نے کرۂ ارضی کو فسق وفجور اور فساد سے بھر دیا تھا، تب عالمِ بالا کے فرشتوں نے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے جنات کو مار مار کر تباہ کیا، اور بقایا کو سمندروں، جزائر اور دور دراز جنگلوں میں لے جا کر جلاوطن اور محصور کر دیا۔

فتأمل فإنه دقيق۔

ازلی عہد و پیمان اور عہد "الست" کا زمانہ:

جب حضرت حق سبحانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا فیصلہ فرمایا، تو ان کے مجسمے کو اپنے دستِ قدرت اور حکم وفرمان سے وادی نعمان، یعنی عرفات وطائف کے درمیانی وادی میں تیار کرایا، اور اس میں چالیس روز کے بعد اپنی روح پھونکی (کمامر) اسی موقع پر وہ مشہور عہد ومیثاق لیا گیا، جس کا تذکرہ سورۃ اعراف آیت (۱۷۲) میں ہے، **قوله**

تعالی:﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی ۚۛ شَهِدْنَا ۚۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ﴾[الأعراف] (اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے، یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی تو ان سے خود ان کے مقابلے میں اقرار کرا لیا (یعنی ان سے پوچھا کہ) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے: کیوں نہیں، ہم گواہ ہیں (کہ تو ہمارا پروردگار ہے)۔ یہ اقرار اس لیے کرایا تھا کہ قیامت کے دن (کہیں یوں نہ) کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمانے کے بعد ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا، تو جو انسان ان کی نسل سے قیامت تک پیدا ہونے والے تھے، وہ برآمد ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی ایک چمک پیدا کر دی، پھر سب کو آدم علیہ السلام کے روبرو کیا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے ربّ! یہ کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تیری اولاد ہیں۔ آدم علیہ السلام نے ان میں سے ایک شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان واضح چمک دیکھی، تو وہ ان کو بہت اچھا معلوم ہوا، تو عرض کرنے لگے: اے پروردگار! یہ کون ہے؟ جواب ملا، یہ داؤد ہے۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا: اس کی عمر کتنی ہے؟ جواب ملا: ساٹھ سال۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ میری عمر میں سے چالیس سال اس کو عطا فرمایا جاوے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے منظور فرمالیا۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی عمر جب پوری ہوگئی، صرف وہی چالیس برس رہ گئے، جو انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دیئے تھے، ملک الموت حاضر ہوا، تو آدم علیہ السلام نے کہا کہ ابھی میری عمر کے چالیس برس باقی ہیں، ملک الموت نے کہا: کیا آپؑ نے اپنے بیٹے داؤد کو چالیس برس نہیں دیئے تھے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا، نہیں مانا، اسی لئے ان کی اولاد بھی (کئے ہوئے وعدے کا) انکار کرتی ہے، اور آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھول کر ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا تھا، اسی لئے ان کی اولاد بھی بھولتی، اور فراموش کرتی ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے خطاء کی تھی، اس لئے ان کی اولاد بھی خطاء کرتی ہے۔ [ترمذي]

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے روایت کی، فرمایا حضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: اللہ تعالیٰ عزّ سبحانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت پیدا فرمایا تو ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا، جس سے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کی (ساری) گوری نسل نکل پڑی، اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کوئلہ کی طرح سیاہ نسل نکل پڑی۔ دائیں طرف والوں کے

متعلق فرمایا: یہ جنت کی طرف جانے والے ہیں، اور مجھے ان کی اطاعت کی پروانہیں ہے، اور بائیں شانہ والوں کے متعلق فرمایا: یہ دوزخ کی طرف جانے والے ہیں، اور مجھے ان کی نافرمانی کی پروانہیں ہے۔[رواہ أحمدوغیرہ]

ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ پھر ''اللہ تعالیٰ نے سب کو آدم کی پشت میں لوٹا دیا''۔اسی طرح کی روایت حضرت عمر فاروق، حضرت اُبی بن کعب، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم ودیگر صحابہ کرامؓ سے منقول ہے، جنہیں مختلف ائمہ حدیث نے تخریج کی ہے۔[مظھري وغیرہ] صحیح اورراجح یہی قول ہے، اور قرینِ قیاس بھی ہے کہ مذکورہ عہد ومثیاق حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعدان کے دخول جنت سے پہلے لیا گیا۔بعض مفسرین نے اس عہد ومیثاق کو ہُبُوط (نزول واخراج) جنت کے بعد بتایا ہے، شاید یہ قول کمزور اور مرجوح ہی ہو۔ واللہ اعلم

اب حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کا جہاں تک تعلق ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کہہ کران کو جومنع کیا گیاتھا، وہ ایک خاص درخت مراد نہ تھا، بلکہ اس قسم (نوع) کے تمام درخت مراد تھے۔حضرت آدم وحواء علیہما السلام سمجھے کہ وہی ایک معین درخت ہی مراد ہے۔ادھر سے شیطان نے بھی یہی وسوسہ اور شبہ ذہن نشین کرایا، اور طرح طرح کی قسمیں کھا کر باور کرایا کہ میں تمہارا ہمدردوخیر خواہ ہوں، میں ہرگز تمہیں کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔آپ اس درخت (هذه الشجرة) کو چھوڑ کر بلاشبہ دوسرا درخت استعمال کر سکتے ہیں۔

یااس ممانعت کووقتی رکاوٹ پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھایا ہو کہ شروع میں بچپن کی وجہ سے آپ میں اس کی طاقت وبرداشت نہ تھی، لیکن اب وہ بات نہیں رہی، اس لئے ممانعت بھی باقی نہیں رہی، یا انہیں یہ بتلایا ہو کہ آبِ حیات کی طرح یہ شجرۃ الخلد (سدابہار) درخت ہے، یہ اپنے کھانے والے کو ہمیشہ سدابہار، ابدی ودائمی جنت کا قیام بخشے گا، تب وہ دونوں ہر قسم کی فرمائشوں کو بھول گئے، کیونکہ یہ چیز ان کی اصلی فطرت میں شامل تھی، ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ [النساء:۲۸] (انسان کو ضعیف پیدا کیا گیا ہے)۔ ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبياء:۳۷] (انسان جلد بازی کی خصلت لے کر پیدا ہوا ہے)۔وہ یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً منع کیا تھا، کوئی قید نہیں لگائی تھی، چنانچہ قرآن حکیم نے یہی ارشاد فرمایا: ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [طه:۱۱۵] (مگروہ (اسے) بھول گئے، اور ہم نے ان میں صبر وثبات نہ دیکھا)۔جان بوجھ کرانہوں نے یہ غلطی نہیں کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ انہوں نے دانستہ طور پر نافرمانی نہیں کی، بلکہ بھول گئے، سہوونسیان ہوگیا، زیادہ سے زیادہ اس کو اجتہادی غلطی کہہ سکتے ہیں، اور اجتہادی غلطی جرم نہیں ہے، اور نہ ہی گناہ ہے، مگر ''حسنات الأبرار سیآت

المقربین" کے پیش نظر چونکہ حضرت آدم علیہ السلام پر جوپے در پے انعامات واحسانات ہوئے، اوران کا بڑا اعزاز د اکرام ہوتا رہا، پس ان کی جلالتِ شان کی وجہ سے یہ اجتہادی غلطی بھی بڑی سمجھی گئی، کیونکہ بڑوں کی چھوٹی غلطی بھی بڑی سمجھی جاتی ہے۔اس لئے "عَصٰی وَغَوٰی" کا اطلاق ہونے لگا، اوراس غلطی کو معصیت وغوایت کا نام دیا گیا کہ انہوں نے اپنی جلالتِ شان کے ہوتے ہوئے کیوں ایسی غلطی کا ارتکاب کیا؟

قضاء مبرم میں تبدیلی نہیں ہوسکتی:

سبحان اللہ وبحمدہ یہ حکمت واستخلاف في الأرض کے پیشِ نظر قضاءِ مبرم تھا، جوکسی بھی صورت میں تبدیل نہیں ہوسکتا تھا، جس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں کہا تھا: میری تخلیق سے چالیس سال پہلے تورات میں یہی لکھا ہوا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام شجرۂ ممنوعہ کھا کر اس کی پاداش میں جنت سے نکالے جائیں گے۔[مشکوٰۃ]

﴿فَاَخۡرَجَهُمَا﴾ شیطان چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا تھا، اس لئے جوشِ انتقام کی وجہ سے خار کھائے ہوئے تھا، اوردل میں پختہ ارادہ کیا ہوا تھا کہ جس طرح تمہاری وجہ سے میں جنت سے محروم ہوکر نکال دیا گیا ہوں، تمہیں بھی نکال کردم لوں گا۔

ع ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

﴿فَاَخۡرَجَهُمَا﴾ کی نسبت مجازاً شیطان کی طرف ہوئی، کیونکہ اِخراج کا ظاہری سبب وہی ہے۔بہرحال اس اِخراج کی سزا ظاہراً یہ ہوئی کہ جنت کے عیش وآرام سے نکال کردنیا کے غمکدہ میں ڈال دیئے گئے۔دوسری روحانی اورقلبی سزا یہ ہوئی کہ آئندہ باہم اولاد میں بھی دشمنی وعداوت اورنا اتفاقی ہمیشہ کے لئے جاری رہے گی، جس سے اولاد کی زندگی اجیرن رہے گی، تواس کا اثر والدین کی زندگی پر بھی ہوگا، چنانچہ ہابیل وقابیل کا جب سانحہ پیش آیا، تو حضرت آدم وحواء علیہما السلام بے حدنا گفتہ بہ پریشانی سے دوچار ہوئے، اور بعدازاں تا قیامِ قیامت یہ سلسلۂ عداوت دوطرفہ قائم رہے گا، جس طرح شیطان نے کھلم کھلا اللہ ربّ العزّت کے حضور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کہا تھا:

﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ﴾ [ص:۸۲] (تیری عزّت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کردوں گا)۔

دوسری طرف اولادِ آدم میں ایسی عداوتوں کا سلسلہ قائم ہوا کہ قیامت تک قتل وغارت اورخونریزی اوردیگر ظلم وزیادتیوں کا بازار گرم ہوا۔ایک ہی دین وشریعت کو ہزاروں نظریات اور باطل خیالات وعقائد پر بانٹ بانٹ کر

شیطان نے ریکارڈ قائم کیا۔

قرآن حکیم کی جامعیت اور اس کا اعجاز:

قرآن کریم ایک واقعہ کو مختلف سورتوں میں اُن سورتوں کے مضامین کے مناسب نئے اور دلکش انداز میں بیان کرنے کے باوجود واقعہ کی اصل حقیقت، اور اس کی متانت وسنجیدگی میں ادنیٰ سا فرق نہیں آنے دیتا، (اگر کوئی قرآن کریم کے واقعات ومضامین کے اعجازی پہلو کا غور وتدبر سے مطالعہ کرے، تو اسے عجائبات اور روح افزا حقائق معلوم ہوں گے) کہیں واقعہ کی تفصیل ہے، کہیں اجمال ہے، کسی مقام پر اس کا ایک پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے، تو دوسرے مقام پر اسی کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ ایک جگہ اسی واقعہ سے مسرت وانبساط اور لذّت و سرور پیدا کرنے والے نتائج نکالے گئے ہیں، تو دوسری جگہ واقعہ میں معمولی سا تغیر کئے بغیر خوف ودہشت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی مقام پر لذّت والم دونوں کا مظاہرہ نظر آتا ہے، مگر موعظت وعبرت کے اس تمام ذخیرہ میں قطعاً ناممکن ہے کہ نفسِ واقعہ کی حقیقت اور متانت میں کوئی ادنیٰ معمولی سا تغیر پیدا ہو جائے۔ بلاشبہ یہی کلام الٰہی کے شایانِ شان ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کریم نے تخلیقِ آسمان اور زمین، نیز "استواء علی العرش" کا تقریباً ایک سو بیس مقامات پر تذکرہ فرمایا۔ اس ضمن میں تخلیقِ آدم علیہ السلام کا کسی ایک جگہ بھی ذکر نہیں کیا، بلکہ پورے قرآن کریم میں ایک مقام ایسا نہیں ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ورسالت کا تذکرہ ہو۔ البتہ! حدیث شریف میں حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ورسالت کا تذکرہ ضرور ہے، جیسا کہ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسالت مآب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انبیاء علیہم السلام کی تعداد دریافت کی، تو آپ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار، پھر سوال کیا کہ ان میں رسول کتنے ہیں؟ فرمایا: تین سو تیرہ۔ میں نے عرض کیا: ان میں اول کون ہیں؟ فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام۔ میں نے عرض کیا: آدم علیہ السلام نبی مرسل تھے؟ فرما: یاہاں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، پھر ان میں روح پھونکی۔ [مشکوۃ]

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷ قُلْنَا اهْبِطُوْا

مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ۝۳۸ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۳۹ ع

ترجمہ: پس آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات سیکھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا آدم کی طرف مہربانی کے ساتھ۔ بیشک وہ رجوع کرنے والا بے حد مہربان ہے۝۳۷ ہم نے کہا: تم سب زمین پر اتر جاؤ، پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی، پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا، اور نہ وہ غم کھائیں گے۝۳۸ اور جنہوں نے کفر کیا، اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۝۳۹

معارف ومنازل

ربط ومناسبت:

جب آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھالیا، جس سے انہیں منع کیا گیا تھا، تو ان پر عتاب آ گیا، اور ان سے اکرام وانعام لے لئے گئے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام آئے، اور آدم علیہ السلام کے سر سے تاج اتارلیا، اور ان کے جسم سے بہشت کا لباس بھی اتارلیا، وہ برہنہ ہوگئے۔ چنانچہ انہوں نے ستر ڈھانپنے کے لئے جنت کے درخت کے پتے استعمال کئے، اور انہیں حکم ہوا کہ: ''تم سب زمین پر اتر جاؤ''۔ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں، اور تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے، اور تمہیں ایک معینہ مدّت تک فائدہ اٹھانا ہوگا''۔ [عزیزی]

قولہ تعالیٰ: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا﴾ اس جملہ کو دہرایا گیا ہے، تاکہ اگلے جملہ ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ﴾ کا ربط صحیح ہوجائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلا ''اِهْبِطُوْا'' حکم صادر کرنے کے لئے تھا، اور دوسرا ''اِهْبِطُوْا'' حکم کے نفاذ کے لئے ہے، یعنی اول سے مقصد فیصلہ سنانا تھا، دوم سے اس پر عمل درآمد مقصود ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلا ''هُبوط'' آسمانِ دنیا تک ہو، دوسرا ہُبوط آسمان سے نیچے زمین کے لئے ہو۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس اہم حکم کے لئے بطورِ تاکید ہو۔ واللہ اعلم

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾۔ (پس آدم علیہ السلام نے اپنے ربّ سے چند کلمات سیکھے)۔ ان کلمات کا اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ انہیں یہ کلمات بتائے گئے۔ ''تلقی'' چونکہ الہام اور

وحی کو بھی کہتے ہیں، جیسے کہ ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ﴾ [النمل:٦] (اورتم کوقرآن (خدائے) حکیم وعلیم کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے)۔اسی وجہ سے یہاں بھی "تلقی" کا معنی الہام سے کرنا مناسب ہوا۔ پس انہوں نے انتہائی تضرع دعاجزی کے ساتھ دعا کی، جیسے کہ سورت اعراف میں ہے: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الأعراف:٢٣] یعنی (اے ہمارے رب! بیشک ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور ہم پر نظر کرم نہیں کرے گا (رحم نہیں کرے گا) تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے)۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور کتاب شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش پر اس قدر روئے اور آنسو بہائے کہ اگر ان کا مقابلہ ان کی قیامت تک آنے والی ساری اولاد کے ساتھ کیا جائے، تو آدم علیہ السلام کے آنسو غالب آجائیں گے۔اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم کو اس درخت کے پھل کھانے پر کس چیز نے آمادہ کیا، جس سے میں نے تمہیں منع کیا تھا؟ "قَالَ يَارَبِّ زَيَّنَتْهُ لِيْ حَوَّاءُ"۔ (اے اللہ تعالیٰ! اس کو میرے لئے حواء نے مزین کیا)۔اور مجھے ترغیب دی کہ ہم وہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہ جائیں گے، یہ شیطان کا وسوسہ تھا۔

صحاح ستہ کی روایت میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "لَوْ لَا بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ لَمْ يُخْنَزِ اللَّحْمُ وَلَوْ لَا حَوَّاءُ لَمْ تَخُنْ اُنْثٰى زَوْجَهَا"۔ [متفق عليه]

اگر بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے حکم میں خیانت نہ کرتے، یعنی پیغمبر علیہ السلام نے ان کو حکم دیا تھا کہ: "مَنّ وَسَلْوٰى" کھاتے پیتے رہو، اور اسے کل تک کے لئے ذخیرہ نہ کرو، مگر انہوں نے خیانت کر کے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ سزا دی کہ گوشت گلنا سڑنا شروع ہوگیا، یہی وجہ ہے کہ آج کل دو دن سے زیادہ گوشت صحیح نہیں رہ سکتا، فوراً خراب ہوجاتا، اور سڑ جاتا ہے، بدبو آنا شروع ہوجاتی ہے۔تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر بنی اسرائیل اپنے نبی کے حکم کی پاسداری کرتے، گوشت کو ذخیرہ نہ کرتے، تو یہ کبھی خراب نہ ہوتا، خواہ کتنا ہی عرصہ پڑا رہتا۔ دوسری بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمائی: "ولولا حواء لم تخن انثى زوجها" یعنی بی بی حواء اگر اپنے خاوند (حضرت آدم علیہ السلام) سے خیانت نہ کرتیں، تو دنیا کی کوئی عورت اپنے خاوند سے خیانت پر آمادہ نہ ہوتی۔ حضرت حواء کی خیانت یہ تھی کہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے کہ جب آدم علیہ السلام سے لغزش سرزد ہوئی، تو وہ بہت نادم اور پریشان ہوئے۔ انہوں نے عرشِ معلٰی پر نگاہ کی، تو وہاں "لا الٰہ اِلاّ اللہ محمد رسول اللہ" لکھا ہوا پایا، آپ علیہ السلام نے خیال کیا کہ جس عظیم شخصیت کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے، یہ ضرور کوئی عظیم المرتبت بابرکت شخصیت ہے، چنانچہ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ معافی مانگی: "اَسْأَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَلِیْ"۔ (اے ربّ العزّت! میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ میری لغزش کو معاف فرما دے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تمہیں کیا علم کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کون ہیں؟

انہوں نے جواب دیا: اے میرے ربّ مولا کریم! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ تیرے نام کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لکھا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تیری اولاد میں یہ آخری نبی ہوں گے، اور میری پوری مخلوق میں ان کی فضیلت و مقام کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ پس آپؐ کے طفیل سے بخشش ہوگئی۔ [عزیزی، البدایة والنهایة]

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ حضرت! ہم لوگ دعا میں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر سکتے ہیں؟ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کیوں نہیں! جس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل سے تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی مغفرت ہوئی تھی، تمہیں بھی اس کے وسیلہ سے دعا کرنی چاہئے۔ منقول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسل و طفیل سے دعا فرمائی، جس کی بدولت آپ کی کشتی کوہِ جودی پر لنگر انداز ہوئی۔ ؎

زجودش گر نبودے راہ مفتوح ☆ بہ جودی کے رسیدے کشتی نوح

(جامی)

میں اپنے اکابر علماء دیوبند کا عقیدہ عرض کرتا ہوں، فرماتے ہیں کہ اجابتِ دعا کے لئے ضروری ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ کے ساتھ ہو، اور دعا کے اول و آخر میں درود شریف کے ساتھ دعا ہو، تو یہ درود دعا کے لئے بمنزلہ پرندہ کے پر کے ہیں، لہٰذا توسل کے ساتھ دعا ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام صرف ابوالبشر نہیں تھے، اور کلمہ "کُنْ" سے پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ انہیں "خَلَقَ اللہُ اٰدَمَ فِیْ صُوْرَتِہٖ"۔ اسی طرح "خَلَقَ اللہُ اٰدَمَ بِیَدِہٖ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ" کی شان و شرف کا اِکرام و اِعزاز حاصل

تھا۔ اور راجح قول بھی یہی ہے کہ دخولِ جنت کے ساتھ منصبِ نبوت سے بھی نوازے گئے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے عتاب و خطاب کو کہاں برداشت کر سکتے تھے؟ جب انہیں سرزنش ہوئی، تو نہایت بے چین ہوئے، اور آہ و زاری کے عالم میں گڑگڑا کر سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل کا دامن پکڑ کر توبہ قبول ہونے کی درخواست کی، چنانچہ ان کی توبہ قبول کرلی گئی، اور انہیں زمین پر فرائضِ خلافت کی انجام دہی کی خاطر (جو ان کی تخلیق کا مقصد تھا) اتار لیا گیا، اگرچہ بظاہر عام طور پر اس "ھبوط" کو لغزش کا ثمرہ سمجھا جاتا ہے، مگر یہ کوئی سزا نہیں، بلکہ ان کے حق میں اعلیٰ درجے کا اعزاز ہے، کہ وہ ھبوط إلی الأرض کے ذریعہ توحیدِ الٰہی اور حکامِ خداوندی کے نفاذ کا بابرکت فریضہ انجام دیں گے، اور یہ اہم و اعلیٰ خدمت کسی صورت میں وہ جنتی زندگی میں انجام نہیں دے سکتے تھے۔

حضرت شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کوئی جلاوطنی نہیں، بلکہ جہاں سے ان کا اور ان کی پوری نسل کا خمیر (مٹی) اٹھالیا گیا تھا، انہیں ہر حال اپنے مستقر پر پہنچنا تھا، اور ان کا وہیں دفن ہونا فطری تقاضا تھا، کیونکہ جنت توالد و تناسل اور موت و تدفین و دیگر امور و عوارض کی جگہ نہیں ہے۔ ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرة:۲۱۶] (مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے، اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو)۔ تو معلوم ہوا کہ امورِ خلافت کی انجام دہی کا دار الحکومت کرۂ ارض ہے، نہ کہ جنت الخلد۔ فافھم

﴿فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾۔ پس اللہ تعالیٰ لطف و عنایت سے ان پر متوجہ ہوئے، اور عفو و کرم کے پانی سے لغزش و نسیان کے دھبہ کو صاف فرمایا، اور انہیں پاک کر کے خلافت کے فرائض پورے کرنے کی استعداد دے کر خلافت کے دار الحکومت کرۂ ارض پر اتار دیا، پھر جہاں جنتی نعمتوں سے وہ ذاتی طور پر عیش و عشرت حاصل کرتے تھے، انہیں زمین پر اتار کر اس نعمت و راحت میں بے حساب لوگوں کو شریک کرنے کا موقع فراہم کیا گیا، جیسے ارشاد ہے: "خير الناس من ينفع الناس"۔ [الحديث]

﴿التَّوَّابُ﴾ مبالغہ کا صیغہ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کے لئے شائع ہے، اگر اللہ تعالیٰ مراد ہوں تو معنی ہوں گے: "بہت زیادہ رجوع کرنے والا معافی دینے والا"۔ البتہ "التائب" صیغہ اسم فاعل کا اطلاق اللہ تعالیٰ سبحانہ پر نہیں ہوگا، کیونکہ اسماء حسنی توقیفی ہیں، قیاس سے بلند و بالا ہیں۔

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا﴾ یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ توبہ قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت ہی میں رہے، ان کو زمین پر اتارا نہ جائے۔ البتہ! پہلی آیت میں ہبوط کا حکم تادیبًا تھا، اب دوسری

مرتبہ ہبوط کا حکم اس خاطر ہے کہ سابقہ تادیبی حکم منسوخ نہیں ہوا، بلکہ ہبوط کا حکم بدستور برقرار ہے، اور یہ دوسرا حکم تدریبی ہے (تعلیمی ہے)۔ یا یہ کہا جائے کہ پہلا حکم حاکمانہ تھا، اور یہ دوسرا حکم حکیمانہ ہوگا، جیسا کہ آئندہ جملہ ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ﴾ اس پر دلالت کررہا ہے کہ اب کا ہبوط فرائضِ خلافت کی انجام دہی کی خاطر ہے۔

دنیا میں بھی اصول جاری ہے کہ کسی لغزش پر حکمرانوں کی طرف سے ملازم کا اخراج یا تنبیہ صرف ڈیوٹی کی تبدیلی پر منتج ہوجاتی ہے، جب جنت مستقل ان کی اصلی قیامگاہ نہیں تھی، اور ان کی تخلیق خلافت کے لئے عمل میں آئی تھی، تو لامحالہ اس کو زیرِ بحث لانا ضروری ہوا۔

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى﴾ حضرت آدم علیہ السلام کو یاددہانی ہورہی ہے کہ روزِ ازل تمہاری پیٹھ سے دو قسم کی اولاد کا اخراج ہوا تھا: ایک طائفہ صالح نیک جنتیوں کا، دوسرا بدقسمت اور نالائق دوزخیوں کا۔ اب آپؑ زمین پر جانے کے بعد خود ہی ملاحظہ کریں گے، اور حقِ خلافت ادا کرتے ہوئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ ان کی رہنمائی کریں گے۔ جو لوگ آپ کی بات مان کر ہدایت قبول کریں گے، وہ جنتی ہوں گے، اور جو لوگ آپ کی بات نہیں مانیں گے اور ہدایت قبول نہیں کریں گے، وہ دوزخی کہلائیں گے۔ چنانچہ ہابیل وقابیل کے واقعہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا علم الیقین عین الیقین سے تبدیل ہوگیا، چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرة:۳۸] (پس جس نے پیروی کی میری ہدایت تو ان پر نہ خوف ہوگا، اور نہ غمگین ہوں گے)۔ یہ فریقِ اول خوش قسمت لوگوں کی علامت (اتباعِ ہدایت) اور ان کی ابدی فوز وفلاح کا بیان ہے۔ "تَبِعَ هُدَايَ" میں دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا منظر ہے، "اتباع هداية" اپنے عالمگیر عمومی معنی کے اعتبار سے شریعت کے بے شمار معانی ومطالب، اور علم وعمل کے سارے خزانوں پر مشتمل ہے، تب ہی تو ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ کا اس پر ترتب ہورہا ہے۔

ابلیس اور اس کے کارخانۂ عداوت کا فلسفہ اور راز:

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا فیصلہ فرمایا، اور انہیں مشتِ خاک سے عظیم حسن اور خوبصورتی کے ساتھ پیدا فرماکر سارے علوم ومعارف کو ان کے وجودِ مسعود میں ودیعت فرمایا، پھر ان کی برتری اور افضلیت کو ثابت کرتے ہوئے سارے نورانی فرشتوں کو ان کی اطاعت وسجدہ (سجدۂ تعظیمی) کا حکم صادر فرمایا، تو سارے کے سارے فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کی برتری تسلیم کرتے ہوئے مطیع بن کر ان کے حضور سجدہ ریز

ہو گئے، مگر ابلیس نے غرور و سرکشی اور حسد (عداوت) کی وجہ سے ربّ العزّت کے حکم کو تسلیم نہیں کیا، اور آدم علیہ السلام کو کمتر سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے حکم اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا، اور نہ مانا۔ ساتھ ساتھ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والا محاذ قائم کیا، اسی نقطہ سے حق و باطل اور خیر و شر کا ابدی معرکہ وجود میں آیا۔

حضرت آدم علیہ السلام حق و صداقت کے علمبردار ثابت ہوئے، اور ابلیس ہر برائی اور کفر و نفاق کا علمبردار قرار پایا۔ آنے والی آیتوں میں ان ہی دونوں باتوں، اور ان کے عواقب و نتائج کا اجمالاً بیان ہے۔ اسی طرح ابلیس کے متبعین کے لئے ابدی جہنم اور خسارے کا بیان ہے۔ وہاں سے حق و باطل کا جو معرکہ شروع ہوا وہ قیامت تک پورے زور و شور سے جاری رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا قیامت ☆ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

ان کلی، اجتماعی اور انفرادی و جزوی معرکوں میں ہر وقت انسان کا شیطان کے ساتھ آمنا سامنا رہے گا، اور یہ طاقتور، مخفی اور مسلح دشمن نفسِ امارہ سے مل کر پوری قوت کے ساتھ اولادِ آدم علیہ السلام کی سرکوبی، اور اسے دبانے کی کوشش میں مصروف رہے گا۔

نفس و شیطان کی تخلیق کیوں ہوئی؟

بہت سے مسلمان شاید یہی سوچتے ہوں گے کہ ہماری تخلیق توحید و عبادت کے لئے ہوئی ہے، تو کیا اچھا ہوتا کہ نفس و شیطان پیدا ہی نہ ہوتے، اور ان کا ہمارے ساتھ کوئی واسطہ اور محاذ آرائی کی نوبت نہ آتی، ہم بڑے ذوق و شوق اور یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے، اور اس کی رضا حاصل کر لیتے، کیونکہ انسان اپنے عزائم کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹ اور موانع سے اکثر و بیشتر گریزاں اور پریشان رہتا ہے۔ آئندہ سطور میں حسبِ توفیق ان شبہات کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔ وباللہ التوفیق

نفس و شیطان کی تخلیق سراسر ہمارے مفاد میں ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾﴾ [ہود] (اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا، تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا، لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے،

مگر جن پر تمہارا پروردگار رحم کرے اور اسی لیے اس نے ان کو پیدا کیا ہے، اور تمہارے پروردگار کا قول پورا ہوگیا کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا)۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ ساری دنیا کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا، اسی لئے حق کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے، اور یہ سارا اختلاف نفس وشیطان ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر سارے لوگ فطرتِ سلیمہ کے موافق چلتے، تو اختلاف نہ ہوتا، اسی لئے ﴿اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ﴾ سے متنبہ فرمادیا کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے ان کی حق پرستی کی بدولت رحم فرمایا، وہ اختلاف کرنے والوں سے مستثنیٰ ہیں۔

دنیا کی آفرینش سے غرض یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر قسم کی ''صفاتِ جمالیہ وقہریہ'' کا ظہور ہو، اس لئے مظاہر کا مختلف ہونا ضروری ہے، تاکہ ایک جماعت اپنے مالک کی وفاداری واطاعت دکھا کر رحمت وکرم اور رضوان وغفران کا مظہر بنے، جو ﴿اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ﴾ کی مصداق ہے۔ اور دوسری جماعت اپنی بغاوت وغداری سے اس کی صفتِ عدل وانتقام کا مظہر بن کر اس بغاوت کی سزا بھگتے، جس پر اللہ تعالیٰ کی یہ بات پوری ہو: ﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾۔

بہر حال! آفرینشِ عالم تشریعی کا مقصد عبادت ہے، ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاریات: ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں)۔ اور تکوینی غرض یہ ہے کہ تشریعی مقصد کو اپنے کسب واختیار سے پورا کرنے اور نہ کرنے والے دو گروہ ایسے موجود ہوں، جو حق تعالیٰ کی صفاتِ جلالیہ وجمالیہ، یا بالفاظِ دیگر لطف وقہر کے مورد ومظہر بن سکیں۔

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست ☆ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

پھر لطف وکرم کے مظاہر بھی اپنے مدارج استعداد وعمل کے اعتبار سے مختلف ہوں گے۔ (عثمانی)

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن ☆ ہے زیب اس جہاں کا فقط اختلاف میں

قصۂ آدم علیہ السلام، عداوتِ ابلیس کا مظہر ہے، جس سے اس حکمت کا اظہار ہی مقصود ہے کہ تکمیلِ انسانیت کے لئے ابلیسی عداوت کا وجود ضروری ہے، کیونکہ ایک مخفی مکار اور عظیم دشمن کا وجود انسانیت کی حدود کے تحفظ کا محرک ہے، اور ایسے خطرناک دشمن دین کی عداوت کا تصور محافظتِ دین کا سامان ہے۔

انسانی وجود کے اندر ایک چھوٹی حکومت کا نمونہ موجود ہے، انسانی اعضاء رعیت کی مانند ہیں، روحِ انسانی ایک

بادشاہ اور حکمران ہے۔ شرع اور قانونِ الٰہی اس چھوٹی سی حکومت کا دستورِ مملکت ہے، شیطان یا ابلیسیت بدنی اعضاء کی رعیت کو شرعی دستورِ مملکت سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر روحِ انسانی دفاعِ مملکت اور ڈیفنس سے غافل رہے، تو دشمن اس مملکت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، اور انسان کی اندرونی مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور اگر دشمن سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر پر ہر وقت نظر رہے گی، تو ڈیفنس اور دفاع مضبوط ہو کر ابلیسی تدابیر ناکام ہوں گی۔

یہی راز ہے کہ آدمیت کی تکمیل کے لئے اس کے ساتھ ساتھ ابلیسی عداوت کا کارخانہ بھی وجود میں آیا۔ دشمن کے وجود کا یہ فلسفہ حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مرید کو سمجھایا، جس نے حضرت کو دشمنوں کی ضرر رسانی کی شکایت کی۔ آپ کا جواب شاعرِ مشرق علامہ اقبال رحمہ اللہ نے نظم کیا، فرمایا:

راست میگویم عدو ہم یارتست ☆ ہستی او رونق بازارتست
ہر کہ دانائے مقامات خودی است ☆ فضل حق داند اگر دشمن قوی است
کشت انسان را عدو باشد سحاب ☆ ممکناتش را بر انگیز دز خاک

اس کی واضح مثال مملکتِ پاکستان کے پہلو میں بھارت کی دشمن حکومت کا وجود ہے۔ اگر پاکستان کے پہلو میں بھارت جیسی دشمن اور مکار حکومت نہ ہوتی، تو پاکستانی عوام اور حکومت دونوں غفلت کا شکار ہو کر دفاع اور تحفظِ مملکت کا پر جوش انتظام نہ کرتے۔ پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی فوج نہ ہونے کے برابر ہوتی۔ اسلحہ جنگ اور جنگی قوتوں کو بروئے کار لانے کا کوئی انتظام نہ ہوتا، اور ہماری تمام مخفی دفاعی قوتیں معطل ہو کر رہ جاتیں۔ اب جو کچھ پاکستان کے دفاعی ساز و سامان کی روز افزوں ترقی ہمیں نظر آتی ہے، یہ سب بھارت جیسے دشمن کے وجود کے تصور کا صدقہ ہے۔

مسئلہ عصمتِ انبیاء کرام علیہم السلام:

علماء امت کے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے۔ ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے محفوظ و معصوم ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں۔ [قرطبی] وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام (گناہ) اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف صادر ہو سکے، تو ان کے اقوال و افعال سے امن اور اعتماد اٹھ جائے گا، جب انبیاء کرام علیہم السلام پر اعتماد ہی نہ

رہے تو دین کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔

اگر قرآن کریم اور دیگر نصوص سے یہ ثابت ہو کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے گناہ سرزد ہوا، اور اس پر انہیں عتاب بھی ہوا، جیسا کہ زیرِ نظر مسئلہ میں حضرت آدم علیہ السلام کا سہو ونسیان یا حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ عہد و میثاق کے بعد وعدہ خلافی وغیرہ، تو ایسے تمام واقعات کا حاصل (جواب) باتفاق علماء امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی، سہو، نسیان، یا اجتہادی غلطی کی وجہ سے ان کا صدور ہوتا ہے، وہ اس لئے بھی کہ لاکھوں عصمتوں اور طہارتوں کے باوجود آخر بشریت کے بھی کچھ نہ کچھ لوازمات اور تقاضے ہوتے ہیں، ورنہ کوئی پیغمبر جان بوجھ کر قصداً وعمداً اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف قطعاً عمل نہیں کرتے۔

غلطی اجتہادی ہو، یا خطاء، سہو ونسیان کے سبب سے ہو، قابلِ معافی تو ہوتی ہے۔ اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس میں بہت ساری مصلحتیں اور حکمتیں بھی پوشیدہ رہتی ہیں، جن سے بہت سے دینی مسائل وابستہ رہتے ہیں، تو ایسی چیزوں کو اصطلاحِ شریعت میں گناہ نہیں کہا جا سکتا، اور ایسی چیزوں پر بروقت وحی کے ذریعہ تنبیہ کی جاتی ہے، جن کی مضرت اور نقصان دفع ہو کر فضا صاف ہو جاتی ہے، اور واہمہ ختم ہو جاتا ہے۔

البتہ! یہ بات واضح ہے کہ یہ سہو ونسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی، جن کا تعلق فرائضِ نبوت، تبلیغِ احکام وتعلیمِ شریعت سے ہو، بلکہ ان کے ذاتی افعال واعمال میں اس طرح کا سہو ونسیان ہو سکتا ہے، اور یہ منافی نبوت وعصمت نہیں ہے۔ [البحر المحیط]

حضرت آدم علیہ السلام کا مَسکن :

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کا مسکن زمینی کوئی باغ تھا، یہ ابو القاسم بلخی معتزلی، ابو مسلم اصفہانی اور دیگر معتزلہ وغیرہ کا قول ہے۔ یا امام موصوف کا اس مسئلہ میں خود توقف اختیار کرنا، یا جبائی وغیرہ کا یہ کہنا کہ ساتویں آسمان کی جنت ہے۔ یا بعض صوفیاء کا یہ کہنا کہ جبلِ یاقوت کا ایک باغ تھا، یا یہود ونصاریٰ کا باغِ عدن یا باغِ فلسطین یا اصفہان کا تعین کرنا، یہ سب خلافِ عقل ونقل ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی سکونت آسمانی جنت میں تھی۔

مسکنِ آدم علیہ السلام آسمانی جنت تھا:

حضرت آدم علیہ السلام کی سکونت جنت میں ہونا، اور پھر زمین پر اترنا قرآن حکیم میں مذکور ہے، اور یہی جنت

جنتِ آخرت اور دار الخلد و دار الثواب تھی، یہی صحیح قول ہے عند الأئمة و جمہور العلماء۔ اس کے دو قرائن ہیں:

☆ پہلا قرینہ یہ ہے کہ جنت کا لفظ جب لامِ تعریف کے ساتھ ذکر ہو، اور الفاظ میں زمین کا کوئی باغ مراد لینے کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو، تو جنت سے مراد دار الثواب ہوگی، بالخصوص یہ کہ مسکنِ آدم علیہ السلام میں آسمانی جنت کے دو قرینے خود الفاظِ قرآن میں بھی موجود ہیں: ایک یہ کہ سورۃ طٰہٰ میں جنت کی جو صفات مذکور ہیں وہ زمینی جنت یا باغ کی صفات نہیں ہیں، بلکہ اس جنت کی صفات ہیں، جو دار الجزاء ہے، اور عالمِ بالا میں ہے، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت میں بسانے کے بعد ارشاد فرمایا: (۱) ﴿فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى﴾ (تو ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے پھر تو مشقت میں پڑے) (۲) ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا﴾ (۳) ﴿وَلَا تَعْرٰى﴾ (۴) ﴿وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا﴾۔ (۵) ﴿وَلَا تَضْحٰى﴾ ۔[طٰہٰ: آیت ۱۱۷ تا ۱۱۹]

یہ پانچ صفات ایسی ہیں جو دنیا کے کسی مقام میں نہیں پائی جاتیں، مثلاً یہ کہ اس جنت سے نکلنے کے بعد تم کو تکلیف ہوگی، اور یہ کہ اس جنت میں تم کو نہ بھوک لگے گی، اور نہ ننگا ہونا پڑے گا، اور نہ پیاس لگے گی، اور نہ دھوپ لگے گی۔ یہ تمام خصوصیات خلدِ بریں کی ہیں، کسی دنیوی باغ کی نہیں ہیں، کیونکہ باغِ دنیا میں اگر کچھ تھوڑے بہت فوائد ہیں، تو اس سے نکلنے کے بعد کسی دوسرے باغ میں چلے جانے سے بھی وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

☆ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ مسکنِ آدم علیہ السلام بہشتِ بریں تھا۔ سورۂ بقرہ کی یہی آیت: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ [البقرة]

جنت سے اترنے پر اس آیت میں دو نتیجے مرتب کیے گئے ہیں: اول یہ کہ تمہاری اولاد میں دشمنی ہوگی، جیسے اس سے پیشتر ملائکہ کی زبان سے بھی یہی ظاہر کیا گیا کہ ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ (کیا تم ایسے لوگوں کو زمین میں جانشیں بناتے ہو، جو اس میں فساد اور خونریزی کریں گے)۔

آیت مذکورہ میں ''اِهْبِطُوْا'' کہ (اترو) اس کے بعد جمع کے لفظ سے فرمایا کہ تمہاری اولاد ایک دوسرے کی دشمن ہوگی، اور یہ کہ تم کو اور تمہاری اولاد کو زمین میں ایک مقرر وقت تک رہنا ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اگر مسکنِ آدم علیہ السلام آسمانی نہ ہوتا، بلکہ زمینی ہوتا تو یہ الفاظ حق تعالیٰ شانہ نہ فرماتے، کیونکہ عداوت زمینی زندگی کا خاصہ ہے، اور یہ بھی نہ فرماتا کہ تم اترنے کے بعد زمین میں رہو گے، جبکہ وہ پہلے بھی زمینی باغ میں رہتے تھے۔

معلوم ہوا کہ جس جنت سے اتارے گئے وہ زمینی باغ نہ تھا۔ بھوک باطنی ذلت ہے، اور ننگا پن ظاہری

ذلت، جبکہ پیاس باطنی گرمی ہے، اور دھوپ ظاہری گرمی، جن میں تقابل ہے، مسکنِ آدم علیہ السلام ان سب سے پاک تھا، وہ صرف اور صرف جنتِ برین کا خاصہ ہے، جو کہ ان چیزوں سے بلند و بالا ہے۔

☆ تیسری بات صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ قیامت کے روز اولادِ آدم، حضرت آدم علیہ السلام سے جنت کے کھلوانے کی درخواست کرے گی، جس کے جواب میں آپ علیہ السلام فرمائیں گے: "وَهَلْ أَخْرَجَكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا خَطِيئَةُ أَبِيكُمْ" کہ تم کو جنت سے تو تمہارے باپ کی غلطی نے نکلوایا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ جس جنت سے حضرت آدم علیہ السلام نکالے گئے، یہ وہی جنت تھی جس میں قیامت کے دن داخلہ اعمال کے مطابق ہوگا۔ جب جنت کا حالی وجود ثابت ہوا، تو دوزخ کا بھی ہوا، کیونکہ فرق کا کوئی قائل نہیں۔

جنت و دوزخ کی تخلیق ہو چکی ہے:

اہل سنت والجماعت اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ جنت و دوزخ کی تخلیق ہو چکی ہے۔ جب سے اللہ تعالیٰ شانہ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق فرمائی، اسی کے ساتھ جنت اور دوزخ کی تخلیق عمل میں آئی، صرف انسان کی تخلیق کا فیصلہ مرورِ زمانہ کے بعد دیر سے ہوا۔

حضرت امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ نے "مقالات الاسلامیین واختلاف المضامین" میں بلفظ "ما أجمع عليه أصحاب الحديث و أهل السنة" یعنی جن عقائد پر سارے اہل حدیث اور اہل سنت متفق ہیں، ان کی تفصیل میں فرماتے ہیں: "وَإِنَّ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ مَخْلُوْقَتَانِ" کہ جنت اور دوزخ پیدا شدہ ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اہل السنۃ والحدیث، فقہاء، صوفیاء اہل التصوف کا اس عقیدہ پر "حادي الأرواح" میں اجماع نقل کیا ہے۔

معتزلہ کا یہ کہنا کہ اس وقت جنت و دوزخ مخلوق نہیں ہیں، ان کی تخلیق قیامت میں ہوگی، کیونکہ ضرورتِ تخلیق اُس وقت ہے، بالکل غلط اور گمراہ کن عقیدہ ہے۔ جنت و دوزخ کا فی الحال موجود ہونا عبث نہیں ہے، بلکہ اس میں بے شمار فوائد ہیں۔

موت کے وقت، اسی طرح برزخی زندگی میں ثواب وعقاب، جنت کی خوشبو، روح وریحان کا ورود، جہنم کے حر وسموم کا ورود، اسی طرح ہر قسم کے راحت والم سے میت کا متاثر ہونا، اور طرح طرح کے سکون وہموم کا مشاہدہ کرنا، بکثرت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، جو جنت ودوزخ کے وجود سے متعلق ہیں۔ اسی طرح اَبرار واَخیار مثلاً انبیاء،

صدیقین، شہداء، صالحین اور علماء، بلکہ بعض دیگر مؤمنین کی روحوں کا بعدازموت جنت کی نعمتوں اور لذتوں سے فائدہ اٹھانا، اور اَشرار و فجار کا دوزخ کے آلام سے ضرر و نقصان حاصل کرنا، یا تکلیف اٹھانا صحیح احادیث میں مذکور ہیں، جس سے بخوبی معلوم ہوا کہ قبل از قیامت (برزخ میں) بھی انسانی ارواح کو جنت و دوزخ کے وجود سے ارتباط موجود ہے۔

جنت کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] (جنت تیار کی گئی ہے متقی لوگوں کے لئے)۔ اور دوزخ کے متعلق ارشاد ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۱] یہ دونوں تعبیر میں ماضی اور گزشتہ کے لئے ہیں۔ فرعون اور اس کے لشکر کے بارے میں فرمایا: ﴿أُغْرِقُوْا فَأُدْخِلُوْا نَارًا﴾ کہ وہ غرق کئے گئے، اور فوراً دوزخ میں داخل کئے گئے۔ اگر دوزخ قبل از قیامت موجود نہیں ہے، تو کس طرح دوزخ میں داخل کئے گئے؟ ''فا'' تعقیب مع الوصل کے لئے ہے، اسی طرح قومِ نوح علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿مِمَّا خَطِيْٓـئٰتِهِمْ أُغْرِقُوْا فَأُدْخِلُوْا نَارًا﴾ [نوح: ۲۵] یہ بھی اسی مقصد پر واضح دلیل ہے۔

جنتی زندگی کا اجمالی نقشہ:

قرآن کریم نے آیت کریمہ میں جنتی زندگی کا منفی انداز میں یہ نقشہ کھینچا ہے:

﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ کہ وہ زندگی ہر قسم کے خوف اور غم سے کلیۃً پاک ہے، نہ گزشتہ کا رنج و اَلم اور نہ آئندہ کا حزن و ملال۔ اور مثبت انداز میں یوں بیان کیا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ أَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ﴾ [حٰمٓ السجدۃ: ۳۱] (اور تمہارے لیے ہے اس میں جو تمہارا جی چاہے، اور تمہارے لیے ہے اس میں جو مانگو، مہمانی بخشنے والے مہربان کی طرف سے)۔ کہ جنت کی زندگی میں تم کو جو کچھ جی چاہے وہ ملے گا، اور جو کچھ طلب کرو گے مہیا ہوگا۔ یعنی دل اور زبان کے تمام مطلوبات حاصل ہوں گے، اور تم کو خود انتظام کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی کہ تم تمام عرصۂ حیات (ابدی زندگی بلا انقطاع) جنت میں خدائے غفور و رحیم کے مہمان ہوں گے۔

مہمان کو ضروریات کے لئے کچھ نہیں کرنا پڑتا، سب کچھ میزبان کے ذمہ ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دین مہمان بن کر تمہارے پاس آیا تھا، تم لوگوں نے جان و مال سے اس کی میزبانی کی، اسے سر آنکھوں پر رکھا، اس کے عوض آج وہ غفور رحیم قدر دان و قدر شناس تمہارا میزبان بن کر ہر طرح تمہیں نوازیں گے، اور مختصر اطاعت کے عوض ابدی و بے مثال جنت عطا فرمائیں گے۔ اللّٰھم ارزقنا۔ آمین

احادیثِ مبارکہ میں جو ''بدور السافرۃ'' میں خاتمۃ الحفاظ حضرت جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ نے درج کی ہیں، اس اجمالی حیاتِ طیبہ کا یہ نقشہ مرتب فرمایا ہے: ''غِنَاءٌ وَ لَا فَقْرَ صِحَّةٌ وَ لَا مَرَضَ شَبَابٌ لَا هَرَمَ حَيَاتٌ لَا مَوْتَ سُرُوْرٌ لَا حُزْنَ ''إلخ۔ یعنی جنتی زندگی میں غناء ہے، فقر ومحتاجی نہیں، ظاہری وباطنی تندرستی ہے، مرض نہیں، دائمی جوانی ہے، بڑھاپا نہیں، ابدی زندگی ہے، موت نہیں، ہمیشہ خوشحالی ہے غم نہیں۔

یہ وہ مختصر اجمالی نقشہ ہے کہ اس نقشہ کے مطابق ایک منٹ کی زندگی بھی کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو دنیا میں نصیب نہیں ہے۔ وہاں رعایا کوئی نہیں، ہر جنتی اپنی حدود میں بادشاہ ہی ہے، اور بادشاہت بھی جنت کی، دنیا کی نہیں، اس لئے ربّ العزّت کا ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ﴾ [العنکبوت: ۶۴] (صرف آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے)۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جنتی کی طاقت ایک سو تندرست قوی جوانوں کی طاقت کے برابر ہوگی، جو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہے گی، اس میں قطعاً کوئی کمی نہیں آئے گی۔ قد وقامت، حسن وجمال اور خوبصورتی بے مثال ہوگی، ہر قسم کی ظاہری وباطنی طہارت اور نزاکت مثالی ہوگی، اور یہ سب کچھ دائمی وابدی ہوگا۔ ان میں دائمی اضافہ بھی ہر وقت ہوتا رہے گا، جیسے احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ عظیم، بے مثال وبے بدل حقیقی نعمت دیدارِ الٰہی عزّ مجدہٗ وتعالیٰ شانہ کی لذّت ایسی ہوگی جو ان تمام لذّتوں سے اَرفع واَعلیٰ اور بالاتر ہوگی، جو جنت میں مختلف ذرائع سے جنتیوں کو حاصل رہے گی، یعنی ان کے اعمال ودرجات کے مطابق۔ اللّٰھم ارزقنا لقاءک واسترنا بسترک (آمین)

بعض جنتیوں کو صبح وشام، بعضوں کو روزانہ ایک مرتبہ، بعض کو ہفتہ وار، اسی طرح تفاوتِ درجات کے لحاظ سے ماہوار، سالانہ، کئی سالوں کے بعد، حتی کہ بعضوں کو ہزاروں سال گزرنے پر ایک مرتبہ دیدارِ الٰہی کا شرف نصیب ہوگا۔ ﴿ولِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ [الأنعام: ۱۳۲] (اور سب لوگوں کے بلحاظ اعمال درجے (مقرر) ہیں)۔

ماقبل کے ساتھ ربط ومناسبت:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ سے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق، اور دیگر بے شمار ظاہری نعمتوں کا بیان ہوا، پھر ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ﴾ سے معنوی نعمتوں کا، اور ہر قسم کی نعمتوں کے حقدار اور منعم علیہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش وخلافت کا مکمل تذکرہ ہوا، آخری آیتوں میں متبعینِ خلافت کی کامیابی، اور نافرمانوں کی ناکامی کا ذکر ہوا، اس ضمن میں بنی اسرائیل کا تذکرہ اس لئے اہم ہے کہ چار ہزار سال میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم میں چار ہزار کے قریب انبیاء

کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے، اور اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار ظاہری و باطنی نعمتوں سے نوازا، اور نبوت وخلافت، ملوکیت وسلطنت، یعنی ظاہری، دنیوی اور روحانی ومعنوی ہر قسم کی نعمتوں سے بے دریغ نوازے گئے، مگر اس قوم نے ہر قسم کی ناشکری وناسپاسی اختیار کر کے خلافت کی قبا اور چادر کو ریزہ ریزہ اور تار تار کر کے رکھ دیا۔

آئندہ آیت نمبر ۴۰ سے آیت ۱۲۳ تک مسلسل انہی ناشکروں اور احکامِ الٰہی سے منحرفوں کا تذکرہ بسط و تفصیل کے ساتھ ہوگا۔

امتِ محمدیہ علےٰ نبیہا الف الف صلوۃ وسلام کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ یہود بے سود کے عقائد واعمال اور ہر قسم کی تہذیب وتمدن اور استہزاء بالدین سے کلی اجتناب میں تمہاری سعادت وفلاح کا راز مضمر ہے، جسے بار بار سورۃ الفاتحۃ میں "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" کے عنوان سے شناخت کرتے رہتے ہو، اور ان کے طرزِ زندگی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے رہتے ہو۔

بنی اسرائیل کون ہیں؟

مشہور ونامور پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام عراقی ثم شامی ثم حجازی (۱۹۸۵ تا ۲۱۶۰ ق م) سے دو نسلیں چلیں: ایک بی بی ہاجرہ علیہا السلام مصریہ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے، یہ نسل بنی اسماعیل کہلائی۔ اور آگے چل کر قریش اُسی کی ایک شاخ پیدا ہوئی، اور ان کا وطن عرب رہا۔

دوسری نسل بی بی سارہ علیہا السلام عراقیہ کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب عرف حضرت اسرائیل علیہ السلام سے، یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، اس کا وطن شام رہا، بشمولِ فلسطین (کنعان) کے۔ قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا، شام ہی کا حصہ تھا۔

ایک تیسری نسل، تیسری بیوی حضرت قطورہ سے چلی اور بنی "قطورہ" کہلائی، لیکن اسے تاریخ میں زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا۔ توحید کی علمبردار دنیا میں یہی قوم رہی۔ انبیاء ومرسلین ان کے درمیان ہوتے رہے۔ بڑے بڑے عابد وزاہد ان میں پیدا ہوئے، کئی حکمران وسلاطین اور فوجی جنرل ومجاہد بھی انہی میں پیدا ہوئے۔ ان میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ نزولِ قرآن کے وقت ان کا دنیوی اقتدار مدت سے رخصت ہو چکا تھا۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر وغیرہ کے اطراف وجوانب میں پھیل چکے تھے، اور ان کے بعض قبیلے حجاز واطرافِ حجاز، خصوصاً یثرب (اسی کا نام بعد میں مدینۃ النبیؐ پڑا) اور حوالی یثرب میں آباد ہو چکے تھے۔

''بنی اسرائیل'' تو ایک قومی ونسلی اصطلاح ہے۔ مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہودی تھے۔ اہلِ کتاب تھے، توریت (اگر چہ محرّف ومسخ شدہ ہوکر) ان میں موجود تھی، سلسلۂ وحی ونبوت اور عقیدۂ جزاءوسزاء کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے۔

علوم انبیاء علیہم السلام ومعارف اولیاء کے حامل تھے، مالدار تھے، شاہوکار تھے، ساتھ ہی سفلی عملیات (جادو، سحرو کہانت) نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے۔ حجاز کی آبادی میں اس دینی ودنیوی تفوق کی بناء پر انہیں اچھی خاصی اہمیت حاصل تھی۔ ملک کی عام آبادی مشرکوں اور بت پرستوں کی تھی۔ وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم وفضل کے قائل اوران کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے، اور دوسری طرف ان کے قرضدار بھی رہا کرتے تھے، گویا دینی ودنیوی اکثر حاجتوں میں انہی کو مشکل کشا جانتے تھے، اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظم وقاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظم قومیں مرعوب ومتاثر ہوجاتی ہیں۔ مشرکینِ عرب بھی اسرائیلی اخلاق، اسرائیلی روایات، بلکہ اسرائیلی عقائد سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے، اور بہت سے مسائل میں یہود کو اپنے استاد جانتے تھے، اوران کے مشوروں پر چلتے رہتے تھے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ یہود کے مذہبی نوشتوں اور اسرائیلیوں کی مقدس زبانی روایتوں (دونوں) میں ایک آنے والے نبی کی بشارت موجود تھی، یہ لوگ اس نبی موعود کے ظہور کے منتظر رہتے تھے۔ ان اسباب کی بناء پر یہ ایک اصولی اور اتفاقی بات تھی کہ قرآن مجید میں تخاطب اس قوم کے ساتھ ہو، اور خوب مفصل ہو۔

اس منزل پر پہنچ کر بہتر ہوگا کہ ایک نظر قرآن مجید کی ترتیب بیان پر کرلی جائے۔ قرآن مجید کا اصل تخاطب ساری کائناتِ انسانی سے ہے، اسی مناسبت سے پہلے رکوع میں اس کا بیان ہوا کہ نوعِ انسان کی حقیقی قسمیں کُل دو ہیں: (۱) ایک اچھے مؤمن (۲) دوسرے بُرے یا کافر۔ مؤمن یا نیک وہ ہیں، جو قرآن کو دستورِ حیات تسلیم کرتے ہیں۔ کافر یا بد وہ ہیں، جو اس سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرے رکوع میں کافروں ہی کی ایک خاص قسم (مخفی کافروں) کی بیان ہوئی۔ اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ ایمان ونجات سے محروم رہیں گے۔

تیسرے رکوع میں مخاطب ساری نسلِ انسانی کو کیا گیا، اور قرآن مجید کا اصل پیام، یعنی توحید ورسالت بیان کردیا گیا۔ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾۔

چوتھا رکوع تاریخ نسلِ انسانی پر ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا کہ انسان کی اصلی غرض آفرینش دنیا میں قانونِ الٰہی کی تنفیذ اور حاکمیتِ الٰہی کی نیابت ہے۔ ذراسی غفلت میں انسان کا دیرینہ دشمن شیطان اس کو پچھاڑ سکتا ہے، اور

حق سے باطل کی طرف، نور سے ظلمت کی جانب اُسے موڑ سکتا ہے، لیکن اگر انسان ذرا بھی ہمت اور توجہ صرف کرتا رہے، اور انبیاء علیہم السلام کی بتائی ہوئی اور دکھائی ہوئی صراطِ مستقیم پر قائم رہے، تو وہی غالب و منصور رہے گا۔

اب پانچویں رکوع میں اس بات کا بیان شروع ہوتا ہے (اس کی تفصیل متعدد رکوع تک چلتی رہے گی) کہ مدتِ دراز ہوئی کہ ایک بڑے مقبول، برگزیدہ بندے کی اولاد میں ایک خاص نسل کو توحید کی نعمت خاص سے سرفراز کیا گیا تھا، مگر قوم اس کے لیے نااہل ثابت ہوئی۔ مواقع اسے بار بار دیئے گئے، رعایت اس کے ساتھ بار بار کی گئی، لیکن ہر مرتبہ اُس نے اس نعمت کو اپنے ہاتھوں سرکشی سے ضائع کیا، یہاں تک کہ اپنی نسل کے آخری پیغمبر (حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام) کی مخالفت میں تو حد سے ہی گزر گئی۔ طویل و مسلسل گوناگوں مراعات کے بعد اب حکومتِ الٰہی کا دستور ایک نیا ضابطہ اختیار کرتا ہے، اور اس ناشکر گزار، نافرمان اور عصیان پیشہ قوم کو اس منصب سے ہمیشہ کے لئے معزول کیا جاتا ہے، اور یہ نعمتِ عظمیٰ اس سے چھین کر ایک اسماعیلی قریشی پیغمبر کے واسطہ سے دنیا کی تمام قوموں اور ساری نسلوں کے واسطے قیامت تک عام کی جارہی ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ کی سنتِ جاریہ ہے کہ اس کی ہر چھوٹی بڑی نعمت کی بخشش میں ہر طرح کے امتحان و ابتلاء کا پہلو نمایاں ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ [ابراهيم: ۷] (اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب بھی سخت ہے)۔ تو اس رکوع میں قومِ یہود کے امراض اور بیماریوں کا اجمالی تذکرہ، اور دینِ الٰہی، انبیاء کرام علیہم السلام اور احکامِ شریعت کے ساتھ ان کے برے سلوک کے چالیس سے زائد مفاسد کا اجمالی بیان اور تذکرہ ہے، جو یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ شانہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین اور گستاخی۔ (۲) انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب اور قتل۔ (۳) شرک۔ (۴) کفر۔ (۵) نفاق۔ (۶) سامریت۔ (۷) اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز۔ (۸) بغیر ایمان و عمل کے نسبت پر فخر۔ (۹) التفريق في العقيدة، آمنوا بالبعض و كفروا بالبعض۔ (۱۰) اتباعِ نفس و شہوات۔ (۱۱) کتمان الحق۔ (۱۲) تلبيس بين الحق والباطل۔ (۱۳) تحريف في الدين والكتاب۔ (۱۴) حرص ولالچ۔ (۱۵) البخل والشح۔ (۱۶) دھوکہ خیانت، جھوٹ۔ (۱۷) انبیاء کرام علیہم السلام پر عدمِ اعتماد۔ (۱۸) دوسروں کو نصیحت، خود میاں فضیحت۔ (۱۹) انکارِ جہاد۔ (۲۰) عہد شکنی۔ (۲۱) احکامِ الٰہی میں چون و چرا۔ (۲۲) اپنے گناہ دوسروں پر ڈالنا۔ (۲۳) حرام خوری، اور تحلیلِ محرمات۔ (۲۴) حق کی مخالفت، اور باطل کی حمایت۔ (۲۵) بے سند باتوں پر

ڈٹ کر رہنا۔(۲۶) حسد و بغض میں انہماک۔(۲۷) باہمی منافرت، تفرقہ بازی۔(۲۸) قتل و غارت۔(۲۹) ظلم و زیادتی۔(۳۰) ریا کاری دکھاوا۔(۳۱) فیصلوں میں بے انصافی۔(۳۲) رشوت خوری۔(۳۳) سودی کاروبار۔(۳۴) ذخیرہ اندوزی، احتکار۔(۳۵) شراب خوری۔(۳۶) زنا کاری، وغیرہ۔(۳۷) فرشتوں کے ساتھ دشمنی اور تفریق۔(۳۸) بداعتقادی، اور احکامِ الٰہی میں شبہات پیدا کرنا۔(۳۹) حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت۔(۴۰) سحر و جادو میں انہماک۔(۴۱) اور قسوۃِ قلوب کا مرض۔(۴۲) ترکِ زکوۃ۔(۴۳) امر بالمعروف نہی عن المنکر کا ترک۔(۴۴) اکل مال یتیم۔(۴۵) انکارِ میراث۔(۴۶) اہلِ حق کی تذلیل۔(۴۷) حقوق کی پامالی وغیرہ۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝۴۰ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۲

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری ان نعمتوں کو جو میں نے تم پر انعام کیں، اور پورا کرو میرے عہد کو۔ میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو، اور خاص مجھ ہی سے ڈرو ۝۴۰ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جس کو میں نے نازل کیا ہے، اور وہ ان (اصل غیر محرف شدہ) کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہیں، اور نہ ہو تم پہلے کفر کرنے والے اس کے ساتھ، اور مت خرید و میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت، اور خاص مجھ ہی سے پس ڈرتے رہو ۝۴۱ اور نہ ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ، اور تم حق کو چھپاتے ہو، اور تم جانتے بھی ہو ۝۴۲

ربط و مناسبت:

زمانۂ نزول قرآن میں کھلم کھلے کافر دو طرح کے تھے: اول بت پرست مشرکین، جن کا بیان پہلے گزر چکا۔ دوم اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) جن کو یہاں آیت (۴۰) سے لے کر (۱۲۳) تک، یعنی چودہویں رکوع تک خطاب کیا جا رہا ہے۔ اور تین مرتبہ ”یا بنی اسرائیل“ کے کلمہ کو تکرار کے ساتھ لایا گیا ہے۔ پہلی سات آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں ایمان کی، اور چار میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے۔ اس کے بعد ہر طرح سے تفصیلی خطاب ہے۔

☆ ☆ ☆

مخصوص خطاب کی وجہ

مخصوص قوم یہود کو خطاب کی وجہ یہ ہے کہ پوری دنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار سال سے تمام اقوامِ عالم کے سامنے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور نافرمانی کے سلسلہ میں جس قدر نشیب و فراز اگر کسی قوم کی زندگی میں آسکتا ہے، وہ اس قوم کی عبرتناک سرگزشت میں نظر آجاتا ہے۔ ان میں پشتہا پشت سے محیر العقول، مخصوص احسانات و انعامات کا سلسلہ جاری تھا، فرمایا: ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَاۗءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [المائدة: ۲۰] (تم پر خدا نے جو احسان کئے ہیں) ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں پیغمبر پیدا کیے، اور تمہیں بادشاہ بنایا، اور تم کو اتنا کچھ عنایت کیا کہ اہلِ عالم میں سے کسی کو نہیں دیا)۔

مگر حسب و نسب، ریاست و نبی زادگی، صاحبزادگی اور پیرزادگی سے ان کا دماغی توازن حدِ اعتدال سے باہر ہوگیا تھا، اور ان میں طرح طرح کی قابلِ نفرت برائیاں پیدا ہوگئی تھیں، حتی کہ جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ و ہارون علیہماالسلام پر طنز و مذاق کرنے سے بھی نہیں شرمائے، اور منعمِ حقیقی جل شانہ کی شان میں متواتر گستاخیاں کیں (نعوذ باللہ) اگرچہ خدائی انعامات اور گوناگوں نوازشات، اور اسی طرح اس ناقدرشناس قوم کی ناشکری اور قباحتوں کی فہرست خاصی طویل ہے، مگر اس مقام سے چودہویں رکوع تک صرف دس عظیم الشان نعمتوں (احسانات) اور ان کی دس قباحتوں، اور دس انتقامات کی تفصیلی فہرست پیش کی جارہی ہے۔ اول اجمالاً ان نعمتوں کا تذکرہ ہے، پھر دوسری "یابني اسرائیل" سے، تیسری "یابني اسرائیل" تک ان کی تفصیلات ہیں۔ اس کے بعد پھر اجمال کے ساتھ (بطورِ خلاصہ) ان کو دہرایا گیا ہے، تاکہ پورے طور پر ان کا قابلِ اہتمام اور عظیم الشان ہونا واضح ہوجائے۔

سارے انبیاء علیہم السلام ایک ہی دین کے داعی ہیں:

بنی اسرائیل کا ایک طبقہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتا، اس کو یہودی کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحیثیتِ معصوم نبی نہیں مانتا، یہ نصاریٰ کہلاتا ہے۔ اول فرقہ دوسرے کا منکر ہے، جن کی کتاب توراۃ ہے۔ دوسرا طبقہ (نصاریٰ) یہود کو نہیں مانتے، ان کی کتاب کا نام انجیل ہے۔ قوله تعالى: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰي شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰي شَيْءٍ﴾ [البقرة: ۱۱۳] (اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں (کے مذہب) کی

کوئی بنیاد نہیں ہے، اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں (کے مذہب) کی کوئی بنیاد نہیں ہے)۔ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ﴾ [التوبة:۳۰] (یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے)۔

چونکہ یہ دونوں فریق اہلِ کتاب ہیں، اور پڑھے لکھے سمجھدار لوگ ہیں، جو محض جہالت کی بنیاد پر حق سے منحرف نہیں ہیں، جیسا کہ مشرکینِ عرب کے لوگ محض جہالت کی بنیاد پر کافر تھے، اور ان کا جہل بسیط رہا ہے، بخلاف یہود ونصاریٰ کہ وہ جہلِ مرکب کے مریض ہیں، اور ضد وعناد کی وجہ سے کافر ہیں۔

قرآن کریم اتمامِ حجت کی خاطر بنی اسرائیل کے موجودہ خواص وعوام سب کو خطاب فرما کر انہیں اللہ تعالیٰ کی بے شمار انعامات کی یاد دہانی کرا رہا ہے، جو ان کے گزشتہ آباء واجداد پر موقع بموقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ انہیں دعوتِ اسلام بھی دی جا رہی ہے، اور ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ اسلام وہی دینِ الٰہی ہے جو تمہارے انبیاء کرام علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ دینِ اسلام اور تمہارے دین کے بنیادی اصول وعقائد میں کوئی بال برابر کا بھی اختلاف نہیں ہے، اور یہ آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پیغمبروں کی تصدیق اور عزّت واحترام کرنے والے ہیں، جبکہ ان کی کتاب (قرآن حکیم) تمہاری آسمانی کتابوں (تورات وانجیل) کی تصدیق کرنے والی ہے۔

شاید تمہیں اپنی کتابوں کے متعلق اتنی صحیح معلومات حاصل نہیں ہیں، جس قدر کہ قرآن کریم تمہیں وضاحت سے خبردار کر رہا ہے، اور تمہیں آگاہ کر رہا ہے کہ تم تورات وانجیل کی پیروی کرنے، اور ان کی ہدایات پر عمل کرنے میں بری طرح ناکام ہو چکے ہو، اب قرآن مجید پر ایمان لائے بغیر تمہاری نجات اور فلاح ہرگز ممکن نہیں۔ بلا شک قرآن کریم پر ایمان لانے کے ساتھ تم گزشتہ تمام فروگزاشتوں اور ناکامیوں کی تلافی کر سکتے ہو، اور ابدی سعادت بآسانی حاصل کر سکتے ہو۔ اگر تم قرآن کریم کی دعوت پر لبیک کہو گے، تو ہر قسم کی شقاوتوں سے نجات پاؤ گے، کیونکہ قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں کے لئے مطلقاً ناسخ ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری آسمانی کتاب کے حکموں پر چلنے اور عمل کرنے کی نہ گنجائش ہے، نہ کوئی اعتبار، کیونکہ قرآن کریم تمام آسمانی کتابوں کا جامع اور خلاصہ ہے، جو رہتی دنیا تک اپنی اصلی شکل وصورت والفاظ کے ساتھ محفوظ ہے۔ اس میں ذرہ برابر کسی کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں ہوگا، بخلاف دیگر آسمانی کتابوں (تورات، انجیل زبور وغیرہ) کے، کہ وہ محرف (تحریف شدہ) ہیں۔ پس قرآن کریم پر ایمان لائے بغیر کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

حضورِ انور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "لَوْ كَانَ مُوْسىٰ حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِىْ" ۔[مشکوۃ]
اگر موسیٰ علیہ السلام حیات ہوتے تو انہیں بھی میری نبوت و میری کتاب کی اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا، اور جب عیسیٰ علیہ السلام قربِ قیامت میں آسمان سے نزول فرمائیں گے، تو قرآن حکیم کے احکامات پر عمل کریں گے، اور شریعتِ محمدی کی دعوت دیں گے، کیونکہ ان کی اپنی شریعت منسوخ ہو چکی ہوگی۔

آیاتِ مذکورہ کا اجمالی خاکہ:

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ﴾ آیت نمبر ۴۰ سے ۴۶ تک آٹھ اوامر، اور چار نواہی کا ذکر ہے۔ امرِ اول تذکیر بآلاء اللہ، امرِ دوم ایفائے عہد، امرِ سوم مقدمۂ تقویٰ اور اس کا التزام، امرِ چہارم دعوت اِلَی القرآن، امرِ پنجم حقیقتِ تقویٰ، امرِ ششم اقامتِ صلوٰۃ، امرِ ہفتم اداءِ زکوۃ، امرِ ہشتم خشوع و خضوع۔ اس کے ساتھ چار نواہی میں سے اول نہی از انکارِ قرآن کریم، نہی دوم دین فروشی، نہی سوم تلبیسِ حق مع الباطل، نہی چہارم کتمانِ حق۔

معارف و منازل

اسرائیل عبرانی لفظ ہے، اس کے معنی عبداللہ کے ہیں۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں: یعقوب اور اسرائیل علیہ السلام۔ قرآن کریم نے ان کو بنی یعقوب کہہ کر خطاب نہیں کیا، بلکہ دوسرے نام، یعنی اسرائیل کا لفظ استعمال کیا۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ عبداللہ، یعنی اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے کی اولاد ہیں۔ ہمیں بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر موحد عبادت گزار بندہ بننا چاہئے، جس کا تذکرہ سورۃ البقرہ آیت ۱۳۳ میں تفصیلاً مذکور ہے۔

﴿اُذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی عمومی اور خصوصی ہر قسم کی بے شمار نعمتیں مراد ہیں، خصوصی نعمتوں کی تفصیل دوسرے رکوع میں آنے والی ہے، مثلاً ہزاروں پابندیوں کے باوجود جناب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، پھر فرعون کی گود میں ان کی پرورش، پھر ان کی رسالت و نبوت، اس کے بعد دریائے قلزم سے بخیر و عافیت ان کا پار ہونا، فرعون کا مع اپنے جرار لشکر کے دریا میں غرق ہونا، بنی اسرائیل کا پانچ سو سالہ فرعون کی غلامی اور ظلم و ستم سے آزاد ہونا، اور ملکِ شام و فلسطین میں ان کو بسانا، منّ و سلویٰ اور دیگر جنتی نعمتوں سے ان کی ضیافت، تورات کا نزول اور احکامِ الٰہیہ کی ہدایات انہیں عطاء کیا جانا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ نے تورات میں ان سے عہد لیا تھا، اقرار کرایا تھا کہ تورات کے حکموں پر قائم رہو گے، اور جو نبی بھیج دوں اس کے مددگار رہو گے، وغیرہ، مگر وہ گمراہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی۔ بجائے شکر گزاری کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نافرمانی کی، اور ایذا رسانی پر کمربستہ ہو گئے۔ چند باتوں پر عمل پیرا ہوئے، باقی احکام کی مخالفت کر کے بدنیتی شروع کی۔ رشوت ستانی، سودخوری پر ڈٹے رہے۔ نفاق، جھوٹ، بدعہدی اور خیانتوں میں منہمک رہے۔ مسئلہ غلط بتاتے اور خوش ہوتے۔ خوشامد کے واسطے حق باتوں کو چھپاتے رہتے۔ تورات میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو صفات لکھی ہوئی تھیں انہیں بدل ڈالا۔ جہاد کے احکام پسِ پشت ڈال کر منکر ہو گئے، اور تمام عہود و میثاق سے منحرف ہو گئے۔

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ اس عہد سے مراد یا تو وہی عام عہد ہے، جس کو ''عہدِ الست'' کہتے ہیں، یا ان عہود و میثاق کی طرف اشارہ ہے، جو ان سے انبیاء کرام علیہم السلام کی معرفت وقتاً فوقتاً لئے گئے تھے، جن کا ذکر قرآن کریم میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً: ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾ [المائدۃ:۱۲] (اور خدا نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا، اور ان میں ہم نے بارہ سردار مقرر کئے)۔ اور ﴿لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ [آل عمران:۱۸۷] (اور تحقیق کے ساتھ خدا نے ان لوگوں سے جن کو کتاب عنایت کی گئی تھی اقرار لیا)۔

اسی طرح ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ [آل عمران:۸۱] (اور جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں، پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے، جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے، تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا)۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر انسان کا عہد کیسے؟

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگر کوئی عہد کسی کو یاد نہ ہو، تب بھی خالق اور مخلوق کے مابین، محسن اور محسن الیہ (مُنعِم اور مُنعَم علیہ) کے درمیان قدرتی اور طبعی طور پر ایک عہد ہوتا ہے۔ جب کسی کے انعامات اور احسانات سے آپ فائدہ اٹھائیں گے تو اس کا صاف واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کے فرمانبردار اور شکرگزار رہیں گے، خواہ اس قسم کا کوئی عہد نامہ لکھا جائے، یا نہ لکھا جائے۔ ماں اور بچے کے درمیان کوئی عہد نامہ نہیں لکھا جاتا، لیکن ہر بچہ طبعی طور پر

جوان ہو کر اس بات کو جانتا ہے کہ مجھے ماں کی اطاعت کرنی چاہئے، اور اس کی فرمانبرداری اور خدمت میرے لئے ضروری ہے، اسی طرح زوجین کا معاملہ بھی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے گونا گوں اور بے شمار ظاہری و باطنی احسانات سے ہم شب و روز بہرہ مند و متمتع ہوتے ہیں، اس کا صاف واضح مطلب یہ ہے کہ اس کی ہر نعمت عہد نامہ کی ایک سطر ہے، خواہ بندہ کوئی عہد نامہ لکھے یا نہ لکھے۔ اسی طرح ان انعاماتِ الٰہیہ کا لامتناہی سلسلہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ فرمانبردار اور شکر گزار لوگوں سے اللہ ربّ العزّت کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کو ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کا بدلہ اور صلہ عطا فرماتا رہے گا، یہاں تک کہ ان کو جنت میں پہنچا کر دائمی طور پر انہیں جنت کا مالک بنادے گا۔

یہی وہ عہد و پیمان ہے جس کی طرف مذکورہ آیت میں اشارہ فرمایا ہے، قولہ تعالیٰ:

﴿أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ [الآية] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح قرآن حکیم میں ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ [التوبة:٧٢] اور ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾ [النور:٥٥] اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ [التوبة:١١١] آخر میں ارشاد ہے: ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ﴾ [التوبة:١١١] جابجا مؤمنین کے ساتھ عہد و پیمان کا ذکر ہے۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ سابقہ کتبِ سماویہ میں ربّ العزّت سبحانہ نے بنی اسرائیل سے بھی اس قسم کے الفاظ فرمائے ہوں، اور انبیاء سابقین علیہم السلام کی معرفت اس قسم کے عہد و پیمان بنی اسرائیل سے کیے ہوں، جیسا کہ قرآن حکیم میں اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، فرمایا: ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ﴾ [ال عمران:١٩٥] یعنی میں نے جو وعدہ تم سے کیا ہے میں بھی اس کو پورا کروں گا، یعنی دنیا میں بہترین اور باعزت زندگی عطا کروں گا، اور آخرت میں دائمی راحت اور ہر مصیبت سے نجات دوں گا۔ آخر میں ارشاد ہے:

﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (خاص مجھ ہی سے ڈرو)۔ اس کا مطلب بھی واضح ہے کہ تم جو دنیوی لالچ اور دنیوی خوف کی وجہ سے میرے حکم سے عدول کر رہے ہو، یہ طریقہ بہت ہی غلط ہے، خوف اور ڈر کے لائق تو صرف میری ہی ذات ہے، لہذا صرف مجھ ہی سے ڈرا کرو، اور جن پیشین گوئیوں کا ذکر تمہاری کتابوں میں موجود ہے، اس کے مطابق جو رسول پیغمبر آئے ہیں، اور جو کتاب (قرآن کریم) آئی ہے، اس کو بلا کسی خوف اور بلا کسی چون و چرا کے تسلیم کرو۔

﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ (اور ایمان لاؤ اس چیز پر

جو میں نے نازل کی ہے، جس کی حالت یہ ہے کہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے، اس پر ایمان لاؤ، اور تم میری نازل کردہ چیز کے انکار کرنے میں پہل کرنے والے نہ بنو)۔ اور میری آیات واحکام کو تھوڑی اور معمولی خسیس قیمت پر فروخت کرتے نہ پھرو، اور صرف میری ہی ناراضگی سے بچتے رہو۔

کتبِ سابقہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ آخری زمانے میں جو رسول آئیں گے، وہ برحق نبی تمہاری کتاب کو سچا بتانے والے ہوں گے۔ یہ ایک علامت تھی، تا کہ بنی اسرائیل اس علامت کو دیکھ کر اس پر ایمان لے آئیں۔

﴿بِمَآ اَنْزَلْتُ﴾ سے مراد یا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یا قرآن کریم ہے۔ (ہم نے دونوں احتمال کی رعایت رکھی ہے)۔

یہ بھی یاد رہے کہ چونکہ توریت میں یہ علامت مذکور تھی، اس لئے قرآن حکیم میں بار بار ارشاد ہوا ہے: ﴿وَلَمَّا جَآءَ هُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۸۹] (اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف کتاب آئی جو تصدیق کرنے والی ہے اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے)۔ اور فرمایا: ﴿وَلَمَّا جَآءَ هُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۰۱] (اور جب ان کے پاس رسول آئے اللہ کی طرف سے جو تصدیق کرنے والے ہیں اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے)۔ گویا اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کریم کا نام ہی ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ رکھ دیا۔ یعنی وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو توریت اور انجیل کی تصدیق کرتے ہیں، یا وہ کتاب جو توریت وانجیل کی تصدیق کرنے والی ہے، اور جو کتاب تمہارے پاس ہے اس کو سچا (برحق) بتانے والی ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ [آل عمران: ۴] (لوگوں کی ہدایت کے لیے پہلے (تورات اور انجیل اتاری) اور (پھر قرآن کو جو حق اور باطل کو) الگ الگ کردینے والا (ہے) نازل کیا)۔

فائدہ:

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ تمہاری کتابوں میں توحید وصفات، عقیدۂ آخرت، احکام اور اطاعتِ رسول وغیرہ جو مذکور ہیں، وہی باتیں یہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں، اور وہی ملتے جلتے دلائل و احکام اس قرآن میں بھی ہیں، لہٰذا یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم تمہاری کتابوں کی سچائی اور صداقت کی تائید کرتے ہیں۔ پس جب اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم میں وہ نشانی (تصدیق) موجود ہے، جو تم کو بتائی گئی تھی، پھر

اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اور کفر میں پہل کیوں کرتے ہو؟ اور جب تم جانتے بوجھتے اور واقف و باخبر لوگ ایمان نہ لاؤ گے، تو عوام الناس بھی تمہاری دیکھا دیکھی (اقتداء کرتے ہوئے) ایمان لانے سے انکار کردیں گے، اور ان کے کفر کا وبال بھی تم پر پڑے گا۔

حضور اقدس سرور عالم ﷺ نے ہرقل روم کے نام جو نامہ مبارک حضرت دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں روانہ فرمایا، اس میں یہ عبارت درج ہے: اَسلِمْ تَسلَمْ یُؤْتِکَ اللہُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَاِنَّ عَلَیْکَ اِثْمَ الْاَرِیْسِیِّیْنَ۔ [بخاري] (آپ اگر اسلام قبول کریں گے تو ہر طرح سلامت رہیں گے، اور دُہرے ثواب کے حقدار بنیں گے، اور اگر تو نے روگردانی کی تو تیرے اوپر اپنے اعراض و انکار کے ساتھ پوری قوم رعایا کاشتکاروں کا بھی گناہ ہوگا، جو تیرے ایمان نہ لانے کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے)۔

نیکی اور بدی اسلام اور کفر کا بانی:

﴿اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ﴾ یہ قید واقعی ہے، احترازی نہیں ہے، کیونکہ کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد میں، بہر حال انتہائی ظلم اور جرمِ عظیم ہے، مگر اس آیت میں جو یہ فرمایا کہ "پہلے کافر نہ بنو" اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اول کفر اختیار کرے گا، تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا، اس کا وبال جس طرح اس شخص پر پڑے گا، اسی طرح اس سے پہلے کافر پر بھی اس کا وبال آئے گا۔ اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بن کر ان سب کے وبالِ کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہوجائے گا۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ: "قیامت تک جتنے قتل ہوں گے قابیل کا ان میں برابر کا حصہ رہے گا، کیونکہ سب سے پہلے قتل کی بنیاد اسی نے رکھ دی"۔ [متفق علیه] لہٰذا تم (بنی اسرائیل) "مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَیِّئَةً فَعَلَیْهِ وِزْرُهَا وَ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا"۔ [الحدیث، مشکوة] حکم کی رو سے اول کافر کہلاؤ گے، اگر تم لوگ ایمان نہ لائے اور کفر پر ڈٹے رہے۔ اسی طرح جو شخص نیکی اور خیر کی داغ بیل ڈال کر دوسروں کی خیر و نیکیوں کا سبب بنے گا، اس شخص کو اپنی نیکیوں کے ثواب کے ساتھ بانی ہونے کے لحاظ سے بھی اُس نیکی کرنے والوں کے برابر ثواب ملے گا، بحکم: "مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ"۔ [مشکوة]

اسی قاعدہ کی رو سے کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سید التوابین ہیں، کیونکہ توبہ اور عجز و انکساری اور رجوع الی اللہ کے وہ سب سے پہلے بانی ہیں، اور ابلیس حسد و کبر و غرور کی وجہ سے قیامت تک کے نافرمانوں کا سردار کہلائے

گا، اور قیامت تک کے گناہوں کا وبال اس کی گردن پر ڈالا جائے گا، اور اسی قاعدہ کی رو سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیفۂ اعمال میں قیامت تک امت کی تمام نیکیاں اور حسنات واعمالِ صالحہ درج ہوں گے، جو کہ تمام حسنات کے بانی اور داعی رہے۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَصَحْبِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّاتِہٖ وَسَلَّمَ

اس کے بعد علماءِ امت، صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین صوفیا، مجاہدین اور اصحابِ حدیث وغیرہم علماءِ امت کا یہی امتیاز وشرف ہوگا، کہ جن جن اعمال کی بنیاد ڈال کر انہوں نے امت کی رہنمائی فرمائی، وہ سارے اعمال تا قیامِ قیامت ان کے نامۂ اعمال کی زینت بنیں گے۔ الحمدللہ

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ یہاں خطاب اگرچہ عام ہے، مگر مراد بنی اسرائیل کے مذہبی علماء اور اور پیشواؤں کو تنبیہ کرنا ہے، جو کہ دین فروشی جیسے مذموم کاروبار میں ملوث تھے۔ ان نام نہاد احبار ورہبان کی حالت یہ تھی کہ وہ محض لوگوں کے دباؤ اور دنیوی لالچ اور اپنی عزّت کے خیال سے، اور چند دیگر دنیوی مفادات کے حصول کی خاطر حق بات چھپا کر، یا تاویل کر کے احکامِ الٰہی کو بدل دیا کرتے تھے، اور حکام وامراء کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان کی منشاء کے مطابق ہر طرح کے فتوے دیتے تھے، جیسا کہ عام طور پر ہر زمانے میں سرکاری علماءِ سوء کا رویہ و عمل ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یا قرآن حکیم اور اسلام کے متعلق توریت وانجیل میں جو مواد وحقائق لکھے ہوئے ہوتے تھے، انہیں نظر انداز کر کے یا تبدیل وتحریف کر کے عوام الناس کو گمراہ کرتے، اور انہیں ایمان لانے سے منع کرتے تھے، تاکہ ہماری ریاست ووجاہت کو نقصان نہ پہنچے، اور ہمارا اقتدار زوال پذیر نہ ہو۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا﴾ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ معمولی قیمت کے بدلے قرآن کریم فروخت کرنا جائز نہیں ہے، زیادہ قیمت کے بدلے جائز ہے، بلکہ دین ومذہب فروشی ہر حال میں حرام وممنوع ہے۔ حق فروشی کے معاوضہ میں انسان دنیا بھر کے مال ومتاع اور پوری دولت بھی اگر لے لے تو پھر بھی معمولی اور قلیل ہی رہے گی۔ ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ﴾ [النساء:۷۷] (کہہ دیں کہ دنیا کا ساز وسامان بہت تھوڑا ہے)۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ ربّ العزتّ کے نزدیک اگر دنیا کی حقیقت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی، تو کافروں کو ایک گھونٹ سادہ پانی بھی ہرگز نصیب نہ ہوتا۔ [ترمذي] پس آیت کریمہ کا منشاء یہ ہے کہ مذہب کی تجارت نہایت قبیح اور ذلیل حرکت ہے، اور پھر وہ بھی چند ٹھیکروں کے عوض۔ یہ برائی در برائی اور نہایت

حقیر ہے، اور ایسا غلط کاروبار با جماعِ امت مذموم اور حرام ہے۔

تعلیمِ قرآن مجید پر اُجرت لینا کیسا ہے؟

رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح صحیح بتلا کر، یا پڑھا کر اس کی اُجرت لینا کیسا ہے؟

جواب: اس کا تعلق آیتِ مذکورہ کے ساتھ نہیں ہے۔ فقہاء امت کا اس میں اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم) جائز قرار دیتے ہیں۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے ائمہ منع فرماتے ہیں، کیونکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن حکیم کو ذریعہ کسب و معاش بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متاخرین احناف نے بھی جب ان حالات کا مشاہدہ کیا کہ پہلے زمانے میں قرآن حکیم کے معلّمین کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلّمین کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت و مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں، تو بچوں کی تعلیمِ قرآن کا سلسلہ یکسر بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیمِ قرآن مجید پر تنخواہ اور معاوضہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر فتویٰ دینا چاہئے کہ تعلیمِ قرآن پر اُجرت و تنخواہ لینا جائز ہے۔

صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بھی بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیمِ قرآن مجید کی طرح دین کی بقاء موقوف ہو، مثلاً امامت، اذان اور تعلیمِ حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیمِ قرآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی ہے۔ [در مختار، شامی]

ایصال ثواب کے لئے ختم قرآن پر اُجرت لینا کیسا ہے؟

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے درمختار کی شرح ردالمحتار میں، اور اپنے رسالہ شفاء العلیل میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تعلیمِ قرآن وغیرہ پر اُجرت لینے کو جن متاخرین فقہاء نے جائز قرار دیا ہے، اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے، جس میں خلل آنے سے دین کا پورا نظام مختل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے مُردوں کو ایصالِ ثواب کے لئے ختم قرآن کرانا، یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اُجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں ہے، جب اُجرت لے کر پڑھنا حرام ہوا، تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہ گار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا، تو میت کو کیا پہنچے گا؟

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعۃ، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین علی البحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین رملی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر پڑھوانا، یا اُجرت دے کر ختم قرآن کرانا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور اسلاف امت سے کہیں منقول وثابت نہیں ہے، اس لئے یہ بدعت اور مذموم ہے۔ [شامي: جلدأول، ص: ۴۷۰]

﴿وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴾ اوپر کی آیت میں ﴿فَارْهَبُوْنِ﴾ فرمایا، اور یہاں ﴿فَاتَّقُوْنِ﴾ ارشاد فرمایا۔ ''رَھْب'' خوف کی ابتدائی حالت کو کہتے ہیں، اور تقویٰ انتہائی اور کامل خوف کا نام ہے، اس لئے دونوں میں فرق ہے، یا اوپر کی آیت میں حکمِ عدولی سے ڈرانا تھا، اور یہاں اپنے غصہ اور اپنے عذاب سے ڈرانا مقصود ہے۔ واللہ اعلم

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی (حق کو باطل کے ساتھ اور ناحق کے ساتھ گڈمڈ مخلوط نہ کرو، اور جان بوجھ کر حق کو چھپاؤ نہیں)۔

خودغرض اور حرص وہوا کے بندے احکامِ الٰہی کو دو طرح سے بدلتے تھے: ایک تو حق بات کو چھپالیا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ بات تورات میں نہیں ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ: ''یہود میں ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا، یہودیوں نے انہیں لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان یہود سے پوچھا کہ تمہاری کتاب تورات میں زنا کے متعلق کیا سزا مقرر ہے؟ کہنے لگے: تورات میں زنا کی سزا صرف یہ ہے کہ زنا کاروں کا چہرہ سیاہ کر کے انہیں بازار میں گھما کر شرمندہ کیا جائے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جو کہ تورات کے عالم تھے کہنے لگے: تم جھوٹ بولتے ہو، توریت میں زانی کے لئے رجم کا حکم باقاعدہ موجود ہے۔ ﴿فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [آل عمران: ۹۳] (لاؤ تورات اور پڑھ لو، اگر تم سچے ہو) چنانچہ وہ تورات کو لے کر آئے، ان کے عالم نے تورات پڑھنا شروع کیا، آیتِ رجم پر انگلی رکھ کر ماقبل ومابعد کی آیتیں پڑھنے لگا، اور آیتِ رجم چھوڑ گیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انگلی اٹھاؤ! اس کے نیچے والی آیت پڑھو، جب انگلی اٹھائی، تو صاف صاف آیتِ رجم کھلی ہوئی معلوم ہوئی۔ پس پڑھنے والا شرمندہ ہو کر کہنے لگا: یا ابا القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آیتِ رجم یہ ہے، اور برحق ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں زانیوں پر حدِ رجم جاری فرمائی۔ [بخاري]

اس قسم کے اور کئی بے شمار واقعات کتب حدیث وسیرت میں موجود ہیں، جہاں وہ لوگ احکامِ الٰہی کو چھپا کر ظاہر نہیں کرتے، تو مؤمنینِ اہلِ کتاب ان سے پردہ اٹھا کر ظاہر کرتے۔

دوسرا یہ کہ اگر کوئی بات چھپا نہ سکتے تھے، تو اس میں دور دور کی منگھڑت توجیہات اور تاویلات کیا کرتے تھے، اور حقیقتِ مسئلہ کو کسی غیرِ مقصد کی طرف پھیر کر اس کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ بسا اوقات تاویل کے زور سے حرام کو حلال، یا بالعکس کسی ذاتی مقصد کی خاطر ثابت کرنے کی فضول کوشش کرتے۔ اگر کوئی آیت یا حدیث پیش کرتے، تو اس کے مطلب میں عجیب وغریب تاویلات کر کے کوئی عبارت مقدر نکالتے، یا حقیقت اور مجاز کا چکر چلا کر طرح طرح کے کرتب دکھلاتے، جیسے عام وخاص، مطلق ومقید، فرض ومباح وغیرہ۔ علماءِ سوء، سرکاری اور حکام و امراء کے گماشتے لوگوں کا ہر زمانہ میں یہی طور وطریق رائج رہا ہے۔

اس شنیع کردار اور ناپاک جسارت میں یہودی علماءِ سوء ہی مجرم اور تنہا نہیں، بلکہ اس آخری امت کے علماءِ سوء ان سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ اَنَّ اَحَدَهُمْ دَخَلَ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ"۔ (یعنی تم لوگ علم وعمل، کردار و اخلاق اور شکل وشباہت میں یہود کی چال چلو گے، ایک ایک بالشت، اور ذراع کے ساتھ) وفی روایۃ: "حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ"۔ (ایسا برابر چلو گے، جیسے ایک جوتی کی دوسری جوتی کے ساتھ برابری ہو۔ یہاں تک کہ اگر ان (یہود و نصاریٰ) میں سے کوئی گوہ کے سوراخ میں گھسا ہے، تو تم بھی ان کی اقتداء کر کے گھس جاؤ گے)۔ مطلب یہ کہ اگر وہ کوئی ناجائز اور نامعقول غلط عمل کریں گے تو تم بھی وہی کام کرو گے۔ جیسے آج پورے عالمِ اسلام میں سرسری نظر ڈالنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پورے کے پورے معاشرے غیر اسلامی ہیں، اور تمام مسلم ممالک کا معاشرہ اول سے آخر تک یہودیت ونصرانیت کا ظل وسایہ اور عکس ہے۔ فإلی اللہ المشتکی

یہ تو ہے عوام کا حال، اور عوامی معاشرہ۔ دوسری طرف علماءِ سوء کے گھناؤنے کردار جو قرآن وسنت کی تبدیلی اور اس کے اصلی چہرے کو مٹانے میں، شرک، بدعت، تحریف والحاد اور غلط وبے بنیاد، منگھڑت تاویلات کے ذریعے دین کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ☆ ہو گئے کتنے فقیہانِ حرم بے توفیق

یہ پیران حرم ہیں جو چرا کر بیچ کھاتے ہیں ☆ گلیم بوذرؓ و دلق اُویسؓ و چادر زہراءؓ
زمن بر صوفی وملا سلامے ☆ کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شان در حیرت انداخت ☆ خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را
(اقبالؒ)

یہ موجودہ صورت حال کوئی نوزائیدہ نہیں ہے، بلکہ یہ سلسلہ خلافتِ راشدہ کے آخری دور سے شروع ہوا، اور شاید قیامِ قیامت تک مسلسل جاری رہے گا۔ البتہ! ہر زمانہ اور ہر سو سال کے بعد گرگٹ کی طرح یہ زندقہ والحاد رنگ و حلیہ بدلتا رہے گا۔

خلافتِ عباسیہ کے دور میں معتزلہ علماء نے قصرِ امارت پر قبضہ جما کر اہلِ حق علماء کے ساتھ وہ وہ ظلم وستم روا رکھے جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیوقوف خلیفہ کے فرمان پر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ و دیگر علماء اہلِ سنت پر بے تحاشا کوڑے برسائے گئے، اور سینکڑوں اہلِ حق علماء، محدثین اور فقہاء کو شہید کیا گیا، اور ہزاروں کی تعداد میں کالی کوٹھڑی اور زندان میں ڈالے گئے۔ ان سب مظالم کے پیچھے علماء سوء، درباری علماء کا کردار وفتویٰ ہوتا تھا، جو کہ باقاعدہ صبح وشام قصرِ خلافت میں تین تین سو کے قریب براجمان رہتے تھے، اور خلیفہ وقت کو غیر اسلامی پٹی پڑھا کر قرآن وسنت کے خلاف کھیلوں میں مصروف رکھتے۔ پھر اسی گروہ بد گہر نے تیمور لنگ جیسے دشمنِ اسلام کو علماءِ حق کے خلاف بھڑکایا، فلسفہ ومعقولات، یونانی علوم وفنون کی ترویج واشاعت پر انہیں ابھارا، اور تیار کیا، رفتہ رفتہ انہی احبارِ سوء ورہبانِ ناعاقبت اندیشوں نے جلال الدین اکبر کو ملحد بنا کر دعویٰ نبوت پر مجبور کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ پورے برصغیر بشمول افغانستان وبرما وغیرہ پر اکبر کی حکمرانی تھی، جہاں دربار پر آتے ہی سب سے پہلے درباری مولانا صاحب تعظیمی سجدہ ادا کرتا تھا، اور اسی تعظیمی سجدہ سے انکار پر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی ہستی کو بحکمِ سرکار، بہ فتوی درباری علماء گوالیار میں قید وبند کی کوٹھڑی میں ڈالا گیا تھا۔ پھر حالات بدل گئے، جہانگیر آئے، اور ان کے بعد شاہ جہان آئے، ان کے بعد مسندِ خلافت پر ایک نامور فرشتہ صفت حضرت محی الدین اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ آئے، بقول علامہ طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ جوہری مصری چھٹے خلیفہ راشد آئے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔ شاعر مشرق عاشق مصطفیٰ ترجمان امت علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کہا۔

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے ☆ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس زرّین دور پر زوال اس وقت آیا جب المغضوب، الضالین، مکار وعیار اور خونخوار انگریزوں کا برصغیر پر قبضہ ہوا۔ یہ داستان نہایت دلگداز بھی ہے، اور طویل بھی۔ جب برصغیر میں اہلِ حق، محافظینِ کتاب وسنت دس ہزار سے زائد، معلّمین، مفکرین، محدثین، مفسرین، فقہاء، واعظین، مصنفین اور خطباء علماء کرام کو انگریزوں نے شہید کیا۔ دراصل ان کی شہادت اور انگریزوں کی اقتداء وشقاوت کے پیچھے بہت سارے علماء سوء، صوفیاء سوء، اور مجدّ دینِ سوء (جیسے مرزا قادیانی ملعون) وغیرہ کے فتاوے، اور ہر قسم کی ہمدردیاں انگریزوں کو حاصل رہیں۔ إنا لله و إنا إليه راجعون

پھر یہاں سے مجددوں، اولیاء سوء، شرک وبدعت کے علمبردار، کتاب وسنت میں یہود علماء کی طرح ہر قسم کے الحادی، زندیقی اور حربی منکرینِ ختم نبوت، محرّفینِ کتاب وسنت کا المناک دور شروع ہوا، اور انگریزوں سے مراعات اور بڑے بڑے القاب پانے والے جیسے مرزا ملعون، اعلیٰ حضرت، شمس العلماء اور سر کا خطاب پانے والے سرسید احمد خان جیسے ملحد پیدا ہوئے۔ آج برصغیر کے کونے کونے میں انہی کا راج ہے، اور ہر محاذ پر انہی کا طوطا بول رہا ہے۔ مگر کیا کیا جائے؟ سنت اللہ یہی رہی ہے کہ: ”مَاأَنْزَلَ اللهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ مَعَهُ شِفَاءً لَاتَزَالُ طَائِفَةٌمِنْ أُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَايَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ“۔ [الحديث متفق عليه] لِكُلِّ فِرْعَوْنٍ مُوْسىٰ وَلِكُلِّ مُبْطِلٍ مُحِقٌّ [مقولة]

اللہ ربّ العزّت نے اپنے دین کی احیاء وحفاظت اور نشاۃِ ثانیہ کے لئے ہر قرن، ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر وطن میں ایک جان نثار، سرفروش، متبعِ کتاب وسنت علماء کا طبقہ ہمیشہ زندہ اور چاق وچوبند رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے، جو ہزاروں بے سروسامانی اور تنہائیوں کے باوجود دین کی حفاظت پر تکوینی طور پر مامور رہتے ہیں، اور ہر قسم کے حکمرانوں اور وزیروں کی عنایات وبخششوں سے مستغنی رہتے ہیں، سوائے ربّ العزّت سبحانہ کے کسی بھی دروازے پر دستک دے کر حاضری نہیں لگاتے ہیں۔ ”اَللّٰهُمَّ اقْذِفْ فِيْ قَلْبِيْ رَجَاكَ وَاقْطَعْ رَجَائِيْ عَمَّنْ سِوَاكَ حَتّٰى لَا أَرْجُوْ أَحَدًا سِوَاكَ، اللهم اجعلنا منهم“۔ أمين۔ یہ ان کا ورد و وظیفہ ہے۔ وفي الحديث: قال النبي صلى الله عليه وسلم: مَنْ ازْدَادَ عِلْمًا وَلَمْ يَزْدَدْ فِي الدُّنْيَا زُهْدًا لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللهِ إِلَّا بُعْدًا وَفِيْ رِوَايَةٍ ثُمَّ لَمْ يَزْدَدْ لِلدُّنْيَا إِلَّا حُبًّا ازْدَادَ اللهُ عَلَيْهِ غَضَبًا۔ [مسند الفردوس عن على ﷺ مرفوعًا]

ایسے لوگ علم وامامت کے ہرگز حقدار نہیں جنہیں علم نے دنیا کی محبت اور لالچ سے آزاد اور بیزار نہ کیا ہو، کیونکہ ترکِ دنیا علم کی ذاتی صفت اور اس کی معرفت ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو مگر اس میں زہد وتقویٰ کی جتنی کمی ہوگی،

اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ سے دور سمجھا جائے گا، اور وہ خلقِ خدا کی امامت و سربراہی سے سراسر محروم و بے نصیب ہوگا۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق ☆ جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

فتنہ ملت بیضاء ہے امامت اس کی ☆ جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے

دل شہنشاہی شکم سامان موت ☆ فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

(اقبال)

جب آگ میں حرارت نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں، پانی میں برودت نہ ہو وہ پانی نہیں، اور چراغ بغیر روشنی کے چراغ نہیں، جاندار حیوان بغیر حرکت کے جاندار نہیں، اسی طرح اگر علم میں زہد و تقویٰ نہ ہو، تو وہ شیطانی علم ہی ہوگا۔ جب تورات کا عالم بغیر عمل اور زہد کے ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعة:۵] (گدھے کی طرح کتابیں لادے ہوئے) کے بموجب گدھوں میں شمار ہوا، تو قرآن حکیم کا عالمِ بے عمل شاید گدھے سے بھی بدتر ہوگا۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ قرآن فروش عالم کو جب جہنم میں ڈالا جائے گا، تو بیک لخت جہنم کا عذاب تیز ہوگا، اور اس کی کیفیت خطرناک حد تک بدل جائے گی۔ جہنمی ناقابلِ برداشت سراسیمگی کے عالم میں پوچھیں گے: یہ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ انہیں بتلایا جائے گا کہ بے عمل عالم کا داخلہ ہوا، جس نے علم جیسے جوہر، موتیوں کو حطامِ دنیا کے عوض بیچا اور غضبِ الٰہی کا مستحق ہوا۔ [ترمذي]

علم کے دو پہلو: سعادت اور شقاوت:

علم بذاتِ خود اگرچہ اللہ ربّ العزّت کی ایک بہت بڑی بخشش و گرانقدر نعمت ہے، مگر وہ علی الاطلاق ذریعۂ نجات اور قربِ الٰہی کا ذریعہ نہیں ہے، کیونکہ اصل مقصد اور قربِ الٰہی کا سبب عملِ صالح ہے، چونکہ علم عمل کے لئے ایک مضبوط سیڑھی اور سبب ہے، اسی خاطر اس کا بڑا بلند مقام و مرتبہ ہے، اور یہ مقام عمل کے ساتھ مشروط و متعلق ہے۔ "عِلْمٌ بِلَا عَمَلٍ كَشَجَرٍ بِلَا ثَمَرٍ"۔ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ تجزیہ کر کے فرماتے ہیں:

علم را بر تن زنی مارے بود ☆ علم را بر دل زنی یارے بود

(مثنوی)

علم اگر دنیوی مقاصد کے لئے ہو، یا کسبِ معاش کی خاطر ہو، نفسانی خواہشات کی تکمیل اور حصول کا ذریعہ ہو، تو یہ علم ذریعۂ ہلاکت اور سببِ بربادی و خسران ہی ہوگا۔ یہ علم اس قابل ہرگز نہیں ہوگا کہ اسے میراثِ انبیاء و رُسل

علیہم السلام کا شرف حاصل ہو۔ یہ علم بلاشک بلعم بن باعورا اور شیاطین کی میراث کہلائے گی۔ یہود و نصاریٰ کے احبار و رُہبان اور عیسائی مؤرخین و مستشرقین کے پاس ایسے علوم و معارف کا اتنا بڑا خزانہ ہے، جسے دیکھ کر علماء اسلام انگشت بدنداں ہیں۔ یہ علم نہ محمود ہے، اور نہ ہی ذریعۂ نجات، بلکہ سببِ خسران و موجبِ حرمان ہی ہے۔

دنیا میں جتنے باطل نظریات اور ناپاک عقائد، باطل و گمراہ فرقے وجود میں آئے ہیں، ان کے بانی اور واضع ایسے دنیوی مذہب فروش اہلِ علم رہے ہیں، کسی بے علم جاہل کی مجال نہیں کہ وہ کوئی گمراہی پھیلائے، یا باطل عقیدہ و ناپاک فرقہ کی سرپرستی یا آبیاری کر سکے۔

شرک، بدعت، قبر پرستی، پیر پرستی جیسے گمراہ و باطل عقیدے آج جس کثرت سے چل رہے ہیں، اور دو تہائی اکثریت کے ساتھ بدعات و محرّمات اور غیر شرعی کافرانہ طور و طریقے مروّج ہیں، ان سب کے بانی و واضع وہ لوگ ہیں، جن کے علوم کے چرچے خاص و عام میں بڑے زور شور سے جاری ہیں، بمصداقِ قولہ تعالیٰ: ﴿وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ [الجاثیة:۲۳] (اللہ تعالیٰ نے (بھی) اس کو گمراہ کر دیا، اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی، اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب خدا کے سوا اس کو کون راہ پر لا سکتا ہے؟ بھلا تم کیوں نصیحت نہیں پکڑتے؟)۔

بقول رئیس المحققین حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ شیطان سے بڑا عالم شاید کوئی نہیں۔ [کبیر] ہاں! دوسرا پہلو ......علم را بر دل زنی یارے بود...... یہی اصلی حقیقی علم ہے، جس سے قلوب کی طہارت اور اعمال میں اخلاص کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ زنگ آلود قلوب کے لئے سوہان بن کر ہزاروں بداعمالیوں کا خاتمہ کر لیتا ہے، اور تزکیۂ نفوس و مراتبِ تقویٰ تک عروج و ترقی کا سبب ہے۔

یہی علم دراصل علمِ الٰہی کے انوار کا پرتو، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث ہوگا، جس کا فیض پورے عالم کو منوّر و روشن فرمائے گا۔ اس علم میں نفسانی خواہشات کے ادنیٰ ذرّہ کا اختلاط نہیں ہوگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اسلام، محدّثین، فقہاء اور صوفیاء رحمۃ اللہ علیہم کا زیور یہی علم ہے، اور اسی علم کے زیور سے وہ آراستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔ آمین

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ
اَنۡفُسَكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا
لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾ الربع

ترجمہ: اور قائم کرو نماز، اور ادا کرو زکوٰۃ، اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ ﴿۴۳﴾ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو فراموش کرتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۴۴﴾ اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ، اور بیشک یہ نماز البتہ بھاری ہے، مگر ان لوگوں پر جو عاجزی کرنے والے ہیں ﴿۴۵﴾ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں، اور بیشک وہ اسی پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ﴿۴۶﴾

ربط و مناسبت:

گزشتہ تین آیات میں ایمان وعقائد کا بیان ہوا، اب کی چار آیات میں اعمالِ صالحہ کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح پچھلی آیات میں مضرتوں، مثلاً ﴿وَلَا تَكُوۡنُوۡا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ ﴿وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا﴾ ﴿وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ﴾ کا بیان ہوا، اور اصولی طور پر دفعِ مضرت جلبِ منفعت پر مقدم ہوتا ہے، تو آئندہ چار آیات میں منفعتوں (نماز، صبر، رکوع، خشوع، خضوع، استعانت وغیرہ) کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر واضح ہے کہ مریض کے علاج میں دواء اور پرہیز دونوں کا لحاظ ہوتا ہے، اکیلی دوا مفید نہیں ہوتی۔ بنی اسرائیل قوم جہاں عقائد واعمال کو ترک کر چکی تھی، اور وہ بالکل پیچھے رہ گئی تھی، وہاں انہوں نے معاصی وگناہوں میں بھی سبقت حاصل کر لی تھی، اس لئے ان کے لئے طریقہ علاج اوامر ونواہی دونوں کے ساتھ بتایا جارہا ہے۔ واللہ اعلم

﴿اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ﴾ "صلوٰۃ" کے لفظی معنی دعاء کے ہیں۔ اس کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، تو رحمت کے معنی، اور فرشتوں اور انسانوں کی طرف ہو تو طلبِ رحمت اور دعاء کے معنی مراد ہوتے ہیں، ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَيۡهِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا﴾ [الأحزاب: ۵۶] (اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ مؤمنو! تم بھی ان پر دُرود اور سلام بھیجا کرو)۔ اور صلوٰۃ اصطلاحِ شریعت میں خاص عبادت، یعنی ارکانِ مخصوصہ کے معنی میں ہے۔ ایک اہم بابرکت عمل، جس سے کسی بھی نبی ورسول کا دین اور امت مستثنیٰ نہیں ہے۔

مطلق نماز کا حکم قرآن کریم میں صرف چند جگہ مذکور ہے، باقی ستر (۷۰) کے قریب مقامات میں ''إقامة'' کے لفظ کے ساتھ تاکیداً آیا ہوا ہے، کیونکہ مطلوب صرف نماز نہیں، بلکہ مقصود اِقامتِ صلوٰۃ ہی ہے۔

''إقامة'' کے لفظی معنی سیدھا کرنے کے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں ہے: ﴿فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ﴾ [الکهف:۷۷] (وہاں ایک دیوار دیکھی جو (جھک کر) گرنا چاہتی تھی۔ خضر نے اس کو سیدھا کر دیا)۔

پس ''إقامة الصلوة'' کے معنی یہ ہوئے کہ تمام ظاہری، باطنی، شرائط، ارکان، آداب واحکام کی رعایت و التزام کے ساتھ نماز ادا کرنا۔

﴿اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں: پاک کرنا، طہارت، صفائی اور بڑھانا، زیادہ کرنا۔ قوله تعالیٰ: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ [البقرة:۱۲۹] (اور (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں گے، اور ان کا تزکیہ کریں گے)۔ اور اصطلاحِ شریعت میں مال کا مخصوص حصہ سالانہ فقراء ومساکین اور مستحقین پر تقسیم اور خرچ کرنا، کہ اس سے باقی مال پاک بھی ہوتا ہے، اور برکت کے ساتھ بڑھتا بھی ہے۔ قوله تعالیٰ: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ [البقرة:۲۷۶] (اللہ تعالیٰ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے)۔

صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ) اور نفلی صدقات سب میں یہی خصوصیت ہے، اور دیگر بے شمار منافع بھی ہیں، جبکہ ربوا اور سود میں سوائے تباہی کے کچھ بھی نہیں، اور اس کے علاوہ، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محاربہ اور جنگ کے مترادف بھی ہے۔

﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ رکوع کے لغوی معنی جھکنے اور سرنگوں ہونے کے ہیں۔ اس سرنگوں والے معنی کے لحاظ سے کبھی سجدے کو بھی رکوع کہتے ہیں۔ یہاں رکوع سے مراد نماز ہی ہے، باعتبارِ تسمية الكل باسم الجزء کے، وهو شائع، کمافي قوله تعالیٰ: ﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ [الإسراء:۷۸] (بیشک فجر کے قرآن میں حاضری دی جاتی ہے)۔ ﴿الفَجْر﴾ سے مراد صلوٰۃ الفجر ہے۔ ﴿قُرْآنَ الْفَجْر﴾ سے مراد: ''قِرَاءَةُ القُراٰنِ فِیْ صَلٰوةِ الفَجرِ وَ القِرَاءَةُ جُزءُ الصَّلٰوةِ''۔

البتہ! رکوع کی تخصیص میں شاید اس طرف اشارہ ہے کہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں ہوتا تھا۔ سورۃ المرسلات

کی آیت میں ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ﴾ [المرسلات:۴۸] (اور جب ان سے کہا جائے کہ رکوع کرو تو رکوع نہیں کرتے)۔

صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب کمر جھکانے کو بہت ہی معیوب سمجھتے تھے، جیسا کہ بنی ثقیف کے وفد کے سرداروں نے کہا تھا کہ ہم اس شرط پر نماز پڑھیں گے کہ نماز میں رکوع نہیں کریں گے۔ یہ ہمارے نزدیک بڑا عیب ہے۔ کمر تو جانور جھکایا کرتے ہیں، کیا ہم جانوروں کی طرح کمر جھکا کر نماز پڑھیں؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس دین میں رکوع نہیں، اس میں خیر و بہتری نہیں۔ [روح المعانی پارہ:۲۹] گویا یہود سے کہا جا رہا ہے کہ تم اسلام قبول کر کے رکوع والی نماز پڑھو، جس طرح مسلمان رکوع والی نماز پڑھتے ہیں۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو، اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ یہ آیت سابقہ آیت کی تاکید و تقریر ہے، اور اس میں ایک تعجب آمیز دھمکی بھی ہے، ہر قسم کی نیکی کو ''بِر'' کہتے ہیں۔ ''البر'' سے مشتق ہے، بمعنی وسیع میدان کے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت علماءِ یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ یہود میں سے کچھ لوگ جو مسلمان ہو گئے تھے، اپنے غیر مسلم یہودی عزیز و قریب رشتہ داروں سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے کہ تمہاری کیا رائے ہے کہ یہ نبی اور اس کا دین برحق ہے یا نہیں؟ تو ان کے عزیز و قریب کہتے کہ تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے دین پر قائم رہو، یہ برحق ہے، اور وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ سچ ہے، اور یہ کہنے والے خود مسلمان نہیں ہوتے، اور تصدیق نہیں کرتے تھے۔

بعض مفسرین حضرات نے کہا ہے کہ اس آیت کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ یہودی علماء اپنے عوام کو توریت پر عمل کرنے کی سختی سے نصیحت کرتے تھے، مگر خود توریت پر عمل نہیں کرتے تھے، اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو صفات توریت میں موجود تھیں، ان میں ردو بدل کر کے اپنے عوام سے چھپاتے تھے۔ [مظھری]

﴿وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ (حالانکہ تم کتابِ الٰہی پڑھتے ہو)۔ ''الکتب'' سے مراد توارات ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس تو کیا، نہایت قبیح ہے کہ دوسروں کو نیکی کا امر کرنا، اور خود نیکی پر عمل نہ کرنا۔ ایسے بے عمل واعظ معاشرے میں نہایت پست اور بے اعتبار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی باتوں پر ہرگز یقین نہیں ہوتا۔ لوگوں میں ان کا وقار اور دلوں سے ان کا احترام ختم ہو جاتا ہے، اور زبانی وعظ و تذکیر کا اثر عوام کے دلوں میں اس وقت ہوتا ہے جب

واعظ آپنے وعظوں پر سختی سے خود عامل ہو، کیونکہ لوگ واعظ کے وعظ پر توجہ کم کرتے ہیں، زیادہ تر اس کے عمل وکردار پر توجہ مبذول رکھتے ہیں۔

آج ہمارے زمانے میں اگر دیکھا جائے تو واعظوں کی اتنی کثرت ہے کہ کبھی یہ کثرت کسی زمانے میں نہ تھی۔ قدم قدم، گلی گلی، محلوں میں، مسجدوں میں، بازاروں میں وعظ وتذکیر کی وہ بھر مارو کثرت ہے، جو کبھی نہ تھی، مگر برکت سے اس لئے خالی ہیں کہ واعظ اور نصیحت کنندہ خود بے عمل ہے، دوسروں کو جو کچھ کہتا ہے، خود اس پر عمل نہیں کرتا، پس اس کا وعظ غیر مؤثر ہوجاتا ہے۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے تجزیہ کر کے کہا ہے: ؎

واعظان کاین جلوہ برمحراب ومسجد میکنند ☆ چون بخلوت میروند آن کار دیگر میکنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ☆ توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر میکنند

قرآن حکیم آفاقی عالمی اور ابدی کتاب ہے۔ وہ صرف یہودی احبار ورہبان کو خطاب نہیں کرتا، اور نہ ہی صرف ان کی اصلاح کرنے کے لئے نازل ہوا، بلکہ اس کے اولین مخاطب مسلمان علماء اور مسلمان عوام ہیں، اولاً و بالذات وہ مسلمان قوم کی اصلاح کرتا ہے، ثانیاً وبالتبع وہ اہلِ کتاب کا تذکرہ بھی کرتا ہے، اور ان کی کمزوریوں اور خامیوں سے ہمیں مطلع کرتا ہے، تاکہ ان کے اعمالِ بد سے ہم پرہیز کریں، اور ان کے عواقب ونتائج سے عبرت حاصل کریں۔

اسی لئے تو احادیثِ صحاح میں اس امت کے بے عمل واعظ ودیگر علماء کے بارے میں جو وعید ارشاد فرمائی گئی ہے، اگر غور وفکر سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو علماءِ بنی اسرائیل بالکل پسِ منظر میں چلے جائیں گے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات میں نے کچھ آدمی دیکھے کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کترے جارہے تھے، میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے واعظ ہیں۔ لوگوں کو تو نیکیوں کا امر کرتے تھے، اور اپنے آپ کو بھولتے تھے۔ (یعنی اس خیر سے آزاد رہتے تھے) حالانکہ وہ قرآن بھی پڑھتے تھے۔

حضرت اسامہ بن زید اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا، پھر اسے جہنم کی آگ میں پھینکا جائے گا، آگ میں اس کی انتڑیاں اور اوجھڑی سب کچھ نکل پڑے گا، پھر وہ اس کے پیچھے اس طرح گھومے گا، جس طرح گدھا اپنی چکی کے گرد گھومتا ہے،

اس کا یہ حال دیکھ کر دوزخ والے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے، اور پوچھیں گے: تیرا کیا حال ہے؟ تم تو ہمیں بھلائی کی باتیں بتلایا کرتے تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا، وہ کہے گا: ہاں! میں تمہیں برائیوں سے منع کرتا تھا، اور خود برائیوں میں مبتلا رہتا تھا۔ [مظہری]

ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیونکر پہنچ گئے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی باتوں پر عمل کر کے جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، وہ کہیں گے: ہم نے تمہیں ضرور بتایا، مگر خود عمل نہیں کرتے تھے۔ (ابن کثیر)

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مقصود اس آیت سے عالم اور واعظ کو تزکیہ اور اصلاح نفس حاصل کرنا ہے کہ خود اپنے وعظ پر عمل پیرا ہو، اسے وعظ ونصیحت سے روکنا، اور منع کرنا مراد نہیں ہے، کیونکہ لوگوں کو وعظ وہدایات اور تبلیغ کرنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور اپنے نفس کو پاک کرنا، اور معاصی سے بچنا یہ بھی ضروری ہے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، پس ایک حکم پر عمل نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے حکم کو چھوڑ بیٹھے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی یہ کہے کہ جب ہم غیبت اور حق تلفیاں کرتے ہیں، تو نماز کیوں پڑھیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا شخص سب کے نزدیک بیوقوف ہوگا۔ [مظہری]

یہ بات ذرا قابلِ توجہ ہے، کیونکہ نصیحت کے لئے اگر مکمل پرہیز گاری ضروری ہو، تو پھر دنیا میں کوئی نصیحت نہیں کر سکے گا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ جو شخص دوسروں کو نصیحت میں اس بات کا انتظار کرے کہ پہلے میں گناہ چھوڑ دوں، پھر دوسروں کو اس کے چھوڑنے کا کہوں گا، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے بغیر کوئی بھی تبلیغ کرنے والا نہیں ہوگا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے سواء گناہ سے بالکل پاک کوئی نہیں ہوگا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اس غلط خیال میں پڑ کر فریضۂ تبلیغ چھوڑ دیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وعظ کرنے والے کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ بے عمل کا وعظ مؤثر اور نتیجہ خیز اور بابرکت نہیں ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ بے عمل شخص کی مقطع، مسجع اور مقفیٰ عبارت میں وہ اثر نہیں ہوتا، جو ایک باعمل شخص کی سادہ عبارت اور شکستہ جملوں میں کوٹ کوٹ کر تاثیر بھری ہوتی ہے۔ مشہور بات ہے...... از دل خیزد بر دل ریزد

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ☆ پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

(اقبالؒ)

حضرت قطب الاقطاب سیدی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند نے والد صاحب سے اجازت چاہی کہ خانقاہ کی مسجد میں مجھے وعظ کہنے کی اجازت ہو۔ حضرتؒ نے اجازت دے دی، صاحبزادہ نے آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی، بزرگوں کے فرمودات اور واقعات نہایت جوش وجذبہ کے ساتھ مقفع، مسجع، فصیح وبلیغ عبارت میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر پیش کئے، اور رو رو کر وعظ سنایا، مگر لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا، اور کوئی ٹس سے مس بھی نہیں ہوا۔ آئندہ کے لئے صاحبزادہ نے وعظ نہ کہنے کا تہیہ کیا، اور والد سے کہا: لوگ بڑے بے حس ہیں۔

آئندہ جمعہ حضرتؒ خود تشریف لائے۔ منبر پر بیٹھتے ہی ارشاد فرمایا: رات کو میں نے اپنی سحری کے لئے برتن میں دودھ رکھا تھا، بلی نے آکر نوش کیا، اور میں نے بغیر سحری کے روزہ رکھا، بس اتنی بات کہنے کے ساتھ پورا مجمع بے خودی کے عالم میں چیخ چیخ کر رونے لگا، اور کئی لوگ بیہوش بھی ہو گئے۔ صاحبزادہ مجلسِ وعظ میں حاضر تھے، بیخود ہو کر وہ بھی بیہوش ہو گئے، اور جب ہوش سنبھالا تو فارسی میں کہنے لگے: ''میدانستم اگر از دل خیزد بر دل ریزد''۔ اسی روز سے یہ مقولہ مشہور ہوا، جسے علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا۔ واللہ اعلم

ایک شبہ کا ازالہ:

البتہ یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ بے عملی تو سب ہی کے لئے ممنوع اور بُری چیز ہے، پھر اس میں واعظ کی تخصیص کیوں ہے، کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور صرف اسی کے لئے یہ بہت بُری بات کیوں ہے؟

جواب (۱) تو یہ ہے کہ یقیناً بے عملی تو سب کے لئے منع ہے، مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ واعظ کے لئے بے عملی بہت بڑا جرم ہے، اور ان پڑھ کے لئے صرف جرم ہے، مگر اتنا بڑا نہیں، کیونکہ وہ لاعلمی کا عذر کر سکتا ہے، اگرچہ لاعلمی اس کے لئے الگ جرم ہے، مگر بے علمی کی وجہ سے بے عملی ہلکی پڑ جاتی ہے۔ اہلِ دنیا بھی اسے معذور اور قابلِ رحم سمجھتے ہیں، برخلاف واعظ اور عالم کے، کہ اس کو دانستہ جرم کی وجہ سے زیادہ مستوجب سزا سمجھا جاتا ہے۔ ''وَيْلٌ لِلْجَاهِلِ مَرَّةً وَوَيْلٌ لِلْعَالِمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً''۔ [حاشیہ تفسیر بیضاوی]

جواب (۲) جو کہ عام ہے، اور آیات کریمہ کے پورے مضامین پر مشتمل اور محیط ہے، وہ یہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو انسان کے لئے محنت طلب اور باعثِ نجات ورفع درجات ہے، وہ علم ہے۔ علم ہی کی بدولت انسان دنیا اور

آخرت میں سعادت وامامت کا مقام حاصل کرسکتا ہے۔

اس سلسلے میں سرورِ عالم ﷺ نے بڑی حکمت کی بات بتائی، ارشاد فرمایا: "اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ"۔ (سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں، تباہ ہونے والے ہیں، مگر علم والے ہلاکت سے بچیں گے) جیسے قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [العصر] (قسم ہے زمانے کی، سارے انسان خسارے میں ہوں گے، مگر ایماندار اور عملِ صالح والے خسارے سے بچیں گے)۔

یعنی جو اہلِ علم ہیں ان کے لئے نجات ہے، جہالت کے ساتھ نجات نہیں ہے، اگر جاہل کو بھی نجات ملتی ہے، تو کسی عالم کے ساتھ لگ کر ملتی ہے، مگر علم والے بھی غرور اور گھمنڈ نہ کریں، کہ بس ہمارے لئے نجات ہی نجات ہے، اور ہمارے اوپر کوئی گرفت نہیں۔

اسی لئے تو آنحضرت ﷺ نے دوسرا جملہ ارشاد فرمایا: "وَالْعَالِمُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ"۔ (علم والے بھی سب تباہ وہلاک ہونے والے ہیں، البتہ بچیں گے وہ عالم جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں) اگر عمل نہ ہو تو محض علم کوئی کارآمد چیز نہیں ہے، بلکہ وہ اور زیادہ وبال وسبب خسران ہے۔

علم تب کارآمد بنتا ہے جب اس کا صحیح استعمال ہو، اور اس کو عمل میں لایا جائے، اس لئے سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: محض علم کارآمد نہیں ہے، جب تک اس کا استعمال نہ ہو۔ جس علم پر عمل نہیں وہ بیکار ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الٹا زیادہ حجت بن جاتا ہے، فرمایا: "اَلْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ"۔ علم یہی قرآن اور علم شریعت ہے (یا تمہارے لئے حجت وسبب نجات بنے گا، یا تمہارے خلاف حجت ہوگا)۔

حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن علماء کی ایک جماعت کو بلایا جائے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے: ہم نے تمہیں علم دیا، اور بڑا علم دیا، بلکہ کئی کئی قسم کے علوم دیئے۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟ وہ عرض کریں گے: ہم نے لوگوں کو مسائل بتائے، ہم نے وعظ ونصیحت کئے، ہم نے کتابیں تصنیف کیں، ہم نے لوگوں کے فیصلے کئے، وغیرہ، فرمایا: یہ سب کچھ کیوں کیا؟ "اَیُقَالُ اَنَّکَ عَالِمٌ؟" تاکہ تمہیں دنیا میں شہرت ہوجائے، کہ تم بڑے واعظ وعالم تھے؟ تو وہ بات ہوگئی، اور وہ چیز تمہیں مل گئی، جس کے لئے تم نے محنت کی تھی، مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟ پس فرشتے انہیں گھسیٹ کر اوندھے منہ جہنم میں ڈالیں گے۔ [مشکوۃ]

علم ان کو کام نہیں آیا، اس لئے کہ اس پر عمل نہیں تھا، تو علم بلا عمل بے کار ہے جب تک کہ اس کے ساتھ عمل نہ ہو، بلکہ احادیث کے دیکھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جو بے چارے بے پڑھے لکھے لوگ ہیں، مگر کچھ نہ کچھ نیکی کرتے ہیں، ان کی نجات بغیر مناقشہ جلدی ہو جائے گی، علماء کی دیر سے ہوگی۔ یہ اس لئے کہ عالم سے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ تو یہ بات بھی جانتے تھے، پھر اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ یہ مسئلہ معلوم تھا، اس پر کیوں عمل نہ کیا؟ یہ گناہ تمہیں معلوم تھا، پھر کیوں اس کا ارتکاب کیا؟ اس پوچھ گچھ کا نام مناقشہ ہے، اور یہ تباہ کن ہے۔

ہاں! اگر علم پر عمل ہو، تو سبحان اللہ! کتنا بڑا مقام ہے؟ کتنی بڑی فضیلت ہے؟ پھر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بڑی پذیرائی اور اعلیٰ ترقی ہوگی، درجات بہت بلند ہوں گے۔ فرمایا: ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾[المجادلة:۱۱] (اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا)۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگے ارشاد فرمایا: "وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ"۔ (عمل کرنے والے سارے تباہ و برباد ہیں، مگر اخلاص والے بچیں گے) یعنی جو اپنے علم میں خلوص اور للّٰہیت رکھتے ہیں، یہ خالص رضائے الٰہی کی خاطر علم حاصل کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کے لئے عمل کرتے ہیں، سوائے رضاءِ الٰہی کے ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بڑے سے بڑا عمل یا علم یا نیکی اگر خلوص سے خالی ہو، تو وہ ناپاک ہوگا، اور اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور پاکیزہ عمل کو ہی قبول کرتا ہے، ناپاک عمل کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ بلکہ اس پر گرفت اور عقوبت مقرر ہے۔ دیکھیں! علم کتنا بڑا عمل ہے، پیغمبروں کا عمل ہے، مگر اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے بے کار ہو گیا، اور انجام اوندھے منہ کے ساتھ دوزخ کا داخلہ ہوا، تو معلوم ہوا کہ علم کا ڈھانچہ کارآمد نہیں ہے، جب تک اس میں روح نہ ہو، جو کہ عمل ہے، اسی طرح عمل کا ڈھانچہ بھی کارآمد نہیں ہے، جب تک اس میں روح نہ ہو، جو کہ للّٰہیت و خلوص ہے، تو علم و عمل دونوں کی لاش کارآمد نہیں ہے، جب تک اخلاص کی روح نہیں، تو مردہ و بے جان ہے۔ لاش کتنی ہی موٹی تازی، خوبصورت و قابلِ قدر و شرافت ہو، مگر لاش ہی تو ہے۔ مثلاً ملک کے بادشاہ کی لاش ہے، پھر بھی وہ دفن کرنے کے قابل ہوتی ہے، نہ کہ گھر میں رکھنے کی، کیونکہ جو بنیادی چیز ہے اس سے وہ خالی ہے۔

آخر میں ارشاد فرمایا: "وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ"۔ مطلب یہ ہے کہ علم و عمل کی روح جو کہ اخلاص ہے، اس کی حفاظت و نگہداشت ضروری ہے، اور اس کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ کبر و غرور اور سرکشی نہ ہو، اور ہر وہ عمل

جو خاتمہ بالخیر کے لئے نقصان دہ ومضر ہے، اس سے کلی اجتناب ہو، اگر اتراہٹ، غرور اور کبر دل میں آیا کہ میں بڑا پاکباز، قابلِ قدر ہستی ہوں، تو سارا کرتا دھرتا اکارت ہوکر ضائع ہوجائے گا، سب عمل نامقبول ہوجائے گا۔ ”لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرٍ“۔ [الحدیث] یہ حدیث اپنے حقیقی معنی۔ یعنی ظاہر پر محمول ہے، زجری نہیں ہے، کیونکہ کبر، اللہ تعالیٰ کی مخصوص ذاتی صفت ہے۔ فرمایا: اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ [الحدیث، خطبات حکیم الإسلام] شیخ سعدیؒ نے فرمایا: ؎

مراورا رسد کبریاء ومنی ☆ کہ ملکش قدیم ست وذاتش غنی

اللّٰهم إنا نسألک من فضلک ورحمتک لاتکلنا إلی أنفسنا ولا إلی غیرک طرفة عین ولا أقل من ذلک۔ آمین۔

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴾ اس آیت کریمہ کے پچھلے حصے کی تشریح مقدم کرکے اب ابتدائی حصہ کی کچھ تفصیلات ذکر کریں گے، اوراس کے بعد ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ کے معانی پر روشنی ڈالیں گے۔

نماز کا حکم اوراس کی فرضیت کا بیان شروع سورت سے تسلسل کے ساتھ ہوتا رہا ہے، اب نماز کی فرضیت کے ساتھ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ کا جو حکم صادر ہوا ہے، اور نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، کیا یہ حکم وجوبی ہے، یا کچھ اور؟ اس میں فقہاء امت کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت صحابہ وتابعین اور فقہاء امت کی، جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور ترکِ جماعت کو سخت گناہ اور جرمِ عظیم گردانتی ہے۔ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو اس نماز کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا عذرِ شرعی کے بدونِ جماعت ادا کی جائے۔ مذکورہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے جو وجوبِ جماعت کے قائل ہیں۔ امام داؤد ظاہری اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی مذہب ہے۔

یہ حضرات درج ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں:

(۱) ان حضرات کی ایک مستدل وہ مشہور حدیث بھی ہے، جس میں تارکین جماعت کے گھروں کو آگ لگانے کی زجر اور توبیخ مذکور ہے، کما في الصحاح۔

(۲) حدیث میں ہے: ”لَا صَلٰوةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ“۔ [أبو داؤد] تو اس حدیث کے

الفاظ سے یہی معلوم ہوا کہ مسجد کے قریب رہنے والوں کی نماز بغیر مسجد، یعنی بغیر جماعت کے جائز نہیں، وہ کہتے ہیں کہ: "لا" نفی ذات کے لئے ہے، أي لَا صَلٰوةَ أَصْلًا۔

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نابینا صحابی (ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ) نے آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دے، اور لے جایا کرے، اس لئے اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت دیں تو میں گھر میں نماز پڑھا کروں، سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اول تو ان کو اجازت دے دی، مگر جب وہ جانے لگے، تو ان سے پوچھا: کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! میں اذان کی آواز سنتا رہتا ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پھر تو آپ کو مسجد میں آنا ہوگا۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پھر میں آپ کے لئے کوئی گنجائش اور رخصت نہیں پاتا۔ [صحیح مسلم، أبو داؤد]

(۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ فرمایا سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: "مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يُجِبْهُ فَلَا صَلٰوةَ لَهٗ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ"۔ (قرطبیؒ نے اس کی تصحیح کی) جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے، اور جماعت کے لئے مسجد میں نہیں آتا، تو اس کی نماز نہیں ہوتی، مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو، مثلاً بیماری یا خوف وہلاکت کا اندیشہ وغیرہ۔ ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہم وغیرہ اور بعض دوسرے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے، وہاں اگر کوئی بلا عذر جماعت میں حاضر نہ ہوا، تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ آواز سننے سے فقہاء کے نزدیک مراد یہ ہے کہ عام متوسط آواز والے مؤذن کی آواز وہاں تک پہنچ سکے، غیر معمولی بلند آواز، یا لاؤڈ سپیکر کی آواز کا اعتبار نہیں ہے۔

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور علماء امت وفقہاء، اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین حضرات کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فجر کی طرح سب سے زیادہ مؤکد اور قریب من الواجب ہے۔

ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ کو دوسری آیات اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے، یعنی یہ صیغۂ امر وجوب کے لئے نہیں ہے، بلکہ تاکید کے لئے ہے۔ اور جس حدیث میں گھروں کے جلانے کی بات ہے، وہاں امر کوئی نہیں، محض زجر اور توبیخ ہے، جس پر کبھی عمل بھی نہیں ہوا، اور وہ

احادیث جن میں "لا صلوۃ" کا کلمہ مکرر آیا ہوا ہے، وہ نفی کمال کے لئے ہیں، جیسے: "لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ" یا "لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا حَیَاءَ لَهٗ" یا "لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ"۔[الحدیث] اس قسم کی روایات ذخیرۂ احادیث میں بکثرت ہیں۔ان تمام روایات کا مقصد ومطلب نفی کمال اور نفی شرف وقبولیت ہے۔

فائدہ:

سابقہ ادیان میں سے کسی بھی دین میں نماز باجماعت نہیں تھی، اور یہود کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔[عثمانی]

نماز باجماعت کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان:

امام مسلمؒ نے فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نماز باجماعت کے متعلق جو روایت نقل کی ہے، وہ نہایت واضح اور ایمان افروز ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (بروز محشر) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے، تو اس کو چاہیئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے، جہاں اذان دی جاتی ہے (یعنی مسجد میں) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچوں نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سُنَنِ ہدیٰ میں سے ہے۔اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے (کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو چھوڑ دیا، تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔اور جو شخص وضو کرے، اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے، پھر کسی مسجد کا رخ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی درج فرماتے ہیں، اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف فرماتے ہیں، اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافق بیّن النفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہیں پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دو آدمیوں کے سہارے پر مسجد میں لایا جاتا، اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔[قرطبی]

اس بیان میں جس طرح نماز باجماعت کی پوری تاکید اور اہمیت وضرورت کا ذکر ہے، اسی طرح اس کا یہ درجہ بھی بیان فرما دیا کہ وہ سُنَنِ ہُدیٰ میں سے ہے۔جس کو فقہاء کرام سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذرِ شرعی، مثلاً بیماری وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو، تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، فرض ذمہ سے ادا ہو گا، مگر سنت مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحقِ عتاب ہو گا، اور اگر ترکِ جماعت کی عادت بنالے، تو سخت

گنہگار ہوگا، خصوصاً اگر ایسی صورت ہوجائے کہ مسجد ویران رہے، اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں، تو یہ لوگ شرعاً مستحقِ سزا ہوں گے، اور قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں، تو ان سے قتال کیا جائے۔[قرطبي]

﴿وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ (صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو)۔

انسان دو چیزوں سے مرکب ہے: روح اور جسم۔ اصل چیز روح ہے، جسم محض ایک قالب ہے۔ روح کا تعلق عالمِ بالا سے ہے۔ اس کی غذا وہاں سے آتی ہے، اور بعد از موت وہ اپنے مستقر ''علّیین'' میں جا پہنچتی ہے، جبکہ جسم مادی ہے، اس کی پیدائش زمینی مٹی سے ہے، اور اس کی غذا زمین اور اس کی پیداوار سے وابستہ ہے، بعد از موت اس کا ٹھکانا زمین ہی ہے۔ پھر جس طرح جسم کو مختلف امراض لگ سکتے ہیں، جن سے اس کی صحت متاثر ہوسکتی ہے، اسی طرح روحانی امراض بھی روح کو متاثر کرکے اس کے اعتدال اور صحت کے لئے ضرر رساں ہوتے ہیں۔ پھر جسمانی امراض کا علاج مادیات کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی طرح روحانی امراض کا علاج بھی روحانیات کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

جسمانی امراض عام طور پر لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں، انہی کی خاطر تو بڑے بڑے ہسپتالوں اور دواخانوں اور معالج کا پورے اہتمام کے ساتھ بندوبست ہوتا رہتا ہے۔ روحانی امراض چونکہ اکثر و بیشتر مخفی اور پوشیدہ ہوتے ہیں، عوام الناس انہیں نہیں جانتے، اور نہ شناخت کرسکتے ہیں، اس لئے ان کے علاج سے وہ غافل رہتے ہیں، مثلاً کفر، نفاق، لالچ، حرص، بغض، حسد، کبر وغرور اور ہر قسم کی بے دینی اور ارتکابِ معاصی، یہ سارے روحانی امراض کہلاتے ہیں۔

دراصل انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد اور آسمانی کتابوں کا نزول انہیں روحانی امراض کے ازالہ کے لئے ہے۔ انسان کی پیدائش جسم اور جسمانیات کے لئے نہیں ہے، بلکہ توحیدِ الٰہی اور عبادات وطاعات کے لئے ہے، چونکہ عبادات وطاعات روح سے متعلق ہیں، اور روحانی امراض لاحق ہونے کی صورت میں عبادات میں غفلت اور ہر قسم کی کمزوری کا امکان ہے۔ اسی غفلت وکمزوری کو دور کرنے، اور روحانی امراض کے دفاع اور سدِ باب کی خاطر ہر زمانے میں، ہر خطہ اور ہر قوم کے لئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے حضرات انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، تاکہ روحانی بیماریوں کا ہر طرح علاج ہو۔ کفر ونفاق کے بعد روحانی امراض میں سرفہرست کبر وغرور، حبِ مال وحبِ جاہ بڑے

خطرناک شمار ہوتے ہیں، اسی لئے موجودہ آیاتِ کریمہ میں ان ہی امراض کے ازالہ پر زور دیا گیا ہے۔

تو واضح ہو کہ حبِّ جاہ وحبِّ مال تمام معاصی اور غفلتوں کی جڑ ہیں، اور یہ دونوں قلب کی ایسی مہلک اور خطرناک بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان کی دنیوی اور اخروی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک جتنی انسانیت سوز لڑائیاں (بے رحمانہ جنگ وجدال) لڑی گئی ہیں، اور جو جو فسادات برپا ہوئے اور خونریزیاں ہوئیں عصمتیں لوٹی گئیں، ان میں سے اکثر وبیشتر کو انہی دونوں بیماریوں نے جنم دیا اور پیدا کیا۔

حدیث شریف میں ہے کہ دو بھوکے بھیڑئے اتنی تباہی نہیں پھیلاتے، جس قدر بربادی حبِّ جاہ اور حبِّ مال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ [مشکوۃ]

حُبِّ جاہ وحُبِّ مال کے برے نتائج وتباہیاں:

(۱) حبِّ مال سے کنجوسی، بخل، بے رحمی پیدا ہوتی ہے، جس کا ایک قومی نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کنجوس کی دولت معاشرہ اور قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے کہ معاشرہ میں ایسے شخص کو اچھی نظر سے کوئی نہیں دیکھتا۔

(۲) خودغرضی، مفاد پرستی پیدا ہوتی ہے، جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اسے اشیاء میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رشوت ستانی، مکروفریب اور دغابازی کے نت نئے طریقے، طرح طرح کے حیلے سکھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں، جس سے پورا معاشرہ خاک وخون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

(۳) ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے، لیکن کمانے اور جمع کرنے کی ایسی دُھن سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کروں، بالآخر جو مال اس کے آرام وراحت کا ذریعہ بنتا، وہ اس کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے، جیسے قارون کے ساتھ ہوا۔

(۴) حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو اس کی ہوسِ مال سے متصادم ہو۔ یہ تمام چیزیں بالآخر پورے معاشرہ کا امن وامان، چین وسکون برباد کر ڈالتی ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال حبِّ جاہ کا نظر آئے گا کہ اس کے نتیجہ میں کبر وغرور، سرکشی، بے رحمی، حیوانیت، شہوت پرستی، بے انصافی، خودغرضی حقوق کی پامالی، ہوسِ اقتدار، بے حیائی، بے شرمی، خواہشات کی

غلامی، اقتدار کی خاطر قتل وغارت، خونریزی، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز اور حیا سوز خرابیاں جنم لیتی ہیں، جو بالآخر دنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑتی ہیں۔

ان دونوں مہلک بیماریوں کا علاج قرآن حکیم نے یہ تجویز فرما کر پوری انسانیت پر احسان فرمایا: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ (مدد لو صبر اور نماز کے ذریعے) یعنی صبر واستغناء حاصل کرو۔ استغناء اختیار کر کے لذّات وشہوات پر قابو حاصل کرو۔ طمع ولالچ چھوڑ کر قناعت اختیار کرو، اس سے حبِّ مال گھٹ کر زندگی اعتدال پر آجائے گی۔ جب لذّتوں اور شہوتوں پر قابو پایا جائے، تو حبِّ مال خود بخود گھٹ کر شرافت وانکساری اور تحفظِ حقوق کا خیال پیدا ہو جائے گا۔ حبِّ مال سے جتنی خرابیاں پیدا ہو سکتی تھیں، وہ ساری تباہیاں ترکِ حبِّ مال سے خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔

''صبر'' لغت میں روکنے اور باندھنے کو کہتے ہیں، اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی عزم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ انضباط ہے، جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلہ میں اپنے قلب وضمیر کے پسندیدہ راستہ پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔

لفظ ''صبر'' تین معانی کے لئے آتا ہے:

(۱)......الصبر علی الطاعات: طاعات پر جما رہنا، خصوصاً فرائض اور واجبات کو پابندی کے ساتھ ادا کرنا۔

(۲)......الصبر عن المعاصي: تمام معاصی اور گناہوں سے پورے اہتمام کے ساتھ بچنا۔

(۳)......الصبر علی البلیات: مصائب، مشکلات، بلیات وآفات اگر پیش آئیں، تو ان پر صبر کرنا، اور جزع فزع سے پرہیز کرنا۔

عام طور پر جب بھی صبر بولا جاتا ہے، تو یہی آخری معنی مراد ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہاں صبر سے مراد ''صوم'' ہے یعنی روزہ۔ [روح المعاني]

اگر صبر کا مکمل التزام ہو، تو حبِّ مال وحبِّ جاہ گھٹ کر کم یا بالکل ختم ہو جائے گی، کیونکہ مال اور جاہ اس وجہ سے محبوب ہیں کہ یہ دونوں لذّات وشہوات کے حصول کا ذریعہ ہیں، جب ان کے ترک کا عزمِ مصمّم اور پختہ ہوگا، تو مال وجاہ کی محبت بھی ختم ہو جائے گی، اور نماز تو نماز ہے، جس کے متعلق فرمان الٰہی ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ [العنکبوت: ۴۵] (بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی، اور برائی سے) جب نماز کی بدولت

فحشاء ومنکرات کی ہوس دل ودماغ سے محو ہو جائے، تو حبِ مال وحبِ جاہ کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے گا، کیونکہ نماز روحانی ترقیوں کا وہ واحد ذریعہ ہے، جس کی بدولت قرب ونیاز کے مناظر سامنے مشاہدہ میں آئیں گے، بشرطیکہ نماز اپنے حقیقی لباس میں ہو، اور ہر طرح کی پستی وانکساری کے ساتھ ہو، یعنی بندگی وعبادت کے رنگ میں ہو نہ کہ عادت وخواہشات کے طور پر ہو۔

پس اگر انسان اپنے اندر یہ قوت پیدا کرلے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نماز کے ذریعے اپنا رشتۂ عبدیت اپنے معبود حقیقی سے محکم کرلے، تو پھر کوئی مشکل اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ آنحضرت سید عالم ﷺ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی مشکل کام پیش آتا، تو آپ ﷺ فوراً نماز پڑھنے لگتے، کیونکہ ہر مشکل کا حل نماز میں ہی ہے، اور سرور عالم ﷺ سے یہ بھی مروی ہے جیسا کہ احمد، نسائی اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا یہی طریقہ تھا کہ جب وہ کسی امر سے گھبراتے اور پریشان ہوتے، تو فوراً نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے اور خود حضور ﷺ کا معمول تھا کہ سفر پر جاتے وقت اور واپسی پر ضرور نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

اس کے ساتھ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے اگر کسی کو کوئی حاجت ہو یا کوئی مشکل پیش آجائے، یہ حاجت اللہ تعالیٰ سے ہو، یا کسی انسان سے، تو اسے چاہئے کہ بڑی احتیاط ورغبت سے وضو کرے، پھر دو رکعت (بہ نیتِ قضاءِ حاجات) پڑھے (ہاں شوق وخشوع کے ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کر کے یہ پڑھے: ’’اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ وَلَکَ الْحَمْدُ عَدَدَ ذَرَّاتِ الْمَوْجُوْدَاتِ وَعَدَدَ مَعْلُوْمَاتِکَ‘‘۔ اس کے بعد درود شریف پڑھے، پھر ان کلمات کے ساتھ خوب دعا مانگے ’’لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْحَلِیْمُ الْکَرِیْمُ سُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اَسْئَلُکَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِکَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِکَ وَالْغَنِیْمَۃَ مِنْ کُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَۃَ مِنْ کُلِّ اِثْمٍ لَاتَدَعْ لِیْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَہٗ وَلَا ھَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَہٗ وَلَا حَاجَۃً ھِیَ لَکَ رِضًی اِلَّا قَضَیْتَھَا یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ‘‘ (ثلاثاً)۔ [ترمذي]

علماء امت نے اس نماز کا نام اکسیر حلِ مشکلات رکھا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس نماز کو روزانہ کا معمول بنائیں، یا کم از کم ہفتہ وار معمول بنائیں۔ اس نماز کے بڑے فوائد وفضائل ہیں تجربہ شرط ہے۔

﴿وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ﴾۔ ’’انھا‘‘ میں ضمیر استعانت (مصدر) کی طرف راجع ہو، تو معنی یہ ہوگا کہ نماز اور صبر سے مدد چاہنا شاق اور گراں ہے، مگر خاشعین پر گران نہیں۔ بعض علماء نے انھا کا مرجع وہ

سارے اوامر ونواہی بتائے ہیں، جو ماقبل میں ذکر ہوئے۔ واللہ أعلم۔

مفسرین نے کہا ہے کہ "انھا" کی ضمیر صلوٰۃ کی طرف راجع ہے، کیونکہ نماز کی شان بہت عظیم ہے، اور نماز میں صبر کے سارے معانی بھی موجود ہیں۔ "فالصَّلٰوۃُ مُستَلزِمَۃٌ لِجَمِیعِ مَعَانِی الصَّبرِ"۔ یہ نہایت واضح ہے کہ نماز میں سکوت، نظر پر پابندی، اکل وشرب، التفات، حرکات، خیالات وغیرہ پر پابندی، یہ سب صبر کے معانی ہیں، اور خود نماز بھی ایک قسم کا صبر ہی تو ہے، جسے نہایت تحمل وسکون سے ادا کیا جاتا ہے، اگر نماز میں صبر و استقرار نہ ہو، محض عجلت ہو، تو وہ حقیقی نماز کہلانے کی حقدار نہیں ہے۔ واللہ أعلم

﴿اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ﴾ قرآن وسنت میں جہاں خشوع کی ترغیب مذکور ہے، اس سے مراد وہ قلبی (باطنی) سکون وانکساری ہے، جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت اور عجز ونیاز کے علم وسوچ سے پیدا ہوتی ہے، (اس کی ضد کبر وغرور اور خود پسندی ہے) اس خشوع کے نتیجے میں طاعات کی بجا آوری اور اوامر ونواہی پر عمل آسان ہوجاتا ہے، اور التزامِ طاعات طبعیت ثانیہ بن کر ایک ایسی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جسے نبوت کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ زہے نصیب! (اگر کسی کو نصیب ہو) علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج ☆ بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگران اور
احوال ومقامات پہ موقوف ہے سب کچھ ☆ ہر لحظہ ہے سالک کا زمان اور مکان اور
الفاظ ومعانی میں تفاوت نہیں لیکن ☆ ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں ☆ کرگس کا جہان اور ہے، شاہین کا جہان اور

جب اللہ تعالیٰ اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور روز قیامت پر ایمان ہو، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ وسید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بھی ہو، تو صرف نماز اور صبر کیا ہے؟ سارے احکامِ شریعت پر چلنا یہاں تک کہ جان کی بازی لگانا، تن من دھن اہل وعیال اور سرمایہ ومال قربان کرنا سب کچھ آسان ہوجائے گا، محض آسان کیا، فخر ومباہات کے ساتھ ہر قسم کی قربانی پیش کرنا سہل ہوگا۔ اگر یہ کچھ نہ ہو تو صبر وصلوٰۃ دور کی بات ہے۔ بدنصیب کے لئے ایک ادنیٰ عمل وضو بھی وبالِ جان اور مشکل معلوم ہوگا۔ اللّٰھم وفقنا لمَا تحب وترضیٰ آمین

پس خشوع اگرچہ ایک باطنی کیفیت ہے، مگر کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ آدمی متواضع باادب اور شکستہ مزاج نظر آتا ہے۔ اگر دل میں خوفِ الٰہی اور تواضع نہ ہو، تو خواہ آدمی ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع

نظر آئے، لیکن حقیقت میں تصنع، بناوٹ اور ریا کاری شمار ہوگا، کامل خشوع کا حامل نہیں ہوگا۔ بزرگوں اور علماء کرام نے باطنی خشوع کے لئے یہ علامت بتائی ہے کہ آدمی اپنی تعریف سے خوش نہ ہو، اگر کسی نے مذمت کی تو بوجھ اور پریشانی نہ ہو۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ موٹا لباس پہننے، سادہ کھانا اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں ہے، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف اور رذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ تعالیٰ نے جو تم پر فرض کیا ہے، اسے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے لئے قلب کو فارغ کردو۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے (زور سے بولتے) جب چلتے، تو تیز رفتاری کے ساتھ چلتے، اور جب کسی مجرم کو مارتے، تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ مجسم خضوع کے پیکر تھے۔

خلاصہ یہ کہ باطنی خشوع کے بغیر اپنے قصد و ارادے سے خاشعین کی شکل و صورت بنانا، اور سر جھکا کر چلنا شیطان اور نفس کا دھوکہ اور فریب ہے، اور یہ مذموم ہے، ریاکاری اور بناوٹ و تصنع ہے۔ ہاں! اگر بغیر ارادہ کے یہ کیفیت ظاہر ہو، تو معذور ہے۔ [قرطبي وغيره]

فائدہ:

خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ ''خضوع'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہ کلمہ متعدد بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں، لیکن ''خشوع'' کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جبکہ وہ مصنوعی نہ ہو، بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا﴾ [طه:۱۰۸] (آوازیں پست ہوگئیں، پس تم نہیں سنو گے مگر آہٹ) اسی پستی اور تواضع کی بدولت نمازیوں کے لئے رشد و فلاح اور کامیابی کا اعلان فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ [المؤمنون:۲] (بے شک ایمان والے کامیاب ہوگئے جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں) ۔ اور خضوع کا لفظ بدنی و ظاہری تواضع کے لئے مستعمل ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ﴾ [الشعراء:۴] (پس ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں)۔

نماز میں خشوع کی حکمت اور فقہی حیثیت:

بندگی دراصل نام ہی انکساری کا ہے۔ جب باطنی خشوع کے ساتھ ظاہری خضوع بھی شامل حال ہو، تو مکمل

بندگی کا اظہار ہوگا۔ ربّ العزّت سبحانہ نے کائنات کی ہر چیز اور ہر ذرّہ میں تکوینی طور پر عجز وانکساری ودیعت فرمارکھی ہے۔﴿كُلٌّ قَدْعَلِمَ صَلَاتَه وتَسْبِيْحَه﴾ [النور: ۴۱] (سب اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہیں) ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّايُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّاتَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الإسراء: ۴۴] اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے)۔

کائنات کی ہر شئی اگر چہ مکلف نہیں ہے، مگر بندگی کی تکوینی طور پر ضرور مکلف ہے، مگر انسان چونکہ احکامِ شرعیہ کا مکلّف بھی ہے، اور دیگر اشیاء کی طرح مخلوق بھی ہے، اس لئے بندگی کا تقاضا اس کے حق میں دہرا اور بنسبت دیگر مخلوقات کے زیادہ ہے۔ اُسے چاہئے کہ ظاہر وباطن دونوں کے ساتھ عجز وانکساری کا فریضہ بجالائے، چونکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ محض اپنے لطف وکرم سے اس کے حق میں ولایت ودوستی کا اعلان فرما چکے ہیں، جیسے کہ فرمایا: قولہ تعالی: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْايُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرة: ۲۵۷] (جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کا دوست اللہ تعالیٰ ہے کہ اُن کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے)۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [محمد: ۱۱] (یہ اس لئے کہ جو مؤمن ہیں ان کا خدا کارساز ہے)۔

اگر کوئی دوست اپنے محبوب دوست کے لئے کوئی تحفہ وہدیہ پیش کرے، تو کسی ایسی چیز کا تحفہ گرانقدر سمجھا جائیگا، جو دوسرے کے پاس موجود نہ ہو، آپ کسی باغبان دوست کی خدمت میں اگر سیب یا انار کا تحفہ پیش کریں گے، تو اس کی کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوگی، پس ربّ العزّت سبحانہ کے حضور ایسا تحفہ پیش کرنا چاہئے جو اس کے خزانوں میں نہ ہو، وہ ایسی عبادت ہے جو تواضع، انکساری اور خشوع وخضوع سے آراستہ ہو۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

چار چیز آوردہ ام شاہا کہ در گنج تو نیست ☆ عاجزی وبیکسی عجز ونیاز آوردہ ام

اگر اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی اور فقدان ہے، تو وہ یہی عجز ونیاز اور خشوع وخضوع ہے۔ واللہ اعلم

رہا فقہی مسئلہ، تو وہ یہ ہے کہ نماز میں خشوع کی تاکید قرآن وسنت میں بار بار آئی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ [طٰهٰ: ۱۴] (اور نماز قائم کرو مجھے یاد کرنے کے لئے)۔ اور ظاہر ہے کہ غفلت یاد کرنے کی ضد ہے۔ جو شخص نماز میں اللہ سبحانہ سے غافل ہے، وہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کو یاد کرنے کا فریضہ ادا نہیں کر رہا۔ ایک آیت میں ارشاد ہے: ﴿وَلَاتَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ﴾ [الأعراف: ۲۰۵] (اور تو غافلوں میں سے نہ بن)۔ سرور عالم ﷺ کا ارشاد ہے: "اَلصَّلٰوةُ تَمَسْكُنٌ وَتَضَرُّعٌ"۔ نماز تو صرف تمسکن اور تواضع ہی ہے، جس کا ظاہری

مطلب یہ ہے کہ جب تمسکن اور تواضع دل میں نہ ہوتو وہ نماز ہی نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کی نماز اسے بے حیائی اور برائیوں سے نہ روکے، وہ اللہ تعالیٰ سبحانہ سے دور ہی ہوجاتا ہے، اور غافل کی نماز بے حیائی اور برائیوں سے نہیں روکتی، تو معلوم ہوا کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ تعالیٰ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے۔ [احیاء العلوم]

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا ہے کہ ان کا یہ تقاضا ہے کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسد ہے۔ لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے خشوع کو شرطِ نماز تو قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اسے نماز کی روح قرار دینے کے باوجود صرف یہ شرط لگائی ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لئے نماز کی نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو، تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اسے پورا نہیں ملے گا جتنے حصے میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رو سے وہ تارکِ صلوۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے، جو تارکِ صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں۔ یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ علمِ فقہ کی حدود سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انہوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا ہے، بلکہ خشوع کے ادنیٰ مرتبہ کو شرط کہا ہے، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت محض اللہ تعالیٰ سبحانہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کرے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریعِ احکام کا یہ واضح اصول بتادیا گیا ہے کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو ان کی طاقت و گنجائش اور امکان سے باہر ہو، جیسے کہ فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة:۲۸۶] (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)۔ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة:۱۸۵] (خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے، اور سختی نہیں چاہتا)۔ اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند اشخاص اور خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف مالایطاق سے بچنے کی خاطر پوری نماز کی

بجائے صرف ابتداءِ صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دیدیا گیا۔

بغیر خشوع کے نماز:

بغیر خشوع کے نماز بالکل بے فائدہ نہیں ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود ہمیں ربّ العزّت رحیم وکریم سے یہی امید ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا بھی بالکلیہ تارکِ صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں ہوگا، کیونکہ بہرحال اس نے اداءِ فرض کا اہتمام تو کیا ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے قلب و باطن کو حق تعالیٰ سبحانہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم یہ فائدہ ضرور ہے کہ اس کا نام نافرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے خارج ہوگیا، مگر دوسری حیثیت سے یہ خوف بھی ہے کہ کہیں غافل کی حالت ''تارکِ صلوٰۃ'' سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہوکر آقا سے بے توجہی برتتا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے، اس کی حالت اس غلام سے زیادہ شدید ہے، جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔ ؎

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر ☆ این چنین تسبیح کے دارد اثر

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس دوسرے مصرعہ کو اس طرح پڑھنا چاہئے:

ع این چنین تسبیح ہم دارد اثر

کیونکہ یہ عادت دیر تک نہیں رہ سکتی، بالآخر یہ نماز جو کہ اشرف الطاعات ہے، اپنا اثر دکھا کر عادت کو عبادت کے ساتھ تبدیل کرسکتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ معاملہ بیم ورجاء کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے، اور بخشش ودرگزر کی امید بھی۔ معاملہ ایک ایسی ذاتِ عالی غفور ورحیم کی مقدّس عدالت میں پیش ہوگا کہ: ؎

اگر در دہد یک صلائے کرم ☆ عزازیل گوید نصیبے برم

مگر پھر بھی غفلت وتساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ [معارف القرآن]

يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّيۡ فَضَّلۡتُكُمۡ
عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝٤٧ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِيۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّ
لَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝٤٨

ترجمہ: اے اولادِ یعقوب! میرے ان احسانات کو یاد کرو جو احسانات و انعامات میں نے تم پر کئے، اور اس بات کو بھی یاد کرو کہ میں نے تم کو اقوامِ عالم (اس زمانے کے، یا اس سے پہلے کے) پر خاص فضیلت اور فوقیت (یعنی نعمتِ ایمان، وتوحید، رسالت، عقیدۂ معاد) عطا کی تھی ﴿۴۷﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ تو کوئی کسی کے کام آسکے، اور نہ کسی کی طرف سے کوئی سفارش قبول کی جاسکے، اور نہ کسی کی طرف سے کوئی فدیہ اور معاوضہ لیا جاسکے، اور نہ ان لوگوں کو کسی طرفدار کی طرفداری کام آسکے ﴿۴۸﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں بقولِ بعض کے ستر ہزار پیغمبر، اور بقولِ بعض کے چار ہزار پیغمبر بھیجے گئے تھے۔ پہلا قول اس بنیاد پر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہے، کمامر۔ دوسرا قول اس بنیاد پر ہے کہ سارے انبیاء علیہم السلام صرف آٹھ ہزار ہیں، جیسا کہ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ واللہ اعلم (یہ بحث سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں دیکھی جائے)۔

گزشتہ رکوع میں انعامات واحسانات کا بیان اجمالاً تھا۔ موجودہ رکوع سے آئندہ ''یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ'' تک ان اجمالی انعامات کی مختلف انداز میں تقریباً چالیس واقعات کی تفصیل ہے، جن میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات کا پہلو ہے، اور دوسری طرف بنی اسرائیل قوم کی سرکشیوں اور نالائقیوں کا بیان ہے۔

ایک ضروری وضاحت:

دُنیا میں ایسا بہت کم اتفاق ہوتا ہے کہ دین ودنیا کی سیادتیں دونوں کسی ایک جگہ جمع ہوجائیں، بالفرض اگر جمع بھی ہوجائیں تو یہ شاذ ونادر ہی بات ہے کہ ان میں ایسا تسلسل ہو کہ کئی پشتوں اور کئی نسلوں تک سلسلہ چلا جائے۔

بنی اسرائیل کا سلسلہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے چلا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جو عرصہ گزرا ہے، یہ پورا زمانہ ترقی یافتہ اور متمدن اقوام کا نہایت عروج کا زمانہ رہا۔ مصری فراعنہ کی تہذیب وتمدن کی بے انتہا ترقی کا دور رہا، جہاں بیسیوں فراعنۂ مصر نے حکومت کی۔ اہرامِ مصر اسی تہذیب وتمدن کی بے مثال یادگار ہیں، جو رہتی دنیا تک شاید قائم رہیں گے۔

موجودہ سائنسی ترقی یافتہ دنیا بھی اہرامِ مصر کے معمہ سے نقاب کشائی نہ کرسکی ہے، اور شاید نہ کرسکے گی۔ اس کے ساتھ ملوکِ فارس، ملوکِ رومہ، ملوکِ یمن، کلدانیوں، عمالقہ، آشوریوں اور خاقانِ چین اور دوسری اقوام بہ شمولِ عاد

وثمود، قومِ ارم اور ملوکِ یمن بہ شمول شداد، یا سکندرِ رومی بانی اسکندریہ ودیگر مقدونی ملوک وسلاطین بہ شمولِ نمرود بن کنعان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر ہے، یہ چار ہزار سالہ عرصہ دنیوی اور مادی اعتبار سے نہایت ترقی یافتہ اور بے مثال عروج وتمدن کا رہا ہے، جس کے آثارِ قدیمہ اب بھی لوگوں کے لئے باعثِ عبرت وحیرت ہیں۔

جب آیت کریمہ نے ﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ والی نعمتِ عظمیٰ کا تذکرہ فرمایا، تو حل طلب امر یہ ہے کہ وہ کونسی فضیلت ہے جو بنی اسرائیل کو حاصل ہوئی؟ جو ان متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کو نصیب نہیں ہوئی، کیا یہ کوئی مادّی فضیلت ہے؟ یا کوئی مادی ترقی یافتہ سلطنت ہے؟ ہر گز نہیں! کیونکہ بنی اسرائیل کی مادّی تہذیب وترقی ان گزشتہ اقوام کی ترقی کی عُشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔

لہٰذا یہ بات قرینِ قیاس اور نفس الامری حقیقت ہے کہ فضیلت علی العالمین کا مصداق ایمان، عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، آسمانی کتاب تورات اور عقیدۂ معاد ہی ہے، جو کہ خالص روحانی ہے۔

اسی عظیم روحانی نعمت کا احسان جتلا کر کہا جارہا ہے کہ ﴿اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ اور یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے، جس سے تمام متمدن اور تہذیب یافتہ، فارسی، رومی، یمنی، مصری، کلدانی آشوری اقوام محروم رہیں، جنہوں نے سوائے کفروشرک مادّیت، صابیت، کواکب پرستی اور معاصی وبغاتوں کے کچھ بھی نہیں پایا، اور ہزاروں سال گمراہی اور ضلالتوں میں محو رہ کر صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔

ان اقوام کی تباہی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں توحید وایمان جیسی نعمت کا ظہور ہوا، جسے ''فضیلت علی العٰلمین'' کا لقب حاصل ہوا، مگر نالائق اور بدنصیب قوم نے اس نعمت کی قدر دانی نہیں کی، جس کی پاداش میں وہ بھی طرح طرح کے عذاب وعقاب میں ڈالے گئے، جسے آیت (۱۲۳) تک مختلف زاویوں سے بیان فرما کر ربّ العزّت سبحانہ نے ان پر حجت قائم کر کے اس آخری خیر الامم کو بار بار، جا بجا خبر دار فرمایا، اور بنی اسرائیل کے نقشِ قدم پر چلنے سے اجتناب کا حکم صادر فرمایا۔

''العٰلمین'' کا مفہوم:

''عالَم'' ماسوی اللہ کا نام ہے۔ کائنات بے شمار عالَموں کا مجموعہ ہے، یہاں ہر مخلوق ایک مستقل عالَم ہے، مثلاً ملائکہ، انس، جن، حیوانات، جمادات اور نباتات وغیرہ۔ کائنات میں اٹھارہ ہزار، چالیس ہزار، یا اسی ہزار علیٰ اختلاف الاقوال مخلوقات (عالَم) ہیں۔ ان سب میں اَشرف المخلوقات انسان ہے۔ انسانوں کی بے شمار اقسام واصناف اُمتیں

(مذاہب) ہیں۔ان سب میں اُشرف واعلیٰ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری امت ہے، ارشاد ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران:۱۱۰] (مؤمنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں، تم ان سب سے بہتر ہو)۔

اس امتِ کریمہ کی فضیلت عمومی اور کلی ہے، مطلقاً، جبکہ بنی اسرائیل کی فضیلت علے العلمین کے تین درجات ہیں: (۱) گزشتہ اقوام پر فضیلت۔ (۲) اپنے زمانے کی اقوام پر فضیلت۔ (۳) جزئی فضیلت بحیثیتِ کثرتِ انبیاء علیہم السلام وملوک وغیرہم۔ جبکہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی فضیلت کلی ہے، دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے، شفاعتِ کبریٰ اور دخولِ جنتِ اوّلیٰ کے اعتبار سے بھی، سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اٰدمُ وَمَنْ سِوَاہُ تَحْتَ لِوَائِیْ"۔ [الحدیث] فرمایا: "لَوْ کَانَ مُوْسیٰ حَیًّا مَاوَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِیْ"۔ [الحدیث] اس مسئلہ کی پوری تفصیل ان شاء اللہ سورۃ آل عمران میں آنے والی ہے۔

دنیوی اوراُخروی مصیبتیں:

دنیوی مصیبتیں عارضی اور اُخروی مصیبتیں دائمی ہیں۔کسی بھی مصیبت سے بچنے اور خلاصی کے لئے دنیا میں چار راستے ہوا کرتے ہیں: (۱) مطالبہ پورا کرنا۔ (۲) معاوضہ۔ (۳) سفارش۔ (۴) حمایت ونصرت، لیکن آخرت میں ایمان کے بغیر یہ سارے راستے بند ہوں گے، اس لئے فرمایا کہ اخروی نجات کے لئے ابھی سے فکروتدبر کرو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [المائدۃ:۳۶] (جولوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس روئے زمین (کے تمام خزانے اوراس) کا سب مال ومتاع ہو، اوراس کے ساتھ اسی قدر اور بھی ہو، تاکہ قیامت کے روز عذاب (سے رستگاری حاصل کرنے) کا بدلہ دیں، تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا، اوران کو درد دینے والا عذاب ہوگا)۔

دنیا دارالاسباب اوردارالعمل ہے۔دنیا کے بڑے بڑے مجرم بڑی شخصیتوں کی سفارش سے یا بڑے بڑے معاوضوں کے سبب یا زبردست طاقتور حامیوں کی حمایت یا مطالبہ کی ادائیگی وغیرہ سے جان چھڑا سکتے ہیں، مگر آخرت میں یہ سارے ذرائع مسدود اور بند رہیں گے۔خلاصی کا وہاں واحد ذریعہ صرف ایمان ہی ہوگا۔

یہود کے دماغ میں چونکہ پیغمبرزادگی اورصاحبزادگی، نیز یہ غلط مفروضہ کہ: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾

[المائدة:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے، وراس کے محبوب ہیں) چھپا ہوا کیڑا ہوتا تھا، تو ربّ العزّت سبحانہ نے انہیں تنبیہ فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾ [المائدة:۱۸] (کہو پھر وہ تمہاری بداعمالیوں کے سبب تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے؟ (نہیں) بلکہ تم اس کی مخلوقات میں (دوسروں کی طرح کے) انسان ہو)۔ تم عام انسانوں کی طرح بشر ہو، جبکہ ربّ العزّت ہر مثل ومثال اور کفوو ہمسر سے پاک ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے)۔ یہ تمہارے سارے مفروضے منگھڑت اور بے بنیاد ہیں۔ دنیا ہی میں جو کہ دار العمل ہے، دار الجزاء نہیں ہے۔ تمہارے آباء واجداد پر فسخ ومسخ کا عذاب کیونکر مسلط ہوا؟ ''قِرَدَة'' (خنازیر) بن کر ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوئے۔

یہاں کا عذاب اُخروی عذاب کی بہ نسبت بہت ہی ہلکا ہے۔ تمہاری تمناؤں کی جڑ کاٹ کر تمہیں کہا جا رہا ہے کہ:

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا﴾ [الآیة] (اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کے کچھ کام نہ آئے)۔ دنیا کی ساری قومیں، خاندان اور ان کے افراد اللہ ربّ العزّت سبحانہ کی مخلوق ہونے میں اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے میں سب برابر ہیں۔ اللہ ربّ العزّت کے نزدیک برتری اور بزرگی کا دارومدار وہ تقویٰ اور عمدہ صفات اور خوبیاں ہیں، جن سے کوئی قوم یا افراد متصف ہوتے ہیں۔ صرف کسی خاندان کا فرد ہونا یا کسی پیغمبر کی اولاد ہونا، یا کسی اعلیٰ نسل کے ساتھ منسلک ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

چون شدی عاشق کنون ترک نسب کن جامی

کہ درایں راہ فلان ابن فلان چیزے نیست

ہدایت، علم وحکمت اور سلطنت وحکومت یہ تین چیزیں ایسی تھیں جو مجموعی طور پر اس وقت قوم بنی اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم میں نہیں پائی جاتی تھیں، اس لئے ان کی بندگی اور فضیلت ان کے زمانے کے دیگر لوگوں اور قوموں پر مُسلّم تھی، لیکن جب غرور اور تعصب کی وجہ سے انہوں نے پیغامِ ہدایت کو ٹھکرا دیا، اور اپنی مذموم خواہشات کی تسکین کے لئے علم وحکمت کے آسمانی صحیفوں میں تحریف وتبدیلی اور بگاڑ شروع کر دیا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین اور بے ادبی کو اپنا شعار بنالیا، اور بعض انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل بھی کر دیا، تو ان کرتوتوں کے باعث ان پر ذلت ومسکنت کی لعنت مسلط کر دی گئی، اور طرح طرح کے ناگفتہ بہ عذاب ان پر مسلط ہوئے، گویا انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی برتری اور فضیلت کا گلا گھونٹ دیا، اور اپنی بزرگی کا خانہ برباد کر کے اس کا جنازہ نکال دیا۔

اب چونکہ ان فضائل واوصاف کے مالک اوران کی وارث امت (امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) مسلمہ تھی، اس لئے فضیلت وکرامت کا تاج اسی کے سر پر رکھ دیا گیا، اوراسے کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ کا ابدی اعزاز ومژدہ سنادیا گیا، اس لئے امت مسلمہ پر بنی اسرائیل کی برتری وفضیلت کا سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔

حضرت الفقیہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ یہود دعویٰ کرتے تھے کہ ہمارے باپ دادے جوپیغمبر گزرے ہیں، بروزِ قیامت ہماری شفاعت کریں گے، اور ہمیں چھڑائیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمانِ باطل کورد فرمایا۔ [مظهري، قرطبي]

میں کہتاہوں کہ یہ باطل عقیدہ ہمارے زمانے کے قبر پرست مشرکوں کا بھی ہے، جو کہتے ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ اور دوسرے اولیاء کرام ہماری شفاعت کریں گے، اور ہمیں ہر قسم کی گرفت اور عذابوں سے نجات دلائیں گے، تو انہیں یادرکھنا چاہئے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کسی مشرک کو کام نہیں آئے، تو اولیاء کرام جو کہ انبیاء علیہم السلام سے پیچھے اور کم درجہ والے ہیں، وہ اُنہیں کیا کام آئیں گے؟ ہرگز نہیں ہوسکتا، کیونکہ مشرک پر شفاعت کے سارے دروازے بند ہوں گے، حسبِ فرمان الٰہی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء:۴۸] (خدااس کے گناہ کونہیں بخشے گا کہ کسی کواس کا شریک بنایا جائے، اوراس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے گا بخش دے گا)۔

مسئلۂ شفاعت:

اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عُصاۃُ المؤمنین، یعنی سوائے شرک کے، عام گناہگاروں کے لئے انبیاء، صدّیقین، شہداء، علماء، حفاظ وقراء اور دیگر اہلِ خیر وتقویٰ کی شفاعت برحق ہے۔ البتہ! معتزلہ ہر قسم کی شفاعت کے منکر ہیں۔

قرآن وسنت میں بکثرت آیات واحادیثِ صحاح ثبوتِ شفاعت پر ناطق ہیں، جن سے شفاعتِ عمومی شفاعتِ کبریٰ، اور ہر قسم کی شفاعت کا روزِ روشن کی طرح اثبات وثبوت ہورہا ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے شفاعتِ کبریٰ مقامِ محمود تواتر کے ساتھ ثابت ہے، جس کا انکار کفر اور زندقہ ہے، اوراس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے دیگر دس قسم کی شفاعتوں کا اثبات بھی ہے۔ [فتح الباري، ابن كثير وغيره]

نصوصِ قرآنیہ اوراحادیثِ مبارکہ میں جہاں بھی شفاعت کی نفی کا ذکر ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اہلِ شرک

کے لئے شفاعت نہیں ہوگی، یا یہ کہ بدونِ اذنِ باری تعالیٰ کسی کو شفاعت کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، جب ربّ العزت سبحانہ اِذن عطا فرمائیں گے، تو شفاعت کنندگان ہر محاذ پر سفارش کر سکیں گے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں شفاعت کے متعلق طویل احادیث موجود ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس، حضرت ابوسعید خدری، حضرت جابر اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بکثرت احادیثِ شفاعت مروی ہیں۔ شفاعت کی حقیقت اور اس کی تمام اقسام کی تفصیل اگر دیکھنا ہو، تو منازل العرفان ''سورۃ النباء'' کی تفسیر میں دیکھیں۔

وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَ
كُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذۡ
فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَآ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: اور یاد کرو، وہ زمانہ جب رہائی دی ہم نے تم کو فرعونیوں سے جنہوں نے تمہیں مبتلا کر رکھا تھا سخت عذاب میں ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو، اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری بیٹیوں کو، اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی ﴿۴۹﴾ اور یاد کرو وہ وقت جب پھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو، پھر ہم نے بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا ہم نے فرعونیوں کو، اور تم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (مشاہدہ کر رہے تھے) ﴿۵۰﴾

ربط و مناسبت:

بنی اسرائیل پر حق تعالیٰ نے جو نعمتیں فرمائی ہیں، یہاں سے ان کی تفصیل شروع ہے۔ شروع رکوع میں تو اجمالاً سب نعمتوں کا بیان آچکا تھا، اب یہاں سے اس اجمال کی تفصیل ہے، چونکہ آباء واجداد کے نجات پانے سے اولاد کو بھی نجات حاصل ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اولاد (موجودہ لوگ) کو مخاطب بنا کر فرمایا کہ جب ہم نے تمہیں چھڑایا، جیسے دوسری جگہ ارشاد: '' اِنَّا لَمَّا طَغَى الۡمَآءُ حَمَلۡنٰكُمۡ فِى الۡجَارِيَةِ [الحاقۃ: ۱۱] اَیْ جَعَلْنَا اٰبَاءَ كُمْ فِي الْجَارِيَةِ'' [قرطبي، مظهري]

''آلِ فرعون'' فرعون کے متعلقین اور ہم مشرب لوگ مراد ہیں۔ اور لفظ ''آل'' اصل میں ''أهل'' ہے،

بدلیل ''أھیل'' جوکہ اس کی تصغیر ہے۔اور''آلؔ'' کے لفظ کا استعمال اشراف میں ہوتا ہے جیسے انبیاء، یا بادشاہ و امراء، یعنی بڑی بڑی ہستیوں میں، اور اھل کا استعمال عام ہے۔ کہتے ہیں: أھل العلم، أھل اللہ، أھل الجنة، اسی طرح أھل القریة وغیرہ۔

''فرعون'' کوئی نام نہیں ہے، بلکہ مصر کے ہر بادشاہ کا لقب ہے، جیسے چین کے بادشاہ کا لقب''خاقان''، ہند کے بادشاہ کا ''مہاراجہ''،یمن کے''تبع''،فارس کے''کسریٰ''،روم کے''قیصر''،حبشہ کے''نجاشی'' وغیرہم۔

موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کا نام ولید بن مصعب بن ریان ہے،اس نے چار سو دس سال عمر پائی،اور بحر قلزم میں مع فوج وحشم کے غرق ہو کر جہنم رسید ہوا۔حضرت یوسف علیہ السلام کے فرعون کا نام ریان بن ولید تھا۔موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے دادا تھے،اورعزیز مصر کا نام ''قطفیر'' تھا۔یہ دونوں مسلمان ہوئے۔واللہ اعلم۔دونوں فرعونوں کے درمیان چارسو سال سے زائد مدت کا فاصلہ ہے۔

معارف ومنازل

قرآن کریم میں جو تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں،بعض تو ان میں سے ایسے ہیں جو پورے قرآن کریم میں ایک یا دو مقامات پر ذکر کئے گئے ہیں، جیسے داستانِ یوسف ،اصحابِ کہف،ذوالقرنین اور لقمان حکیم کے واقعات۔اور بعض واقعات ایسے بھی ہیں،جن کو عبرت کی خاطر، یا کسی اور مقصد کے لئے بار بار دہرایا گیا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات ہیں۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام نامی قرآن حکیم میں (۱۳۶) مرتبہ،جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام کا نام نامی بیس (۲۰) مقامات پر مذکور ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کی امت بنی اسرائیل کے واقعات قرآن کریم کی (۳۷) سورتوں اور (۵۱۴) آیات میں مع تذکرہ فرعون اجمال اور تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔یہ تعداد قرآن حکیم میں مذکورہ واقعات میں سب سے زیادہ ہے۔پھر اسی ایک واقعہ کے بعض اجزاء کسی سورت میں،اور بعض اجزاء اسی سورت کے کسی اور مقام پر،بعض اجزاء دیگر مختلف سورتوں میں سلسلہ وار بیان ہوئے ہیں۔

اگر ان سب کڑیوں کو ترتیب دے کر ملا دیا جائے،تو پوری تاریخی داستان کو سمجھنا بڑا آسان ہوگا،اور واقعہ کی تاریخی حیثیت واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔مگر قرآنی اعجاز اسی کا متقاضی ہے کہ واقعہ کو انتشار کے ساتھ تذکیر وعبرت کی خاطر مختلف سورتوں اور متعدد مقامات پر بیان کیا جائے،جس کے فوائد نہایت کثرت کے ساتھ سامنے آئیں گے۔

شاید ایک مقام پر بیک وقت تفصیلی بیان سے وہ فوائد حاصل نہ ہوتے۔

فرعون کے مظالم اور زیادتیوں کا اجمالی بیان:

جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس وقت کے مصری فرعون کے کہنے اور اصرار پر اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام مع اپنے پورے خاندان کے جو ستر (۷۰) نفوس پر مشتمل تھا، بڑی عزّت واحترام کے ساتھ کنعان (فلسطین) سے مصری دارالحکومت جاشان (رعمیسیس) بلایا، تو شہر کے باہر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے وزراء اور دیگر مصری عمائدین کے ساتھ ان کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا، اور انہیں دارالحکومت میں شاہی محلات میں بڑے اعزاز کے ساتھ رکھا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں شہر سے باہر ایک آباد علاقے میں بسایا، تا کہ وہ وہاں اپنے دیہاتی ماحول اور پیغمبرانہ مراسم کے ساتھ رہیں۔ اپنے دین اور دینی اقدار کو تحفظ دے سکیں، کیونکہ مصری معاشرہ میں رہنا ان کے لئے موزوں نہیں تھا۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔ حسبِ وصیت انہیں دریائے نیل کے کنارے پر بڑے اعزاز کے ساتھ سرکاری اکرام واحترام کے ساتھ دفن کیا گیا۔

انہوں نے یہ وصیت کردی تھی کہ کسی وقت جب بنی اسرائیل مصر کو چھوڑ کر جب واپس فلسطین جائیں، تو میرے جسدِ خاکی کو یہاں سے نکال کر ارضِ فلسطین سرزمین انبیاء (آباء واجداد) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر کے نزدیک "الخلیل" نامی بستی (نابلس کے قریب) دفن کریں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی موت کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد اور خاندان تقریباً سینکڑوں نفوس پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد حالات بدلتے گئے، اور مصریوں میں ان کی قدیم رسوم شرک وبت پرستی، کواکب پرستی اور صابئیت کو عروج ہوا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا دین صرف بنی اسرائیل تک محدود رہا۔

رفتہ رفتہ فرعونیوں نے ان سے قدیم جاگیریں اور املاک بزورِ قوت واپس لے کر انہیں مکمل غلام بنا دیا، اور ان سے طرح طرح کی خدمات لے کر ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر کے ان کی زندگی اجیرن کردی۔ اس پورے پانچ سو سالہ عرصے میں ان کی آبادی لاکھوں تک پہنچ گئی، اور وہ نہایت ذلّت وغلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے کئی دفعہ یہاں سے نکل کر جانے کا سوچا، مگر ان پر مکمل قدغن و پابندی لگ چکی تھی، وہاں سے اجتماعی طور پر نکلنا تو کیا، انفرادی طور پر بھی کہیں باہر کا سفر نہیں کرسکتے تھے۔ بعض مؤرخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ بنی اسرائیلیوں کی

گردنوں میں غلامی کے طوق ڈالے جاتے تھے، تاکہ ان کی پہچان ہو، اور ان کے دینی و مذہبی اقدار پر بھی پورا پورا قدغن ہوتا تھا۔ ان کے لباس اور قومی وضع قطع پر بھی پابندی ہوتی تھی۔ ان کو کسی ایک علاقے میں اجتماعی طور پر رہنے سہنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

وہ مصریوں کے محلوں میں بحیثیتِ خدمتگار و مزدور منتشر رہتے تھے۔ انہیں مصریوں کی طرح پختہ اور اونچے مکان بنانے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ان کی عورتیں عاریۃً زیورات لے کر استعمال کرتی تھیں، ان کی عورتوں کیلئے ذاتی زیورات بنانے اور استعمال پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ کوئی اسرائیلی جوان کسی قبطی عورت سے شادی نہیں کرسکتا تھا، جبکہ قبطی نوجوان زبردستی ان کی حسیناؤں پر قبضہ کر کے دادعیش لینے پر اختیار رکھتے تھے۔ مختلف علاقائی تنظیموں کے ذریعہ روزانہ ان کی حاضری لی جاتی تھی۔ کوئی اسرائیلی کسی محفل میں مصریوں کے برابر بیٹھ نہیں سکتا تھا، وغیر ذلک من المظالم۔

یہ ہے ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ کی ایک مختصر جھلک، جس کی ایک ادنیٰ جھلک ہم نے روسیوں کے زمانہ میں ہی دیکھی کہ جب روسیوں نے اسلامی ریاستوں (بلخ و بخارا اور سمرقند و تاشقند وغیرہ) پر قبضہ کر کے فرعونیوں اور چنگیزیوں کی تاریخ دہرائی، اور کروڑوں مسلمانوں کو خاک و خون میں نہلایا۔ انہیں بے دریغ قتل کیا۔ ان کے تمام دینی اقدار پر پابندی لگائی، اور کمیونسٹ انقلاب کے نام پر ان پر ناقابلِ برداشت مظالم ڈھائے۔ ان کی گردنوں میں فرعونیوں کی طرح غلامی کا طوق ڈال کر ان کی حمیت اور آزادی کو سلب کیا۔ آج ایک صدی کے بعد وہ اگرچہ آزادی حاصل کر چکے ہیں، مگر بدقسمتی کہئے، یا تازیانۂ عبرت و عذاب، کہ وہ اسی غلامی والے ذہن کے ساتھ اسلام اور اس کی تعلیمات سے مکمل محروم اور بے بہرہ ہیں۔

انگریزوں نے برصغیر کے مسلمانوں پر بھی یہی چال چلائی، اور انہیں ایک ایسے محاذ پر پہنچا دیا جو ہمارے سامنے ہے۔ ''نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے''۔ الکفر ملة واحدة''۔ سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ غلامانہ ذہن کا اثر اور نتیجہ ہے کہ برصغیر کے مسلمان اور سمرقند و تاشقند کے مسلمان آزادی حاصل کرنے کے باوجود آج بھی انگریز اور روس کے نرغے اور گرفت میں پابندِ سلاسل ہیں، اور ہر بات پر اسلام دشمنوں کے گیت گاتے ہیں، اور ان کے نقشِ قدم پر رواں دواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے دین، قرآن کریم اور سارے جہاں کے نور و برکت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنہرے احکام سے بے بہرہ اور بے خبر ہیں۔

اسی طرح بنی اسرائیل نے جب سینکڑوں سالہ غلامی سے آزادی اورفرعونیوں کے ظلم وستم سے نجات پائی، اور اپنی آنکھوں سے فرعون اوراس کی فوج وحشم کی تباہی کا نظارہ دیکھا، اورخودمختاری حاصل کی، تو غلامانہ ذہن کے ساتھ اپنے نجات دہندہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا﴾ [المائدة:۲۴] (تم اور تمہارا خدا جاؤ اورلڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے)۔ اورانہوں نے یہ بھی کہاتھا: ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [البقرة:۵۵] (جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے، تم پر ایمان نہیں لائیں گے) اسی طرح کہنے لگے: ﴿اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ [الأعراف:۱۳۸] (جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دو)۔

ع جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا۔ (ظفر)

؎ بملک جم ندہم مصرعہ نذیری را ☆ ہر آنکہ کشتہ نشد از قبیلہ ما نیست

اس وقت سارا عالم اسلام ایک ناگفتہ بہ کشمکش میں مبتلا ہے۔ پورے عالم پر یہود ونصاریٰ کا راج ہے۔ ہر جگہ ان کا قانون اورنظریۂ حیات ہے، معدودے چند (اہلِ حق طائفۂ منصورہ) کے علاوہ باقی تمام مسلمانوں کی گردنوں میں یہودیت کا طوق پڑا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کے اتارنے کا وقت کب آئے گا؟ اور وہ مجدِّدِ کبیر کون ہوگا؟ بیشک! اس بڑے مرض اور بین الاقوامی غلامی سے نجات دہندہ ضرور کوئی بڑا بین الاقوامی مجدّد ہی ہوگا، وہ حضرت محمد بن عبداللہ امام مہدی ہی ہوں گے۔

موجودہ حالات اسی کے غماز ہیں کہ یورپ کے بڑے باپ دجالِ اکبر کے خروج کا زمانہ قریب آپہنچا ہے، جب فتنہ بہت بڑا ہو تو بڑے مرض کا معالج بھی بڑا ہوگا۔ دجال کے لئے بڑے پیمانہ پر راستہ ہموار ہو چکا ہے، پلیٹ فارم بن چکا ہے، محل اور سواری اور ائیر پورٹ تک سب کچھ تیار ہو چکا ہے، استقبالیہ کمیٹی ترتیب دے دی گئی ہے، "فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى! لگتا ہے کہ یہ صدی خروجِ دجال اور ظہورِ مہدی اور نزولِ مسیح علیہ السلام کی ہے۔ اللّٰھم عجل وسلم۔

فائدہ:

دجال کون ہے؟ دجال کی کنیت ہے: "أبو اليهود، أبو كردوس اور أبو الحمقاء"۔ اور لقب ہے: "دجال اور المسيح الدجال اور الأعور الكذاب" بھی۔ خالص یہودی النسل بنی اسرائیلی ہے۔ اس کے ماں باپ دونوں یہودی ہیں۔ اس وقت شمالی جزائر میں بند ہے۔ اس کا خروج ایران کے شہر اصفہان سے ہوگا۔ پہلے مرحلے

میں اصفہان کے اسی (۸۰) ہزار یہودی اس کے ہم رکاب ہوں گے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھے گا، اس کی فوج میں بے تحاشا اضافہ ہوتا جائے گا، اس کا دعویٰ الوہیت کا ہوگا۔

ظاہری طور پر استدراجاً اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہوگا، بادلوں سے جو کہے گا، وہ برسائیں گے۔ ہواؤں سے کہے گا، وہ چلیں گی۔ زمین سے کہے گا، وہ سبزہ پیدا کرے گی، اور وہ مسمریزم اور سحر و جادو کا بادشاہ ہوگا۔ مردوں کو جادو کے زور سے زندہ کرے گا۔ کوئی ظاہری جنت اور دوزخ بھی اس کے تصرف میں ہوں گے، کچھ ماننے والوں کو اپنی جنت کے، اور نہ ماننے والوں کو اپنی دوزخ کے حوالہ کرے گا۔ اس کی دوزخ اللہ تعالیٰ کی جنت اور اس کی جنت اللہ تعالیٰ کا جہنم ہوگا، مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے علاوہ پورے روئے زمین کا چکر لگائے گا۔ بابُ اللُّد (موجودہ اسرائیل) پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جہنم رسید ہوگا۔

﴿يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ﴾ (تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے ہیں) یہ ﴿يَسُومُونَكُمْ﴾ کا بیان ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ بیٹوں کو ذبح کرنے اور بیٹیوں کو چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک شعلہ زن آگ نمودار ہو کر آئی، اور پورے مصر کو اپنے گھیرے میں لے کر سارے قبطیوں کو جلایا اور بھسم کر کے رکھ دیا، تو کاہنوں سے تعبیر پوچھی، وہ کہنے لگے: بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا، جو پورے مصر اور اس کے باشندوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا، اور تیرا سب کچھ (ملک، مال اور اقتدار) ختم ہو جائے گا۔ تب فرعون نے حکم نامہ جاری کیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اسے فوراً قتل کیا جائے۔

علاقے کی تمام دائیوں کو جمع کر کے انہیں یہ حکم سنایا گیا، اور دیگر ہر قسم کے ذرائع سے نگرانی سخت کر لی گئی، تاکہ کوئی بچہ زندہ نہ رہ جائے۔ البتہ! لڑکیوں کے لئے کوئی سخت حکم نافذ نہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس مہم میں اس مردود نے بارہ ہزار بچے مروائے (ضائع کئے)۔ وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات وثوق کے ساتھ پہنچی ہے کہ فرعون نے نوے ہزار بچے بیدردی کے ساتھ ذبح کرائے۔ پھر بنی اسرائیل کے بوڑھے لوگ کثرت سے مرتے گئے، تو قبطیوں کے رئیس یہ کیفیت دیکھ کر فرعون سے کہنے لگے کہ بنی اسرائیل کے بچے آپ کے حکم سے مارے جاتے ہیں، اور بوڑھے اپنی موت مر رہے ہیں، اگر یہی حالت رہی، تو بنی اسرائیل نیست و نابود ہو جائیں گے، اور ساری بیگار ہم پر آپڑے گی، اور کوئی بیگاری مزدور ہمیں دستیاب نہیں ہوگا۔ فرعون نے یہ بات سن کر دوبارہ حکم دیا کہ ایک سال بچے قتل

کئے جائیں، اور ایک سال چھوڑ دیئے جائیں۔ تقدیر الٰہی سے حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال بچوں کو چھوڑا جاتا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال بچوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ [مظهري]

علامہ محمد عبدہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور وجہ بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی نسل اس تیزی اور کثرت سے بڑھنے لگی تھی کہ فرعون اور اس کے اعوان کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ اگر ان کی پیدائش کی رفتار یہی رہی، تو بنی اسرائیل کی اقلیت اکثریت میں تبدیل ہوجائے گی، اور اپنی غالب اکثریت کی بناء پر یہ کوئی مخالف انقلاب برپا کریں گے۔ اس خدشہ کے پیش نظر اس نے بنی اسرائیل کی نسل کشی کا یہ ظالمانہ حکم دے دیا۔ [تفسیر منار رشید رضا]

﴿وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ﴾ (اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی) عظیم بلاء کی صفت ہے۔ بلاء کے معنی آزمائش کے ہے۔ آزمائش کبھی شدتِ عذاب سے ہوتی ہے، اس وقت اس بات کی جانچ ہوتی ہے کہ آیا صبر کرتے ہیں یا نہیں، اور کبھی نعمت وفراخی سے ہوتی ہے، اس وقت یہ امتحان ہوتا ہے کہ آیا شکر کرتے ہیں یا نہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ [الأنبياء: ۳۵] (اور ہم تو لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں) ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ [البقرة] (اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے، تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنادو، ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں، اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔

﴿الۗمّۗ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ [العنكبوت] (الٓمٓ: کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے، اور اُن کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ اور جو لوگ اُن سے پہلے ہو چکے ہیں، ہم نے اُن کو بھی آزمایا تھا (اور ان کو بھی آزمائیں گے) سو خدا اُن کو ضرور معلوم کریں گے جو (اپنے ایمان میں) سچے ہیں، اور اُن کو بھی جو جھوٹے ہیں)۔

مؤمن کی زندگی قدم بقدم ابتلاء اور آزمائشوں کے گھری ہوئی ہے، جتنا کسی کا ایمان کامل اور عمل پختہ ہوگا، اتنا ہی امتحان و ابتلاء زیادہ ہوگا۔ اسلام اور احکامِ الٰہیہ پر صدقِ دل سے پابندی پلِ صراط پر چلنے سے کم نہیں ہے۔ در اصل معنوی پلِ صراط اسی زندگی میں باقاعدہ اتباعِ شریعت کا نام ہے، اس مرحلہ پر سو فیصد کامیابی ہی قیامت کا پلِ صراط عبور کرنے کی ضمانت ہے۔ شریعت کی اتباع و پیروی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر یہ آسان کام ہوتا، تو ہر مسلمان صاحبِ نسبت اور مکمل متقی و پرہیزگار بن جاتا۔

اگر گویم مسلمانم بلرزم ☆ کہ دانم مشکلات لا الہ را

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے سمجھنے کے لئے قلب و دماغ، سننے کے لئے دو کان، دیکھنے کے لئے دو روشن آنکھیں، چلنے کے لئے دو پاؤں، پکڑنے کے لئے دو ہاتھ عنایت کئے۔ اسی طرح اپنی رضا کے لئے صبر و شکر کی نعمت سے نوازا، قیامت کی فلاح اور جنت کے درجات انہی دو نعمتوں پر مقرر فرمائے، اور ہر مؤمن کو اپنی زندگی میں انہی دونوں نعمتوں پر چلنے اور انہیں حاصل کرنے کا حکم صادر فرمایا، اور "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" کے پیش نظر اللہ تعالیٰ سبحانہ کے اسم گرامی "الصبور" کا بھی تقاضا صبر ہی ہے، اور "الشکور" کا تقاضا شکر ہی ہے، جیسے کہ پرندے کے دو پر ہوتے ہیں، اسی طرح ایمان و یقین ان دو پروں کا نام ہے جس کے سایہ میں مسلمان کا ہر عمل پرورش پا کر او پر پرواز کرتا ہے۔ خوب غور کرو، اور سمجھو۔

نسب وولادت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوکابد ہے۔ بعض حضرات نے والدہ کا نام یوحانذ لکھا ہے۔

باپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عمران بن قامت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام "کلثوم یا مریم" ہے۔

زمانۂ ولادت، پھر تابوت میں دریا سپردگی سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک تمام تفصیلات قرآن کریم نے موقع بموقع بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں، اگر انہیں جمع کر کے بیان کیا جائے، تو ایک طویل تاریخی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ شیخ عبد الوہاب نجار مصری رحمۃ اللہ علیہ نے اور حضرت سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے قصص القرآن میں پوری تفصیل سے لکھا ہے، فلیراجع۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ [الزخرف:۵۵] (جب انہوں نے ہم کوخفا کیاتو ہم نے ان سے انتقام لے لیا)۔جب فرعون اوراس کے سرداروں پر معجزات (تسع آیات بینات) کا کوئی اثر نہیں ہوا،اوروہ مسلسل کبروغروراور تکذیبِ حق میں اور موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے میں،اورانہیں راستہ سے ہٹانے اور قتل کی تدبیر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، پھر جب ہدایت کے سارے دروازے بند ہونے لگے تو قدرت نے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ تسع آیات بینات یہ ہیں: (۱) عصا (۲) یدِ بیضا (۳) سنین (قحط) (۴) نقصِ ثمرات (۵) طوفان (۶) جراد (۷) قمل (۸) ضفادع (۹) دم۔ان میں عصااور یدِ بیضا آیات کبریٰ ہیں، باقی آیاتِ صغریٰ ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ، مجاہد،عکرمہ،شعبی اورقتادہ رحمۃ اللہ علیہم بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔البتہ!اتنا واضح ہو کہ آیاتِ کبریٰ از قبیلِ معجزات ہیں،اور باقی سات آیات عذاب ہیں۔بعض علماء نے سب کو معجزات میں شمار کیا ہے۔واللہ اعلم

﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ (اور یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑا) یعنی تمہاری نجات اور پار ہونے کی خاطر دریا کو چیر کر تمہارے لئے راستے بنائے۔''فرق'' کے معنی جدا کرنا، دوٹکڑے کرنا، سر پر مانگ نکالنے کو بھی اسی مناسبت سے فرق کہتے ہیں۔ ''فلق'' کے معنی پھاڑنا، ایک چیز کو چیر کر اس سے کوئی چیز علیحدہ کرنا، نکالنا، ومنه فالق الإصباح وأيضا۔﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾[الأنعام:۹۵] (بیشک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے)۔

حضرت یعقوب علیہم السلام جب اپنے خاندان کے ساتھ مصر میں داخل ہوئے، اس وقت ان کا خاندان ستر نفوس پر مشتمل تھا،اور بعض مؤرخین نے بیانوے لکھا ہے۔اب موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کو مصر سے فلسطین کی طرف نکلنے کا حکم دیا، اس وقت بنی اسرائیل تقریباً چھ لاکھ کے قریب تھے۔یہ بات کسی پر مخفی نہ رہے کہ آیا بنی اسرائیل قوم چوری چھپکے راتوں رات مصر سے نکل چکی ہے؟ یہ کبھی ممکن ہی نہیں کہ اتنی بڑی قوم چھپ کر نکلی ہو۔واقعہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اوراس کے سرداروں سے کہا تھا کہ ہمارا ایک مذہبی تہوار ''عیدقربان،عیدفسح'' آنے والی ہے، جس میں دو تین دن صرف ہوں گے، جس کو ہم مصر کے دارالحکومت میں ادا نہیں کر سکتے۔ہمیں باہر صحراء میں جانے کی

اجازت دی جائے۔ پہلے مرحلہ میں فرعون نے یہ شرط لگا کر اجازت دی کہ کوئی سامان وغیرہ ساتھ نہیں لے جاسکتے، مگر دوبارہ اس نے یہ کہا کہ ضروری ساز وسامان ساتھ لے جاسکتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو تاکید سے ہوشیاری کے ساتھ اپنے پورے مال ومتاع جمع کرنے کا حکم دے دیا کہ مخفی طور پر گھروں میں سامان جمع کر کے رات کی تاریکی میں کوچ کرو، تاکہ فرعونیوں کو پتہ نہ چلے، ورنہ یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے۔ جب رات کی تاریکی میں پوری قوم مع اپنے ساز وسامان اور مال ومتاع کے روانہ ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرعونیوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، اور وہ بے خبر رہے۔ دوسرے اور تیسرے دن جب فرعون کے کارندوں نے ان کے گھروں کا معائنہ کیا، تو گھروں میں کوئی سامان نہیں پایا۔ انہیں شک پڑ گیا کہ یہ قوم ہمیشہ کے لئے یہاں سے کوچ کر گئی ہے، اور یہ لوگ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ انہوں نے اس بارے میں فرعون کو اطلاع کر دی، جس پر فرعون نے بڑے غصے میں آ کر اپنے لشکر وسپاہ کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

﴿وَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ﴾ [الشعراء:٥٣] (تو فرعون نے شہروں میں نقیب روانہ کئے)۔ تمام قریب وبعید شہروں اور بستیوں سے بے تحاشا لوگوں کو مع ساز وسامان جمع کر کے انہیں غیرت دلا کر کہا: ﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ۝ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ۝﴾ [الشعراء:٥٤] (اور کہا) کہ یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہے، اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں) پھر ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ ہر قسم کے حربی ودوسرے مال ومتاع کے ساتھ ان کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔

ادھر حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام قوم کی قیادت کرتے ہوئے کافی آگے نکل چکے تھے۔ مصر سے فلسطین، یا ارضِ کنعان جانے کے دو راستے ہیں، ایک خشکی کا راستہ ہے، اور وہ قریب ہے، اور دوسرا بحر احمر (قلزم) کا راستہ، یعنی اس کو عبور کر کے بیابانِ سوار اور سینا (میدانِ تیہ) کی راہ ہے، اور یہ راہ بہ نسبت اول کے کافی طویل ہے۔

مگر احکم الحاکمین سبحانہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ (دریا والا) اختیار کریں، اور قلزم کو پار کر کے جائیں، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی کے ذریعہ بتایا گیا تھا کہ: ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ﴾ [الدخان:٢٤] (اور دریا کو یونہی جگہ جگہ سے چھوڑ دے، بیشک وہ لشکر ڈبو دیا جائے گا)۔

یہ مقصد تب پورا ہوسکتا تھا کہ وہ دریا والا لمبا راستہ اختیار کریں۔ اگر وہ خشکی والے راستہ پر چلیں گے، تو دشمن کا غرقاب ہونا ممکن نہیں ہوگا، اور اس میں دیگر بہت سے فوائد اور وجوہات بھی مضمر تھیں۔ اسی بناء پر انہوں نے دریا

والا راستہ اختیار کیا۔ جب فرعون، ہامان اور ان کے سرداروں نے بنی اسرائیل کے تعاقب کا فیصلہ کیا، تو ایک کروڑ ساتھ لاکھ آدمی لے کر مصر سے نکلے، ستر ہزار سیاہ گھوڑے بھی ہمراہ تھے۔

ادھر بنی اسرائیل دریا تک پہنچے ہی تھے کہ سورج طلوع کر چکا تھا، اور دریا خوب اپنی موجوں کے ساتھ بہہ رہا تھا کہ دیکھتے کیا ہیں، فرعون اپنے جرار لشکر کے ساتھ پیچھے سے تعاقب میں آرہا ہے۔ ان بیچاروں کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ نہایت خوف وہراس اور پریشانی میں چیخ اٹھے۔ قرآن کریم نے یہ نقشہ ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے: ﴿فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ﴾ [الشعراء: ٦١] (دونوں جماعتیں جب ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو پکڑے گئے)۔ ﴿قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ﴾ [الشعراء: ٦٢] حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے عزم واستقامت اور وحی الٰہی کی روشنی میں فرمایا: (ہرگز نہیں! میرا رب تعالیٰ میرے ساتھ ہے، جو مجھے نجات کی راہ بتائے گا)۔

اسی کے ساتھ ربّ العزّت سبحانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا: ﴿اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ﴾ [الشعراء: ٦٣] (آپ اپنا عصا دریا پر مارو، موسیٰ علیہ السلام نے عصا دریا پر مارا، پس دریا پھٹ گیا، اور بارہ راستے نکل آئے، جس کا ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ جیسا کھڑا ہو گیا (پانی پہاڑ بن کر کھڑا رہا)۔ بارہ قبائل کے لئے بارہ راستے بن گئے۔ ہر دونوں راستوں کے درمیان پانی پہاڑ بن کر پہاڑ کی شکل میں کھڑا رہا، اونچا ہو کر اور اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ہوا اور دھوپ کے ذریعہ لمحوں میں تمام راستے خشک کر لئے، اور ہر قبیلہ اپنا اپنا راستہ لے کر روانہ ہوا۔

پانی چونکہ (اونچا) بلندی میں چڑھ گیا تھا، اس لئے چلتے میں ایک گروہ دوسرے کو دیکھتا نہ تھا، تو وہ خوف کھانے لگے، اور ایک دوسرے کے لئے پریشان ہونے لگے، تو حق تعالیٰ سبحانہ نے اس خوف کو بھی دور کر دیا، اور پانی میں روشندان کھول دیئے کہ آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے، اور باتیں سنتے رہتے تھے۔ اس طرح صحیح سالم اور عافیت کے ساتھ دریا عبور کر کے پار ہوئے۔

پیچھے سے جب فرعون اپنے لشکر وسپاہ اور رعایا وحشم کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچا، تو دیکھا کہ دریا پھٹا ہوا خشک ہو چکا ہے، اور گزرنے کے لئے باقاعدہ راستے بنے ہوئے ہیں، تو فخر وغرور کے ساتھ اپنے سرداروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: دیکھو! دریا میرے خوف سے اس لئے پھٹ گیا کہ میں اپنے بھاگے ہوئے غلاموں اور چاکروں کو پکڑلوں۔ فرعون ایک اعلیٰ نسل کے سیاہ گھوڑے پر سوار تھا، اور سب سے آگے آگے جا رہا تھا، اور سارے

لشکر کے گھوڑے پیچھے چل رہے تھے۔

تقریباً کوئی گھوڑی نہ تھی۔حضرت جبریل علیہ السلام بحکمِ الٰہی بشکلِ انسان ایک خوبصورت گھوڑی پر سوار تشریف لائے، اور فرعون کی سواری سے پہلے دریا میں گھس کر گھوڑی دوڑائی۔فرعون کا گھوڑا، گھوڑی کی بوسونگھ کر بے اختیار اس کے پیچھے دوڑ لگا کر دریا میں گھس گیا، اور مادی گھوڑی کا پیچھا کیا، اور آگے بڑھا۔پیچھے سے سارے لشکر والے فرعون کے پیچھے دریا میں گھستے چلے گئے، اور حضرت میکائیل علیہ السلام ایک گھوڑے پر سوار ہوکر بالکل لشکر کے آخری حصے میں آکر ان کے گھوڑوں کو اپنے گھوڑے کے ذریعہ ہانکتے ہوئے تیزی کے ساتھ چلاتے ہوئے بھگاتے رہے، تاکہ کوئی سوار غرقاب ہونے سے بچ کر نہ نکلے، حتی کہ سب کے سب دریا میں گھس گئے۔کوئی خشکی پر نہ رہا۔جب سب کے سب ہدف کے نشانے پر پہنچ گئے، تو جو راستے بنی اسرائیل کے لئے بنے ہوئے تھے، وہ سب مل کر ایک ہو گئے۔پانی کی موجوں نے طغیانی میں آکر ساری کسر پوری کر دی، اور پورا لشکر موجوں کی نذر ہو کر غرق ہوا۔اس مقام پر پانی کا پاٹ بارہ میل تھا، یعنی چار فرسخ۔

﴿وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ (فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا) عقلمندو! عبرت حاصل کرو۔

زحکمش دو نیم ست دریائے نیل ☆ بمرغان کشد فیل واصحاب فیل

یہ عبرتناک منظر قابل دید تھا، جسے بنی اسرائیل ناشکرے اور نافرمان قوم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ کاش یہ قوم اگر باقی ماندہ نعمتوں کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک نعمت کی قدر اور شکر ادا کرتی، تو چاہئے تھا کہ ساری زندگی حق تعالیٰ کے حضور سربسجود ہوتے، مگر ایسا نہیں ہوا، جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ان پر شمار نہیں، اسی طرح اس ناعاقبت اندیش نافرمانوں کی نافرمانیوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ [مظهري ملخصا]

فائدہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لوگوں نے یاد دہانی کرائی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں بذریعۂ وحی بھی معلوم ہوا ہو کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وصیت کی تھی کہ بنی اسرائیل جب مصر سے فلسطین ہجرت کریں، تو میرے جسد خاکی کو بھی قبر سے نکال کر ساتھ لے جائیں، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو یہی وصیت کی تھی، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حسبِ وصیت، والد صاحب کو فلسطین منتقل فرمایا تھا۔اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی سنت

کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کا جسد مبارک قبر سے نکال کر فلسطین منتقل کیا، اور ''نابلوس'' کے قریب انہیں دفن کرایا۔
تاریخی روایات سے پتہ چلا ہے کہ قبر کی نشاندہی ایک معذور بوڑھی عورت نے اس شرط پر کرائی کہ موسیٰ علیہ السلام ان کے لئے دعا کریں کہ جنت میں وہ ان کی رفاقت میں رہے، اور دنیا میں ان کی جوانی لوٹ آئے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی یہ دونوں مطالبے منظور کر لئے۔ واللہ اعلم [أحسن الحاضرہ، سیوطي]

مقامِ عبرت:

بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون کی تباہی میں مقامِ عبرت

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، بلکہ حق و باطل کے معرکوں میں عظیم الشان اور عبرت آموز واقعہ ہے۔ یہ ایک جانب غرور ونخوت، جبر وظلم، طغیانی وسرکشی، قہرمانیت وانانیت کی بے مثال ذلت و رسوائی ہے، تو دوسری جانب مظلومیت، خدا پرستی اور صبر واستقامت کی فتح وکامرانی کا عجیب وغریب اور محیر العقول مرقع ہے۔ فرعون کی تباہی محض فرعون اور اس کی کابینہ اور قومی سرداروں کی تباہی نہیں، بلکہ پوری قوم ورعایا اور بے انتہا مال وجواہرات اور جنگی اسباب وذرائع کی بھی تباہی اور ہلاکت ہے۔

اس واقعہ کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ پیچھے قوم میں عورتوں اور بچوں کے سوا کچھ بھی نہیں بچا۔ صرف کچھ معذور اور عمر رسیدہ لوگ بچ گئے۔ بادشاہت کے لئے کوئی جوان یا تجربہ کار مرد دستیاب نہیں رہا، بامر مجبوری ''دلوکہ'' نامی عورت کی تاجپوشی ہوئی۔ اس طرح مصر پر جو زوال آیا وہ قابلِ عبرت اور سبق آموز ہے۔ فرعون جیسے جبار کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے غرق فرما کر برباد کیا، اور اس کے اقتدار کو عورتوں میں منتقل فرما کر پوری قوم کو تباہی سے ہمکنار فرمایا۔ [أحسن الحاضرہ، سیوطي]

❁ ❁ ❁

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ: اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس رات کا، پھر تم لوگوں نے تجویز کرلیا گوسالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد، اور تم لوگ ظالم ہی تو رہے ﴿۵۱﴾ پھر ہم نے تم سے درگزر کر دیا اس پر بھی شاید تم شکر گزار بنو ﴿۵۲﴾

معارف ومنازل

دوسرے مقام پر فرمایا:﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ [الأعراف:۱۴۲] (اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی، اور اس کے ساتھ دس (راتیں) اور ملا کر اسے پورا (چلّہ) کر دیا، تو اس کے پروردگار کی چالیس رات کی میعاد پوری ہوگئی)۔

جب بنی اسرائیل کو طرح طرح کی پریشانیوں سے اطمینان نصیب ہوا، تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمارے لئے کوئی آسمانی شریعت لائیے۔ جس پر ہم دلجمعی کے ساتھ عمل کر کے دکھلائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کا معروضہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کم از کم تیس دن، اور زائد چالیس دن کا وعدہ فرمایا کہ جب اتنی مدّت تم پے در پے روزے رکھو گے، اور کوہِ طور پر معتکف رہو گے، تو تم کو تورات شریف عنایت کی جائے گی۔

دو مدّتیں (کم اور زیادہ) ٹھہرانے کا شاید یہ مطلب تھا کہ اگر اثنائے ریاضت میں وظائف عبودیت اور آدابِ تقرّب ادا کرنے کے اعتبار سے کسی قسم کی کوتاہی اور تقصیر ظاہر نہ کی، تو اقلِ مدت تیس دن کافی ہوں گے، ورنہ اکثر الا جلین چالیس روز پورے کرنے پڑیں گے۔ یا شروع سے تیس دن ضروری و لازمی میعاد کے طور پر ہوں اور چالیس روز پورے کرنا اختیاری و استحبابی حیثیت سے اصل میعاد کی تکمیل و تتمیم کے طور پر رکھے گئے ہوں، جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی بیٹی دیتے وقت فرمایا تھا:﴿عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ﴾ [القصص:۲۷] (اس عہد پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو، اور اگر دس سال پورے کر دو تو تمہاری طرف سے (احسان) ہے)۔

ہمارے زمانہ کے بعض مصنّفین نے یہ کہا ہے کہ اصلی میعاد چالیس ہی دن کی تھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے، اور یہاں بھی﴿فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ﴾ میں ارشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس چالیس دن کے بیان کا ایک پیرایہ ہے کہ ہم نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا، جس کا نتیجہ دس روز اور تھے، تا کہ اشارہ ہو جائے کہ ایک مہینہ سالم (ذیقعدہ) پورا کر کے دوسرے مہینہ (ذی الحجہ) میں سے دس دن اور بڑھادئے گئے۔ اس طرح یکم ذی القعدہ سے شروع ہو کر دس ذی الحجہ کو چلّہ پورا ہوا، جیسا کہ اکثر سلف سے منقول ہے۔ واللہ اعلم [تفسیر عثمانی]

موضح القرآن میں ہے کہ حق تعالیٰ نے وعدہ وفا دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو،

تاکہ تمہاری قوم کو ''تورات دوں'' اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی، فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے جو خوشی ہوتی تھی وہ جاتی رہی، اس کے بدلے دس رات اور بڑھا کر مدت پوری کی۔ [موضح]

ایک ضروری اور تاریخی نکتہ:

بنی اسرائیل چار سو سال فرعون کی غلامی میں زندگی گزار کر نہایت بے ہمت، بے حوصلہ رہے، اور اپنے آباء و اجداد کے دینی مذہبی اقدار کو کلیۃً بھول گئے۔ مصری معاشرہ گوسالہ پرستی اور بت پرستی کے اوہام میں غرق ہو کر مذہب سے کوسوں دور رہا۔ دریائے قلزم عبور کر کے بجائے شکر کے احسان فراموشی کے دریا میں ڈوب گئے۔ چلتے چلتے کسی گوسالہ پرست قوم پر ان کا گزر ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمارے لئے بھی ایسا معبود (گوسالہ) مقرر کر کے ہمیں اس کی عبادت کا موقع فراہم کریں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

﴿وَجَاوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ﴾ [الأعراف:١٣٨] (اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتارا، تو وہ ایسے لوگوں کے پاس جا پہنچے جو اپنے بتوں (کی عبادت) کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔ (بنی اسرائیل) کہنے لگے: اے موسیٰ علیہ السلام! جیسے کہ ان لوگوں کے لئے معبود ہیں، ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو)۔

یہ ہے وہ عجیب و غریب فطرت، پست ذہنیت اور حیران کن منحوس طبیعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قوم بنی اسرائیل! جو ان تمام معرکہ ہائے حق و باطل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے، اور حق کی کامیابی کے ساتھ اپنی نجات پا جانے کے شکریہ میں آج موسیٰ علیہ السلام سے پہلا مطالبہ یہ کرتی ہے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود (بت) بنا دے جیسا کہ یہ پجاری بت خانہ میں بیٹھے پوجا کرتے ہیں، اور ناچ رہے ہیں۔ اس ماجرا اور غیر مہذب و غیر معقول مطالبہ کو دیکھ اور سن کر سامری جیسے کافر اور دشمنِ حق و صداقت منافق نے تاڑ لیا، اور نوٹ کیا، اور کسی خاص موقع کے انتظار میں رہا، جس کا بیان آنے والا ہے۔

حضرت علامہ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں رقم طراز ہیں کہ جن چالیس رات کا حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا، ان میں سے تیس راتیں تو ذیقعدہ کی تھیں، اور دس ذی الحجہ کی، اور یہ قصہ اس طرح ہے کہ جب فرعون ہلاک ہو گیا، اور بنی اسرائیل پھر مصر میں آ کر بسے، تو حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا کہ ہم تم پر توریت

اتاریں گے، اور چالیس رات کا وعدہ فرمایا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بناتا ہوں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام اسپِ حیات پر سوار ہو کر انہیں لینے کے لئے تشریف لائے، جہاں اس گھوڑے کا قدم پڑتا وہاں سبزہ اُگ آتا تھا۔سامری نے یہ عجیب واقعہ دیکھ لیا، یہ سامری ایک سنار تھا، باجرمی کا رہنے والا تھا۔بعض نے کہا ہے کہ کرمان کا رہنے والا تھا۔یہ ظاہراً اسلام لایا تھا، مگر منافق تھا، اور اس قوم میں سے تھا جو گائے کو پوجتے ہیں۔ جب اس نے یہ بات دیکھی، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے زیرِ قدم کی ایک مٹھی خاک اٹھا کر رکھ لی، اور بنی اسرائیل نے کبھی مصر سے نکلنے سے پہلے فرعون کی قوم سے بہت سے زیورات شادی کے بہانے سے مستعار لے لیے تھے۔

جب حق تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا تو وہ زیورات انہی کے پاس رہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت لینے کے لئے کوہِ طور تشریف لے گئے، تو سامری نے بنی اسرائیل سے کہا: جو زیورات تمہارے پاس ہیں، غنیمت کا مال ہے، اور تمہارے لئے حلال نہیں ہیں، اسے کہیں گڑھا کھود کر دفن کرو، جب موسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے، وہ جو فرمائیں گے ویسا ہی عمل کیا جائے گا۔سدیؒ نے کہا کہ یہ مشورہ انہیں حضرت ہارون علیہ السلام نے دیا تھا۔

القصہ! انہوں نے حسبِ مشورۂ ہارون علیہ السلام یا سامری، وہ زیورات سارے کے سارے ایک جگہ دفن کر دیئے، پھر سامری نے خفیہ طور پر وہ سارے زیورات نکال لیے، اور ان کا تین دن میں ایک بچھڑا تیار کر کے اس کو زیورات سے مرصع کیا، اور وہ خاک جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کی اٹھائی تھی، اس میں ڈال دی۔ چونکہ اس میں مادۂ حیات تھا، مٹی پڑتے ہی وہ بچھڑا آواز دینے لگا، اور اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔سامری نے بنی اسرائیل سے کہا: ﴿هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِیَ﴾ [طٰہٰ:۸۸] یعنی تمہارا اور موسیٰ کا معبود تو یہ ہے، وہ بھول گئے، یعنی معبود کو بھول کر کوہِ طور چلے گئے، اور بنی اسرائیل کا دستور تھا کہ وہ ایک دن رات کو دو دن شمار کرتے تھے، جب بیس دن گزر گئے، اور موسیٰ علیہ السلام واپس نہ آئے تو سب کہنے لگے کہ چالیس دن تو گزر گئے، اور موسیٰ علیہ السلام اب تک نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتقال کر گئے۔

اُدھر سامری نے یہ فتنہ پھیلایا کہ لوگوں کو بہکانا اور گمراہ کرنا شروع کر دیا۔بعض نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا، پھر دس راتیں اور بڑھا دی گئیں، جیسے کہ سورۂ اعراف میں ہے، اس لئے

سارے لوگ فتنہ میں پڑ گئے، کھلم کھلا شرک کرنے لگے، اور بچھڑے کے اردگرد ناچنے لگے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے ہر چند انہیں روکا، منع کیا، مگر کسی نے ان کی بات نہ مانی، سوائے چند مخصوص لوگوں کے، یعنی بارہ ہزار لوگ، کہ وہ ہارون علیہ السلام کے ہمراہ راہِ حق پر رہے، باقی سب گمراہ ہوگئے۔ پوری تفصیل آئندہ سورۃ أعراف اور سورۃ طٰہٰ میں آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ پھر تم لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا، اور تم لوگ ظلم وشرک کررہے تھے۔ [مظهري]

لطیفہ:

اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ بنی اسرائیل میں ایک ہی وقت میں دو موسیٰ ہوئے (سامری کا اصلی نام بھی موسیٰ ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون نے پالا، ان کی فطرت میں نبوّت اور سعادت موجزن رہی، جبکہ سامری کی پرورش حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کی۔ یہ خبیث ولد الزنا تھا، ماں نے اِسے جھاڑیوں میں پھینک کر چھوڑ دیا تھا، فرشتہ نے اس کے منہ میں انگلیاں ڈال کر اس کی پرورش کی، جب اس کی فطرت ناپاک وخبیث رہی، تو فرشتہ کی پرورش کا فائدہ نہیں ہوا۔

حدیث شریف میں ہے: "الشقي من شقي في بطن أمه والسعيد من سعد في بطن أمه"

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل ☆ کہ خضر از آب حیوان تشنہ لب آرد سکندر را

اذا المرء لم يخلق سعيدا من الأزل ★ فقد خاب من ربى وخاب المؤمل

فموسىٰ الذي رباه جبريل كافر ★ وموسىٰ الذي رباه فرعون مُرسَل

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ پھر اس کے بعد بھی ہم نے تم سے درگزر کی، تا کہ تم احسان مانو (شکر کرو) مطلب یہ ہے کہ باوجود احسان فراموشی اور شرکِ جلی کے ہم نے تم سے درگزر فرمائی، (کیا تمہارا یہ شرک اور گوسالہ پرستی فرعون کے عمل وگناہوں سے کم تھا، جن کی پاداش میں وہ غرق ہوا؟) پس ہمارا کرم مانو کہ تم کو غرق نہیں کیا، اور تمہیں معافی دے دی گئی، تا کہ تم آئندہ شکر گزار بنو "گزشتہ را صلوات، آئندہ را احتیاط"۔

مفسرین نے کہا ہے کہ شکر سے مراد طاعت ہے، اور شکر قلب، زبان اور جوارح تینوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت کو منعمِ حقیقی کی رضا میں صرف کیا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ درحقیقت شکر کی ادائیگی سے اظہار عجز کرنا بھی شکر ہے۔ اگر بندہ حضور قلب واخلاص کے ساتھ یہ اعتقاد رکھے کہ

مجھ پر اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ظاہری وباطنی اتنی عظیم وبے شمار نعمتیں ہیں کہ پوری زندگی کا لحہ لحہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزاروں، اور سربسجود رہوں، پھر بھی میں اس کی نعمتوں کے شکر سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا ہوں، تو یہ اظہارِ عجز اور تسلیم بھی شکر ہے، اور یہ خواص کا دستور وشیوہ بھی رہا ہے، جیسے کہ سید الشاکرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: **اللّٰھمّ لاأحصي ثناء علیک أنت کماأثنیت علی نفسک۔** [احیاء العلوم]

چالیس کے عدد کی مختصر خصوصیات:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص میری مسجد (مسجد نبوی) میں چالیس نمازیں ادا کرے اس کے گناہ معاف ہوں گے، اور روزِ قیامت میری شفاعت کا حقدار ہوگا۔ (۲) اسی طرح فرمایا: جو شخص چالیس روز تک اخلاص کے ساتھ عمل کرے، اللہ تعالیٰ علم وحکمت کے چشمے اس کے قلب وزبان پر جاری فرمائیں گے۔ (۳) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں فرشتوں نے بحکمِ الٰہی اس کے خمیر کو چالیس دن رکھا۔ (۴) انسان کے پیدائشی مراحل میں ہر چالیس روز پر انقلاب وتبدیلی کا فیصلہ ہوتا ہے، (نطفہ، علقہ، مضغہ وغیرہ)۔ (۵) صوفیاء کرام اور تبلیغی جماعت والے چلّہ لگانے کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ اس مدّت کو زندگی میں تبدیلی آنے میں بڑا دخل ہے۔ (۶) ایک لقمہ حرام کھانے سے چالیس دن تک نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ (۷) بنی اسرائیل پر چونکہ تورات ملنے کے بعد چالیس دنوں کا روزہ فرض ہونا تھا، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو چالیس راتوں کا حکم ملا۔ واللہ اعلم

بہر حال! عقل ونقل اور تجربہ ومشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کے عدد کو زندگی کے حالات کی تبدیلی میں بڑا دخل ہے، اور یہ عدد انقلاب پر دال ہے۔

.......❁.......❁.......❁.......

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عنایت فرمائی اور قانونِ فیصل تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۵۳﴾ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم نے بچھڑے کی پرستش سے اپنے

اوپر بڑا ہی ظلم کیا، سواب اپنے خالق کی جناب میں توبہ کرو، اور ہلاک کرو اپنی جانوں کو، یہی قتل بہتر ہے تمہارے حق میں تمہارے خالق کے نزدیک، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی، بیشک وہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۞

معارف ومنازل

''الکتاب'' سے مراد توریت، اور ''الفرقان'' سے مراد بھی بعض مفسرین کے قول پر توریت ہی ہے۔ توریت ہی کو اللہ تعالیٰ نے دو ناموں سے یاد فرمایا، اور یہی دونوں نام قرآن حکیم کے بھی ہیں۔ امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ''الفرقان'' ''الکتاب'' کی صفت ہے، اور واو زائد ہے، یا عطف تفسیری ہے۔ بعض کے نزدیک الفرقان سے مراد احکامِ شرعیہ، یا معجزات وآیاتِ بینات ہیں۔ الفرقان کے معنی ہیں: ''حق وباطل میں فرق کرنے والی''، پس اس عمومی معنی کے لحاظ سے اس کا اطلاق ہر آسمانی کتاب پر ہوتا ہے، اور معجزات بھی اس میں شامل رہیں گے۔

قرآن کریم نے یومِ بدر کو بھی یوم الفرقان کہا، ارشاد ہوا: ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ [الأنفال: ۴۱] (اگر تم خدا پر اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق وباطل میں فرق کرنے کے دن (یعنی جنگ بدر میں) جس دن دونوں فوجوں میں مڈھ بھیڑ ہوگئی)۔ عمومی معنی کے لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام کے شرائع وصُحف سب الفرقان ہی ہوں گے۔

قانونِ مجازات اور توبہ:

اللہ تعالیٰ شانہ نے انسان کو شترِ بے مہار (خودسر وخودراہ) پیدا نہیں فرمایا، بلکہ اسے اپنے احکام وشرائع کا مکلّف بنا کر اس کی تخلیق فرمائی، پھر اس کی ہدایت ورہنمائی کے لئے انبیاء ورسل علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اسے تمام مخلوقات پر فضیلت وبرتری عطا فرمائی، اور اسے اُحسن تقویم، نہایت خوبصورت شکل وصورت کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کی خوبصورتی اور رعنائی ونزاکتوں کو اس کے چہرے میں ودیعت فرمایا۔ اس کے حسین وجمیل چہرے کو اپنے حضور جھکنے اور سجدے کا حکم صادر فرمایا، اور اسے انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ جس طرح میرے ساتھ کسی شریک کا تصور جرم ہے، اسی طرح اس معزز چہرے کو غیر اللہ کے حضور میں خم کرنا، اور جھکانا بھی عظیم جرم ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے قانون شکنی اور اپنے احکام کی خلاف ورزی کو بھی جرم قرار دیا، اور اپنے احکام کی بجا آوری کو بندگی بتا کر اس پر بڑے بڑے انعامات کا وعدہ فرمایا۔ اسی طرح شرک اور دیگر معاصی پر بڑے

بڑے عقاب وعذاب کی وعیدیں سنائیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی جتنی بڑی ہوگی، اس کی جزا بھی اسی کے مطابق ہوگی، اور گناہ جتنا بڑا ہوگا، اس کی سزا بھی اتنی بڑی بھاری ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی عمریں بڑی لمبی ہوتی تھیں، اوران کی بدنی ساخت، قدوقامت، دل اوراعضاء کی قوت بھی مثالی ہوتی تھی، اسی بناء پران پرشرعی احکام سخت سے سخت مقرر ہوئے، اور معاصی کی سزا بھی نرالی، مثالی اور بہت سخت ہوئی ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ جیسا حکم ان کے توبہ کے لئے نازل ہوا۔ نمازیں ان کی چار تھیں، عشاء کی نماز نہیں تھی۔ روزہ چالیس دن کا تھا، زکوٰۃ دسواں یا چوتھائی مال، حولانِ حول اور نصاب کی شرط نہیں تھی، مسجد کے بغیر وہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ تیمم کی سہولت نہیں تھی، کپڑوں پر نجاست لگ جاتی تو اسے قینچی سے کاٹنا ضروری تھا۔ پانی سے دھونا کافی نہیں ہوتا، تطہیر بالماء کی سہولت نہیں تھی۔ ایک وضوء سے متعدد نمازیں نہیں پڑھ سکتے تھے، اور ارتکابِ شرک کے بعد توبہ کا واحد ذریعہ قتلِ نفس ہوتا تھا۔ جہاد میں حاصل شدہ مالِ غنیمت کو کھانا جائز نہیں تھا، قتلِ عمد میں صرف قصاص ہی تھا، دیت قبول نہیں ہوتی تھی۔ قتلِ خطاء وغیرہ میں دیت تو ہوتی، مگر مقتول کے ورثاء کی رضامندی سے۔

یہ اور دیگر بہت سارے سخت سے سخت احکام ان پر لاگو ہوتے تھے۔ جبکہ یہ آخری امت مرحومہ عمر کے لحاظ سے بھی کمزور، بدنی ساخت کے لحاظ سے ضعیف، قوت ندارد...... ضعف ہی ضعف ہے، اور دیگر بے شمار کمزوریوں کی وجہ سے احکامِ شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے نہایت سہل اور آسان مقرر فرمائے۔

قتلِ نفس کے صرف تین مقام مقرر ہوئے ہیں:

(۱) قتلِ عمد میں قصاص۔ (۲) ردّت وارتداد کی صورت۔ (۳) زنا بعد احصان۔

جبکہ شرک وعبادت غیر اللہ اور بت پرستی، جیسے مہلک گناہوں کا کفارہ صرف انابت اور توبہ، ہے اس کے ساتھ دیگر تمام احکام، طاعات، عبادات، معاملات، وغیرہ میں سہولت وآسانی اور عفو ودرگزر مثالی ہے۔ اس مسئلہ کی پوری وضاحت سورۂ بقرہ کی آیت: ''يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ'' کے تحت آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور سے واپس تشریف لائے، تو سخت غیظ وغضب کے عالم میں ہارون علیہ السلام کا گریبان پکڑ کر انہیں ملامت کرنا شروع کیا، اور توریت کے صحیفوں ''تختوں'' کو پھینک (رکھ) کر بنی اسرائیل کی

سرکشی اور گوسالہ پرستی پر انہیں مورِدِ الزام ٹھہرا کر ربّ العزّت سبحانہ کے حضور التجا وتضرّع میں رونا شروع کر دیا، اس غصہ کا یہ فائدہ فوراً اظاہر ہوا کہ لوگ اپنی اس غلط حرکت پر شرمسار ہوئے، اور ندامت سے سر جھکا کر سارا کرتا دھرتا، اور تمام جرم والزامات منحوس سامری پر ڈال کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ پوری تفصیل سورۃ طٰہٰ میں ہے۔

پھر حق سبحانہ وتعالیٰ کی جناب میں قوم کے لئے توبہ اور درگزر کے التجاء وسوال میں لگ گئے، حتی کہ منظوری حاصل کر لی، تو ربّ العزّت الرحیم عزّ شانہ کی طرف سے جواب ملا کہ جن لوگوں نے یہ تعدّی وشرک کیا، ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ سنن نسائی میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا: تمہاری توبہ کی صرف ایک صورت مقرر کی گئی ہے، وہ یہ کہ مجرموں کو اپنی جان کو اس طرح ختم کرانا چاہئے کہ جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہے، وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ یعنی باپ بیٹے کو، اور بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کو۔ آخر بنی اسرائیل کو اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، اور انہوں نے نہایت شرمندگی کے عالم میں اس حکم کو بخوشی استقامت کے ساتھ منظور کر لیا۔ عملاً اس کے نفاذ کے لئے گھٹنے ٹھیک کر بیٹھ گئے، اور اس کے ساتھ ربّ العزّت سبحانہ نے ایک ہلکا بادل، گرد وغبار کا نظام قائم فرمایا کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر شناخت نہ کر پائیں، اور اپنے عزیزوں کے قتل سے رک کر بزدلی کا مظاہرہ نہ کریں۔

یہ سلسلہ صبح سے لے کر عصر تک جاری رہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ تقریباً ستر ہزار لوگ مارے گئے۔ [قرطبی] جب نوبت یہاں تک پہنچی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام درگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے، اور عرض کیا: بارِالٰہ! اب ان پر رحم فرما، اور ان کی خطاؤں کو اپنے لطف وکرم سے بخش دے! مزید قتل ہونے سے انہیں بچائیں۔ آپ کی دعا قبول ہوئی، اور التواب الرحیم عزّ شانہ نے فرمایا: ہم نے قاتل ومقتول دونوں کو بخش دیا، معاف فرمایا، اور جو قصوروار اب تک قتل نہ ہوئے، ان کی بھی معافی اور مغفرت ہوئی۔ آپ ان کو یہ حکم پہنچا دو کہ آئندہ کسی شرک کا ارتکاب نہ کریں، اور کسی شرک کے قریب بھی نہ جائیں۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝٥٥ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٥٦

ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) ہم ہرگز تیرا یقین نہیں کریں گے (ہرگز تجھ

پر ایمان نہیں لائیں گے) یہاں تک کہ دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا۔ پھر پکڑ لیا تمہیں زوردار کڑک نے، اور تم دیکھ رہے تھے ۵۵ پھر ہم نے تمہیں زندہ کھڑا کیا تمہارے مرنے کے بعد، شاید تم احسان مانو، شکر کرو ۵۶

معارف ومنازل

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی اور سزایابی کے بعد پیش آیا، لیکن سورۃ نساء کی آیت ﴿فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ [النساء: ۱۵۳] (انہوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کھلی آنکھوں دکھاؤ، چنانچہ ان کو بجلی کے کڑکے نے آپکڑا تھا، ان کی سرکشی کی وجہ سے، پھر انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا، ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آنے کے بعد)۔ آیت یہ واضح کرتی ہے کہ گوسالہ پرستی اس کے بعد ہوئی۔ واللہ اعلم

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تمہاری باتیں اس وقت تسلیم کرسکتے ہیں، جب ہم خدا تعالیٰ سے خود سن لیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہو، اور توریت اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ محض تمہارے کہنے پر ہمیں یقین نہیں آتا۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اپنے اشراف میں سے ستر آدمی منتخب کرکے میرے ساتھ طور پر روانہ کرو۔ فرمایا: ﴿وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا﴾ [الأعراف: ۱۵۵] (موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر ۷۰ مرد ہمارے وعدہ کے لیے چنے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان میں سے ستر آدمیوں کو جو سردار تھے، طور پر لے گئے (منتخب کرکے اپنے ساتھ کوہِ طور پر لے گئے)۔

آخر انہوں نے حق تعالیٰ کا کلام سن لیا، تو کہنے لگے: جب تک ہم حق تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے بے حجاب دیکھ نہ لیں، ہم کو یقین نہیں آسکتا۔ اس گستاخی پر نیچے سے سخت بھونچال آیا، اور اوپر سے بجلی کی کڑک ہوئی، آخر کانپ کر سب مر گئے، اور مردوں کی سی حالت میں پہنچ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ سے سخت پریشان ہوئے، اور عاجزی کے ساتھ اس طرح دعا کی:

”اے بارِ الٰہ! اگر تو ان کو ہلاک ہی کرنا تھا تو ان سب کو، بلکہ ان سب کے ساتھ مجھ کو بھی کہ میں ہی ان کو لے کر آیا ہوں بلانے اور کلام سنانے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا، کس کی مجال تھی کہ آپ کی مشیت کو روک سکتا؟ جب آپ نے ایسا نہیں چاہا، بلکہ مجھے لانے کی، اور ان کو کلام الٰہی سننے کے لئے یہاں آنے کی اجازت دی، تو یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ آپ یہاں بلا کر محض بعض بیوقوفوں کی حماقت کی سزا میں ہم سب کو ہلاک کر دینا چاہتے ہیں؟

یقیناً یہ (رجفہ وصاعقہ کا) سب آپ کی ظرف سے ہماری آزمائش وامتحان ہے، اور ایسے سخت امتحانات میں ثابت قدم رکھنا یا نہ رکھنا بھی آپ ہی کے قبضہ میں ہے۔ اس قسم کے خطرناک اور مزلّۃ الاقدام مواقع میں آپ ہی ہمارے تھامنے اور دستگیری کرنے والے ہیں، اور صرف آپ ہی کی ذات منبع الخیرات سے یہ امید ہوسکتی ہے کہ ہم سب کی گذشتہ تقصیرات اور بے اعتدالیوں سے درگزر فرمائیں، اور آئندہ اپنی رحمت سے ایسی خطاؤں اور غلطیوں کا شکار نہ ہونے دیں"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعاء پر وہ لوگ بخشے گئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو از سرِ نو زندگی مرحمت فرمائی، کماقال: ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [عثمانی، سورۃ أعراف آیت:۵۵]

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

ترجمہ: اور سایہ فگن کیا ہم نے تم پر بادل کو، اور اتارا تم پر منّ وسلویٰ۔ کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں، اور انہوں نے ہمارا کچھ بھی نقصان نہیں کیا، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے ﴿۵۷﴾

معارف ومنازل

یہاں سے ساتویں اور آٹھویں انعام کا ذکر ہورہا ہے، غمام "غَمّ" سے مشتق ہے، بمعنی اَبر کے، بادل کو "غمام" اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سورج کو چھپا لیتا ہے۔

بنی اسرائیل مسلسل چار سو سال تک فرعون کے غلام رہے۔ بڑے ست اور پست ہمت رہے۔ غلامی نے انہیں بزدل بنایا، جب انہیں جہاد کا حکم موصول ہوا، تو موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: ﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ﴾ [المائدۃ:۲۴] (آپ جائیں، اور آپ کا ربّ، تم دونوں لڑو)۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلّت ومسکنت اور بزدلی مسلط کی۔ میدانِ تیہ میں چالیس سال ذلّت کی زندگی گزاری۔ دھوپ میں بے آب وگیاہ صحراء میں بھٹکتے رہتے تھے، "نہ راہِ رفتن، نہ جائے ماندن"۔ موسیٰ علیہ السلام سے سایہ، روٹی، سالن اور پانی وغیرہ مانگتے رہتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بامرِ مجبوری دعا کرتے رہتے تھے، اور تیار خور غلاموں کے لئے اللہ تعالیٰ سے سب کچھ مانگتے رہتے تھے۔ ربّ العزّت ان کے لئے ہر ضرورت کی چیز مہیا فرماتے رہتے۔

یہ میدان، لق ودق صحراء، جہاں نہ درخت، نہ سایہ اور نہ غذائی اشیاء، ہر چیز مفقود تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مناجات پر حق تعالیٰ مسلسل سفید پتلا اَبر سایہ کے لئے بھیج دیا کرتے۔ دن کو اَبر کے سایہ میں آرام سے رہتے، پھر رات کو روشنی کے مطالبے شروع ہوئے۔ ایک سفید براق نہایت روشن ستون کا انتظام ہوتا، جس کی روشنی پندرہ بیس میل تک صبح تک قائم رہتی، اور چودہویں رات کے چاند کی طرح پورے علاقے کو روشن رکھتی۔ بعض مفسرین نے کہا کہ یہ نورانی ستون قوسِ قزح کی طرح نورانی بھی تھا، اور رنگین بھی۔ واللہ اعلم

سبحان اللہ! یہ سارے معجزات اور آیات بینات، پانی کا اچھا خاصا انتظام ہونے لگا۔ یہ آئندہ ذکر ہوگا۔ کھانے کے لئے لذیذ وشیرین اور سریع الہضم، اعلیٰ خوراک ''منّ وسلوٰی'' کا انتظام تسلسل کے ساتھ جاری ہوا، نہ آگ کی ضرورت، نہ دھواں، نہ ہانڈی وغیرہ۔ یہ اعلیٰ درجہ کی غذا مسلسل جاری رہتی، بلا کسی تعب ونصب، اور بلا کسی نقصان کے۔

''المنّ'' اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ منّ سے مراد ترنجبین ہے۔ اور بعض نے کہا کہ پتلی چپاتی مراد ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ منّ گوند کی مثل ایک شئے ہے (ایک لذیذ شے ہے) یہ گوند درختوں اور ٹیلوں پر آکر گرجاتی، اور جم جاتی، اس کا مزہ شہد جیسا ہوتا تھا۔

روایت ہے کہ اوّل اللہ تعالیٰ نے صرف منّ نازل فرمایا، جب اُسے کھاتے کھاتے انہیں بہت دن گزر گئے، تو سب نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ حضرت! اس مَنّ کی شیرینی اور مٹھاس نے ہمیں تباہ کیا! کب تک اسے کھائیں گے؟ آپ جناب باری تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہمیں گوشت کھلائے، اس پر ''سلوٰی'' کا اضافہ ہوا۔

''السلوٰی'' اکثر مفسرین کے نزدیک ایک پرندہ ہے، جو بٹیر کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک خود بٹیر ہی ہے۔ اور اس کے نزول کی کیفیت یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ ایک بادل بھیجتا، اس میں سے طلوع آفتاب تک نیزہ برابر طول اور میل بھر عرض میں برابر سلوٰی برستا۔ ہر شخص اس میں سے ایک دن رات کی خوراک اٹھالیتا، اور جمعہ کے دن دو یوم کی خوراک لے لیتا، کیونکہ ہفتہ کے دن کچھ نہ برستا تھا۔ [مظہری]

﴿ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ (کھاؤ! پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو مفت مہیا کیں)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ ہر روز جس قدر کھاسکو لے لیا کرو، اور کھاتے رہو، مگر دوسرے دن کے لئے ذخیرہ کرکے مت رکھو! انہوں نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی، اور خوب جمع کرکے ذخیرہ اندوزی شروع کی۔ آخر کار یہ نعمت بند ہوگئی،

اور جو کچھ جمع کر کے رکھ لیتے، وہ گل سڑ کر خراب ہو جاتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے: اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے، تو لم یخنز اللحم۔ گوشت کبھی سڑ کر خراب نہ ہو جاتا، ولو لا حواء لم تخن انثی علی زوجھا۔ اگر حضرت حواء علیہا السلام نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے خاوند سے بیوفائی نہ کرتی۔ [بخاري، مسلم، أحمد]

جب بنی اسرائیل نے اپنی فطری سرکشی کی بنیاد پر اس نعمتِ غذاء میں ذخیرہ اندوزی والی خیانت شروع کی، تو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کی آمد روک لی۔ دوسری طرف مسلسل ناز ونخرے اور ناشکری کر کے کہتے رہے: ﴿لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ [البقرة: ٦١] (ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے)۔ قرآن کریم نے واضح کیا: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ [ابراهيم: ٧] (اگر تم نے شکر کیا تو ہم مزید دیں گے، اور اگر تم نے کاشکری کی، تو میرا عذاب بہت سخت ہے)۔ انہوں نے ناشکری کر کے اپنا نقصان کیا، کہ تیار تیار غذاء سے محروم رہے، تو فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا﴾ ان لوگوں نے ہمارا تو کچھ نہ بگاڑا، یعنی ناشکری کر کے اپنا نقصان کیا۔ ہمارا تو کچھ بھی نہ بگاڑا۔ ﴿وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ کے یہی معنی ومطلب ہیں کہ: ''بدکنی برخودکنی''۔

اس آیت کریمہ نے ایک کلّی قاعدہ کی بنیاد بیان کر دی کہ انسان کو اچھا اور برا جو بھی نفع ونقصان پیش آئے، اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ دوسرا یہ کہ نعمت کی ناقدری سلبِ نعمت کا سبب ہے، اور شکرانِ نعمت سببِ دوام واضافۂ نعمت ہے۔ آنے والی آیت میں اسی کا بیان ہے۔

❁ ❁ ❁

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾ ع

ترجمہ: اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے کہا: داخل ہو جاؤ اس بستی میں، اور کھاؤ اس میں سے جہاں بھی چاہو کشادگی سے، اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے، اور کہو بخشش (معافی) ہم بخش دیں گے تمہاری خطاؤں کو، اور زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو ﴿٥٨﴾ پس تبدیل کر لیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات کو، اس

بات کے علاوہ جو ان سے کہی گئی تھی، سو ہم نے نازل کر دیا ان لوگوں پر آسمان سے عذاب جنہوں نے ظلم کیا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بار بار قوم نے مختلف کھانے کی چیزوں کا جب مطالبہ کیا، نیز وہ میدانِ تیہ کے لق ودق صحراء میں ایک عرصہ گزار کر خانہ بدوشی سے تنگ آ گئے، کیونکہ وہ شہری متمدن زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ نیز یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جہاد کی تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ تمہیں شام وفلسطین کا وہ آباد، متمدن اور زرخیز علاقہ واپس دلا دیں گے، جو تمہارے آباء واجداد کا مسکن رہا ہے، اور اس بستی میں نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے پروردگار کے حضور سجدہ کرتے ہوئے عاجزانہ اور فاتحانہ انداز میں داخل ہو! یہ تمہارا عملی شکر ہوگا، اور ساتھ ساتھ زبانی شکر کرتے ہوئے معذرت ومعافی مانگتے ہوئے "حطّة" کہو۔ (اے ہمارے پروردگار! ہم معافی مانگتے ہیں) کہتے جاؤ! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نصرت سے نوازیں گے، اور فتح وکامرانی سے ہمکنار فرمائیں گے۔ جب مفتوحہ علاقہ پر تمہارا قبضہ ہوگا، اور سارے علاقہ پر تمہارا اقتدار مکمل پختہ ہو جائے گا، تو ہر قسم کی نعمتیں تمہارے قبضے میں آ جائیں گی۔ پس تم کشادگی وفراخی کے ساتھ کھاؤ، پیو اور ربّ العزّت کا شکر بجالاتے رہو۔

مگر بنی اسرائیل کے لوگوں نے صاف انکار کیا، اور جہاد سے منکر ہوئے، کہنے لگے: ﴿اِنَّ فِيۡهَا قَوۡمًا جَبَّارِيۡنَ﴾ [المائدة: ۲۲] (وہاں پر عمالقہ (بقیہ قوم عاد) بڑے سخت طاقتور لوگ ہیں)۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ! اگر وہ خود بخود اس بستی سے نکل جائیں، تو ہم وہاں جانے کو تیار ہیں۔ (پوری تفصیل سورۃ المائدہ میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ) یہاں سورۃ البقرہ میں مختصر کچھ باتیں مذکور ہیں۔

پس ان کی نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل چالیس یا ستر سال تک میدانِ تیہ میں بے سروسامانی کے عالم میں سرگرداں پھرتے رہے، یہاں تک کہ اسی عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے۔ اس کے بعد جب پرانے بوڑھے لوگ ختم ہو کر مر گئے، اور نوجوان نسل نے اُن کی جگہ قیادت سنبھالی، تو حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں نوجوان نسل جہاد کر کے شام وفلسطین پر قابض ہو گئے۔

البتہ! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ کونسی بستی تھی جس میں بنی اسرائیل کو داخلے کا حکم ہوا تھا؟ اس کے متعلق مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ بستی "بیت المقدس" ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو راجح

کہا ہے۔مگر راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''اریحا'' کی بستی ہے۔بعض نے کہا کہ وہ ''ایلیا'' نامی بستی ہے۔اور بعض نے مطلق فلسطین اور شام کا علاقہ کہا،مگر راجح اریحا نامی بستی ہے۔واللہ اعلم

فائدہ:

عجز وانکساری اور تواضع وفروتنی وہ عظیم عمل ہے جس پر تمام آسمانی شریعتوں کی عمارت کھڑی ہے۔یہ پسندیدہ عمل ہر زمانہ میں عبادُ الرحمٰن کا مخصوص کردار رہا ہے،اور ربّ العزّت سبحانہ نے اپنی رضا،اور ہر قسم کی فوز وفلاح کو اسی کردار اور عمل کے ساتھ وابستہ رکھا ہے۔انبیاء کرام علیہم السلام،صالحین،بندگانِ خدا ہمیشہ اسی شرعی اور پسندیدہ عمل کے زیور سے آراستہ رہے ہیں،مگر بدنصیب اسرائیلی جس طرح شکر وصبر کی نعمتوں سے بے بہرہ رہے،اسی طرح اطاعت گزاری اور عجز وانکساری سے بھی محروم رہے،اسی کے نتیجے میں وہ ہر طرح کی شفقت ورحمت اور رحمدلی سے بھی محروم رہے۔

البتہ! یہ بات بھی مسلم ہے کہ وہ سارے کے سارے ایسے نہیں تھے۔قرآنِ حکیم نے فرمایا:﴿لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾[آل عمران:۱۱۳] (سب ایک جیسے نہیں ہیں،کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں،اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں،اور سجدہ کرتے ہیں)۔گوسالہ پرستی سے بھی کچھ لوگوں نے اجتناب کیا تھا،حکمِ جہاد پر بھی ان میں سے کچھ لوگوں نے آمادگی کا اظہار کیا تھا،﴿اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ میں بھی کچھ لوگوں نے حصہ نہیں لیا تھا۔''حطّة'' کو تبدیل کرکے ''حنطة یا حبة'' کہنے والے لوگ بھی مخصوص لوگ تھے۔ہوسکتا ہے کہ اس جرم کی پاداش میں جب طاعون کا عذاب آیا،توصرف ان نافرمانوں پر آیا ہو۔اس طاعون کے عذاب میں بقولِ مفسرین ان کے ستر (۷۰) ہزار آدمی مارے گئے تھے۔واللہ اعلم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برتری،اور بے مثال جرأت:

اس مقدس گروہ نے منہ پر جواب دینا اور جہاد سے پہلوتہی کرنا،اپنے پیشوا کے حکموں،اشاروں کو نظر انداز کرنا،یا اس کی محفل میں بے ادبی کرکے چارزانو بیٹھ کر آداب کا لحاظ نہ رکھنا،یا بے سوچے سمجھے کوئی بات کرنا تو درکنار، سبحان اللہ وبحمدہ۔انہوں نے نظر جما کر اپنی آنکھوں سے پیشوائے دین ودنیا کی پیشانی اور چہرہ اقدس کو دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کی۔ہر محفل میں نظر پست کرکے آنکھوں کے گوشوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرۂ انور کو دیکھنے کی کوشش کی،اور تسکین حاصل کی۔رضوان اللہ علیہم أجمعین

"حطة" کی بجائے حنطة یا حبة في شعرة"۔ الفاظ کی تبدیلی چونکہ معنوی تبدیلی تھی، اور صریح گستاخی تھی، اس لئے ان پر عذابِ الٰہی (طاعون) کا نزول ہوا۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ طاعون ایک عذاب ہے: "اُرْسِلَتْ عَلٰی طَائِفَةٍ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ"۔ یہ طائفہ وہ ہے، جسے ﴿ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ کے الفاظ کے ساتھ قرآن حکیم نے ذکر فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جہاں کلمہ رِجْز مذکور ہو، اس سے مراد عذاب ہے۔ [ابن جرير، مظهري]

تبدیلی الفاظ یا معانی کا شرعی حکم:

"حطة" کی بجائے "حنطة یا حبة" کہنا صرف الفاظ کی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ اس کے ساتھ معانی اور مطالب میں بھی تبدیلی اور بگاڑ پیدا ہوا۔ الفاظ کی ایسی تبدیلی جس سے معنی بھی الٹ کر مقصد کے خلاف ہو شرعاً جائز نہیں ہے۔ ایسی تبدیلی قرآن کریم میں ہو، یا احادیث میں ہو، یا دعائیہ کلمات اور اذکار میں ہو، یا اذان واقامت اور دیگر کسی امرِ الٰہی میں ہو، قطعاً بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا استہزاء اور تحریف ہے، اسی لئے اس پر عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق یہ تفصیل ذکر کی ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی طرح الفاظ بھی مقصود اور اداءِ عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں ہے، جیسے اذان کے کلماتِ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً: سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ، دعاءِ قنوت، التحیات، رکوع وسجدہ کی تسبیحات یا سَمِعَ اللہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ قومہ کے اندر، یہ تمام اذکار وتسبیحات دعائیں جن الفاظ وکلمات کے ساتھ منقول ہیں انہی الفاظ میں انہیں ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی ملحوظ رہے، مگر تبدیلی کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن کریم (جو کہ اسم للنظم والمعنی جمیعا ہے) کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوتِ قرآن مجید سے جو احکام متعلق ہیں، وہ صرف انہی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم میں نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان قرآنی الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں (عربی اردو، فارسی) میں کر کے پڑھے، اور تلاوت کرے، جن میں معانی بالکل محفوظ رہیں، اس کو اصطلاحِ شریعت میں تلاوت نہیں کہا جائے گا، اور اس پر کوئی ادنیٰ ثواب بھی مرتب نہ ہوگا، چہ

جائیکہ ایک حرف پر دس نیکیاں، بلکہ یہ الٹا جرم اور گناہ ہوگا۔ کیونکہ قرآن حکیم صرف معنی کا نام نہیں ہے، بلکہ معنی اور نازل شدہ الفاظ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

آیت مذکورہ میں ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾[الآیۃ] کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو توبہ کے لئے جو الفاظ ''حِطَّة'' کے بتلائے گئے تھے، یہ الفاظ بھی مامور بہ تھے، ان کی تبدیلی خود بھی گناہ ہے، پھر انہوں نے ایسی تبدیلی کی کہ معنی ہی الٹ گئے، اور یہ تبدیلی سہواً نہیں ہوئی، بلکہ استہزاءً جان بوجھ کر بطور مذاق ہوئی، جو کہ کفر اور شرک ہے، تب ہی تو عذاب میں مبتلا ہوئے۔

لیکن یہ بات بھی واضح ہو کہ جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ نہیں ہیں، بلکہ الفاظ معانی کی تعبیر اور اظہار ہی کے لئے ہوں، خود وہ الفاظ مقصود نہ ہوں، اگر ان میں لفظی تبدیلی اس درجہ کی ہو، جس سے معانی متاثر نہ ہوں، اور پوری طرح محفوظ رہیں، تو جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ جائز ہے۔ بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک، امام اعظم، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم سے نقل کیا ہے کہ احادیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ روایت بالمعنی کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقعِ خطاب، اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے، اس سے پوری طرح واقف ہو، تا کہ اس غلطی سے معنی میں فرق وتبدیلی نہ آنے پائے۔ اور ائمۂ حدیث کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ جس طرح الفاظ حدیث سُنے ہیں، اسی طرح نقل کرنا ضروری ہے۔ یہ حضرات کوئی لفظی تغیر وتبدل بھی جائز نہیں سمجھتے۔

محمد بن سیرین اور قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہم جو کہ فقہاء سبعہ میں سے ہیں، وغیرہ حضراتُ کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا تعامل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لفظی غلطی بھی کی ہے، تو اس سے سننے والے کو اسی غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے۔ اپنی طرف سے تغیر نہ کرے۔ اس کے ساتھ یہ ظاہر کر دے کہ میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے۔

ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے، تو یہ دعاء پڑھے: '' اٰمنتُ بکتابک الذي اَنزلتَ وبنبیک الذي اَرسلتَ''۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے نبیک کی جگہ رسولک بڑھا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت

فرمائی کہ لفظ نبیک پڑھا کرو، اس کو رسولک کے ہم معنی لفظ کے ساتھ تبدیل نہ کرو [رواہ بخاري] اس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں سرورِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے: "نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَبَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا"۔ [الحديث] یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے، جس نے میرا کوئی کلام سنا، اور پھر امت کو اسی طرح پہنچادیا، جس طرح اس نے سنا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ سنا تھا، انہی الفاظ سے پہنچانا مراد ہے (الفاظ کی پابندی کے ساتھ)۔

مگر جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اولیٰ اور بہتر تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنے ہیں، اپنے قصد وارادہ سے اس میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں رہے، تو ان کا صحیح مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور یہی طرز وطریق سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول رہا ہے، اور اسی پر انہوں نے مسلسل عمل بھی کیا ہے۔ ان شاء اللہ یہی سلامتی کا طریقہ بھی ہے۔ [قرطبي]

اور حدیث بلغها كماسمعها کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو مضمون سنا ہے، وہی بعینہٖ بلا کمی وبیشی کے نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہ آئے۔ الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں ہے۔ اور امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تائید میں فرمایا کہ خود یہی حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے، اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسولک کے بجائے نبیک ہی کے پڑھنے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ نبي میں صفت مدح بہ نسبت رسول کے زیادہ ہے، کیونکہ رسول کا لفظ تو قاصد کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبي کے کہ وہ خاص اسی منصب کے لئے استعمال ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعۂ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دعاؤں میں الفاظِ مأثورہ منقولہ کا اتباع خواص وآثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، جبکہ دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت باقی نہیں رہتی۔ [قرطبي]

اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادعیۂ مأثورہ بھی اسی قسمِ اول میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظِ مخصوصہ کی ادائیگی وحفاظت بھی مقصود ہے، اور اقرب الی الاجابۃ وقبولیت بھی یہی ہے۔ اسی پر علماء ومشائخ کا مستمر

عمل رہا ہے، اور اسی میں خیر و برکت کا راز ہے۔ تدبّر

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَؕ

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًاؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْؕ

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝۶۰

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا۔ پس ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی کے ساتھ پتھر کو مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے تحقیق جان لیا سب لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو، اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو۝۶۰

معارف ومنازل

بارہویں اور تیرہویں انعام کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ یہ واقعہ ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار اس طرح کے واقعات پیش آتے رہے، جب پانی کی ضرورت پیش آئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ اور عصا سے پانی کا معجزہ ظاہر ہوتا رہا۔ اس عصا کو قرآن کریم نے ''آیۃ الکبریٰ'' کا خطاب دے کر اس کی اہمیت وافادیت پر مہر ثبت فرمائی۔ اس عصا نے بحرِ قلزم کو خشک کر کے بارہ راستے نکالے۔ یہ عصا سانپ بن کر ہزاروں جادوگروں کے مصنوعی سانپ ہضم کر گیا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام راستے پر چل کر تھک جاتے، تو اس پر سواری کرتے۔ یہ گھوڑے کا کام دیتا، اور جب آرام فرماتے، یہ چوکیدار بن کر نگرانی کرتا، خود کہیں بیٹھ کر اس کو روانہ کرتے۔ یہ ان کے ریوڑ کو چرا کر جمع کرتا، اگر گھاس کی ضرورت ہوتی، یہ اونچے درختوں پر چڑھ کر پتے جھاڑ دیتا، اور رات کی تاریکی میں روشنی کر کے راستہ بتا دیتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر سامان رکھ کر سفر میں چلتے تو یہ بار برداری کا کام دیتا، وغیر ذلک من الخدمات۔

جب بنی اسرائیلیوں کو پانی کی ضرورت پیش آتی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بامرِ الٰہی کسی بھی پتھر پر عصا کو مارتے، تو حسبِ ضرورت بارہ چشمے صاف شفاف پھوٹ نکلتے، اور لوگ سیراب ہو جاتے۔ بنی اسرائیل میں بارہ خاندان تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے، ہر ایک کا خاندان الگ ہوتا تھا، ہر خاندان کا ناظم وسردار وغیرہ مستقل ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں راجح قول یہی ہے کہ الحجر میں الف لام عہد کا نہیں ہے، کوئی خاص پتھر مراد نہیں ہے، بلکہ الف لام جنس کا ہے، موقع پر کسی بھی پتھر پر عصا مارنے سے چشمے جاری ہوتے تھے۔ مؤرخین نے ایک پتھر کی نشاندہی بھی

کی ہے، بقول ان کے کہ آج بھی صحراءِ سینا میں موجود ہے، جس سے پانی نکلنے کے نشانات واضح ہیں۔ واللہ اعلم

سورۃ الأعراف میں فَانۢبَجَسَتْ کا کلمہ مذکور ہے، جو فَانْفَجَرَتْ کا ہم معنی لفظ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس عصا (جسے ''آیۃ کبریٰ'' کہا گیا ہے) کے ذریعے پانی کی فراہمی، اور دیگر امور کی انجام دہی ہوئی، اور یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے۔ اہل سنت والجماعت کا متفقہ قول ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء کرام سے کرامات کا صدور برحق ہے، اور معجزہ وکرامت باری تعالیٰ سبحانہ کا فعل ہے، اس کا صدور اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہوتا ہے، پیغمبر اور ولی کے اختیار کا اس میں قطعاً دخل نہیں ہے۔ جو لوگ معجزہ اور کرامت کا انکار کرتے ہیں، وہ گمراہ اور زندیق ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات دس ہزار کے قریب ہیں۔ قرآن پاک کی ہر آیت آپ کا معجزہ شمار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیان سے کئی مواقع پر پانی کے چشمے جاری ہوئے۔ یہ روایات صحیحین میں مذکور ہیں۔ (سورۃ الفاتحۃ کی تفسیر میں معجزات پر تفصیل سے کلام ہو چکا ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب لوگوں نے پانی کا مطالبہ کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بامرِ الٰہی اپنے عصا کو پتھر پر مارا، جس سے بارہ قبائل کی آبادی کے مطابق صاف شفاف پانی کے چشمے جاری ہوئے، ہر قبیلہ نے اپنے اپنے پانی کی پہچان کی، اور خوب سیراب ہوئے۔ ربّ العزّت سبحانہ نے تذکیر بآلاء اللہ کے طور پر انہیں حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی (منّ وسلویٰ) خوب کھاؤ، اور یہ معجزہ کا پانی بھی کشادگی کے ساتھ پیا کرو، اور اپنے خالق ورازق مہربان معبود کا شکر بجا لاتے رہو، اور اس کی حکمِ عدولی نافرمانی سے اجتناب کرو۔ معاصی، گناہ، ناشکری وغیرہ کے ذریعے فساد وبدامنی مت پھیلاؤ، اور حقوق اللہ وحقوق الخلق کی پامالی اور خیانت سے بچو۔

فائدہ:

استسقاء کے معنی پانی مانگنا، پانی طلب کرنا۔ انبیاء سابقین علیہم السلام سے یہ روایت جاری ہے، سورۂ نوح کے فوائد میں اس پر کلام ہو جائے گا۔ إن شاء اللہ۔ کتبِ حدیث وفقہ میں اس کے مستقل ابواب اور احکام موجود ہیں۔ استسقاء کا عمل سنتِ مستمرہ مؤکدہ ہے۔ احناف کے نزدیک صرف دعا ہی کافی ہے، نماز اگرچہ بہتر ہے، مگر ضروری نہیں. دیگر ائمہ نماز کو ضروری کہتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا
تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ
الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَکُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَ ضُرِبَتۡ
عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡکَنَةُ ٭ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ
بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ع

ترجمہ: وہ وقت بھی یاد کرو جب کہا تم نے اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک ہی قسم کے کھانے پر۔پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کر کہ وہ ہمارے لئے وہ چیزیں نکالے جن کو زمین اُگاتی ہے۔اپنی ترکاریوں سے، اور اپنی ککڑیوں سے، اور اپنی گندم سے، اور اپنی مسور سے، اور اپنی پیاز سے، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا تم بدل میں لیتے ہو اس چیز کو جو ادنیٰ ہے اس کے جو بہتر ہے؟ کسی شہر میں اتر جاؤ، بیشک تمہارے لئے وہی کچھ ہوگا جو تم نے مانگا، اور ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کی گئی، اور وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب لے کر لوٹے، اس وجہ سے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ بات اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے نافرمانی کی، اور وہ حد سے آگے نکل جاتے تھے ﴿۶۱﴾

معارف ومنازل

یہ واقعہ بھی صحراء سینا میں پیش آیا۔دراصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔یہ لوگ علم وحکمت اور اخلاقی پہلو سے بالکل محروم تھے۔ان کے سامنے نہ کوئی مستقبل تھا، نہ ماضی سے سبق وعبرت، کیونکہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے، تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے، اور نہ ان کا ذہن اپنا ہوتا ہے، بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔یہ عَبۡدًا مَّمۡلُوۡکًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ [النحل: ۷۵] (مملوک غلام، جو کسی چیز پر قادر نہ ہو) کا مصداق بن کر بے دست وپا اور بے اختیار ہوتا ہے، دوسروں کی حرکتوں پر ناچنا شروع کرتا ہے، اس کے پاس نہ اپنا ضمیر ہوتا ہے، نہ نظریہ اور نہ لائحہ عمل، نہ کوئی مستقبل کا پروگرام۔وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے، اس کا ضمیر تک بدل جاتا ہے، اس کے اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

اس کی رائے اپنی رائے نہیں رہتی، اس کو شترِ بے مہار کی طرح جدھر گھمایا جائے گھوم جاتا ہے، پس یہ غلام

اگر ہزار آزادی کا مالک ہو جائے، پھر بھی اس کے دماغ میں غلامی کا جو کیڑا پڑا ہوا ہے، وہ اسے آزادی کی نعمت سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتا، کیونکہ اس کا ضمیر مردہ اور بے حس ہے۔ بعینہٖ یہی حال ہمارے برصغیر کے مسلمانوں کا ہے، جو اب تک انگریزوں کا غلام بنے ہوئے ہیں۔ صحرائے سینا میں مفت بلا مشقت ''منّ وسلویٰ'' کھاتے کھاتے، بنی اسرائیل کے مزاج بھر چکے، اور کھانے میں تبدیلی کے مطالبے کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی کہ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، حالانکہ ''منّ وسلویٰ'' دو مختلف کھانے تھے، مگر مسلسل کھانے کی وجہ سے انہوں نے ان کو ایک ہی کھانا کہا۔

اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی مچھلی یاد آ رہی ہے، وہاں ہمیں مختلف قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں، اور یہاں ایک قسم کا کھانا مسلسل کھا کر تنگ آ چکے ہیں۔ [تفسیر حقانی]

﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ [الآیۃ] (اے موسیٰ! آپ اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کریں) ﴿يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ﴾ (کہ وہ نکالے ہمارے لئے وہ چیزیں جنہیں زمین اُگاتی ہے) ﴿مِنْ بَقْلِهَا﴾ اپنی ترکاریوں سے ﴿وَقِثَّائِهَا﴾ اور اپنی ککڑیوں سے ﴿وَفُومِهَا﴾ اپنی گندم سے ﴿وَعَدَسِهَا﴾ اور اپنی مسور سے ﴿وَبَصَلِهَا﴾ اور اپنی پیاز سے۔ اے موسیٰ! اپنے ربّ سے کہہ دیں کہ ہمیں یہ مرغوب چیزیں مہیا کرے، تاکہ ان چٹ پٹی چیزوں کے کھانے سے ہمارے منہ کا ذائقہ بدل جائے، اور ہم لطف اندوز ہوں۔

اس بے موقع فرمائش پر موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سرزنش فرما کر کہا: کیا تم گھٹیا اور ادنیٰ چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہشمند ہو؟ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بیوقوف شخص سونے جواہرات کے عوض مٹی اور پتھر کی خواہش کرے۔ مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مفت انہیں ''منّ وسلویٰ'' دے رکھا تھا، اور وہ حساب وکتاب سے بھی بری تھے، پھر یہ غذا (منّ سلویٰ) دوسری نعمتوں کے مقابلہ میں بدن کے لئے نافع بھی تھی۔ [مظهري]

جس طرح بلا مشقت ''منّ وسلویٰ'' انہیں دستیاب رہا، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طفیل نہ ان کے کپڑے پھٹتے تھے، اور نہ ہی میلے ہوتے تھے، ان کے بچوں کے بدن پر جو کپڑے تھے، وہ ان کے جسم کے مطابق بڑھتے رہتے تھے، اور ''منّ وسلویٰ'' ان کے مزاج کے بھی موافق ہوتا تھا، اسے کھا کر کبھی بیمار بھی نہیں ہوتے، اور نہ ہی بدہضمی کی شکایت پیش آتی۔ [انوار القرآن]

﴿اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا﴾ تم کسی بستی کا رخ کر کے وہاں اترو، اور وہاں کھیتی باڑی کر کے اپنی مطلوبہ، مرغوبہ، پست اور ادنیٰ اشیاء حاصل کرو، جس کے لئے میری دعاء والتجاء کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہو، عقل کی نعمت وروشنی سے محروم ہو۔ نفع ونقصان کی پہچان سے سراسر بے بہرہ ہو، گندی طبیعت کے دریا میں غرق ہو۔ بصیرت وبصارت کی دنیا سے محروم ہو۔ مکھی ہمیشہ گندگی پر بیٹھتی ہے، تم وہی مکھی ہو۔ جاؤ! ناشکری اور بے صبری کی پاداش میں ذلیل وخوار رہو۔

آخر کار حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی صبر وبرداشت کے بعد بارگاہِ ایزدی میں نہایت تضرّع وعاجزی کے ساتھ یوں گویا ہوئے: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ﴾ [المائدة: ۲۵] (اے میرے ربّ! مجھے تو بجز اپنے اور اپنے بھائی کے کسی اور پر کوئی اختیار (اعتماد) نہیں، پس آپ ہم میں اوران برگشتہ نافرمانوں میں فیصلہ فرمادیں)۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ☆ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

پس کیا ہوا؟ ذلت ومسکنت میں ڈوب گئے، مغضوب علیہ بن کرملعون ہوئے، قِرَدَة (خنازیر) بن کر مسخ ہوئے۔ ''فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ'' کی لعنت میں گرفتار ہوئے۔ پایا کچھ نہیں، کھویا سب کچھ۔ نبی زادگی کچھ بھی کام نہ آئی، ایمان گیا، شرافتِ نسب بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ☆ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

یہ ہے: ''خسر الدنیا والأخرة'' کا تازیانۂ عبرت، فصار وا مغضوبین ملعونین أبداً۔ ان کے برعکس سید کائنات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار ہمہ تن فرمانبردار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے اپنے حسن اخلاق، اطاعت و فرمانبرداری، جان نثاری، سرفروشی، جذبۂ جہاد اور ترکِ دنیا واقبال علی الآخرۃ کے زرّین اصولوں کے تحت اوراقِ تاریخ میں بے مثال نقوش ثبت کئے، اور بار بار ''رضی اللہ عنہم'' کا تمغہ حاصل کیا۔ ''اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ'' کا خطاب پاکر منعم علیہم کی فہرست میں نام لکھوائے۔ ان کے ایمانی کمالات کا اثر وکرشمہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی اکنافِ عالم میں نمایاں اور موجود ہے۔ فرضي الله عنهم أجمعين

﴿وَضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡکَنَةُ﴾۔ ان پر ذلت ورسوائی اور فقر ومحتاجی کی مہر لگ گئی۔ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ﴾ والے لوگوں میں شامل ہوگئے۔ الضرب الختم وهما واحد۔ صحت کے باوجود دل کے

مریض رہیں گے۔ مال کے باوجود فقیر رہیں گے۔ سیری کے باوجود بھوکے پیاسے رہیں گے۔ امن کے باوجود خوف زدہ رہیں گے۔ کثرت کے باوجود قلت میں رہیں گے۔ غضبِ الٰہی کی ننگی تلوار ہمیشہ ان کے سروں پر لٹکتی رہے گی۔ پورے عالم میں عبد نام بھی رہیں گے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ ارشاد ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ [الآیۃ] (یہ سب کچھ اس لئے کہ انہوں نے آیات اللہ اور آیات بینات کے ماننے سے انکار کیا)۔ حقوق اللہ کی پامالی کی، اور حقوق العباد میں اپنے سب سے بڑے محسنین، نمائندگانِ الٰہی حضرات انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا۔ ان کی حق تلفی اور بے احترامی کی، اور اللہ تعالیٰ کی زمین کو ظلم و بربریت، سرکشی، نافرمانی اور فتنہ وفساد اور دیگر ہر قسم کی بدامنیوں اور طغیانیوں سے بھر دیا۔

یہ وہ لوگ ہیں اگر انہیں مجموعۃ الشر، ابلیس کے بھائی کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے بعد مزید ان کے کفر، سرکشی، اسلام دشمنی، دینِ الٰہی کے ساتھ عداوت وغیرہ ہزاروں فتنوں کا بیان ہوگا۔ مکروفریب، عیاری ومکاری میں یہ قوم بے انتہا ماہر ہے کہ شیاطین بھی اس سے کئی درجہ پیچھے ہیں۔ بیوقوف نصاریٰ جو ان کے ازلی اور مذہبی دشمن تھے، انہیں لوریاں دے دے کر اپنے اندر ضم کر دیا۔ آج کا نصرانی یہودی فوج کے ہراول دستے کا سپاہی نظر آتا ہے۔ بیچارہ بدقسمت عیسائی کو نہ اپنے مذہب کا پتہ ہے، نہ انجیل کی سچی تعلیمات کا، مکار یہود نے اسے قومی، مذہبی، اور دینی سطح پر اپنے اندر ضم کر کے ان کی حیثیت اور مذہبی شعاروں تک کو تباہ کیا ہوا ہے۔ فاعتبروا

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ [آل عمران: ۱۱۲] (جہاں کہیں پائے جائیں ان پر ذلّت کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے، اِلّا یہ کہ اللہ کی طرف سے کوئی سبب پیدا ہو جائے، یا انسانوں کی طرف سے کوئی ذریعہ نکل آئے)۔ قیامت تک کی ذلّت ومسکنت اور غلامی کی پیشگوئی ہے۔ یہ قوم کبھی بھی فلاح نہیں پائے گی، اور اقتدار وسلطنت حاصل نہ کر سکے گی۔ ہاں! غیروں کی حمایت اور دوسروں کی ماتحتی اور سایہ میں، جیسا کہ موجودہ اسرائیلی حکومت ہے، برائے نام یہود کا اقتدار اور مملکت ہے۔ فی الواقع یہ امریکی وبرطانوی چھاؤنی ہے، اور ان کی زیرسرپرستی قائم ہے۔ آج بھی اگر امریکہ اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے۔ شاید ایک ہفتہ میں یہ دنیا کے نقشہ سے محو ہو جائے، تمام کائنات کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ایک انگشتری سے بھی کم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ترجمہ: بیشک! جو لوگ مسلمان ہوئے، اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے، اور نصرانی ہوئے، اور صابی ہوئے، جو شخص بھی ایمان لایا، اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اور اچھے کام کئے، پس ان کے لئے ان کا اجر ہے، ان کے رب کے پاس، اور ان پر کچھ خوف نہیں ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۶۲﴾

معارف ومنازل

یہود قوم کی شرارت اور ہزاروں نافرمانیوں کے ذکر کے بعد خیال ہوسکتا تھا کہ اب شاید ان میں سے کسی کی معذرت اور ایمان قبول نہ ہوسکے، اس وہم کو دور فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾[الآیة] ایک عمومی قاعدہ کلیہ ارشاد فرما کر واضح کیا کہ ہمارا دروازہ کسی مجرم پر بند نہیں ہے، ہر آنے والے کے لئے کھلا ہے، چونکہ یہودی خود کو بہت بڑی ہستیوں کی اولاد سمجھتے ہیں، اور ﴿نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّاءُهُ﴾[المائدة:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں) کا رٹا لگا کر کہتے رہتے ہیں: ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾[البقرة:۱۱۱] (ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو)۔ ہزاروں نافرمانیوں کے باوجود اپنے جنتی اور محبوبِ الٰہی ہونے کے دعویدار ہیں۔ دوسرے تمام لوگوں کو گھٹیا اور محروم سمجھتے ہیں۔ ان کی اس مزعومہ خام خیالی پر ضرب لگا کر فرمایا:

اتنا نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت ☆ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

قرآن کریم ہر موقع پر ترغیب کے ساتھ ترہیب کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہاں یہی واضح فرمایا کہ نسب وحسب پر کوئی انعام مقرر نہیں ہے، اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے، اور یہی مدارِ نجات ہے۔ گروہ بندی، نبی زادگی، شہزادگی کچھ نہیں ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت ان کے بیٹے کو بھی نہ بچا سکی، تمہیں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی نبوت ہرگز نہیں بچا سکتی۔ کیا مشرک، نافرمان اور انبیاء کرام علیہم السلام کے قاتل کے لئے کسی معافی کی گنجائش ہے؟ ہرگز نہیں! روزِ قیامت "منعم علیہم" پر کرم ہوگا، اور "مغضوب علیہم" پر غضب ہی ہوگا۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔

آیت کریمہ کا مطلب ومراد:

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اٹل اور عام ہے، اس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے، اس قانون میں کسی

سیاہ وسفید کا فرق ہے، نہ نئے اور پرانے کا، نہ فقیر وغنی کا، نہ کسی سابق ولاحق کا، اور نہ کسی نسل وقومیت کا، جو بھی اسلام کے دائرہ میں آکر ایمان قبول کرے گا، اور حق وصداقت کے اصولوں پر چل کر عملِ صالح اختیار کرے گا، گزشتہ تمام برے عقائد وبُرے اعمال سے تائب ہو کر سید کائنات خاتم الانبیاء وناسخ الادیان محمد ﷺ کا دامن پکڑ کر قرآن حکیم کی تعلیمات کو مضبوطی واعتصام کے ساتھ قبول کرے گا، بس یہی اعمالِ شرعیہ اور ایمانِ کامل اس کی نجاتِ اخروی کا ذریعہ وضمان ہی رہے گا۔ یہودیت ہو یا نصرانیت، صابئیت ہو یا مجوسیت، سرسری ایمان ہو یا نفاق سب کے سب منسوخ اور غیر مفید ہی رہیں گے۔ طلوعِ اسلام کے ساتھ آسمانی غیر آسمانی سارے مذاہب وادیان ہمیشہ کے لئے منسوخ ہو گئے۔ ’’لو كان موسىٰ حيًا ماوسعه إلا اتباعي‘‘ [الحديث]

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جو ظہورِ اسلام سے پہلے مؤمن اور موحد رہے، اور وہ لوگ بھی ہیں، جو اخلاص کے ساتھ ایمان لائے، اور استقامت اختیار کی، وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو نفاق سے تائب ہو کر ایمان لائے، پھر اخلاص کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

اس آیت کریمہ میں مؤمنین، یہود، نصاریٰ، صابئین کا ذکر ہے، جبکہ سورۃ الحج میں مجوس اور مشرکین کا بھی تذکرہ ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئِیْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْٓا﴾ [الحج:۱۷] (مسلمان اور یہودی اور ستارہ پرست اور نصرانی اور آتش پرست اور مشرک) یہود ونصاریٰ سب کے نزدیک معلوم ہیں، باقی دونوں کا تعارف ضروری ہوا۔

صابئین اور مجوس کون ہیں؟

شہرِ بابل عراق کی قدیم تاریخ میں خراسان کا مرکز رہا۔ جہاں حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے ملوکِ فارس کی سلطنت وحکومت رہی۔ فارس خراسان پر تقریباً ۵۴ بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔ پہلے بادشاہ کا نام کیومرث بن آدم علیہ السلام تھا، آخری بادشاہ کا نام یزدجرد تھا، جسے خلافتِ فاروقی میں اسلامی مجاہدوں نے ہلاک کیا تھا۔ اس فہرست میں کیومرث کے بعد تیسرے نمبر پر طہمورث بن نوب جہان بن ارفخشد ہے، جس کے زمانے میں صابئی مذہب کا ظہور ہوا۔

صابئین کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے، یہ کواکب پرست فرقہ ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’تلبیس ابلیس‘‘ کتاب میں ان کے متعلق دس تک اقوال ذکر کئے ہیں۔ یہ فرقہ بنی آدم کا قدیم ترین مشرک فرقہ ہے، اس فرقہ کے بانی کا نام ’’بوداسف‘‘ ہے۔ یہ طہمورث بادشاہ کے زمانے میں ظاہر ہوا۔ یہ فرقہ نہایت خبیث، بدعقیدہ، مشرک،

منکرِ توحید رہا ہے۔ یہ سیارات وکواکب وثوابت سیاروں کی شکلیں اور ہیکل بنا کر اپنے عبادت خانوں میں رکھتے تھے، اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ (مروج الذہب) طوفانِ نوح سے کافی عرصے بعد یہ بت پرستی، صابئیت، آشوری اقوام میں بڑے زور شور سے رواج پایا۔

نمرود بن کنعان جو کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے زمانہ میں تھا، اس کا مذہب بھی یہی صابئیت تھا، اور وہ آشوری اور کلدانی اقوام کا سربراہ بادشاہ تھا، جو بت پرست اور اُلوہیت کا مدعی بھی تھا۔ وہ بتوں اور کواکب کے ہیکلوں کا پجاری تھا، اور پورے عراق ونواحی پر اس کی حکمرانی تھی، اور آس پاس کے لوگ اس کے باج گزار تھے۔ اس نے نینوا، بابل اور حرّان کے علاقوں میں ایک بہت بڑا بتکدہ تعمیر کیا تھا، جس کا منتظم اعلیٰ آزر، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد تھا۔ جس میں بے شمار (تین سو سے زائد چھوٹے اور سات، یعنی سبع سیاروں کے ہیاکل بڑے) بت رکھے ہوئے تھے، اسی بت خانہ کے بتوں کو جناب حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے تہس نہس کر کے ٹکڑے ٹکرے (کر کے تباہ) کردیا تھا، جس کی پاداش میں انہیں آگ میں ڈالا گیا تھا، جسے احکم الحاکمین جل شانہ نے ﴿بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِيْمَ﴾ [الأنبياء: ۶۹] پر گل وگلزار میں تبدیل فرمایا تھا، جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ مذکور ہے۔

صابئین نے یہ عقیدہ تسلیم کیا، اور اس پر کاربند رہے کہ اجرام علوی آسمانی، چاند، سورج اور ستارے جاندار ذی روح ہیں، تب ہی تو متحرک ہیں، اور پورے عالم کے امور خیر وشر میں متصرف ہیں۔ ان کا تعلق عالم کے ساتھ ہمہ گیر قائم اور منسلک ہے، اور اسی تعلق کی بناء پر دنیا کے سارے تغیرات، تبدیلیاں، غمی خوشی، موت وحیات، پیدائش، صحت ومرض، فتح وشکست عزّت وذلت، فقر وغناء وغیرہ امور رونما اور ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

ان تمام امور میں ستاروں کے تصرف اور کارنامے شامل ہیں، اور وہ اس پورے نظامِ عالم میں مدبّر متصرف ہیں، جہاں یہ کواکب روشنی مہیا کرتے ہیں، وہیں یہ تمام امورِ دنیویہ میں مؤثر وفاعل رہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر صابی فرقہ نے ان تمام کواکب کی پرستش کو برحق سمجھ کر ان کی عبادت شروع کی لیکن یہ اجرامِ فلکی ان کی رسائی سے چونکہ بلند وبالاتر تھے، اور بیشتر ان کی آنکھوں سے بھی پوشیدہ تھے، اس لئے انہوں نے ان کے ناموں پر بت واصنام بنا کر عبادت گاہوں میں رکھ چھوڑے، تاکہ ان کے تصور وذکر کی وہاں تک رسائی ہوسکے، چنانچہ اس طرح یہ بت معرضِ وجود میں آگئے، اور ان کی عبادت شروع ہوگئی، اور مکمل معبود بنا لئے گئے۔

تمام مذاہبِ باطلہ خبیثہ میں سب سے قدیم مذہب یہی صابئیت ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان سے عرصہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک تقریباً پورے معمورہ پر اسی باطل عقیدہ کی گرفت عام رہی۔

اسلام کی آمد کے بعد ایک حد تک یہ عقیدہ روبزوال ہو کر ختم ہوا، مگر ایک عرصہ بعد پھر آہستہ آہستہ دوبارہ زندہ ہوا، ابھی بھی روس، چائنا، جاپان اور ہندوستان میں صابئیت کے ماننے والے (پرستار) بکثرت موجود ہیں، اور بدھ مت، ہندومت عقیدہ اسی صابئیت کی ایک شاخ ہے۔ تقریباً یہ دونوں مذہب قریب قریب ایک ہی ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عزیزی میں صابیوں کے مختلف ہیکلوں کی شکل وصورت کا بھی تذکرہ کیا ہے، مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ علتِ اولیٰ، یعنی تخلیق پر بھی ہیکل بناتے ہیں، عقل کا ہیکل الگ ہوتا ہے، سیاست کا الگ، اسی طرح صورت کا ہیکل بناتے ہیں، اور پھر نفس کا ہیکل گول شکل کا بناتے ہیں۔ زحل ستارے کا ہیکل مسدس شکل کا ہوتا ہے، اور مشتری کا ہیکل مثلث شکل کا، آفتاب کا ہیکل مربع شکل کا ہوتا ہے، اور چاند کا ہیکل مثمن، یعنی آٹھ پہلو کا ہوتا ہے۔

یہ لوگ قیامت اور بعد الموت دوبارہ زندگی کا بالکل انکار کرتے ہیں، اس کی بجائے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ چھتیس ہزار چار سو پچیس (۳۶۴۲۵) سال کا ایک دور ہوتا ہے، جب ایک دور ختم ہو جاتا ہے، تو پھر ہر ذی روح کا ایک ایک جوڑا پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً انسان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے وغیرہ ہر ایک کا جوڑا پیدا ہوتا ہے، جس سے آئندہ نسل چلتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ موجودہ دور جب تک موجود ہے، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا، اس کے بعد یہ تناسخ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا، اور پھر دوسرا دور شروع ہو جائے گا علیٰ ہذا القیاس، یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا کبھی ختم نہیں ہوگا، تو قیامت نہیں آئے گی، اور کائنات فنا نہیں ہوگی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کلدانیوں کی ایک بہت بڑی تہذیب گزری ہے۔ اس کا مرکز بابل شہر تھا، (اس کے جڑواں شہر کابل، اور درمیانی شہر زابل ہے)۔ بابل سب سے بڑا شہر ہوتا تھا، جو کہ کم وبیش ایک سو میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر بغداد سے تقریباً ستر یا سو میل دور تھا، اس سے پہلے آشوریوں کی تہذیب کا دور دورہ تھا، وہ تہذیب ختم ہوئی، تو کلدانی تہذیب کو عروج حاصل ہوا، ان کے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ آپ علیہ السلام وہاں تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے، مگر مجبور ہو کر وہاں سے ہجرت کی اور شام وفلسطین کو مرکز بنایا، پھر مصر تشریف لے گئے، پھر خانہ کعبہ کی تعمیر کے لئے مکہ مکرمہ آئے، تو صابئیوں کی طرح یہ کلدانی بھی ستاروں اور

روحانیات اور ہیکلوں کے قائل تھے، اور ان ستاروں کو قبلہ بنا کر ان کا سجدہ اور پرستش کرتے تھے، جیسے کہ پہلے تفصیلاً بیان ہوا۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کے مذاہب ہیں: ایک حنفی اور دوسرا صابی۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک صابی دور تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد دورِ حنیفیت شروع ہو چکا ہے۔ اب آگے حنیفیت کی تین شاخیں ہیں: (۱) مسلمان (۲) یہود (۳) اور نصاریٰ۔ ان میں سے صرف مسلمان ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (ملت) پر قائم ہیں، باقی دونوں گروہ دین سے ہٹ چکے ہیں۔ دورِ ابراہیمی سے پہلے جو صابی گروہ تھا، وہ کچھ زوال کے بعد دوبارہ ترقی کر کے اب بھی موجود ہے۔ آگے اس کی بھی تین شاخیں ہیں: یعنی مجوس، برہمن اور بدھ۔ مجوسیوں کو زیادہ تر عروج ایران میں ہوا، وہاں ان کی تاریخی حیثیت مسلَّم ہے۔ تاریخ کی ایک مشہور کتاب ''ایران بعہد ساسانیاں'' موجود ہے، کہ مجوس کی بھی دو قومیتیں ہیں: ایک کا نام ایرج ہے، اور دوسری کا طوج۔ قدیم زمانے میں ایران کے بادشاہ فریدون کے دو بیٹے ایرج اور طوج تھے، انہیں کے نام پر مجوس کی دو شاخیں پھیل گئیں۔

مجوسی لوگ زردشت بن یوشب کو نبی مانتے ہیں، اس شخص نے فارس کے بادشاہ گشتاسپ بن لہراسپ کے زمانہ میں مجوسیت کی بنیاد ڈالی، اور ۲۹ ابواب پر مشتمل ایک کتاب پیش کی، جس کا نام ''زنداوستا'' ہے، پھر اس کی ایک شرح لکھی، جس کا نام ''البازند'' ہے۔ یہ دونوں مجوسیوں کے نزدیک نہایت معتبر اور مستند و متبرک ہیں، مجوسی آتش پرست بھی ہیں، اور کواکب پرست بھی۔

یہ لوگ دو الٰہ دو خالق مانتے ہیں۔ خیر و صلاح کے خالق کو نور کہتے ہیں، اس کا نام یزداں ہے، اور شر و فساد کے خالق کو ظلمت کہتے ہیں، اس کا نام اہرمن ہے۔ یہ لوگ قیامت اور بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں۔ ماں، بہن، بیٹی کے ساتھ ازدواجی تعلقات کو جائز قرار دیتے ہیں، ان کے تقریباً چھ فرقے ہیں، ہر فرقے کے عقائد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: کیومرثیہ، ثنویہ، مانویہ، مزدکیہ، دیصانیہ، مرقیونیہ۔ لہراسپ فارس کا آٹھواں بادشاہ ہے، بخت نصر جس نے بیت المقدس کو شہید اور بنی اسرائیل کو بیدردی سے قتل کیا تھا، اسی بادشاہ لہراسپ کا گورنر تھا، یہ بڑا ظالم اور بے انصاف گزرا ہے۔ جب اس کا بیٹا گشتاسپ بادشاہ ہوا، تو بنی اسرائیل کے بقیہ لوگوں کو معافی دے دی۔

حضرت عزیر علیہ السلام اسی کے زمانے میں سو سالہ خواب سے بیدار ہوئے تھے، یہ بادشاہ رحمدل غریب نواز گزرا ہے۔اس سے پہلے فارس کے تمام بادشاہ صابی مذہب رکھتے تھے۔زردشت بن یوشب اسی کا معاصر ہے، جس نے مجوسیت کی بنیاد ڈالی، پھر بادشاہ کو دعوت دی، چنانچہ اس نے مجوسیت قبول کر کے پوری رعایا، اور خلقت کو مجوسیت کا پابند بنایا، اسی گشتاسپ سے لے کر خراسان فارس کے آخری فرمان روا تک ملوک وسلاطین کا سرکاری مذہب مجوسیت (آتش پرستی کواکب پرستی) رہا، یہاں تک کہ حضرت امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایران فتح ہوا، اور آخری بادشاہ یزدجرد مدائن سے نکل بھاگ کر خاقان (چین) کی پناہ میں آ گیا، پھر امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔کابل، ہرات، بلخ وغیرہ بھی فتح ہوئے اور ''یزدجرد'' مارا گیا۔

قدرت کے عجائبات دیکھیں! یزدجرد شاہ فارس کی تینوں شہزادیاں اسیر ہو کر مدینہ طیبہ پہنچیں۔ایک کا نکاح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہوا، اس کے بطن سے سالم رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔دوسری کا نکاح امام حسین رضی اللہ عنہ سے ہوا، اس کے بطن سے زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔تیسرے کا نکاح محمد بن ابی بکر سے ہوا، اس کے بطن سے قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔[حیاۃ الحیوان، بحث بغل]

مجوسیوں کی دوسری شاخ برہمن ہے، جو ہندو کے نام سے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔اور تیسری شاخ بدھ ہے، جو چین اور جاپان میں آباد ہیں۔مجوسیت میں کواکب پرستی، بت پرستی کے ساتھ آتش پرستی بھی رائج ہے۔ برہمنوں اور بدھ والوں کا مذہب بت پرستی ہے، جبکہ آتش پرستوں کو آج کل پارسی کہتے ہیں۔یہ لوگ پورے برصغیر پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں، مگر مرکز ان کا بمبئی ہندوستان ہے، لہٰذا یہ یاد رہے کہ یہ سب کے سب صابی ہیں۔[شهرستاني، مروج الذهب، اثمار التكميل وغيره]

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ [الآیۃ] الغرض! اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ابدی نجات، امن وسلامتی، اطمینان وبے خوفی، ابدی کامیابی اور نجات کا عمومی قانون اور کلیہ سمجھا دیا کہ ابدی اور اخروی نجات کسی خاص فرقہ یا گروہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔کوئی ایمان کا دعویدار ہو، یا یہودیت کا، یا نصرانیت کا، یا صابیت کا، اور مجوسیت کا نجات کے لئے واحد قانون یہ ہے کہ وہ صدق ویقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر، انبیاء ورسل علیہم السلام اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، اور گزشتہ بداعمالیوں سے تائب ہو کر نیک اعمال کا سلسلہ اختیار کرے، تو وہ کامیابی اور نجات سے ہمکنار ہوگا، اور ہر قسم کے خوف وپریشانیوں سے امن میں رہے گا۔

یہ مضمون اتنا جامع اور خوش کن ہے کہ تقریباً قرآن حکیم میں ایک سو سے زائد مقامات پر بڑے عمدہ اور پیارے انداز پر موجود ہے، اور تسلّی کے ساتھ خوشخبری بھی ہے۔ واللہ تعالٰی ولی التوفیق

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ﴿۶۴﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا، اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا، جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی ہے اسے مضبوطی سے پکڑو، اور یاد کرو جو کچھ اس میں ہے، تاکہ تم متقی بن جاؤ﴿۶۳﴾ پھر تم اس کے بعد پھر گئے، پس اگر اللہ تعالٰی کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی، تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے﴿۶۴﴾

معارف ومنازل

ایک طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مناجاتیں اور عاجزانہ مطالبات کا سلسلہ ہے، دوسری طرف سے حق تعالٰی کی عنایات ہیں۔ رحمتوں کے دروازے سارے کھلے ہیں، چشمِ زدن میں ہر مطالبہ پورا ہو کر بنی اسرائیل کو نوازا جاتا ہے۔ اب فطرتِ سلیمہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ سب اللہ تعالٰی کا شکر بجالاتے، اس کے فضل وکرم کی بے مثال فراوانی کے پیشِ نظر فرمانبرداری اور عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم کر کے انہیں مزید رنج و پریشانیوں سے نجات دیتے، مگر ہوا یہ کہ انہوں نے ناشکری کی، اور اپنی کج روی، ہٹ دھرمی کو باقی رکھا، اور سمعنا کے ساتھ عصینا کی رٹ لگا کر نافرمانی کی انتہاء کر دی، اور اپنے ستر آدمیوں اور نمائندوں کی تصدیق کے باوجود تورات اور اس کے احکام کو قبول کرنے میں معاندانہ پس وپیش شروع کر دی، بے سمجھ وناداں بچوں کی طرح بہانے بناتے رہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طنز وطعنے کا بازار گرم کر کے انہیں سخت دھمکی دینے لگے، اور ایسے بہتان بکنے لگے جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا، تو بارگاہِ الٰہی میں رجوع کرتے ہوئے قوم کی سرکشی اور بے راہ روی کا گلہ شروع کیا۔ درگاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ ان نافرمانوں کے لئے میں تجھ کو ایک معجزہ بطورِ حجت عطا کرتا ہوں، اور وہ یہ کہ جس پہاڑ (کوہِ طور) پر تو مجھ سے ہمکلام ہوتا رہتا ہے، اور جس پر تیری قوم کے نمائندہ سرداروں نے حق کا مشاہدہ

کیا ہے، اسی پہاڑ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے، اور سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سروں پر چھا جائے، اور زبانِ حال سے یہ اعلان کرے کہ موسیٰ علیہ السلام رب تعالیٰ کا سچا اور برحق پیغمبر ہے، تورات اللہ تعالیٰ کی بلاشبہ سچی کتاب ہے، اور اس کا ہر حکم واجب العمل ہے۔ اگر یہ دونوں حق وصداقت کا مظہرِ اتم نہ ہوتے، تو اس عظیم الشان ''نشانی'' کا تم مشاہدہ نہ کرتے، جس کا ظہور قدرتِ الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔

چنانچہ جوں ہی اللہ تعالیٰ کا یہ تکوینی فیصلہ ہوا، کوہِ طور ان کے سروں پر مثلِ سائبان نظر آنے لگا، اور زبانِ حال سے کہنے لگا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تم میں عقل وہوش باقی ہے، اور حق وباطل کی تمیز موجود ہے، تو خوب سنو! میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشان بن کر تم کو یقین دلاتا ہوں، اور شہادت دیتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بارہا میری پیٹھ پر حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ ہمکلامی کا شرف حاصل کیا ہے، اور تمہارے رشد وہدایت کا قانون (تورات) بھی میری ہی پیٹھ پر عطا ہوا ہے۔ جب قوم بنی اسرائیل نے یہ منظر مشاہدہ کیا، اور انہیں خوف طاری ہوا کہ یہ طور ہمارے اوپر گرنے والا ہے، اور ہمیں پیس کر نیست ونابود کرنے والا ہے، ہمارے پاس تسلیم ورضا کے علاوہ کوئی ذریعۂ نجات ممکن نہیں ہے، تو بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی جانب متوجہ ہوئے، اور ہر قسم کی تعمیلِ احکام کا اقرار کر کے عہد کیا کہ کبھی نافرمانی نہیں کریں گے۔

دوسرے مقام پر اسی طرح کا ارشاد ہے: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [الأعراف] (اور جب ہم نے ان (کے سروں) پر پہاڑ اٹھا کھڑا کیا، گویا وہ سائبان تھا، اور انہوں نے خیال کیا کہ وہ ان پر گرتا ہے تو (ہم نے کہا کہ) جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے زور سے پکڑے رہو۔ اور جو اس میں لکھا ہے اس پر عمل کرو تاکہ بچ جاؤ)۔

مگر افسوس کہ یہ ساری باتیں بے سود ورائیگاں ثابت ہوگئیں۔ ان کا عہد ومیثاق ایک ہنگامی تعمیل کے سوا کارگر نہ ہوا۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر سنو کہ کوئی پہاڑ سرک کر اپنی جگہ سے دور چلا گیا ہے، اس کی تصدیق کرو، کیونکہ یہ چیز ممکنات میں سے ہے، اگر یہ سنو کہ کوئی اپنی فطرت چھوڑ چکا ہے، باور نہ کرو کہ یہ غیر ممکن ہے۔ [مشکوٰۃ] یہ لوگ بھی فطری طور پر ضدی، عنادی، نافرمان، ہٹ دھرم، احسان فراموش ہی تو تھے۔ صرف چار روز تک کاربند رہنے کے بعد حسبِ عادت پھر خلاف ورزی اور شرارت پر اُتر آئے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ (توتم اس کے بعد (عہد سے) پھر گئے) حق تو یہ تھا کہ تمہیں فرعون کی طرح عذاب گھیر لیتا، مگر "فلولا فضل الله علیکم ورحمته" رحمت وعنایت کے وسیع دامن نے تمہیں گھیر کر بخشش ودرگزر سے نوازا، ورنہ تم اس قابل ہرگز نہ تھے کہ تم پر بخشش وعنایت ہو۔

ایک شبہ اوراس کاازالہ:

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جبری قسم کا عہد ہے کہ ان کے سروں پر کوہِ طور معلق کر کے ان سے عہد لیا جارہا ہے، جبکہ ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِى الدِّينِ﴾ [البقرة:۲۵۶] (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) اس کی نفی کر رہا ہے؟

جواب یہ ہے کہ اسلام نے جو قوانین وضابطے مقرر کیے ہیں، ان کی خلاف ورزی اور قانون شکنی کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اور جو کوئی قانون شکنی کا مرتکب ہوگا، وہ کسی بھی صورت میں قانون کی گرفت اور سزا سے نہیں بچ سکتا۔ تعزیرات اور حدود کے نفاذ پر جبر کا ہرگز اطلاق نہیں ہوتا، بلکہ نظامِ عدل وانصاف کے ہمہ گیر پہلو کا تقاضا اور یہی عین مصلحت اور شمار ہوگا۔ اگر ان امور میں قانون کی بالادستی نہ ہو، تو نظامِ عالم تہہ بالا ہو کر لوگوں کی زندگی اجیرن اور غیر محفوظ رہے گی۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل آئندہ آیت کریمہ: ﴿وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ [البقرة: ۱۷۹] کے تحت آنے والی ہے، ان شاء اللہ

کتاب کو مضبوطی اور قوت کے ساتھ پکڑنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے ہاتھوں میں تھام لو، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس کے قوانین پر سختی سے عمل پیرا ہو، اور یہی چیز تقویٰ کا ذریعہ ہے۔ تقویٰ اصل میں نام ہے: ''معاصی و منہیات اور جرائم سے مکمل بچنے کا''۔ خواص کے لئے تقویٰ کا ذریعہ خوف وخشیتِ الٰہی ہی رہا ہے، وہ اسی بنیاد پر جرائم سے بچتے ہیں، جبکہ عوام الناس اور دیگر غیر مذہب اہلِ ذمہ میں اس چیز کا مکمل فقدان ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ حدود زواجر ہیں۔ اگر یہ حدود وتعزیرات اور گناہوں اور جرائم پر گرفت نہ ہو، اور قانون شکنی پر سخت سے سخت سزائیں نہ ہوں، تو پورا معاشرہ برباد ہو جائے گا، اور یہ چیز ہمارے مشاہدے میں ہے کہ جہاں قانون یا اس کی بالادستی اور نفاذ نہیں، وہاں لوگوں کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے اور انسانوں میں چین وسکون کا نام ونشان تک نہیں ہے۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

پھر تم اس عہد ومیثاق سے پھر گئے، اسے پورا نہ کیا۔ حق تو یہ تھا کہ تم پر سخت سے سخت عذاب نازل ہوتا، پتھروں کی بارش ہوتی، تمہاری شکلیں بدل جاتیں، مگر ایسا نہیں ہوا، کیونکہ تمہارا معاملہ ایک ایسی ذات کے ساتھ وابستہ ہے، جس

نے کائنات کی تخلیق فرما کر سب سے اوپر اپنے عرش پر یہ لکھ دیا کہ: "إن رحمتي سبقت على غضبي"۔ پھر یہ نہیں کہا کہ اس سبقت کی وسعت کیا ہے؟ یہ رحمت غضب سے کس قدر آگے ہے؟ میں نے آج تک کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔ اپنے خیال سے کہتا ہوں کہ اس سبقت کی مسافت اس پورے جہاں کی وسعتوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ دیکھو! کائنات کی ہر سمت اور ہر طرف نظر اٹھا کر دیکھو! آپ کو چاروں طرف معصیتوں کا ڈھیر نظر آئے گا، اور نیکیاں اتنی قلت میں ہوں گی، جتنا آٹے میں نمک، مگر درگزر مثالی اور لامتناہی ہے۔ پکڑ دھکڑ کا نام ونشان نہیں ہے۔

خطائیں دیکھتا بھی ہے عطائیں کم نہیں کرتا۔ میں حیران ہوں اس بات پر کہ اتنا مہربان کیوں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام براہِ راست فرشتے کے واسطے کے بغیر کلیم اللہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی پوری فوج میں تیسرے نمبر پر ان کا درجہ ہے، اور عالمِ اسباب میں فرعون کی غلامی سے تمہارے نجات دہندہ ہیں، جن کے طفیل تمہیں صبح وشام آسمانی اور زمینی نعمتوں کا انبار مل رہا تھا۔ تم نے انہیں اتنا ستایا کہ ان کے پتہ کا پانی خشک ہو گیا۔ آئے دن ایسی ایسی بے ہودہ باتیں اور مطالبے پیش کرتے ہو کہ حدِ امکان سے باہر ہیں۔ کبھی یہ کہنے سے بھی نہیں شرمائے: ﴿لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً﴾ [البقرة: ۵۵] (ہم تمہاری ہرگز تصدیق نہیں کریں گے، یہاں تک کہ اللہ کو کھلی آنکھوں نہ دیکھیں) کبھی تم نے یہ مشورہ بھی کیا کہ انہیں قتل کرو، سنگسار کرو، وغیرہ۔

دیکھیں! اگر فضلِ الٰہی اور اس کی وسیع رحمت کا تقاضا نہ ہوتا، تو آج تم ہمارے مسخ ہو کر بندروں اور خنزیروں کی شکل وصورت میں ہو جاتے (چنانچہ کسی وقت ایسا ہو گیا جو آنے والا ہے)۔ حدیث پاک میں ہے کہ مؤمن اپنے معمولی گناہ سے ایسا ڈرتا ہے، جیسے وہ سمجھتا ہے کہ یہ گناہ ایک بہت بڑے پہاڑ کی شکل میں میرے اوپر کھڑا ہے، اور کہیں میرے اوپر گر کر مجھے تباہ نہ کر دے۔ اس کے برعکس فاجر شخص اپنے پہاڑ جتنے بڑے گناہ کو ایسا معمولی ہلکا خیال کرتا ہے، جیسے اس کی ناک پر کوئی مچھر یا مکھی بیٹھی ہو۔ [مشکوٰۃ]

یہی بنی اسرائیل کا حال ہے کہ ان کے سروں پر طور کا پہاڑ سائبان کی طرح کھڑا ہے، مگر وہ اسے مکھی و مچھر سمجھ کر پہلوتہی، اور استہزاء کر رہے ہیں۔ اگر ربّ العزت کا فضل وکرم نہ ہوتا، اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی بے مثال التجائیں اور دعائیں شاملِ حال نہ ہوتیں، تو تم اپنے پیشرو فرعون اور عاد وثمود کی طرح صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح ہمیشہ کے لئے مٹ جاتے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً
خٰسِئِيْنَ ۝٦٥ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٦٦

ترجمہ: اور البتہ تحقیق تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے دن زیادتی کی تھی، پس ہم نے ان کو کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ ۝٦٥ اور بنا دیا ہم نے ان لوگوں کو عبرت ان کے لئے جو اس وقت موجود تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے، اور متقیوں کے لئے نصیحت بنا دیا ۝٦٦

معارف ومنازل

مسلمانوں کے لئے جمعہ کا روز مقدس ہے، جس کے بڑے فضائل اور کرامات کا بیان اپنے موقع پر آئے گا، اسی طرح یہود کے لئے ہفتہ اور نصاریٰ کے لئے اتوار کا دن مقدس ہے۔

بنی اسرائیل کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کا دن آرام اور عبادت کے لئے مخصوص رکھیں۔ اس میں دکانداری، تجارت، زراعت اور ہر قسم کے دنیوی کاروبار سے اجتناب کریں، حتیٰ کہ کھانا پکانا بھی خود نہ کریں، بلکہ خادموں سے کرائیں۔ اگر کوئی اس فرمانِ الٰہی کے خلاف کرے گا، تو وہ واجب القتل ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں کم وبیش اس پر عمل ہوتا رہا، اگرچہ کبھی خلاف ورزی بھی ہوئی، جیسا کہ دیگر احکام کی بھی خلاف ورزی ہوتی رہی، مگر کوئی سخت عذاب نہیں آیا۔ جب بنی اسرائیل پر انحطاط کا دور آیا تو وہ قصداً علی الاعلان اس حکم کو بھی پامال کرنے لگے، اور ہفتہ کے روز کھلم کھلا سب کچھ کرنے لگے، زراعت، تجارت وغیرہ کرتے رہتے تھے، بغیر کسی روک ٹوک کے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں سمندر کے کنارے ملک شام کی ایک بستی ایلہ میں مچھلی کے شکار کے لئے یہ حیلہ کیا گیا کہ ہفتہ کے روز حوضوں اور تالابوں میں آنے والے نالوں کے منہ کھول دیتے تھے، جب سمندر کی مچھلیاں ان میں آجاتیں، تو ان کی سمندر میں واپسی کا راستہ بند کرتے تھے، اور اتوار کے روز ان کا شکار کرتے، اور پکڑ لیتے تھے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل سورۃ اعراف میں ایک پورے رکوع میں آنے والی ہے، اِن شاء اللہ، جو کہ صرف اسی موضوع پر ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم سنا کر سختی سے منع فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگ اپنی بری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے، تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے، چنانچہ آپ علیہ السلام کی تبلیغ سے بہت سے لوگ اس عمل

سے تائب ہوئے، اور دوسروں کو بھی روکنا شروع کیا۔ دوسرا گروہ فاسقین کا تھا، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ایک تیسرا گروہ ایسا تھا جو خود تو برائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا، مگر دوسروں کو روکتا بھی نہ تھا، یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عامل نہ تھا۔ قرآن حکیم نے سورۃ الاعراف میں تینوں گروہوں کا تذکرہ اور انجام بیان فرمایا ہے، کہ جب عذاب آیا، تو صرف پہلا (صالحین) گروہ نجات پا گیا۔ باقی دونوں گروہ عذاب کی لپیٹ میں آگئے۔ مجرم گروہ نافرمانی کی وجہ سے، اور دوسرا گروہ نہی عن المنکر کے فریضہ کے ترک کرنے کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہو گیا۔ **فاعتبروا یا أهل العلم و یا أهل القرآن**

مختصر واقعہ یہ کہ پہلے صالحین کے گروہ نے سوچا کہ ہم ان نافرمانوں کے ساتھ کب تک ایک محلہ میں گزارہ کریں گے؟ کیوں نہ ہم ان سے الگ ہو جائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے، اور ہم بھی اس میں تباہ ہو جائیں، چنانچہ انہوں نے باقی دونوں گروہوں کا بائیکاٹ کر دیا، اور قریب ہی اپنے علیحدہ علاقے میں منتقل ہو گئے۔ ان دونوں علاقوں کے درمیان کوئی بڑی دیوار حائل تھی، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ البتہ! ایک دوسرے کی آوازیں صبح شام سنتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ صالحین کے گروہ نے دوسرے گروہ کے کسی آدمی کی آواز نہ سنی، اور نہ ہی ان کی کوئی حرکت وغیرہ محسوس کی، کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انہوں نے دیوار سے جھانک کر دیکھا، تو اللہ تعالیٰ کا حکم آچکا تھا:

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ (پس ہم نے کہا کہ تم سب ذلیل ہو کر بندر بن جاؤ) چنانچہ صالحین نے دیکھا کہ اس گروہ کے بڑے (بوڑھے، مرد و عورت) خنزیروں کی شکل میں، اور نوجوان طبقہ (مرد و عورت) بندروں کی صورت میں مسخ ہو چکے ہیں۔ شکلیں تبدیل ہو چکی ہیں، مگر شعور باقی ہے۔ اپنے عمل پر نادم اور پشیمان ہیں، اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارا فلاں رشتہ دار ہے، فلاں بھائی یا فلاں رشتہ دار ہے۔

اس مقام پر صرف بندروں کا ذکر ہے، دوسرے مقام پر خنزیروں کا تذکرہ بھی ہے: ﴿فَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ﴾ [المائدة: ٦٠] (پس ان میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنا دیا)۔ پس یہ لوگ اس شکل و صورت میں صرف تین روز زندہ رہے، اس کے بعد سارے ہلاک ہو گئے۔ تقریباً ستر ہزار کے لگ بھگ تھے۔

اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے: نافرمان اور فرمانبردار۔ نافرمانوں کے لئے تو اس کو "نکال" اور فرمانبرداروں کے لئے "موعظة" فرمایا گیا ہے۔

حیلہ جائز بھی ہے، اور نا جائز بھی:

حیلہ کرنے سے بنی اسرائیل پر عذاب آیا، مگر نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے کہ حیلہ جائز ہے۔ چنانچہ ایک سیر عمدہ کھجوروں کا دو سیر گھٹیا کھجوروں کے بدلہ بیچنا سود کے دائرہ میں آجانے کی وجہ سے اگرچہ ناجائز ہے، مگر سرورِ عالم ﷺ نے اس کا حیلہ بتلایا کہ پہلے عمدہ کھجوروں کو قیمۃً بیچ دو، اور پھر اس قیمت کے بدلہ میں دوسری گھٹیا کھجوریں زیادہ خرید لو، اسی طرح قرآن حکیم نے واضح کیا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کسی معمولی بات پر ناراض ہو گئے، تو قسم کھائی کہ اگر تندرست ہو گیا، تو بیوی کو سو کوڑے یا لاٹھیاں ماردوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری بیوی نیک خاتون اور بے قصور ہے، اس کو سو کوڑے کی سزا مت دو، بلکہ اپنی قسم پوری کرنے کے لئے یہ حیلہ استعمال کرو کہ سو چھڑیوں کا ایک گٹھا لے لو، اور ایک دفعہ بیوی کو ضرب لگادو، یہ کافی ہے۔ اس سو خوشوں کے گھٹے مارنے سے اس کو تکلیف بھی نہیں ہوگی، اور تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے گی۔ ارشاد فرمایا: ﴿وَخُذْ بِيَدِكَ﴾ ...... الخ

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھنے کی خاطر بادشاہی پیمانہ کو اس کے سامان میں رکھوا کر اسی بہانہ (حیلہ) کے ذریعہ انہیں اپنے پاس رکھا۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ حیلہ جائز ہے، جبکہ مچھلیوں کے شکار کے حیلہ سے عدمِ جواز معلوم ہوا، تو اس لئے کہا جائے گا کہ حیلہ کی دو صورتیں ہیں: (۱) جائز (۲) ناجائز۔ اور تفصیل یہ ہے کہ اگر حیلہ سے کوئی شرعی حکم ختم یا خراب ہو، یا کسی حقدار کی حق تلفی اور نقصان کا اندیشہ ہو، یا کوئی شرعی مقصد فوت ہو، جیسے بنی اسرائیل کا مچھلیوں کا شکار اور حیلہ سازی تو ایسا حیلہ ناجائز اور حرام متصور ہوگا، اس پر عمل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی۔

ہاں! اگر حیلہ ایسا ہو کہ اس سے نہ حکم شرعی فوت ہو، اور نہ کسی حقدار کی حق تلفی ہو، بلکہ صرف حیلہ کرنے والے کا کوئی ذاتی اور جائز فائدے کی تکمیل ہو، جس سے حقوق اللہ وحقوق العباد پر کوئی خطرہ نہ ہو، ایسا حیلہ جائز ہوگا، بلکہ مستحسن ہے، جیسے کھجوروں، اور حضرت ایوب وحضرت یوسف علیہما السلام کے واقعات وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ بعض لوگوں نے سرورِ عالم ﷺ سے پوچھا: موجودہ بندر اور خنزیر کیا انہی انسانی (اسرائیلی) بندروں کی نسل سے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی پر مسخ کا عذاب بھیجتا ہے، تو اس کی نسل منقطع ہو جاتی ہے۔ دیکھا جب وہ لوگ بندر وخنزیر کی شکل میں مسخ ہو گئے تو تین روز کے اندر سب کے سب مر گئے، اور فرمایا کہ بندر وخنزیر تو پہلے سے دنیا میں موجود تھے۔ مطلب یہ ہے کہ مسخ شدہ سارے

ختم ہو گئے ہیں، موجودہ خنزیر و بندروں کا مسخ شدہ کے ساتھ تعلق وجوڑ نہیں ہے۔ یہ ایک مستقل قدیمی مخلوق ہے، دوسری مخلوقات کی طرح۔

جدید فلسفہ اور سائنسدانوں ڈارون جیسے ملاحدہ کے نزدیک اگر بندر ترقی کر کے انسان بن سکتا ہے، تو یہ بھی قابلِ غور ہے کہ انسان اپنے انسانی اقدار کو پامال کر کے تنزل اختیار کر کے بندر و خنزیر کیوں نہیں بن سکتا؟ یہی قرآن حکیم کا فیصلہ ہے کہ انسان بندر و خنزیر بن گئے۔ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا فرمایا، جہاں مأکولات و مشروبات سے خون اور خون سے منی کا نطفہ، پھر نطفہ سے علقہ، علقہ سے مضغہ، گوشت و پوست، رگیں، ہڈیاں وغیرہ عجیب و غریب قدرتی انقلابات و تبدیلیاں ظہور و وجود میں آگئیں۔ فتبارک اللہ أحسن الخالقین۔

دہد نطفہ را صورتے چون پری ☆ کہ کردست و بر آب صورتگری (شیخ سعدیؒ)

جب اس وسیع و عریض کائنات کو جو کہ لاکھوں تضادات و نیرنگیوں پر مشتمل ہے، بغیر مادہ کے مختصر وقت میں پیدا کرنے پر، اور پھر اسے فنا کرنے پر قادر ہے، وہ اپنی پیدا کردہ مادی مخلوقات میں طرح طرح کی تبدیلیوں پر کیوں قادر نہیں؟ ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ فرمایا: ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ۝ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ۝ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ۝ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ۝﴾ [الواقعة] (ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا کیا ہے، تو تم (دوبارہ اُٹھنے کو) کیوں سچ نہیں سمجھتے؟ دیکھو! جس (نطفے) کو تم (عورتوں کے رحم میں) ڈالتے ہو، کیا تم اس (سے انسان) کو بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں؟ ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا ہے، اور ہم اس (بات) سے عاجز نہیں کہ تمہاری طرح کے اور لوگ تمہاری جگہ لے آئیں، اور تم کو ایسے جہاں میں جس کو تم نہیں جانتے، پیدا کر دیں۔ اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی ہے، پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟)۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے، بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح

کرو، توانہوں نے کہا: کیا تو بناتا ہے ہم کوٹھٹا کیا ہوا؟ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: پناہ بخدا اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہوجاؤں ﴿۶۷﴾

معارف ومنازل

مفسرین حضرات نے یہ واقعہ دوطرح سے بیان کیا ہے۔ بہرحال واقعہ کی صورت جو بھی ہو، مطلب ومراد دونوں کا ایک ہی ہے۔ پہلا واقعہ علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مشکوٰۃ میں یوں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کسی نے ایک شخص کی لڑکی سے شادی کی درخواست کی، مگر اس نے انکار کردیا، جس پر اس شخص نے اسے قتل کردیا۔ قاتل کا پتہ نہیں لگ رہا تھا، لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قاتل کے بارے میں درخواست کی، وحی کے ذریعہ یہ حکم آیا کہ گائے ذبح کی جائے، إلى أخر القصة۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص عامیل نامی بڑا مالدار تھا، جس کا کوئی بیٹا نہ تھا، اور اس کا ایک چچازاد بھائی فقیر تھا، اس چچازاد بھائی کے علاوہ "عامیل" کا کوئی وارث نہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے سوا اس کا کوئی وارث نہیں ہے، آخرکار اس کے مال کا میں ہی وارث ہوں، تو ابھی سے اس کے مال پر کیوں قبضہ نہ کروں! تو اسے کسی کام کے بہانے پر بستی سے باہر لے جاکر قتل کیا، اور اس کی لاش دوسری بستی کے قریب ڈال کر چھوڑ دی۔ پھر صبح وہاں جاکر بستی والوں کو ملوث کرکے کہا کہ میرے چچا کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے، اس پر دونوں فریقین میں تنازع شروع ہوا۔ اس بستی نے والوں آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے استغاثہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو وحی کے ذریعہ گائے ذبح کرنے کا حکم نازل ہوا۔

چونکہ یہ واقعہ نزولِ تورات سے پہلے کا ہے، اور پھر ایک معروف بے اولاد سرمایہ دار کا تھا، اس سے پہلے کوئی ایسا واقعہ کبھی رونما نہیں ہوا تھا، اس لئے اس کی اہمیت بڑھ گئی، اور خصوصی شکل اختیار کرگئی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گائے ذبح کرنے کا حکم صادر فرمایا، تو بنی اسرائیل اپنے پرانے مزاج وفطرت پر کہنے لگے: آپ ہمارا مذاق وتمسخر اڑا رہے ہیں۔ بھلا گائے ذبح کرنے اور قاتل معلوم ہونے میں کیا مناسبت؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں اس بات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نبی ہوتے ہوئے جاہلوں جیسا کام یا بات کروں۔

جب لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم اور موسیٰ علیہ السلام کا مشورہ قبول کیا، توحسب عادت دور دراز کے حیلے اور حجتیں نکالنی شروع کردیں، اور حددرجہ ٹال مٹول کی کوشش کی، مگر جتنے سوالات وہ پوچھتے گئے، اتنے ہی پھنستے گئے۔

سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر یہ لوگ کوئی بھی گائے ذبح کرتے، تو ان کا مسئلہ حل ہو جاتا، اور مراد و مطلب پورا ہو جاتا، لیکن انہوں نے حجتیں نکالنی شروع کیں، تو ان کے ذمہ بہت سی قیدیں لگ گئیں۔ [مظھری]

نیکی اور توکل کی برکت و سرفرازی:

بنی اسرائیل کے لیت و لعل اور کثرتِ سوالات کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک نوجوان جس نے زندگی بھر والدین کی خدمت کی، اور توکل علیٰ اللہ پر کار بند رہا۔ اس کے یہاں مطلوبہ موصوفہ گائے دستیاب ہوئی۔ پوری قوم میں تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہوئی، اور لوگ تقریباً عاجز ہو گئے، تو اس مردِ صالح کی قسمت جاگ اٹھی۔ اس شخص نے مرتے وقت اپنے یتیم بچہ بیوی، اور اس گائے کے بچھڑے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا تھا۔ اس زمانے میں اس کی قیمت تو صرف تین دینار تھی، مگر اب توکل کی برکت سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کی کھال کو سونے سے بھر کر دے دیا جائے۔

یہ واقعہ تقریباً حضرت خضر و حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، جو یہ ہے: ﴿وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا﴾ [الکھف: ۸۲] (رہی وہ دیوار تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی، اور اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا، اور ان کا باپ نیک آدمی تھا)۔

اصل واقعہ اور اس کے نتائج کی اہمیت:

دراصل گائے ذبح کرنے کا حکم ایک خاص مقصد کے لئے تھا، جسے آئندہ آیتوں میں بیان فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ [البقرة: ۷۳]۔ اور اصلِ واقعہ کا بیان اگلے رکوع کی پہلی آیت میں ہے: ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ [البقرة: ۷۲]۔ اس میں تقدیم و تاخیر واضح ہے۔ پہلا حصہ آخر میں آ گیا، اور آخری حصہ شروع میں۔

اس تقدیم و تاخیر کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم واقعات کے بیان کرنے میں نتائج اور نصائح و عبرت وغیرہ کے فوائد کا لحاظ رکھتا ہے، اور عموماً ان امور کو پہلے بیان کرتا ہے جن کا تعلق حقوق اللہ یا عقائد سے وابستہ ہوں، جیسے یہاں ہوا۔ اگر شروع میں اصل واقعہ کا بیان ہوتا، تو نظر واقعہ میں الجھی رہتی۔ اہم نتائج و ثمرات کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا، لیکن ترتیب بدلنے سے ذہن نتیجہ کی کھوج اور تلاش میں لگ جائے گا۔ آخری چیز (جس کو پہلے ذکر فرما دیا) اس سے بنیادی عقیدہ ''احیائے موتی''، عظیم الشان عقیدہ کی بنیاد مضبوط ہوگی، اور اول حصہ جس کو آخر میں بیان کیا گیا، اس میں اخفائے واردات اور احکامِ الٰہی کے ٹال مٹول کی مذمت بیان فردی۔ اس کے ساتھ یہ کہ اصل قتل جس میں

مقتول کا حق ضائع ہوا، یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے، اس کو مؤخر کیا، اور بقرہ کا ذبح اور اس کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مارنا اور اس کا زندہ ہوکر اپنے قاتل کی نشاندہی کرنا، اس کا تعلق حقوق اللہ اور معجزات سے ہے، اس لئے یہ مقدم ہوا۔

مرنے کے بعد زندہ ہونا:

اللہ تعالیٰ شانہ کے لئے آسان ہے، اور اس کے حق میں یہ مسئلہ اتنا واضح ہے، اور صبح وشام بکثرت ہمارے مشاہدے میں ہے، کہ اس کے اثبات اور تحقیق کے لئے کسی برہان ودلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر بنی اسرائیل کے ایمان ویقین کے لئے ستر آدمیوں کی دوبارہ زندگی یا موجودہ ''عامیل'' نامی شخص کی زندگی کے لئے ایسے ایسے معجزات کی ضرورت ہے، تو باید وشاید، کیونکہ یہ قوم سرکش ومعاند اور منکرِ حقائق ہے۔ الحمدللہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مشاہدوں پر چنداں پابند اور حریص نہیں ہوتی، جتنا کہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات پر۔

ایک خاتون رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے دو بچے وفات شدہ کہاں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ جنت میں ہیں۔ کہنے لگی: الحمدللہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم انہیں دیکھنا چاہتی ہو؟ اگر دکھادوں! کہنے لگی: نہیں! آپ کے ارشاد پر جتنا یقین ہے، اتنا یقین اپنی آنکھوں پر نہیں ہے۔ یہ ہے اصل یقین، جو کہ معجزات ومشاہدات سے مستغنی اور بالاتر ہے۔ یہ خاتون خدیجۃ الکبریٰ تھی رضی اللہ عنہا۔

موت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کے دل میں بجلی کی طرح ایک غیر مرئی کرنٹ رکھا ہے۔ بجلی کی طرح اس کے زوال کا نام موت ہے، اور دوبارہ آنے کا نام حیات بعد الموت ہے۔ یہ صبح وشام کا مشاہدہ ہے۔

البتہ! یہ بات قابلِ غور ہے کہ اثباتِ قتل کے لئے دو عادل گواہوں کا ہونا یا اقرار ضروری ہے، اور محض مقتول کے کہنے سے قتل کا اثبات نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر اسی کے ساتھ وحی الٰہی کی تائید ہو، یا خود قاتل کا اقرار بھی ہو، یا ایسا پختہ اور ناقابلِ تردید علامت اور قرینہ ہو، تو قتل کا اثبات ہوسکتا ہے، جیسے مقتول خون میں لت پت پڑا ہوا، اور خون آلود خنجر کسی کے ہاتھ میں ہو، اور جائے واردات پر موجود ہو، یا وہاں سے بھاگ رہا ہو۔

گائے کے ذبح کرنے میں جو حکمت مخفی ہے، وہ حکمتوں کے خالق کو معلوم ہے۔ البتہ! گوسالہ پرستی اس کی حکمت ہوسکتی ہے، اور اس میں ایک دیندار آدمی کی گائے کی فروخت اور اس کی حوصلہ افزائی کا راز بھی مضمر ہے۔ واللہ أعلم وهو الحكيم العليم

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيۡنَ ذٰلِكَ ؕ فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾

ترجمہ: درخواست کیجئے! ہمارے لئے اپنے ربّ سے کہ ہم سے بیان کرے (بتادے) کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف وعلامات ہیں؟ ﴿۶۸﴾ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں فرماتے ہیں) کہ وہ ایک بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو، اور نہ بچہ ہو (مطلب یہ ہے کہ بہت بوڑھا ضعیف وناتوان نہ ہو، جس میں سلسلۂ نسل منقطع ہو، اور صغیر السن، نہایت بچہ بھی نہ ہو، جس میں ابھی تک مادہ نسل موجود نہ ہو) بلکہ ان دونوں کی درمیانی حالت میں ہو (یعنی جوان ہو، اور قابلِ نسل بھی ہو) اب کرو جو تمہیں حکم دیا گیا ﴿۶۸﴾

یعنی اللہ تعالٰے کے حکم پر عملی اقدام کرو، مزید ٹال مٹول سے کام مت لو۔ اس کلمہ میں امتثالِ امرِ الٰہی پر ترغیب وتحریض ہے، اور بار بار سوال کرنے پر تہدید وتوبیخ ہے۔

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾

ترجمہ: وہ کہنے لگے ہمارے لئے اپنے ربّ سے دریافت کرو کہ ہمیں اچھی طرح سمجھادے کہ اس کا کیا رنگ ہے؟ (موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد گائے ہے، اور اس کا رنگ خوب گہرا (چمکدار) ہے، دیکھنے والوں کو خوش کرتا ہو ﴿۶۹﴾

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے فاقع کے معنی گہری زردی کے ہیں۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا زردی سیاہی مائل مراد ہے۔ مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول راجح ہے۔ وہ رنگ اتنا عمدہ ہے کہ دیکھنے والوں کو بھلا، اچھا معلوم ہوتا ہے۔

قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ؕ وَاِنَّاۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾

ترجمہ: سو وہ بولے: اپنے ربّ سے دعا کیجئے کہ ہمارے لیے صاف بیان کردے، وہ گائے کیسی ہے؟ بیشک گائیوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا، اور اللہ چاہے تو ہم راہ پاجائیں گے ﴿۷۰﴾

یہ پہلے ہی سوال کا تکرار ہے، جو مزید انکشاف کی طلب کے لئے ہے۔ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ہمیں گائیوں میں شبہ پڑ گیا۔ یہ مکرر سوال کرنے کا عذر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن صفات کی گائے ارشاد ہوئی ہے، اس جیسی

گائے بکثرت پائی جاتی ہیں، اس لئے ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی گائے سے ہمارا مقصود حاصل ہوگا۔ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اور ہم ضرور ان شاء اللہ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جائیں گے، اور اپنے مطلب میں کامیاب ہو جائیں گے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ
لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۚ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

ع

ترجمہ: موسیٰ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وہ ایک گائے ہے جو (عام گایوں کی طرح ہے، وہ) نہ تو محنت والی ہو، نہ ہل میں چلی ہوئی ہو، جس سے زمین جوتی جاوے، اور نہ (کنویں میں جوڑی گئی ہو کہ) اس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، غرض ہر قسم کے عیب سے سالم ہو، اور اس میں کسی طرح کا کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ (یہ سن کر) کہنے لگے کہ ہاں! اب آپ نے پوری (صاف واضح) بات بتادی۔ (القصہ گائے تلاش کر کے خرید لی) پھر اس کو ذبح کیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔ ﴿۷۱﴾

یعنی ان کے بار بار پوچھنے اور آپس میں اختلاف کرنے، یا اصل قاتل کے ظاہر ہونے سے جو رسوائی ہوتی، اسی کے خوف سے یا ایسی صفات کی گائے نہ ملنے کے سبب یا اس کی قیمت کی گرانی سے یا ان کی ہٹ دھرمی اور نافرمانی وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ گائے ذبح نہ کریں گے۔

ضروری الفاظ کے معانی:

"فارض" بہت بوڑھی گائے کو کہتے ہیں، عمر رسیدہ، خستہ، جو بچہ دینے سے رہ گئی ہو۔ "بکر" ابتدائی نوجوان گائے، جو بچہ دینے کی عمر کو نہیں پہنچی ہو۔ "عوان" متوسط گائے، یعنی ان دونوں کی درمیانی عمر، جو ایک دو بچوں کی ماں کی عمر میں ہو۔ "صفراء" زرد رنگ کی گائے، اور "فاقع" خوب گہرا زرد رنگ سیاہی کی طرف مائل۔ "فاقع صفراء" کے لئے تاکید ہے۔ "ذلول" جفاکش اور محنت والی۔ "تثیر" زمین جوتنے والی جو ہل چلانے اور زمین ہموار کرنے کے معنی میں ہے۔ "تسقی" پانی پلانے، یعنی وہ گائے جو کنویں سے پانی نکال کر کھیتی کی سیرابی کی خدمت کرتی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ کم عمر بچہ، بلکہ نوجوان اور درمیانی عمر کی ہو، اس کا رنگ گہرا زرد تیز چمکدار ہو۔ اسی طرح محنت کش بھی نہ ہو، جو ہل میں چلی ہوئی ہو، جس سے زمین جوتی جائے، نہ کنویں میں جوڑی گئی ہو، جو آبپاشی پر (زراعت) کے مامور اور باندھی گئی ہو۔

وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝ فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝

ترجمہ: جب تم نے ایک جان (انسان) کو قتل کیا، پھر ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے۔ مگر اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والے ہیں اس چیز کو جو تم چھپاتے ہو۝ پس ہم نے حکم دیا کہ گائے کے گوشت کا ایک حصہ (ٹکڑا) اس مقتول کی لاش پر مارو، (چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وہ مقتول زندہ ہوکر اپنے قاتل بھتیجے کا نام بتا دیا، اور فوراً مر گیا۔ فرمایا: نتیجہ یہ ہوگا کہ قاتل معلوم ہوگا) اس طریقے سے اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا، اور اپنی (قدرت کی) نشانیاں تمہیں دکھادے گا، تاکہ تم سمجھ لو۝ (جس سے تم عبرت سیکھو، تاکہ تم غور وفکر کر کے سوچو، اور ان آیات کے پیش نظر آخرت پر یقین کرو)۔

معارف ومنازل

یہ ہے وہ اصل واقعہ جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ بظاہر اس حصہ کو مقدم ہونا چاہئے تھا، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کو پہلے رکھا گیا، اور اس واقعہ کو مؤخر کیا گیا ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، گائے کی تلاش شروع ہوئی، جب وہ دستیاب ہوئی، تو مالک نے اس کے وزن کے برابر سونے کی قیمت مقرر کی۔ بالآخر خرید کر اسے ذبح کیا، گوشت کا ٹکڑا میت کے جسم پر لگالیا گیا، وہ جی اٹھا، زندہ ہوکر اپنے قاتل کا نام بتادیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ خود قاتل مجمع میں قریب کھڑا تھا، اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میرا قاتل ہے، اور قتل کی وجہ بھی بتادی، پھر فوراً مر گیا، اور خاموش ہوگیا۔

اس چیز میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ گائے کا کونسا حصہ تھا جو مردہ پر مارا گیا؟ بعض روایات میں دُم، بعض میں زبان، بعض میں قلب بیان کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم ہر اس چیز کو بیان کرتا ہے جس میں لوگوں کی کوئی خاص دینی منفعت ہو۔ غیر ضروری چیزوں کو نہیں بیان کرتا، یہاں بھی ﴿بِبَعۡضِهَا﴾ کہہ کر اس کی وضاحت نہیں کی، کیونکہ تعیین میں کوئی مذہبی اور دینی فائدہ وابستہ نہیں، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں کسی درخت کی نشاندہی نہیں کی گئی، اسی طرح دیگر بہت سے امور میں بھی یہی حال ہے۔

بہرحال! یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا، اس کی حکمتوں کا ہم احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ معجزانہ طریقے کا ایک حکم تھا، جس پر عمل ہونے کے بعد یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہوا۔ گائے کے گوشت میں کوئی ایسی تاثیر نہیں ہے، جس سے کوئی مردہ زندہ ہو۔

قصاب روزانہ ہزاروں گائے ذبح کرتے ہیں، جن میں کوئی ادنیٰ معمولی تاثیر بھی نہیں دیکھتے، اور نہ کسی گوشت میں ایسی کوئی خصوصیت رکھی ہوئی ہے۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے بحر قلزم شق ہوا، پھر عصا کے مارنے سے پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، یہ معجزات تھے۔ اسی طرح گائے کا واقعہ آپ علیہ السلام کا معجزہ تھا، جس سے مردہ نے زندہ ہوکر اپنے قاتل کی نشاندہی کی، اور منکرین پر حجت تمام ہوئی۔ مردوں کو معجزات کے ذریعہ زندہ کرنا، یا بغیر کسی واسطہ وذریعہ کے ایک یا ستر، یا ہزار، یا لاکھوں کروڑوں، یا اربوں کھربوں کو آنِ واحد ''فرمانِ واحد'' ایک کلمہ کُن سے پیدا کرنا رب العزت کے لئے نہایت آسان ہے۔ اسی بات پر پورے عالمِ اسلام کا ایمان ہے۔ **الحمدللہ رب العلمین ونحن علی ذلک من الشاھدین**

❁ ❁ ❁

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ
مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ
الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۷۴

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، پس وہ پتھروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت ہیں، اور بیشک بعض پتھروں میں سے البتہ کچھ وہ ہیں کہ جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں، اور بیشک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گر پڑتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سبحانہ ان کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۝۷۴

معارف ومنازل

بنی اسرائیل کی چالیس کے قریب برائیوں اور بیماریوں کا شروع میں بیان (اجمالاً) ہوا۔ گزشتہ آیات میں بھی چند برائیوں کا تفصیلاً ذکر ہو۔ اور بعض دیگر برائیوں کا ذکر آئندہ آئے گا۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام برائیوں کا نتیجہ بیان فرمایا ہے۔ قساوۃ قلبی، بنی اسرائیل کی طرف سے کتمانِ حق، ناشکری، بےادبی وبے انصافی، ایذاء الرسل، بچھڑے کی پرستش، قانون کی خلاف ورزی، قتل انبیاء علیہم السلام وغیرہ، یہ تمام ایسی بیماریاں تھیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل سخت ہو گئے۔

دوسرے مقام پر ان کی قساوتِ قلبی کا یوں تذکرہ ہے: ﴿فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً﴾ [المائدة:۱۳] یعنی (بنی اسرائیل کے عہد و پیمان توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت بھیجی، اوران کے دلوں کو سخت کر دیا)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ بہت سارے برے کام کرتے تھے۔منجملہ یہ کہ: ﴿يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [المائدة:۱۳] اللہ تعالیٰ کے کلام کو اپنے مزاج کے مطابق تحریف کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے قساوتِ قلبی جیسی لاعلاج لعنت میں گرفتار ہوئے، اوران کے فہم بھی الٹ گئے، اور تمام دینی اقدار کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ہر قسم کی برائیوں اور بداعمالیوں پر راضی اور خوش ہوئے، اور فخریہ طور پر کہنے لگے: ﴿قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ﴾ [البقرة:۸۸] (ہمارے دل غلاف میں ہیں)۔یہی وہ تازیانۂ عبرت اور غضبناک چابک ہے، جہاں لگ جائے، تو ﴿بَلۡ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ﴾ [المطففين:۱۴] (ہرگز نہیں! بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے) کا المیہ پیدا ہوگا، اور قلوب و باطن ناکارہ و ماؤف ہو جاتے ہیں۔

دل اوراس کی حقیقت:

دل کیا ہے؟ دل حجم اور بناوٹ کے اعتبار سے بہت ہی چھوٹا، نرم و نازک عضو ہے، لیکن کارکردگی کے اعتبار سے دنیا کی کوئی مشین اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ دل نرم و نازک گوشت اور پٹھوں سے بنا ہوا ہے۔ دل میں چار خانے ہیں: دو اوپر، دو نیچے۔ دل ایک منٹ میں ۷۲ مرتبہ دھڑکتا ہے، اور ایک گھنٹے میں چار ہزار تین سو بیس مرتبہ، اور ایک دن میں ایک لاکھ تین ہزار چھ سو اسی مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اور اتنی ہی دفعہ دل کے دونوں وال کھلتے اور بند ہوتے ہیں، اور یومیہ (بحالت تندرستی) دو ہزار گیلن خون پمپ کرتا ہے اور ساٹھ سال میں تقریباً چار لاکھ ٹن خون پمپ کر چکا ہوتا ہے۔

پوری زندگی، یعنی پیدائش سے لے کر موت تک مسلسل بیدار رہتا ہے، اور اپنی حرکت کو جاری رکھ کر ایک منٹ بھی آرام نہیں کرتا، اور مسلسل خدمت انجام دیتے ہوئے کبھی کوئی تھکاوٹ بھی محسوس نہیں کرتا، کیونکہ اسے مرکزِ تجلیاتِ الٰہیہ کا مقام و شرف حاصل ہے، جو کہ ﴿لَا تَأۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ﴾ [البقرة: ۲۵۵] والی صفت کا تقاضا ہے۔ پس عالم صغیر میں یہی عرش الرحمن اور مرکزِ تجلیاتِ ربانی ہے، اسی بنیاد پر وہ سلطان البدن (بادشاہ) بدن ہے۔

اس کی موٹی صفات صرف دو ہیں: صلاح اور فساد، جسے صحیحین کی حدیث نے بیان کیا۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: ألا إن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح

الجسد کله۔ (یہ دل کی پہلی اور اعلیٰ صفت ہے) وإذا فسدت فسد الجسد کله۔ (یہ دل کی دوسری اور ردی صفت ہے) ألا وھي القلب۔ [متفق علیه]

اول مثال قلبِ سلیم کی ہے، جو کہ مؤمنین، اہلِ توحید کی ہے۔ پھر اس کے بہت سے مراتب ہیں۔ اول قلوبُ الانبیاء علیہم السلام کا مرتبہ، جسے قلبِ سلیم کہتے ہیں۔ دوسرا مرتبہ قلبِ سالم کا ہے، ادنیٰ مرتبہ، جو کہ عامۃ المؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے، علیٰ حسب المراتب، وھو القلب الفھیم۔

قسمِ دوم جو کہ قلبِ سقیم کے نام سے مشہور ہے، وہ کفار، فجار، منافقین کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ قلبِ مریض بھی ہے، اور ردی بھی، حتیٰ کہ عام جانوروں کے قلوب سے بھی کمتر اور بدتر ہے۔ یہی قلب عرش الشیاطین و مرکز الکفر و النفاق و الفجور ہے، جس کے متعلق قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] (ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ بالکل چار پایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے)۔

جہاں قلب، قلب ہی نہ رہا، وہاں اس کے فساد نے دوسرے جوارح کو بھی ناکارہ بنا دیا۔ دراصل جس قلب کی سختی اور قساوت کا یہاں قرآن کریم نے حوالہ دیا کہ: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ بنی اسرائیل کے قلوب کی کیفیت ہی ہے، جو کہ انکارِ حق اور مسلسل نافرمانیوں کا نتیجہ ہے۔

اس کے ساتھ یہ واضح ہو کہ قلوب کی صحت و فساد کے مجموعی طور پر جو اسباب قرآن و احادیث میں بیان ہوئے ہیں، ان کی ایک بہت بڑی فہرست ہے۔ مختصراً سمجھنا چاہئے کہ اتباعِ شریعت و سنت سے قلب میں صحت اور سلامتی آجاتی ہے، جبکہ کفر و نفاق اور کثرتِ معاصی سے قلب ناکارہ اور مریض بن جاتا ہے۔ اسی مرضِ قلب کو قساوۃِ قلب سے تعبیر فرمایا، جبکہ قلبِ سلیم میں ایمان اور نرمی، رحمت و شفقت وغیرہ صفاتِ حمیدہ کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں اپنے دل میں سختی محسوس کرتا ہوں، اس کا علاج بتایئے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر دو، غریبوں مسکینوں کی دیکھ بال اور پرورش کرو، انہیں کھانا کھلاؤ۔ [احمد، ترمذی]

دیکھا! حکیم انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہلک مرض کا کیا عمدہ علاج تجویز فرمایا؟ اور واضح فرمایا کہ رحمت و

شفقت علی الخلق ایمان کا نتیجہ اور ثمرہ ہے،اس سے واضح ہوا کہ بے رحمی اور زیادتی قساوۃِ قلب اور سرکشی کا ثمرہ ہے۔ موجودہ زمانہ کا یورپ، امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس کون ہیں؟ یہ لوگ بنی اسرائیل و یہود ہی تو ہیں۔آج سے تین ہزار سال قبل انہیں قساوۃِ قلب کا تمغہ جوملا، وہ آج اس سے کئی درجہ زیادہ اس کے حامل ہیں۔پورے جہاں کو گولہ و بارود کا ڈھیر بنا کر درندوں سے زیادہ بے رحمی کے ساتھ خلقِ خدا کو ہر قسم کے ظلم وستم کا نشانہ بنا کر تباہ کر رہے ہیں، اور لوگوں کو بلاوجہ تڑپا کر ان کی عصمتوں کو لوٹ رہے ہیں۔بڑے بڑے شہروں کو بمباری کر کے کھنڈرات میں تبدیل کر رہے ہیں۔ساتھ ساتھ خود کو امن وانصاف کا علمبردار بھی شمار کر رہے ہیں، اور کچھ نام نہاد مسلمان ان کے حاشیہ بردار ایجنٹ، مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ گرا رہے ہیں۔

جب سے مسلمان قوم نے بابرکت فریضۂ جہاد سے پہلوتہی کی ہے، تب ہی تو مار کھا کر ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔فإلی اللہ المشتکی۔قرآن وحدیث کی تعلیم کو نظر انداز کر کے سارے مسلمان ممالک نے یورپ کی انگریزی تعلیم کو سینے کے ساتھ لگایا۔اب اگر جہاد کرے گا، تو کیسے کرے گا؟ ؎

وہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ ورسم شاہبازی
(اقبالؒ)

﴿ ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ﴾ پھر اس کے بعد تمہارے قلوب سخت ہوگئے۔ہزاروں معجزات اور دلائلِ قدرت نے تمہارے دلوں میں انابت اور نرمی پیدا نہیں کی۔

﴿فَہِیَ کَالۡحِجَارَۃِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَۃً ﴾ تمہارے قلوب پتھر جیسے سخت ہوگئے۔جیسے پتھر میں کیل (میخ) نہیں گھستی، اسی طرح تمہارے قلوب میں حق بات کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت لوہے کی طرح۔حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مرفوعاً یہ الفاظ ہیں کہ چار چیزیں بدبختی اور شقاوت ہیں: (۱) ایک آنکھ کا خشک ہونا، یعنی آنکھ سے آنسو نہ نکلنا۔(۲) دوسرے دل کی سختی۔(۳) تیسرے طویل اور لمبی لمبی امیدیں۔(۴) اور چوتھے دنیا کی حرص، یعنی دنیا کی محبت یہ آخری بیماری تمام معاصی کی جڑ اور بنیاد ہے۔[مظہری] أو بمعنی بل کے ہے۔ ؎

پھول کی پتی سے کٹ جاتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلامِ نرم ونازک بے اثر (اقبالؒ)

پتھر اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے، جسے بے روح و بے جان جمادات کہتے ہیں، اس کے باوجود وہ مسلسل ذکر و عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے۔ پہاڑوں کو دیکھیں! وہ ہمیشہ التحیات کی شکل میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دیگر عمدہ صفات کے ساتھ اور خلقِ خدا کی نفع رسانی میں کوشاں ہیں، مثلاً:

﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام اصحابِ قلبِ سلیم کی مثال ہے۔ فرمایا: بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان میں سے نہریں پھوٹتی ہیں، جن سے مخلوقِ خدا سیراب ہوجاتی ہے۔

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ﴾ اور بعض پتھر ایسے ہیں، جو پھٹ جاتے ہیں، اور ان سے پانی بہہ کر نکلتا ہے۔ یہ مثال ہے ان کی جو اصحابِ قلبِ سالم ہیں۔

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ اور بعض پتھر ایسے بھی ہیں جو اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے خوفِ خدا کی وجہ سے نیچے گر جاتے ہیں، جو خلقِ خدا کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ لوگ انہیں جمع کر کے اپنے لئے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ سبحان اللہ و بحمدہ۔

اللہ رب العزت کا پاکیزہ گھر کعبۃ اللہ شریف بھی ایسے سادہ پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ یہ مثال ہے عام مؤمنوں کی، یعنی اصحابِ قلبِ فہیم کی۔ تفسیر عزیزی، تفسیر مدارک، تفسیر معالم اور دیگر تفاسیر نے لکھا ہے کہ پتھروں کا بلندی سے پستی کی جانب گر پڑنا خشیتِ الٰہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اور درحقیقت یہ پتھروں کا اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ہوتا ہے۔ کیوں نہیں! قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ﴾ [الرحمٰن:۶] (اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں)۔

کائنات کی ہر مخلوق صبح و شام ذکر و تسبیح، قیام و قعود، رکوع و سجود اور التحیات حمد و ثناء میں مصروف ہے، حتی کہ سمندر کا مدوجزر، اور اونچی لہریں اور بلند و بالا موجیں، سب حمد و ثناء کے نمونے اور مناظر ہیں۔ فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الاسراء:۴۴] اللّٰھم اجعلنا من عبادک الذین یسبحون لک باللیل و النھار، واختم لنا بخیر أعمالنا واجعل ثوابہ رضوانک۔ امین

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اخبار کے ساتھ تہدید و توبیخ ہے کہ یاد رکھو! اپنے غلط اعمال سے باز آجاؤ، تمہارے اعمال کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، روزِ قیامت ہر عمل کی سزا و جزا تمہارے سامنے ہوگی۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ
مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا
بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِهٖ عِنۡدَ
رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴿۷۶﴾ اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ﴿۷۷﴾

ترجمہ: (اے اہل ایمان!) کیا تم امید رکھتے ہو کہ (اہل کتاب) ایمان لائیں گے تمہاری بات پر؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا تھا، پھر اس کو بدل ڈالتا تھا، بعد اس کے کہ انہوں نے اسے سمجھ لیا تھا، اور وہ جانتے بھی ہیں﴿۷۵﴾ اور جب وہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے، اور جب وہ الگ ہوتے ہیں ان سے بعض بعض کے پاس تو کہتے ہیں: کیا تم ان (مسلمان) کے پاس ایسی چیزیں بیان کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہر کی ہیں؟ تاکہ وہ ان کے ذریعہ تمہارے ساتھ تمہارے ربّ کے ہاں جھگڑا کریں، کیا تم سمجھتے نہیں؟﴿۷۶﴾ کیا یہ لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ بیشک! اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس کو یہ چھپاتے ہیں، اور جس چیز کو ظاہر کرتے ہیں﴿۷۷﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کا معنوی تعلق گزشتہ آیت: ﴿اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ کے ساتھ ہے، اسے دوبارہ ملاحظہ کیا جائے۔ مطلب یہ کہ یہود کی عام احسان فراموشی اور دوغلا پن وقساوتِ قلبی کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں ان مسلمانوں کو خاص انداز سے خطاب فرما کر بیدار کیا جا رہا ہے، جنہوں نے یہود سے بوجہ ان کے اہلِ کتاب ہونے کے بہت سی توقعات قائم کر رکھی تھیں، اور ان کو مسلمان بنانے کی سعی میں سرگرم تھے۔

اس خطاب سے مقصود یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو سمجھایا جائے، اور تسلّی دی جائے کہ بھلا یہ لوگ کب ایمان قبول کر سکتے ہیں؟ ان کی حالت تو یہ ہے کہ یہ سمجھ بوجھ کر قصداً کلامِ الٰہی میں تحریف کرنے سے چوکتے نہیں، اور احکامِ الٰہی میں تحریف کرنے کو اپنا حق اور ثواب سمجھتے ہیں۔

تحریف سے مراد یہ ہے کہ یا تو الفاظ کو بدل دیتے ہیں، یا معنوی تحریف کر کے غلط تفسیر کرتے ہیں، یا بہ یک وقت دونوں قسم کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر ان کے نفاق کی حالت یہ ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں، تو ایمان کا

دعویٰ کرتے ہیں، اور خوشامد کے طور پر اپنی کتاب کی بعض باتیں بھی تم سے کہہ دیتے ہیں، تاکہ تمہاری ہمدردیاں انہیں حاصل ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ تورات میں نبی آخرزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے یہ آیا ہے، اور قرآن کے متعلق یہ لکھا ہے، اسلام کی حقانیت کے متعلق یہ یہ باتیں توریت میں موجود ہیں، مگر ان باتوں اور وضاحتوں پر وہ خود عمل کرکے ایمان قبول نہیں کرتے ہیں۔

جب یہ منافق اپنے دوسرے ہم مشربوں اور ساتھیوں سے تنہائی میں ملتے ہیں، تو وہ ان کو ڈانٹتے ملامت کرتے ہیں، اور دھمکاتے ہیں کہ ہم لوگوں نے جو باتیں مسلمانوں سے چھپا رکھی ہیں تم وہ سب ان سے خوشامد میں کہہ دیتے ہو، اور اپنی کتاب کی باتیں اور پیش گوئیوں کا ان سے ذکر کرکے اپنے اوپر اتمامِ حجت کرتے ہو۔ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے! اور ہماری ملت کے لئے سراسر نقصان دہ ہے، جیسے کوئی خود کو اپنی چھری سے ذبح کرے۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب قیامت میں پروردگار کے رُو برو تمہارا اور ان کا جھگڑا ہوگا، تو وہ خود تم کو تمہاری باتوں اور شہادتوں سے اور تمہاری ہی کتاب سے قائل اور ملامت کریں گے، اور تم وہاں لاجواب ہو جاؤ گے۔ تم لوگ اتنی صاف واضح بات کیوں نہیں سمجھتے کہ اپنا بھید کسی دشمن کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہئے! خوب عقل سے کام لو، اور ہوشیار رہو۔

بعض مفسرین نے اس جھگڑے اور غلبہ کا تعلق دنیا ہی میں مراد لیا ہے، اور ﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ کے معنی تمہارے ربّ کے پاس نازل کردہ مضمون کے ہیں، أي: من عند ربکم۔ ان کی اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہاری ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مسلمان تم کو مناظرے میں مغلوب اور ملامت ولاجواب کریں گے، اور تم کو یہ کہہ کر قائل کردیں گے کہ دیکھو! یہ مضمون اللہ تعالیٰ کے پاس سے تمہاری کتاب میں آیا ہے، اور خدا تعالیٰ کا یہ نازل کردہ مضمون تمہاری توریت میں موجود ہے: ﴿فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [آل عمران: ۹۳] (لاؤ تورات، اور اس کو پڑھ لو، اگر تم سچے ہو) کارٹ لگائیں گے۔ ابھی مسلمانوں کو تو خبر نہیں ہے کہ ہماری کتاب میں کیا ہے؟ جب تم ہی ان کو بتادو گے، تو وہ بحث ومباحثہ میں اسی بات کو لے کر تم کو قائل کردیں گے، جیسے کسی جانور نے پاؤں زمین پر رگڑ رگڑ کر چرواہے کے لئے چھری نکالی، جس سے وہ خود ذبح ہو، اگر وہ ایسا نہ کرتا، تو چرواہا اس کو ذبح نہ کرتا۔ یہ تقریر نہایت عمدہ اور برموقع ہے۔ واللہ اعلم

یہود اور اس کے ہمنوا مقلدین:

دنیا میں کفر ونفاق کا وہ دور گزر گیا، جب لوگ جہالت اور بے علمی کی وجہ سے کفر وشرک اور نفاق وگمراہی میں

مبتلا رہے۔ موجودہ دور میں جہالت ونادانی کی وجہ سے کسی کفر و بے ایمانی کا نام ونشان بھی نہیں۔ اب کفر وضلالت کی بنیاد صرف ہٹ دھرمی اور بغض وعناد اور ضد ہی پر ہے، اور یہ بات بھی اَظہر من الشّمس ہے کہ سارے کفار ومنافقین اپنے کفر ونفاق اور اپنے مذہب کے بطلان سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنے مخصوص کفریہ معتقدات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کبھی بھی اپنے کفریہ معتقدات تک کسی دوسرے مذہب والوں کو مطلع نہیں کرتے، اور نہ کسی کو وہاں تک رسائی کا موقع دیتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے ہی عوام کو ان معتقدات سے لاعلم اور بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ان کا یہ پنڈورا بکس کھل نہ جائے، اور ہمارے ہی عوام کسی افراتفری کا شکار نہ ہوں۔

اگر علماء یہود کے کردار کو ان کا کوئی سادہ لوح بیوقوف شخص مسلمانوں کے سامنے بیان کرے، یا اپنا کوئی خصوصی کفریہ عقیدہ بیان کرے گا، تو ان کے ذمہ دار مذہبی پیشوا اسے سختی سے منع کریں گے، اور اسے مجرم گرداں کر اس کو خوب ملامت کریں گے، کہ تم نے یہ کیا کیا کہ اپنا ہتھیار دشمن کے ہاتھ میں دے دیا؟ جس سے بآسانی وہ تمہیں شکار کرلے گا، اور بحث ومباحثہ میں لاجواب کرکے ملامت کرے گا۔

یہی حال موجودہ زمانے کے تمام باطل فرقوں کا ہے، جیسے روافض، قبوری فرقہ، مشرک قبر پرست، ہندو، سکھ، پرویزی، قادیانی، ذکری وغیرہ۔ یہ یہودیوں والا طرزِ عمل تقریباً سب میں موجود ہے۔ اگر کوئی غور سے دیکھے اور تحقیق کرے، تو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اسلام اور عقیدۂ اہل سنت والجماعت کے خلاف جتنے فرقے اس وقت وجود میں آئے ہیں، اور غیر اسلامی عقائد ونظریات پر گامزن ہیں، سب یہود اور عیسائی اقوام کی پیداوار ہیں، اور انہی کے عقائد ونظریات کے پرچار میں مصروف ہیں۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ دجالی فتنوں کے لئے راہ ہموار کررہے ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اسلام کے خلاف کوئی ایسا فرقہ نہیں، جس کی جڑیں یہود کے ساتھ مربوط نہ ہوں، ان کے علاوہ ایک ہی طائفہ منصورہ اہل سنت والجماعت کا طائفہ حقہ ہے کہ جن کے سارے عقائد اور اعمال کتاب وسنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں، اور ان کے خیالات اور نظریات کتاب وسنت سے بال برابر بھی ہٹے ہوئے نہیں ہیں۔

وہ اپنے عقائد ونظریات کو طشت از بام، کھلم کھلا خلقِ خدا کے سامنے بیان کرتے ہیں، اور کسی بھی عقیدے کو چھپانے کی کوشش نہیں کررہے، الحمدللہ۔ ان کا ایسا کوئی عقیدہ نہیں ہے جس کے اظہار سے انہیں کبھی شرم وندامت محسوس ہو۔ قوله عليه السلام: "والإثم ما حاك في صدرك وكرهتَ أن يطلع عليه الناس"۔ یہ حدیث ان کے لئے مشعلِ راہ اور دلیل وحجت ہے۔

بخلاف دیگر باطل اورقرآن وسنت سے ہٹے ہوئے نظریات اورفرقوں کے، کہ وہ اپنے عوام وجہلاء تک سے بھی اپنے مخصوص باطل عقائد کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، کہ کہیں یہان پر قیامت قائم نہ ہو، یہاں تک کہ اپنی کتب کے قدیمی ایڈیشنوں سے بہت سی باتیں حذف کر کے جدید ایڈیشنوں میں انہیں جگہ نہیں دی ہے۔ یہ اس کے سوااور کچھ نہیں کہ خدا سے بے خوفی، اور لوگوں سے خوف ان چیزوں کی بنیاد ہے۔

لطف کی بات یہ کہ ان کے عوام جہلاء احکامِ شریعت سے بے بہرہ ہیں۔ مذہبی پیشواؤں نے مزید انہیں اندھیرے میں رکھ کران کے عقائد پرڈاکہ ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ چال انہوں نے اپنے یہودی پیشواؤں سے سیکھ کر خلقِ خدا کو اپنے ذاتی اغراض ومفادات پرقربان کیا ہوا ہے، اور دھڑادھڑ عوام الناس کو اپنے قدموں اور ہر شجر وحجر، مزارات اورزیارت گاہوں پر سجدہ کروار ہے اور جھکا رہے ہیں۔ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!

غضب ہے یہ مرشدان خود بین خدا تیری قوم کو بچائے
بھلا ہمیں ان سے واسطہ کیا یہ اپنا سجدہ کروار ہے ہیں
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوگئے کتنے فقیہان حرم بے توفیق
(اقبال)

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر، دلق اویس وچادر زہرا
(اقبالؒ)

یہی نام نہاد رہبرانِ قوم، جنہوں نے یہود کے علماء سوء، نام نہاد احبار ورہبان کے نقشِ قدم پر چل کر دو تہائی امت کو کٹر مشرک بنا دیا، اور شب وروز حق تعالیٰ کے حضور سجدہ ریزی کی بجائے کمترین، بدترین فقیروں، پیروں، بے نماز سیدوں کی چوکھٹوں پر سجدہ کرایا، چونکہ قرآن حکیم من جانب اللہ محفوظ ہے۔ کسی لفظی تحریف کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ معنوی تحریفات، غلط معانی ومطالب، بے سند وبے بنیاد حکایات واقعات کے انباروں کے انبار، جھوٹے مواعظ وقصص بیان کر کے عوام الناس کے عقیدوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ محض نسبتوں کا رٹ لگا کر سنت نبوی اور بزرگان دین کے اعمال کا مذاق اڑایا۔ ان شاء اللہ! ایسے دشمنان اسلام بدخواہان سنت خیر الانام ﷺ اور بدنام کنندگان بزرگان

ملت کا حشر یہودی علماءِ سوء کے ساتھ ہوگا۔

﴿اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ ان کی ہر اس بات کو جانتا ہے، جو یہ چھپاتے ہیں، اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اچھی طرح اپنی منافقت اور دورخی طرزِ زندگی کو جانتے تھے کہ اہلِ ایمان اور اہلِ کتاب دونوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھ کر ہم کامیاب نہیں ہو سکتے، مگر ان کی عقل وفہم پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور وہ اپنی کامیابی اسی منافقت میں سمجھتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ
لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا
بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴿۷۹﴾

ترجمہ: اور ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو، مگر چند جھوٹی آرزوئیں اور نہیں ہیں، وہ مگر گمان کرتے ہیں﴿۷۸﴾ پس ہلاکت ہے ایسے لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب کو اپنے ہاتھوں سے، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تاکہ خریدیں اس کے ذریعے تھوڑی سی قیمت، پس ہلاکت ہے ان کے لئے جو لکھا ہے ان کے ہاتھوں نے، اور ہلاکت ہے ان کے لئے جو کمایا ہے انہوں نے﴿۷۹﴾

معارف ومنازل

﴿اُمِّيُّوْنَ﴾ سے مراد یہود کے عوام ہیں۔ ''أمي'' اصل میں اس کو کہتے ہیں جسے نہ تو لکھنا آتا ہو، اور نہ وہ کسی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ سکتا ہو۔ چنانچہ یہ بات عام ہے کہ ہر قوم میں کچھ لوگ پڑھے لکھے، عالم اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، جبکہ بیشتر عوام اُمی ناخواندہ ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ اکثر چیزوں میں پڑھے لکھے لوگوں کے تابع ہوتے ہیں۔ بہرحال! یہودی عوام کی حالت یہ تھی کہ وہ چند جھوٹی اور بے سند باتوں پر بھروسہ کر کے بڑے خوش تھے، مثلاً ہم نبیوں کی اولاد ہیں، جنت صرف ہمارے لئے ہے۔ ہم اگر دوزخ میں گئے تو صرف چند یوم بچھڑے کی عبادت کے دنوں جتنے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سفارش صرف ہمارے لئے ہے۔ یہ سب باتیں تخمینی اور اٹکل پر مبنی ہیں، اس لئے اسے ''يَظُنُّوْنَ'' سے تعبیر فرمایا کہ وہ عوام الناس بے علمی کی وجہ سے خیالی

پلاؤ پکانے کے عادی ہیں۔

ان عوام الناس کے بعدان کے علماء اور پڑھے لکھے طبقہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ کتاب کی تحریف کر کے لکھتے تھے، اور پھر اپنے ہاتھ کے محرّف شدہ خود ساختہ باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ کتنا بڑا جرم ہے کہ ایک تو تحریف کا ارتکاب کیا، پھر اس کو اللہ کا کلام باور کرایا؟ یہ گناہ پر گناہ ہو گیا، اور منشاء صرف یہ ہوتا تھا کہ اس کارروائی سے کچھ پیسے اور مال حاصل کریں۔ یہ ہوا تیسرا جرم۔ اس لئے یہاں کلمۂ ویل تین مرتبہ مذکور ہوا، یعنی لوگوں سے رشوت لے کر تین طریقے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کرتے تھے۔

واضح ہو کہ کلام اللہ میں لفظی اور معنوی تحریف کفر ہے، پھر اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا کفر بالائے کفر ہی ہوگا۔ کہاں گیا ایمان؟ بالکل ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے! یہ متعدی بیماری آج کل ہمارے ملک میں عام وباء کی طرح پھیل گئی ہے، علماءِ سوء، سرکاری مراعات یافتہ علماء بڑے زور وشور سے حکام اور عوام کو خوش کرنے کی خاطر شریعتِ الٰہی اور احکامِ خداوندی کو توڑ پھوڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ جب عائلی قانون ایوب خان کے دور میں قرآن وسنت کے سراسر منافی ترتیب دے کر بنایا گیا، تو اس کے بنانے اور مرتّب کرنے والے کوئی پروفیسر یا ماسٹر نہیں تھے، بلکہ یہودی و نصرانی مزاج کے مذہب فروش علماء و عمامہ و جبہ والے لوگ تھے۔

زمن بر صوفی وملا سلامے کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شان در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را
(اقبالؒ)

جامع ترمذی کی حدیث (روایت) سے معلوم ہوتا ہے کہ ویل جہنم کی ایک بہت عمیق (گہری) وادی ہے، جس سے خود جہنم پناہ مانگتی ہے، (روزانہ تین سو مرتبہ)۔

جب اس مضمون کی دونوں آیتوں میں تین مرتبہ لفظِ ویل مکرر آیا، تو مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ جب گناہ متعدد ہو، تو سزا بھی متعدد ہوئی۔ واللہ اعلم

تنبیہ:

﴿ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ پر مفصل کلام آیت کریمہ ﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴾

[البقرة: ۴۱] کے تحت گزر چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۚ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

ع ۱۱

ترجمہ: اور یہودیوں نے یہ بھی کہا کہ ہم کو گنتی کے چند ایام کے سوا دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں۔ (اے محمد!) آپ ان سے فرمایئے، کیا تم نے اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے کوئی وعدہ لے لیا ہے کہ وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا؟ یا ویسے ہی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو؟ جس کا تم علم نہیں رکھتے ﴿۸۰﴾۔ یوں نہیں، بلکہ (تم ہمیشہ آگ میں رہو گے، کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے) جس نے قصداً گناہ کا ارتکاب کیا، اور گناہ کرتا رہا، اور اس کے گناہوں نے اس کو سب طرف سے گھیر لیا، تو ایسے ہی لوگ اہلِ جہنم و دوزخی ہیں، اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۸۱﴾ اور جو لوگ ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، تو یہ لوگ اہلِ جنت ہیں، وہ اس جنت میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۸۲﴾

معارف ومنازل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود کا یہ خیال تھا کہ دنیا کی کُل عمر سات ہزار سال ہے۔ ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن ہم لوگ جہنم میں رہیں گے، اور سات دن کے بعد عذاب منقطع ہو جائے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہم لوگوں نے چالیس دن بچھڑے کی پرستش کی ہے، بس چالیس دن ہی آگ میں رہیں گے، پھر وہاں سے نکال لئے جائیں گے۔ ایک تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ جتنی عمر انہوں نے اس دنیا میں گزاری ہے، اُتنے سال، مہینے، دن دوزخ میں رہیں گے، پھر ہمیشہ کے لئے بہشت جائیں گے۔ [ابن کثیر، تفسیر عزیزی، تفسیر معالم]

دوسرے مقام پر یوں اُرشاد ہے: ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ [البقرة: ۱۱۱] (جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا، مگر جو یہودی ہو، یا نصرانی ہو)۔ بہر حال اس سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں ہیں۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ سب ان کی خام خیالیاں اور خوش فہمیاں ہیں۔ جنت اور دوزخ میں جانے کا یہ اصول ہرگز

نہیں! جو بنی اسرائیل نے خود بنا رکھا ہے۔ یہ سارے ان کے اپنے غلط خیالات اور خوش فہمیاں ہیں۔ [ابن کثیر، وغیرہ]

ایک اجماعی مسئلہ:

آمنت باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر والقدر خیرہ وشرہ والبعث بعدالموت۔ اس مسئلہ میں اجماعِ امت ہے کہ ایمان باللہ میں ذات وجمیع صفات مراد ہیں۔ کسی ایک صفت کے انکار سے بھی کفر لازم آتا ہے۔ اسی طرح ملائکہ اور کتبِ سماویہ میں بھی اجماع ہے کہ کوئی شخص پورے قرآن مجید پر ایمان لائے، صرف ایک آیت یا نصف آیت (بسم اللہ الرحمن الرحیم) کا انکار کرے، تو کفر لازم آئے گا۔ اگر رُسل میں سے ایک پیغمبر کا کوئی منکر ہو، تو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں ہوگا۔ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [الحجر:۸۰] (حجر والوں نے رسولوں کو جھٹلایا)۔ اسی طرح ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ﴾ [الشعراء:۱۰۵] (نوح علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا)۔ ظاہر ہے کہ اصحابِ حجر نے صرف صالح علیہ السلام، اور قومِ نوح نے صرف نوح علیہ السلام کی تکذیب کی ہے، تو ایک نبی کی تکذیب جمیع انبیاء علیہم السلام کی تکذیب شمار ہے، اور یہ مستلزمِ کفر ہے۔

یہود اس لئے کافر شمار ہوئے کہ انہوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کی۔ نیز انجیل اور قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام تسلیم نہیں کیا۔ نصاریٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کے ساتھ ساتھ تورات اور قرآن کریم کی تکذیب کے مرتکب ہوئے۔

اس کے علاوہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹] (بیشک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔ اور ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران:۸۵] (اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین تلاش کرے تو ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا) کے مطابق سابقہ تمام ادیان منسوخ ہوگئے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب کو ایمان لانا ضروری ہوا، لہٰذا یہ مسئلہ واضح اور متفق علیہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے سارے یہود ونصاریٰ غیر مسلم کافر ہی شمار ہوں گے۔ نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے، نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ مزید تفصیل سورۂ بقرہ کے آخر میں، اور سورۃ المائدہ میں دیکھ لی جائے۔

پس معلوم ہوا کہ جنت ودوزخ کا فیصلہ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے، جو ذات پاک جنت ودوزخ کا خالق و مالک ہے، جنت ودوزخ کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ تم یہود کون ہو فیصلہ کرنے والے کہ تم دوزخ میں صرف سات دن، یا چالیس دن رہو گے؟ پھر وہاں سے منتقل ہو کر تم ابدی جنت میں عیش کرو گے؟ ایسا کیسے ہوگا؟

جنت اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضا والا ٹھکانا ہے، اس میں وہ لوگ جائیں گے، جنہوں نے ایمان وعمل صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی رکھا، اور دوزخ اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کا مرکز ہے، اس میں وہ لوگ جائیں گے جن پر غضب ہوگا، جنہوں نے ایمان وعمل صالح کی سعادت حاصل نہیں کی، آخر تم ہی ہوں گے، تم لوگ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی لعنت کے مستحق ہو گئے۔ آگے اسی کا ضابطہ آنے والا ہے۔

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ آپ ان سے فرمادیں: کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد پکڑ رکھا ہے کہ تم ضرور جنت میں جاؤ گے؟ اور یہ کہ تم چند دن سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہو گے؟ وہ کونسا عہد ہے کہ جس کی پابندی اللہ تعالیٰ ضرور کرے گا؟

﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (اور تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے) تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی عہد و پیمان کیا ہوا ہے۔

البتہ! اللہ تعالیٰ نے ایمانداروں کے ساتھ ضرور عہد کیا ہوا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اور اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر، اور اس کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید پر ایمان لائے گا، اور دینِ اسلام کو بطیبِ خاطر قبول کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کے ابدی عذاب سے نجات دے کر ابدالآباد جنت، اور اس کی راحتوں سے نوازے گا۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو ضابطہ جاری فرمایا ہے وہ اٹل اور پختہ ہے، اور وہی اللہ تعالیٰ کا عہد بھی ہے کہ مؤمن اور اعمالِ صالحہ کے عامل کے لئے ابدی جنت ہوگی، اور کافر کے لئے ابدی دوزخ کا عذاب ہوگا۔ یہ ضابطہ بھی ہے اور عہد و وعدہ بھی ہے۔ اب تمہیں خود فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم کس کھاتے اور کس قسم میں ہو؟ ظاہر ہے کہ تم کافر اور ابدی جہنمی ہو، کیونکہ تم نے حضرت محمد ﷺ اور ان کی کتاب و شریعت اور اسلام کی تکذیب کی ہے۔

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ یہ ہے وہ ضابطہ و قانون کہ (جس شخص نے بھی گناہ کمایا، اور اس کے گناہوں نے اسے گھیر لیا وہ دوزخی ہے، جو ہمیشہ اس میں رہے گا)۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جو گناہ آدمی کو گھیر لے گا، وہ تو بڑا گناہ ہی ہوگا، جو چاروں طرف چھا جائے گا، اور یہ گناہ کفر اور شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے مگر وہ گناہوں سے گھیرا ہوا نہیں

ہوتا، جب تک کفر وشرک کا ارتکاب نہ کرے۔قرآن کریم نے فرمایا:﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۵۴] (سب سے بڑے ظالم کافر ہیں)۔نیز فرمایا:﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾[لقمان:۱۳] (بیشک! شرک بہت بڑا ظلم ہے)۔اور پھر وضاحت کے ساتھ فیصلہ کیا:﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾[النساء:۴۸] (مشرک کے لئے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ! شرک کے علاوہ، وہ جسے چاہے معافی دے دے) توبہ کے ساتھ، یا بغیر توبہ کے، کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہے۔

اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے کسی مجرم کو معاف کرے، وہ مالک ہے، اگر سارے جہان کو دوزخ کے حوالے کر دے، وہ ظلم شمار نہیں ہوگا۔اگر پورے جہان کو جنت عطا کرے تو یہ کرم ہی کرم ہوگا۔

آنزا بری از صومعہ دردار گبران افگنی ☆ این راکشی از بتکدہ سر حلقہ رندان کنی

چون و چرا با کار تو عقل زبوں راکے رسد ☆ اے قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

مگر شرک اور کفر جیسے عظیم گناہوں کو معاف نہیں کرے گا۔ہاں! اگر سکرات طاری ہونے سے پہلے پہلے اس نے توبہ کر لی، تو وہ معاف کر دے گا، کیونکہ اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے، جب تک کسی پر موت کے آثار ظاہر نہ ہوں۔حدیث شریف میں وارد ہے: إن الله يقبل توبة العبد مالم يغرغر۔[ترمذي] انسان کی توبہ غرغرہ شروع ہونے سے پہلے مقبول ہے، بعد میں نہیں۔اگر فرعون غرقاب ہونے سے پہلے توبہ کر لیتا، تو بچ جاتا! مگر اس نے دیر کی۔ ابو طالب بدقسمت کو موقع ملا، مگر پیشکش مسترد کر دی۔کیا عجب ہوتا اگر وہ آمادہ ہوتے۔

اے میرے پیارے مسلمان بھائیو! صبح وشام توبہ کرو۔بڑی بے نیاز قدردان درگاہِ رحمت ہے۔ہزاروں گناہوں کو چشمِ زدن میں معاف کر کے تحفہ میں رحمتوں سے نوازتے ہیں۔

ہوسکتا ہے ہمارے اعمال کسی کمی کی وجہ سے مسترد اور غیر مقبول ہوں، مگر دو عمل ایسے ہیں جو کبھی مسترد نہیں ہوتے، ہر حال میں مقبول رہیں گے: ایک چیز توبہ ہے، اور دوسری چیز رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام۔پس خوش قسمت ہے وہ مسلمان جو صبح وشام توبہ اور درود کا التزام کرے۔اللهم وفقنا وارحمنا۔آمین

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ جولوگ ایمان لائے، اور نیک اعمال کئے، یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)۔ضابطۂ نجات کا دوسرا حصہ بیان فرمایا۔نتیجہ ظاہر ہے۔کفر وشرک کی نہ مغفرت ہے، نہ دخولِ جنت،﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾

[الأعراف: ۴۰] کافر کے پاس اگر کوئی گناہ نہ بھی ہو، تب بھی خلود فی النار کے لئے، اور حرمتِ جنت کے لئے اس کا کفر کافی ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے لئے شفاعت کریں گے، تو اللہ تعالیٰ یہی ارشاد فرمائیں گے کہ میں نے کافر پر جنت حرام کردی ہے۔[بخاری] اسی طرح خلود فی الجنۃ کے لئے صرف ایمان کی دولت کافی ہے، اگرچہ عملِ صالح نہ بھی ہو۔ ہزاروں بداعمالیوں کے باوجود مومن دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ گناہوں کی سزا کاٹ کر بالآخر جنت میں داخل ہوگا۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ اصل چیز جنت کے لئے ایمان ہے، اور دوزخ کے لئے کفر و شرک اور نفاق ہے۔

❁ ❁ ❁

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ وَ بِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝۸۳

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو، جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا، اور قرابت داروں کے ساتھ، اور یتیموں کے ساتھ، اور مسکینوں کے ساتھ، اور کہو لوگوں کے لئے نیک بات، اور قائم رکھو نماز کو، اور دیتے رہو زکوٰۃ۔ پس پھر گئے تم (اے بنی اسرائیل!) مگر بہت تھوڑے لوگ تم میں سے، اور تم اعراض کرنے والے ہو۝۸۳

معارف و منازل

ان آیات کریمہ میں جس عہد و میثاق کا تذکرہ ہے، یہ اسی عہد و میثاق کا حصہ ہے، جس کا ماقبل میں تذکرہ ہوا۔ اصولی بات یہ ہے کہ کسی امت کے ہر فرد سے الگ میثاق نہیں لیا جاتا، اور یہ ممکن بھی نہیں۔ اگر نبی علیہ السلام سے عہد و میثاق لیا جاتا ہے، تو یہ پوری امت کے لئے سمجھا جائے گا، پھر سب کے لئے اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ دنیوی امور میں بھی اسی طرح ہی ہوتا ہے، کہ قوم کے بڑوں کا عہد و پیمان پوری قوم کے لئے شمار ہوتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں جن چیزوں کا تذکرہ ہے وہ تمام سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں، جن کی تکمیل ہماری

شریعتِ مقدسہ میں ہوئی، کیونکہ ان امورِ مذکورہ پر کسی بھی شریعت میں ایسا مکمل عمل نہیں ہوا، جس طرح سید الانبیاء ﷺ اور آپ کے جان نثار فرمانبردار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ علیہم اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے علماء، صلحاء، اتقیاء اور صوفیاء کرام نے عمل کیا، اور یہ سلسلہ جزوی طور پر قیامت تک جاری رہے گا۔ ہمارے سرکردہ علماء و محققین کا قول ہے کہ تمام، یعنی سارے انبیاء کرام علیہم السلام کی امتوں میں کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو ابوبکر و عمر عثمان علی اور عشرہ مبشرہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہم پلّہ، اور مرتبہ میں ان کے برابر ہو۔

اس امت میں بکثرت ایسے لوگ پیدا ہوئے، اگر چہ وہ نبی تو نہیں تھے، مگر انہوں نے کام وہی کیا جو انبیاء علیہم السلام نے کیا، اور بتایا۔ اگر یہ امت نہ ہوتی تو کائنات کی تخلیق کا مقصد یقیناً فوت ہو جاتا، اس امت کے سروں پر ربّ العزّت کا ہاتھ ہے، اور اس عظیم ہستی کا ہاتھ ہے، جو صرف اپنی امت کا تاجدار نبی نہیں، بلکہ سارے نبیوں کا نبی بھی ہے۔ جس کا لقب ہے: ''نبی الانبیاء امام الانبیاء''، جو تمام کائنات کا، ملائکہ کا، جنات کا اور پورے جہاں کا نبی ہے۔ آپ ﷺ ہی کے طفیل سے یہ امت خیر امۃ، افضل و اکرم امت ہے۔ اور جنت کی آبادی کا نصف حصہ بھی ہے۔

اللّٰھم ارحم علی أمة محمد صلی اللہ علیه و سلم أجمعین

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَاۗءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ وہ وقت یاد کرو، جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد و میثاق لیا تھا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مختلف اوقات میں مختلف عہد لئے، مگر ان عہود و مواثیق کا مرکزی مسئلہ توحیدِ باری تعالیٰ کا عقیدہ رہا۔ سارے اعمال، خواہ عبادات ہوں، یا معاملات، یا عقائد، پھر قولی ہوں، یا فعلی بدنی ہوں، یا مالی، ان سب کی اصلی بنیاد توحید ہی ہے۔ لاکھوں اعمال ہوں، قولی فعلی، بدنی اور مالی، ہر قسم کی بے شمار طاعات، وہ اس وقت کارآمد رہیں گی، جب توحیدِ خالص کا سایہ ان پر ہوگا، ورنہ تو سب بے کار غیر مفید رہیں گی۔

توحید کا مثبت پہلو یہ ہے: ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ تم خالص اپنے ربّ کی عبادت کرو۔ یہ مثبت پہلو جمالی ہے، اس سے کوئی انتشار اور تفرقہ چنداں پیدا نہیں ہوتا، اور نوعِ انسان اکثر و بیشتر بآسانی اسے قبول کر لیتی ہے، جبکہ اس کا دوسرا پہلو جو کہ منفی بھی ہے، اور جلالی بھی، اور سخت وحشت ناک اور گراں بھی، اور ہر شخص اسے بآسانی قبول بھی نہیں کر سکتا، وہ: ﴿وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا﴾ [النساء:۳۶] (اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ) ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ [البقرة:۸۳] (سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہیں کروگے) ﴿اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ﴾

[هود:۲] (سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو) ﴿اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ﴾ [یوسف:۴۰] (عبادت نہیں کرو گے سوائے اسی کے) ﴿مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ﴾ [الأعراف:۵۹] (تمہارے لئے نہیں ہے اس کے سوا کوئی معبود)

یہ وہ طاقتور ایک لاکھ ایم جی والی دواء ہے، جو عام مریضوں کو ہضم نہیں ہوتی۔ اس کا نام سنتے ہی بیمارانِ توحید بیہوش ہو جاتے اور دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ پھر کسی دواء و انجکشن سے ہوش میں نہیں آتے۔ یہ وہ مستانہ نعرہ ہے جس نے فرعون و نمرود، شداد و قومِ ہود، اور دنیا کے بڑے بڑے عظیم نامور بادشاہوں کے ایوانوں میں زلزلہ، اور ان کے قلوب و حواسِ خمسہ میں رعشہ پیدا کیا، یہاں تک کہ ان کا صفایا ہو گیا۔ نہ ابرہہ رہا، نہ شداد، نہ عاد، نہ ثمود، نہ قومِ نوح، نہ فرعون وقر ہود (نمرود کا لقب ہے) نہ ابو جہل، اور نہ ان کے ہمنوا۔

یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا، اور ابلیسی کارنامے قدم قدم پر کبھی قبروں کا سجدہ، کبھی درختوں کا، کبھی مزارات کا، کبھی بے جان پتھروں اور جاندار سیدوں اور پیروں کا۔ جو منع کرے وہ وہابی، اور جو شرک و بدعت اختیار کرے، اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت و مقابلہ کرے وہ آغا صاحب اور اعلیٰ حضرت۔ **لاحول ولاقوۃ إلا باللہ**

اشعارِ توحید: ؎

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق ☆ زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق ☆ اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو اس سے اپنی لگاؤ ☆ جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر ☆ جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر ☆ کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں ☆ پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں ☆ اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں ☆ شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے ☆ نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں ☆ سمجھ پر ہماری یہ پتھر پڑے ہیں

(حالی)

جہاں ہم نے عیسائیوں کو کافر کہا، جنہوں نے اپنے لئے تین کارساز مانے، وہاں کوئی لاکھوں اولیاء کرام کو اپنا حقیقی کارساز مان کر کیسے مسلمان رہ سکتا ہے؟ مجوسی آگ میں، اور بدھ مت والے ستاروں میں، ہندو بتوں میں کرشمے مان کر کافر ہوئے۔

الغرض! اس مقام پر جس عہد کا ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرو، اور اسی کو نفع ونقصان کا مالک سمجھو، اور جس طرح اس کی وحدانیت ذات کے ساتھ ہے، اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی وحدت کے ساتھ موصوف ہے۔ عزّت وذلّت، غنا وفقر، زندگی و موت، اولاد و بے اولادی، آبادی وبربادی، سب اسی کے حکم اور ارادے سے متعلق ہیں۔ قاضی الحاجات اور مشکلات و مصائب دور کرنے والی وہی ذات پاک ہے۔ بیماری، شفاء وغیرہ سب اسی کے حکم سے آتے اور دور ہوتے ہیں۔ سارا جہاں مل کر انبیاء علیہم السلام واولیاء ایک قطرہ بارش برسانے پر بھی قدرت نہیں رکھتے، اس کے حکم کے بغیر کوئی مکھی مچھر بھی پیدا نہیں کر سکتے، وہ سب اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتے اور سوال کرتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے، سارے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، اور اسی کے قبضے میں ہیں۔

غور کریں کہ سارے جہاں کے اربوں غیر مسلم مل کر ادنیٰ مسلمان کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے، پھر اربوں مسلمان مل کر ایک ادنیٰ صحابی کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتے، پھر سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگر جمع ہوں ایک پیغمبر کے ساتھ برابر نہیں ہو سکتے، پھر سارے انبیاء علیہم السلام اور دیگر تمام مخلوقات، ساتوں آسمان کے نورانی فرشتوں کے ساتھ مل کر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

غالب ثناء خواجہ بہ یزدان گزاشتیم ☆ کان ذات پاک مرتبہ دان محمد ست

اب آپ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں۔ قدم قدم پر عجز ونیاز اور ربّ کریم سبحانہ کے حضور خشوع وخضوع کے ساتھ ہاتھ پھیلا پھیلا کر سوال اور دعا، اور نہایت انکساری کے ساتھ درخواست۔ حجۃ الوداع کے موقع پر کھڑے ہو کر اتنا روئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ترس آیا!

آپ کو روتے ہوئے دیکھ کر وہ حضرات بھی اتنا روئے کہ فرشتوں کو ترس آیا، چنانچہ فرشتے بھی تڑپ تڑپ کر اتنا روئے کہ مالک الملک حضرت حق سبحانہ نے ساری امت کی مغفرت کا فیصلہ فرمایا۔ جب ابلیس کو پتہ چلا، تو

مقامِ عرفات کی مٹی اٹھا کر اپنے سر پر ڈالنا شروع کی، اور ایسا رویا جیسے کوئی مہربان والدہ اپنے نوجوان بیٹے کی موت پر روتی ہے، یا کوئی اونٹنی اپنے بچے کی جدائی پر زار زار روتی اور ماتم کرتی ہے، کیونکہ شیطان اتنی بڑی عمومی مغفرت کو کیسے برداشت کر سکتا تھا؟

اب سوال یہ ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کیوں روئے؟ پانچ چھ گھنٹے کھڑے ہو کر کیوں زار و قطار روئے؟ حق تعالیٰ سے اتنی درخواستیں اور دعائیں کیوں مانگیں؟ اور اپنی امت کے حق میں ہر چیز کا فیصلہ خود کیوں صادر نہیں فرمایا؟ ان سارے سوالات کا ایک ہی جواب ہے، کہ ہر چیز کا دینے والا صرف ربُّ العزّت سبحانہ ہی ہے، وہی مہربان سارے خزانوں کا مالک ہے۔ پیغمبر اور سارے انبیاء علیہم السلام سائل ہیں، اور مسئول عنہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور وہی معطی بھی ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "إنما أنا قاسم واللّٰہ یعطي"۔ [بخاري] دینے والا اللہ تعالیٰ ہے، میں اس کے حکم کے مطابق تقسیم کرنے والا، اور مالِ غنیمت بانٹنے والا ہوں۔ مجھے یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہے کہ کسی کو کم دیدوں، کسی کو زیادہ۔ مجھے جو فرمان ہوگا میں اس کا تابع ہوں۔

عہد و میثاق کا دوسرا حصہ یہ ہے:

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً﴾ یعنی ماں باپ کے ساتھ احسان، ہمدردی اور حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ ۔۔۔ے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [الإسراء: ۲۳] (اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو)۔ اسی طرح: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا﴾ [الأحقاف: ۱۵] (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا)۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا والدین کی رضاء میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے، جو شخص والدین کو ستائے گا وہ جنت میں (ابتداءً) داخل نہ ہوگا۔ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ماں باپ کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آنے سے عمر اور رزق میں اضافہ اور برکت آتی ہے۔ تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جو والدین کے ساتھ احسان کرے۔ [مشکوٰۃ]

بہر حال! والدین کی خدمت فرض بھی ہے، اور موجبِ خیر و برکت بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور توحید کے حکم کے بعد نہایت اہتمام کے ساتھ جس چیز کا تذکرہ اور تاکید فرمائی ہے، وہ والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ

احسان وحسنِ سلوک ہے۔ سعید، جنتی اور نیک بخت، مقرب عند اللہ تعالیٰ وہ خوش قسمت انسان ہے جو والدین کا ادب و احترام اور ان کی خدمت کرے۔

حدیث پاک نے یہاں تک کہا کہ دنیا کے مصائب و پریشانیاں، اور آخرت کی تنگی و وحشت والدین کی خدمت اور دلجوئی سے دور ہو جاتی ہے، اور جو شخص والدین کو ناراض کرے گا، ان کی خدمت نہیں کرے گا، اور ان کی رضا حاصل نہیں کرے گا، وہ مصائب میں مبتلا رہے گا، اور عنایتِ الٰہی سے محروم ہو جائے گا۔

دراصل یہ مسئلہ (خدمتِ والدین) توحیدِ باری تعالیٰ اور اطاعتِ الٰہی کی ایک شاخ ہے۔ عقل و نقل دونوں سے ثابت اور مسلّمات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توحید و ایمان سے بیگانہ کافروں میں بھی اس کی خوبی اور التزام موجود ہے۔ بسا اوقات غیر مسلموں میں بھی دیکھا گیا ہے کہ بہ نسبت عام مسلمانوں کے اپنے والدین کی خدمت زیادہ کرتے ہیں، کیونکہ یہ مسئلہ اگر ایک طرف شرعی ہے، تو دوسری طرف عقلی بھی ہے۔ تیسرے پہلو میں دیکھا گیا ہے کہ جبلّی اور فطری بھی ہے۔ اکثر و بیشتر حیوانات میں بھی اس کا بکثرت مشاہدہ کیا گیا ہے، کیونکہ والدین کی رحمت و شفقت اولاد پر جس طرح مسلمانوں میں ہے، اسی طرح غیر مسلموں میں بھی ہے، اور حیوانات بھی میں اس کا وجود مسلّم ہے۔ پس لامحالہ دوسری جانب سے بھی اس کا ظہور لازمی قرار پایا کہ اولاد بھی والدین کے بارے میں اس کا مظاہرہ کرے۔

اسلامی تعلیمات میں یہاں تک اس کا اہتمام و التزام موجود ہے کہ اولاد اگر مسلمان ہو، اور والدین غیر مسلم ہوں، تو اختلافِ دین کے باوجود سرورِ عالم ﷺ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بنت صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنی کافرہ ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو، اور اسے راضی رکھو۔

جب قرآن حکیم نے والدین کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [الاسراء] (اگر تیرے پاس والدین میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو "اف" (ہوں) بھی نہ کہنا، اور نہ ان کو جھڑکی دینا، اور ان کے ساتھ خوب ادب سے بات کرنا، اور ان دونوں کے لئے اپنی عاجزی سے بازو ان کے نیچے رکھو (ہاتھ تک نہ اٹھاؤ۔ کنایہ ہے غایتِ احترام سے) انتہائی رحم کی وجہ سے، اور ان کے لئے دعا کرو، اور یوں کہو: اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسے انہوں نے میری صغرسنی میں مجھے پالا، اور میری پرورش کی)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمام گناہوں کو اللہ

تعالیٰ چاہتا ہے قیامت پر (اس کے عذاب یا مغفرت کو) ٹال دیتا ہے، سوائے ماں باپ کی نافرمانی کے، کہ اس کی سزا تو مرنے سے پہلے دنیا ہی میں اسی زندگی میں فوراً دے دیتا ہے۔ [مظہری]

ماں باپ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے انعام اور اس کی رحمت ہیں۔ وہ اگر اولاد کے ساتھ ہزار بدسلوکی اور بے رحمی سے پیش آئیں، پھر بھی قابلِ احترام ہیں، کیونکہ ان کے حقوق کوئی تین چار نہیں کہ اولاد ان سے عہدہ برآ ہو۔ ساری زندگی موت تک، بلکہ بعد از موت بھی ان کے حقوق کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کہ جب تک اولاد زندہ ہے، ان کے لئے مغفرت کی طلب کرے، ان کے لئے ایصالِ ثواب (نوافل، صدقات، کارہائے خیر، دعاء وغیرہ) کا سلسلہ جاری رکھے۔ اس کے چار فوائد ہیں:

(۱) وہ قبر میں خوش ہو کر راضی ہو جائیں گے۔ (۲) ان کو ثواب ملے گا، اور رفعِ درجات یا عذاب کی تخفیف کا فائدہ ہوگا۔ (۳) ان کا حق ادا ہوگا، اور جو شخص والدین کے لئے جو کچھ کرے گا، اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد اس کے لئے وہی کچھ انجام دیتی رہے گی۔ (۴) ایسی دعا گو اولاد سے اللہ تعالیٰ راضی ہو کر اس کو جنت اور اپنی خوشنودی عطا فرمائے گا۔ بعض علماء کرام نے فرمایا کہ برّ الوالدین سببِ مغفرت بھی ہے، اور خاتمہ بالخیر اور سکرات الموت کی آسانی کا باعث بھی ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ والدین کے نافرمانوں کی سکرات بہت سخت و پریشان کن ہوتی ہے۔ اللہ ربّ العزّت سبحانہ ہر مؤمن کو اپنی اطاعت اور برّ الوالدین کی توفیق عطا کرے، اور اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ منکوحہ بیوی ہے، اس کی شرارت و شر سے بچائے۔ آمین

﴿وَذِي الْقُرْبٰى﴾ عہد و میثاق کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ بھی نہایت اہم اور موجبِ رضائے الٰہی ہے۔ صلہ رحمی فرض ہے۔ جو شخص صلہ رحمی کرے، رشتہ داروں کو اپنے ساتھ ملا لے، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی رحمتوں کے ساتھ ملا کر اس سے راضی ہوگا، اور جو شخص قطعِ رحمی کر کے رشتہ داروں سے دور رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمتوں سے قطع فرما کر اس سے دور رہے گا۔ [متفق علیہ]

رشتہ دار نسبی ہوں یا رضاعی یا ازدواجی ہوں، پھر محرم ہوں یا غیر محرم، سب کے ساتھ حسنِ سلوک، خیالداری، شفقت و محبت، مالی تعاون، حوصلہ افزائی تلطّف و مہربانی وغیرہ فرض ہے۔ جو شخص احسن طریقے سے ان فرائض کو بخوشی انجام دے گا، اس کی اولاد اور عمر و حیات، مال و رزق، غرض ہر چیز میں برکت آئے گی۔ ہمیشہ تندرست و خوش حال رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ کیونکہ اس نے رضاءِ الٰہی کے ساتھ بہت سی دعائیں کمائیں۔ اگر کوئی ان فرائض میں کمی اور

سستی کرے گا، وہ خوار اور ذلیل ہوجائے گا، اور ہر قسم کی برکتوں اور راحتوں سے محروم رہے گا۔ رشتہ داروں کی ہزاروں دعاؤں اور چاہتوں کو کھو بیٹھے گا، اور خوار ہوجائے گا۔

﴿وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ﴾ یہ عہد و میثاق کا چوتھا حصہ ہے۔ یتیموں، مسکینوں، ناداروں کے ساتھ حسنِ سلوک، بھلائی کا سلسلہ جاری رکھو۔ یتیم وہ نابالغ بچہ ہے جو والدین کے سایہ سے محروم ہو۔ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو، اور اس کے ساتھ اچھا سلوک ہو، اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو، اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک نہ ہو''۔ بزرگوں نے فرمایا: ''جس گھر میں کوئی یتیم نہ ہو، وہ خیر سے محروم ہے''۔ اگر کوئی قیامت میں رحمۃ للعٰلمین ﷺ کا قرب چاہتا ہے، تو چاہئے کہ یتیم کی کفالت و نگہداشت کرے، خاص کر لڑکیوں کی۔

ارشاد فرمایا: أنا و كافل اليتيم كهاتين و أشار بإصبعيه السبابة و الوسطى۔ [متفق عليه] یتیم کی کفالت کرنے والا مجھ سے اتنا قریب ہوگا، جیسی یہ دونوں انگلیاں۔ یتیموں کی کفالت کا اتنا بڑا اجر و ثواب ہے جس کی کوئی حد و اندازہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے۔

جس طرح یتیم کی کفالت کا اجر و ثواب ہے، اسی طرح چوتھے نمبر پر عام مسکینوں، ناداروں، بیماروں اور بے سہاروں اور محتاجوں کی خبر گیری اور حوصلہ افزائی کا اجر و ثواب ہے۔ سبحان اللہ! یہ ہمارے مہربان ربّ کے رحم و کرم کے عجیب و غریب کرشمے ہیں، اور ہمارے لئے امتحان و آزمائش بھی ہیں۔ اسلام نے صرف غریب پروری، مسکین نوازی کا سبق نہیں دیا، بلکہ دشمن پروری اور حیوان پروری کا بھی حکم مرحمت فرمایا۔ ہے کوئی خوش قسمت ہے جو ان اصولوں پر عمل کرے؟

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (اور کہو لوگوں کے لئے اچھی بات) یہ عہد و میثاق کا پانچواں حصہ ہے۔ سبحان اللہ! قرآن کریم کی جامعیت کی نرالی شان ہے۔ سمندر کو ایک انگشتری کے سوراخ میں ڈال دیا۔ اس ایک جملہ کی اگر مکمل تشریح لکھی جائے، ضخیم کتاب تالیف ہوگی۔ امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جملے کا لفظی ترجمہ یہ بیان فرمایا کہ لوگوں سے ایسی اچھی بات کہو، جو تمہیں اپنے لئے پسند ہو، جو بات اپنے لئے پسند نہ کرو، تو دوسروں کو مت کہو۔

یہ ترجمہ صحیحین کی اس حدیث کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اَنْ یحبَّ لِاَخِیهِ مَایحبُّ لِنَفْسِه۔ اسی طرح اِنْ یَکْرَهَ لِاَخِیهِ مَایَکْرَهُ لِنَفْسِه۔ [متفق عليه] سید کائنات فخر موجودات ﷺ نے فرمایا: بعثت لأتمم مكارم

الأخلاق۔آپ ﷺ کی بعثت بھی اسی مقصد کے لئے ہے کہ اشرف المخلوقات انسان کو شرف اور مکارم اخلاق کے زیور سے آراستہ وپیراستہ فرمائے، اور قرآن حکیم کا اصلی موضوع بھی تکمیلِ انسانیت ہی ہے کہ گم گشتہ و بے راہ انسان شرافت و اخلاق، اور علم وعمل کے زیور سے آراستہ ہوکر اپنی اخلاقی تکمیل کے ساتھ اقوامِ عالم کی سرپرستی اور قیادت کرے۔

﴿قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ کی بہت طویل فہرست علماء کرام نے بیان کی ہے، اس کے چند اجزاء کا بیان اجمالی طور پر لکھ دیا جاتا ہے:

(۱) آپس میں ملاقات کے وقت سنت کے مطابق "السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته" کہنے میں پہل کرنا۔(۲) "السلام علیکم" کہنے والے کے جواب میں "وعلیکم السلام ورحمة الله وبرکاته" سنت کے مطابق جواب دینا۔(۳) آنے والے مہمان کا خیر مقدم کرنا، اور آیئے تشریف لایئے جیسے الفاظ کہنا وغیرہ۔ (۴) مجلس میں بات کرتے وقت نرم لہجہ میں بات کرنا۔(۵) مجلس میں چیخ چلا کر بات کرنے سے اجتناب کرنا۔ (۶) مجلس میں کوئی ایسی بات نہ کہنا جس سے کسی کی دل آزاری ہو، وغیرہ۔(۷) بات کرتے وقت لب ولہجہ نرم رکھنا۔ (۸) گالی گلوچ، بدزبانی سے کلیۃً پرہیز کرنا، وغیرہ۔(۹) اپنے مسلمان بھائیوں کو نرمی کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنا، اور نصیحت کرنا۔(۱۰) کسی آدمی کو برے نام اور برے لقب سے یاد نہ کرنا۔(۱۱) اگر کسی کو آواز دینا مقصود ہو، یا بلانا ہو، تو چیخ کر آواز دینے سے اجتناب کرنا۔(۱۲) مجلس میں معیوب اور بے ادبی کے الفاظ کہنے سے پرہیز کرنا، ایسے وقت کنایات سے کام لینا۔(۱۳) کسی کی غیبت اور ہر طرح کے بہتان اور الزام تراشی سے اجتناب کرنا وغیرہ۔(۱۴) اگر کسی مصلحت کے تحت سختی سے بولنا ہو، تو اعتدال کو ملحوظ رکھنا۔(۱۵) مریض کی عیادت میں کوئی ایسی بات کہنے سے اجتناب کرنا جس سے کوئی ناامیدی پیدا ہو، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرنا۔(۱۶) کسی بھی مجرم کی حوصلہ افزائی نہ کرنا، اور اچھے کام کرنے والے کی حوصلہ شکنی نہ کرنا۔(۱۷) کوئی آپ سے مشورہ طلب کرے تو برحق اور صحیح مشورہ دینا، خیانت سے پرہیز کرنا۔(۱۸) اپنا حق کسی قرضدار وغیرہ سے وصول کرنا ہو، تو حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا۔ (۱۹) اگر کوئی آپ سے اپنا حق مانگ رہا ہو، تو نرمی کرنا، اس کی حوصلہ شکنی نہ کرنا۔(۲۰) اگر آپ وعظ کر رہے ہوں، تو نامناسب ہنسی مذاق کی باتیں کہنے سے اجتناب کرنا۔(۲۱) ہر کام میں افراط وتفریط معیوب ہے، راہِ اعتدال کا انتخاب کرنا۔(۲۲) مجلس میں اندازہ کے ساتھ بولنا، دوسروں کو بھی بولنے کا موقع دینا۔(۲۳) مردوں کی محفل میں عورتوں کے عیوب ونقائص اور مخصوص حالات کا تذکرہ نہ کرنا۔(۲۴) کسی قابلِ قدر ہستی کا تذکرہ کرنا ہو تو اس کے

منصب کے خلاف پردہ دری سے اجتناب کرنا، اگرچہ آپ کا مخالف ہو۔(۲۵) بڑوں کی مجلس میں ان کی اجازت کے بغیر اندھادھند بولنے سے پرہیز کرنا۔(۲۶) اگر وعظ ونصیحت کی محفل کے سامعین میں عورتیں ہوں، تو بہت ہی احتیاط کرنا نہایت ضروری ہے۔(۲۷) مجلس میں اہلِ حق پر لعن وطعن اور فساق وفجار کی مدح وثناء سے اجتناب کرنا۔ (۲۸) حکام، امراء، وزراء اور بے انصاف لوگوں کی تعریف وثناء سے اجتناب کرنا۔(۲۹) اگر کسی موقع پر حق بات کہنے سے جان ومال وعزّت کا نقصان یقینی ہو، تو سلامتی کا راستہ اختیار کرنا۔(۳۰) مساکین وفقراء، یتیموں اور محتاجوں کی حوصلہ افزائی کرنا، اگر مالی مدد کی گنجائش نہ ہو، تو زبانی حوصلہ افزائی کرنا۔

اس کے علاوہ اور بہت ساری باتیں ہیں جنہیں کتبِ اخلاق وسنت میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔

﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ یعنی (قائم کرو نماز کو، اور ادا کرتے رہو زکوۃ) یہ دونوں اہم عبادتیں ہیں۔قرآن مجید میں ان دونوں کا اکٹھا ذکر بتیس (۳۲) مرتبہ آیا ہے۔نماز بدنی عبادتوں کی سردار ہے، اور قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے نماز سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے۔ ہر عبادت کی فرضیت زمین پر ہوئی، جبکہ نماز کی فرضیت اوپر عرش معلیٰ پر ہوئی۔ ہر عبادت کی فرضیت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا واسطہ رہا، نماز کی فرضیت براہ راست بلاواسطہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے ہوئی۔ ہر فرض عبادت کی ادائیگی کے لئے لمبا وقفہ مقرر ہے۔مثلاً صوم وزکوٰۃ کے لئے سال کا وقفہ، حج کی فرضیت پوری عمر میں ایک مرتبہ ہے۔لیکن نماز وہ بابرکت فریضہ ہے، جس کے لئے چند گھنٹوں کا وقفہ مقرر ہے۔رات دن میں یہ ناکارہ ظلوم وجہول بندہ، پانچ مرتبہ اپنے مالک کے حضور حاضری دیتا ہے، اور مناجات کی سعادت حاصل کرتا ہے۔کتنی بڑی خصوصیت وکرامت ہے، جس کی ادائیگی میں فوز وفلاح اور روحانی ترقیوں کی معراج ہے، اور اس کے ترک میں کفر ومفارقت کا خطرہ مضمر ہے۔پوری تفصیل سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ تمام مالی عباداتوں کا سرچشمہ ہے، جس میں رضائے الٰہی کے علاوہ غرباء ومساکین، یتیموں، محتاجوں کی سرپرستی اور دلجوئی ہے، یہ کتنی اہم اور باریک عبادت ہے، جس سے بخل جیسی لعنت کا خاتمہ ہوگا، اور مفلوک الحال بندوں کی سرپرستی ہوگی۔

حدیث قدسی میں فرمایا: مجھے مفلوک الحال، شکستہ دل اور پریشان فقراء ومساکین کے پاس تلاش کرو، اور لطف یہ کہ سارے انبیاء علیہم السلام انہی فقراء ومساکین کی محفلوں کے روشن وچمکدار چراغ رہے۔ فصلوات اللہ

وسلامه علیھم۔سورۃ المائدہ میں بنی اسرائیل سے یہی فرمایا:﴿لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللہَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾[المائدۃ: ۱۲] (اگرتم نماز قائم کرتے رہوگے، اورزکوٰۃ ادا کرتے رہوگے، اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤگے، اوران کی مدد کروگے، اورقرض دوگے، اللہ تعالیٰ کواچھی طرح کا قرض! توالبتہ دور کردوں گا میں تم سے گناہ تمہارے، اورداخل کروں گاتم کو باغوں میں کہ بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں)۔

مگرنافرمان اورعہدومیثاق کوتوڑنے والی بنی اسرائیل قوم نے اس کی کوئی پروانہیں کی۔اللہ تعالیٰ کے احکامات کوترک کر کے ضدوعناد پر قائم رہ کرتمام عہودومواثیق کوچھوڑ دیا،توارشادہوا:

﴿ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ﴾ (پھرتم پھرگئے)۔

﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ﴾ مگرتم میں سے بہت تھوڑے ایسےلوگ تھے،جواس عہدومیثاق پرقائم رہے۔

﴿وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (اورتم اعراض کرنے والے ہو)۔تمہارے آباءواجداد نے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کیا،اورآج بھی تم ان کے نقش قدم پرچل کراعراض کررہے ہو۔تمہیں پتہ نہیں کہ اس اعراض کانتیجہ تمہارے حق میں کتناتباہ کن ہوگا،اورتمہاراحشرکتنابرااورعبرتناک ہوگا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ۝۸۴ ثُمَّ اَنْتُمْ ھٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْکُمْ مِّنْ دِیَارِھِمْ ۡ تَظٰھَرُوْنَ عَلَیْھِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۸۵ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ۡ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ۝۸۶

ترجمہ: اوراس واقعہ کو یاد کرو،جب ہم نے تم سے پختہ عہدلیاتھا،کہ آپس میں خونریزی نہ کروگے،اورنہ ایک

ع ۱۰

دوسرے کو اپنے شہروں سے نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا، اور تم اس پر گواہ ہو۞ پھر تم وہی ہو جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو، اور نکالتے ہو تم ان کو وطنوں سے، اور تم چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ، اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں، تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کا نکالنا بھی تم پر حرام ہے۔ کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لاتے ہو؟ اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پس جو کوئی ایسا کرتا ہے تم میں سے، تو اس کا بدلہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے، اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان باتوں سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو۞ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خرید لیا ہے، پس ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی ان کی مدد کی جائیگی۞

معارف ومنازل

مدینہ منورہ میں قبل از اسلام تقریباً پانچ قبائل آباد تھے۔ دو خالص عرب تھے، یعنی اوس اور خزرج۔ تین قبائل یہود تھے، یعنی بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع۔ ان قبائل میں مختلف اوقات میں لڑائیاں ہوتی تھیں۔ عرب آپس میں بھی لڑتے تھے، اور یہود کے ساتھ بھی لڑتے تھے۔ اسی طرح یہود آپس میں بھی لڑتے تھے، اور اوس وخزرج کے ساتھ بھی لڑتے تھے، کیونکہ ان کے آپس میں معاہدے ہوتے تھے، اور عہد شکنی پر لڑتے تھے، چنانچہ اوس اور بنو قریظہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔

جب ان قبائل میں جنگ ہوتی تھی، خواہ اوس وخزرج کے درمیان ہو، یا بنو قریظہ و بنو نضیر کے درمیان ہو، تو ان کے حلیف اور معاہد لوگوں کو بھی لڑنا پڑتا تھا۔ اوس لڑتا تو بنو قریظہ ان کے ساتھ ہوتا، اسی طرح بنو قریظہ لڑتا تو اوس ان کے ساتھ ہوتا۔ اگر خزرج لڑتا تو بنو نضیر ساتھ ہوتا۔ اگر بنو نضیر لڑتا تو خزرج ان کے ساتھ ہوتا۔ ایسے ہی یہود کبھی آپس میں، اور کبھی اپنے حلیفوں کی خاطر لڑائیاں لڑتے تھے۔ ایک دوسرے کو قتل کرتے، جلاوطن کرتے، پھر فدیہ دے کر یہودی قیدیوں کو چھڑا لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے توریت میں یہودیوں کو تین حکم دیئے تھے:

(۱) ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ (۲) ایک دوسرے کو جلاوطن نہ کرو۔ (۳) اپنے گرفتار قیدی بھائیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لو۔ یہ لوگ توریت کے اول و دوم حکموں کی دیدہ و دانستہ مخالفت کرتے تھے۔ براہِ راست یا

اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر قتل بھی کرتے تھے، اور جلاوطن بھی کرتے تھے۔ البتہ! تیسرے حکم پر سختی سے عمل کرتے تھے، اسی کو فرمایا کہ تم توریت کا کچھ حصہ مانتے ہو، اور کچھ حصہ نہیں مانتے! تمہیں چاہئے تھا کہ توریت کے تینوں حکموں کو مانتے، اور ان پر عمل پیرا ہوتے، تو توریت کی رو سے تم کافر ہو گئے، اور قرآن حکیم کی رو سے تم اس لئے بھی کافر ہے کہ تم نے جناب نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا۔ قرآن حکیم کی تکذیب کی، اور اسلام سے منحرف رہے۔

تو یہاں یہود کے کفر سے مراد کفرِ حقیقی ہے۔ تہدید وتوبیخ مراد نہیں۔ فرمایا:

﴿وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ﴾ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے، یعنی اپنے دوستوں، یہودیوں، اہلِ ملّت والوں کی خونریزی اور قتل نہیں کرو گے۔ یہ خونریزی اور قتل وقتال جس طرح ہماری شریعت میں حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، اسی طرح شریعتِ موسوی میں بھی اپنی ملّت والوں کا قتل حرام تھا۔ البتہ! جہاد کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے۔ کما ھو الظاھر [عزیزی]

﴿وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ﴾ تم اپنے مسلک وملّت کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے، جلاوطن نہیں کرو گے۔ یہ دوسرا حکم تھا جس کی یہودیوں نے مخالفت کی، حالانکہ تم نے اقرار بھی کیا، اور ابھی بھی تم اس پر گواہ ہو۔

﴿ثُمَّ اَنۡتُمۡ ھٰۤؤُلَآءِ﴾ یہ تم ہی تو ہو کہ اقرار وتسلیم کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکموں کے توڑنے اور مخالفت پر متواتر کمربستہ وآمادہ ہو۔ قتل بھی کرتے رہتے ہو، اور جلاوطن بھی کرتے ہو، اور تم اپنے بھائیوں پر چڑھائی بھی کرتے ہو، گناہ اور تعدّی کے ساتھ، کیونکہ یہ قتل وغارت گناہ بھی ہے، اور مظلوموں کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی بھی ہے۔ یہ سارے اِثم وعدوان ہی ہیں۔

﴿وَاِنۡ یَّاۡتُوۡکُمۡ اُسٰرٰی﴾ جب تمہارے یہی بھائی قیدی ہو کر تمہارے پاس آتے ہیں، تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، انہیں گھروں سے نکال کر نہیں شرماتے، اب چھڑانے پر تیار ہو گئے۔

﴿وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیۡکُمۡ﴾ حالانکہ ان کا وطن سے اخراج بھی تمہارے اوپر حرام تھا، جس کا تم نے لحاظ نہیں کیا۔ یہود آپس میں کہتے تھے کہ قیدی اگر ہمارے پاس آجائے، تو اس کی خلاصی فرض ہے، اسے قید سے نہ چھڑانا خلافِ شریعت بھی ہے، اور ہمارے لئے بے شرمی کا باعث بھی۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ یہی بات قتل وجلاوطن کی صورت میں بھی ہے، مگر یہ تفریق کیوں کرتے ہو کہ کچھ مانو اور کچھ نہ مانو؟ یہی سراسر کفر اور احکامِ الٰہی سے انحراف وانکار ہے۔

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ﴾ کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو، اور بعض کا انکار کر دیتے ہو؟

﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ﴾ تم میں سے ایسا کرنے والوں کی جزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ:

﴿اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ دنیا میں ان کی جزا ذلّت و رسوائی ہوگی۔

﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ اور قیامت کے روز سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہود کے سارے قبائل جزیرۂ عرب سے ذلّت و خواری کے ساتھ نکالے گئے۔ باقی رہا معاملہ قیامت کا، وہ ہماری نظروں سے غائب ہے۔ وہ ابھی عین الیقین کے درجہ میں نہیں ہے۔ البتہ! قرآن کریم نے جب اعلان فرمایا، اور اطلاع دے دی، تو علم الیقین، اور کچھ لوگوں کو حق الیقین کے درجہ میں بھی حقیقت واضح ہوگئی۔

یہ بات پہلے بھی واضح ہوئی کہ دنیا و آخرت کا انتخاب ایک قسم کا لین دین اور بیع وشرا ہے، ہر انسان اپنے معاملے میں خود مختار ہے۔ طالبِ دنیا آخرت سے محروم ہے، اور طالبِ آخرت دنیا سے خفا اور اعراض میں ہے۔ قرآن حکیم میں جن جن مقامات پر ایسے الفاظ مذکور ہوئے ہیں، وہاں معنی مجازی اور استعارہ وتشبیہ مراد ہے، اور کلامِ عرب میں اس کی بڑی گنجائش بھی ہے، کیونکہ خرید وفروخت اور نفع ونقصان جس طرح اموال میں ہوتا ہے، اسی طرح مجازاً اعمال وعقائد میں بھی متحقق ہے۔ [موجودہ مسلمان اور قرآن کریم]

قرآن حکیم ابدی و دائمی کتاب ہے۔ قیامت تک پورے عالم کے لئے راہ نما اور مشعلِ راہ ہے، وہ اگر کسی خاص قوم کو خطاب کرتا ہے، یا ان کے متعلق کوئی خبر دیتا ہے، اگر چہ وہ حکم جزوی طور پر اسی قوم کے متعلق ہوتا ہے، مگر اپنے عمومی اور عالمگیر معنی کے اعتبار سے قیامت تک سارے انسانوں پر محیط ہوتا ہے۔ اس مقام پر یہودیوں کے جزوی ایمان کا جو نقشہ قرآن کریم نے ان آیات میں کھینچا ہے، اگر انصاف اور غور کی نظر سے دیکھا جائے، تو آج کل بہت سے مسلمانوں کی حالتِ زار بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ سنت اللہ ہر زمانہ میں یہی رہی ہے کہ اطاعت شعار غلام حرّیت کے مقام پر پہنچتے ہیں، اور نافرمان ملوک وسلاطین ذلّتوں کی پستی میں خوار ہوجاتے ہیں۔

آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے کہ آسمان نے انہیں ثریا سے اٹھا کر زمینی ذلّتوں میں اتارا ہے، کیونکہ وہ یہود کی اقتداء ونقش قدم پر چل کر قرآن کریم کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہیں، جو ان کے مزاج اور خواہشات کے

ساتھ ہم آہنگ ہو، اور بعض حصہ کو نظر انداز کر کے نہیں مانتے ہیں، جو ان کے مزاج و خیالات سے متصادم ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے بندے نہیں کہلاتے، کیونکہ یہ اپنی خواہشات کے بندے ہوتے ہیں، اور بندگی ایک ہی معبود کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ دو معبودوں والا بندہ موحد نہیں رہتا۔ پس یا خدا ہوگا یا غیر خدا (فقط)، یہی وجہ ہے کہ کثیر تعداد اور بے پناہ مالی سرمایہ و وسائل کے باوجود مسلمان قوم پورے عالم میں لاوارث اور ذلیل و رسوا ہے۔ وہ کسی عالمی ادارہ کا اگر بظاہر ممبر بھی ہے، مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ دوسری اقوام کی رائے کے خلاف اپنی خصوصی منفرد رائے پیش کر سکے، یا کوئی ویٹو کر سکے۔

اس کو پورے جہاں پر چھائے جانے کے بعد یہ ذلت کیونکر پیش آئی؟ اس کی وجہ سب کو معلوم ہے، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کا نہیں بنتا تو اپنا بھی نہیں رہے گا، اس نے اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ سے انحراف کر کے اپنا نصیب خود ضائع کیا۔

ہم تو مائل بکرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں ☆ راہ دکھائیں کسے جب راہ رو منزل ہی نہیں

سوتے کو کیا ملے گا، جو بیداری کے باوجود سویا ہوا ہو؟ قومِ یہود نے ہمارے اربابِ حل وعقد کے منہ میں تھوک کر ہم سے بدلہ لے لیا۔ آج جتنا ہم ان کے خیر خواہ فرمانبردار ہیں، اپنے قرآن کے نہیں! قرآن مجید کی جو سورۃ شب و روز کھربوں بار تلاوت ہوتی ہے۔ ﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ﴾ ہم نے آج تک نہ اس پر عمل کیا، اور نہ ہی غور کیا۔ حب الدنیا و کراھیۃ الموت نے حلوا کی طرح ہمیں نوش کیا، اور چاٹ لیا۔ ہم ان لوگوں کے وارث ہیں جنہوں نے زندگی میں خربوزہ یا تربوز اس لئے نہیں کھایا کہ اس کے کھانے کے متعلق سنت نبوی کا علم نہ تھا۔ آج سوائے چند نہتے، بے سروسامان علماء و طلباء اور تبلیغ والوں کے اسلام کا نام اور درد کسی کے دماغ و قلب میں نہیں ہے۔ عوام الناس اور پورا معاشرہ حکام سمیت ان کو اپنے راستے سے ہٹانے پر مسلسل سوچ رہے ہیں۔

یہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہے کرگسوں میں ☆ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

فتح بیت المقدس کے موقع پر عیسائیوں نے مسلمانوں کے دلوں سے ایمانی جذبہ اور تقویٰ (جو کہ روحِ ایمان واخلاص ہے) نکالنے کی خاطر یہ حربہ استعمال کیا کہ جس راستے سے مسلمان فوج ہمارے علاقے میں داخل ہو رہی ہے، وہاں ایک عارضی مینا بازار قائم کیا جائے، اور سینکڑوں کی تعداد میں حسین وجمیل خوبصورت دوشیزاؤں کو زرق و برق لباس میں نیم عریاں بٹھایا جائے، اور ہر طرح کا عمدہ ساز وسامان مہیا کیا جائے۔ جب مسلمانوں کا لشکر وہاں پہنچ

جائے گا، تو خرید و فروخت شروع کریں گے۔ یہ بچیاں نہایت خوش اخلاقی ہنسی مذاق میں ان کے ساتھ چھیڑ خانی میں لگ جائیں، اور مفت بلا معاوضہ انہیں بدکاری کی دعوت دیں، یہ بچارے کئی مہینوں سے بیوی بچوں سے دور رہ کر زنا پر آمادہ ہوجائیں گے۔ جب غلط کام کرتے ہی ان کا نورِ ایمان اور روحِ تقویٰ ان کے وجود سے خارج ہوجائے گی، تو اللہ تعالیٰ کی مخصوص نصرت کھو بیٹھیں گے، پس ہمارے ہاتھوں شکست کھا جائیں گے۔

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا، اور منصوبہ تیار تھا، جب لشکر اس حدود پر وارد ہوا، تو سپہ سالار امینِ امت حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو مختصر خطاب کر کے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ان کے سامنے رکھ دی۔ لشکر بازار کے اندر سے گھوڑوں پر سواری کی حالت میں گزر گیا، کسی بھی سپاہی نے منظر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی، اور پار ہوگئے۔ وہ منظر قابلِ دید تھا، اور ان نورانی فرشتوں کے سامنے تھا، جنہوں نے ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ کا نعرہ لگایا تھا۔ جب عیسائیوں نے منصوبے کو خاک میں ملتے ہوئے ناکام دیکھا، تو جنگ کرنے سے معذوری ظاہر کی، اور صلح پر آمادہ ہوگئے۔ ؎

نہ ایران میں رہے باقی نہ توران میں رہے باقی ☆ وہ غازی فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ

یہ تھے صحرائے عرب کے شتربان، اسلامی سپوت، جن کے وارث و جانشین ہم لوگ ہیں۔ [واقدی] آج مسلمان کیا ہے؟ ننگِ ملّت، ننگِ اسلام، ننگِ اسلاف، جس جہاد کو شریعت نے اسلام کے کوہان کی بلندی اور برتری قرار دیا تھا، جب سے ہم نے اغیار کے کہنے پر، اور ان کو راضی رکھنے کی خاطر اسے ترک کیا، تو ہمارے مقدر میں غلامی لکھ دی گئی۔ جہاد! جس کی اہمیت و برکت سے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں، مگر آج مسلمان نوجوان اس کے نام سے بھی واقف نہیں۔ اگر یہودی مجرم ہے کہ اس کا توریت پر ایمان و عمل نہیں ہے، اس بارے میں ہم بھی اس سے کم اور پیچھے نہیں ہیں۔ وہ توریت کا منکر ہے، مسلمان قرآن کا منکر ہے۔ ؎

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ☆ ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے ☆ وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۸۵﴾ (جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے)۔ اس کو تمہارے ہر ارادہ اور ہر عقیدہ پر عمل کا بخوبی علم ہے۔ کائنات کا کوئی ذرّہ اس سے پوشیدہ نہیں ہے، جب اس کی گرفت کا وقت آپہنچے گا، تو تمہاری سب تدابیر ناکام ہوجائیں گی۔

﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ [البقرة:۱۶] (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی خرید لی ہدایت کے بدلے)۔ اگر کوئی آخرت پر دنیا کو، اور ہدایت پر گمراہی کو، ابدی پر عارضی کو ترجیح دیتا ہے، تو وہ بیوقوف خسارے اور تباہی سے دوچار رہے گا، اس لئے فرمایا:

﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴿۸۶﴾﴾ تو پھر ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی، اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴿۸۷﴾ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ﴿۸۸﴾

ترجمہ: اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی، اور ہم نے ان کے پیچھے بہت سے رسول بھیجے، اور ہم نے عیسیٰ (علیہ السلام) بن مریم کو بینات (واضح اور کھلی باتیں) دیں، اور ہم نے ان کی پاک روح کے ساتھ تائید کی، کیا جب بھی تمہارے پاس رسول کوئی ایسی چیز لے کر آیا، جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے تو تم نے تکبر کیا، پس ایک فریق کو تم نے جھٹلا دیا، اور ایک کو قتل کیا﴿۸۷﴾ اور انہوں نے کہا ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے ان کے کفر کی وجہ سے، پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں﴿۸۸﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ سبحانہ نے جن بے شمار نعمتوں سے بنی اسرائیل کو نوازا، مسلسل ان نعمتوں کا اور اسی کے ساتھ ان کی احسان فراموشی اور نافرمانیوں کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں: دیکھو ہم نے تمہاری فلاح ونجات کی خاطر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) عطا فرمائی، تاکہ تم اس کے ذریعے ہدایت اور رہنمائی، فوز وفلاح، اخروی

سعادت حاصل کرسکو، پھر اس کتاب میں مذکور احکام کی ہر زمانہ و ہر عصر میں یاددہانی کے لئے:

﴿وَقَفَّيْنَا مِنْ ۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پے در پے یکے بعد دیگرے لگا تار رسول بھیجے، جو توریت کی تعلیم و تبلیغ کرتے تھے، کیونکہ جس طرح آسمانی کتاب محض اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا نتیجہ ہے، اسی طرح پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کے معلّموں اور مبلّغوں کی تشریف آوری بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا نتیجہ ہے۔ ہر پیغمبر اپنی کتاب اور اپنے سے پہلے پیغمبر کی کتاب کا معلّم اور شارح ہوتا ہے۔ جو اس کتاب کے مسائل اور احکام کی تبلیغ و تعلیم کرتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں چار ہزار انبیاء علیہم السلام بھیجے ہیں۔ [عزیزی]

پھر اللہ تعالیٰ سبحانہ نے سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ آپؑ صاحب کتاب (انجیل) اور اللہ تعالیٰ کے عظیم المرتبت رسول ہیں، چنانچہ آپؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ (اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا کیں)۔ ایک طرف سے وہ خود اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہیں، کہ بغیر باپ کے والدہ ماجدہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے انہیں عجیب و غریب معجزات عطا فرمائے، مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھوں کو بینائی عطا کرنا، مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارنا، اور اسے ہوا میں اڑانا وغیرہ۔

''بینات'' سے احکام و مسائل اور دلائل بھی مراد لے سکتے ہیں۔ آپ علیہ السلام کی پیدائش اور دیگر بہت سی خصوصیات کا تذکرہ سورۃ آل عمران، اور سورۃ مریم میں آئے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ ہم نے پاک روح سے اس کی تائید کی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ روح القدس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ امام بخاری وغیرہ محدثین رحمۃ اللہ علیہم بھی یہی کہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اس کی تائید بھی ہوتی ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ [الشعراء: ۹۴] (اس کتاب کو روح الامین نے اتارا ہے آپ کے دل پر) یہاں روح الامین سے مراد جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی: ''اللّٰهمّ أيده بروح القدس''۔ [بخاري] اور یہ بھی ارشاد فرمایا: اے حسان! تم اپنے اشعار کے ذریعے مشرکین کی ہجو کرو (مذمت کرو) وجبريل معك [بخاري] حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے جو شعر منسوب ہے اس میں بھی اسی طرح کی بات ہے۔

وجبريل رسول الله فينا ★ وروح القدس ليس له كفاء

حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کئی طریقوں سے تائید ہوئی۔اول تو ولادت کے وقت مس شیطان سے محفوظ رہے، پھر ان کے پھونک سے حمل ٹھہرا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، پھر یہود قوم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے کی کوشش کی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان کی حفاظت فرمائی، جس کے نتیجے میں انہیں اُٹھا کر آسمانوں پر پہنچایا، اور اکثر اوقات آپؑ کے ساتھ رہتے بھی تھے۔

سورت نساء میں ارشاد ہے:﴿اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾[النساء: ۱۷۱] (بیشک مسیح عیسیٰ ابن مریم تو محض اللہ کے رسول تھے، اور اللہ کا ایک کلمہ تھا، جو اس نے مریم تک پہنچایا، اور ایک روح تھی اس کی طرف سے)۔اور اسی مناسبت سے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کا لقب "کلیم اللہ" ہے، تو عیسیٰ علیہ السلام کا لقب "روح اللہ ہے"۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ:"روح القدس" اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم تھا، جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے، اور نابیناؤں کو بینائی عطا کرتے، اور لوگوں کو عجائبات دکھاتے تھے۔[لغات القرآن] اس سے معلوم ہوا کہ اسمِ اعظم کے ساتھ کچھ مخصوص ضروری شرائط کا تعلق ہے، اگر وہ شرائط نایاب ہوں، تو مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔واللہ اعلم

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ﴾ بنی اسرائیل کی خودغرضی، مفاد پرستی اور اتباعِ نفس وہویٰ کا تذکرہ فرمارہے ہیں، جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر آئے جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے، اِسْتَكْبَرْتُمْ (تو تم نے تکبر کیا) یہ تکبر وغرور اس قوم کا بنیادی سرمایہ رہا ہے۔اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور احکامِ الٰہی سے روگردانی کی وجہ یہی تکبر وسرکشی ہی ہوتی ہے۔ہر زمانہ میں یہ چیز تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ نافرمانی کی وجہ سرکشی اور غرور ہے۔اطاعت اور اتباع کی وجہ انکساری اور کم نفسی ہے۔

﴿فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝۸۷﴾ تم لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے ایک گروہ کو جھٹلایا، اور ایک گروہ کو قتل کر کے شہید کیا۔حدیث وروایات سے ثابت ہے کہ اس بدنصیب قوم نے اکثر انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، اور چار سو کے قریب پیغمبروں علیہم السلام کو شہید کیا، جن میں حضرت زکریا، حضرت یحیٰ، اور حضرت شعیاء علیہم السلام وغیرہم، شامل ہیں۔

یہود میں یہ غرور اور زعمِ باطل بھی عام طور پر پایا جاتا تھا کہ ہم صاحب علم ہیں۔ ہمارے قلوب علم ومعرفت

سے لبریز ہیں۔ اگر کوئی برتن بھرا ہوا ہو، تو مزید کسی چیز کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہمارے قلوب میں مزید ہدایت و بیرونی تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ طنزیہ طور پر کہتے رہتے تھے:

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ﴾ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں۔ ہم اپنے مذہب پر پختہ ہیں، مخالف مذہب اسلام اور قرآن کا ہمارے اوپر اثر نہیں ہوتا۔ اس کا ایک مطلب بعض نے یہ بیان کیا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے دل بند ہیں، کھلتے نہیں۔ ہم تمہاری بات سمجھتے نہیں، جیسے مشرکوں نے کہا تھا: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾ [السجدۃ:۵] (اور کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں، اور ہمارے کانوں میں بوجھ (یعنی بہرا پن) ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ درست ہے کہ تمہارے اوپر حق کا اثر نہیں ہوتا، اس کی وجہ وہ نہیں، جو تم کہتے رہتے ہو، بلکہ اصلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ تمہارے قلوب پر اللہ تعالیٰ کی مار ہے، اور اس کی لعنت ہے کہ تم اسلام کی واضح ہدایات کے قبول کرنے سے عاجز اور منکر ہو۔ اس انکار کی وجہ صرف اور صرف لعنت ہی ہے:

﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ اس ناسمجھی کا سبب لعنت ہے، اور لعنت کا سبب تمہارا کفر ہے۔

﴿فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ۝۸۸﴾ ان کی بہت قلیل تعداد ایمان لاتی ہے، اور اکثریت ایمان سے محروم رہتی ہے۔ پس اکثریت سے ایمان کی نفی، اور اقلیت کے لئے ایمان کا اثبات ہوا۔ اس کی تفصیل سورت آل عمران میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔ فرمایا: ﴿لَیْسُوْا سَوَآءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ [آل عمران: ۱۱۳] (یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں، ان اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ (حکمِ خدا پر) قائم بھی ہیں)۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ
عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ۝۸۹
بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ۝۹۰

ترجمہ: اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب آئی، اس چیز کی تصدیق کرنے والی جو ان کے پاس ہے،

اور اس سے پہلے وہ کافروں پر فتح مانگتے تھے، اور جب ان کے پاس وہ چیز آئی، جسے انہوں نے پہچان لیا، تو اس کے ساتھ کفر کرنے لگے۔ پس کفر کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ﴿۸۹﴾ وہ بری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا ہے کہ کفر کرتے ہیں اس چیز پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے، سرکشی کرتے ہوئے، اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارتا ہے۔ پس یہ لوگ غضب پر غضب لے کر لوٹے، اور کافروں کے لئے ذلت ناک عذاب ہے ﴿۹۰﴾

معارف ومنازل

یہاں سے یہود کی تیئسویں شرارت ونافرمانی کا بیان ہے، کہ صرف یہ نہیں کہ وہ لوگ توریت وانجیل اور زبور وغیرہ آسمانی کتابوں کے منکر اور باغی ہیں، بلکہ وہ ہر آسمانی کتاب کی تکذیب کرتے ہیں، جیسے ابھی گذر گیا کہ انہوں نے "قُلُوْبُنَا غُلْفٌ" کہہ کر یہی اظہار کیا تھا کہ قرآن مجید ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، اس لئے ارشاد ہو:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس وہ آخری کتاب آگئی، جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، جو ان کے پاس موجود ہیں۔ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتے ہیں، اور آخری کتاب ان کی کتابوں (توریت وانجیل وزبور اور دیگر تمام آسمانی صحیفوں) کی تصدیق کرتی ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ فوراً اسلام قبول کرلیں، اور ایمان لے آئیں۔

لفظ "كَفَرُوْا بِهٖ" جو آئندہ آنے والا ہے "لمّا" کا جواب ہے۔ آیت کے درمیان حصہ میں بطورِ جملہ معترضہ یہودیوں کی ایک بات کا ذکر ہے۔

﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ ﴾ یعنی نزولِ قرآن مجید سے پہلے وہ کفار ومشرکین پر فتح مانگتے تھے۔ تفسیر مظہری نے اس کے دو معنی بیان کئے ہیں: ایک معنی یہ کہ فتح کے معنی کھولنے، ظاہر کرنے، اور بیان کرنے کے ہیں، تو یہ معنی ہوں گے کہ بنی اسرائیل کفار پر اس بات کو کھول کر بیان کرتے تھے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب لانے والے ہیں، اس پر تم لوگ ایمان لانا۔ سورت اعراف میں موجود ہے: ﴿ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [الأعراف:۱۵۷] یعنی وہ اپنی کتابوں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے تھے کہ آخری نبی آنے والے ہیں، ان کی یہ یہ صفات وعلامات ہیں۔ یہ پیش گوئی تمام آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے صحیفہ میں بھی اس کی بشارت ہے کہ میں

''امیون'' میں امی نبی بھیجوں گا۔

﴿یَسْتَفْتِحُوْنَ﴾ کے دوسرے معنی ''کامیابی اور فتح'' کے ہیں کہ یہود اللہ تعالیٰ سے آخری نبی ﷺ کے طفیل کفار کے مقابلے میں فتح و کامرانی طلب کیا کرتے تھے، اور کفار کے ساتھ جب ان کی جنگ ہوتی تھی، تو کہتے تھے: ''یا اللہ تعالیٰ! ہمیں اس آنے والے نبی آخر الزمان (ﷺ) کی برکت اور وسیلہ سے کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب فرما! تاکہ جب وہ نبی آئے، تو ہم ان کی اتباع کر سکیں''۔ اور یہ بھی کفار سے کہا کرتے تھے کہ اب تو تم ہم پر غلبہ حاصل کرتے رہتے ہو، جب آخری نبی (ﷺ) تشریف لائیں گے، تو ہم ان کے ساتھ تمہارا مقابلہ کریں گے، ان کے طفیل ہم تمہارے اوپر ضرور فتح پائیں گے۔ ہم ان کے انتظار میں ہیں، جوں ہی وہ آئیں گے، ہم ان پر ایمان لائیں گے، اور ان کی قیادت میں تم پر فتح پائیں گے۔

﴿فَلَمَّا جَآءَ هُمْ﴾ پس جب وہ قابلِ احترام ہستی آ گئی، جس کے وہ منتظر رہتے تھے ﴿مَّا عَرَفُوْا﴾ اور اس ہستی کو انہوں نے اوصاف و علامات اور شواہد سے پہچان بھی لیا۔ ﴿كَفَرُوْا بِهٖ﴾ اس کے باوجود بجائے ایمان لانے کے اس کا انکار کیا۔ یہ انکار ضد و عناد اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھا، بخلاف باقی کفار کے کہ ان کا انکار جہالت پر مبنی تھا۔ تو یہود کفار سے ہزار درجہ بُرے اور بڑے مجرم ثابت ہوئے۔ اس لئے فرمایا:

﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝۸۹﴾ ایسے منکروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ الکٰفرین کا الف لام عہد کا ہے۔

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ﴾ بری ہے وہ شئے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا۔ وہ کونسی چیز ہے جو انہوں نے جان کے بدلے خریدی؟ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب، شریعت اور وحی الٰہی کا انکار کیا، اور یہ محض ''بَغْيًا'' (شرارت کرتے ہوئے) کہ نبی آخر الزمان ﷺ دوسری قوم میں کیوں آ گئے؟ ان کو تو ہماری قوم بنی اسرائیل میں آنا چاہئے تھا۔ وہ بنو اسمٰعیل میں کیوں آ گئے؟

چنانچہ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہا ہے کہ آخری نبی (ﷺ) ضرور بنی اسرائیل میں آئے گا؟ فرمایا: حقیقت یہ ہے:

﴿اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتار دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی مبعوث فرمائے، مگر نبی آخر الزمان (ﷺ) کی بعثت بنی اسمٰعیل میں مقدر ہو چکی تھی، اس لئے وہ بنی اسماعیل میں ہی تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی

اسرائیل سے آخری نبی کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا تھا۔ اب جبکہ آخری نبی آ گئے ہیں، تو بنی اسرائیل کا فرض بنتا ہے کہ وہ انہیں اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہوئے ان پر ایمان لائیں، اور ان کا اتباع کریں۔ مگر اس کے برخلاف انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا، اور اپنے خاندانی تفوّق اور برتری کا دم بھرنے لگے، جو ان کے لئے مناسب نہ تھا۔

دراصل یہ ان کا ایک غیر معقول بہانہ اور ضد وعناد پر مبنی ہٹ دھرمی تھی، ورنہ انہوں نے اپنے نبیوں کو بھی جھٹلایا، اور شہید کیا تھا۔ یہ عدمِ تسلیم ان کی عادت اور فطری غرور کا حصہ رہا تھا۔ پس ان کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ ﴾ وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔ ان کا پہلا غضب تو یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ بنی اسرائیل کے منحوس ومغضوب بادشاہ نے انہیں سولی پر لٹکانے کا حکم دے دیا۔ ان کا مذاق اڑایا، منہ پر تھوکا، انجیل اور توریت وزبور سب کی بے احترامی کی۔ پھر اس غضب پر دوسرا غضب یہ تھا کہ جب خاتم الانبیاء نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور آخری جامع کتاب (قرآن حکیم) نازل ہوئی، تو ان کا انکار کیا۔ یہ گویا غضب پر غضب ہو گیا۔

اگر غور کیا جائے، تو اس قوم پر غضبوں کا انبار نظر آئے گا، اسی لئے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الیھود مغضوب والنصاریٰ ضلال**۔ [ترمذی] ''مغضوب'' اسے کہتے ہیں کہ جو دیدہ ودانستہ احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آج کا مسلمان بھی جانتا ہے کہ اسلام سچا ہے، اور شریعت برحق ہے، مگر دیدہ ودانستہ اس پر چلنے اور عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اور یہودیت ونصرانیت کو باطل جانتے ہوئے بھی ان کی تقلید پر رواں دواں اور فخر محسوس کرتا ہے۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب سے بچ سکتا ہے؟

اور ''ضلال'' وہ ہے جس کی فہم میں خرابی اور فتور آ جائے، اور وہ بھٹک جائے، یہ نصاریٰ ہیں، جنہیں آج تک مذہب کی حقیقت کا پتہ نہ چل سکا۔ تین کو ایک، اور ایک کو تین کہتے رہے۔ امورِ دنیا میں تو اتنے ماہر ہوئے کہ چاند تک پہنچ گئے، مگر مذہب انہیں آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ ان کی تقلید کرتے ہوئے، اور ان کی تعلیم پر مر مٹنے والے نام نہاد مسلمان بھی اسی لادینیت کے سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے۔ **اللھم ارحمنا**۔ فرمایا:

﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۹۰﴾ یاد رکھو! نافرمانوں کے لئے ذلّت ورسوائی کا عذاب مقرر ہے، یہاں عذاب کی صفت ''مُهِيْن'' ذکر فرمایا، معلوم ہوا کہ یہ عذاب نہایت اندوہناک اور سخت ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ق وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ق وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ: اور جب ان (اہل کتاب) سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے (یعنی قرآن کریم) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی (یعنی توراۃ) اور اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ یہ (قرآن) برحق ہے، اور تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے (تورات کی)۔ آپ فرما دیجئے: پس تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو؟ اس سے پہلے اگر تم ایمان والے ہو ﴿۹۱﴾ البتہ! تحقیق تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آئے، پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا، اور تم ظلم کرنے والے تھے ﴿۹۲﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا، اور ہم نے تمہارے اوپر کوہِ طور کو اٹھالیا، پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے مضبوطی کے ساتھ، اور سنو! انہوں کہا ہم نے سنا اور نہ مانا، اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلادی گئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ آپ کہہ دیجئے: کہ وہ بری بات ہے جس کے لئے تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے اگر تم ایمان والے ہو ﴿۹۳﴾

معارف ومنازل

ایمان بالکتب وبالرُسل، یعنی ایمان میں یہ ضروری ہے کہ تفریق وامتیاز نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے چند رسولوں پر ایمان لانا اور باقی کی تکذیب کرنا یا کتابوں میں بھی اسی طرح تفریق کرنا، سراسر کفر ہے، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی آسمانی کتاب کے ایک کلمہ سے انکار بھی کفر شمار ہوتا ہے۔ آیت کریمہ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ [البقرۃ: ۲۸۵] (ہم رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے) کا بھی یہی مقصد ہے۔ اب یہود اگر توریت کے علاوہ کسی بھی آسمانی کتاب، یا اس کی کسی ایک آیت کا انکار کریں، تو وہ کافر ہی رہیں گے۔ ان آیات میں ان کے

اسی کفر کا بیان ہے۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے) یعنی قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کی فرستادہ کتاب تسلیم کرو۔

﴿ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا ﴾ (ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے)۔ یعنی ہم صرف توریت کو مانتے ہیں، اور اس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیتے ہیں۔

﴿وَهُوَ الْحَقُّ﴾ (حالانکہ قرآن پاک برحق ہے)۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے، اور یہ قرآن پاک توراۃ کا تصدیق کنندہ ہے۔ جو شخص قرآن کا منکر ہوگا، اسے توراۃ کا بھی منکر سمجھا جائے گا۔

تو یہود اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہی سمجھے جائیں گے۔ ان کے جھوٹے ہونے کی یہ واضح دلیل ہے، فرمایا:

﴿قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ﴾ (آپ ان سے پوچھئے کہ اگر توراۃ پر تمہارا ایمان ہے تو تم نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا ہے؟)۔ قتلِ انبیاء توراۃ کی رُو سے بھی تو حرام ہے۔ اگر تم توراۃ کو ماننے والے ہوتے، تو اتنے بڑے جرم کا ہرگز ارتکاب نہ کرتے، اور توراۃ پر تمہارے ایمان کا دعویٰ اس لئے جھوٹا ہے کہ: ﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ [الآیة] جب موسیٰ علیہ السلام واضح نشانیاں، یعنی معجزات لے کر آئے، تو تم نے ان پر ایمان لانے کی بجائے ایک بچھڑے کو معبود بنالیا، جو کھلم کھلا شرک تھا، اور توراۃ کے حکموں کی واقع نفی اور انکار کے مترادف تھا، اور تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے ظلم کیا کہ ایک بے جان گوسالہ کو معبود بنالیا۔

﴿وَإِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا، اور تمہارے سروں پر کوہِ طور کو معلق کیا، اور حکم دیا کہ:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ ہم تمہیں جو کچھ عطا کر رہے ہیں، اسے مضبوطی سے تھام لو، اور خوب سن لو اور قبول کر لو۔ مگر تم نے الٹا ہی جواب دیا کہ ہم نے سنا اور مانا اور تسلیم نہیں کیا۔ یہ ایک نفاق کی نشاندہی ہوئی، جو ظاہری طور پر تسلیم اور باطن میں وعدہ خلافی اور بے عملی پر عزم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ:

﴿وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ جس طرح رنگ کپڑے میں سرایت کر کے اسے گھیر لیتا ہے، اسی طرح گوسالہ پرستی تمہارے قلوب کے رگ و ریشے میں پختہ ہو کر سرایت کر چکی تھی، اور بچھڑے کی محبت تمہارے دلوں

میں گھر کر چکی تھی۔

پھر تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم توراۃ کو مانتے ہیں یہ غلط ثابت ہوا۔

﴿قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ﴾ (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیجئے کہ: وہ بری بات ہے جس کے لئے تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے اگر تم ایمان والے ہو)۔ چونکہ ایمان ایک نورِ باطنی ہے، وہ انسان کو نیکی پر آمادہ کرتا ہے، تمہیں تمہارے ایمان نے بجائے تسلیم وانقیاد کے نافرمانی اور برائی پر آمادہ کر کے ثابت کر دیا کہ تمہارا ایمان حقیقی ایمان نہ تھا، یہ بہت ہی بری بات ہے کہ ایمان کسی کو بے ایمانی پر آمادہ کرے، اور اگر تم مؤمن ہوتے، تو گوسالہ پرستی ہرگز نہ کرتے۔ اور سَمِعْنَا کے ساتھ عَصَيْنَا نہ کہتے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾
وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ
اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۰

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا گھر دوسرے لوگوں کے سوا صرف تمہارے لئے خالص ہے، پس تم موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو ﴿۹۴﴾ اور وہ اس موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے، کبھی بھی، اس وجہ سے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو ﴿۹۵﴾ اور البتہ! تم ان لوگوں کو زندگی پر زیادہ حریص پاؤ گے دوسرے لوگوں سے بھی، اور ان لوگوں سے بھی زیادہ حریص جنہوں نے شرک کیا، ان میں ہر کوئی پسند کرتا ہے کہ اسے ہزار سال عمر دی جائے، حالانکہ عمر اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے دور کرنے والی نہیں ہے، اگر اس کو اتنی عمر دے دی جائے، اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ یہ کام کرتے ہیں ﴿۹۶﴾

معارف ومنازل

اگر کوئی کافر منکر بھی ہو، اور معاند بھی، تو شرعاً اس کے ساتھ مباہلہ ہوسکتا ہے۔ مباہلہ کی پوری تفصیل سورۂ آل عمران آیت ۶۱ میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔ یہاں ان آیتوں میں یہود کے ساتھ مباہلہ کی یہ صورت ہوئی کہ

یہود مسلسل ضد وعناد کی بنیاد پر کہتے رہتے کہ ہم لوگ حق پر ہیں، جنت صرف یہود و نصاریٰ کے لئے ہے، کوئی اہلِ کتاب دوزخ میں نہیں جائے گا، مگر چند روز، ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرّب اور پسندیدہ ہیں، جنت اور اس کی نعمتیں صرف ہمارے لئے ہیں، ہم لوگ بغیر حساب وکتاب جنتی ہیں۔ ان باتوں کا ایک ہی جواب ارشاد فرمایا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، تو بسم اللہ کر کے آجاؤ! ہم اور تم مل کر دعاء کریں کہ دونوں فریقوں میں جو بھی جھوٹا ہوگا، وہ ابھی فوراً مرجائے گا، وہ اس طرح کہ مباہلہ میں یہ کہیں گے: ''یا اللہ! ہمیں موت دے اور جو جھوٹا ہے اسے فوراً ہلاک کردے''۔

سرورِ عالم ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ ان کو فرمادیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا گھر صرف تمہارے لئے ہے، اور جنت وجنتی نعمتیں تمہاری قسمت میں ہیں، اور تم مقرّبِ الٰہی بھی ہو، اور تمہارا یہ یقین ہے کہ تم بلا روک ٹوک جنت میں جاؤ گے، تو ذرّا موت کی تمنا کرو! اور اللہ تعالیٰ سے موت مانگو! تاکہ تمہیں بغیر کسی تاخیر کے فوراً جنت کا داخلہ اور اس کی نعمتیں دستیاب ہوں، اور یہ ظاہر ہے جس کو اپنا جنتی ہونا یقینی ہوتا ہے، اور بغیر موت کے جنت تک پہنچنا اس کے لئے مشکل اور غیر ممکن ہوتا ہے، تو وہ موت کے انتظار میں ہوتا ہے۔ موت کو گلے لگاتا ہے۔ اس کو بخوشی وبصد امید وآرزو طلب کرتا ہے، تاکہ منزلِ مقصود کو جلدی حاصل کرے، تو آؤ! موت کو طلب کرو! اور اپنا مدّعیٰ ثابت کرو۔ تمہارے ایسے کرنے سے تمہاری جیت اور ہمارے حق میں شکست خود بخود ثابت ہوگی۔ چونکہ یہود جھوٹ کے عادی، اور حق کے منکر تھے، وہ دل اور باطن میں اچھی طرح جانتے تھے کہ نبی آخر الزمان ﷺ، ان کی کتاب، ان کا دینِ اسلام برحق ہیں، اور توریت کی رُو سے بھی ہم باطل پر ہیں، اگر ہم نے اپنی اپنی زبانوں سے موت کی تمنا کی تو ہم میں سے کوئی فرد زندہ نہیں بچے گا۔

چنانچہ قرآن کریم نے پیشین گوئی کے ساتھ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ﴾ (یہود موت کی کبھی بھی تمنا نہیں کریں گے، کیونکہ انہیں ان کے وہ کرتوت اور برائیاں جو انہوں نے آگے بھیجی ہیں خوب معلوم ہیں)۔ اور اچھی طرح انہیں معلوم ہے کہ مرنے کے بعد سوائے جہنم کے اور کہیں ان کا ٹھکانا نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ اگر یہود صرف زبان سے موت کی تمنا اور طلب کرتے، تو سارے یہود فنا ہو کر مرجاتے۔ [تفسیر ابن جریر]

قرآن حکیم اور نبی آخر الزمان ﷺ کی صداقت کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ یہودیوں نے قرآن پاک کا چیلنج قبول نہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودی موت کی تمنا کبھی نہیں کریں گے، بلکہ یہ طویل العمری کے اتنے

خواہشمند ہیں کہ آپ انہیں عام انسانوں اور مشرکین سے بھی زیادہ حریص پائیں گے۔ مشرکین کے نزدیک آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے، تو ان کا طویل زندگی پر حرص کرنا معقول ہے، مگر یہ یہودی آخرت کو مانتے ہوئے، اور خود کو جنتی کہتے ہوئے بھی دنیوی زندگی پر حریص ہیں، اور موت سے خوفزدہ ہیں۔

جنگ صفین میں جناب حضرت علی کرم اللہ وجہہ چغہ پہنے ہوئے تھے، تیروں کی بارش ہو رہی تھی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اباجان! آپ کا یہ لباس تو جنگی لباس نہیں ہے! فرمایا: بیٹے! مجھے اس چیز کا خوف نہیں ہے کہ موت مجھ پر گرے، یا میں موت پر گروں۔ ہمیں تو شہادت کی تمنا ہے، موت ہمیں خوفزدہ نہیں کرسکتی۔ ہم موت کو بخوشی چاہتے، اور دعوت دیتے ہیں۔ [تفسیر عزیزی]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو دنیا کی عظیم طاقتوں کے ساتھ ٹکرائے، اور اپنے سے سوگنا زیادہ طاقتور لشکروں سے نبرد آزما ہوئے، تو ان میں یہی صفت سب سے زیادہ نمایاں تھی کہ وہ موت سے نہیں ڈرتے تھے، اور راہ خدا میں شہادت کو سعادت سمجھتے تھے۔ جنگ قادسیہ کے موقع پر ایرانی مجوسیوں نے اپنے سپہ سالار کو یہی بتایا کہ ہمارا واسطہ ایک ایسی قوم کے ساتھ پڑا ہے، جو شراب نہیں پیتے، اور ساری رات جاگتے، نماز پڑھتے ہیں، اور موت سے کبھی نہیں ڈرتے، بلکہ اسے وہ اپنے لئے کامیابی سمجھتے ہیں، ایسی قوم کے ساتھ لڑنا ہمارے لئے مشکل ہے۔

یہود بھی ایرانیوں کی طرح موت سے خوفزدہ رہے۔ ان کا ہر شخص یہ تمنا کرتا کہ اسے ایک ہزار سال کی لمبی زندگی حاصل ہو۔ فرمایا: کیا ہزار سالہ لمبی زندگی کسی کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکتی ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دور کرسکتی ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں! دنیا میں بہت سارے لوگوں نے ہزار سال سے زائد عمر پائی، کیا انہیں اتنی بڑی عمر نے عذاب الٰہی سے بچا لیا؟ ہاں! یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ لمبی عمر اُن لوگوں کے حق میں ضرور فائدہ مند ہے، جن کی زندگی، اور زندگی کے لمحات اطاعت وفرمانبرداری، اور نیک اعمال کے ساتھ صرف ہو، زہے سعادت!

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۝۹۷ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ
مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۝۹۸

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے! جو شخص جبرئیل کا دشمن ہے، پس بیشک یہ (قرآن پاک) اسی نے آپ کے دل

پر نازل کیا اللہ تعالیٰ کے حکم سے، یہ تصدیق کرنے والا ہے، ان کتابوں کی، جو اس سے پہلے ہیں، اور یہ اہلِ ایمان کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہے ﴿۹۷﴾ جو شخص دشمن ہوا اللہ تعالیٰ کا، اور اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا، اور جبرئیل کا، اور میکائیل کا، پس بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کے ساتھ دشمنی رکھنے والا ہے ﴿۹۸﴾

معارف ومنازل

ان آیات کریمہ کے شان نزول کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو یہودی اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔ تفسیر مظہری وغیرہ نے یہ کہا کہ یہودی عالم ابن صوریا نے سوالات پوچھے، جب حضرت جبریل علیہ السلام کا نام آیا، تو کہنے لگے: یہ ہمارے یہود کا دشمن ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا۔ اس کے علاوہ دیگر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا، اور یہی کہا۔ اسی طرح کتبِ حدیث وتفاسیر میں یہی تینوں اقوال موجود ہیں۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں تطبیق دیتے ہوئے فرمایا: امکان ہے کہ یہ سارے واقعات بیک وقت، یا یکے بعد دیگرے واقع ہوئے ہوں، مآل ومقصد ساری باتوں کا ایک ہی ہے کہ یہود نے حضرت جبریل علیہ السلام کے متعلق یہی کہا تھا۔

تفصیل یہ ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے، اس وقت مدینہ منورہ کے گرد ونواح میں بہت سے یہودی قبائل آباد تھے (بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع وغیرہ)، اس وقت ان یہودی قبائل میں دس نامور یہودی عالم تھے۔ انہی علماء کے بارے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر یہود کے دس لوگ میرے اوپر ایمان لائیں، تو سارے یہود ان کی وجہ سے اسلام قبول کریں گے۔ [بخاری] مگر یہ سارے بدقسمت اور محروم رہے، صرف ایک عالم حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی سعادت کا ستارہ چمکا، انہوں نے شروع ہی میں اسلام قبول کیا۔

ان علماء یہود کا سرکردہ ''ابن صوریا'' تھا، جو دجال کی طرح ایک چشم سے کانا تھا (کانے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں، ابولہب کی بیوی بھی کانی تھی) یہ کانا یہودی عالم بعض دیگر یہودیوں کے ہمراہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتحان لینے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف سوالات پوچھے۔

اس نے کہا کہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خواب سے متعلق ہماری کتابوں میں بعض نشانیاں موجود ہیں، آپؐ

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے خواب کی کیفیت بیان فرمائیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے جواب میں فرمایا: إن عيني تنامان و لاينام قلبي۔ میری آنکھیں تو سوتی ہیں، مگر دل کبھی نہیں سوتا، وہ برابر جاگتا اور بیدار رہتا ہے۔اس نے اس کی تصدیق کی، اور کہا کہ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ہماری کتابوں میں بھی نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہی نشانی بتائی گئی ہے۔اس شخص نے دوسرا سوال کیا کہ رحمِ مادر میں جنس کی تفریق کیسے ہوتی ہے؟ یعنی بچے اور بچی کی پیدائش میں کونسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کا مادہ منویہ سفید رنگ کا ہوتا ہے، اور عورت کا مادہ منویہ زرد رنگ کا ہوتا ہے، اور مباشرت کے وقت جس مادہ کا غلبہ ہوتا ہے، بچے کی شکل وصورت اس کے موافق ہوتی ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ غلبے سے کیا مراد ہے؟ مقدار میں غلبہ ہوتا ہے، یا خروج میں سبقت ہوتی ہے، یا رقت و غلظت میں غلبہ ہوتا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی بتایا کہ مرد اور عورت میں سے جس کے مادہ میں غلبہ ہوتا ہے، ایک توجیہ یہ ہے کہ جب مرد کا پانی سبقت کرتا ہے، تو لڑکا پیدا ہوتا ہے، اور جب عورت کا پانی سبقت کرتا ہے، تو لڑکی پیدا ہوجاتی ہے۔ عام اطباء بھی اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں، کوئی سبقت مراد لیتا ہے، کوئی مقدار۔ واللہ اعلم

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غلبہ کا ذکر فرمایا، اور مزید کیفیت صرف یہ ذکر فرمائی، کہ جس کے مادہ کا غلبہ ہوگیا، وہ مشابہت میں بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔اس جواب پر انہوں نے کہا کہ آپ نے بالکل صحیح جواب دیا، ہماری کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔اس کے بعد انہوں نے تیسرا سوال پوچھا کہ آپ بتایئے! کہ جو لوگ جنت میں داخل ہوں گے انہیں سب سے پہلی کونسی خوراک پیش کی جائیگی؟

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنتیوں کی پہلی خوراک مچھلی کے جگر کا زائد حصہ ہوگا، "زيادة كبد الحوت"۔ اور پھر دوسرے نمبر پر ان کو بیل کا گوشت پیش کیا جائے گا، جو جنت کے اطراف میں چرتا ہے، انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ بھی درست فرمایا۔

اب سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم نے آخری نبی کی تمام علامتیں پہچان لی ہیں، تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ انہوں نے کہا: اچھا ایک بات اور بتایئے! وہ یہ کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جبرئیل علیہ السلام مجھ پر وحی لاتے ہیں۔ وہ کہنے لگے: جبرئیل تو ہمارا دشمن ہے۔ اگر وہ وحی لاتا ہے، تو ہم اس کو اور اس

کی وحی کونہیں مانتے۔ ہاں! اگر میکائیل وحی لاتا تو ہم مان لیتے۔

پھر انہوں نے کہا کہ جبرئیل کو ہم دو وجوہات کی بناء پر تسلیم نہیں کرتے: (۱) اول یہ کہ قوموں پر عذاب نازل کرتا ہے، بخلاف میکائیل کے کہ وہ بادل اور بارش رزق وروزی وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ (۲) دوسرا یہ کہ جبرئیل نے ہمارے دشمن کی حفاظت کی ہے، اور ہماری تباہی میں اس کا ہاتھ ہے، کیونکہ اس نے ہمارے دشمن بخت نصر کی حمایت کی ہے۔

اس کی تفصیل انہوں نے یہ بیان کی کہ ہمارے پیغمبروں نے ہمیں بتایا تھا کہ بخت نصر نامی بادشاہ تمہیں تباہ و برباد کرے گا، لہٰذا اسے بچپن ہی میں قتل کردینا ضروری ہے۔ پھر پیغمبروں نے اس کی نشانیاں بتائیں، اور یہ بھی بتادیا کہ اوائلِ عمر میں وہ فلاں جگہ ملے گا، اور فلاں کام کرتا ہوگا۔ چنانچہ ہمارے سرداروں نے بخت نصر کی تلاش میں چاروں طرف آدمی روانہ کئے، اور انہوں نے شہرِ بابل میں انہی نشانیوں کے ساتھ بخت نصر کی شناخت کرلی، جب وہ اسے ہلاک کرنے لگے، تو جبرئیل علیہ السلام سامنے آکھڑے ہوئے، اور کہنے لگے: تم اسے کیوں مارتے ہو؟ ہمارے لوگوں نے کہا کہ یہ ہمارا قاتل ہے، اور ہماری تباہی کا باعث بنے گا۔ تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا: اگر یہ واقعی قاتل ہے تو تم اسے ہلاک نہیں کرسکوگے! اور اگر یہ تمہارا قاتل نہیں ہے، تو خواہ مخواہ اسے قتل کرنا تمہارے لئے باعثِ عذاب اور سخت گناہ ہے۔

اس طرح جبرئیل علیہ السلام نے اسے بچالیا، اور وہ بڑا ہوکر جب بادشاہ بنا، تو شام وفلسطین کے علاقوں میں بڑی تباہی مچائی، بیت المقدس کو شہید کیا، تورات کو جلادیا، یہودیوں کا قتل عام کیا، اور ان کے مردوں کو غلام، عورتوں کو باندیاں بناکر وہی کچھ کیا جو فرعون نے کیا تھا، چنانچہ بنی اسرائیل سو سال تک غلامی میں رہے، اور بڑی ذلت ورسوائی اٹھائی۔

اس کے ساتھ انہوں نے جبرئیل علیہ السلام پر یہ اعتراض بھی اٹھایا کہ یہ آپ کے پاس ہماری چغلیاں کھاتا ہے۔ ہماری ساری باتیں آپ کو بتاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعے نازل ہونے والی وحی کو ہم نہیں مانتے۔ یہودیوں کے ان اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں، اور ان کی گندی اور ناپاک ذہنیت پر رد فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام روح القدس، روح الامین اور مقرّب فرشتہ ہیں۔ وہ ہر قسم کے عیوب ونقائص سے صاف ستھرا پاکیزہ اور مقربِ درگاہ ہے۔ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتا ہے۔ امرِ الٰہی کے بغیر وہ ایک قدم اٹھانے پر بھی تیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کے ساتھ دشمنی رکھنا کفر ہے، ان کے ساتھ دشمنی رکھنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی رکھنے کے برابر ہے۔

"جبر" "میک" "اسراف" ان تینوں لفظوں کے معنی عبد، بندہ، کے ہیں۔ "ایل" کے معنی "اللہ" گویا یہ تینوں مرکبِ اضافی کے ساتھ عبداللہ کے معنی دیتے ہیں، تو جبرئیل، میکائل، اسرافیل کے معنی "عبداللہ" ہوئے۔ چوتھے فرشتے کا لقب "ملک الموت" ہے، اس کا نام "عزرائیل" بھی ہے، مگر کسی معتمد روایت میں نہیں ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿قُلۡ يَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ﴾ [الم السجدة:۱۱]

قرآن کریم میں صرف چھ فرشتوں کے نام مذکور ہیں:

(۱) جبرئیل (۲) میکائیل (۳) ہاروت (۴) ماروت (۵) الرعد، یعنی بادلوں کا فرشتہ (۶) مالک، جہنم کا داروغہ ہے۔ اسرافیل اور جنت کے انچارج "الرضوان" یہ نام قرآن مجید میں نہیں۔ احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا عرش اٹھانے والے چار فرشتوں کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔ روزِ قیامت چار فرشتے اضافی ان کے ساتھ مل کر آٹھ ہو جائیں گے۔ (مزید تفصیل سورۃ الحاقہ میں دیکھی جائے)

الغرض! جب یہودیوں نے جبرئیل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا، تو اس کے جواب میں ارشاد ہوا:

﴿قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ﴾ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے، بیشک! جبرئیل نے تو قرآن پاک آپ کے قلبِ اطہر پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے، ان کے ساتھ کسی دشمنی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتے ہیں، خواہ وہ چیز تمہاری موافقت میں ہو، یا مخالفت میں ہو۔ پھر یہ کلام بھی ایسا ہے جو اپنے سے پہلے صحیفوں اور تمام کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔

دوسرے مقام پر "مُهَيۡمِنًا" کا لفظ آیا ہے۔ تصدیق کے ساتھ ساتھ یہ کلام گزشتہ تمام آسمانی کتابوں کے احکام اور علوم و معارف کا جامع بھی ہے، اور یہ سابقہ کتب کا "مُهَيۡمِن" یعنی محافظ بھی ہے، اور ذریعۂ ہدایت و بشارت بھی ہے۔ سارے انسانوں کے لئے خاص کر اپنے ماننے والے مؤمنوں کے لئے۔ پھر فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ اور پیغمبروں اور جبرائیل و میکائیل کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے، وہ کافر ہو کر دینِ الٰہی سے خارج ہو جاتا ہے، اور اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کا شمار اللہ تعالیٰ کے دشمنوں میں ہوگا۔

مطلب واضح ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں اور عظیم المرتبت رسولوں سے دشمنی رکھتا ہے، وہ گویا اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لیتا ہے، اور ایسا شخص یقیناً لعنتی اور کافر ہوگا۔ اسی خاطر زبانِ صداقت بیان نے ارشاد فرمایا:

"من عادى لي وليا فقد أذنته بالحرب"۔ (حدیث قدسی ہے) بیان کرنے والا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ (جو میرے کسی ولی اور دوست سے عداوت رکھتا ہے، اسے میرا چیلنج ہے کہ وہ میرے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جائے) یعنی اپنی تباہی کا انتظار و نظارہ کرے۔

۞ ۞ ۞

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍۚ وَمَا یَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۝۹۹ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ
فَرِیْقٌ مِّنْهُمْؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝۱۰۰ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا
مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۝۱۰۱

ترجمہ: اور البتہ تحقیق ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل کیں، اور اس کے ساتھ نہیں کفر کرتے، مگر نافرمان لوگ ۝۹۹ کیا جب بھی انہوں نے کوئی عہد کیا، اس کو ان میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے ۝۱۰۰ اور جب ان کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول آیا، جو تصدیق کرتا ہے اس چیز کی جو ان کے پاس ہے، تو کتاب یافتہ لوگوں میں سے ایک گروہ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا، گویا کہ وہ جانتے نہیں ہیں ۝۱۰۱

معارف و منازل

یہودی عالم "بن صوریا" نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو سوالات پوچھے، اور کہا کہ آپ نبی آخرالزمان ہونے کے دعویدار ہیں، اس دعویٰ کے ثبوت میں ہمیں کوئی واضح نشانی بتائیں، جسے ہم پہچانتے ہوں، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍۚ﴾ ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل کی ہیں، جس شخص میں ذرہ برابر بھی انصاف ہوگا، وہ ان نشانیوں کا انکار نہیں کر سکے گا۔

﴿وَمَا یَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۝۹۹﴾ ان کھلی ہوئی نشانیوں کا انکار صرف نافرمان لوگ ہی کریں گے۔

فرمایا کہ ان بدبخت یہودیوں کی فطرت بن چکی ہے کہ:

﴿اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا﴾ ان میں سے جب بھی کسی نے کوئی عہد کیا، ﴿نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ﴾ ان میں

سے ایک فریق نے اس عہد کو توڑ دیا، اس کی وجہ یہ ہے:

﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ان کی اکثریت ایمان لانے سے قاصر رہی ہے۔ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب اس وجہ سے مسلط ہوا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿تسعَ آياتٍ بيّناتٍ﴾ وغیرہ کے باوجود صدقِ دل سے تسلیم نہیں کیا۔ زندگی بھر ان سے لڑتے رہے، حتیٰ کہ وہ پریشانیوں کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ابھی آیاتِ بینات دیکھ دیکھ کر کہاں ایمان لائیں گے؟ کیونکہ ان کو ایمان لانا اور فیصلۂ الٰہی تسلیم کرنا ہی نہیں۔ آئندہ فرمانِ الٰہی ان کے بارے یہ ہوگا: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ [البقرة: ١٢٠] (ہرگز یہود و نصاریٰ آپ سے خوش نہیں ہوں گے، جب تک آپ ان کے دین کی پیروی نہ کرو)۔ لہٰذا ان کے ایمان لانے سے قطع تعلق کے ساتھ مکمل ناامیدی کے سوا کچھ نہیں، جیسے بیان ہوا: ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ﴾ [البقرة: ٧٥] (کیا تم کو امید ہے کہ یہ لوگ تمہاری تصدیق کریں گے؟) کے ضمن میں۔

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (جب ان کے پاس ہادیٔ اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے) ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (جو اس چیز کی تصدیق کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے)، یعنی توراۃ، انجیل، زبور و دیگر صحف و شرائعِ الٰہیہ، تو پھر انہوں نے یہ چال چلائی:

﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ (ان کے ایک گروہ نے پھینک دیا اللہ تعالیٰ کی کتاب توریت کو پس پشت)۔

انہوں نے اس کی تحریفِ لفظی و معنوی کے باوجود جو احکام توریت کے اندر برقرار رہے، ان پر چلنا چھوڑ دیا ﴿سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا﴾ کہتے رہے۔ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) و آخری کتاب کے برحق ہونے کے اقرار کرنے سے منحرف ہوگئے، اور قصداً جان بوجھ کر حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منکر ہوگئے، اور اس کے ساتھ عداوت و دشمنی پر کمربستہ ہوگئے۔ یہاں سے جا کر قریشِ مکہ کی ہمدردیاں حاصل کرتے رہے، اور انہیں ہر قسم کی مالی و جانی امداد کی پیش کش کرتے رہے، یہاں تک کہنے سے نہیں شرمائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے تمہارے آباء و اجداد کا دین برحق اور بہتر ہے۔

یہ تفصیل سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ۔ اور یہی مطلب ہے: ﴿كَاَنَّهُمْ لَا

يَعۡلَمُوۡنَ﴿١٠١﴾ کا۔ کہ یہ جانتے ہوئے سب کچھ پہچانتے ہوئے بے علمی اور انکار پر اتر آئے۔ یہ حق کے دشمن اور باطل کے حامی ہیں، ان کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔ آئندہ اسی کا بیان ہوگا۔

وَاتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّيٰطِيۡنُ عَلٰى مُلۡكِ سُلَيۡمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيۡمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ كَفَرُوۡا يُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ۚ وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوۡلَآ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ فَلَا تَكۡفُرۡ ؕ فَيَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡهُمَا مَا يُفَرِّقُوۡنَ بِهٖ بَيۡنَ الۡمَرۡءِ وَ زَوۡجِهٖ ؕ وَمَا هُمۡ بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوۡنَ مَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ ؕ وَلَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ﴿١٠٢﴾ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَمَثُوۡبَةٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ خَيۡرٌ ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ﴿١٠٣﴾ ع

ترجمہ: اور انہوں نے اس چیز کا اتباع کیا جو شیاطین حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی بادشاہی میں پڑھتے تھے اور سلیمان (علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین کفر کرتے تھے، اور لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، اور وہ چیز جو اتاری گئی تھی بابل کے مقام پر دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر، اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں کہتے تھے: بیشک! ہم تو آزمائش ہیں، پس تم کفر نہ کرنا، پس لوگ ان دونوں سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے، جس کے ذریعہ مرد اور عورت کے درمیان جدائی ڈالتے تھے، اور وہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور وہ ان سے ایسی چیزیں سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی ہیں، اور فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ اور البتہ تحقیق انہوں نے جان لیا اس شخص کو جس نے اس (سحر) کو خریدا ہے، اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں، اور وہ بری چیز ہے، جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے، اگر ان کو سمجھ ہوتی ﴿١٠٢﴾ اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب اور بہتر اجر تھا، اگر یہ سمجھتے ﴿١٠٣﴾

معارف ومنازل

ان آیات کریمہ میں بنی اسرائیل پر ایک سخت قسم کا فرد جرم عائد کیا گیا ہے۔ دراصل اس نافرمان قوم کا مزاج ہی ایسا رہا کہ وہ بحر قلزم کے مرحلہ سے لے کر حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کی وفات تک مسلسل رب العزت کے

آسمانی اور زمینی انعامات کا مشاہدہ کرتی رہی، اور اس کے باوجود وہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ [آل عمران: ۱۸۱] (اللہ فقیر ہے (نعوذ باللہ) اور ہم مالدار ہیں)۔ یا یہ کہ ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ [المائدة: ۶۴] (اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے) کا رٹ لگاتی رہی، جس نافرمان قوم نے اللہ تعالیٰ کو معاف نہ کیا، تو کیا وہ انبیاء علیہم السلام کو معاف کر سکتی ہے؟

بنی اسرائیل کی نافرمانیاں:

(۱) اس قوم نے مسلسل انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کے ساتھ چار سو کے قریب انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا۔

(۲) انبیاء علیہم السلام پر الزام تراشی، بلکہ انہیں کافر ساحر و جادوگر کہنا، یہ بنی اسرائیل کا عام عمل و رویہ جاری رہا۔

(۳) انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر پر یہ الزام عائد کیا کہ ان کی سو بیویاں تھیں۔ ان میں اکثر بت پرست، کواکب اور ستارہ پرست کافرہ تھیں، ان کی محبت اور کہنے پر حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے معبود بتوں کا سجدہ کرتے تھے۔ ملکہ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے اپنے معبود کا سجدہ کرایا، العیاذ باللہ۔

(۴) حضرت سلیمان علیہ السلام بڑے ساحر تھے (العیاذ باللہ) اسی سحر و جادو کی قوت سے وہ جنات و شیاطین اور انسانوں و حیوانات پر حکومت کرتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حیرانی ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی ساحر پیغمبر ہو؟

(۵) وہ یہ بھی کہتے تھے کہ سحر و جادو کے بانی، یا اسے عام کرنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ اس علم کے موجد وہی ہیں، نہ کہ شیاطین۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعونی ساحروں کے ساتھ مقابلہ ہوا تھا، اور یہ علمِ سحر بہت قدیم زمانے سے رائج ہے۔

(۶) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل نے فرعونی غلامی کے زمانہ میں مصریوں سے جادو سیکھا، اب سلیمان علیہ السلام کو اس لئے ملوث کیا تاکہ ان کے لئے حجت ہو، کہ انہوں نے یہ علم مصری بت پرستوں سے نہیں سیکھا، بلکہ اپنے پیغمبر سلیمان علیہ السلام سے سیکھا، اور یہ علم نبیوں کا ہے، نہ کہ شیاطین کا۔

(۷) ان آیات میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ آپ علیہ السلام اس قوم کی تکذیب اور الزامات سے پریشان نہ ہوں۔ انہوں نے اگر انبیاء علیہم السلام کو قتل اور ان کی تکذیب کی ہے، تو وہاں ان پر بے جا اور ناروا، غلط الزامات (سحر و جادو) لگا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش بھی کی ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ۳۵] (آپ صبر کریں جیسے عزیمت والے رسولوں نے صبر کیا) پر کاربند رہئے۔

(۸) ان آیات نے بنی اسرائیل کی ناشکری اور خبثِ باطن کا برملا اظہار فرمایا کہ انہوں نے علمِ وحی اور برحق پاکیزہ آسمانی تعلیمات کے بدلے میں شیطانی علم سحر وجادو کا اپنے لئے انتخاب کیا، جس طرح اس سے پہلے حق وہدایت کے بدلے میں انہوں نے گمراہی وضلالت کو خریدا تھا، یہی سب سے بڑا فردِ جرم ہے، جو ان پر عائد ہوا کہ: "أنكروا الحق ورفضوه واتبعوا امكانه ماتتلو الشياطين في عهدملك سليمان ونسبوه إليه وهو بريء منه"۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے برحق (قرآن پاک) کا انکار کیا، اور اس کے بدلے میں انہوں نے شیاطین کے باطل علم سحر وجادو کا اتباع کر کے اسے سیکھا، اور پھیلایا۔ ایک غضب تو یہ ہوا، اور اس غضب کے اوپر دوسرا غضب یہ کمایا کہ اس خبیث شیطانی علم جادو کی نسبت ایک پاکیزہ ہستی حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کردی، جو کہ نہایت قبیح ہے، بلکہ کفر ہے۔

(۹) ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں جتنے علوم مروج ہیں، ان میں سے ایک یہی علمِ سحر بھی ہے، جو کہ باطل وحرام ہے، اس کے موجد شیاطین ہیں، اور اس کا وجود مسلم ہے۔ قرآن وحدیث میں بکثرت اس کا تذکرہ ہے، اور "سورۃ المعوذتین" کی تفسیر میں اس پر تفصیل سے کلام ہوا ہے۔ پس جو لوگ (سائنسدان، معتزلہ، فلاسفہ) اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہے۔ ایسے لوگ فرشتوں اور جنات کے بھی منکر ہیں، اور بعض مغرب زدہ مسلمان مفکر جیسے سرسید اور دوسرے لوگ، وہ تو جنت ودوزخ، وزنِ اعمال اور پلِ صراط کے بھی منکر رہے ہیں، پس کیا حرج؟

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے اس باطل علم اور اس کے برے اثرات سے بچانے، اور اس کے اصول، قواعد اور جزئیات سے آگاہ کرنے کی خاطر قدیم زمانے میں، تین ہزار سال قبل مسیح علیہ السلام بابل (عراق میں) میں دو فرشتے "ہاروت وماروت" بہ شکل وصورتِ انسان بھیجے تھے، تاکہ وہ لوگوں کو یہ علم سکھائیں، اور اس کے اصول وقواعد سے انہیں آگاہ کریں، چونکہ یہ علم سراسر شر اور فتنہ ہے، اس میں کسی خیر کا کوئی پہلو بھی نہیں ہے، اور اس کے بانی صرف شیاطین ہی ہیں، اور وہ فرشتے لوگوں کو سکھانے سے پہلے یہ بھی خبردار کریں کہ اس کا سیکھنا گناہ کبیرہ اور جرم ہے، اس پر عمل کرنا کفر اور ہلاکت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ باطل اور کفر ہے، تو فرشتوں نے کیوں اس کی تعلیم دی؟

جواب: دیکھو! خنزیر کا گوشت حرام ہے، اسی طرح زہر مہلک ہے، مگر اس کی تخلیق میں حرج نہیں ہے۔ پس

اگر کوئی شخص اس کے خواص اور مضرتوں کی تعلیم دے، تو یہ گناہ نہیں ہے، بلکہ فائدہ ہے۔ ہمارے زمانے میں پولیس افسروں اور مجسٹریٹوں کی تربیت وٹریننگ کا رواج ہے، وہاں انہیں ہر قسم کے جرائم اور واردات کی تعلیم دیجاتی ہے، مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان جرائم پر خود عمل کریں، بلکہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان قواعد وضوابط کی روشنی میں جرائم پیشہ افراد اوران کے وارداتوں پر کڑی نظر رکھیں، اور تدارک کریں۔ اسی طرح مذہبی مدارس میں باطل فرقوں کے عقائد کی تعلیم کا مقصد طلبہ کی بیداری ہوتی ہے، نہ یہ کہ خدانخواستہ وہ خود ان پر عمل کریں۔ واللہ اعلم

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے، مگر اس کی خاصیت معلوم کرنا، اور اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا حرام نہیں ہے۔ فلسفہ کے بہت سے مسائل کفر ہیں، لیکن ان کی تعلیم دیجاتی ہے، تا کہ ان کی حقیقت معلوم کر کے اس کا جواب دیا جاسکے۔

اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس کام (تعلیمِ سحر) کے لئے فرشتوں کا کیوں انتخاب ہوا؟ انبیاء علیہم السلام سے یہ کام کیوں نہیں لیا گیا؟ اس کی حکمت اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے فقط۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی بداعمالیوں پر فرشتے ہی معترض رہتے تھے، پس امتحان انہی کا مقصود تھا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے فرائض شرعی احکام تک محدود ہیں، تکوینی امور ان کے فرائض میں شامل نہیں ہیں، بخلاف فرشتوں کے کہ وہ تکوینی امور کی انجام دہی پر مامور ہیں۔

ایک اہم واقعہ کے متعلق وضاحت:

تفسیر عزیزی، تفسیر ابن جریر، درمنثور، ابن کثیر اور بہت سے حضرات نے حضرت ابن عباس، ابن مسعود، ابن عمر، مجاہد، قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہم سے اس موقع پر زہرہ نامی ایک عورت کا واقعہ بڑے شد ومد کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ہاروت ماروت نے اس کو اسم اعظم سکھایا، اور اس کے ساتھ زنا بھی کیا، اور اس کے شوہر اور ایک بچے کو قتل بھی کیا۔ شراب پی لی اور شرک بھی کیا۔ پس زہرہ آسمانوں میں پہنچ کر ''زہرہ'' نامی ستارہ کے ساتھ ضم ہوگئی، اور یہ دونوں بابل کے کنویں میں الٹا لٹکائے گئے، وغیرہ وغیرہ۔

امام رازی، قاضی عیاض اور دیگر مفسرین، متکلمین، محققین رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ کذب وافتراء اور سراسر جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ موضوع اور بے بنیاد ہے۔ کاش! ہمارے علماء کی تصنیفات اس قسم کی موضوعات اور بے بنیاد باتوں سے پاک ہوتیں۔ لوگوں نے اسرائیلیات اور منگھڑت باتوں سے قیمتی کتابوں کے اوراق سیاہ

کر کے کوئی اچھی خدمت نہیں کی۔ و اللہ المستعان

اس خیر الامم کے ابوبکر و عمر عثمان و علی، عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم، باقی طبقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے بعد آنے والے لاکھوں مجاہدین، شہداء، محدّثین دس دس لاکھ حدیثوں کے حافظ، ائمہ مجتہدین، مفسرین ہزار ہزار جلدوں میں تفسیر قرآن لکھنے والے اور ابدال و اقطاب، بڑے بڑے شیوخ و مقربین رحمۃ اللہ علیہم نے اسم اعظم کے لئے زندگیاں وقف کیں۔ ہزاروں حسرتوں میں تڑپ تڑپ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسم اعظم شریف انہیں معلوم نہیں ہوا، اور بابل کی ایک کافرہ فاجرہ، زانیہ، مشرکہ عورت کو اسم اعظم حاصل ہوا، اور اس نے ہزاروں جنابتوں کے ہوتے ہوئے پڑھ لیا، اور آسمانوں پر پرواز کی۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

کثرتِ طرق سے حدیث اس وقت حسن لغیرہ بنتی ہے، جبکہ عقل و درایت کے ساتھ کھلم کھلا متصادم نہ ہو۔ واللہ اعلم

اگر کوئی اس امت سے قطع نظر کر کے بنی اسرائیلی امت میں غور کرے، تو معلوم ہوگا کہ بنی اسرائیل نے چار سو انبیاء کرام علیہم السلام کو شہید کیا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو آری کے ساتھ چیر کر ان کے دو ٹکڑے کئے۔ حضرت یحیٰی علیہ السلام کو مجمع عام میں لا کر بکری کی طرح ذبح کیا، اسی طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی بے دردی کے ساتھ شہید کیا۔ کیا ان سب کو اسم اعظم سے محروم رکھا گیا تھا؟ اور بابل کی فاحشہ خبیثہ کو اسم اعظم سکھا کر اوپر آسمانوں میں دلہن کی طرح اٹھایا گیا؟ اس لئے محققین نے اس واقعہ کو موضوع، بے بنیاد اور منگھڑت قرار دیا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

الغرض! دنیا میں اور خصوصاً بابل میں جادو کا بڑا چرچا رہا ہے۔ اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر ان میں اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہمہ گیر حکمت کے تحت یہ دونوں فرشتے ''ہاروت و ماروت'' بشکلِ انسان زمین پر بھیجے، محض لوگوں کی اصلاح کی خاطر۔ ان دونوں نے اپنے فرائض اور تبلیغی سلسلہ کے ذریعہ لوگوں کو تعلیم دینا شروع کی، اور اصول و ضوابط کی نشاندہی کے ساتھ لوگوں کو اس علم کے خطرات و نقصانات سے خبردار کرتے رہے، اور سیکھنے والوں سے کہا کہ ہم اور یہ ہمارا علم تمہارے لئے آزمائش ہیں۔ ہم سے یہ علم سیکھ کر کفر اختیار نہ کرو۔ جب کوئی اصرار کرتا تھا، تو اسے سکھا دیتے۔

پس لوگ ان دونوں فرشتوں سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے کہ جن کے ذریعہ سے کسی مرد اور اس کی بیوی

کے درمیان تفریق کر دیتے تھے، اور یہ بات واضح ہے کہ نفع ونقصان دونوں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اسی لئے فرمایا کہ یہ ساحر کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور یہ کہ سحر وجادو خالص شر ونقصان کی چیز ہے، اس میں خیر کا پہلو کوئی بھی نہیں ہے، اور جو لوگ یہ عمل کرتے ہیں، ان کو آخرت میں سوائے نقصان اور ناکامی کے کچھ بھی حصہ نہیں ملے گا، اور یہود یہ سب کچھ جانتے ہوئے پھر بھی اس عملِ شر پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ کاش! یہ جانتے ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ اسی ایک آیت میں ان کے لئے علم کا اثبات بھی ہے اور نفی بھی۔ تو معلوم ہوا کہ علم کے تقاضوں پر عمل نہ کرنے والے کا شمار بے علم اور جاہلوں میں ہوگا، اور یہ پکی بات ہے۔

اگر وہ لوگ (یہود) بجائے اس کفر وبد عملی کے ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے، آسمانی وحی کی اتباع کرتے، اور شیاطین کے علم سے تائب ہو کر اسے چھوڑ دیتے، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کا معاوضہ اس کفر وبد عملی سے ہزار درجہ بہتر ہوتا۔ کاش! اگر یہ جاننے والے ہوتے۔

سحر کی حقیقت:

سحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں، جس کا سبب ظاہر نہ ہو۔ [قاموس] اسی طرح حلقوم، گلے اور پھیپھڑے کو بھی سحر کہتے ہیں۔ اطباء حضرات طبیعت کو ساحرہ کہتے ہیں۔ مطلب تقریباً سب کا ایک ہی ہے کہ سبب ظاہر نہ ہو، خواہ وہ سببِ معنوی ہو، جیسے: خاص خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے: جنات وشیاطین کا اثر، یا مسمریزم میں قوتِ خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا، مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے، جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر، جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں، یا نجوم وسیارات کا اثر وغیرہ۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرف عام میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے، جن میں جنات و شیاطین، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم، یا کچھ اور الفاظ وکلمات کا عمل دخل ہو، کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے، اور تجربہ و مشاہدہ بھی یہی ہے، اور قدیم وجدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف وکلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں۔ کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص طریقے پر، کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ (بعض لوگوں نے حروف میں عناصرِ اربعہ: خاک، باد، آب، آتش جیسی صفات کا بھی اثبات کیا ہے) یا ایسی تاثیرات جو انسانی ہڈیوں، خون، ناخن، بالوں وغیرہ اعضاء یا اس کے استعمالی لباس کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کر کے پیدا کی جاتی ہیں، جن کو عرف عام میں ٹونہ ٹوٹکا کہا جاتا ہے، اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اصطلاحِ قرآن وسنت میں سحر ہر ایسے امرِ عجیب کو کہا جاتا ہے، جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو۔ پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں: کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں، جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں، اور شیاطین کی مدح وتعریف کی گئی ہو، یا کواکب ونجوم کی عبادت اختیار کی گئی ہو، جس سے شیاطین خوش ہوتے ہیں۔ کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں، جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا، یا جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد ان اقوال وافعال سے حاصل کی جاتی ہے جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں، مثلاً طہارت وتقویٰ، پاکیزگی، خوشبو وعطر اور ذکر اللہ تعالیٰ ودیگر اعمالِ خیر، نماز، وضوء، تلاوت، تسبیحات وغیرہ، اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال وافعال سے حاصل ہوتی ہے، جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر ایسے لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے، ناپاک اور نجس رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نام اور پاکی سے دور رہیں۔ خبیث کام کریں۔ رات دن مرداری وناپاکی میں گزاریں۔ ابلیس کے ناموں کا رٹ لگائیں، کیونکہ ساحر اگر مسلمان تھا اور وضوء و طہارت کے ساتھ رہا۔ بسم اللہ شریف اور کبھی تسبیح وتحمید زبان سے بھی ادا کی، تو اس کا سحر غیر مؤثر اور بے مقصد ہوگا۔ ساحر کا جادو اس شرط پر مؤثر وکارگر ہوگا کہ جب وہ دولتِ ایمان سے محروم ہو، ایمان اور جادو جمع نہیں ہو سکتے۔

جادو کے متعلق چند ضروری باتیں:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ جادو کے وجود اور حقیقت کے منکر ہیں وہ صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ واقع میں جادو کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ محض وہمی خیالات اور افسانے ہیں۔ سو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ قول باطل اور حقیقت کے خلاف ہے۔ قرآن وسنت اور علماء امت نے بکثرت دلائل اور واقعات سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ موجود رہا ہے، اور رہتی دنیا تک اس کا وجود رہے گا۔

(۲) دوسرا یہ کہ یہ علم سراسر ناپاک اور نجس ہے۔ اس کے بانی مبانی شیاطین ہیں، اور شیاطین کے رہنے تک یہ علم بھی رہے گا، کیونکہ اس میں سوائے شر کے کسی قسم کی خیر اور بھلائی کا مادہ نہیں ہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ جادو بابل کا ہو یا مصر کا، ایران کا ہو یا بنگال کا، ہندو کا ہو یا سکھ کا، جب تک اس میں کفریہ شرکیہ خبیث الفاظ وکلمات شامل نہ ہوں، اور ناپاکی کی حالت میں اس کو ترتیب نہ دیا گیا ہو، اور ناپاک شخصیتوں (انس و جن) نے اس کو جاری نہ کیا ہو، وہ ہرگز مؤثر نہیں ہوتا۔ اس کی تاثیر اور واقع ہونے کے لئے یہ تینوں چیزیں ضروری

ہیں، تب وہ اثر کرے گا۔

(۴) چوتھا یہ کہ جادو کے آثار مختلف ہوتے ہیں، اور یہی آثار دراصل جادو کی انواع واقسام شمار ہوتے ہیں:

☆......مثلاً یہ کہ جادو سے کبھی لوگوں کی نظر بندی ہوتی ہے، جو کچھ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، خارج (واقع) میں وہ ایسا نہیں ہوتا۔

☆......دوسرا یہ کہ کبھی ناظرین کی قوتِ خیالیہ پر اثر ہوتا ہے، جو کچھ وہ دیکھتے اور سمجھتے ہیں وہ واقع میں موجود نہیں ہوتا۔

اکثر مفسرین حضرات نے یہی کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جادوگروں کی لاٹھیاں اور رسیاں سانپ معلوم ہوئیں، جو دوڑ لگا رہے تھے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ﴾ [طٰہٰ:۶۶] (جب انہوں نے چیزیں ڈالیں) تو ناگہاں ان کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسی آنے لگیں کہ وہ (میدان) میں ادھر اُدھر دوڑ رہی ہیں)۔ یعنی ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں۔ اس میں ﴿يُخَيَّلُ إِلَيْهِ﴾ کے لفظ سے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں، حقیقت میں نہ سانپ بنیں، اور نہ انہوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ خیالیہ متأثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

☆ تیسری قسم جو کہ شیاطین کی وساطت سے ہوتی ہے، یہی قسم ہر زمانہ میں کثیر الوقوع رہتی ہے۔ جادوگر لوگ اپنے مخالفین پر سخت جادو کر کے ان کی زندگیاں تباہ کرتے ہیں، یا عام بدخواہ لوگ اپنے مخالفین کے خلاف جادوگروں کو بھاری فیس دے کر طرح طرح کی جانی و مالی پریشانیوں اور ہر قسم کی بیماریوں میں مبتلا کر کے سکون وراحت محسوس کرتے ہیں، اسی قسم میں یہ بھی ہے کہ سحر کے ذریعہ ایک شئے کی حقیقت کو بدل دیتے ہیں، جیسے کسی انسان کو پتھر یا گدھا یا کتا بنا دینا۔

امام جصاص اور امام راغب اور دیگر حضرات رحمۃ اللہ علیہم نے اگرچہ اس انقلابِ حقیقت سے انکار کیا ہے، مگر بعض علماء نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ بعض تاریخی کتب میں اس قسم کے بہت سے واقعات کا ظہور اور ثبوت موجود ہے، اور جمہور علماء نے اسے تسلیم کیا ہے کہ انقلابِ اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے، نہ شرعی، اور اس کے جواز اور ثبوت پر حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے، جو کہ موطا امام مالک میں بروایت قعقاع بن حکیم

منقول ہے: "لَوْ لَا کَلِمَاتٌ اَقُوْلُهُنَّ لَجَعَلَتْنِیَ الْیَهُوْدُ حِمَارًا"۔ (اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی لوگ مجھے گدھا بنا دیتے)۔

یہاں بغیر ضرورت معنی مجازی (بیوقوف) مراد لینے، اور اس پر محمول کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ پس ظاہری و حقیقی معنی ہی مراد ہوں گے، کیونکہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ اونچے درجے کے یہودی عالم تھے، جب امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام قبول کیا، تو یہود ان کے پیچھے پڑ گئے، اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئے۔ وہ انہیں جادو کے زور سے جانور، گدھا بنانے پر مصروف رہے، مگر وہ اپنے منصوبے میں اس لئے ناکام رہے کہ آپؓ کے پاس جادو سے حفاظت کی دعاء موجود تھی، جسے وہ پابندی کے ساتھ صبح و شام پڑھ کر محفوظ رہتے، وہ دعا یہ ہے: اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ لَیْسَ شَیْئٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِهِ التَّامَاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰی كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَءَ وَذَرَءَ... الخ۔

سحر اور معجزہ میں فرق:

جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں، جو خلافِ عادت ہیں، انہیں خرقِ عادت کہا جاتا ہے۔ بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے اکثر لوگوں کو ان دونوں میں التباس ہو جاتا ہے۔ دراصل بابل میں ہاروت و ماروت کے اتارے جانے کا اصلی مقصد بھی یہی تھا کہ وہ لوگوں کو سحر و جادو کی حقیقت بتا دیں، اور معجزات کے صحیح رخ اور کیفیت سے لوگوں کو آگاہ کریں، تا کہ حق و باطل کا مکمل امتیاز ہو۔

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے، اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے۔ حقیقت کا فرق یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں، یہ دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں، فرق صرف اسباب کے ظہور و خفا کا ہے، جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں، وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں، تو وہ تعجب کی چیز بنتی ہے، اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرقِ عادت سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی امور کی طرح کسی شیطان اور جن کے اثر سے ہوتی ہے۔

ایک خط مشرقِ بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آ کر گر گیا، تو دیکھنے والے اسے خرقِ عادت ہی تصور

کریں گے، حالانکہ جنات اور شیاطین کو ایسے اعمال و افعال کی قوت دی گئی ہے۔ ان کا ذریعہ معلوم ہو، تو پھر کوئی خرقِ عادت نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسبابِ طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرقِ عادت کا ہوجاتا ہے، بخلافِ معجزہ کے کہ وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ اس میں اسبابِ طبعیہ کا بالکل دخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہوجا، مگر ٹھنڈک بھی اتنی نہ ہو، جس سے تکلیف پہنچے، بلکہ اتنی ٹھنڈی ہو جس سے سلامتی حاصل ہو، اس حکمِ الٰہی سے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔

آج کل ایک مسالہ ایجاد ہوا ہے، جسے بدن پر ملنے کے بعد لوگ آگ میں داخل ہوتے ہیں، پھر صحیح سالم باہر آجاتے ہیں۔ یہ معجزہ نہیں ہے، بلکہ دواؤں (اسباب) کا اثر ہے۔ دوائیں مخفی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو خرقِ عادت کا دھوکا ہوجاتا ہے۔ قرآن حکیم نے خود تصریح فرمائی کہ معجزہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ [الأنفال:۱۷] (جس وقت آپ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ آپ نے نہیں پھینکی تھیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں)۔ یہ معجزہ غزوۂ بدر میں پیش آیا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنگریزوں کی ایک مٹھی ہاتھ میں لے کر مشرکین کے لشکر پر پھینکی، بحکمِ الٰہی سارے لشکر کی آنکھوں میں پڑگئی، تو ظاہری سبب اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ مبارک تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا معجزہ تھا، مگر مشتِ خاک کو تقریباً ایک ہزار لوگوں کی آنکھوں تک پہنچانا اور ان کی آنکھوں میں ڈالنا یہ سب کچھ ربّ العزّت سبحانہ کا فعل تھا، اسی لئے تصریح فرمائی: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ پس واضح ہوا کہ معجزہ اسبابِ طبعیہ کے بغیر محض ربّ العزّت سبحانہ کا براہِ راست فعل ہے، اور جادو اسبابِ طبعیہ کے تحت ہوتا ہے، جس میں شیاطین وغیرہ کا عمل دخل ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ معجزے کا تعلق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہے، اور کرامت کا تعلق اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے ساتھ ہے۔ یہ حضرات متقی، پرہیزگار، اصحابِ باطن، پاکیزہ اور باعمل حضرات ہوتے ہیں۔ بخلاف جادو کے کہ اس کا صدور ایسے لوگوں کے ہاتھ سے ہوتا ہے، جن میں صداقت کا نام ونشان تک نہیں ہوتا، وہ سراسر خبیث، ناپاک، بے دین، نجس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، یہ سب لوگوں پر عیاں وآشکارا ہے۔

☆ ☆ ☆

جادو کا اثر انبیاء علیہم السلام پر:

سحر جب اسبابِ طبعیہ کا اثر ثابت ہوا، تو اسبابِ طبعیہ سے متأثر ہونا شانِ نبوت کے منافی نہیں ہے، جیسے پیاس، بھوک، بیماری، رنج و پریشانی، یہ سب اسبابِ طبعیہ کے ماتحت انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی طرح پیش آئے جس طرح عام لوگوں کو۔ اسی طرح لبید بن اعصم اور اس کی بیٹیوں نے جو سحر کیا تھا، اس موقع پر معوّذتین کا نزول ہوا، پھر ''ذی اروان'' کنویں سے وہ جادو کے پرزے نکالے گئے۔ اس کی مکمل تفصیل سورۃ المعوّذتین کی تفسیر میں آئے گی۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۰۴

ترجمہ: اے ایمان والو! مت کہو ''رَاعِنَا''، بلکہ کہو ''اُنْظُرْنَا'' اور سنو، اور کفار کے لئے دردناک عذاب ہے ۝۱۰۴

معارف ومنازل

قرآن کریم میں اٹھاسی جگہ اس امت کے مسلمانوں کو ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب ہوا ہے۔ یہ ان میں سے پہلا موقع ہے، اور فرشتوں کا تذکرہ بھی قرآن مجید میں اٹھاسی مقامات پر ہے، جبکہ شیاطین کا تذکرہ بھی اسی تعداد میں ہے۔ سبحان اللہ! اس میں ایک عجیب ولطیف اشارہ ہے، کہ مسلمان طہارت میں فرشتوں کی اتباع و اقتداء کریں، اور شیاطین سے اجتناب و پرہیز کریں۔

کتبِ سابقہ میں ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوا ہے۔ کسی امت کو کسی بھی خطاب میں شامل نہیں کیا گیا، پھر انبیاءِ کرام علیہم السلام کو اپنی اپنی امتوں کو خطاب کا حکم ہوا، بخلاف اس امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے، کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خصوصی خطاب کے ساتھ نواز کر اس کی برتری اور افضلیت ثابت فرمادی: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ [آل عمران: ۱۱۰] (تم بہترین امت ہو) یہ بہت ہی بڑا اعزاز ومنقبت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم جب قرآن کریم پڑھو، اور آیت: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے خطاب سنو، تو فوراً اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کرو، اور قلب کو حاضر رکھو کہ اللہ تعالیٰ تم کو بلاواسطہ خطاب فرمارہے ہیں۔ ایک نیک عمل کی بجا آوری کا، یا کسی برے عمل سے اجتناب کا حکم صادر فرمارہے ہیں، اسے

غنیمت سمجھو۔[بیہقی ،زوائد مسند احمد]

''رَاعِنَا'' ذومعنی لفظ ہے۔یہود جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تو ''رَاعِنَا'' کہتے ،اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حاضری میں یہ لفظ استعمال کرتے ،مگر استعمال میں بڑا فرق تھا۔پہلا استعمال گندہ اور ناپاک ارادوں پر مبنی ہوتا تھا،جبکہ دوسرا استعمال ادب اور عقیدت پر مبنی ہوتا تھا۔یہود کی عبرانی زبان میں ''رَاعِنَا'' ایک برے معنی (حماقت) پر بولا جاتا تھا،پھر یہ احمق لوگ ''رَاعِنَا'' کوکھینچ کر پڑھتے، یہ ''رَاعِيْنَا'' بن جاتا،''رَاعِيْ ''عربی میں چرواہے کو کہتے ہیں۔

ایک موقع پر یہودی لوگ بارگاہِ رسالت میں آئے ،اور طنزاً یہ لفظ استعمال کیا۔حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مجلس میں حاضر تھے،اور عبرانی زبان سیکھے ہوئے تھے۔فوراً انہیں اندازہ ہوا،تو یہود سے کہنے لگے کہ اگر آئندہ تم نے یہ کلمہ استعمال کیا تو تمہاری سب کی گردنیں اڑادوں گا،اور تمہیں قتل کردوں گا۔اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ان کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی ایسے مبہم اور وہم پیدا کرنے والے کلمات کے استعمال سے روکا گیا،اور آئندہ کے لئے یہ اصول وضع ہوا کہ جس لفظ کے استعمال سے ''وہم'' اور بے ادبی پیدا ہونے کا خطرہ یا امکان ہو،تو ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع ہوگا،اگر چہ متکلم کی نیت صحیح ہو۔

مطلب یہ ہے کہ دشمن کے مکر وخیانت سے ہر حال میں بچنا چاہیے،اور اس کو کسی بھی قسم کی چال بازی اور استخفاف فی الدین کا موقع نہیں دینا چاہیے۔جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس لفظ کا استعمال ترک کردیں گے،تو دشمن کو آئندہ ہمیشہ کے لئے سبق مل جائے گا،اور ان پر استہزاء کا دروازہ بند ہوجائے گا۔اور ﴿اُنْظُرْ نَا ﴾ کہنے میں چونکہ کسی بے ادبی اور مفاسد کا احتمال نہیں ہے،یہ لفظ احتمالاتِ فاسدہ سے پاک ہے،لہٰذا یہ بہتر رہے گا۔

مگر ﴿وَاسْمَعُوْا﴾ کلمہ کے ساتھ ایک تاکیدی تنبیہ ہے،کہ جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں کچھ سنا رہے ہوں،تو توجہ کے ساتھ ہمہ تن گوش بن کر سنو،تاکہ ﴿اُنْظُرْ نَا ﴾ کہنے کی بھی نوبت نہ آئے،کیونکہ یہ بھی شانِ نبوت کے مناسب نہیں ہے کہ ایک ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو، بلکہ کمالِ ادب اور انتہائے تعظیم یہ ہے کہ غور سے سنو،تاکہ سوائے ایک سخت ضرورت کے دوبارہ پوچھنے،اور ﴿اُنْظُرْ نَا ﴾ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

فائدہ:

اس آیت کی کڑی کو سورۃ حجرات کی ابتدائی کڑیوں کے ساتھ ملانے سے ایک اہم اور عالمگیر عشق ومحبت اور

خلوصِ ادب واحترام کا جذبہ نمایاں ہوگا، کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اپنے حبیب پاک سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور بلندیٔ مقام کا کتنا زیادہ خیال رکھا ہے؟ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے لئے جن لوگوں کا انتخاب فرمایا ہے، وہ کتنا عظیم انتخاب ہے کہ جنہوں نے زندگی بھر ہر میدان میں جان نثاری کے اعلیٰ ثبوت پیش کئے۔ اور کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نام لے کر نہیں پکارا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی بھی فرمان کے ماننے میں کوئی تأمل اور چون و چرا نہیں کیا۔ اور نظر جما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کو دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔

یہ چیزیں کسی کو اہلِ کتاب کی تاریخ میں ہرگز نہیں مل سکتیں، یہود و نصاریٰ کے نافرمان لوگوں نے کبھی تو اپنے پیغمبروں کو صحیح معنوں میں تسلیم بھی نہیں کیا۔ ان عظیم ہستیوں پر طرح طرح کے بہتان لگائے۔ انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر شہید کیا، اور ان کی ہر بات کا انکار کر کے ان کا مذاق اڑایا، تب ہی تو ملعون و مغضوب ہوئے۔ رحمت کا لقب اور سلامتی و خیر کا نام صرف اس آخری امت کے حصہ میں آیا۔ فرمایا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ [آل عمران:۱۱۰] (مؤمنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو)۔ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا﴾ [البقرة:۱۴۳] (اور اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا ہے)۔ الحمد للہ رب العٰلمین۔

❁ ❁ ❁

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ
خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ نہیں پسند کرتے کہ تمہارے ربّ کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی اتاری جائے، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ﴿۱۰۵﴾

معارف ومنازل

کفار اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، تمہاری عداوت و دشمنی دونوں کے قلوب میں یکساں و برابر ہے۔ ان میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا کہ تم آباد و کامیاب رہو، وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے ربّ کی طرف سے تم پر کوئی بہتری اور کامرانی کی چیز اتاری جائے۔ مشرکین مکہ تو یہ کہتے رہتے تھے کہ: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ [الزخرف:۳۱] کہ یہ قرآن ابوجہل بن ہشام، یا عروۃ بن مسعود جیسے

بڑے لوگوں پر کیوں نہیں اترا؟ جو قوم کے رئیس اور سردار ہیں۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نہ اپنی قوم کے رئیس ہیں، نہ سردار! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ کوئی عام آدمی ہو؟ ابوجہل اور اس کے ہمنوا سرداران قریش اگر سرور عالم ﷺ کو برحق نبی تسلیم کر لیتے تو ان کی سرداری ختم ہوجاتی، اور وہ عام رعایا میں شامل ہوجاتے۔

دوسری طرف اہلِ کتاب پر اُمید تھے کہ نبی آخرالزمان بنی اسرائیل میں آئے گا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ ہرقلِ روم نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے بھی یہی کہا تھا: "وَقَدْ كُنْتُ اَعْلَمُ اَنَّهُ خَارِجٌ وَلَمْ اَكُنْ اَظُنُّ اَنَّهُ مِنْكُمْ"۔ [بخاري] میں یقین سے جانتا تھا کہ آخری نبی آنے والے ہیں، مگر میں اتنا نہیں جانتا تھا کہ وہ تمہارے عرب میں مبعوث ہوں گے۔

بہر حال! جب آخری نبی بنو اسماعیل عرب میں مبعوث ہوئے، تو یہود حسد کی آگ میں جلنے لگے، لہٰذا انہوں نے عناد اور حسد کی بنیاد پر آپ ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا، اور سراسر منکر ہوگئے۔

﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ﴾ فرمایا: نبوت ہو، یا اور کوئی منصب، اللہ تعالیٰ جسے چاہے عطا کرے، اور وہ جب بھی چاہتا ہے، جسے بھی چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے۔ وہ جل شانہ بڑے فضل والا ہے۔ اس کی بخشش اور ہر قسم کی عنایت موروثی نہیں ہوتی، اور جو لوگ (یہود قوم) اس آخری نبوت کو بطورِ وراثت اپنے اندر دیکھنا چاہتے ہیں، اور پرزور اس کی تمنا کرتے ہیں، انہیں شرم آنی چاہئے، اور اپنے گریباں میں منہ ڈال کر سوچنا چاہئے کہ نبی آخرزمان ﷺ سے پہلے جو انبیاء کرام علیہم السلام بنی اسرائیل میں آئے، انہوں نے ان انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اور کہاں تک ان پر ایمان لائے؟ اور ان کی اتباع کی؟ یہ محض اپنی ضد و حسد کی بناء پر یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔

یہ لوگ ایمان وصداقت سے کوسوں دور گمراہیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے خاندانی (بنی اسرائیلی) انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہیں لائے۔ ان کی تکذیب کی، اور سینکڑوں انبیاء کرام علیہم السلام کو شہید کیا، اسی طرح آخری نبی ﷺ پر بھی ان کو ایمان نہیں لانا تھا، اور ہر طرح کی تکذیب ہی کرنی تھی محض بہانہ بنا کر کہنے لگے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر نہیں ہے، وغیرہ۔ یہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے بت پرستی کو اسلام پر ترجیح دے کر مشرکینِ مکہ سے کہا تھا کہ تمہارا دین محمد (ﷺ) کے دین سے بہتر اور برحق ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: جوہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں، یا بھلا دیتے ہیں، تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟﴿۱۰۶﴾ کیا آپ نہیں جانتے کہ بیشک! اللہ تعالیٰ کے لئے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے؟ اور تمہارے لئے اس کے سوا نہ کوئی حمایتی ہے، اور نہ مددگار﴿۱۰۷﴾

معارف ومنازل

﴿مِنۡ اٰيَةٍ﴾ میں "مِنۡ" بیانیہ ہے۔ اور نسخ کے دو معنی آتے ہیں: ایک نقل اور کتابت، یعنی نسخ الکتاب بھی اسی سے مأخوذ ہے۔ دوسرے معنی رفع، اِزالہ، اٹھانا علٰحدہ کرنا ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں: نَسَخَتِ الشَّمۡسُ الظِّلَّ علٰحدہ کردیا دھوپ یا آفتاب نے سایہ کو۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، یہ معنی باعتبار لغت کے ہیں۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ کتاب اللہ میں نسخ چند وجوہ پر آیا ہے:

(۱) ایک تو کسی آیت کی تلاوت کا منسوخ ہونا، اور حکم کا اپنے حال پر باقی رہنا، جیسے آیتِ رجم کا حکم باقی ہے، اور اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی۔

(۲) یا حکم کا منسوخ ہونا، اور تلاوت کا اپنے حال پر باقی رہنا، جیسے: اقارب (رشتہ داروں) کے لئے وصیت کرنے کی آیت، اور وہ آیت جس میں عدّتِ وفات ایک سال آئی ہے۔

(۳) یا تلاوت اور حکم دونوں کا منسوخ ہونا، چنانچہ کہتے ہیں کہ سورۃ احزاب مثل سورۃ بقرہ طویل تھی، اس کے اکثر حصہ کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ کرکے اٹھادیئے گئے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ جس آیت کا حکم منسوخ ہو، اس کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ اس منسوخ حکم کی جگہ دوسرا حکم قائم مقام ہو، جیسے: اپنے رشتہ داروں کیلئے وصیت کرنے کا حکم تھا، مگر یہ حکم میراث والی آیت سے منسوخ ہوگیا، اور ایک سال عدّتِ وفات کا حکم چار ماہ دس روز سے منسوخ ہوگیا، اور دوسری قسم یہ ہے کہ دوسرا حکم قائم مقام نہ ہو، جیسے: عورتوں کا امتحان کہ ابتداء میں تھا، بعد میں منسوخ ہوا، اور اس کی جگہ دوسرا حکم نازل نہیں ہوا۔ اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نسخ ہمیشہ احکام اور اوامر ونواہی میں ہوتا ہے، اخبار میں نہیں ہوتا۔

﴿اَوْ نُنْسِهَا﴾ کے معنی دو ہیں: ایک معنی تاخیر کے، یعنی کچھ آیتوں کا نزول مؤخر کر دیتے ہیں، یعنی لوح محفوظ میں مؤخر کر کے نازل ہی نہیں کرتے ہیں، تو نسأ کے معنی ''بالکل نہ اتارنا''۔ دوسرا معنی ''بھلا دینا، ذہن سے محو کرنا''، جو کہ حفظ کے مقابل ہے۔ اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک سے نزول کے بعد کسی آیت کو محو کر دیتے ہیں۔

حضرت ابو امامہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک شب نماز کے لئے کھڑے ہوئے، اور ایک سورت پڑھنی چاہی، تو وہ سورۃ سوائے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بالکل یاد نہ آئی۔ صبح یہ لوگ سید کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور واقعہ عرض کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس سورت کی تلاوت اور حکم دونوں اٹھا لئے گئے ہیں۔ [مظہری]

شان نزول اور احکامِ الٰہیہ میں نسخ کی حقیقت وحکمت:

جب تبدیلی قبلہ کا مرحلہ پیش آیا۔ بیت المقدس کی بجائے کعبۃ اللہ شریف کے استقبال کا حکم ہوا، تو یہود نے حسبِ عادت وفطرت خوب شور مچایا۔ اسلام میں پہلا عمومی نسخ کا واقعہ یہی استقبالِ قبلہ تھا۔ اس پر یہود اور مشرکین نے اعتراض شروع کیا، کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ صبح شام احکام بدل رہے ہیں۔ بہر حال انہوں نے لعن وطعن میں کوئی کمی نہیں کی، پس اس پر ان آیتوں کا نزول ہوا۔

نسخ کی اقسام بیان کرنے سے پہلے اس کی حقیقت وحکمت کا بیان ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کی حکومتوں اور اداروں، بلکہ محلّہ اور گھریلو معاملات میں کسی حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم جاری کر دینا عام طور پر مشہور و معمول ہے، مگر یہ تبدیلی انسانوں کے احکام اور خدائی احکام میں ایک جیسے برابر نہیں۔ ان دونوں تبدیلیوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے، کیونکہ انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے یا کسی غلط مشورہ کی بناء پر کوئی حکم جاری کیا گیا، جو اس وقت اور حالات کے مناسب تھا، اور آگے آنے والے حالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدل گئے، تو حکم بھی تبدیل ہو گیا، کیونکہ سابق حکم کا ایسے حالات میں باقی رکھنا مشکل تھا۔ یہ دونوں صورتیں احکام خداوندی میں نہیں ہو سکتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اول ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے، اور جو حکم ابھی دیا جا رہا ہے، وہ حکم تبدیلئ حالات کے بعد مناسب نہیں ہوگا، وہاں دوسرا حکم دینا ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے

اس نے آج ایک حکم دے دیا، اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے، تو اپنی قرار دادِ سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے کہ جب نیا نیا اسلام آیا، احکام آئے، عرصۂ دراز سے لوگوں نے کسی قسم کی شرعی پابندی نہیں دیکھی، اور نہیں سنی تھی۔ مادر پدر آزاد زندگی کے عادی تھے۔ وہ کسی سخت شرعی حکم کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، جب لوگ شرعی احکام کے عادی ہو گئے، تو اسلام نے تدریجاً تدریجاً احکام کے ذریعہ ان کی تربیت کی۔ جب لوگ شرعی احکام کے تحمل کے عادی ہو گئے، اور علم و عمل کے میدان میں پختہ ہو گئے، تب سخت سخت احکام کا تدریجاً نزول شروع ہوا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ مریض کی موجودہ حالت کو دیکھ کر معالج ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس دوا کے استعمال کے چند روز بعد مریض کا حال بدل جائے گا، اور وہ کسی طاقتور دوا کے استعمال کے قابل ہو جائے گا، اور مجھے اس کے لئے دوسری دوا تجویز کرنی ہوگی۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے اس مریض کے ضعف کو دیکھ کر ایک دوا جو مناسبِ حال ہو تجویز کرتا ہے، جب چار دن بعد وہ دوبارہ مریض کا معائنہ کرتا ہے، تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اب مریض کچھ تندرست اور طاقتور ہے، تو مریض کی خاطر پرانا نسخہ موقوف کر کے نیا طاقتور اور نفع بخش نسخہ تجویز کرتا ہے۔ یہ عین حکمت اور مصلحت ہے، جس میں کوئی شک و تردد نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ سبحانہ کے احکام میں، اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہو سکتی ہے، اور ہوتی رہی ہے۔ ہر آنے والی نبوت، اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی نبوت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی طرح ایک ہی نبوت و شریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم جاری رہا، پھر بتقاضائے حکمت خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے، فرمایا: ''لَمْ تَكُنْ نُبُوَّةٌ قَطُّ اِلَّا تَنَاسَخَتْ'' کبھی کوئی نبوت نہیں آئی جس نے احکام میں نسخ اور رد و بدل نہ کیا ہو۔ [قرطبی]

منکرین نسخ:

معتزلہ اور خوارج جو کسی زمانہ میں پورے اقتدار اور سیاسی نظام پر چھائے ہوئے تھے، اور فی سبیل اللہ فساد کے نظریے پر کاربند رہتے تھے۔ عام احکامِ شریعت تو کیا، وہ بڑے زور و شور کے ساتھ بنیادی اصول و عقائد میں

اہلسنت والجماعت کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیست ونابود فرمایا۔ ابھی پورے عالمِ اسلام میں کہیں ان کا وجود نہیں، سوائے مسقط وعمان کے، کہ وہاں ابھی بھی سرکاری مذہب انہیں کا ہے، گویا جس طرح زمانۂ نزولِ وحی میں احکامِ الٰہیہ شرعیہ میں نسخ ہوتا رہتا تھا، اوراحکامِ شرعیہ بدلتے رہتے تھے۔

جس جب زمانۂ نزولِ وحی کے بعد نسخ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا، جس سے ابلیس علیه اللعنة بڑا پریشان ہوا۔ تواس نے اسلام کے متفقہ عقائدواحکام کے خلاف بڑے عیار، مکار، شاطر شاگردوں کی خدمات حاصل کی، جن میں سرِفہرست روافض (شیعہ) ہیں، اور دیگر بدباطن جہنمی فرقے بھی آتے گئے، اور مٹتے گئے، مگر یہ دجالی فرقہ پہلے سے زیادہ اپنے عروج وترقی پر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب، یہودیت، نصرانیت سب اس کے معاون اورحامی ہیں، اور یہ سب کومعلوم ہے کہ تشیع کا بانی عبداللہ بن سبا یہودی ہی تھا۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَعَلٰی اَتْبَاعِهٖ

روافض نسخ کی تعبیراس طرح کرتے ہیں (العیاذ باللہ) کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ سے غلطی ہوجاتی ہے، وہ کوئی حکم دے دیتا ہے، بعد میں وہ پشیمان ہوجاتا ہے، اوراپنے اس سابق حکم کومعطل کردیتا ہے۔ روافض کی اصطلاح میں اسے نسخ نہیں کہتے ہیں، بلکہ اس کا نام ''بدا'' ہے، جوان کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ [اصول کافی، ج:۱، ص:۱۴۶]

ہمارے اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایسا عقیدہ رکھنا صریح کفراورشرک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کاعلم ازلی مَاكَانَ وَمَايَكُوْنُ کے تمام کلیات وجزئیات جمیع ذرات پرمحیط وحاوی ہے، اس میں کسی قسم کی فروگزاشت، سہوونسیان اورغلطی کاامکان تک نہیں، ''وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ''۔

قرآن وسنت میں نسخ کے وجوداوروقوع کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اورائمۂ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم سے اتنے آثار واقوال منقول ہیں، جن کونقل کرنامشکل ہے۔ تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور، معالم، روح المعانی، کبیروغیرہ میں اسانیدِ قویہ صحیحہ کے ساتھ بہت سی روایات بھی مذکورہیں، اورضعیف روایات کاتوشمارنہیں۔ تفسیر کبیرمیں بڑی تفصیل ہے۔

نسخ کے مفہوم میں متقدمین ومتاخرین کی اصطلاحوں میں فرق:

چونکہ نسخ کے اصطلاحی معنی حکم کی تبدیلی کے ہیں، اور یہ تبدیلی جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کرکے اس کی جگہ دوسراحکم لانے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ شریف کوقبلہ بنادینا، اسی طرح کسی مطلق یاعام حکم میں کسی قیدوشرط کوبڑھادینابھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ اسلافِ امت نے نسخ کواسی عام معنی میں استعمال فرمایاہے،

جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن مجید میں آیاتِ منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

متاخرین حضرات نے صرف اس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیاتِ منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی۔ اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیاتِ قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا، اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا۔ ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ قرار دیا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تأویلِ بعید کے نہیں ہو سکتی۔

یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل چیز بقاءِ حکم ہے۔ نسخ خلافِ اصل ہے، اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے، اس میں بلاضرورت نسخ ماننا درست نہیں ہے، لیکن اس تقلیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلۂ نسخِ اسلام یا قرآن مجید میں کوئی عیب تھا، جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی۔ آخر انکشاف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے تقلیلِ تنسیخ پانچ رہ گئی، اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے۔

مسئلۂ نسخ میں ایسا رخ اختیار کرنا، نہ اسلام اور قرآن کی صحیح خدمت ہے، اور نہ ایسا کرنے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور پھر چودہ سو برس کے علماء متقدمین و متاخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جا سکتا ہے، اور نہ مخالفین کی زبان سے طعن و تشنیع اس سے بند ہو سکتی ہے، بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چودہ سو برس تک تمام علماء امت کچھ کہتے رہے ہوں، اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے۔ معاذ اللہ۔ اگر یہ دروازہ کھلے گا، تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائے گا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ آج جو کسی نے تحقیق کی وہ آئندہ کل کو غلط ثابت نہیں ہو جائے گی؟

عصر حاضر میں بعض علماء کی ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں، جو وقوعِ نسخ کے قائل نہیں ہیں، بلکہ ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی طرح عدمِ نسخ کا دعویٰ کر چکے ہیں، جو سراسر غلط ہے، کیونکہ پوری امت کا اس پر اجماع منعقد ہوا ہے کہ قرآن و سنت کے بہت سے احکام میں نسخ کا وجود اور ثبوت بہت ہی واضح ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

نے تطبیق پیدا کر کے تعداد تو کم بتلائی، مگر مطلقاً وقوعِ نسخ سے انکار نہیں فرمایا، اور مذکورہ آیت کریمہ سے پوری امت کے علماء نے استدلال کیا ہے، اور ثبوتِ نسخ پر اس کو حجت قرار دیا ہے۔

اسی طرح جہاد کے سلسلے میں پہلے یہ آیت اتری: ﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ [الأنفال:٦٥] (اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دوسو کافروں پر غالب رہیں گے)۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا ہر شخص دشمن کے دس آدمیوں کا مقابلہ کرے۔ یہ کتنا بڑا سخت حکم تھا؟ پھر اسے اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما کر آسانی فرمائی، ارشاد ہوا: ﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ (اب خدا نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا اور معلوم کرلیا کہ (ابھی) تم میں کسی قدر کمزوری ہے۔ پس اگر تم میں ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دوسو پر غالب رہیں گے)۔ [الأنفال:٦٦]

اب ایک سو کو کفار کے دوسو کے مقابلہ پر، اور ایک ہزار کو دشمن کے دو ہزار کے مقابلہ پر مامور فرما کر آسانی فرمائی، اور سابق حکم کو ہمیشہ کے لئے منسوخ فرمایا۔ اسی طرح کے بہت سے دیگر احکام جو کتاب وسنت کے اوراق کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(سعدیؒ)

نسخ کے اصول وشرائط:

آیت کریمہ ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ سے نسخ کا اصول اس طرح ثابت ہوا کہ ناسخ منسوخ سے خیر، یعنی قوت میں بڑھ کر ہو، یا کم از کم اس کے مثل اور برابر ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اجماعِ امت اور قیاس چونکہ کتاب وسنت سے قوی اور برابر نہیں ہیں، لہٰذا اجماع اور قیاس کتاب وسنت کے لئے ناسخ نہیں بن سکتے۔

نسخ کی شرائط میں یہ ضروری ہے کہ ناسخ منسوخ سے باعتبارِ زمانہ مؤخر ہو، اگر زمانہ معلوم نہ ہو تو نسخ متحقق نہ ہوگا۔ اسی طرح سابق لاحق کے لئے بھی ناسخ نہیں ہوسکتا۔ ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ نسخ کے لئے صرف احکام متعین ہیں۔ عقائد وایمانیات میں نسخ کا تحقق نہیں ہوتا۔

☆☆☆

علماء کرام نے نسخ کے لئے جو صورتیں متعین کی ہیں، وہ صرف درج ذیل چار صورتیں ہیں:

(۱) ناسخ ومنسوخ دونوں قرآنی آیات ہوں۔ (۲) ناسخ ومنسوخ دونوں احادیث ہوں۔ (۳) ناسخ آیتِ قرآنی ہو، اور منسوخ حدیث ہو۔ (۴) ناسخ حدیث ہو، اور منسوخ آیت ہو۔

پہلی دوصورتوں میں ناسخ ومنسوخ ہم مثل وبرابر ہیں۔ تیسری صورت میں ناسخ آیتِ قرآنی منسوخ (حدیث) سے بڑھ کر ہے، اس لئے یہ تینوں صورتیں بے تکلف صحیح ہیں۔ صرف چوتھی صورت میں ناسخ (حدیث) منسوخ (آیتِ قرآنی) سے قوت میں کمتر ہے، اس لئے یہ مختلف فیہ ہے۔ حضرات احناف رحمہم اللہ علیہم کا مذہب یہ ہے کہ اگر حدیث (ناسخ) قطعی الثبوت، قطعی الدلالۃ ہو، تو قرآن مجید کے لئے ناسخ بن سکتی ہے، کیونکہ حدیث متواتر قرآن مجید کے ساتھ قطعیت میں برابر ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تدریب میں لکھا ہے کہ اگر کسی حدیث کو دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کی، تو اس کو تواتر کا درجہ حاصل رہے گا۔ بہر حال اس چوتھی صورت کو حضرات احناف رحمہم اللہ علیہم کے علاوہ دوسرے ائمہ رحمہم اللہ علیہم نے قبول نہیں کیا۔ واللہ اعلم (تفصیل اصول کی کتابوں میں دیکھی جائے)۔

بابِ نسخ کے مسائل کا خلاصہ، اور ضروری اقسام اور مثالیں:

(۱) کسی آیت کے حکم اور تلاوت دونوں کا منسوخ ہونا، جیسے سورۂ احزاب کا ایک بڑا حصہ۔

(۲) آیت کی تلاوت باقی ہو، اور حکم منسوخ ہو، جیسے: وفات کی عدت ایک سال۔

(۳) آیت کا حکم باقی ہو، اور تلاوت منسوخ ہو، جیسے: ﴿الشَّيخُ وَالشَّيخَةُ اِذَازَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا﴾۔

(۴) ایک حکم منسوخ ہو، مگر اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ ہو، جیسے: اقرباء کی وصیت اور اس کی جگہ میراث، اسی طرح استقبالِ قبلہ شریف۔

(۵) ایک حکم منسوخ ہو، اس کا کوئی بدل نہ ہو، جیسے: عورتوں کا امتحان۔

(٦) کسی حکمِ شرعی کا قبل العمل منسوخ ہونا، جیسے: لیلۃ المعراج کی پچاس نمازیں۔

(۷) کسی حکمِ شرعی کی فرضیت منسوخ ہو، اور استحباب باقی ہو، جیسے: صومِ عاشورہ اور صلوٰۃ التہجد۔

(۸) متقدمین حضرات کے نزدیک نسخ عام ہے، جو ہر تبدیلی کو شامل ہے، جبکہ متاخرین نسخ کے عموم کے قائل

نہیں ہیں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

(۹) متقدمین پانچ سو آیتوں کو منسوخ مانتے ہیں۔ متاخرین صرف بیس آیات، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ صرف پانچ آیتوں میں نسخ کے قائل ہیں۔

(۱۰) اہل سنت والجماعت کثرتِ نصوص کی بناء پر نسخ کا وقوع مانتے ہیں۔ معتزلہ وخوارج وقوعِ نسخ کے منکر اور امکانِ نسخ کے قائل ہیں۔ روافض نسخ کو ''بدا'' کہتے ہیں۔

(۱۱) سوال: نسخ کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

جواب: اس کے اسباب بہت ہیں، مثلاً بندوں کی ابتلاء وآزمائش، شفقت ورحمتِ خداوندی، جیسے پچاس نمازوں کی پانچ کے ساتھ تبدیلی۔ دس کفار کے مقابلے کی دو کے ساتھ تبدیلی، اور وقتاً فوقتاً تدریجی طور پر بندوں کی تربیت وپرورش، جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں بیان ہوا۔ اسی طرح سخت حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ آسان حکم جاری کرنا، تاکہ بندے اپنے ربّ کی شکرگزاری میں منہمک ومشغول رہیں۔

بعض علماء نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ جس طرح انسان تکوینی طور پر ترقی کرتا یا تبدیلیاں اختیار کرتا ہے، چاہئے کہ شرعی طور پر بھی چھوٹے اعمال سے بڑے اعمال کی طرف اس کی ترقی ہو، یعنی سہولت اور کثرت منافع اور ثواب میں، جیسے پچاس نمازوں والا ثواب پانچ کے ضمن میں۔ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [الأنعام: ۱٦۰] (جس نے ایک نیکی کی تو اس کے لئے اس کے دس گنے ہیں) اس کے علاوہ اور بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں، اور ہر چیز وعمل میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کی بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ واللہ اعلم

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [الآیۃ] یہ نسخ کے لئے بھی دلیل ہے، کیونکہ مالک اور بادشاہ کو ہر قسم کے احکام نافذ وجاری کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اور یہ دلیل اول کے لئے بھی دلیل ہے کہ ہر چیز پر قدرت اس وجہ سے ہے کہ وہ تمام چیزوں کا مالک وخالق ہے۔ پس مالک وخالق کو اپنے مملوک ومخلوق پر قدرت ضرور حاصل ہوگی، اور وہی سب کا والی، وارث اور مددگار بھی ہے۔ الحمد للہ

❁ ❁ ❁

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا
وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا
الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١٠﴾

ترجمہ: کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اسی طرح سوال کرو جس طرح اس سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) سے سوال کیا گیا؟ اور جو شخص کفر کو ایمان کے ساتھ تبدیل کرے گا، وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا ﴿١٠٨﴾ اہلِ کتاب میں سے بہت سے پسند کرتے ہیں کہ مؤمن ہونے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پلٹا دیں، اپنے نفسوں میں حسد کرتے ہوئے، بعد اس کے کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو گیا ہے، پس درگزر کرو، اور معاف کردو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ بیشک! اللہ تعالیٰ شانہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿١٠٩﴾ اور نماز قائم رکھو، اور زکوۃ دیتے رہو، اور بھلائی میں سے جو کچھ تم اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجو گے، اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس پالو گے، اللہ تعالیٰ جل جلالہ تمہارے ہر کام کو دیکھنے والا ہے ﴿١١٠﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہے۔ البتہ! مسلمان اور مشرکین سب کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امتِ دعوت اور امتِ اجابت دونوں کو خطاب ہے۔ یہود بیہودہ، نامناسب اور غیر ضروری سوالات کرتے تھے، ان کا مقصد ایمان لانا نہیں ہوتا تھا، بلکہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنگ کرنا، پریشان کرنا ہی ان کا مقصد تھا، اور کبھی مشرکین کو بھی پٹی پڑھا کر کہتے تھے کہ فلاں فلاں سوالات کیا کرو، پھر دیکھو وہ کیا جواب دیں گے۔

ایک دفعہ یہود نے مشرکین سے کہا کہ اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور روح کے متعلق سوالات کرو۔ ایک دفعہ یہود نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک بار دفعۃً تورات کا نزول ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنے ربّ سے کہہ دیں کہ قرآن کریم کو بجائے وقفوں کے ایک مرتبہ نازل کریں۔ کبھی مشرکین بھی یہی کہا کرتے تھے، اس پر ان آیتوں کا نزول ہوا۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ کو تسلّی دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان غیر ضروری اور بیہودہ سوالات سے پریشان نہ ہوں:

﴿فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [النساء:١٥٣] ان بدنصیبوں نے تو موسیٰ

علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا، کہنے لگے: آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے بالمشافہ ہماری ملاقات کرائیں، تاکہ ہم اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھیں، تب ہم مانیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام پر کتاب (توراۃ) اتاری ہے۔ (یہ واقعہ گزر چکا، وہاں دیکھیں)۔

اسی طرح کے سوالات مشرکین نے بھی شروع کر دیئے۔ سورت بنی اسرائیل میں ہے کہ انہوں نے حضرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمائش کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں، اور پھر وہاں سے کتاب لائیں۔ ہماری سرزمین کو باغات میں تبدیل کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد ملائکہ کی جماعت ہونی چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق ہمارے پاس آ کر خود اللہ تعالیٰ کر دے۔ اسی قسم کے دیگر سوالات کا تذکرہ سورۃ الانعام اور سورۃ الفرقان وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

کبھی یہ دونوں فرقے مسلمانوں سے بھی کہا کرتے تھے کہ تم لوگ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فلاں فلاں سوال پوچھو۔ بسا اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ایسے سوالات کرتے رہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ”اِنَّ اللّٰہَ کَرِہَ لَکُمْ ثَلَاثاً ، قِیلَ وَقَالَ وَاِضَاعَةَ الْمَالِ وَکَثْرَةَ السُّؤَالِ“۔ [بخاري] (اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کو تمہارے لئے ناپسند فرمایا ہے:

(۱) سنی سنائی باتوں میں مشغول ہونا۔ (۲) بے جا مال کو ضائع کرنا۔ (۳) کثرت سے بے ہودہ سوال کرنا۔

بہرحال معاندین کے سارے سوالات کا ایک ہی جواب دیا گیا: ﴿قُلْ سُبْحٰنَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ [الإسراء: ۹۳] (کہہ دو کہ میرا پروردگار پاک ہے، میں تو صرف ایک پیغام پہنچانے والا انسان ہوں)۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں قادرِ مطلق ہوں، اور سب کچھ کرنے والا ہوں، بلکہ یہ صفات میرے ربّ تعالیٰ کی ہیں۔ وہی سب کچھ کر سکتا ہے۔ لہٰذا مجھ سے اس قسم کے بیہودہ سوالات نہ کیا کریں، جس کا نتیجہ بہت ہی نقصان دہ ہوگا۔ اعتراض برائے اعتراض، اور وہ بھی ایذاء رسانی کے لئے کفر اور گمراہی ہے، اور جو شخص اس طرح کا کفر اختیار کرے گا، تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گمراہ ہو جائے گا، کیونکہ اس نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کر لیا، جس کا نتیجہ سوائے ضلالت کے کچھ نہیں۔

یہ بات ذہن نشیں ہو کہ بعض مفسرین نے اَمْ تُرِیْدُوْنَ کے مخاطب اہلِ ایمان کو قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ غزوۂ حنین کے موقع پر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ مشرکین ایک خاص قسم کے درخت کو متبرک خیال کرتے

تھے، اور اس درخت کے ساتھ اپنے اسلحہ جات لٹکاتے تھے۔ اس کو ذَاتَ اَنوَاط کہتے تھے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یَارَسُولَ اللّٰہِ اِجعَل لَنَا ذَاتَ اَنوَاطٍ کَمَالَھُم ذَاتُ اَنوَاطٍ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے بھی ایک درخت کو ''ذات انواط'' مقرر فرمائیں، جیسے کہ ان کے لئے ذات انواط مقرر ہے، تاکہ اس پر ہم اپنے ہتھیار لٹکایا کریں، جیسا کہ مشرک کرتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سن کر سخت ناراض ہوئے، اور فرمایا: سبحان اللہ! یہ تو بالکل وہی بات ہوگئی کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں بحیرۂ قلزم عبور کیا، تو وہاں ایک قوم کو پایا: ﴿یَعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ فَقَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ [الأعراف:۱۳۸] (وہ ایسے لوگوں کے پاس جا پہنچے جو اپنے بتوں (کی عبادت) کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔ (بنی اسرائیل) کہنے لگے کہ اے موسیٰ! جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں، ہمارے لیے بھی ایک معبود بنادو)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ناراض ہوئے، اور فرمایا: بیوقوف قوم! یہ تو شرک میں مبتلا ہیں، کیا تم بھی اسی ہلاکت میں ہلاک ہونا چاہتے ہو؟ آئندہ ایسے بیہودہ سوالات نہ کیا کرو۔ [ترمذی، تفسیر کبیر]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ بغیر سوچے سمجھے نیک نیتی کے ساتھ ہر قسم کے سوالات کرتے تھے، حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْــٴَـلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾ [المائدۃ: ۱۰۱] (اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کیا کرو جو اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں)۔ اس کے بعد لوگ اتنے سنجیدہ ہوگئے کہ بسا اوقات ایک ضروری بات پوچھنے سے بھی خوف محسوس کرتے تھے۔ [بخاری]

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے کثرت سوالات پر ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! فضول اور بے مقصد سوال نہ کیا کرو، کیونکہ پہلی اُمتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ ''لِکَثْرَۃِ مَسَائِلِھِمْ وَاخْتِلَافِھِمْ عَلٰی اَنْبِیَاءِھِمْ''۔ [صحیح مسلم]

اکثر یہود شب و روز مختلف تدبیروں اور چالاکیوں سے خیر خواہی، اور دوستی کے پیرایہ میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور طرح طرح کی چالبازی سے انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا﴾ اہل کتاب میں سے بہت سے پسند کرتے ہیں کہ مومن ہونے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پلٹادیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان کا یہ عمل کسی خیرخواہی

پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ تمہارے دینی دشمن ہیں، ان کا یہ عمل صرف اور صرف حسد اور دشمنی پر بنی ہے کہ انہیں حق سے واقفیت نہ ہو، بلکہ:﴿مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡحَقُّ﴾ حق ان پر واضح ہو چکا ہے، مگر حسد نے انہیں اندھا کیا ہوا ہے۔ پس ایسی صورت میں آپ لوگ جذبات سے کام مت لیں، کسی انتقام کی کوشش نہ کریں، بلکہ ﴿فَاعۡفُوۡا وَ اصۡفَحُوۡا﴾ معاف کریں، اور درگزر کریں، جب تک اللہ تعالیٰ اپنا حکم اور کوئی لائحہ عمل (قانون) بھیجیں۔

اشارہ ہے کہ آئندہ ان کے متعلق جہاد اور جزیہ کا حکم آنے والا ہے۔ ان شاءاللہ! یہ سارے آنے والے وقت میں تمہارے سامنے سرنگوں رہیں گے، اور اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ البتہ! اس خاص وقت کے آنے سے پہلے آپ لوگ پابندی کے ساتھ نمازوں کا اہتمام کریں، اور زکوٰۃ دیا کریں، تاکہ تمہیں قربِ الٰہی حاصل ہو جائے، جو ہر طرح کی نصرت و سربلندی کا سبب ہے۔

نیز یہ مت خیال کرو کہ نماز و زکوٰۃ میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہے، بلکہ تم لوگ کم یا زیادہ جو بھی خیر و عمل آگے بھیجو گے، بلاکم و کاست وہ سب کچھ اپنے ربّ کے پاس پاؤ گے، کیونکہ ربّ تعالیٰ تمہارے ہر عمل کو دیکھتا ہے، اور اس کی مع صلہ دیکھ بال کرتا ہے، چنانچہ مختصر وقت کے بعد تمام یہودِ مدینہ کے ساتھ جہاد ہوا، اور ان کے بقایا کو مدینہ طیبہ سے جلاوطن کیا گیا، حتی کہ خلافتِ فاروقی میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام یہود کو جزیرۃ العرب سے بیدخل فرمایا۔ یہ ہے تعبیر:﴿حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ﴾ کی۔ واللہ اعلم

حسد کی حرمت اور غبطہ کا جواز:

حسد ایک بہت بڑا مرض ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے، فرمایا:﴿وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ﴾ [الفلق:۵] سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلۡحَسَدُ يَاۡكُلُ الۡحَسَنَاتِ كَمَا تَاۡكُلُ النَّارُ الۡحَطَبَ۔ [مشکوۃ] حسد نیکیوں کو اسی طرح ضائع و برباد کرتا ہے، جس طرح آگ لکڑیوں کو۔ حسد کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی کو کوئی مال، عزت اور برتری حاصل ہو، اس کے زوال اور محرومی کی تمنا کرے۔ بلاشک! یہ حرام ہے۔ البتہ! غبطہ اور رشک جائز، بلکہ مستحسن ہے۔ وہ یہ کہ کسی کے پاس نعمت دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے ایسی نعمت کی تمنا کرے، چونکہ غبطہ میں زوالِ نعمت کی تمنا نہیں ہوتی، بلکہ اپنے لئے خواہش ہے، اس لئے اس کی اجازت ہے۔ حدیث میں عالم کے علم پر، سخی کی سخاوت پر غبطہ کی ترغیب ہے، اور ترغیب استحسان کی علامت ہے۔ [بخاری]

﴿حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ﴾ اپنی نفسوں میں حسد کرتے ہوئے۔ غیر مسلم اقوام تمام تر اس مہلک

بیماری میں مبتلا ہیں، خاص کر یہود و نصاریٰ میں مسلمان، اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف حسد کی آگ نزولِ قرآن کے زمانے سے لے کر آج تک برابر بھڑک رہی ہے۔ اس وقت تمام یہودی اور عیسائی طاقتیں اربوں ڈالر اس مقصد کے لئے خرچ کر رہی ہیں۔

امریکہ کے پادری کئی مرتبہ لاکھوں عوام کی موجودگی میں سینکڑوں نسخے قرآن مجید کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذر آتش کر چکے ہیں، اور کر رہے ہیں، اور وہ قرآن مجید کو ہاتھوں میں لے کر پکار پکار کر کہتے رہے ہیں کہ دنیا کے امن و سلامتی کے لئے یہ کتاب خطرناک ہے۔ جب تک یہ کتاب کرۂ ارض پر موجود رہے گی دنیا میں امن ہرگز نہیں ہوگا۔

دوسری طرف نبی معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب وازواج رضي الله عنهم أجمعين کے خاکے اخبارات اور ٹیلیوژن کے ذریعہ انتہائی جرأت و بیباکی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، اور مسلمان مستورات کے لئے مذہبی پردہ، سکارف، برقعہ پہننے پر سختی سے پابندی لگا کر باقاعدہ اس کے لیے قانون بنا رہے ہیں۔

ایک برطانوی پادری قرآن کو ہاتھ میں لے کر کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب اور تلوار نے دنیا کے امن اور تہذیب کو تہ و بالا کیا ہوا ہے۔ چاہئے کہ تمام لوگ اس کے وجود سے دنیا کو پاک کریں۔

رئیس المجاہدین حضرت امیر شکیب ارسلان رحمۃ اللہ علیہ نے اَلْحَاضِرُ الْعَالَمُ الْاِسْلَامِیْ (جو ان کی مشہور کتاب ہے) میں لکھا ہے کہ یورپی عیسائیوں اور یہودیوں نے سید کائنات پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کو مسخ کرنے، اور قرآن مجید اور احکامِ اسلامی کی تردید میں چھ لاکھ کی تعداد میں رسائل اور کتابیں شائع کی ہیں، تاکہ مسلمان اپنے نجات دہندہ راہنما پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن مجید و اسلام سے بدظن اور کنارہ کش ہو جائیں، اور دھڑا دھڑ عیسائیت میں داخل ہو جائیں، یا کم از کم ان میں اسلامی جذبات اور اقدار باقی نہ رہیں۔ مشن سکول، مشن ہسپتال، بے شمار این جی اوز اسی مقصد کے لئے اسلامی ممالک میں چل رہے ہیں۔

انڈونیشیا اور سوڈان جیسے اسلامی ملکوں میں باقاعدہ ریاست کے اندر ریاست بنا کر عیسائیت کی داغ بیل ڈال کر ان کی وحدت کو ختم کیا گیا ہے، اسی طرح مراکش، جزائر، تیونس، یمن، شام، عراق اور افغانستان وغیرہ میں جو تباہی اور قتل عام رونما ہے، یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ اے عالم اسلام کے غیور اہل دل، دیندار مسلمانو! ہمارا مستقبل کیسے اور کیا ہوگا؟ جواب دو!!!

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا

بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ
رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠
وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ
لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

ع

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ داخل ہوگا جنت میں، مگر وہ جو یہودی ہو یا نصرانی ہو، یہ ان کی خواہشات ہیں، اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو ﴿۱۱۱﴾ کیوں نہیں! جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دیا، اور وہ نیک کام کرنے والا ہو، پس اس کے لئے اس کے ربّ کے ہاں بدلہ ہے، اور ان لوگوں پر نہ خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۱۲﴾ یہودیوں نے کہا: نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں، اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں (یعنی ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ ہمارا دین برحق ہے، دوسروں کا باطل ہے، حالانکہ یہ کتاب والے ہیں) اور کتاب پڑھتے ہیں، اسی طریقے سے بے علم جاہل مشرکوں نے بھی ان جیسی بات کہی (مشرکوں نے کہا: صحیح دین ہمارا ہے، نہ کہ یہودیت اور نصرانیت، یہ دونوں باطل ہیں) پس اللہ تعالیٰ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾

معارف ومنازل

آیت نمبر ۱۱۱ سے یہود کے چھتیسویں مرض کا بیان ہے۔ آیت نمبر ۱۱۳ میں اسی کی تفصیل بھی ہے۔ اور ان دونوں گروہوں کے زعمِ باطل کے ساتھ ایک تیسرے گروہ کے زعمِ باطل کا تذکرہ بھی ہے، جو کہ جہال اور بے علم ہیں (مشرکین وغیرہ)۔ دراصل پہلا دعویٰ صرف اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں مشرکین کا اشتراک نہیں ہے، کیونکہ وہ قیامت اور جنت دونوں کے منکر ہیں۔ البتہ! دوسرے دعویٰ (مذہب کی حقانیت) میں یہود ونصاریٰ (اہل کتاب) اور بے علم مشرکین تینوں مشترک ہیں۔

پہلا دعویٰ صرف اہلِ کتاب کا ہے کہ یہود کہتے ہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ جنت صرف ہمارے لئے ہے، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا، جنت ہمارے لئے مخصوص ہے۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ یہود نے کہا: حقیقی اور برحق دین ہمارا ہے، اور نصاریٰ کا دین کچھ بھی نہیں، یعنی باطل

ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب ان کا دین باطل ہے، تو جنت میں وہ کیسے جائیں گے؟ تو ظاہر ہے کہ دین کی نفی سے جنت کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے، جبکہ دوسری طرف نصاریٰ نے کہا کہ حقیقی اور برحق دین ہمارا ہے، اور یہود کا دین کچھ بھی نہیں، یعنی باطل ہے، جب یہود کا دین باطل ٹھہرا تو وہ جنت سے محروم ہو گئے، تو ہمارا پہلا دعویٰ ثابت ہوا کہ جنت صرف ہمارے لئے ہے، اور کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس دوسرے دعویٰ میں مشرکین بھی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے چھلانگ لگا کر آئے، اور کہا کہ اصل دین ہمارا ہی ہے (بت پرستی) یہودیت اور نصرانیت دونوں باطل ہیں، یعنی کچھ بھی نہیں۔

ان دونوں غلط دعوؤں کا جواب یہ ارشاد ہوا:

﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ [الآیة] (پس اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن) یہ جواب اول دعویٰ کا بھی ہو سکتا ہے، جبکہ اول و دوم دعوؤں کا مشترکہ جواب یہ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ [الآیة] (کہہ دو اے محمد! لاؤ اپنی دلیل)۔

اسی کے ساتھ دوسری آیت کریمہ: ﴿بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ ان تمام گروہوں کے غلط اور منگھڑت نظریات و خیالات کا جواب بھی ہے، اور عمومی قانون و ضابطہ کا بیان بھی ہے، کہ جنت کا فیصلہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ یہ فیصلہ حضرت حق سبحانہ کے ہاتھ میں ہے، اور اس نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہوا ہے کہ جو کوئی اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے سامنے جھکائے گا، اور اس کے نبیوں اور آسمانی کتابوں کی ہدایات پر کما حقہ عمل پیرا ہوگا، اور وہ احسان کے دونوں درجوں میں سے کسی ایک پر قائم رہے گا، یا دونوں پر، وہ یہ کہ: "تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ"۔

اسی طرح وہ شخص اعمالِ صالحہ پر کاربند و عامل بھی رہے گا۔ پس وہ شخص اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے سارے نیک اعمال کا بدلہ پورا پورا پائے گا، اور ہر قسم کے خوف و پریشانیوں اور رنج و آلام سے محفوظ رہے گا، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اگر کسی میں یہ صفات نہ ہوں، اور وہ صرف کسی نسب و قومیت کی بناء پر جنت کا مدّعی ہوگا، تو یہ اس کی خام خیالی ہوگی، اور اپنی خواہشات پر محض فریب کا شکار رہے گا، وہ جنت تو در کنار! اس کی خوشبو سے بھی محروم اور دور رہے گا۔

حاصلِ استدلال کا یہ ہوا کہ جب یہ قانون مسلّم ہے کہ جو حکم منسوخ ہوتا ہے، وہ قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ قابلِ عمل وہ دوسرا حکم ہوتا ہے، جس نے پہلے والے حکم کو ختم کیا (منسوخ کیا) تو اب بات صاف ظاہر ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے، اور قرآن کریم کے نزول سے سابقہ تمام ادیان اور کتب و احکام منسوخ ہو گئے، اور منسوخ چیز پر ہرگز عمل نہیں ہوتا، اور اس پر عمل کرنے والا نہ مؤمن کہلاتا ہے، نہ فرمانبردار۔ پھر کس طرح وہ جنتی شمار ہوگا؟

ہاں! اگر ان یہود ونصاریٰ کو جنت اور دائمی فلاح کا شوق ہے، تو اس کا فقط ایک ہی راستہ ہے کہ سید کائنات ﷺ پر ایمان لائیں، اور قرآن حکیم کی تصدیق کریں۔ بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ یہود ونصاریٰ اسلام کی آمد سے پہلے مؤمن رہے، کیونکہ وہ اپنے دینِ حق پر قائم رہے، اور وہ دین قابلِ عمل بھی رہا، منسوخ نہیں ہوا۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اسلام (ناسخ) کی آمد سے پہلے بھی وہ کافر رہے۔ ان کا دین اگرچہ منسوخ نہ تھا، مگر ان میں کفر موجود تھا۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے، اور انجیل پر ان کا ایمان نہ تھا، جبکہ نصاریٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توارات کے منکر رہے، اور یہ بات مسلّم ہے کہ کسی ایک نبی کے انکار سے کفر لازم آتا ہے، جیسے پہلے بیان ہوا، تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ یہود اور نصاریٰ کبھی مؤمن نہیں رہے۔ ہاں! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے وہ مؤمن رہے ہوں، تو الگ بات ہے، اور یہ صرف یہود کے بارے میں ہوگا۔

نجران کے نصرانیوں کا وفد جب سرورِ کونین ﷺ کے پاس آیا، تو آپ ﷺ کے پاس یہودیوں کے علماء بھی آئے۔ اس وقت ان لوگوں نے ایک دوسرے پر لعن طعن کئے، اور ایک دوسرے کو گمراہ کہتے رہے، حالانکہ یہ دونوں اہلِ کتاب تھے۔ توارات میں انجیل کی تصدیق، اور انجیل میں توارات کی تصدیق موجود ہے۔ انجیل سے پہلے یہود برحق تھے، اور ان میں ایسے ایسے بے مثال اعلیٰ درجے کے متقی مؤمن ہوئے ہیں، جن کے ایمان وتقویٰ کے عجیب وغریب واقعات احادیث میں موجود ہیں۔

یہود جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار اور ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔ انجیل کی بے حرمتی کرکے اسے نذرِ آتش کیا، تو ان سرکشیوں کی پاداش میں وہ صحیح دین سے محروم ہو کر گمراہ ہوئے۔ ان کے اس رویہ سے تنگ آکر نصاریٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توارات کے منکر ہوئے، اس طرح وہ دونوں دینِ حق سے پھر گئے، اور ہدایت سے محروم ہوگئے، پھر ان میں سے ہر فریق نے خود کو ہدایت یافتہ اور جنتی کہا، اور دوسرے فریق کو گمراہ اور دوزخی قرار دیا، حالانکہ ﴿وَهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ﴾ وہ آسمانی کتابوں والے ہیں، اور ہر کتاب دوسری کتاب کی تصدیق بھی کرچکی ہے۔

جس وقت خاتم الانبیاء ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ کے زمانہ میں نہ اصلی یہودیت باقی تھی، نہ اصلی نصرانیت۔ عرصۂ دراز سے ان دونوں نے آسمانی کتابوں (توارات وانجیل) میں تحریفات کرکے اصلی دین کی پہچان تک ختم کردی، اور خوب ایک دوسرے پر گمراہی کے فتوے لگا کر ہر ایک نے دوسرے کے دین کو باطل قرار دیا تھا۔ ان پہلوانوں کا معرکہ (دنگل) دیکھ کر ایک بے کتاب فرقے کو بھی جوش آیا، تو وہ کہنے لگے: اصلی حقیقی دین تو ہمارا ہی

ہے، یہودیت ونصرانیت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تھے مشرکینِ عرب اور مجوسی لوگ۔

اس پر ربّ العزّت سبحانہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ نہ ختم ہونے والا اختلاف ہے۔ اس کا فیصلہ قیامت پر چھوڑ دو۔ روزِ قیامت جب ہر سیاہ وسفید کا فیصلہ ہوگا، وہاں حق و باطل کا بھی فیصلہ ہوگا، جو حق پر ہوں گے وہ ابدی جنتی ہوں گے، اور جو باطل پر ہوں گے وہ ابدی جہنمی ہی رہیں گے۔ پس بہتر ہے کہ انتظار کیا جائے۔ ﴿قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ﴾ [السباء:۲۶] (کہہ دو کہ: ہمارا پروردگار ہم سب کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان برحق فیصلہ کرے گا، اور وہی ہے جو خوب فیصلے کرنے والا ہے، مکمل علم رکھنے والا ہے)۔ تو وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقت میں صحیح تھیں، لیکن حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے دین اور کتاب سے تمام ادیان منسوخ ہو گئے، اور اب قیامت تک سوائے دینِ اسلام کے اور کوئی دین مقبول نہیں۔ قیامت کے دن جب حق والے جنت میں، اور باطل والے دوزخ میں جائیں گے، تو اس عملی فیصلے سے امتیاز کے ساتھ آنکھوں سے مشاہدہ ہو جائے گا، اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی پر؟

یہ ہوا عملی فیصلہ۔ باقی علمی طور پر فیصلہ تو دنیا ہی میں دلائل اور براہین سے حق اور باطل کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اگر انسانی طبائع میں ضد وتعصب وعناد نہ ہوتا، تو دنیا ہی میں نزاع اور اختلاف مکمل ختم ہو جاتا، لیکن دنیا میں عملی طور پر حق اور باطل کے اختلاف کا فیصلہ کر دینا خلافِ حکمت ہے۔ دنیا دار التکلیف اور دارِ ابتلاء وامتحان ہے۔ عملی فیصلہ یومِ جزاء ہی میں مناسب ہے۔

ایک اہم دستاویز:

یہود ونصاریٰ دونوں نے دینِ الٰہی کی اصل حقیقت کو فراموش کر کے مذہب کے نام پر ایک قومیت بنالی تھی، اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی قوم کے جنتی اور مقبول ہونے، اور اپنے سوا تمام اقوامِ عالم کے دوزخی اور گمراہ ہونے کا معتقد تھا۔ اس نامعقول اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکینِ عرب کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ عیسائیت اور یہودیت دونوں بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔ حق وصحیح صرف ہماری بت پرستی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قوموں کی جہالت وگمراہی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں قومیں صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے ہٹی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کو کسی قومیت کے ساتھ نہ کوئی تعلق رہا ہے، اور نہ ہی کوئی واسطہ۔

قومیت کا نعرہ مذہب کے لئے زہرِ قاتل سے کم نہیں ہے۔ مذہب میں جو وحدت ویگانگت ہے، وہ قومیت سے

ایسا پارہ پارہ ہوجاتا ہے کہ مذہب کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ مذہب میں اللہ تعالیٰ نے جو کمال وخوبی رکھی ہے، قومیت سراسر اس کی ضد اور نفی ہے۔ یہ مذہب ہی کی برکت ہے کہ اس نے عرب وعجم، سیاہ وسفید ہر قسم کی نسلوں کو ایک ربّ، ایک نبی، ایک کتاب اور ایک قبلہ کے گرد جمع کر کے ساری تفریقات اور اختلافات کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا ہوا ہے۔

ے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز ☆ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہمارے آج کے زمانے میں جو لوگ قوم پرست ہیں، اور شب وروز قومیتوں کا پرچار کرتے ہیں، یہ وہ کالے بھیڑیے ہیں، جنہیں یورپ کی عیسائیت ویہودیت نے پالا ہے، جنہوں نے اسلام کی نورانی ہدایات وتعلیمات پر انگریزوں کی خرافات کو ترجیح دے رکھی ہے۔ یہ ہزار دفعہ اسلام اور ایمان کے مدّعی ہوں، مگر بے سود! کیونکہ یہ لوگ رنگ ولباس اور ثقافت وغیرہ میں اگرچہ مسلمان کہلاتے ہیں، مگر ذہنی طور پر یہ یہود ونصاریٰ کے غلام اور کاسہ لیس ہیں، کیا کسی کتے، گدھے کو انسانی لباس پہنانے سے وہ انسان کہلائے گا؟

انسان کی شرافت وپہچان زبان ولباس کا نام نہیں ہے، بلکہ شعور وسوچ اور فکر کا نام انسان ہے۔ اور انسانیت اسی سوچ کے ساتھ وابستہ ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس انسان کا تصور اور ذہن یہود ونصاریٰ کے ساتھ موافق ہوگا، وہ روزِ قیامت انہی کے ساتھ اٹھے گا، اور انہی کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔ [مشکوٰۃ]

حقیقت اور بنیادی اصول یہ ہے کہ مذہب اسلام ہو، یا یہودیت ہو، یا نصرانیت، ان سب کی اصلی روح دو چیزیں ہیں: ایک یہ کہ بندہ دل وجان سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے، جیسے: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۱] (اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم خود کو میرے سپرد کرو، کہنے لگے: بلاشک! میں نے اپنی جان آپ کے سپرد کردی)۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سخت سے سخت آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ انہوں نے بغیر کسی چون وچرا کے سب برداشت کئے، اور بطیبِ خاطر سارے کٹھن مراحل سے گزر کر سارے امتحانوں میں کامیاب ہوئے، اور بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ [النساء:۱۲۵] (اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنالیا) کا سب سے عظیم منصب اور ایوارڈ حاصل کیا۔ فرمایا: ﴿وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ [البقرۃ:۱۲۴] (اور جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی تو ان میں پورے اترے)۔

پوری انسانیت کی امامت کا تمغہ امتیاز حاصل کیا، فرمایا: ﴿اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ [البقرۃ:

۱۲۴] (اللہ نے کہا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا)۔یہی وجہ ہے کہ آج ہر مذہب والے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیح جانشین اور پیروکار ہیں۔

اے بندہ بمن بیا وخود را یلہ کن ☆ پس اگر شاہ جہانت نہ کنم گلہ کن

بندگی کا سب سے بڑا اونچا مقام یہی ہے کہ آپ تن من ، دھن سب کچھ خداوند تعالیٰ کے سپرد کر کے "كَالْمَيِّتِ فِي يَدِ الْغَسَّالِ"۔اس مردے کی طرح بے اختیار و بے حرکت بنو، جسے غسال جیسے چاہے پلٹ دے۔ آپ اپنے سارے اختیارات وخواہشات شریعت کے حوالہ کر دیں، جو حکم ہوگا بصد عجز و نیاز لبّیک کہتے ہوئے سرِ تسلیم خم کر دیں، اور یہ کہیں:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ☆ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

سر سے لے کر پاؤں تک اللہ تعالیٰ کے بنو۔نفس وشیطان کے ساتھ برسر پیکار رہو۔کبھی ان کے ساتھ صلح نہ کرو۔تمہارا قلب صرف اللہ تعالیٰ کا گھر ہو۔اس میں کسی اور کو جگہ نہ دو۔اگر کسی غیر کا وہاں گزر ہوا، تو سمجھو کہ تمہارا دل ناپاک ہوا۔البتہ! یہ یاد رکھو کہ کتابوں کے مطالعہ سے اور وعظوں کے سننے سے، حج وعمرہ، زکوٰۃ، صدقات سے اسی طرح بہت نوافل پڑھنے سے یہ مقام حاصل نہیں ہوتا، جب تک اس فن کے کاریگر، ماہر، فنافی اللہ، مردِ کامل کے سامنے زانوئے ادب وعقیدت طے نہیں کریں گے۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا ☆ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

قال را بگزار مردے حال شو ☆ پیش مرد کاملے پامال شو

پس مردِ کامل کی تلاش میں رہو۔سبحان اللہ! شہرو دیہات ولیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔خانقاہ و مزارات گدی نشینوں، ولی ابن ولی، شہزادوں، صاحبزادوں اور پیرزادوں سے بھرے ہوئے ہیں۔صبح کے ناشتوں میں درجنوں قسم کی خوراکوں کا ڈھیر لگتا ہے۔ہر قسم کی سہولیات بکثرت موجود ہیں۔روزانہ صبح وشام کھانے اور غذاؤں کی کثرت ہے۔نفیس سے نفیس لباس، جبہ وقبہ، عمامہ اور مخصوص ٹوپیوں کی بھر مار ہے۔صلوٰۃ وسلام کی گونج ہے، اور یہ سب کچھ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن حکیم پر عمل ہو رہا ہے۔﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ [الأعراف: ۳۲] (پوچھو تو کہ جو زینت (وآرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، ان کو حرام کس نے کیا ہے؟)۔

سب کچھ موجود ہوتا ہے، مگر روحِ سنت مفقود ہے۔ یہ آستانہ، یہ گدی، یہ خانقاہ کس ہستی کے نام پر قائم ہیں۔ اس تارک الدنیا ہستی کے نام پر جنہوں نے زندگی بھر جَو کی خشک روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی، اور پوری زندگی چٹائی پر گزار دی، جن کا بچھونا ٹاٹ کا رہا، جن کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے تین تین ماہ تک گھر کا چولہا روشن نہیں کیا۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دسترخواں پر کبھی دو قسم کا کھانا نہیں کھایا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کھانے پر بلایا، جب دسترخواں بچھا دیا، تو ایک برتن میں سالن دوسرے برتن میں گھی پیش کیا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ دیکھ کر رو پڑے، میزبان سے پوچھا: تم کب سے تارکِ سنت بنے ہوئے ہو؟ کہنے لگے: امیر المؤمنین! یہ ضیافت ہے، مہمان کی حوصلہ افزائی ہے۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ میری حوصلہ شکنی ہے۔ میرے پیشوا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ حسنہ کی خلاف ورزی ہے۔ ایک برتن اٹھاؤ صرف ایک باقی رکھو، تب میں کھانا کھاؤں گا۔ یہ ہے اتباع سنت!

بہرحال، اے بھائی مسلمان! ''مرشد'' کی تلاش کرنے والے، ایسے خانقاہوں پر سلام ڈال کر آگے گزر جاؤ، شاید! کسی تارک الدنیا فقیر پر گزرتے ہوئے آپ کی اشک شوئی ہو جائے، وہاں بھی جاتے ہوئے تجسس کی نگاہ سے دیکھو کہ کہیں دنیا، اور اس کی پذیرائی تو نہیں ہو رہی ہے۔ کچھ نذرانے بطور امتحان پیش کرو، اگر مرشد کو سرور و خوشی حاصل ہوئی، تو سمجھو کہ یہاں بھی دنیا کی کارستانی ہے، لہٰذا بھاگ جاؤ! شاید! کوئی صحیح مرشد مل جائے۔

صحیح مرشد کی چار علامتیں ہیں:

(۱) سچا موَحد، جس کی زندگی شرک سے مکمل پاک ہو۔ (۲) اعلیٰ درجے کا متبعِ سنت ہو، جس کی زندگی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرۃِ مطہرہ کا نمونہ ہو۔ (۳) مکمل تارک الدنیا ہو، مال وزر کی آمد سے پریشانی، اور مال کے جانے پر خوشحالی محسوس کرے۔ (۴) ہر قسم کی مدح وثناء پر خوشی محسوس نہ کرے، بلکہ رنجیدہ رہے، اور مذمتوں پر خوشی محسوس کر کے رنجیدہ نہ ہو۔ یہ ہے ولی۔

خلافت فاروقی میں حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہ حمص (شام کے صوبہ) کے گورنر تھے۔ حمص کے لوگ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم لوگ اپنے علاقے کے فقراء کی فہرست لکھ کر مجھے پیش کر دو۔ میں بیت المال سے ان کے لئے وظائف مقرر کر دوں گا۔ انہوں نے فقراء کی فہرست مرتب کر کے پیش کی، سرِ فہرست علاقے کے گورنر کا نام تھا۔ امیر المؤمنین شروع میں ان کا نام دیکھ کر بہت روئے، اور ایک ہزار دینار

سپاہی کے ہاتھ روانہ کیے۔ عصر کے وقت وہ اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ سپاہی نے ان کی خدمت میں ہزار دینار پیش کئے۔ وہ یہ بڑے مال کو دیکھ کر سخت پریشانی کے عالم میں زور سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر خوب روئے۔

ان کی بیوی جھونپڑی کے اندر بیٹھی ہوئی تھی، وہ بھی رو پڑی، اس کو خیال گزرا کہ شاید! امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ کہنے لگی: کیا امیر المؤمنین وفات پا چکے ہیں؟ گورنر نے کہا: نہیں! الحمد للہ! وہ تو سلامت ہیں، مگر مجھے اس بڑے مال نے ستایا، پریشان کیا۔ اس پر ان کی بیوی نے کہا: کوئی بات نہیں، یہ میرے حوالے کردو، مغرب تک فقراء پر تقسیم کر کے آپ کی پریشانی دور کردوں گی۔

جیسا شوہر ویسی بیوی، چنانچہ اذانِ مغرب سے پہلے یہ مال اپنی جھونپڑی غریب خانہ سے نکال باہر کیا، اور میاں بیوی دونوں نے خوش ہو کر شکرانہ کی نماز ادا کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لئے، اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پوری زندگی اطاعتِ حق اور عبادتِ الٰہی کے لئے وقف کردے، اور امتثالِ امرِ الٰہی کے طریقے بھی وہی اختیار کرے، جو اللہ تعالیٰ نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے بتائے، اور متعین کئے ہوں۔

پہلی بات ﴿بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ کے ذریعہ، اور دوسری بات وَهُوَ مُحْسِنٌ کے ذریعہ واضح کی گئی۔ اس دوسرے درجے کا نام احسان بھی ہے، اور استقامت بھی۔ تو دخولِ جنت ہو، یا حصولِ رضائے الٰہی، یہ ان دو چیزوں پر موقوف ہے، اور یہ نہایت واضح اور اَظہر من الشمس ہے کہ یہ دونوں چیزیں صرف مسلمان قوم کے طرۂ امتیاز ہیں، باقی یہود و نصاریٰ اور مشرک وہ تو ان صفات سے سراسر محروم ہیں۔ ان کے پاس توحید، استسلام اور احسان و استقامت کا نام تک نہیں۔ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ

❁ ❁ ❁

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾
وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۤ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے منع کرتا ہے؟ کہ ان میں اللہ

تعالیٰ کا ذکر کیا جائے، اوران کی بربادی کی کوشش کرتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں کہ نہیں ہے ان کے لئے کہ داخل ہوں، ان گھروں میں، مگر ڈرتے ہوئے، ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں رسوائی ہے، اور ان کے لئے آخرت میں عذابِ عظیم ہے ﴿۱۱۴﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں مشرق اور مغرب، پس جدھر بھی تم منہ کرو ادھر اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے۔ بیشک! اللہ تعالیٰ وسعت والا، اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾

معارف ومنازل

سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: یہ تینوں فرقے، یہود ونصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں۔ دراصل یہ خود سارے کے سارے گمراہ ہیں۔ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی، جبکہ نصاریٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی، پھر دونوں نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ مل کر سید الانبیاء ﷺ کی تکذیب کی، تو آپ ﷺ کی تکذیب سے سارے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب لازم آئی، اور جب انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کفر ہے، اور کفر سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں، تو یہ سب بڑے ظالم ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ ان تینوں فرقوں نے شعائر اللہ کی مسلسل توہین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کی بے حرمتی کی، جس سے ان کے ظلم میں مزید اضافہ ہوا، اور ظالم وکافر کبھی جنت کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ پس ان کا اپنے آپ کو جنتی کہنا سوائے حماقت ونادانی کے کچھ بھی نہیں ہے۔

اب تفصیل یہ ہے کہ ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے:

❶ پہلی آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا (پورا واقعہ مظہری نے سورۃ اسراء کے شروع میں تفصیلاً بیان کیا ہے) تو روم کے نصاریٰ نے ان سے انتقام لینے کی خاطر بابل (عراق) کے مجوسی بادشاہ لہراسپ سے (جس کا گورنر بخت نصر مجوسی تھا) مدد مانگی۔ رومیوں کے بادشاہ کا نام طیطوس تھا۔ بخت نصر نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ بیت المقدس پر حملہ کیا۔ چنانچہ بیت المقدس کو نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کیا، اور لاکھوں یہودی مارے گئے۔ بقایا کو قیدی بنا کر عراق لے جایا گیا۔ وہاں عراقیوں کے غلام بنائے گئے، جس طرح کبھی فرعون کے غلام بھی بنے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت عزیر علیہ السلام نے بیت المقدس کی تباہی دیکھ کر کہا تھا: ﴿اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [البقرۃ:۲۵۹] (یا اسی طرح اس شخص کو (نہیں دیکھا) جسے ایک گاؤں میں جو اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا اتفاقاً گزر ہوا۔ تو اس نے کہا کہ خدا اس (کے باشندوں)

کو مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا؟)۔ جب بادشاہ لہراسپ مر گیا، تو اس کا بیٹا گشتاسپ بادشاہ بنا، اور اپنے باپ کے مذہب مجوسیت کو چھوڑ کر صابی مذہب اختیار کیا۔ یہ بہ نسبت اپنے ظالم باپ کے انصاف پسند تھا، تو تمام یہودیوں کو آزادی دے کر واپس فلسطین جانے کی اجازت دے دی۔ اس پوری لشکر کشی اور بیت المقدس کی خرابی وغیرہ میں روم کا بادشاہ طیطوس مع نصرانی فوجوں کے بخت نصر کے ساتھ شامل اور معاون رہا۔

اس جنگ نے بنی اسرائیل کو تہ و بالا کر دیا، ان کی عبادت گاہیں، بشمول بیت المقدس تباہ ہو گئیں اور تورات کے بیشتر نسخے جلائے گئے، اور ان کی مستورات کی بڑی بے عزّتی ہوئی۔

مفسر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کریمہ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ﴾ کا مصداق اسی کو قرار دیا، اور اسی کو شان نزول قرار دیا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ اور واقعہ معراج شریف تک بیت المقدس کا شہر خراب رہا۔ البتہ! مسجد اقصیٰ جزوی طور پر صحیح حالت میں تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاں نئے شہر آباد کئے، جیسے بصرہ، کوفہ، وہاں خصوصیت کے ساتھ بیت المقدس شہر کی مکمل تعمیر کی۔ ایک بڑے عرصہ بعد بیت المقدس شہر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ایک سو سال تک عیسائیوں کے ہاتھ میں رہا۔ جب مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کا زریں دور آیا، تو چھٹی صدی ہجری میں دوبارہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس وقت اس مقدس شہر پر صیہونی یہودیوں کا قبضہ ہے۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ میں یہودیوں نے اردنی فوج کو شکست دے کر پورے یروشلم (بیت المقدس) پر قبضہ کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ آیت کریمہ کا شان نزول واقعۂ حدیبیہ ہے۔ جب ۶ سنہ ہجری میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۴ یا ۱۵ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بغرضِ ادائیگی عمرہ تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ سے نزدیک بمقامِ حدیبیہ (موجودہ شمیسی) پہنچے، تو کفارِ مکہ نے مزاحمت کی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عمرہ سے روک دیا، وہاں مشہور تاریخی واقعہ ''بیعۃ الرضوان'' پیش آیا، اور صلحِ حدیبیہ کی تکمیل ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے عمرہ ادا کئے بغیر واپس مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ حافظ ابن کثیر وغیرہ آیت کریمہ کا شان نزول واقعۂ حدیبیہ کو قرار دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

بہر حال! سببِ نزول کچھ بھی ہو، آیات مطلق ہیں، اور ان میں خدائی عبادت گاہوں میں خداوند تعالیٰ کے ذکر کو منع کرنے اور انہیں تباہ و برباد کرنے کی کوشش کے سلسلے میں عام حکم ہے، جو کہ قیامت تک مذہبی عبادت گاہوں

کے متعلق ہے، خاص کر اسلام میں مساجد کے تقدس واحترام کے سلسلے میں اتنی بکثرت ہدایات ہیں کہ کتب حدیث و فقہ میں ہزاروں کی تعداد میں مساجد کے احکام ہیں۔

بعض علماء کرام نے مساجد کے سلسلے میں بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں مساجد کی اہمیت و ضرورت، اوران کے احترام وتقدس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات اور ہزاروں احادیث مساجد کے بارے میں نصوصِ قطعیہ کے طور پر ثابت ہیں۔ ساری عبادتوں سے افضل ترین عبادت نماز ہی ہے، اور نماز کی ادائیگی کے مراکز مساجد ہی ہیں، اوران مساجد کی تعمیر وترقی اوران کی خدمت کو ایمان کی علامت بتایا گیا ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [التوبة:۱۸] (خدا کی مسجدوں کوتو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لاتے ہیں، اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے)۔

جب مساجد کی نسبت واضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوئی تو ان کی عظمت وتقدس میں پھر کیا شبہ باقی رہتا ہے؟

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی مساجد کی خدمت بجالاتا ہو، تو اس کے ایمان پر گواہ بنو، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنتی حوروں کا حقِ مہر مساجد کی خدمت کو قرار دیا۔ یہ کتنی بڑی قیمتی ترغیب ہے؟ تو ثابت ہوا کہ جب مسجد کی خدمت کا اتنا بڑا صلہ ہے، تو اس کی ویرانی اور بے احترامی کا جرم بھی اتنا عظیم ہوگا، جسے آیت کریمہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اور ایسے لوگوں کو بڑا ظالم قرار دیا، اوران کے لئے دنیوی واخروی دونوں قسم کے عذابوں کی وعید سنائی۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کعبۃ اللہ شریف کی دو حیثیتیں ہیں: ایک خصوصی حیثیت کہ مسجدِ حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ تمام عالمِ اسلام کا قبلہ ہے، اور شعائرِ اسلام میں چوتھے درجہ پر ہے۔ شعائرِ اسلام یہ ہیں:

(۱) اسماء اللہ الحسنیٰ (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۳) کتاب اللہ (۴) کعبۃ اللہ۔ اسی طرح کعبہ پورے عالم اسلام کی مسجدوں کا سردار اور مرکز ہے۔

ابرہہ اشرم نصرانی تھا۔ جب اس نے کعبہ کے خلاف فوج کشی کی، تو عرفات کے قریب ستر ہزار فوجیوں کے ساتھ ابابیل پرندوں کے ذریعے ہمیشہ کے لئے تباہ وبرباد ہوا۔

﴿ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ ﴾ یہی وہ لوگ ہیں کہ نہیں ہے ان کے لئے کہ

داخل ہوا ان گھروں میں مگر ڈرتے ہوئے۔ تم میں سے جو شخص مسجد میں داخل ہو خشوع و خضوع، ہیبت و عظمت کے ساتھ ڈرتے ہوئے داخل ہو، جیسے کسی شاہی دربار میں داخل ہو رہا ہو، کیونکہ یہ کائنات کے والی متعالی، مالک الملک سبحانہ کا گھر اور دربار ہے۔ اس میں داخل ہوتے ہوئے آداب بجالائیں۔ دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کرے، پھر اپنی حاجت پیش کریں۔ حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ ہر حاجت مند اور پریشان آدمی کو حکم دیتا تھا کہ جاؤ مسجد میں اپنی حاجت مانگو۔ تو معلوم ہونا چاہئے کہ شاہی دربار کے آداب کے بجالانے میں جتنے بے شمار فوائد ہیں، اسی طرح اس کی ویرانی اور بے احترامی میں بھی بڑے خسارے اور تباہی کے اسباب ہیں۔

آج مسلمانوں میں مسجد کی بے احترامی بہت زیادہ ہے، جسے دیکھ کر دل پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔ لوگوں نے مسجدوں کے رنگ وروغن، تزیین وخوبصورتی انگریزوں سے سیکھی ہے، کیونکہ بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما (في البخاري) یہ یہود و نصاریٰ کی روایت ہے۔ اسلام نے مسجدوں کی خوبصورتی کا جو پیغام دیا ہے، وہ رنگ وروغن نہیں ہے، بلکہ کثرتِ صلوٰۃ، تسبیحات، اذکار، تلاوتِ قرآن کا پیغام ہے۔ جو لوگ لاکھوں روپیہ ضائع کر کے بلاضرورت خرچ کرتے ہیں، انہیں ایک پائی کا ثواب بھی نہیں ملے گا، الٹا گناہ ہوگا۔ دیکھو! پورے عالمِ اسلام کا قبلہ وکعبہ بیت اللہ شریف کتنا سادہ پتھروں سے تعمیر ہے۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ہماری ذلّت وخواری کے دوسرے اسباب کے علاوہ سب سے بڑا سبب مسجدوں کی، قرآن پاک کی اور حقیقی علماء کی بے حرمتی ہے۔ یہ تینوں ایک ہیں۔ آپس میں لازم ملزوم ہیں۔ ان تینوں کے قالب الگ ہیں، مگر روح ایک ہے۔ "القرآنُ والمسجدُ والعالمُ متحد"۔

الغرض! نسبت الی اللہ کے اعتبار سے تمام مساجد آداب واحترام کے لحاظ سے مساوی ہیں، مگر مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی کے بہت بڑے مناقب وفضائل وبرکات ہیں۔ یہ تینوں مساجد رتبہ وعظمت کے لحاظ سے اور ثواب ومناقب کے اعتبار سے نہایت عظیم اور بلند وبالا ہیں۔ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، اور ایک لاکھ نمازیں باون سال چھ ماہ کے عرصہ میں ادا ہوسکتی ہیں۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔

حدیث شریف کی رُو سے دور دراز ملکوں سے سفر کر کے ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی ترغیب آئی ہے، دیگر تمام مساجد جہاں کہیں ہوں ثواب میں برابر ہیں، اور احترام کا پہلو سب میں مساوی اور برابر ہے۔ مسجد چھوٹی ہو،

یا بڑی، کچی ہو یا پختہ، سادہ ہو یا خوبصورت، سب اللہ تعالیٰ کے گھر شمار ہوں گے۔

دوسری آیت: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تسلّی دی گئی ہے، اور ایک عام ضابطہ کا بیان بھی ہے، جو کہ مسئلہ نسخ سے متعلق ہے۔

پہلی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت سے قبل مکی زندگی میں رکنِ یمانی اور حجر اسود کے درمیان کھڑے ہو کر قبلتین (بیت اللہ و بیت المقدس دونوں) کے استقبال کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے، تو ایسا ممکن نہ رہا، تو آپ نے بحکمِ الٰہی (وحی خفی) سولہ، سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قلبی کشش یہی رہی کہ مجھے کعبہ کی طرف استقبال کا حکم ہو، چنانچہ سترہ ماہ بعد ۵ رجب کو یہ تمنا پوری ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بتایا گیا کہ اصل چیز تعمیلِ حکمِ ربّ ہے، جو کبھی کعبہ اور کبھی بیت المقدس کے استقبال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سارے جہات اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نہ جہات کے لئے ہے، اور نہ ہی جہات اس پر محیط ہیں، بلکہ وہ جہات پر محیط ہے، اس کی مرضی آپ کو جس کسی جہت کا حکم دے دے، آپ نے اس پر عمل کرنا ہے، اور بس۔

❷ دوسری بات یہ ہے کہ اصل عبادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کیا جائے، خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو۔ اصل طاعت اس کا حکم ہے، کوئی جہت نہیں۔ اگر وہ ہر چند وقت کے بعد پہلا حکم موقوف کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرے، خواہ قبلہ کے متعلق ہو، یا عام حکم، آپ نے اس کا حکم ماننا ہے، اور ساتھ ساتھ آپ کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ جب مرکزی چیز (استقبالِ قبلہ) میں تبدیلی آسکتی ہے، تو دوسرے احکام میں بطریق اولیٰ تبدیلی ہو سکتی ہے۔

تو مشرق اور مغرب سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو تمہارے لئے مسجد بنا دیا ہے۔ تمہارے لئے ہر جگہ نماز و عبادت درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی جسم اور جسمانی نہیں ہے کہ جو کسی خاص مکان میں موجود ہو، اور دوسرے مکان میں نہ ہو۔ وہ تو وراء الوراء ہے۔ البتہ! تم اور دیگر مخلوق زمان و مکان کے ساتھ مقید ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہاری عبادت کے لئے مخصوص جہت مقرر فرما دی، اور تنظیم و اتحاد کے پیشِ نظر سارے عالم اسلام کے لئے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا، تاکہ بے تنظیمی اور تفرقہ و اختلاف ختم ہو۔ مشرق سے مغرب تک سارے مسلمان ایک ہی سمت و جہت میں اسی طرح سجدہ ریز ہوں، جس طرح آسمانی فرشتے اپنے قبلہ بیت المعمور کی طرف سجدہ ریز ہوتے ہیں، اور وہاں حج کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ﴾ نے استقبال قبلہ کی پوری حقیقت کو واضح کر دیا، کہ اس کا منشاء بیت اللہ یا بیت المقدس کی (معاذ اللہ) پرستش نہیں ہے، اور نہ ان دونوں مکانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات پاک سارے عالم پر محیط ہے، اور ہر جہت وسمت میں اس کی توجہ یکساں ہے، پھر جو کسی خاص مکان یا خاص سمت کو مخصوص کیا جاتا ہے، اس میں تنظیمی، اتحادی، یکجہتی فوائد ومقاصد کے علاوہ بہت ساری حکمتیں ہوتی ہیں۔

ایک ہندو مناظر نے ایک مولانا صاحب پر اعتراض کیا کہ تم لوگ ہمیں طعنہ دیتے ہو کہ ہندو بت پرست ہیں، پتھروں کی پوجا کرتے ہیں، دیکھو! تم مسلمان بھی پتھروں سے بنائے گئے کعبۃ اللہ کی پوجا کرتے ہو۔

عالم صاحب نے جواب دیا کہ ہم کعبۃ اللہ کو معبود بنا کر اس کی پرستش نہیں کرتے، ہمارا معبود اللہ تعالیٰ ہی ہے، نہ کہ کعبہ۔ اگر کعبہ ہمارا معبود ہوتا، تو ہمارے نبی پاک ﷺ اپنے موذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس کی چھت پر کھڑے کر کے اذان کا حکم نہ دیتے، کیونکہ کوئی مخلوق اپنے معبود کے اوپر سوار ہونے کو پسند نہیں کرتا، اور اس طرح کوئی ہندو بھی اپنے بت پر کھڑے ہونے کو جائز ہرگز نہیں سمجھتا۔ تو کعبۃ اللہ ہمارا معبود نہیں ہے، بلکہ معبود کی عبادت کی جہت اور سمت ہے۔

البتہ! یہ بات یاد رہے کہ صرف سفر میں (حضر میں نہیں) بحالتِ سواری اگر کوئی شخص نفلی نمازوں میں قبلہ کا استقبال ترک کرے، تو یہ جائز ہے، مجبوری کی وجہ سے۔ باقی حضر میں اس کی اجازت نہیں ہے، اور سفر میں بھی صرف سواری کی صورت میں جائز ہے۔ رہا عام اوقات میں اذکار وتسبیحات، کتب بینی اور تلاوت قرآن وغیرہ، ایسے امور میں استقبال قبلہ واجب نہیں ہے، بلکہ استحباب کے درجے میں ہے۔

اسی طرح صحراء میں اور بند مکان میں بھی یہ حکم ہے کہ بحالتِ قضاء حاجت، ہمبستری، بول وبراز، استنجاء وغیرہ قبلہ شریف کے احترام کی خاطر استقبال واستدبار مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے۔ اسی طرح عام حالات میں قبلہ کی طرف تھوکنا، یا ناک صاف کرنا، یا کوئی نجاست پھینکنا، یا سوتے لیٹتے ہوئے پاؤں پھیلانا بھی سخت بے ادبی اور مکروہ ہے۔ علماء کرام نے کہا ہے کہ جو شخص قصداً قبلہ کا احترام نہیں کرتا، اور قبلہ شریف کی بے احترامی کرتا ہے، تو قبر میں فرشتے اس کا منہ قبلہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس قسم کے دس لوگ ہیں کہ ان کا منہ قبلہ سے ہٹ جاتا ہے، اس کی تفصیل سورۃ مائدہ میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ: اور کہا ان لوگوں نے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا، پاک ہے اس کی ذات، بلکہ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں ﴿۱۱۶﴾ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے، تو اسے کہتا ہے: ہوجا، پس وہ ہوجاتی ہے ﴿۱۱۷﴾

معارف ومنازل

اہلِ کتاب کی بدعقیدگی اور بیماریوں کے بیان کا سلسلہ چل رہا ہے۔ یہاں سے ان کی تیسویں بیماری کا بیان ہورہا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ﴾ سے ان کے عام ظلم کا بیان ہوا تھا، اب یہاں سے ان کے اس ظلمِ عظیم (شرک) کا بیان ہورہا ہے کہ ساری کائنات میں اس جیسا کوئی گناہ نہیں ہے، اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾۔ [لقمان: ۱۳] (بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔

شرک کی مختلف انواع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر ظلمِ عظیم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ذاتی مخصوص صفت جو کہ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ ہے۔ اس کے حصار کو توڑتے ہوئے اس کے لئے اولاد ثابت کرنا، یہ وہ عظیم گناہ ہے، جس کی مغفرت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو، اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہا: ﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ [التوبۃ: ۳۰] (یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے)۔ ان کو دیکھ کر جہلاء عرب نے باقی کسر پوری کردی کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾ [الزخرف: ۱۹] (اور انہوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، عورتیں قرار دیا)۔

سورۃ مریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ ﴾ [مریم] (کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے (ایسا کہنے والو! یہ تو) تم بری بات (زبان پر) لائے ہو، قریب ہے کہ اس (افتراء) سے آسمان پھٹ پڑیں، اور زمین شق ہوجائے، اور پہاڑ پارہ پارہ ہوکر گر پڑیں کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹا تجویز کیا)۔

بہت سے لوگوں نے تو غیر اللہ کو معبود ہی ٹھہرایا تھا، لیکن ایک جماعت وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کی، مثلاً نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو، اور بعض یہود نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا۔ بعض مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ العیاذ باللہ۔ یہ ایسی بھاری بات کہی گئی، اور ایسا سخت گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالا گیا، جسے سن کر اگر آسمان، زمین اور پہاڑ مارے ہول کے پھٹ پڑیں، اور ریزہ ریزہ ہو جائیں، تو کچھ بعید نہیں۔ اس گستاخی پر اگر غضبِ الٰہی بھڑک اٹھے، تو سارا عالم تہ و بالا ہو جائے، اور آسمان و زمین کے پرخچے اڑ جائیں۔ محض اس کا حلم مانع ہے کہ ان بیہودگیوں کو دیکھ کر دنیا کو ایک دم تباہ نہیں کرتا، جس خداوند قدوس کی توحید پر آسمان، زمین، پہاڑ، سمندر، غرض ہر علوی و سفلی چیز شہادت دے رہی ہے۔ انسان کی یہ جسارت کہ اس کے لئے اولاد کا احتیاج ثابت کرنے لگے! نعوذ باللہ۔ [عثماني]

لہٰذا اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا سخت بے ادبی اور نہایت بے محل، فضول اور گستاخی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اَحد و صمد ہے، اور یہ اس کی ذاتی صفات میں سے ہے۔ اس جہاں کا واحد خالق و مالک ہے، تو اس کو کسی چیز کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ کائنات کا ہر ذرّہ اپنے وجود و بقاء میں اس کا محتاج ہے، اور اس کو کسی چیز کا احتیاج نہیں ہے، کیونکہ احتیاج ضعف کی نشانی ہے، اور یہ ایک نفسانی چیز ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ضعف، احتیاج اور نفسانی خیالات سے پاک و مبرّا ہے۔

پھر اولاد کے لئے جو احتیاج ہے، وہ ایک نہیں، بلکہ احتیاجوں کی کھیپ ہے۔ بیوی کا احتیاج، اس کی دیکھ بھال اور خواہشات، ناز و نخروں کا پورا کرنا، اپنی نسل کو جاری اور خوشحال رکھنے کا احتیاج، ان کی ترقی کا احتیاج، اور ان کی وراثت کا احتیاج، وہ سارے لوازمات جو اولاد کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔

بالفرض والتقدیر! اگر اللہ تعالیٰ کے لئے حقیقی بیٹا تسلیم کر لیا جائے، تو لازماً وہ اللہ تعالیٰ کا جزء ہوگا۔ پس خدا تعالیٰ بسیط کہاں رہا؟ مرکب ہوا۔ ترکیب حدوث کی علامت ہے، حادث کبھی موجد و خالق اور معبود و اِلٰہ نہیں بن سکتا، اور جیسے عیسائی کبھی مجبور ہو کر کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مجازاً ابن اللہ کا اطلاق ہوا ہے، تو جواب یہ ہے کہ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص نہیں ہوئی۔ پھر تو سارے انبیاء علیہم السلام کو بطور محبوب و برگزیدہ ابن اللہ مجازاً کہنا چاہئے۔ دوسرا یہ کہ مجاز کے لئے یہ ضروری ہے کہ ممکنات میں سے ہو، محال کو حقیقت کی جگہ کبھی بھی مجازاً استعمال نہیں کیا جا سکتا، اور یہ ناجائز ہے۔

حکایت:

ہندوستان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مناظرہ ہو رہا تھا۔ ایک لاکھ سے زائد لوگ مناظرہ سن رہے تھے۔ پادری اسی ابن اللہ پر پُرزور دار دلائل دے رہا تھا۔ مناظر مولانا صاحب سن رہے تھے، اور جواب کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں محفل میں ایک عام آدمی پکوڑا فروش کھڑا تھا، مولانا صاحب سے عرض کیا کہ حضرت آپ تکلیف نہ کریں۔ پادری صاحب کو میں ہی جواب دوں گا۔ فرمایا: اچھا! ٹھیک ہے۔ انہوں نے پادری سے پوچھا: آپ بتاؤ! بیٹا اپنے باپ کے لئے رحمت ہوتا ہے یا عذاب؟ پادری نے کہا: رحمت ہوتا ہے۔

دوسرا سوال: پادری صاحب یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی عمر کتنی ہے؟ پادری نے کہا: اللہ تعالیٰ کی عمر نہیں ہوتی۔ وہ ازلی اور ابدی ہے۔

تیسرا سوال: پادری صاحب یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی بچیاں کتنی ہیں؟ اور بیویاں کتنی، اور بیٹے کتنے ہیں؟ پادری نے کہا: اللہ تعالیٰ کی بیوی کوئی نہیں، اور لڑکیاں بھی نہیں۔ ہاں! لڑکا ایک ہی ہے، حضرت مسیح علیہ السلام۔ پکوڑے والے نے کہا: تم نے خدا کی بڑی بے عزّتی کی۔ میری عمر چالیس سال ہے، میرے آٹھ بچے، تین بچیاں ہیں۔ یہ تمہارا کیسا خدا ہے، لاکھوں سال محنت کی، اور زور لگایا، تو بمشکل صرف ایک بیٹا پیدا کیا؟ جب دشمنوں نے اس ایک اکلوتے بیٹے کو سولی پر لٹکایا، تو باپ عاجز رہا، تماشا دیکھتا رہا، کچھ نہ کر سکا۔ تمہیں شرم نہیں آتی ایسے عاجز خدا کی طرف دعوت دیتے ہو؟ یہ تمہارا والا خدا ہرگز خدا نہیں ہوسکتا۔ اصلی خدا ہمارا ہے: ﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ایک کلمہ ”کُن“ کے فرمان کے ساتھ لوگوں کو اربوں بیٹے دینے پر قادر ہے۔ پھر کیا ہوا! پادری مجلس مناظرہ چھوڑ کر شرمندگی کے عالم میں بھاگ گیا، اور مسلمان جیت گئے۔ [تاریخ ہند]

”سُبْحَانَہ“ کا مطلب یہ ہے: ”تنزیہ اللہ تعالیٰ من کلّ سوء“۔ ہر قسم کے عیوب ونقائص اور برائیوں سے رب تعالیٰ شانہ کی پاکی اور برأت ثابت کرنا۔ یاد رہے کہ احتیاج، حدوث اولاد وغیرہ یہ بندوں کے لئے عینِ کمال سمجھے جاتے ہیں، مگر واجب تعالیٰ جل جلالہٗ کے لیے عیب اور نقص شمار ہوتے ہیں۔ پس اس کی تقدیس کرنا، اور سارے عیوب کو اس کی ذات سے نفی کرنا فرض ہوا۔ علماء اسلام نے کہا ہے کہ صفاتِ سلبیہ کی نفی صفاتِ ایجابیہ کے اثبات پر مقدم ہے۔ پس اولاد کی نفی اس کی ذات سے ایسا فرض وضروری ہے جس طرح احدیت وصمدیت کا اثبات اس کے لیے ضروری ہے۔ انسان کے لیے اولاد قابلِ عزّت وفخر ہے۔ اگر کسی کے دس بیس بچے ہوں، تو وہ کم اولاد والے لوگوں

سے اعلیٰ وافضل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں ہزاروں احتیاج موجزن ہیں، ان میں سب سے بڑا احتیاج بقاءِ نسل ہے، جس کا واحد سبب کثرتِ اولاد ہے، وغیرہ۔

﴿بَلْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾: تمام علویات وسفلیات مملوک ہیں، صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کا مالک ہے۔ اتنے بڑے کارخانے کے مالک کے لئے نہ ولد کا احتیاج ہے، نہ کسی مشیر ووزیر اور معاون کی ضرورت ہے، جو ذات پاک اتنا بڑا کارخانہ ایک حکم کے ساتھ پیدا کرسکتا ہے، اس کو بیٹے کی کیا ضرورت؟ تجربہ ومشاہدہ گواہ ہے کہ لاکھوں سالوں سے قائم یہ عالم اسی طرح باقی ہے، جیسے پیدائش کے وقت تھا۔ اس کے ساتھ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس بڑے کارخانے میں کوئی ایسا پرزہ نہیں ہے کہ جس سے کسی قسم کی حکمِ عدولی یا کسی انقلابی تبدیلی کا کوئی خطرہ ہو۔

تو ارشاد فرمایا: ﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ تکوینی طور پر سارا جہاں، آسمانوں، زمینوں، فضاؤں کی تمام مخلوقات اس کے حکم کے سامنے سرافگندہ اور اطاعت گزار ہیں۔ کسی مخلوق کی کیا مجال کہ اس کے حکم کے بغیر کوئی حرکت کرے، یا اپنا ارادہ تبدیل کرے، یا جس ڈیوٹی پر مامور ہے، اس میں سستی کرے۔

یہ الگ بات ہے کہ لوگ کفر وشرک کرتے ہیں۔ عبادات سے انکار یا کمی اور سستی کرتے ہیں، اور دیگر ہزاروں خلاف ورزیاں، گناہ، معاصی اور حکمِ عدولی کرتے ہیں۔ یہ سب شرعی امور ہیں۔

یہاں اِکراہ وزبردستی نہیں ہے، ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الكهف: ۲۹] (جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے)۔ شرعی امور انسانوں کے اختیار پر مبنی ہیں۔ ان کا تعلق ﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ کے ساتھ نہیں ہے، یہ صرف امورِ تکوینیہ سے متعلق ہے، اور تکوینی امور انسانی اختیار کے دائرہ سے خارج ہیں، مثلاً دفترِ بالا سے جب کسی کی موت کا پروانہ جاری ہوتا ہے، تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت اس کو نہ ٹال سکتی ہے، نہ آگے پیچھے کرسکتی ہے۔ اسی طرح دوسرے تکوینی امور بھی ہیں۔

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمینوں کا ایجاد کرنے والا، یعنی موجِد۔ بدیع صفت مشبہ کا صیغہ ہے، بمعنی اسم فاعل، یعنی مُبدِع۔ ایک حدیث کے الفاظ بھی اسی صیغہ پر وارد ہوئے ہیں۔ ''اِبْدَاع'' اس تخلیق کو کہتے ہیں جس کا پہلے سے نہ مادہ موجود ہو، نہ کوئی نمونہ اور نقشہ وصورت اور نہ محنت۔ دراصل تخلیق اسی کا نام ہے جو کہ مخصوص ہے حضرت باری تعالیٰ جل شانہ کے ساتھ ﴿وَهُوَ الْخَلّٰقُ﴾۔

آج کی دنیا میں بے شمار چیزیں، لاکھوں مشینیں، ہزاروں محیر العقول اشیاء ایجاد ہوئی ہیں۔ یہ سب

مصنوعات ہیں، ایجاد شدہ چیزیں ہیں، مخلوقات نہیں ہیں۔ ان کو مخلوق کہنا ہرگز جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اکثر و بیشتر لوہے، پتھر، تانبے، پیتل، المونیم، مٹی، تیل، پلاسٹک، ربڑ وغیرہ سے بنے ہوئے ہیں۔ ماہرین نے انہی چیزوں سے ترتیب دے کر بنایا، اور یہ سارے مواد پہلے سے موجود ہیں، پھر ان چیزوں میں انسان نے غور وفکر کیا، محنت کی، اور بار بار تجربہ کیا، تب کہیں جا کر کامیاب ہوا۔ یہی تو ایجاد ہے، فقط۔ بخلافِ تخلیق کے، کہ اس میں تجربہ اور محنت وغیرہ نہیں ہے۔

تیسری چیز جو مصنوعات کے ساتھ خاص ہے، وہ نقشہ اور نمونہ ہے۔ یہ قدرتی طور پر پہلے سے موجود ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اسے انسان نے غور وفکر کے ساتھ بار بار دیکھا، اور ایک چیز بنائی، مثلاً ہوائی جہاز ہے، یہ بعینہٖ پرندوں کی شکل میں ہے۔ اکثر و بیشتر مشین اور انجن انسانوں کے قدرتی پیدا شدہ اعضاء کے عکس اور نمونہ ہیں، وغیرہ۔

آگے خالق، مؤجد، مبدع کی صفتِ خاصہ ذاتیہ کا بیان ہے:

﴿وَاِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ﴾ کوئی یہ نہ کہے کہ تجربہ اور محنت کے نتیجے میں اس منظم و محکم کارخانہ کی تخلیق ہوئی ہے، نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ محض ارادہ ہوا، اور کارخانہ موجود ہوا۔ یہ لفظ ''کُنْ'' صرف ہمارے سمجھانے کے لئے ہے، ورنہ وہاں یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا؟ صرف ارادہ ہوا۔ اور چیز موجود ہوگئی۔ ﴿وَمَاۤ اَمۡرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمۡحٍۢ بِالۡبَصَرِ﴾ [القمر: ۵۰] (اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ﴾ [آل عمران: ۵۹] (عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا، پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا، تو وہ (انسان) ہو گئے)۔ پس اس آیت سے نصاریٰ کو تنبیہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اسی کلمۂ کُنْ سے ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ تم لوگوں نے انہیں ابن اللہ کا درجہ دے دیا؟

کلمۂ کُنْ ایسا لفظ ہے، جو سرعت اور تیزی پر دلالت کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کُنْ فرماتے ہیں، تو اس چیز کے معرضِ وجود میں آنے کے لئے نہ کسی مادّے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کوئی نقشہ، ڈیزائن مطلوب ہوتا ہے، نہ کسی کاریگر، معاون یا مددگار کی مدد درکار ہوتی ہے، بلکہ ارادہ، حکم صادر ہوتے ہی کام ہو جاتا ہے۔

دراصل یہ لفظ محض تعبیر کے لئے ہے، ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں تک قدرتِ کاملہ اور ارادۂ عالیہ مخصوصہ کا بیان تھا۔ چونکہ حق تعالیٰ شانہ کی قدرت الگ ہے، اور عادت الگ۔ پس جاننا چاہئے کہ عادت و حکمت کے تحت دنیا کی ہزاروں مخلوقات اور تمام اشیاء بجائے سرعت و تیزی کے تدریجی ہیں، مثلاً انسان ہے، یہ نطفہ سے لے

کر پیدائش تک، پھر بچپن کے مراحل کے بعد جوانی، پھر بڑھاپا۔ اسی طرح دیگر حیوانات، نباتات، صحت، تندرستی، بیماری، علم وہنر وغیرہ اشیاء حکمت کے تحت حسبِ عادت سب تدریجی ہیں، لہٰذا مغالطہ نہ ہو، کوئی اشکال نہیں رہا۔ واللہ اعلم

حدیث شریف میں ہے کہ: كَذَّبَنِىْ ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِىْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ ذٰلِكَ۔ (بنی آدم مجھ کو جھٹلاتا ہے، اور یہ اس کے لئے مناسب نہیں ہے، اور مجھے گالی دیتا ہے، حالانکہ یہ بھی اس کے لئے بہتر نہیں ہے)۔ فَاَمَّا تَكْذِيْبُهٗ اِيَّاىَ فَيَقُوْلُ لَنْ يُّعِيْدَنِىْ كَمَا بَدَأَنِىْ۔ (اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ انسان کہتا ہے کہ مجھے دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا، جس طرح پہلی مرتبہ کیا)۔ یعنی انسان حیات بعد الموت اور قیامت کا منکر ہے، گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلا دیا، اور گالی اس لحاظ سے دیتا ہے کہ وہ میری طرف اولاد کی نسبت کرتا ہے، حالانکہ نہ میری بیوی ہے، اور نہ اولاد ہے، اور نہ ہی مجھے ان کی ضرورت ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کو گالی دیتا ہے، نعوذ باللہ منہ۔ فرمایا: میں اَحد وصمد ہوں، نہ میں کسی سے پیدا ہوا، اور نہ کوئی مجھ سے پیدا ہوا۔ [بخاري]

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ: اور کہا ان لوگوں نے جو نہیں جانتے: اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیوں کلام نہیں کرتا؟ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح کہا ان سے پہلے لوگوں نے ان کی بات کی طرح، ان کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں، تحقیق ہم نے ان لوگوں کے لئے آیات بیان کردی ہیں، جو یقین رکھتے ہیں ﴿۱۱۸﴾ بیشک! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا، اور آپ سے دوزخ والوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا ﴿۱۱۹﴾

معارف ومنازل

یہاں سے اکتیسویں بیماری کا بیان ہے، جو کہ یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے درمیان مشترک ہے۔ مشرکینِ عرب ضد وعناد اور کبر وغرور کی بنیاد پر وہی غلط اور مہمل مطالبات کرتے تھے جو کہ ان سے پہلے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ نے کیا تھا، مثلاً کہتے تھے: ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [البقرة:۵۵] (جب تک ہم خدا کو

سامنے نہ دیکھ لیں گے، تم پر ایمان نہیں لائیں گے)۔ اس کی تفصیل گزر چکی۔ یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چل کر مشرکین نے بھی اسی طرح کے مطالبات شروع کئے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہے:﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا﴾ [الفرقان: ۲۱] (اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کئے گئے؟ یا ہم اپنی آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں)۔

اسی طرح سورۃ اسراء میں ارشاد ہے:﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۝ ﴾ [الإسراء] (اور کہنے لگے کہ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ (عجیب وغریب باتیں نہ دکھاؤ، یعنی یا تو) ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری کردو، یا تمہارا کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو، اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو، یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان کے ٹکڑے لا گراؤ، یا خدا اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لاؤ)۔

کبھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ، کبھی اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا، کبھی فرشتوں کے اترنے کا، اور کبھی خاص علامت ونشانی کا مطالبہ،﴿حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ﴾[الإسراء: ۹۳] یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کے ذریعہ ہمارے نام کی چٹی (خط) کتاب کی آمد ونزول کا مطالبہ۔ ان جاہل، ونادانوں کے مہمل اور بے ڈھنگ ہر قسم کے مطالبات ہوتے تھے۔ دراصل ان کا مقصد ایمان لانا نہیں ہوتا تھا، بلکہ ایذاءرسانی اور خواہ مخواہ ناجائز تنگ کرنا، بہانہ شہانہ کرکے ایمان لانے سے راہِ فرار اختیار کرنا ہوتا تھا وغیرہ۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الآیۃ] اور یہ ناداں جاہل یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلاواسطہ براہِ راست ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ بالمشافہہ ہم سے بات کرے کہ یہ حضرت اقدس محمد ﷺ ہمارے نبی اور رسول ہیں، تو ہم آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کریں، اور آپ ﷺ کی اطاعت قبول کریں، یا اگر ہم سے براہِ راست کلام نہیں کرتے، تو کم ازکم من جانب اللہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی بھیج دیں، جسے دیکھ کر ہمیں آپ ﷺ کی نبوت کا بداہۃً یقین آجائے۔

ربّ العزّت سبحانہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ کوئی نیا احمقانہ اور جاہلانہ سوال نہیں ہے﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ جو جاہل ومعاندان سے پہلے گزرے ہیں وہ بھی ایسی باتیں کہتے رہے ہیں، اور یہی ان کی نادانی اور

جہالت کی دلیل ہے کہ باوجود اپنی کمال نالائقی کے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی کا اہل سمجھتے ہیں۔تم تو دنیاوی بادشاہوں اور امیروں کی ہم کلامی کی جرأت نہیں رکھتے، اگر ہر جاہل اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی کا رتبہ رکھتا، تو پھر انبیاء ورُسل علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ کیا دنیا میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں وزیر اور مجاز افسر کے حکم کو نہیں مانتا، جب تک کہ بادشاہ خود بالمشافہہ براہِ راست مجھ سے آکر یہ نہ کہہ دے کہ یہ میرا وزیر یا افسر ہے، تم اس کو مانو اور اس کی اطاعت کرو؟

چونکہ یہ مہمل سوال ہے، اس لئے اس کی جوابدہی کی ضرورت ہی نہیں۔البتہ! اس احمقانہ سوال کا منشاء بیان فرمایا کہ ان اگلے اور پچھلے سارے کافروں کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔"اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ وَقُلُوْبُھُمْ مُتَشَابِھَۃٌ"۔اس لئے ان نادانوں کے شبہات پہلے نادانوں کے شبہات کے مشابہ ہیں۔ان کے درمیان زمانے کا اگرچہ بڑا فاصلہ ہے، مگر خیالات سب کے ایک جیسے ہیں۔آج کا کافر وہی کچھ کہتا ہے جو ہزار سال پہلے کے کافر کہتے تھے۔اسی نکتہ کو دوسرے مقام پر یوں واضح فرمایا:﴿یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَاْتِیْھِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ﴾ [یٰسٓ:۳۰] (ہائے افسوس بندوں پر کہ ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا مگر اس سے تمسخر کرتے ہیں)۔

معلوم ہوا کہ ہر زمانہ کے کفار کے خیالات میں ہم آہنگی اور تشابہ قائم ہے۔اس کی وجہ﴿وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِھِمْ﴾([الأنعام:۱۲۱] (اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں)۔ہر پیچھے آنے والے کفار کو شیاطین وہی پٹی پڑھاتے ہیں جو انہوں نے پہلے والوں کو پڑھائی تھی، لگتا ایسا ہے کہ ہر مجرم اپنے آئندہ آنے والے احباب کے لئے کوئی وصیت نامہ چھوڑ جاتا ہے کہ تم نے یہ، یہ کام ضرور کرنا ہے۔اسی طرح آیات و معجزاتِ سے انکار کا جو سلسلہ پرانے کافروں میں تھا، بعد میں آنے والوں نے اسی طرح انکار کر کے معجزات کو سحر و جادو اور کہانت قرار دیا۔

شق القمر سے بڑھ کر کوئی نشانی ہوسکتی ہے؟ یہی معجزۂ شق القمر مکہ مکرمہ سے نو ہزار کلومیٹر دور مشرق میں مالیبار کے خوش قسمت راجہ کے مع خاندان ایمان کا سبب بن سکتا ہے، مگر نبوت کی رہائش گاہ سے صرف پانچ سوفٹ کے فاصلے پر رہنے والے ابوجہل بن ہشام اور اس کے رفقاء کے لئے ہدایت کا ذریعہ نہیں بنتا۔جس زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان فرمایا مکہ مکرمہ واطراف کے شجر وحجر، جانور، چرند پرند، بکریوں تک، بلکہ، سنگریزوں اور

پتھروں تک نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم نبوت کی گواہی دی۔

اس بارے میں یہ واضح ہے کہ خود سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی صفات اپنی نبوت پر ایک مجسم دلیل ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل، گفتار و کردار، طرزِ حیات، جس کی مثال و نمونہ، نہ کسی نے دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ یہ تمام کے تمام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت پر روزِ روشن کی طرح دلیل اور حجت ہیں، اور قرآن کریم کی معجز عبارت کی ہر آیت و ہر جملہ اور بے مثال نظم و حروف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت پر واضح ثبوت ہیں۔

جس طرح کائنات کے ذرّات اپنے خالق و مالک حق سبحانہ کی الوہیت و وحدت کی گواہی دیتے ہیں، کیا ﴿لَهُمۡ قُلُوبٌ لَّا يَفۡقَهُونَ بِهَا﴾ محض جملہ خبریہ کا اخبار ہے؟ ہرگز نہیں! یہ قہر و غضب کا چابک اور تازیانہ ہے۔ ممکن کوئی یہ سمجھے کہ قدرت نے ہدایت کا راستہ ان مجرمین پر بند فرمایا۔ تو جواب دیا: نہیں، جو ہمارے پاس چل کر آنا چاہتا ہے، ہماری رحمت دوڑ لگا کر اس کا استقبال کرتی ہے۔

دیکھئے! ابوسفیان بن حرب اور سہیل بن عمرو نے ابوجہل سے زیادہ اسلام اور نبوت کی مخالفت کی، مگر ہدایت کا دروازہ کھلا رہا۔ فتح مکہ کے روز انہیں آغوش میں لے کر نبوت کے قدموں پر گرایا، پھر کیا ہوا؟ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت ہو تو میں سہیل بن عمرو کے سارے دانت توڑ دوں، جس نے غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے حرمتی کی۔ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عمر! ہوسکتا ہے کہ اس کے دانت کبھی ہمیں کام دے دیں۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی اس وقت سامنے ظاہر ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے عقبیٰ کی طرف پردہ فرما گئے، اسی سانحہ کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دے کر مدینہ والوں کا سہارا بنے، اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مکہ والوں کے ایمان کا تحفظ کیا۔ رضي الله عنهم أجمعين

تو ارشاد ہوا کہ ہمارا دروازہ بدستور کھلا ہے۔ ﴿قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ﴾ ان لوگوں کے لئے جو ایمان و یقین کے متلاشی و طلبگار ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اب نہیں، وقت گزر گیا، مگر ربّ العزّت کی رحمت کا دروازہ موت سے پہلے تک کھلا ہے، "مَالَمۡ يُغَرۡغِرۡ"۔ سکرات کا غرغرہ شروع ہونے کے بعد پھر بند ہوجاتا ہے۔ اللّٰهم اغفر لنا وارحمنا وعافنا واعف عنا۔

﴿اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ﴾ [الآية] ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخلوقات کی ہدایت کے لئے دینِ حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان لانے والوں کو خوشخبری دیں، اور منکروں کو عذابِ الٰہی سے ڈرائیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

اہلِ دوزخ اور اصحابِ جحیم کی کوئی باز پرس نہ ہوگی۔

اس سلسلے میں ربّ العزّت سبحانہ نے دوبارہ آپ ﷺ کی نبوت کا اعلان فرمایا، یعنی اَرۡسَلۡنٰكَ ، اور آپ ﷺ کی تسلّی فرمائی۔ اعلان تو اس لئے کیا کہ اہلِ کتاب پر حجت قائم ہو، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر بشیر ونذیر ہوتا ہے، نیز کفارِ عرب کو بھی یہ بتانا تھا کہ آپ ﷺ دینِ حق کو لے کر آئے ہیں، اور آپ ﷺ کا لقب بشیر ونذیر ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اہلِ کتاب سے معلوم کر سکتے ہیں۔

اور آپ ﷺ کو تسلّی دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ اہلِ کتاب سے توقعات نہ رکھیں۔ یہ لوگ ہرگز ماننے والے نہیں ہیں، اور کسی کے ایمان لانے اور نہ لانے کے آپ ﷺ ذمہ دار بھی نہیں ہیں، اور نہ جہنم میں جانے والوں کی آپ ﷺ سے باز پرس ہوگی۔ ﴿لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ ﴾۔ [الغاشية:۲۲] (آپ ان پر مسلّط نہیں ہیں)۔ آپ ﷺ پر کوئی الزام نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو مسلمان کیوں نہیں کیا؟ یہی حقیقی قانونِ خداوندی ہے کہ پیغمبر کا کام صرف ابلاغ ہے، ہدایت دینا یہ حق سبحانہ کا کام ہے کہ جسے چاہے ہدایت دے یا نہ دے۔

وَلَنۡ تَرۡضٰى عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَى
اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِىۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ
تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

ترجمہ: اور ہرگز راضی نہ ہوں گے آپ سے یہودی اور نصرانی یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کا اتباع کریں، آپ کہہ دیجئے: بیشک! اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، اور آپ نے اگر ان کی خواہشات کا اتباع کیا بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے، تو نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار ﴿۱۲۰﴾ جن کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے گا پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾

معارف ومنازل

سید کائنات ﷺ مسلسل اس امید میں رہے کہ شاید اہلِ کتاب کُل یا بعض قرآنی تعلیمات اور نبوت کی

برکات سے متاثر ہوکر عناد ترک کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوجائیں۔اس عرصہ میں مشرک آہستہ آہستہ ختم ہوتے گئے، یا دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے، کیونکہ وہ جہلِ بسیط کے اندر تھے،مگر یہود ونصاریٰ مرورِ زمانہ کے ساتھ اپنے جہلِ مرکب اور باطل پر ڈٹے رہے،ان کے عناد وغرور میں کوئی کمی نہیں آئی۔

تو اصل حقیقت واضح فرما کر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی بھی کرادی،اور آپ کے طمع وامید کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا،فرمایا:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى﴾ کہ یہود ونصاریٰ ہرگز آپ سے راضی نہیں ہوں گے۔ کبھی آپ کی نبوت اور قرآن حکیم کو قبول نہیں کریں گے،کیونکہ اول تو یہ ہے کہ وہ اس غرور میں ہیں کہ ہم کتبِ الٰہیہ کے حامل ہیں۔ہمارا دین قدیم ہے،ہم انبیاءزادے، بلکہ ابناء اللہ واحباءہ کے زمرے میں ہیں۔ہم متبوع ومقتداء ہیں۔ پس کیوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کر کے تابع بن جائیں۔اپنی سرداری چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیرِ دست رعایا میں شامل ہوجائیں۔یہاں تک ان کے غرور وتکبر کا حال بیان ہوا۔

دوسرا یہ کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب اور مسلمانوں سے اتنا بغض ودشمنی رکھتے ہیں کہ ان کا اسلام قبول کرنا تو دور کی بات ہے، یہ تو الٹا مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف اور بیزار کرنا چاہتے ہیں،جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [البقرۃ:۱۰۹] (بہت سے اہلِ کتاب اپنے دلوں کے حسد کی بناء پر یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں پلٹا کر پھر کافر بنادیں)۔ان کی مسلسل کوشش رہتی ہے کہ مسلمانوں کے قلوب میں شکوک وشبہات پیدا کریں۔انہیں برگشتہ کر کے اسلام سے بیزار کریں،اور دوبارہ کفر وشرک میں لوٹادیں، یا انہیں سبز باغ دکھا کر یہودیت ونصرانیت میں داخل کریں، کیونکہ اسلامی احکام ایک اعتبار سے بڑے سخت اور دشوار ہیں،اس کے مقابلے میں یہودیت ونصرانیت میں آزادی ہے۔

ان وجوہات کے پیشِ نظر وہ مسلمانوں میں بددلی پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام سے بدظن ہوں،اور ہمارے دین کے پیروکار ہوں۔ بالفرض! اگر کوئی مسلمان یہودی اور عیسائی نہ بھی بن سکے،تو کوئی بات نہیں! اسے کم از کم صحیح مسلمان نہیں رہنا چاہئے، بلکہ نام اس کا اسلامی ہو،عقیدہ وعمل غیر اسلامی ہو۔اپنے دین پر اس کا مکمل عقیدہ نہ ہو،اس کے خیالات متزلزل اور غیر یقینی ہوں۔

اس طرح مسلمان کا رشتہ اسلام سے کٹ جائے گا، اور ہمارے نظریات وخیالات پر گامزن رہے گا۔ اس کی شکل وصورت، وضع وقطع مسلمانوں کا ہوگا، دل ودماغ اور خیالات ہمارے پاس گروی رہیں گے، جیسے آج کل ہمارے نام نہاد انگریزی خواں مسلمانوں کا حال ہے۔ اوپر سے اسلام، اندر سے عیسائیت ویہودیت، اور معاشرہ بھی تباہ وبرباد۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا: ؎

وضع میں ہو تم نصاریٰ تو تمدن میں ہنود ☆ یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

اس لئے ارشاد ہوا کہ یہود ونصاریٰ ہرگز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے راضی نہیں ہوں گے، جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی ملت کا اتباع نہ کریں، اور ان کا مذہب اختیار نہ کریں، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ شاید کسی وقت یہ ایمان لے آئیں گے، بلکہ یہ تو الٹا مسلمانوں کو اپنے دین پر لانا چاہتے ہیں، جو ناممکن اور بہت ہی مشکل ہے۔ اور ان کی ملت خود ساختہ وتحریف شدہ ہے۔ یہ تمہیں اسی ملت پر لانا پسند کرتے ہیں۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے خیالِ خام کے جواب میں فرمائیے:

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ اللہ تعالیٰ کی ہدایت (اسلام) اصل ہدایت ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہدایتِ الٰہی (اسلام) کو چھوڑ کر ان کی ملت (خود ساختہ یا اصلی منسوخ شدہ) کا اتباع کریں گے، تو یہ خواہشات کی پیروی ہوجائے گی، جو کہ ہدایت کی ضد ہے۔ پس اتباعِ ہدیٰ نہیں رہے گا، خدانخواستہ گمراہی ہوگی، جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ممکن نہیں ہے۔

﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ (اور اگر آپ نے اتباع کیا ان کی خواہشات کا بعد اس کے کہ آپ کے پاس اس کا علم آچکا ہے) تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا: ﴿مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہ کوئی حمایتی ہوگا، اور نہ ہی کوئی مددگار۔ یعنی اے نبی! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اہلِ ایمان! اب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتابِ ہدایت آچکی ہے، اگر اس کو چھوڑ کر اہلِ کتاب کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت ضرور آسکتی ہے۔

اگرچہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قطعاً ممکن نہیں کہ حق کو ترک کر دیں، اور باطل کی اتباع کریں، تاہم قانونِ کلّی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرمائی کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، اُسی کی پیروی لازم ہے۔ کسی اور چیز کے پیچھے نہیں چلنا ہے۔ یہ قاعدہ سب کے لئے ہے، اور اس سے کوئی بھی مستثنیٰ اور بری الذمہ نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ﴾[الزمر: ۶۵] (اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے، اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے)۔اسی طرح: ﴿وَلَوۡ اَشۡرَكُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴾[الأنعام:۸۸] (اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے)۔

اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور دیگر انبیاء علیہم السلام سے شرک سرزد ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ یہ اصول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر بذریعۂ وحی بھیجی گئی، کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، اور شرعی احکام کے جس طرح اُمت کے لوگ مکلف ہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی ان کے پابند ہیں۔ارشاد ہے:﴿اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ [البقرة:۲۸۵] (رسول اس کتاب پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں، اور مؤمن بھی)۔﴿وَاۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا﴾ [طٰه:۱۳۵] (اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو، اور اس پر قائم رہو)۔

یہود و نصاریٰ کا دین اصل میں کتابِ الٰہی (تورات وانجیل) کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا، اور وہ برحق دینِ الٰہی تھا، مگر اب ان کی ملّت اور کتاب تحریفات کی وجہ سے بگڑ چکی تھیں، حتی کہ بنیادی چیزیں بھی معدوم ہو چکی تھیں، اس لئے وہ قابلِ اتباع نہیں ہیں، بلکہ وہ ہمیشہ کے لئے منسوخ بھی ہو گئیں۔اب سارے عالم پر دینِ اسلام کا غلبہ ہو جائے گا، اور اس کی آواز چاردانگِ عالم میں پھیل جائے گی، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَ دِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾ [الفتح:۲۸] (وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت (کی کتاب) اور دینِ حق دے کر بھیجا، تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے)۔

جب مقصدِ رسالت دیگر ادیان پر غالب ٹھہرا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ علمِ حق اور ہدایتِ الٰہی کی آمد کے بعد اہلِ کتاب کی خواہشات کی پیروی کی جائے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسریٰ کی ہلاکت کے بعد دوسرا کسریٰ پیدا نہیں ہوگا، اور قیصر کی ہلاکت کے بعد دوسرا قیصر پیدا نہیں ہوگا۔مگر رومی عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول تک باقی رہیں گے، اور تم ان سب کے ساتھ دست وگریبان رہو گے، کبھی ان کو غلبہ ہوگا، اور کبھی تم غالب رہو گے، گویا یہ لوگ قربِ قیامت تک باطل پر ڈٹے رہیں گے، لہٰذا ان سے قبولِ حق کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہئے۔[مسلم]

فائدہ:

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾ میں تہدیدی خطاب ظاہراً سرور عالم ﷺ کو ہے، لیکن سنانا دوسروں کو ہے۔ یہود و نصاریٰ کو، اور اس امت کے لوگوں کو بھی کہ خواہشات کا اتباع قطعاً حرام ہے، اور ہدایت کو چھوڑ کر بدعات وغیر شرعی رسومات کے پیچھے چل کر قرآن وسنت سے انحراف کسی صورت میں جائز نہیں ہے، اور یہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ غداری اور بغاوت ہے۔

آج مسلمانوں میں ایک طرف یہود و نصاریٰ کی تعلیمات، اور ان کی مذموم کافرانہ خیالات کی پزیرائی کا عروج ہے۔ پورے عالمِ اسلام کے معاشی، معاشرتی، تعلیمی، تنظیمی، ثقافتی، لسانی اور تہذیبی اقدار پر یورپ اور عیسائیت کا قبضہ ہے، جبکہ غیر مسلم اقوام میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف عداوت و دشمنی کی آگ جو نزولِ قرآن کے زمانے سے لے کر آج تک برابر بھڑک رہی ہے، اس میں کمی کا نام ونشان تک نہیں، بلکہ روز بروز اس میں تیزی آرہی ہے۔

اس آیت کریمہ نے واضح کیا کہ یہود و نصاریٰ کو حسد اور دشمنی کسی اور مذہب کے ساتھ نہیں ہے، ان کی عداوت صرف اسلام کے ساتھ ہے۔ وہ دنیا کے ہر باطل مذہب کے ساتھ بخوشی مصالحت کر سکتے ہیں، مگر اسلام کے ساتھ وہ کسی مصالحت پر آمادہ نہیں ہوتے۔

اس وقت یہودی اور عیسائی طاقتیں اسلام کے خلاف کھربوں ڈالر خرچ کر رہی ہیں کہ کسی نہ کسی طریقے سے مسلمان قوم کا تعلق اور رابطہ قرآن حکیم سے منقطع کر دیا جائے، اور وہ برملا کہتے رہتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کا تعلق قرآن پاک کے ساتھ مضبوط ہے، ہم مسلمانوں پر سیاسی اور مذہبی غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں وہ پانی کی طرح پیسہ خرچ کر رہے ہیں، اور دنیا کو پروپیگنڈے کے ذریعے باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسلام ہر قسم کی دنیوی ترقیوں میں رکاوٹ ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کا قرآن دنیا میں موجود ہے، دنیا میں امن وخوشحالی نہیں آئے گی۔ حالانکہ انہیں سو فیصد معلوم ہے کہ قرآن پاک ہر قسم کے امن وسلامتی کا پیغام لایا ہے، اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ دنیا کے جن چند خطوں میں جب تک قرآن کا نظام جاری رہا، تو قرآنی نظام نے صرف انسانوں کو نہیں، بلکہ حیوانات، چرند، پرند، کیڑے مکوڑوں تک کو بھی تحفظ دیا۔

اس کے ساتھ اس نے انسانوں کے کرۂ ارضی کو جنت کا گہوارہ بنا دیا، عدل وانصاف کے وہ محیر العقول مناظر

دیکھنے میں آئے، جن کو دیکھ کر لاکھوں لوگ دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئے، جنگل کے درندے اور بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ ساتھ گھاس کھانے پر مجبور ہو گئے۔ مرکزِ اسلام مکہ و مدینہ سے ہزاروں میل دور مملکتِ احمد شاہی، احمد آباد گجرات میں تیس سال گزرنے کے بعد پولیس نے بادشاہ کو ایک شخص کے قتل کی رپورٹ پیش کی، تو بادشاہ بیہوش ہو گئے، تین روز تک کھانا نہیں کھایا۔

یہ تھی قرآن پاک کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کی برکت! موجودہ افغانستان جہاں امن وسلامتی کے ٹھیکدار عیسائی اور یہود نے بلاوجہ پچاس لاکھ بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی، اور پورے ملک کی آبادی کو کھنڈرات میں تبدیل کیا۔ وہ کس منہ سے کہتا ہے کہ دنیا کے امن اور خوشحالی میں قرآن رکاوٹ ہے!! اسی افغانستان میں صرف پانچ سال کے لئے جب قرآن کا نظام رائج ہوا، تو لوگوں کو محی الدین اورنگزیب اور عمر بن عبدالعزیز و احمد شاہ کا زرّین دور یاد آیا۔

یہود و نصاریٰ آج سے نہیں، چودہ سو سال پہلے سے سر پیٹ رہے ہیں کہ تمام برائیوں کی بنیاد قرآن ہے، اور اسی کتاب نے مسلمانوں کے ہاتھ میں تلوار دے کر انہیں خونریزی پر اکسایا ہے۔ جہاد کو ایک نئی سازش کے تحت دہشت گردی کا نام دے کر لوگوں کو قرآن اور اسلام سے منقطع اور بیزار کرنے کی لا حاصل کوشش کی ہے، اور یہ ہر شخص کو بخوبی معلوم ہے کہ جہاد خونریزی کا نام ہرگز نہیں ہے۔ جہاد کا مقصد صرف اور صرف دفعِ فساد ہے، اسی طرح دیگر اسلامی حدود و تعزیرات کا مقصد بھی دفعِ فساد ہی ہے۔ جب فساد دب جائے گا، تو امن ہی قائم ہوگا۔

عیسائیوں نے آج سے ایک سو سال پہلے چند ناکارہ مذہب فروش مولویوں، پروفیسروں، دانشوروں اور شاعروں پر بے تحاشا پیسہ خرچ کیا، کہ کسی طرح مسلمان اور قرآن کے درمیان فاصلہ پیدا کیا جائے، اور قرآن میں بھی تورات وانجیل کی طرح تحریف کر کے جہاد نامی عمل کو ہمیشہ کے لئے محو کیا جائے، چونکہ قرآن مجید تکوینی طور پر محفوظ ہے، اس کے نظم، عبارت، کلمات، حروف میں کسی قسم کے ردّ و بدل کا امکان نہیں ہے، تو عیسائیوں کے وظیفہ خور، کاسہ لیس لوگوں نے معنوی تحریف شروع کی۔ بدنصیب مرزا قادیانی حقیقۃ الوحی کتاب میں خود لکھتا ہے کہ میں نے انگریزوں کی حمایت میں پچاس الماریاں کتابوں کی تالیف کی ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے نام نہاد مذہب فروش مذہبی علماء اور سکالروں نے انگریز کی حمایت، اور اسلام کی مخالفت میں کتابیں لکھیں، ان کی کوئی حد نہیں ہے۔

دراصل یہ ہوتا تھا کہ جو شخص قرآن و حدیث کی معنوی تحریف پر، یا جہاد جیسے عمل کے خلاف، یا انگریز

گورنمنٹ کی حمایت میں جولکھتا تھا، اس زمانے کے نرخ وحساب سے اس کو ہر صفحہ کے لکھنے پر سو روپیہ اُجرت وعوضانہ ملتا تھا۔ اس زمانے کا سو روپیہ آج کے پچاس ہزار روپیہ کے برابر شمار ہوتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر عیسائیوں کے خلاف جہاد کا فتوے صادر فرمایا۔ چند روز بعد جب یہ اشتہار چھپ کر شائع ہوا، تو فوراً ضبط ہوا، اور عیسائیوں، انگریزوں نے ایک بڑے پیر صاحب مفکر اسلام حضرت اقدس کی خدمات حاصل کرلیں۔ جناب پیر صاحب نے فوراً شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے "اِظْهَارُ الْكَرْبِ بِاَنَّ الْهِنْدَ دَارُ الْحَرْبِ" کی تردید میں "اِعْلَامُ الْاِعْلَامِ بِاَنَّ هِنْدُوسْتَان دَارُ الْاِسْلَام" کے نام سے رسالہ تالیف فرمایا، اور شائع کرایا۔

اس پیر صاحب کو اکثر لوگ جانتے ہیں، میں نے اس کا نام خفاء میں رکھا۔ کچھ دیگر لوگ بھی میدان میں اترے تھے، ان میں محمد حسین بھوپالی شیعی، اور عزیز احمد لکھنوی شیعی، اور جناب سر سید احمد خان بھی ہے۔ آپ اندازہ لگائیں! یہودی اور عیسائی حقیقی اسلام کے دشمن ہیں، اور قیامت تک رہیں گے، وہ کبھی حقیقی اسلام کو تسلیم نہیں کریں گے۔ صحیح مسلم کی گزشتہ حدیث کے مطابق قربِ قیامت تک اسلام کے ساتھ برسرِ پیکار رہیں گے، اور اہلِ کتاب ہر محاذ پر حقیقی اسلام سے خوفزدہ وخائف رہیں گے، مگر عرس ومزارات، نذرانے اور قبروں پر میلہ وچراغاں والے اسلام سے انہوں نے نہ تو کبھی محاذ آرائی کی، نہ ان سے ناراض ہوئے، اور نہ ہی کبھی ان سے کوئی خوف محسوس کیا۔

اسی طرح شیعہ وروافض اور دیگر بہت سے فرقوں کے ساتھ ابھی بھی ان کے مراسم قائم ہیں۔ البتہ! اصلی حقیقی اسلام انگریزوں کا مبغوض بھی رہا، اور دشمن بھی رہا، اسے کبھی یہودیت ونصرانیت نے تسلیم نہیں کیا۔ جب بھی کوئی سازش کی تو اسی کے خلاف کی، یہی وہ طبقہ عالیہ اور طائفہ منصورہ ہے جس نے انگریز تو کیا، بلکہ ہر فرقہ باطلہ کا ہر محاذ پر بڑی جرأت ودلیری کے ساتھ نتائج وعواقب سے بے نیاز ہو کر مقابلہ کیا۔ اگر کوئی سورج کے درخشاں شعاعوں کو انگلی سے نہیں چھپا سکتا، تو علماء دیوبند کے کارناموں کو بھی کوئی کسی تدبیر وحیلہ سے نہیں چھپا سکتا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [الآیۃ] تو جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان (باتوں کے بارے) میں ان کا فیصلہ کردے گا)۔

اس کے بعد ربّ العزّت یہ فرما رہے ہیں کہ اہلِ کتاب (اسی زمانہ کے) سارے ایک جیسے نہیں ہیں، کہ اسلام کے بدخواہ اور باغی ہوں، بلکہ ان میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو منصف مزاج ہیں، اگرچہ کم تعداد میں سہی، مگر وہ مخلص ہیں۔

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾[الآیۃ] (جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں، جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے)۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿لَیْسُوْا سَوَآءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیَاتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ﴾[آل عمران: ۱۱۳] (یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں، ان اہل کتاب میں کچھ لوگ (حکم خدا پر) قائم بھی ہیں جو رات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے، اور (اس کے آگے) سجدہ کرتے ہیں)۔ تو اس آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں دوسرے لوگوں کی طرح کسی قسم کی تحریف لفظی اور معنوی نہیں کرتے ہیں۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات اور قرآن کریم کی صداقت دین اسلام کی حقانیت جو ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، ان کو کھل کر ظاہر کرتے ہیں، چھپاتے نہیں ہیں، اور اسلام قبول کرتے ہیں، راتوں کو قیام اللیل ادا کر کے حق کے حضور سرِ تسلیم خم کر کے سجدہ کرتے ہیں۔

دراصل اپنی کتاب تورات وانجیل پر ایمان لانے والے لوگ یہی ہیں، جو اپنی کتابوں کی ہدایت وبشارت پر عمل کر کے نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے، اور قرآن کریم کی تصدیق کی، اور جو اہلِ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے، وہ درحقیقت اپنی کتاب پر بھی ایمان نہیں لائے، اور اس کی بشارت پر عمل نہیں کیا۔

انہی لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (اور جو اس کے ساتھ کفر کرتا ہے یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں)۔ یہاں "بِہٖ" کی ضمیر "هُدٰی" قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تینوں کی طرف راجع کر سکتے ہیں، یعنی "هُدٰی" کا منکر ہو، یا تورات وانجیل اور قرآن کا منکر ہو، یا سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منکر ہو، یہ کفار ہیں، اور خسارے والے ہیں۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ایک کتاب کا منکر ساری کتابوں کا منکر کہلائے گا، اور ایک نبی کا منکر سارے انبیاء علیہم السلام کا منکر شمار ہوگا۔

بعض علماء مفسرین کے نزدیک ﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور ﴿الْكِتٰبَ﴾ کا مصداق قرآن کریم ہے۔ ﴿حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ رات دن بڑے ذوق وشوق سے ترتیل کے ساتھ صحیح تلاوت کرتے ہیں، اور اس پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آیت کو عموم پر رکھ کر مؤمنین اہلِ کتاب اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، نیز قیامت تک آنے والے علماء وقراء سب کو اس کا مصداق قرار دیا جائے۔ کسی خاص

طبقہ کے ساتھ تخصیص نہ ہو، کیونکہ قرآن مجید کا موضوع ہر جگہ عموم ہی ہے۔ إلّا ماشاء اللہ

حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کا مقصد:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک ﴿حَقَّ تِلَاوَتِہٖ﴾ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کی جائے۔ آیاتِ رحمت پر جنت کا سوال کرے، آیاتِ قہر و غضب پر وقف کرکے استعاذہ کرے، پناہ مانگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تلاوت میں حروف کے مخارج وصفات کا لحاظ اور اوقاف کی خیالداری ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تلاوت میں تیزی اور عجلت نہ ہو۔ الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ معانی اور مطالب کا لحاظ ہو۔ غالباً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ تلاوت میں خضوع وخشوع اور انکساری ہو، اور قرآن مجید پر عمل ہو۔ سبحان اللہ! مآل سب کا ایک ہی ہے۔ مستحب اور خوش قسمتی یہی ہے کہ سب اقوال پر عمل ہو۔ اے ارحم الراحمین! ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما! آمین

يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّيۡ فَضَّلۡتُكُمۡ
عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ۝۱۲۲ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِيۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔـا
وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ۝۱۲۳

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم پر کیں، اور یہ بات کہ بیشک! میں نے تم کو جہاں والوں پر فضیلت بخشی ۝۱۲۲ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آئے گا کوئی نفس کسی کی طرف سے ذرا بھی، اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے بدلہ، اور نہ اس کو سفارش فائدہ دے گی، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ۝۱۲۳

معارف ومنازل

قرآن حکیم میں لفظ بنی اسرائیل تینتالیس مقامات پر مذکور ہے۔ چار مقامات میں خطاب کے ساتھ، باقی مقامات میں بغیر خطاب کے۔ شروع کے دو رکوع میں خطاب کے ساتھ مذکور تھا، اب یہ تیسرا مقام ہے، جو خطاب کے ساتھ ہے۔ اوّل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا اجمالاً ذکر فرما کر انہیں یاد دہانی کرائی۔ دوسرے ﴿يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ سے اپنی بے پناہ، بے بہا نعمتوں، عنایتوں کا ذکر فرما کر یہود کی تقریباً چالیس کے قریب قباحتوں،

جنایات اور تقصیرات کا ترتیب وار تذکرہ فرمایا۔ اب آخر میں دوبارہ اجمالی نعمتوں کی شکر گزاری کی تاکید فرمارہے ہیں۔ یہ طرزِ بیان بلاغت وفصاحت کے عین مطابق ہے، کہ شروع میں اجمال ہو، پھر اس کی تفصیل ہو۔ آخر میں یاددہانی کے طور پر پھر اجمال کا اعادہ ہو۔

علامہ ابوحیان ''بحر المحیط'' میں فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اس سورت میں تین مرتبہ خطاب فرما کر انہیں اعزاز بخشا، اور شرف وعزّت کے ساتھ نوازا گیا، لیکن بنی اسرائیل نے غرور وسرکشی اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی ان عظیم اور بے پناہ نعمتوں کا ناشکری وناسپاسی سے جواب دے کر اس کی مسلسل نافرمانیوں کا سلسلہ جاری رکھا، تو اللہ تعالیٰ نے اعراض فرما کر تین مرتبہ کے بعد پھر کبھی انہیں خطاب نہیں فرمایا، کہ یہ قوم ہرگز اس قابل نہیں کہ انہیں خطاب کے اعزاز سے نوازا جائے۔

سورۃ طٰہٰ میں جو انہیں ایک مرتبہ خطاب ہوا ہے، وہ مکی سورت ہے، اور خطاب بھی مکہ میں ہوا ہے، وہ یہ ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ﴾ [طٰہٰ:۸۰] (اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو نجات دی، اور تم سے وعدہ لیا) اس تیسرے خطاب کا مضمون اور تمام ضروری مقاصد دوسرے خطاب کے ضمن میں مذکور ہوئے، سوائے ایک دو کلمات کی تقدیم وتاخیر کے، باقی مطالب وہی ہیں جو وہاں بیان ہوئے۔ مزید معلومات کے لئے دوبارہ مطالعہ ہو۔ وباللہ التوفیق

❁ ❁ ❁

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَـمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ
اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے ربّ نے چند باتوں کے ساتھ، پس انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہیں لوگوں کے لئے پیشوا بنانے والا ہوں، (ابراہیم علیہ السلام نے) کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: میرا وعدہ ظالموں کے لئے نہیں ہے ﴿۱۲۴﴾

معارف ومنازل

بہتر یہ ہے کہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ وتعارف ہو، پھر آیت کریمہ پر کلام ہو۔

نسب نامہ:

ابراہیم علیہ السلام بن تارخ (آزر) بن ناحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا نام بقولِ بعض ''امیلہ'' ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: بونا بنت کربنا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب الخلیل، الحنیف ہے، اور کنیت أبو الأنبیاء، أبو الضیفان ہے۔ [البدایة]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش بابل (عراق) میں ہوئی۔ یہی صحیح ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام دمشق کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ دراصل یہاں آپ علیہ السلام نے ہجرت کی، تو مقامِ ہجرت کو لوگوں نے مقامِ پیدائش سمجھا۔ پہلا قول صحیح ہے، جو کہ جمہور مؤرخین کا ہے۔ علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو راجح بتایا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن مجید میں اُنہتر مقامات پر مذکور ہے، سب سے زیادہ سورۂ بقرہ میں ذکر ہے، جہاں آپ علیہ السلام کا نام پندرہ دفعہ ذکر ہوا ہے۔ آپ علیہ السلام کی عمر شریف ایک سو پچھتر سال تھی، شام میں الخلیل نامی بستی کے کونے میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر آپ کا مزار ہے۔

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے تعبیر میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے جو چھوٹے بچے صغرسنی میں وفات پاتے ہیں، وہ قیامت تک برزخ میں حضرت ابراہیم و حضرت سارہ علیہما السلام کی کفالت میں ہوتے ہیں۔ اس کی تائید ایک حدیث (بخاری اول ص:۱۸۵) سے بھی ہوتی ہے۔

فائدہ:

آزر جس کو قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ بتایا ہے، اس پر علماء امت کا اجماع ہے کہ آزر کا کفر منصوص ہے، اور یہ کفر پر مرا ہے۔ البتہ! یہ بات مختلف فیہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے، یا چچا۔ علماء کرام سے دونوں طرح کے قول منقول ہیں۔ جو علماء اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

(۱) اولاً: اکثر محققین اور اہلِ کتاب کے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام ''تارخ'' تھا، بالحاء او بالخاء، نہ کہ آزر۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے ہیں کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام نہیں ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہم نے نقل کیا ہے۔

(۲) ثانیاً: بعض روایات میں اس پر صراحۃً ''عم'' کا اطلاق ہوا ہے۔

''اَخرَجَ ابنُ المُنذِرِ فِی تَفسِیرِہٖ بِسَنَدٍ صَحِیحٍ عَن سُلَیمَانَ بنِ صُرَدٍ الصَّحَابِیِّ قَالَ

لَمَّا اَرَادُوْا اَنْ یُّلْقُوْا اِبْرَاهِیْمَ فِی النَّارِ جَعَلُوْا یَجْمَعُوْنَ الْحَطَبَ حَتّٰی اَنْ کَانَتِ الْعَجُوْزُ لَتَجْمَعُ الْحَطَبَ فَلَمَّا اَرَادُوْا اَنْ یُّلْقُوْہُ فِی النَّارِ قَالَ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۔ فَلَمَّا اَلْقَوْہُ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ ۔ فَقَالَ عَمُّ اِبْرَاهِیْمَ مِنْ اَجْلِیْ دُفِعَ عَنْہُ فَاَرْسَلَ اللّٰہُ عَلَیْہِ شَرَارَةً مِّنَ النَّارِ فَوَقَعَتْ عَلٰی قَدَمِہٖ فَاَحْرَقَتْہُ"۔ [الحدیث]

حافظ سیوطی رحمہ اللہ اس حدیث کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:

"فَقَدْ صَرَّحَ فِیْ هٰذَا الْاَثَرِ بِاَنَّہٗ عَمُّ اِبْرٰهِیْمَ وَفِیْہِ فَائِدَةٌ اُخْرٰی وَهُوَ اَنَّہٗ مَاتَ فِیْ اَیَّامِ اِلْقَاءِ اِبْرَاهِیْمَ فِی النَّارِ وَقَدْ اَخْبَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی الْقُرْاٰنِ بِاَنَّ اِبْرَاهِیْمَ تَرَکَ الْاِسْتِغْفَارَ لَہٗ لَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِلّٰہِ وَوَرَدَتِ الْاٰثَارُ بِاَنَّ ذٰلِکَ تَبَیَّنَ لَہٗ لَمَّا مَاتَ مُشْرِکًا وَّاَنَّہٗ لَمْ یَسْتَغْفِرْ لَہٗ بَعْدَ ذٰلِکَ"۔

[مسالک الحنفاء للسیوطي]

(۳) ثالثاً: حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ کے اثر سے یہی ثابت ہوا کہ آزر عمِ ابراہیم علیہ السلام بابل میں مر گئے، اور اصحابِ تاریخ وعلماء تفسیر کہتے ہیں کہ امتحانِ القاء فی النار کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے ارضِ بابل ترک کر کے ارضِ کنعانیین (شام فلسطین) ہجرت کی، اور اس سفرِ ہجرت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے والد تارخ بھی تھے، اور آپ علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ اور لوط علیہ السلام بھی شریکِ سفرِ ہجرت رہے۔

اس سے دو امور معلوم ہوئے: اول یہ کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہیں ہے، کیونکہ آزر کی موت کے بعد بھی ان کے والد تارخ کافی مدّت تک زندہ رہے۔

دوم یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد مؤمن تھے، اور حفاظتِ ایمان کی خاطر مسلمانوں کی اس چھوٹی سی جماعت نے یہ ہجرت کی تھی۔ اس وقت کُل مسلمان ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ آپ علیہ السلام کے والد کے علاوہ دو اور، یعنی لوط علیہ السلام اور حضرت سارہ بھی تھے۔ اگر آپ علیہ السلام کے والد مسلمان نہ ہوتے تو ہجرت کیوں کرتے؟

اس دلیل کا مأخذ "البدایة لابن کثیر" ہے۔ چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ البدایہ جلد اول میں رقم طراز ہیں:

"قَالُوْا فَتَزَوَّجَ اِبْرَاهِیْمُ سَارَةَ وَکَانَتْ عَاقِرًا لَاتَلِدُ قَالُوْا وَانْطَلَقَ تَارَخُ بِابْنِہٖ اِبْرٰهِیْمَ وَامْرَاَتِہٖ سَارَةَ وَابْنِ اَخِیْہِ لُوْطِ بْنِ هَارَانَ فَخَرَجَ بِهِمْ مِنْ اَرْضِ الْکُلْدَانِیِّیْنَ اِلٰی اَرْضِ الْکَنْعَانِیِّیْنَ

فَنَزَلُوا حَرَّانَ، فَمَاتَ فِيهَا تَارِحُ وَلَهُ مِائَتَانِ وَخَمْسُونَ سَنَةً وَهٰذَا يَدُلُّ عَلَى اَنَّ اِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمْ يُولَدْ بِحَرَّانَ وَاِنَّمَا مَوْلِدُهُ بِاَرْضِ الْكُلْدَانِيِّينَ وَهِيَ اَرْضُ بَابِلَ كَمَا مَرَّ"۔

(۴) **رابعاً:** علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے مسالک الحنفاء میں دلائلِ قویہ سے ثابت کیا ہے کہ ہمارے نبی پاک سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کُل اجداد وجدّات حضرت عبدالمطلب سے حضرت آدم علیہ السلام تک سب مؤمن تھے۔(زمانہ فترۃ پر کلام آنے والا ہے)۔

"قَالَ فِي مَسَالِكِ الْحُنَفَاءِ: بَعْدَ بَحْثٍ، فَعُرِفَ مِنْ مَجْمُوعِ هٰذِهِ الْاٰثَارِ اَنَّ اَجْدَادَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوا مُؤْمِنِينَ بِيَقِينٍ مِنْ اٰدَمَ اِلَى زَمَنِ نَمْرُوْدٍ وَفِي زَمَنِهِ، كَانَ اِبْرٰهِيمُ وَآزَرُ، وَقَالَ الْفَخْرُ الرَّازِيُّ علیہ الرحمۃ: قِيلَ اَنَّ آزَرَ لَمْ يَكُنْ وَالِدَ اِبْرَاهِيمَ بَلْ كَانَ عَمَّهُ، وَاحْتَجُّوا عَلَيْهِ بِوُجُوهٍ مِنْهَا: اَنَّ آبَاءَ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مَا كَانُوا كُفَّارًا وَيَدُلُّ عَلَيْهِ وُجُوهٌ مِنْهَا: قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِينَ﴾" [الشعراء]

"قِيلَ مَعْنَاهُ اَنَّهُ كَانَ يَنْقُلُ نُورَهُ مِنْ سَاجِدٍ اِلَى سَاجِدٍ، ثُمَّ قَالَ: وَمِمَّا يَدُلُّ عَلَى اَنَّ آبَاءَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كَانُوا مُشْرِكِينَ، قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لَمْ اَزَلْ اُنْقَلُ مِنْ اَصْلَابِ الطَّاهِرِينَ اِلَى اَرْحَامِ الطَّاهِرَاتِ، وَقَالَ تَعَالَى: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ فَوَجَبَ اَنْ لَا يَكُونَ اَحَدٌ مِنْ اَجْدَادِهِ مُشْرِكًا۔"

نیز کئی احادیثِ مرفوعہ سے مذکورِ صدر دعویٰ کی تائید مستنبط کی جاسکتی ہے، مثلاً:

"اَخْرَجَ الْبَيْهَقِيُّ فِي دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا افْتَرَقَ النَّاسُ فِرْقَتَيْنِ اِلَّا جَعَلَنِيَ اللهُ فِي خَيْرِهِمَا فَاُخْرِجْتُ مِنْ بَيْنِ اَبَوَيَّ فَلَمْ يُصِبْنِي شَيْءٌ مِنْ عَهْدِ الْجَاهِلِيَّةِ خَرَجْتُ مِنْ نِكَاحٍ وَلَمْ اَخْرُجْ مِنْ سِفَاحٍ مِنْ لَدُنْ آدَمَ حَتّٰى انْتَهَيْتُ اِلَى اَبِي وَاُمِّي، فَاَنَا خَيْرُكُمْ نَفْسًا وَخَيْرُكُمْ اَبًا وَاَخْرَجَ اَبُو نُعَيْمٍ فِي دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ مِنْ طُرُقٍ عَنْ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَزَلِ اللهُ يَنْقُلُنِي مِنَ الْاَصْلَابِ الطَّيِّبَةِ اِلَى الْاَرْحَامِ الطَّاهِرَةِ مُصَفًّى مُهَذَّبًا لَا تَنْشَعِبُ شُعْبَتَانِ اِلَّا كُنْتُ فِي خَيْرِهِمَا"۔

(۵) خامسا: آزر وتارخ کی وفات کے بعد ابراہیم علیہ السلام اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں، جب کہ کافر کے لئے بعد الموت ایسی دعا حرام ہے۔

معلوم ہوا کہ آزر عمِ ابراہیم علیہ السلام ہے، اور آپ علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا، نہ کہ آزر۔ نیز ثابت ہوا کہ آپ علیہ السلام کے والد مؤمن تھے، اور ان کی موت ہجرت کے بعد ایمان پر ہوئی تھی۔

قرآن حکیم میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ کو مکہ مکرمہ میں چھوڑنے کے بعد یہ دعا کی: ﴿رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ ﴾ إلى قوله تعالىٰ: ﴿رَبَّنَا اغۡفِرۡلِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ﴾ [ابراهيم: ۴۱]

"فَاسْتَغْفَرَ لِوَالِدَيْهِ وَ ذٰلِكَ بَعْدَ هَلَاكِ عَمِّهٖ بِمُدَّةٍ فَنَسْتَنْبِطُ مِنْ هٰذَا اَنَّ الْمَذْكُوْرَ فِي الْقُرْاٰنِ بِالْكُفْرِ وَ التَّبَرِّيْ مِنَ الْاِسْتِغْفَارِ لَهٗ هُوَ عَمُّهٗ لَا اَبُوْهُ الْحَقِيْقِيُّ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰى مَا وَفَّقَ وَ اَلْهَمَ"۔

رَوَى ابْنُ سَعْدٍ فِي الطَّبَقَاتِ عَنِ الْكَلْبِيِّ قَالَ هَاجَرَ اِبْرَاهِيْمُ مِنْ بَابِلٍ اِلَى الشَّامِ وَ هُوَ يَوْمَئِذٍ ابْنُ سَبْعٍ وَ ثَلَاثِيْنَ سَنَةً فَاَتٰى حَرَّانَ فَاَقَامَ بِهَا زَمَانًا ثُمَّ اَتٰى اِلَى الْاُرْدُنِ فَاَقَامَ بِهَا زَمَانًا ثُمَّ خَرَجَ اِلٰى مِصْرٍ فَاَقَامَ بِهَا زَمَانًا ثُمَّ رَجَعَ اِلَى الشَّامِ فَنَزَلَ السَّبْعَ (اسم لمكان) بَيْنَ اِيْلِيَاءَ وَ فِلَسْطِيْنَ ثُمَّ اِنَّ بَعْضَ اَهْلِ الْبَلَدِ اٰذَوْهُ فَتَحَوَّلَ مِنْ عِنْدِهِمْ فَنَزَلَ مَنْزِلًا بَيْنَ الرَّمْلَةِ وَ اِيْلِيَاءَ۔

وَرَوَى ابْنُ سَعْدٍ عَنِ الْوَاقِدِيِّ قَالَ وُلِدَ لِاِبْرَاهِيْمَ اِسْمَاعِيْلُ وَ هُوَ ابْنُ تِسْعِيْنَ سَنَةً فَعُرِفَ مِنْ هٰذَيْنِ الْاَثَرَيْنِ اَنَّ بَيْنَ هِجْرَتِهٖ مِنْ بَابِلٍ عَقِيْبَ وَاقِعَةِ النَّارِ وَ بَيْنَ الدَّعْوَةِ الَّتِيْ دَعَا بِهَا بِمَكَّةَ الْمُكَرَّمَةِ بِضْعًا وَ خَمْسِيْنَ سَنَةً۔

سوال: جب آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہیں تھے، تو قرآن مجید نے اس کو اَب کیوں کہا؟

جواب: عم پر لغتِ عرب اور عرفِ شرع میں اَب کا اطلاق رائج وشائع ہے، قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَمۡ کُنۡتُمۡ شُہَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ یَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ اِذۡ قَالَ لِبَنِیۡہِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰـہَکَ وَ اِلٰـہَ اٰبَآئِکَ اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ﴾ [البقرة: ۱۳۳] (کیا اس وقت تم حاضر تھے جب

یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ ان سب نے کہا تھا کہ: ہم اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود ہے، اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے)۔ یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام پر اَب کا اطلاق ہوا، حالانکہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے جدامجد ہیں۔ ''وَاَخرَجَ عَنْ اَبِی الْعَالِیَةِ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی: وَاِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ، قَالَ سَمَّیَ الْعَمَّ اَبًا''۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے پیشوا محبوب ربّ العلمین سید الاوّلین والآخرین خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدامجد ہیں، اور آپ علیہ السلام کے بعد سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کے اخیر تشہد میں درود شریف پڑھتے وقت آپ علیہ السلام کا نام لینے کا حکم ہے۔

شبِ معراج میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساتویں آسمان پر آپ علیہ السلام کو اس حال میں پایا تھا کہ بیت المعمور سے آپ علیہ السلام ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ [مسلم] آپ علیہ السلام نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استقبال مرحبا بالنبي الصالح والابن الصالح فرماتے ہوئے کیا تھا۔ [متفق علیہ] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز سب سے پہلے جس کو لباس پہنایا جائے گا، وہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام ہوں گے''۔ [بخاري]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، تو آپ علیہ السلام کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے: ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ''۔ اس کے علاوہ دعا بھی: ''اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ فِي السَّمَاءِ وَاحِدٌ وَاَنَا فِی الْاَرْضِ وَاحِدٌ اَعْبُدُکَ''۔ (اے ربّ تعالیٰ! بلاشک تو آسمان میں واحد ہے، اور زمین پر میں اکیلا تیرا پرستار ہوں)۔

سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے حلیہ مبارک کے متعلق ارشاد فرمایا کہ آپ لوگ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شکل و صورت دیکھنا چاہو تو مجھے دیکھو۔ [متفق علیه]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، دوسری بیوی حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل کے چار ہزار پیغمبر سب حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ تیسری بیوی قنطورہ کے بطن سے چھ لڑکے، چوتھی بیوی حجون کے بطن سے پانچ لڑکے پیدا ہوئے۔ پوری تفصیل البدایۃ والنہایہ میں مذکور ہے، وہاں دیکھا جائے۔

☆☆☆

الفترة:

''فترت'' کے معنی ہیں: انقطاع۔اس کی تین قسمیں ہیں۔قرینہ کے ذریعے ان تین میں سے ہر ایک قسم کی تعیین کی جاتی ہے، کتابوں میں تینوں اقسام مستعمل ہیں:

(۱) عہدِ قدیم میں دو پیغمبروں کے مابین زمانۂ جاہلیت پر فترت کا اطلاق ہوتا ہے۔مِثْلُ الْفَتْرَةِ بَيْنَ اٰدَمَ علیہ السلام وَ اِدْرِيْسَ علیہ السلام، وَ كَذٰلِكَ بَيْنَ اِدْرِيْسَ علیہ السلام وَ نُوْحٍ علیہ السلام، وَبَيْنَ نُوْحٍ علیہ السلام وَهُوْدٍ علیہ السلام، وَبَيْنَ هُوْدٍ وَ صَالِحٍ، وَ بَيْنَ صَالِحٍ وَ اِبْرَاهِيْمَ علیہ السلام۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین طویل زمانۂ جاہلیت فترت کہلاتا ہے۔ اس زمانۂ فترت کا عرصہ تقریباً چھ سو سال سے کچھ کم ہے۔

(۳) فترت الوحی، غارِحراء میں نبوت مل جانے، اور سورۃ اقراء کی پانچ آیات کے نزول کے بعد تقریباً تین سال تک وحی کے نزول میں انقطاع آیا۔ یہ فترۃ الوحی کہلاتا ہے۔اس زمانۂ فترت کے اندر جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات کا وقفہ کبھی چالیس دن ہوتا تھا، کبھی پندرہ دن، کبھی بارہ اور کبھی تین دن۔ ''قَالَ الْاِمَامُ الشَّعْبِيُّ وُكِّلَ اِسْرَافِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِنُبُوَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَ سِنِيْنَ ثُمَّ جَاءَهٗ جِبْرِيْلُ بِالْقُرْاٰنِ''۔اس فترت کے اختتام پر سب سے پہلی وحی ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ نازل ہوئی۔[بخاري]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین اس عرصہ فترت میں تحریفات کی وجہ سے مکمل مٹ چکا تھا، برائے نام چند ایک احکام باقی رہ گئے تھے، وہ بھی غیر یقینی، اس لئے اس زمانۂ فترت کو ایامِ جاہلیت کہا جاتا ہے کہ اس میں سوائے ظلم وستم اور شرک وبت پرستی، اور رسومِ جہالت کے روئے زمین پر کچھ بھی نہ تھا، اور پورے اُفق پر آسمانی کتاب وآسمانی شریعت کا نام ونشان تک نہ تھا، سارا جہاں ظلمتوں میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ وَالْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ اَوْلَادُ عَلَّاتٍ وَلَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عِيْسٰى نَبِيٌّ۔[احمد، ابن حبان]

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ دِيْنُهُمْ وَاحِدٌ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَاَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ لِاَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ نَبِيٌّ وَاَنَّهٗ نَازِلٌ۔[رواه أحمد في المسند]

بعض علماء تاریخ وتفسیر جیسے زمخشری و بیضاوی وغیرہ فرماتے ہیں کہ زمانۂ فترت میں چار انبیاء مبعوث ہوئے ہیں، جن میں حضرت خالد بن سنان عبسی عرب تھے، اور بقیہ تین بنی اسرائیل میں سے تھے۔ حنظلہ بن صفوان وشعیب بن ذی مہذم وغیرہ، مگر صحیح وہی ہے جو پہلے بیان ہوا۔ ہاں! بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ حضرات انبیاء نہیں تھے، بلکہ مصلحین، مبلّغین، نیک، متقی اور باکرامت لوگ تھے۔ لوگوں نے ان کی دیانت وتقویٰ کو دیکھ کر انہیں پیغمبر یقین کیا۔ یہ بڑی طویل بحث ہے، اس کی تفصیل سورۃ آل عمران میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

زمانۂ فترت کے متعلق میں دس مسائل:

زمانۂ فترت کے سلسلے میں علماء محققین نے جن دس مسائل پر بحث کی ہے وہ یہ مسائل ہیں:

(۱) سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء واجداد، امہات وجدات الطاہرین والطاہرات۔

(۲) کفار ومشرکین کے نابالغ بچے بچیاں، جو بلوغ سے پہلے وفات پا چکے تھے۔

(۳) فاتر العقل مجانین، پاگل لوگ، جو بحالتِ جنون مر جائیں۔

(۴) زمانۂ فترت کے عاقل بالغ تندرست لوگ، جن کے متعلق کوئی معلومات نہ ہوں۔

(۵) زمانۂ فترت کے معذورین، گونگے، بہرے اور اندھے لوگ، جو اسی حالت میں مر گئے ہوں۔

(۶) وہ لوگ جن پر نبوت، شریعت، احکامِ الٰہی کی پہنچ ممکن نہ ہو، جیسے یاجوج ماجوج وغیرہ۔

(۷) وہ لوگ جنہوں نے اخبار یا عقل کی راہنمائی سے توحید سیکھی، مگر کسی مذہب پر نہیں رہے، محض اپنی نسبت ملتِ ابراہیمی کی طرف کی، جیسے قیس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل وغیرہ۔

(۸) وہ لوگ جو اپنی نسبت توریت وانجیل کی طرف کر کے مؤمن بنے، جیسے تبع حمیری، ورقہ بن نوفل، حاتم طائی وغیرہ۔

(۹) وہ لوگ جنہوں نے قصداً کفر وشرک اور بت پرستی اختیار کی، جیسے عمرو بن لحی بن قمعہ خزاعی۔

(۱۰) وہ لوگ جنہوں نے زمانۂ فترت اور اسلام دونوں کو پایا، اور اسلام قبول نہیں کیا، یعنی فترتِ وحی کے تینوں سالوں کو پایا، اور رسالت کے اعلان سے پہلے مر گئے۔

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ ﴾ [الآیۃ]

ربط ومناسبت: بنی اسرائیل اس بات پر مغرور تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ان کے نقش قدم

پر چل رہے ہیں، اور وہ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کسی اسرائیلی کو دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے، پھر یہود کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے ہیں۔ نصرانی کہتے تھے کہ وہ ہمارے تھے، ان کو دیکھ کر مکہ وعرب کے مشرک کہنے لگے: ابراہیم علیہ السلام ہمارے جدامجد تھے، ہم لوگ ان کی ملّت کے محافظ ہیں۔ ان ساری بے بنیاد باتوں کا تفصیلی جواب سورۂ آل عمران میں: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [آلعمران:۶۷] کے تحت آنے والا ہے، یہاں صرف چند ضروری امور کا تذکرہ ہے:

(۱) اوّل یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اور وراثت میں ظالموں کا کوئی حصہ نہیں ہے، اور تم تینوں فریق ظالم و نافرمان ہو۔

(۲) دوم یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبۃ اللہ ہی ہے، بلکہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام حتی کہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کا قبلہ بھی کعبۃ اللہ ہی رہا۔ بیت المقدس کا اختراع یہود نے کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قبلہ ہونے کی کہیں بھی کسی حدیث میں تصریح نہیں فرمائی، صرف یہود کے قلوب کی تألیف کی خاطر وحی خفی کے ذریعے سولہ ماہ استقبال بیت المقدس فرمایا اور بس۔

(۳) ملّتِ ابراہیمی ملّتِ اسلام کا ہی نام ہے، اور کسی کا نہیں۔

(۴) صرف ملّتِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی ہے، اور کسی کے لئے نہیں۔

(۵) ابراہیم علیہ السلام نے جس صاحبزادے (اسماعیل علیہ السلام) کے ساتھ مل کر کعبہ شریف کی تعمیر کی ہے، اور دونوں نے قومِ عرب میں جس پیغمبر کے لئے دعا کی ہے، وہ نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

(۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ کے معمار ہیں۔ بیت المقدس کے نہیں، تو ابراہیم علیہ السلام کا قرب ورشتہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر اعتبار سے محکم ہے، یہ ملّت والا رشتہ ان شاء اللہ قیامت تک برقرار و مضبوط رہے گا، اس میں کسی کمی کا امکان نہیں ہے، جبکہ تم لوگوں نے (یہود ونصاریٰ ومشرک) قلیل ومختصر عرصہ کے اندر ملّتِ ابراہیمی سے دینی ومذہبی تعلقات توڑ کر، ملّتِ ابراہیمی کے خدوخال، حلیہ اور شکل وصورت کو بگاڑ دیا۔ تمہیں ملّتِ ابراہیمی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو ☆ پھر پسر وارث میراث پدر کیونکر ہو

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دینی رشتہ یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ مکہ سے مکمل منقطع فرما کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے ساتھ جوڑ کر یوں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران:۶۸] (ابراہیم علیہ السلام سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں، اور پیغمبر (آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے)۔

(۷) ابوالانبیاء خلیل الرحمن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی منزلت و شرف اور آپ علیہ السلام کی عظیم اور بے مثال قربانیوں کا تذکرہ ہر دور میں تمام امتوں میں مسلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت سے سخت امتحانات و آزمائشوں سے جانچا۔ چنانچہ وہ تمام امتحانات میں کامیاب رہے، اور عزم و حوصلہ کے ساتھ کامیابیوں سے مشرف ہوئے۔ جب انہیں فرمان ہوا: ﴿اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرة: ۱۳۱] (سرِ تسلیم خم کردو، وہ بولے: میں نے رب العالمین کے آگے سر جھکا دیا)۔ پس ان کی تمام خواہشات اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان ہوئیں۔ یہود کس منہ سے ان کے اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں؟ جن کی نافرمانیوں کا صرف دسواں حصہ چالیس بیماریوں کی شکل میں ابھی بیان ہوا۔

آیت ۴۰ سے آیت ۱۲۳ تک مسلسل ان کی بیماریوں اور نافرمانیوں کے بیان کا سلسلہ جاری رہا۔ جس قوم کی نافرمانیاں اتنی بکثرت و بے شمار ہوں، وہ ہرگز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دینی رشتوں میں منسلک نہیں ہوسکتی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ابراہیمی رشتہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے منقطع فرما کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت کے ساتھ جوڑ دیا، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الحج: ۷۸] (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔

ابوالانبیاء حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے عظیم امتحانات کی تفصیل:

ان آیات کریمہ میں حق تعالیٰ شانہ کے خاص پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مختلف امتحانات اور ان میں ان کی کامیابی، پھر بہت بڑے انعام و صلہ کا بیان ہے۔ پھر جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ازراہِ شفقت و ہمدردی اپنی اولاد کے لئے بھی اسی صلہ و انعام کی درخواست کی، تو انعام پانے کا ایک ہمہ گیر ضابطہ ارشاد فرما دیا گیا کہ محض نسب اور نسبی رشتہ ایسے عالمگیر انعامات کے لئے کافی نہیں ہے، اسی وجہ سے ان کی درخواست کی منظوری مشروط

صورت میں دی گئی کہ اس میں ہرگز شک وشبہ نہیں۔ یہ انعام آپ علیہ السلام کی اولاد کو بھی ملے گا، مگر شرط یہ ہے کہ ان کے اعمال آپ علیہ السلام کے جیسے ہوں، اور وہ ہر قسم کے ظلم ونافرمانی سے بری الذمہ ہوں، کیونکہ ظالم اور نافرمان اس انعام کے حقدار نہیں ہوتے، اور یہ صلہ وہ ہرگز نہیں پاسکیں گے۔

یہاں سوال ہوتا ہے کہ امتحان کسی شخص کی قابلیت معلوم کرنے کے لئے لیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے، کسی بھی شخص کا کوئی حال یا کمال واستعداد ان پر مخفی نہیں، ان کو ہر چیز کا علم ہے، پھر امتحان لینے کا مقصد کیا تھا؟

جواب یہ ہے کہ امتحان وآزمائش کی غرض وغایت یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی کو آزمائش میں ڈال کر اس کی حیثیت اور برتری کو دوسروں پر واضح کیا جائے۔ امتحان لینے والے کو تو علم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ مگر دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں، لہٰذا امتحان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس مقام پر امتحان کی یہی غرض وغایت ہے۔ اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ بندوں کے اچھے اور برے اعمال سب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں، پھر روزِ قیامت وزنِ اعمال کی ضرورت ہی کیا؟ تو جواب وہی ہوگا کہ اتمامِ حجت کے ساتھ عمومی علم ہی مقصود ہوتا ہے کہ اچھے برے کا سب کو علم حاصل ہوا، اس کے علاوہ اور کئی مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

تو یہاں بھی یہی حکمت کارفرما ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ جس ہستی کو میں نے اپنا خلیل منتخب کیا ہے، اس میں یہ عظیم خوبیاں ہیں جن کی بناء پر انہیں یہ بلند مقامِ خُلت وامامت کا حاصل ہوا ہے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، وہ چاہے تو انبیاء علیہم السلام کا امتحان لے لے، اور انہیں بڑے درجات اور اونچے مقامات عنایت کرے، اور چاہے تو ایک گنہگار کو معاف کردے، وہ **ذو العرش المجید، فعال لما یرید** ہے۔

یہاں آیت کریمہ میں کلمہ رَبُّہٗ مذکور ہے۔ اسماء حسنیٰ میں رَبّ کا جو مقام ہے، وہ ساری صفاتِ الٰہیہ سے مقدم ہے، اور قرآن حکیم میں اسمِ جلالہ کے بعد رَبّ ہی کا مقام ہے۔ پورے قرآن حکیم میں اضافت وبغیر اضافت کے ساتھ ۹۰۰ مرتبہ مذکور ہے۔ شانِ تربیت وربوبیت کا منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تربیت کا سلسلہ بچپن ہی سے شروع فرما کر اپنی نگرانی میں آہستہ آہستہ خُلت وامامت کے بلند وبالا درجے تک پہنچایا۔

"**بِکَلِمٰتٍ**" کلمات کی تفسیر وتشریح میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ تفسیر رحمۃ اللہ علیہم کے مختلف اقوال ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو دو قسم کے احکام یا معانی مراد ہوسکتے ہیں:

(۱) وہ سخت اور کٹھن امور وحالات، جنہیں عام آدمی اور ہر مؤمن نہ برداشت کرسکتا ہے، اور نہ ہی انہیں پورا

کرکے کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ چھ قسم کے احوال ہیں، جنہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بخوشی وبطیب خاطر برداشت بھی کئے، اورنہایت سنجیدگی کے ساتھ انہیں پورا کرکے ان کے صلے میں مقامِ خلت وامامت پر فائز ہوئے۔

(۲) وہ عام احکامِ الٰہی، جنہیں ہر سنجیدہ اورفرض شناس مؤمن بطیبِ خاطر پورا کرسکتا ہے، کیونکہ یہ عام اور نسبتاً نہایت آسان اعمال ہیں، جن کا تعلق ملّتِ ابراہیمی کے ساتھ ہے۔ یہ نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، ان کی تعداد دس یا تیس یا چالیس ہے:

☆**قسم اول:** وہ سخت اور کٹھن امور ہیں، جنہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پورا کیا، اور مقامِ خلت پر سرفراز ہوئے، جوکہ درج ذیل ہیں:

پہلی آزمائش: یہ ہے کہ آپ علیہ السلام بچپن میں جب شعور کے مراتب طے فرمارہے تھے، آپ علیہ السلام کا واسطہ ایک ایسے شرمناک، گندے اور ناپاک معاشرہ سے پڑا، جہاں چاروں طرف سوائے ظلمتوں، شرک وبت پرستی و دیگر حیاسوز جرائم ومعاصی کے کچھ نہ تھا۔

دوسری آزمائش: یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے پوری قوم کی اصلاح کی خاطر نتائج کی پرواکئے بغیر تبلیغ اور توحیدِ الٰہی کا نغمہ سناتے ہوئے قریب وبعید سب کی دشمنی مول لی، اور اکیلے تنِ تنہا یہ خاردار کٹھن مراحل طے کرتے ہوئے ہر قسم کی اذیتیں برداشت کیں۔

تیسری آزمائش: جب آپ علیہ السلام نے ان کے باطل معبودوں کو کلہاڑی سے پاش پاش کرکے تباہ کیا۔ نمرود جیسے ظالم اور مطلق العنان جابر سے ٹکر لی، اور انہیں مناظرہ میں شکست دے کر لاجواب وشرمندہ کیا، تو پوری قوم نے ملکر آپ علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ آگ ......وہ بھی تاریخی آگ، جسے اگر دنیا کی سب سے بڑی تاریخی آگ کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا۔ آپ علیہ السلام نے اس آگ میں ڈالے جانے کو قبول کیا، مگر اپنے موقف سے دستبردار نہ ہوئے۔ یہ کتنا بڑا امتحان وابتلاء تھا؟ مگر اس میں آپ علیہ السلام سرخرو اور کامیاب رہے۔

چوتھی آزمائش: یہ ہے کہ جب آگ کا مرحلہ گزر گیا، اور آپ علیہ السلام کامیابی کے ساتھ نجات پائی، تو ایسے میں آپ علیہ السلام کو امید اور طمع پیدا ہوئی کہ شاید اس معجزے کے بعد کوئی اسلام قبول کرلے، یا میرا ہمنوا بن جائے، مگر یہ کسی کی قسمت میں نہ تھا، پس آپ علیہ السلام مایوس ہوگئے۔

پانچویں آزمائش: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر آپ علیہ السلام اپنے پیدائشی وآبائی ملک بابل عراق سے اپنے

والد تارخ، بی بی سارہ اور حضرت لوط (بھتیجے) کو لے کر شام وفلسطین کی طرف ہجرت کر گئے، وہاں سے مصر گئے۔ مصر کے سفر میں وہاں کے جابر بادشاہ نے آپ علیہ السلام کی بیوی سارہ پر قبضہ جمانے کا ارادہ کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس ابتلاء میں آپ علیہ السلام کے حق یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ جابر بادشاہ نے آپ علیہ السلام کا عقیدت مند بن کر اپنی بیٹی سیدہ ہاجرہ تحفہ و بخشش کے طور پر حضرت سارہ کو بخش دی۔ حضرت سارہ نے یہ لڑکی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہبہ کر کے ان کی زوجیت میں دے دی۔

چھٹی آزمائش: حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر سے واپس جب فلسطین ہجرت کر کے یہاں مقیم ہوگئے، اس مرحلہ پر آپ علیہ السلام کا چھٹا امتحان شروع ہوا۔ اس وقت حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ ماں اور بیٹے کو گھوڑے پر بٹھا کر اُس مبارک وادی میں پہنچاؤ، جہاں کعبہ شریف کے آثار ونشانات باقی ہیں۔ اگر چہ کعبہ شریف طوفانِ نوح میں مکمل شہید ہوگیا تھا، مگر آثار وعلامات نمایاں تھے، جب آپ علیہ السلام زوجہ محترمہ اور لختِ جگر بیٹے کو وہاں تنِ تنہا چھوڑ کر واپس جانے لگے، تو پہاڑی پر کھڑے ہو کر زبردست دعا کی، اس دعا کی برکات اور نتائج قیامت تک ان شاء اللہ باقی رہیں گے۔

ساتویں آزمائش: اس کے بعد آپ علیہ السلام سالانہ ملکِ شام سے مسلسل بیوی بچے کی نگرانی کی خاطر وہاں تشریف لاتے رہے، اور واپس شام کی طرف جاتے، وہاں اقامت کرتے، یہاں تک کہ آخری امتحان اکلوتے بیٹے کی قربانی کا مرحلہ آپہنچا، اور یہ امتحان آگ والے امتحان کی طرح آپ علیہ السلام کے اعصاب پر چھا گیا، مگر خلیل اللہ علیہ السلام کے عزم واستقلال پر کوئی امتحان اثر انداز نہ ہوا۔ سبحان اللہ! باپ بیٹے دونوں نے حکمِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے قوموں کے نام وہ پیغام چھوڑا، اور وہ قیمتی روایت چھوڑ گئے، جسے اقوامِ عالم موافق ومخالف سب نے سونے کے قلم سے جواہرات کی تختی پر نقش کیا، ارشاد ہوا: ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ﴾ [الصافات: ۸۰] (ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ سبحانہ نے آپ علیہ السلام کو ان کٹھن مقامات اور سخت مشکل امتحانات سے گزارا، اور پار کیا، اور ہر قسم کی کامیابیوں سے سرفراز فرمایا، تو وہ بلند اور عظیم رتبہ ومقام عطا فرمایا، جس کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ ساری کائنات کے دُرِّ یکتا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا: ﴿ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ [النحل: ۱۲۳] (پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیم

(علیہ السلام) کی پیروی اختیار کرو، جو ایک طرف کے ہو رہے تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ارجمند ہیں، اور وہ آپ علیہ السلام کے عظیم المرتبت والد محترم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دینِ متین شریعت مطہرہ ابراہیمی ملّت کی شرح وتفصیل ہے۔ چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی اقتداء اور اتباع کر کے ان کی ملّت کی پیروی واشاعت کریں۔

☆ **قسم دوم:** وہ اعمالِ حسنہ، جنہیں ہر مسلمان بآسانی پورا کرسکتا ہے۔ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہیں، اور تقریباً تیس خصلتیں ہیں، جو شرائعِ اسلام اور سہامِ اسلام کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں سے دس سورۃ براءت میں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں:

توبہ، عبادت، حمد وثناء، سیاحت، رکوع، سجود، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، محافظۂ حدود ایمان، وغیرہ۔

اور دس ان میں سے سورۃ احزاب میں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں:

اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ ونیاز، صوم، شرمگاہ کی حفاظت، کثرت ذکر اللہ۔

اور دس خصلتیں ان میں سے سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج میں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں:

ایمان روزِ جزاء پر، اللہ تعالیٰ کی خشیت، نمازوں میں خشوع، نماز کے آداب وسنن کی حفاظت، لغو بیہودہ باتوں سے اعراض، اداءِ زکوٰۃ، منکوحہ ومملوکہ عورتوں کے علاوہ دیگر سے احتراز، ایفائے عہد، اداءِ امانت، اداءِ شہادت۔

اس کے علاوہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دس خصالِ فطرت کو بھی اس میں شامل کیا ہے، جو یہ ہیں:

مونچھیں کتروانا، مضمضہ یعنی کلی کرنا، استنشاق کرنا، مسواک کرنا، سر میں مانگ نکالنا، ناخن تراشنا، بغل کے بال صاف کرنا، زیرِ ناف بال صاف کرنا، ختنہ کرنا، استنجاء کرنا۔

دراصل اگر غور سے دیکھا جائے، تو ملّتِ ابراہیمی میں سے یہ چند گنتی کے اعمال مراد نہیں ہیں، بلکہ تمام شرعی احکام مراد ہیں، اسی بناء پر صاحبِ مظہری نے فرمایا کہ تمام مأمورات ومنہیاتِ شرعیہ مراد ہیں، اور یہی عام معنی درست وحق ہے۔ دینِ اسلام ملّتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اور اس کی تفسیر وتشریح ہے۔ پس واضح ہے کہ اسلامی اعمال واحکام قولی ہوں یا فعلی، بدنی ہوں یا مالی از قبیلِ فرائض، واجبات، سنن، مستحباب، مکروہات، محرمات وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں، اور ان کے بجالانے اور ادا کرنے، یا ترک کرنے میں ایک ابتلاء تو کیا، ہزاروں ابتلاء وامتحانات ہیں، مگر یاد رہے کہ ابتلاء کی قسمِ اول بمنزلہ اصل الاصول ہے، باقی سارے اعمال اس پر مرتب ہو کر اس کے

توابع ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب

﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ (اے ابراہیم! (میں تیری فرمانبرداری اور عظیم الشان قربانیوں کے صلہ میں) تجھے ساری خلقت کے لئے امام، مقتدا اور پیشوا بناؤں گا) کہ لوگ تیری تعریف اور احترام کریں، اور آپؑ کی پیروی میں اپنی مراد حاصل کریں، کیونکہ تیری پیروی حق کی علامت ہوگی، اور تیری مخالفت گمراہی متصور ہوگی، اور تیری ملّت تمام عالم کے لئے بمنزلہ دستورِ سیاسی کے ہوگی، چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا۔ یہود ونصاریٰ، مشرکین سب نے حضرت خلیل علیہ السلام کو اپنا مقتدا تسلیم کیا، اور برابر ان کے احترام کے قائل ہو گئے۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کے بعد ان تینوں فرقوں نے ملّتِ ابراہیمی پر عمل کرنا بالکل چھوڑ دیا، جس طرح انہوں نے ازلی عہد و پیمان "اَلَسْتُ" کو نظر انداز کر کے منحرف ہو گئے۔ اسی طرح ملّتِ ابراہیمی کی اقتداء کو ترک کر کے شیطان کی پیروی کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ نسبتِ کبریٰ ان سے سلب فرما کر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خیر امت کو نصیب فرمائی۔

اب یہ اسلام، یہ شریعتِ خیر الانام ملّتِ ابراہیمی کے لئے بمنزلہ روح وحیات ہی ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے، یہ شریعت قائم رہے گی۔ قولی و فعلی اور مالی قربانیوں تک ابراہیم علیہ السلام کے یادگار قائم رہیں گے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سوال کرتے ہیں: "مَاهٰذِهِ الْأَضَاحِيْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟" ارشاد فرماتے ہیں: "سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ"۔ [ترمذي] حج اور مناسک، حج اول سے آخر تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعمال اور یادگار ہیں۔ یہ وہ عظیم تحفہ و بخششِ ایزدی ہے، جس کے فیوض و برکات سے تمام اقوامِ عالم سراسر محروم ہیں، اور صرف امتِ محمدیہ اس قیمتی سرمایہ کی واحد وارث ہے، اسی نکتۂ عجیبہ نے ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ کی تفسیر کا عقدہ بآسانی حل کر دیا کہ جب وراثت کی حقدار یہی امت ہوگئی، تو اس پر ہرگز ظالم کا اطلاق نہ ہو سکے گا۔ ظالم وہی (سارے اقوام عالم کے لوگ) کہلائیں گے جو اس وراثت سے محروم ہیں۔ (یہ الہامی نکتہ ہے، لکھتے وقت اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈال دیا)۔ الحمدللہ

جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا کہ انہیں بنی نوعِ انسان کا امام و رہنما بنایا جائے، جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا، اس وقت سے لے کر مرتے دم تک ان کی پوری زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان محبت کرتا ہے، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو حضرت

خلیل علیہ السلام نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو، اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں، جن سے آدمی ڈرتا ہے، ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا، جسے انہوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

❁ ❁ ❁

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ
عَهِدْنَاۤ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۤئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ: اور اس بات کو یاد کرو، جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لئے رجوع اور امن کی جگہ بنایا، اور ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ کو مصلیٰ، یعنی نماز کی جگہ بنالو۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اور اعتکاف میں بیٹھنے والوں، اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لئے پاک وصاف رکھو﴿۱۲۵﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیتوں میں واضح فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب سارے امتحانات میں کامیاب ہوئے، تو انہیں اس امامتِ کبریٰ کے اعزاز وشرف سے نوازا گیا، جب انہوں نے اپنی اولاد اور پوری نسل کے لئے اس کی درخواست کی، تو آپ علیہ السلام کو بتایا گیا کہ آپ کی اولاد میں جو لوگ آپ کے نقشِ قدم پر چلیں گے، وہ اس عظیم منصب کو حاصل کر پائیں گے، مگر جو لوگ غیر صالح ہوں گے، آپ علیہ السلام کے نقشِ قدم پر نہیں چلیں گے، وہ امامت کو حاصل نہیں کر سکیں گے، کیونکہ مشرک، کافر اور ظالم وفاسق لوگ نبوت کی میراث سے محروم رہیں گے، جیسے زمانۂ رسالت کے یہود ونصاریٰ جو مشرک وکافر رہے، جنہوں نے تورات وانجیل کے اکثر وبیشتر حکموں سے انحراف وانکار کیا، اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقرآن مجید کی تکذیب کی۔ اسی نکتے کی وجہ سے وہ ملّتِ ابراہیمی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت سے محروم ہوئے، کیونکہ کافر ومشرک آدمی پیغمبر کی میراث سے اختلافِ دین کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ متصلاً حضرت باری تعالیٰ جل شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میراث کے اصلی حقدار اور صحیح جانشین حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ فرما کر انہیں آپ علیہ السلام کا صحیح وارث گردانا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مل کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لئے دعا فرما رہے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ [الآیة] اے پروردگار! ان (لوگوں) میں انہیں میں سے

ایک پیغمبر مبعوث فرما)۔

یہ ایک قسم کی نقلِ وراثت اور پیغامِ صداقت ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس جو وراثت ہزاروں سال قائم رہی، اب اس کے اختتام اور انتقال کا وقت آ پہنچا کہ: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ کے فرمان کے مطابق اب یہ سلسلہ ظالموں اور گوسالہ پرستوں سے واپس لے کر ایک ایسے مستحق و برگزیدہ آخری پیغمبر کے حوالے کیا جائے، جس کی سیرت وصورت، قول وفعل، عمل و کردار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ منطبق و یکساں ہو، اور وہ صحیح معنوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جانشین اور ان کی ملّت کا محافظ ونگہباں ہو، اور جس کعبۃ اللہ شریف کی ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کی اور جہاں انہوں نے مناسکِ حج ادا کئے، اور پوری دنیا کو اس کی دعوت دی، یہ آخری پیغمبر قیامِ قیامت تک ابراہیمی ملّت پر عمل پیرا ہو۔

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر شدہ کعبۃ اللہ اور مناسکِ حج پر آج تک کسی یہودی یا نصرانی نے عمل نہیں کیا، اور قیامت تک انہیں نصیب بھی نہیں ہوگا کہ وہ حج کریں اور ملّتِ ابراہیمی کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھ سکیں، یا کعبۃ اللہ کے احترام واستقبال پر کوئی ادنیٰ اور جزوی عمل کا ثبوت پیش کر سکیں۔

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ (اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے، اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا)۔

﴿مَثَابَةً﴾: یہ لفظ ثَابَ يَثُوْبُ ثَوْبًا وَثَوْبَانًا وَمَثَابَةً سے ماخوذ ہے، جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں، اس لئے مثابہ کے معنی مرکز اور مرجع کے ہو گئے، جہاں انسان بار بار لوٹ کر جائے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو یہ خاص فضیلت بخشی ہے کہ وہ ہمیشہ مرجعِ خلائق بنا رہے گا، اس لئے لوگ بار بار اس کی طرف جانے اور لوٹنے، اور نمازوں میں استقبال کرنے کے خواہشمند رہیں گے۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا: لا يقضي أحد منها وطرا۔ [قرطبي] یعنی کوئی آدمی اس کی زیارت سے کبھی سیر نہیں ہوتا، بلکہ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ زیارت وطواف کا شوق ومحبت لے کر لوٹتا ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ قبولِ حج کی علامات میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہاں جانے کا شوق دل میں موجزن رہے۔ چنانچہ عام طور پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ جتنا شوق زیارتِ بیت اللہ شریف کا ہوتا ہے، دوسری مرتبہ کے لئے اس شوق میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور جوں جوں بار بار زیارت اور طواف کرتا رہتا ہے، یہ شوق اور زیادہ

ہوتا رہتا ہے، اور کبھی سیری نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اتنا عشق وتڑپ رکھتے ہیں کہ سارا دن طواف کرتے رہتے ہیں، اور کچھ لوگ دور دراز علاقوں سے سفر کر کے ہر سال حج وعمرہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ستر یا اسی حج کر کے بھی سیر نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ہے ''مثابة'' کا معنی وخلاصہ۔

درحقیقت یہ عشق ومحبت کعبۃ اللہ کی خصوصیت اور معجزہ ہے کہ لوگ دور دراز علاقوں سے ہزاروں مشقتیں برداشت کر کے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے جاتے ہیں، اور ہر طرح کے لوگ جوان، بوڑھے، مرد، عورتیں ناتوانی اور کمزوری کے باوجود پوری زندگی بار بار دل میں تڑپ اور بے تحاشا شوق ورغبت کے ساتھ وہاں حاضری دیتے ہیں، اور دے رہے ہیں۔

﴿وَاَمۡنًا﴾ یہ لفظ امن و پناہ اور جائے امن وسلامتی کے معنی میں ہے، اور امن وسلامتی صرف کعبۃ اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ پورے شہر مکۃ المکرمہ کی خصوصیت وشرف ہے۔ اس سلسلے میں بہت کثرت کے ساتھ احادیث وارد ہیں، اور اجماعِ امت بھی ہے کہ پورے شہرِ مکۃ المکرمہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور جائے امن بھی، چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں ملّتِ ابراہیمی کے کچھ آثار جو باقی رہ گئے تھے، ان میں سے یہ بھی تھا کہ حرم شریف میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل اگر کسی کو ملتا تو انتقام لینے سے پرہیز کرتے تھے۔ عام جنگ وجدال کو بھی حرام سمجھتے تھے، اور پورے شہر کو امن کا گہوارہ کہا کرتے تھے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی ہے وہ یہ ہے:

﴿وَاِذۡقَالَ اِبۡرَاهِيۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا﴾ [ابراهيم:۳۵] مطلب یہ ہے کہ یہ امن والا حکم پورے شہر (البلد الحرام) کے ساتھ متعین اور مخصوص ہے، اور یہ حدودِ حرم حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتا کر مقرر کئے، پھر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تجدید فرمائی، قیامت تک یہ سلسلہ ان شاء اللہ برقرار رہے گا۔

﴿وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾: دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۚ‏ ۝۹۶ فِيۡهِ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ [آل عمران:۹۶] (سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت کرنے) کے لئے مقرر کیا گیا تھا، وہی ہے، جو مکے میں ہے، بابرکت اور جہاں کے لئے موجب ہدایت، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، جن میں سے ایک

ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے، جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہوا، اس نے امن پالیا)۔

یہ مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی تعمیر کی تھی، اس پتھر پر آپ علیہ السلام کے دونوں پاؤں کے واضح نشانات ہیں۔ یہ کعبہ شریف کے متصل شیشہ اور پیتل کے خوبصورت خول میں بند ہے، اور اس پر اعلیٰ قسم کی جالی لگادی گئی ہے۔ اس کا قرب وجوار ہی نمازیوں کا مرجع ومصلّٰی ہے۔ اس کے پاس نماز پڑھنا کوئی فرض نہیں، بلکہ مستحب اور سنت ہے۔ ازدحام کے وقت یہی بہتر ہے کہ طواف کی دو رکعت واجب یہاں کی بجائے مسجد حرام کے کسی بھی حصے میں پڑھ لیں۔ فقہاء کرام نے تحیۃ الطواف ہر جگہ پڑھنے کی اجازت دی ہے۔

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ ہم نے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو حکم بھیجا کہ ہمارے گھر کو پاک وصاف رکھیں طواف کرنے والوں کے لئے، اور اعتکاف میں بیٹھنے والوں کے لئے، اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لئے۔ پاک وصاف رکھنا دو طرح سے ہوسکتا ہے، یعنی ظاہری پاکیزگی، اور باطنی پاکیزگی۔ ظاہری پاکی کا مطلب یہ ہے کہ لوگ پورے سال بغیر کسی توقف کے حج وعمرہ کے لئے دور دراز علاقوں سے آتے رہتے ہیں۔

پس ہر طرح ان کی سہولت کا خیال رکھا جائے، اور حرمِ پاک کو اور اس کے قرب وجوار کو ہر قسم کی غلاظتوں، اور بدبودار چیزوں سے پاک رکھا جائے، کیونکہ لوگ وہاں عبادت کے لئے آتے ہیں، اور وہاں اعتکاف میں بیٹھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں، اور ذکر واذکار، تسبیح اور وظائف میں مشغول رہتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ آپ دونوں (باپ اور بیٹے) اس گھر کی نظافت وصفائی کو اللہ تعالیٰ کے مہمانوں کی خاطر قائم وجاری رکھیں۔

یہ بات واضح ہو کہ جس طرح کعبہ شریف کی پاکیزگی قائم رکھنے کا حکم ہے، اسی طرح عام مساجد کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک وصاف رکھنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ [النور: ۳۶] (وہ قندیل) ان گھروں میں (ہے) جن کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کئے جائیں، اور وہاں خدا کے نام کا ذکر کیا جائے)۔

ان گھروں میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بلند رکھنے کا حکم دیا ہے، اور وہاں اپنے نام کے ذکر کرنے کا کہا ہے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی تاکید کے ساتھ ان مساجد کی صفائی ونظافت کا حکم دیا ہے۔ [ترمذی]

دوسری بات، یعنی مساجد کی باطنی صفائی کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کوئی مشرک کافر، منافق، یا ملحد وزندیق

داخل نہ ہو: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبة:۲۸] (بیشک مشرک ناپاک ہیں، اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ جائیں)۔ یعنی مشرکین پلید و ناپاک ہیں، ان کے قلوب پر شرک کی نجاست پڑی ہوئی ہے۔ جب تک لوگوں کے قلوب پر شرک، کفر اور بدعت کا سیاہ دھبہ اور غبار لگا ہوا ہے، وہ کسی بھی صورت کعبۃ اللہ اور دیگر مساجد میں آنے کے اہل نہیں ہیں۔ جب ایک موحد مسلمان بحالتِ جنابت مسجد میں نہیں آسکتا، حالانکہ اس کی جنابت بہ نسبتِ شرک کے نہایت خفیف ہے، تو مشرک کے لئے کیا گنجائش ہوگی؟

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ: اور اس بات کو یاد رکھو جب ابراہیم نے کہا: اے ربّ! اس شہر کو امن والا بنا دے، اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے، جو کوئی ان میں سے ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: اور جس شخص نے کفر کیا، میں اسے تھوڑے دن تک فائدہ پہنچاؤں گا، پھر اسے کشاں کشاں دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا، اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت بری جگہ ہے ﴿۱۲۶﴾

معارف و منازل

اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل و مناقب کا تذکرہ ہو رہا تھا، یہاں سے آئندہ (آیت ۱۲۶ سے آیت ۱۴۱ تک) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مناقب اور دعوات کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ یہاں اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چار دعاؤں کا بیان ہے، جبکہ سورۂ ابراہیم میں آیت ۳۶ سے آیت ۴۱ تک سات دعاؤں کا تذکرہ ہے۔

قرآن حکیم جہاں بھی انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کا تذکرہ کرتا ہے، تو وہ ساری دعائیں قبول شدہ ہوتی ہیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ ساری دعائیں جو مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، سب قبول شدہ ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کی دعاء کی برکت سے پورا شہر مکۃ المکرمہ امن و سلامتی کا گہوارہ بنا، جیسے ارشاد ہے: ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ [العنکبوت:۶۷] (کیا انہوں نے نہیں دیکھا

کہ ہم نے حرم کو مقامِ امن بنایا ہے؟ اورلوگ اس کے گردونواح سے اچک لئے جاتے ہیں)۔اور ﴿اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ [القریش:۴] (جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ شریف کی تعمیر کے بعد، بشری تقاضوں اور کعبہ شریف کی جائے وقوع اور اردگرد کے دوسرے مقامات اور لق دق وادی غیر ذی زرع کے ماحول سے متاثر ہوکر پریشان ہوئے، تو بارگاہِ الٰہی میں درخواست پیش کی: ﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ﴾ [ابراهیم:۳۷] (لہٰذا لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے کشش پیدا کردیجئے، اور ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمایئے)۔اسی کے ساتھ آپ علیہ السلام کی دعاء قبول ہوئی، اور آپ علیہ السلام کو حکم ملا: ﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ﴾ [الحج:۲۷] (اور لوگوں میں حج کے لئے ندا کرو کہ پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر جو دور دراز راستوں سے (سوار ہوکر) چلے آئیں)۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ علیہ السلام پہاڑ جبل ابوقبیس پر کھڑے ہوکر اعلان فرمارہے تھے۔بعض تفسیروں میں ہے کہ مقام ابراہیم والے پتھر پر کھڑے ہوکر اعلان فرمایا۔اعلان یہ ہوا کہ اے لوگو! کعبۃ اللہ کی تعمیر ہوچکی، تم پر اللہ تعالیٰ نے حج فرض کیا ہے، آؤ حج کا فریضہ ادا کرو۔ربّ العٰلمین عزّوجل نے یہ آواز ہر طرف ہر ایک روح کو پہنچا دی۔قیامت تک آنے والی ارواح تک پیغام پہنچ گیا۔لبّیک کہنے والے ہر حال میں آکے یہ سعادت حاصل کریں گے، اور جتنی مرتبہ لبّیک کر چکے اتنی مرتبہ آئیں گے، اور جن ارواح نے لبّیک نہیں کیا، وہ ہمیشہ کے لئے محروم رہیں گی۔

پس جن کے لیے حج مقدر تھا، ان کی روح نے لبّیک کہا۔یہ وہی شوق کی دبی ہوئی چنگھاری ہے کہ لاکھوں آدمی ہر سال، پیدل، دبلے پتلے اونٹوں پر، گدھے، گھوڑے اور مختلف قسم کی سواریوں پر ہزاروں تکالیف، بھوک، پیاس و دیگر ہر قسم کی پریشانیوں کے ساتھ فوج درفوج، افتاں وخیزاں، کشاں کشاں اس مقدس گھر کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے ہیں، اور ایک جھلک دیدار کے ساتھ ان کی ساری پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں، اور تمام تھکاوٹیں کافور ہوجاتی ہیں۔انہیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی مغفرت کا فیصلہ ہوچکا ہے، اور وہ ابدی جنت اور اس کی راحتوں میں پہنچ چکے ہیں۔سبحان اللہ! برحق تمنا ہے۔

دوسری طرف یہ اجابت بھی ہوئی کہ پورے جہاں کے خزانے، ماکولات، مشروبات، پھل اور میوے ہر موسم میں ضرورت سے زائد مناسب قیمت پر ہر موقع، ہر محاذ اور ہر وقت بکثرت دستیاب رہتے ہیں۔اگر کوئی شخص

کاغذ قلم لے کران باہر سے آنے والے فواکہ، پھل وثمرات کی فہرست مرتب کرے، تو شاید عاجز ہوجائے۔ یہ سب کچھ جناب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دعاؤں کی برکت اور فیض ہے۔

بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ شہر مکۃ المکرمہ سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر بڑا زرخیز اور ہر قسم کے پھل میوے اور دیگر غذائی اشیاء کی پیداوار والا علاقہ ''طائف شریف'' ملک شام کا سرسبز علاقہ تھا۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اس کو وہاں سے اٹھا کر یہاں لاکر رکھ دیا۔ یہ کسی مرفوع روایت سے ثابت نہیں ہے، مگر چیدہ چیدہ علماء نے اس واقعہ کی تصدیق کی ہے، جیسے علامہ سیوطی اور حضرت پانی پتی صاحب ''تفسیر مظہری'' وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم۔ یہ سب کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی مقبولیت کا اثر ہے۔ واللہ أعلم

﴿مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (ان میں سے جو ایمان لائے، اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر) دعاء میں مؤمنوں کی تخصیص اس لئے ہے کہ کافر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حقدار نہیں ہوتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ سے تنبیہ اور اطلاع فرمائی کہ ظالم ومشرک لوگ اللہ تعالیٰ کی نوازشات کو حاصل نہیں کرسکتے، اس لئے ان کو دعا میں شامل نہیں فرمایا۔

﴿قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا﴾ (فرمایا: اور جس شخص نے کفر کیا، میں اسے تھوڑے دن تک فائدہ پہنچاؤں گا)۔ رب العلمین عزّ شانہ کی ذاتی اور عمومی صفت کی طرف اشارہ ہے کہ: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [ھود:٦] (اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں، مگر اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے)۔ دنیوی رحمت، رزق وروزی کی شکل میں ہو، یا آل واولاد کی صورت میں ہو، اس میں مؤمن وکافر برابر کے شریک ہیں، بخلاف دینی پیشوائی وغیرہ نعمتوں کے کہ وہ صرف مؤمن کے ساتھ مخصوص ہیں۔

''قَلِيْلًا'' متاع قلیل، دنیوی نعمتوں سے نافرماں مشرک وکافر کو بھی نوازا جاتا ہے۔ سورۃ المرسلات میں فرمایا: ﴿كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ﴾ [المرسلات:٤٦] (اے جھٹلانے والو!) تم جس قدر کھالو اور فائدے اٹھالو، تم بے شک! گنہگار ہو)۔ پھر فرمایا: ﴿مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ﴾ [آل عمران: ۱۹۷] (یہ دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر (آخرت میں) تو ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے)۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر دنیا کی قدر ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی، تو کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نصیب نہ ہوتا۔ [مشکوۃ، ترمذي] دوسری

حدیث میں ہے: ''اَلدُّنیامَلعُونٌ وَمَلعُونٌ مَافِیهَا اِلَّا ذِکرَ اللهِ وَمَاوَالَاهُ اَوعَالِمٌ اَومُتَعَلِّمٌ''۔[مشکوٰۃ،ابن ماجه]

توکافروں سے یہی کہا جارہا ہے کہ خوب کھاؤ، پیو،عیش وعشرت کرو، یہ نعمتیں تمہارے لئے چندروزہ ہیں۔ آخری تمہاراانجام جہنم کی ابدی ذلت وخواری کا عذاب ہی ہوگا، جیسے کہ فرمایا:﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ [المرسلات:۱۵] (قیامت کے روز تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لئے)۔﴿ثُمَّ اَضْطَرُّهٗ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ﴾ [البقرة:۱۲۶] (پھراس کومجبورکروں گا،گھسیٹ کرزنجیروں میں جکڑکردوزخ میں ڈالوں گا)۔ارشادفرمایا: ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴾ [الحاقة: ۳۲] (اسے پکڑلواورطوق پہنادو، پھردوزخ کی آگ میں جھونک دو، پھرزنجیر سے جس کی ناپ سترگز ہے،جکڑدو)۔

فائدہ:

جس طرح یہاں کعبۃ اللہ اورشہرمکہ کوامن وسلامتی کا مرکزوگہوارہ کہا گیا،اسی طرح سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾[آل عمران:۹۷] (جوشخص اس (مبارک) گھرمیں داخل ہوا،اس نے امن پالیا)۔بہت سے علماء وصلحاء کاقول ہے کہ جس طرح یہ امن دنیامیں حاصل رہتاہے،اسی طرح قیامت میں بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن حاصل ہوگا،اور یہ بھی یادرہے کہ روزِقیامت حجراسوداورابراہیمی پتھر دونوں اپنے زائرین کے حق میں گواہی دیں گے،اورانہیں امن دلائیں گے۔

اَلْكَعْبَةُ وَنُبْذَةٌ مِنْ تَارِيْخِهَا وَفَضَائِلِهَا وَتَعْمِيْرِهَا وَبِنَائِهَا اِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا:

بیت اللہ شریف کانام کعبۃ اللہ بھی ہے،اوربغیراضافت''الکعبة'' بھی ہے۔کعبۃ اللہ شریف انبیاء علیہم السلام کا اورمسلمانوں کاقبلۂ صلوٰۃ ہے،اوریہ بڑی عظیم شرف ومنزلت ہے۔یہ مقدس کعبۃ اللہ، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اورعظیم انوارات وبرکات کامرکزومنبع ہے۔یہاں صبح وشام برکاتِ رحمانیہ کاظہورونزول ہوتارہتاہے۔روئے زمین پرسب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے جوگھرتیارہوکربنایاگیاوہ کعبۃ اللہ شریف ہی ہے،جومرکزِتجلیات ہے۔

یہی کعبۃ اللہ زمین کاوہ پہلامبارک خطہ ہے،جوتخلیقِ ارض کے وقت پانی پرخشک ٹیلے کی صورت میں ظاہرہواتھا،اورپھریہیں سے اللہ تعالیٰ نے چاروں طرف خشک زمین کوپھیلادیا۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران:۹۶] (پہلاگھرجولوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے مقررکیا گیاتھا،وہی ہے جومکے میں ہے،بابرکت اورجہاں کے لئے موجبِ ہدایت ہے)۔

بیت اللہ شریف کے فضائل و برکات لامحدود اور نہایت زیادہ ہیں، مثلاً اول یہ:

”قَالَ کَعْبُ الْاَحْبَارِ کَانَتِ الْکَعْبَةُ غُثَاءً عَلَی الْمَاءِ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِاَرْبَعِیْنَ سَنَةً وَّمِنْهَا دُحِیَتِ الْاَرْضُ وَعَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ خَلَقَ اللّٰہُ هٰذَا الْبَیْتَ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ شَیْئًا مِّنَ الْاَرْضِیْنَ وَعَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ قَالَ لَمَّا کَانَ الْعَرْشُ عَلَی الْمَاءِ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بَعَثَ اللّٰہُ تَعَالٰی رِیْحًا هَفَّافَةً فَصَفَقَتِ الْمَاءَ فَاَبْرَزَتْ عَنْ خَشْفَةٍ (اَلْخَشْفَةُ حِجَارَةٌ تَنْبُتُ فِی الْاَرْضِ نَبَاتًا) فِیْ مَوْضِعِ هٰذَا الْبَیْتِ کَاَنَّهَا قُبَّةٌ فَدَحَی اللّٰہُ تَعَالٰی الْاَرْضِیْنَ مِنْ تَحْتِهَا فَمَادَتْ ثُمَّ مَادَتْ فَاَوْتَدَهَا اللّٰہُ الْجِبَالَ فَکَانَ اَوَّلَ جَبَلٍ وُّضِعَ فِیْهَا اَبُوْقُبَیْسٍ فَلِذٰلِکَ سُمِّیَتْ مَکَّةُ ”اُمَّ الْقُرٰی“ وَعَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ لَقَدْ خَلَقَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ مَوْضِعَ هٰذَا الْبَیْتِ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ شَیْئًا مِّنَ الْاَرْضِ بِاَلْفَیْ سَنَةٍ وَّاِنَّ قَوَاعِدَهٗ لَفِی الْاَرْضِ السُّفْلٰی۔ [اخبار مکہ اذرقی و فاکھی]

ایک روایت میں ہے کہ مکہ مکرمہ زمین کے وسط میں واقع ہے، اور یہ زمین کی ناف ہے، اس لئے اسے اُمّ القریٰ کہا جاتا ہے، اور کعبہ شریف بیت المعمور کا سایہ ہے۔ [کبیر، تاریخ القویم]

اس کے علاوہ احادیث میں ہے کہ بیت اللہ کی سمت اور سیدھ پر ساتوں آسمانوں میں اور ساتوں زمینوں میں اسی طرح کے کعبۃ اللہ و بیت اللہ ہیں، اسی طرح ہر آسمان کے فرشتے اور ہر زمین کے باشندے اپنے اپنے کعبہ کی زیارت کے لئے آ کر اس کا طواف کرتے ہیں۔

فَعَنْ لَیْثِ بْنِ مَعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا الْبَیْتُ خَامِسُ خَمْسَةَ عَشَرَ بَیْتاً سَبْعَةٌ مِّنْهَا فِی السَّمَاءِ اِلَی الْعَرْشِ وَسَبْعَةٌ مِّنْهَا اِلٰی تُخُوْمِ الْاَرْضِ السُّفْلٰی لِکُلِّ بَیْتٍ مِّنْهَا حَرَمٌ کَحَرَمِ هٰذَا الْبَیْتِ [اخبار مکہ اذرقی]

آسمانوں میں موجود کعبہ کا نام بیت المعمور ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کا نام ضراح ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ بیت معمور سماء سادسہ میں ہے۔ ابن کلبی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں: اِنَّ بَیْتًا فِی السَّمَاءِ یُقَالُ لَهٗ ”ضِرَاحٌ“ بِحِیَالِ الْکَعْبَةِ یَدْخُلُهٗ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ مِّنَ الْمَلٰئِکَةِ مَا دَخَلُوْهُ قَطُّ قَبْلَهَا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ زمین میں پہلے اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کو بنایا، اور کعبۃ اللہ ابتداءً ایک مجوّف سرخ جنتی یاقوت تھا۔ اس کا ایک دروازہ شرقی اور ایک غربی تھا۔ طوفان نوح علیہ السلام کے وقت اللہ تعالیٰ نے اسے

اوپر آسمان کی طرف اٹھالیا، اور حجر اسود کو جبل ابوقبیس میں بطورِ امانت محفوظ رکھا۔

فَرَوىٰ ابْنُ جُرَيْجٍ كَانَ بِمَكَّةَ الْبَيْتُ الْمَعْمُوْرُ فَرُفِعَ زَمَانَ الْغَرَقِ فَهُوَ فِي السَّمَاءِ۔

محقق وصحیح قول یہ ہے کہ کعبۃ اللہ تمام انبیاء علیہم السلام کا قبلہ رہا:

"فَعَنْ اَبِي الْعَالِيَةِ كَانَتِ الْكَعْبَةُ الْمُكَرَّمَةُ قِبْلَةَ الْاَنْبِيَاءِ وَكَانَ مُوْسىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُصَلِّيْ اِلىٰ صَخْرَةِ بَيْتِ الْمَقْدَسِ وَهِيَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْكَعْبَةِ وَذَكَرَ الْعُلَمَاءُ اَنَّ ذٰلِكَ مِمَّا كَتَمَهُ الْيَهُوْدُ وَذٰلِكَ كَمَا هُوَ دَأْبُ الْيَهُوْدِ فِيْ كِتْمَانِ الْحَقِّ وَتَحْرِيْفِ الْكُتُبِ وَاَحْكَامِ التَّوْرٰةِ حَيْثُ صَلَّوْا اِلَى الصَّخْرَةِ وَادَّعَوْا اَنَّهَا الْقِبْلَةُ وَهُوَ قَوْلُ الزُّهْرِيِّ كَذَا فِي السِّيْرَةِ الْحَلَبِيَّةِ وَطَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعَ اَشْوَاطٍ وَفِيْ بَعْضِ الرِّوَايَاتِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا سَفِيْنَةُ النُّوْحِ عَلىٰ نَبِيِّنَا وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَالتَّحِيَّةُ كَمَا مَرَّ فِيْ سُوْرَةِ نُوْحٍ وَهُوَ مَرْوِيٌّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَمُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ الْقُرَظِيِّ وَغَيْرِهِمْ كَذَا فِيْ اَخْبَارِ مَكَّةَ لِلْاَزْرَقِيِّ وَغَيْرِهٖ۔

بحث نفيس في تعمير الكعبة المشرفة:

مفسرین ومحققین اور علماء مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام بیت اللہ شریف کے پہلے معمار نہیں ہیں، بلکہ وہ کعبۃ اللہ شریف کے قواعد اور بنیادوں کو جو پہلے سے موجود تھیں بلند کرنے والے ہیں، کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ﴾[البقرة:۱۲۷] (اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے)۔ جمہور علماء ومورخین نے لکھا ہے کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر دس مرتبہ ہوئی ہے، اور بعض نے گیارہ مرتبہ لکھی ہے:

تعمیر اوّل: بناءِ ملائکہ۔ عن علی بن الحسن قال ان اللہ بعث ملائكة فقال لهم ابنو لي بيتا في الأرض بمثاله وقدره أي مثال البيت المعمور۔ [سیرت حلبیہ]

تعمیر دوم: بناء حضرت آدم علیہ السلام۔ روي البيهقي في دلائل النبوة عن عبد اللہ بن عمرو مرفوعا بعث اللہ جبريل إلى ادم وحواء فأمرهما ببناء الكعبة فبناه ادم ثم أمره بالطواف به وقيل له أنت أول الناس وهذا أول بيت وضع للناس۔

تعمیر سوم: بناء شیث بن آدم علیہما السلام۔ حضرت شیث علیہ السلام پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے اور جانشین تھے۔

تعمیر چہارم: بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم سے پانچ پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر لاتے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پتھروں کو رکھ کر، اونچی دیوار تعمیر کرتے تھے، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام انہیں ایک ایک پتھر دیکر، ان کی مدد کرتے تھے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سودس سال تھی، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر بیس سال تھی۔ جن پانچ پہاڑوں سے فرشتوں نے پتھر جمع کئے، وہ یہ ہیں: جبلِ حراء، جبلِ ثبیر، جبلِ لبنان، جبلِ طور، جبلِ احمر۔ بعض روایات میں ''جبلِ جودی'' کا نام بھی مذکور ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ شریف کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ سب سے پہلے یمن کے بادشاہ تبع، جس کا نام ''اسعد حمیری'' ہے، انہوں نے کعبہ شریف کا دروازہ لگایا، اور قفل کے ساتھ اسے بند کیا، اور سفید ریشم کا غلاف بنا کر کعبہ شریف کو پہنایا۔ اس سے قبل غلاف کا کوئی وجود و رسم نہیں تھا۔ حضرت تبع اسعد حمیری مسلمان تھے، اور ان کی قوم بت پرست تھی، جو ہلاک ہوئی۔ حضرت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری جلد ہشتم تفسیر سورۃ حٰمٓ الدخان کے تحت اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

تعمیر پنجم: بناءِ عمالقہ۔ یہ قوم عمالقہ کتب آثار و تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم جرہم سے پہلے مکہ مکرمہ میں آباد تھی، پھر کثرتِ معاصی اور فسق و فجور نے انہیں ذلیل کر کے سرزمینِ مکہ شریف سے نکال باہر کیا، اور وہ مختلف علاقوں میں در بدر ہو کر، منتشر ہو گئے۔

تعمیر ششم: بناءِ جرہم۔ یہ لوگ خالص عرب تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انہی سے زبان سیکھی، اور انہی میں شادی کی۔ اگر یہ روایت صحیح ہو، جیسا کہ اکثر علماء و مورخین کا خیال ہے، تو ان کی تعمیر پانچویں نمبر پر، اور عمالقہ کی تعمیر چھٹے نمبر پر شمار ہوگی۔ اور بعض علماء یہاں تک کہتے ہیں کہ قومِ عمالقہ نے صرف کعبہ شریف کی دیواروں کی مرمت کی ہے، اور مکمل کوئی تعمیر نہیں کی۔ لیکن تواریخِ مکہ میں دونوں قول مذکور ہیں۔ واللہ اعلم

تعمیر ہفتم: بناءِ قصی بن کلاب۔ قصی رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد کے سلسلے میں واقع ہے۔ سلسلۂ نسب شریف یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔

تعمیر ہشتم: بناءِ قریش۔ قریشی تعمیر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حصہ لیا تھا، اس وقت آپ کی عمر شریف تقریباً پینتیس سال تھی، اور حجر اسود رکھنے (نصب کرنے) پر جو شدید اختلاف پیدا ہوا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت دانشمندی سے اسے حل فرما کر پوری قوم کو خونریزی سے بچا لیا تھا۔

بناءِ قریش کی چند خصوصیات:

(۱) انہوں نے کعبۃ اللہ پر چھت ڈال دی، اس سے پہلے تمام تعمیرات میں چھت نہیں تھی ،صرف چار دیواری تھی، جس پر شاہ تبع نے سفید، یمنی ریشم کا غلاف پہنایا تھا، جو مرورِ زمانہ کے ساتھ جاری رہا۔

(۲) قریش نے کعبہ کا دروازہ بہت اونچا رکھا، تا کہ ان کی اجازت و مرضی کے بغیر کوئی اس میں داخل نہ ہو۔

(۳) قریش نے کعبہ کا شرقی دروازہ اونچا رکھ کر باقی رکھا، اور غربی دروازے کو مکمل بند کیا۔

(۴) قریش نے چھت اٹھانے کے لئے کعبہ کے اندر دو لائنوں میں چھ ستون بنائے۔ (دو قطار میں)

(۵) مالِ حلال اور عمارتی لکڑی کی کمی کی وجہ سے انہوں نے پورے بیت اللہ پر چھت نہیں ڈالی، بلکہ شمال میں کچھ حصہ بغیر چھت کے چھوڑ دیا، جو آج تک حطیم کے نام سے یاد ہوتا ہے۔ (حجر)

(۶) قریش نے حطیم کو الگ کر کے کعبہ شریف کو مربع شکل میں بنایا، جبکہ ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر میں اس کی شکل مربع نہ تھی، بلکہ مستطیل تھی۔

(۷) قریش نے کعبہ شریف کے اندر چھت پر چڑھنے کے لئے لکڑی کی سیڑھی بنائی، جو نئی ایجاد تھی۔

(۸) قریش نے کعبہ شریف کی چھت پر پرنالہ (میزابِ رحمت) رکھا تا کہ بارش کا پانی حطیم کے اندر گر جائے۔

(۹) ساگوان کی قیمتی اور خوبصورت لکڑیوں کو کعبہ کی دیواروں میں پتھروں کے درمیان چسپاں کیا۔ اس طرح کی تعمیرات کا عرب میں خاص رواج ہوتا تھا، جس کا مقصد تزیین و آرائش اور خوبصورتی ہوتی تھی۔

(۱۰) قریش نے مطاف کو خوبصورت پتھروں سے فرش بنا کر، طواف کرنے والوں کیلئے آسانی اور سہولت پیدا کی۔

(۱۱) قریش نے کعبۃ اللہ پر دو چھت بنا کر دو منزلہ عمارت تعمیر کیا، اس سے پہلے وہ بغیر چھت کے ایک منزلہ تھا۔ ابھی اس وقت یہی دو منزلہ عمارت قائم ہے۔ پہلی منزل کیلئے کوئی دروازہ نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ بند ہے۔ اس میں کعبہ کا خزانہ محفوظ ہے۔ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا امام مہدی علیہ السلام نکال کر، مجاہدین پر تقسیم فرمائیں گے۔

تعمیر نہم: بناءِ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد یزید کی بیعت سے انکار کرتے ہوئے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ حجاز و یمن، نجد اور عراق کے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر کعبۃ اللہ

شریف کی از سرِ نو تعمیر کی، اور قریش کی تعمیر کو گرا کر حطیم شریف کو کعبہ میں شامل کر کے شرقی غربی دونوں دروازے فرش (زمین) پر رکھوا کر، حضرت اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو مشورہ دیا تھا، اس پر عمل کر کے کعبہ شریف کی بناء مکمل کی۔ رضی اللہ عنہ

عام کتبِ تاریخ اور تواریخِ مکہ مکرمہ میں اس کی عجیب تفصیلات ہیں، وہاں دیکھ لی جائیں۔

تعمیر دہم: بناءِ حجاج بن یوسف بامر عبدالملک بن مروان الحمار الاموی۔ حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی عمارت کو گرا کر، دوبارہ اپنے آباء واجداد قریش کی عمارت پر تعمیر کر دی، جو آج تک وہ تعمیر قائم و باقی ہے، اور حطیم کعبۃ اللہ کی چھت سے الگ تھلگ ہے۔ یہ آخری تعمیر جو حجاج نے عبدالملک کے حکم پر کی، اس میں کیا راز ہے؟ اس کی حکمت صاحبِ کعبہ ربّ العزّت عزّ مجدہٗ ہی کو معلوم ہے۔ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فخر موجودات رحمت دارین محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کو برقرار رکھنا بنوامیہ کے حکمرانوں کی تقدیر و قسمت میں نہ تھا، عبدالملک نے صاف کہا تھا کہ ہم ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے باقیات الصالحات کو باقی رکھنا نہیں چاہتے، اسی بناء پر کعبہ کو شہید کر کے قریشی کفار کی دلجوئی کی، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش والی روایت، جو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی تھی، اسے تسلیم نہیں کیا۔

پھر کسی زمانہ میں ابوجعفر منصور عباسی بقول ابن جریر خلیفہ ہارون الرشید نے ارادہ ظاہر کیا کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر پر کعبۃ اللہ کو شہید کر کے بنائے، مگر حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے منع فرمایا، اور کہا کہ آئندہ یہ رسم بادشاہوں میں جاری ہو جائے گی۔ ہر ایک سابق تعمیر کو گرا کر، اپنی تعمیر کو نام آوری کی خاطر قائم کرے گا، اس طرزِ عمل سے کعبۃ اللہ کی بے احترامی ہوگی۔

تعمیر یازدہم: ۱۰۳۹ھ میں طوفانی سیلاب اور بارشوں سے کعبہ شریف کو نقصان پہنچا، تو سلطان عثمانی ترکی سلطان مراد خان بن سلطان احمد خان نے کعبہ شریف کی از سرِ نو تعمیر کی۔ لیکن بعض مؤرخین اس کو تعمیر سے تعبیر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ ایک جزوی مرمت ہے۔ واللہ اعلم

کعبہ شریف کی پیمائش اور طول وعرض:

① دیواروں کی موٹائی ۳ فٹ ہے۔ ② کعبہ شریف کی بلندی ۴۰ فٹ ۶ انچ ہے۔ ③ مشرقی دیوار ۳۹ فٹ ہے۔ ④ مغربی دیوار ۳۹ فٹ ہے۔ ⑤ شمالی دیوار ۳۳ فٹ ہے۔ ⑥ جنوبی دیوار ۳۰ فٹ

ہے۔⑦ دروازے کی بلندی ۶ فٹ ۱۰ انچ ہے۔⑧ دروازے کا عرض ۴ فٹ ہے۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) بیت اللہ شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اور دونوں کہتے تھے: اے ہمارے پروردگار! ہم سے قبول فرما، بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے﴿۱۲۷﴾ اے پروردگار! بنا دے ہم دونوں کو اپنی فرمانبرداری کرنے والے، اور بنا دے ہماری اولاد میں سے بھی ایک اپنی فرمانبردار امت اور بتلا ہم کو ہمارے احکام، اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے﴿۱۲۸﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کا تعلق سابقہ آیت: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ کے ساتھ ہے۔ وہاں یہ ذکر ہوا کہ کعبہ شریف مرکز ومرجعِ خلائق ہے، اب کعبہ شریف کی بناء وتعمیر کا بیان ہو رہا ہے۔ ایک طرف سے کعبہ شریف کی ہمہ گیر فضیلت اور اس کے معمار وبانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت وبرتری کا بیان کہ یہ عظیم مرکزِ تجلیاتِ الٰہیہ، جن مبارک ہاتھوں سے تعمیر ہوا، وہ بھی مرجعِ خلائق صاحبِ ملّتِ ہیں، سیدنا ابو الانبیاء ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

کعبہ را ہر دم تجلی مے فزود ☆ این ز اخلاصات ابراہیم بود

(مثنوی)

جہاں روزانہ ایک سو بیس رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، اور ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے [illegible]اب کے برابر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل سے ہجرت کر کے ملکِ شام تشریف لے گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہاں [illegible]صر تشریف لے گئے تھے۔ مصر سے واپسی پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملکِ شام کو اپنا مستقل قیام گاہ بنایا، اور پوری زندگی وہاں رہے۔ اس وقت حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی، ابھی تک حضرت سارہ علیہا السلام کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے تھے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت اسماعیل

علیہ السلام سے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے۔ [ابن کثیر] حضرت سارہ علیہا السلام کو یہ بات ناگوار گزری۔ ادھر سے حق تعالیٰ کی مرضی تھی کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر اور آبادی کا مسئلہ بھی حل ہو، تو اس کی تمہید شروع ہوگئی۔

تو ربّ العزّت سبحانہ کے حکم سے حضرت جبریل علیہ السلام براق لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے، اور انہیں بیوی اور شیر خوار بچے سمیت گھوڑے پر بٹھا کر فوراً وہاں پہنچے، جہاں آج کعبۃ اللہ ہے۔ وہاں پر ببول کے چند درختوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ماں اور بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر وہاں چھوڑ گئے، اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر واپس روانہ ہوگئے۔ پہاڑ پر کھڑے ہو کر بڑے سوز و گداز کے ساتھ دعا کی، وہ مشہور دعا سورۃ ابراہیم کی آیت ۳۶ سے آیت ۴۱ تک موجود ہے۔

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا دانہ پانی جب ختم ہوا، تو انہوں نے سخت پریشانی کے عالم میں قریبی پہاڑ صفا و مروہ پر سات مرتبہ چڑھ کر دوڑ لگائی کہ شاید کوئی انسان مجھے نظر آئے، اور میرا مسئلہ حل ہو جائے، اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، اور شیر خوار بچے کے پاؤں کے نزدیک زمین پر اپنا قدم (ایڑی) مار کر ماءِ زمزم (چشمہ) جاری فرمایا۔ اس مبارک پانی سے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو سکون اور راحت حاصل ہوئی، پھر قبیلۂ جرہم کے لوگ، جو کہ خالص قحطانی عرب تھے وہاں آ کر آباد ہوگئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان سے عربی زبان سیکھی، اور آٹھ دس سال کے ہوگئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وقتاً فوقتاً ملک شام سے ان کی خبر گیری کی خاطر تشریف لاتے تھے۔

اس اثنا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا ابتلاء پیش آیا، چنانچہ باپ بیٹے بطیبِ خاطر تیار ہوگئے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مشکل آزمائش میں بھی مکمل کامیاب ہوئے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام بالغ ہوئے، تو قبیلۂ جرہم کی ایک لڑکی سے آپ علیہ السلام کا نکاح ہوا، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم پر اس خاتون کو طلاق ہوگئی، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کا شکوہ کیا تھا، اس کے بعد ایک دوسری لڑکی سے آپ علیہ السلام کا نکاح ہوا، یہ خاتون بڑی شکر گزار نکلیں۔ ان سے سلسلۂ نسب جاری ہوا، اور دو تین بچے پیدا ہوئے۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی اس سے پہلے وفات ہو چکی تھی۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام بیس سال کے ہوگئے، تو حسبِ معمول حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ علیہ السلام کو کعبۃ اللہ کی تعمیر کا حکم ہوا تھا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک مبارک کام کا حکم دیا ہے، کیا تم اس میں میری مدد کرو گے؟

فرمانبردار اور لائق فرزند نے عرض کیا کہ بسر و چشم آپ علیہ السلام کی مدد کروں گا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے اس ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں پہلے بیت اللہ تھا کہ مجھے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے۔ بیت اللہ شریف کی حدودِ اربعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتلادی تھیں، جب دونوں بزرگوار ہستیوں نے کام شروع کیا، تو بیت اللہ شریف کی قدیم بنیادیں نکل آئیں۔ انہی پر دونوں نے تعمیر شروع کردی، جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ [البقرة:۱۲۷] اس کے متعلق تفصیل گزر چکی۔

قَوَاعِدَ جمع ہے قَاعِدَة کی، جس کے معنی بنیاد کے ہیں۔ اصل بانی و معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بحیثیتِ مددگار و معاون شریک ہیں۔

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ یہ اس مقام پر اگرچہ پہلی دعا ہے، مگر مجموعی حیثیت سے یہ دوسری دعا شمار ہے۔ پہلی دعا آیت ۱۲۶ پر گزر چکی۔ اس دعا میں نہایت عجز و نیاز کا اظہار ہے، اور ساری ملّت کے لئے تعلیم ہے کہ کوئی شخص بڑے سے بڑا عمل کرے، تو اس پر ناز نہ کرے، اور یہ تصور نہ کرے کہ میں نے یہ بڑا عمل انجام دیا، بلکہ یہ ظاہر کرے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے کہ مجھ جیسے کمزور انسان سے یہ عمل پورا ہوا، اور مزید الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرے کہ میرا یہ عمل قبول ہو جائے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بناءِ کعبۃ اللہ شریف کے عمل کے متعلق یہ دعا فرمائی کہ اے ہمارے پروردگار! آپ ہمارے اس عمل کو قبول فرمالیں، کیونکہ آپ جل شانہ تو سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ آپ جل شانہ ہماری دعاؤں کو سنتے ہیں، اور ہماری نیتوں کو جانتے ہیں۔

پہلی دعا جو آیت ۱۲۶ میں گزر گئی، وہ یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! اس بستی کو امن و سلامتی کا شہر بنادیجئے، جہاں چاروں طرف خوشی اور سکون ہو۔ ہمارے اس شہر کی یہ خصوصیت ہو کہ اس کے باشندوں میں بدامنی اور رسہ کشی نہ ہو، اور نہ جنگ وجدال ہو۔ سبحان اللہ! یہ اتنی بڑی عقلمندی کی بات ہے کہ امن و سلامتی ایمان واسلام دونوں کی بنیاد ہے۔ مؤمن امن سے مشتق ہے، اور اسلام سلامتی سے، اگر کسی ملک یا شہر میں امن نہ ہو، تو اس کا یہی مطلب ہے کہ وہاں نہ ایمان ہے نہ اسلام، بلکہ کفر و ظلم کا راج ہے، اور لوگوں کی زندگی اجیرن اور اغیر اسلامی زندگی متصور ہوگی۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ چند آیات کے بعد ارشاد ہے:

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ اسلام لے آؤ، تو انہوں نے عرض کیا کہ میں ربّ العٰلمین کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہوں) دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ [آل عمران:۶۷] (بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو

رہے تھے، اور اسی کے فرمانبردار تھے)۔ اسی طرح ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللہِ الْاِسْلَامُ﴾[آل عمران:۱۹] (دین تو خداتعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔ سورۂ حج میں ارشاد ہے: ﴿مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ [الحج:۷۸] (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا)۔ اور فرمایا:﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران:۸۵] (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا) وغیر ذلک من الآیات۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ سبحانہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین صرف اسلام ہی ہے، اسلام کے علاوہ سارے ادیان تو منسوخ شدہ ہیں، یا باطل و ناکارہ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ کے بانی ہوتے ہوئے اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے دعا فرمارہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنا فرمانبردار بندہ بنادیجئے، اور ہماری اولاد میں بھی ایک جماعت فرمانبردار بنادیجئے، جو ہر وقت آپ کے حکموں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے، اور آپ جل جلالہ کے حکموں پر ہر قسم کی جانی مالی اور اولاد کی قربانی پیش کرے۔ قرآن کریم نے سورۂ تحریم میں فرمایا:﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ [التحریم:۶] (مؤمنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ (جہنم) سے بچاؤ)۔

ایک مشفق ومہربان والد کا فرض بنتا ہے کہ اپنی اولاد کے لئے ہر قسم کی فلاح وکامیابی کی دعا کرے۔ ہر قسم کی نیکی اور فوز وفلاح کے راستوں پر ان کی رہنمائی کرے، اور اسلامی بنیادوں اور احکام پر ان کی تربیت وتعلیم کرے، جیسے فرمایا:﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾[البقرة:۱۲۸]

مناسک منسک کی جمع ہے، بمعنی قربانی، اعمالِ حج کو **مناسک** کہتے ہیں۔ اسی طرح مقاماتِ مقدسہ، مثلاً عرفات، مزدلفہ، منیٰ کو بھی مناسک کہتے ہیں۔ یہاں دونوں مراد ہوسکتے ہیں۔

دعا کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں حج کے احکام اور مقاماتِ ادائیگی حج دونوں سمجھا دیجئے! چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مواقیتِ احرام اور مقاماتِ حج وعمرہ، عرفہ، مزدلفہ، منیٰ اس طرح مقاماتِ مقدسہ کی حدودِ اربعہ اور حرمِ مکۃ المکرمہ کے چاروں طرف کی حدود ودیگر تمام اعمال وافعالِ حج وعمرہ دکھا کر بتلایا۔ الحمد للہ! اس سلسلے میں کوئی گوشہ تشنہ تکمیل نہیں رہا، اور تمام فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، محرمات، مکروہات، نواقض روزِ روشن کی طرح معلوم ہوگئے۔

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول بھیج، جو ان پر تیری آیتیں تلاوت کرے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور ان کو پاک کرے، بیشک! تو زبردست حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

معارف ومنازل

جلیل القدر، عظیم المرتبت باپ بیٹے سیدنا ابراہیم وسیدنا اسمٰعیل علیہما السلام نے آخری دعا یہ فرمائی:

﴿رَبَّنَاوَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًامِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡعَلَيۡهِمۡ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ﴾ (اے ہمارے پروردگار! بھیج ان میں انہی میں سے رسول جو تیری آیتیں ان پر تلاوت کرے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور ان کو پاک کرے)۔ تو اس کی قبولیت واجابت کا اعلان ہو رہا ہے، جو ارشاد ہے: ﴿كَمَآاَرۡسَلۡنَافِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّالَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ [سورۃ البقرۃ: ۱۵۱] (جیسے ہم نے تمہارے اندر تم میں سے رسول بھیجے جو تمہارے اوپر ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، تم کو پاک کرتے ہیں، اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اور تم کو سکھاتے ہیں وہ کچھ جو تم نہیں جانتے تھے)۔ تیسری مرتبہ پھر ارشاد ہے: ﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡاعَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ﴾ [آل عمران: ۱۶۴] (بیشک اللہ نے احسان کیا مؤمنوں پر کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے، اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، جبکہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے)۔

چوتھی مرتبہ ارشاد ہے: ﴿هُوَالَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًامِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡاعَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاِنۡ كَانُوۡامِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ﴾ [الجمعۃ: ۲] (وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے)۔

مفسر ابن جریر اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہما نے حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت مل گئی تھی کہ آخری زمانہ میں یہ عظیم الشان رسول مبعوث ہوں گے۔

تب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر یہ دعا فرمائی کہ اس امتِ مسلمہ میں ایک عظیم الشان رسول بھیج، اور اس پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرما، اور پھر وہ عالی مرتبت رسول اس امتِ مسلمہ کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے، اور وہ رسول ہم دونوں کی ذرّیت اور اولاد سے ہو، تاکہ دنیا و آخرت میں ہمارے لئے عزّت اور شرف کا موجب ہو، جس طرح آپ کا پاکیزہ گھر ہمارے لئے عزّت اور کرامت کا موجب ہے، اور اس عظیم ہستی اور عالی مرتبت رسول کے ذریعہ بھی قیامت تک میری امامت باقی اور قائم رہے، کیونکہ میری اولاد کی امامت میری ہی امامت ہے۔

علاوہ ازیں! جب وہ رسول انہیں میں سے ہوں گے، تو لوگ ان کے مولد اور منشاء سے، اور ان کے حسب و نسب اور ان کی امانت و دیانت، اخلاق و کردار اور صورت و سیرت سے بخوبی واقف ہوں گے، اور اس کے اتباع سے شرم محسوس نہیں کریں گے، اور جب حقِ نبوت و رسالت کے ساتھ قرابت کی محبت اور شفقت بھی مل جائے گی، تو اس رسول کی نصرت اور اعانت و حمایت اور ان کی شریعت کی ترویج اور اشاعت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے۔ وہ لوگ اس نبی کو اپنا عزیز و رشتہ دار سمجھ کر ان کے ساتھ بھائیوں جیسا معاملہ کریں گے۔ اجنبی اور غیر کا معاملہ نہیں کریں گے، اور رسول ایسا عظیم الشان ہو کہ ان پر ایک ایسی جامع اور عظیم الشان کتاب بھی نازل ہو کہ اولین و آخرین میں اس کی نظیر نہ ہو، تاکہ وہ عظیم رسول، عظیم الشان کتاب کی تعلیم اور اس کے علوم و معارف اور اسرار و حکم سے انہیں آگاہ فرمائیں، اور علمِ ظاہر و باطن کے انوار و برکات سے ان کے قلوب کو پاک و صاف کر کے کفر و جہالت کی تاریکیوں سے انہیں نجات دے کر ان کا تزکیہ کریں، اور کتابِ ہدایت کی تعلیم سے زنگ آلود نفوس کو صیقل (سوہان) کر کے مثلِ آئینہ کے چمکدار شفاف بنا دیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو ربّ العزّت سبحانہ نے شرفِ قبولیت سے نوازا، اور ان کی دعا کے مصداق سید الانبیاء، خاتم المرسلین، حبیب ربّ العٰلمین، سید کائنات، فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسی جامع کتاب و جامع شریعت کے ساتھ آخرِ زمانہ میں مبعوث فرمایا کہ تا قیامت کسی نبی اور رسول اور کسی دوسری شریعت کی ضرورت باقی نہ رہی۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب آیا: "قَدْ اُسْتُجِیْبَ لَکَ هُوَ کَائِنٌ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ"۔ [ابن کثیر] اور اس آیت میں سید القراء حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے: "وَقَرَأَ اُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ وَابْعَثْ فِیْ اٰخِرِهِمْ رَسُوْلًا"۔ [روح المعاني وغیرہ]

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسولِ برحق کے لئے جو دعا مانگی تھی، ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نبی آخری نبوت کے حامل ہوں، اور خاتم الانبیاء ہوں، تو ان کی یہ دعا سو فیصد قبول ہوئی۔ ؎

پیغام خدا نخست آدم آورد ☆ انجام بشارت ابن مریم آورد

باجملہ رسل نامہ بے خاتم بود ☆ احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برما نامہ وخاتم آورد

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کی نبوت کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "دَعْوَةُ اَبِیْ اِبْرَاهِیْمَ وَبُشْرٰی عِیْسٰی وَرَأَتْ اُمِّیْ اَنَّهٗ یَخْرُجُ مِنْهَا نُوْرًا اَضَائَتْ لَهٗ قُصُوْرُ الشَّامِ"۔ [درمنثور، أحمد، ابن کثیر وغیرہ] یعنی میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ کا مصداق اور نتیجہ ہوں۔ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے میری بعثت کی دعا کی، اور پھر میں اپنے بھائی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی بشارت ہوں: ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾ [الصف: ۶] (خوشخبری سناتے ہوئے ایسے رسول کی جو میری بعد آئیں گے، جن کا نام احمد ہے) کہ انہوں نے میری آمد کی بشارت دی، اور پھر میں اپنی والدہ ماجدہ کا خواب ہوں کہ انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا کہ ان کے بدن سے ایک نور نکلا ہے، جس سے ملکِ شام کے محل روشن ہو گئے۔

الطاف حسین حالیؔ نے کیا خوب کہا: ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا ☆ دعائے خلیل ونوید مسیحا

(حالی)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے:

"اِنِّیْ عِنْدَ اللهِ فِیْ اُمِّ الْکِتَابِ لَخَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ وَاِنَّ اٰدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَتِهٖ وَسَاُنَبِّئُکُمْ بِاَوَّلِ ذٰلِکَ دَعْوَةُ اِبْرَاهِیْمَ"۔ [مسند أحمد، درمنثور] یعنی (میں اللہ تعالیٰ کے یہاں لوح محفوظ میں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا، اور

آدم علیہ السلام ہنوز گارے اور مٹی کے پتلے میں تھے، اور میری نبوت کی ابتداء ابراہیم علیہ السلام کی دعاء ہے)۔

رسول (ﷺ) کے چار فرائض:

اس آیت کریمہ اور اس کی نظیر دیگر آیات میں رسول کے لئے خصوصیت کے ساتھ چار فرائض کا بیان ہے:

(۱) ﴿یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیات کا امتِ مسلمہ کے سامنے پڑھ کر تلاوت کرنا۔

(۲) لوگوں کو کتاب کی تعلیم دینا۔

(۳) امتِ مسلمہ کو حکمت کی تعلیم دینا۔

(۴) زنگ آلود قلوب ونفوس کا تزکیہ، اور انہیں ہر قسم کے برے عقائد واعمال سے پاک وصاف کرنا۔

اب ہر ایک کا مختصر بیان:

تلاوت کے معنی پڑھنا، سنانا، عرفِ عام میں اس کے معنی قرآن مجید کو پڑھنا، کیونکہ کسی عام کتاب کے پڑھنے کو تلاوت نہیں کہتے، یہ کلام اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

"اَلْکِتَاب" لغت میں ہر مکتوب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، چھوٹا مجموعہ ہو یا بڑا، یہاں تک کہ عام خطوط کو بھی کتاب کہتے ہیں، اگر چہ چند جملوں پر مشتمل ہو، جیسے حدیث میں ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے بادشاہوں کے نام کتاب (یعنی خطوط) لکھی اور بھیجی۔

شریعت کی اصطلاح میں جب کتاب بغیر اضافت مستعمل ہو، تو اس سے فردِ کامل صرف قرآن حکیم ہی مراد ہوگا، جیسے: "ذٰلِکَ الْکِتَابُ، تِلْکَ اٰیَاتُ الْکِتٰبِ، وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ" وغیرہ۔

قرآن حکیم عام کتابوں کی طرح نہیں ہے، "وَھُوَ اِسْمٌ لِلنَّظْمِ وَالْمَعْنٰی جَمِیْعًا"۔ یعنی قرآن مجید میں الفاظ ومعانی دونوں مقصود ہیں۔ قرآن کریم دوسری کتابوں کی طرح نہیں ہے، جن میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں، اور الفاظ صرف ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت میں ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ میں ردّ وبدل یا تقدیم وتاخیر ہو، تو حرج نہیں ہے، بشرطیکہ معنی خراب نہ ہو، اور محض الفاظ کے پڑھنے اور رٹنے میں کوئی فائدہ نہیں، اگر معانی تک رسائی حاصل نہ ہو۔ مگر قرآن مجید ایسا نہیں ہے۔ جب قرآن مجید کے معانی ومطالب تک عوام الناس کی رسائی بہت مشکل ہے، تو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر آسانی فرمائی، لہٰذا معنی سمجھے بغیر صرف الفاظ کی تلاوت پر اجر وثواب کا وعدہ فرمایا۔

قرآن مجید کے کلمات، حروف، بلکہ زیر وزبر پیش تک کی پابندی ضروری ہے، اگر چہ معنی میں تبدیلی نہ ہو،

کیونکہ وہ الفاظ ومعانی اور ترتیب سب کا مجموعی نام ہے، یہی وجہ ہے کہ عربی الفاظ اور متنِ قرآن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنا جائز نہیں ہے، اور صرف ترجمہ پر نہ قرآن کا اطلاق ہوتا ہے، اور نہ ہی اس کے پڑھنے پر ثواب مرتب ہوتا ہے۔ جب قرآن کریم الفاظ اور معانی دونوں کا نام ہے، تو لفظی اور معنوی تحریف (ردّ وبدل، کمی بیشی) دونوں اس میں حرام ہیں۔

بہت سارے لوگ قرآن حکیم کی تلاوت پر قدرت نہیں رکھتے۔ وعظ ونصیحت کے طور پر صرف صحیح ترجمہ و مطلب بیان کرتے ہیں، یہ بالاتفاق جائز ہے، مزید تفصیل کتبِ اصول میں دیکھیں۔

قرآن مجید افضل الاذکار ہے، اور جو ثواب تلاوتِ قرآن پر ملتا ہے، وہ ذکر واذکار کے ثواب سے کہیں زیادہ ہے۔ ہر حرف کے بدلہ دس نیکیوں کا وعدہ ہے۔ درمنثور میں ہے کہ نماز میں پڑھنے کا ثواب ہر حرف کے بدلے سو ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تلاوتِ قرآن پاک سارے اذکار سے افضل ہے۔ جب قرآن کے قاری کو زمین میں دفن کیا جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ زمین پر وحی کر کے اسے خبردار کرتا ہے کہ اس کی ہڈی گوشت پوست کی حفاظت کرو۔ زمین جواب دیتی ہے: میری کیا مجال! کہ میں اسے ضائع اور تلف کروں، چنانچہ اس کا بدن محفوظ رہے گا۔ ”اِذَا مَاتَ حَامِلُ الْقُرْاٰنِ اَوْحَی اللّٰہُ اِلَی الْاَرْضِ اَنْ لَّا تَاْکُلِیْ اللَّحْمَ قَالَتْ یَارَبِّ وَ کَیْفَ اٰکُلُ اللَّحْمَ وَ کَیْفَ اُتْلِفُ الْجِسْمَ وَ کَلَامُکَ فِیْ جَوْفِہٖ“۔ [مظهري]

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ کہ وہ رسول امتِ مسلمہ کو کتاب کی تعلیم دیں گے۔ کسی کتاب کو صرف پڑھ کر سنا دینا اور چیز ہے، اور اس کی تعلیم دینا اور چیز ہے۔ یہاں پر تعلیمِ کتاب کا ذکر ہے، جس کا مقام بہت اونچا ہے، کیونکہ علم بغیر محنت اور بغیر معلّم کے حاصل نہیں ہوتا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ۔ [بخاري كتاب العلم] علم خود بخود حاصل نہیں ہوتا، بلکہ سیکھنے سے آتا ہے، اور جو لوگ بغیر استاد کے محض کتابوں کے مطالعہ سے علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ گمراہ ہی ہو جاتے ہیں، اور ان کا علم نہایت کچا اور ناکارہ ہوتا ہے۔

آج تک کوئی شخص بغیر استاد ومعلّم کے صرف کتابیں دیکھنے اور پڑھنے سے نہ حکیم بنا ہے، نہ ڈاکٹر وانجنیئر اور نہ فقیہ ومحدّث۔ جن لوگوں نے بغیر معلّم کے احادیث وتفاسیر کا مطالعہ کر کے عالم اور مفکر بننے کی کوشش کی ہے، جیسے غلام قادیانی، غلام پرویز اور سرسید وغیرہ، ان کا انجام سب کے سامنے ہے کہ کافر وگمراہ بنے، اور اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اگر صرف کتاب دیکھنے اور پڑھنے سے علم وہدایت کا حصول ممکن ہوتا، تو ربّ العزّت کسی فرشتے کے ذریعہ

آسمانی کتاب اتارتے، لوگ اسے پڑھ کر علم و ہدایت حاصل کر لیتے۔ انبیاء علیہم السلام کی آمد کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، مگر صورت حال یہ ہے کہ بغیر معلّم کے دنیا کا کوئی ایک ادنیٰ پیشہ اور ہنر بھی حاصل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ علم جیسا ہنر و کمال۔ وہ تو ہر لمحہ استاد کی نگرانی و سرپرستی پر موقوف ہوتا ہے۔

سب سے اعلیٰ اور کامل معلّم جس کو علم کے سارے تقاضوں اور نہایت باریکیوں پر عبور حاصل ہو، وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت ہے، جنہیں وحی الٰہی کے ذریعے اور اس کی رہنمائی سے اللہ تعالیٰ علم عطا فرماتے ہیں، اور پھر اس علم کا مسلسل تحفظ اور نگرانی کا بذریعۂ الہام اور فرشتے حفاظت کا انتظام ہوتا رہتا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال رمضان المبارک میں پابندی کے ساتھ تشریف لاتے تھے، اور صاحبِ قرآن سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن سناتے، اور دَور کرتے تھے، حالانکہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حفظ اور علم اتنا پختہ اور مضبوط ہوتا تھا، جس میں کسی فروگزاشت یا نسیان کا امکان تک نہیں ہوتا تھا، مگر یہ سب کچھ امت کی تعلیم کی خاطر ہوتا تھا۔

ایک موقع پر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے، وہاں پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو گروہ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے: ایک گروہ ذاکرین کا تھا، جو ذکرِ الٰہی میں مشغول تھا، اور دوسرا گروہ تعلیم و تعلّم کا کام کر رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں سے خوش ہوئے، فرمایا: كِلَاكُمَا عَلَى الْخَيْرِ۔ تم دونوں اچھے اور خیر کے کام میں مصروف ہو، مگر بات یہ ہے کہ: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" (مجھے اللہ تعالیٰ نے معلّم بنا کر بھیجا ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعلیمی گروہ میں شامل ہو گئے، اور ان کے پاس تشریف رکھی۔ [مشکوۃ] کیونکہ علم اصل ہے، سارے اعمال کے لئے، تو ذکر اللہ کے لئے بھی علم ضروری ہے، بغیر علم کے ذکر اللہ تمام نہیں ہوتا۔

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا حصہ ہے کہ میری اولاد (امتِ مسلمہ) میں ایسا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث فرما جو کتاب کی تعلیم کے ساتھ انہیں حکمت کی تعلیم بھی دے۔ حدیث میں وارد ہے: "راس الحكمة مخافة الله" (حکمت کی جڑ اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے)۔ اسی طرح: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ [البقرة: ۲۶۹] (اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی)۔ اسی طرح: "مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا جَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ"۔ [جامع صغیر]

قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ [لقمان: ۱۲] (اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی)۔

حدیث میں وارد ہے: "اَلْاِیْمَانُ یَمَانٍ وَالْحِکْمَةُ یَمَانِیَةٌ"۔[بخاري] امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اَلْحِکْمَةُ اِصَابَةُ الْحَقِ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْلِ"۔ یعنی حق کو علم اور عقل کے ذریعہ پالینا حکمت ہے، یہی جامع معنی ہے، جو تمام معانی پر مشتمل ہے کماھو الظاھر۔

حکمت کے معانی:

علماء کرام، محدّثین ومفسرین حضرات سے حکمت کے بہت سے معانی منقول ومروی ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) حکمت نورِ قلب کا نام ہے۔ (۲) باطنی باتوں کا جاننا حکمت ہے۔
(۳) دل کی بصیرت اور فہم کا نام حکمت ہے۔ (۴) علم وعمل کے مجموعہ کا نام حکمت ہے۔
(۵) سنت وحدیث کا نام حکمت ہے۔ (۶) حق وباطل میں تفریق کرنا حکمت ہے۔
(۷) احکامِ شریعت کے رموز واسرار کے جاننے کا نام حکمت ہے۔ (یہ قول امام مالک رحمہ اللہ کا ہے)۔
(۸) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا نام حکمت ہے۔ (۹) اعمالِ صالحہ واخلاقِ حسنہ اختیار کرنا حکمت ہے۔
(۱۰) تکمیلِ انسانیت باحکام اللہ تعالیٰ حکمت ہے۔ (۱۱) پختہ عمل اور پختہ عقیدہ، جس میں کسی قسم کا ذرہ برابر تردّد وشک نہ ہو، یہ ہے حکمت۔

عبار اتنا شتی وحسنک واحد ★ وکل إلی ذاک الجمال یشیر

﴿وَیُزَکِّیْهِمْ﴾ (اور ان کو پاک کرے) یہ لفظ بڑے دوررس معانی کا حامل ہے۔ سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کا یہی مطلب ہے کہ ہزاروں متضاد، مختلف الجنس والنوع اور متفرّق معانی کے لئے ایک ایسا جامع لفظ مستعمل ہو، جو ان سارے معانی پر مشتمل ہو، وہ ہے "یُزَکِّیْهِمْ" جو کہ تزکیہ سے ماخوذ ہے، بمعنی طہارت ونظافت اور پاکی۔

مختصر تشریح:

مذکورہ آیت کی مختصر تشریح یہ ہے کہ انسانی اعمال دو قسم کے ہیں:

(۱) فضائل۔ (۲) رزائل۔

☆ **پہلی قسم فضائل:** وہ یہ ہیں کہ مأموراتِ شرعیہ اور تمام حسنات فرائض، واجبات، سنن ومستحبات، خواہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق المخلوقات سے (بشمول حیوانات) ان کی بجا آوری اور ادائیگی کے ساتھ ظاہر و

باطن کی پہچان کے ساتھ ایک عجیب استحضار حاصل ہوتا ہے، جسے درجۂ احسان سے تعبیر کرتے ہیں۔ "تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ"۔ اسی حقیقتِ صادقہ اور خصلتِ فاضلہ کا نام تزکیہ ہے، جو کہ مطلوب ہے، اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں ایسے وقت میں تشریف لائے جس میں اس خصلتِ فاضلہ کا نام ونشان نہ تھا۔

☆**دوسری قسم رزائل:** وہ یہ ہیں کہ مأمورات ومنہیاتِ شرعیہ پر عمل نہ ہو، نہ عقائد درست ہوں، نہ اعمال، حقوق اللہ وحقوق الخلق دونوں متروک ہوں، تو ایسی صورت میں انسان ظاہری اور باطنی طور پر ناپاک ہوجاتا ہے، اور تمام رزائل اور برائیوں میں غرق ہوجاتا ہے۔ اس کے باطن کا فطری نور اور اس کی حرارت ختم ہوجاتی ہے۔ وہ نیکی و برائی کی شناخت سے ایسا بیگانہ ہوجاتا ہے، جیسے حیوان، تو اس کی طہارت اور تزکیہ کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہی ہے، جس سے اس کی ناپاکی دور ہو، اور اس کا تزکیہ ہو، یہی تزکیہ کامل نبوت کی شان ہے تو فرمایا: "وَيُزَكِّيهِمْ"۔ جیسے ہم میلے کچیلے کپڑوں، فرشوں، برتنوں کو پانی سے پاک وصاف کرتے ہیں، اس طرح انسانی قلوب وباطن کی صفائی کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس طرح تعلیمِ کتاب وحکمت کا حق ادا فرمایا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تزکیہ کا عمل ایسا انجام دیا جس پر نورانی فرشتے بھی رشک کرنے لگے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی اگر دیکھی جائے جو تزکیہ انہیں حاصل ہوا، وہ ایک ایسی تاریخی محیر العقول حقیقت ہے، جس سے تمام ادیانِ سماویہ کے لوگ سراسر محروم رہے، اور تا قیامت اس کی نظیر شاید دستیاب نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد ان کے جانشیں تابعین اور تبع تابعین اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم ایسے ایسے عجیب وغریب اعمال و کردار پر عمل پیرا رہے، جنہیں قیامت تک لوگ یاد کریں گے، اور انہیں داد دیں گے، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔

موجودہ زمانہ میں ہم سب دیکھتے اور مشاہدہ کررہے ہیں کہ جہاں جہاں وحی کا نزول اور گزر ہوا ہے، وہاں کے لوگ پاکیزہ اور پرہیزگار ہیں، ان کی زندگی اور معاشرہ دوسروں کے لئے مثالی اور نمونہ ہے، اور جہاں وحی کا گزر نہیں ہوا، اور وحی کے انوار وبرکات نہیں پہنچے، وہاں شربت وشراب کا دور دورہ ہے۔ ماں، بہن، بہو اور بیٹی سب ایک جیسی ہیں۔ انسان کتوں اور خنزیروں سے زیادہ بے شرم ہیں۔ ہم جنس پرستی اتنی بکثرت اور عام ہے کہ خدا کی پناہ۔ سارا معاشرہ جنگلی جانوروں کے رنگ وروپ کا منظر پیش کررہا ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے کہ ان کی گردنوں میں وحی کا طوق اور قیمتی ہار ڈالا ہوا نہیں ہے، وہ مادر پدر آزاد اقوام پست اور بے غیرت ہیں کہ انہیں اپنے حقیقی باپ کا پتہ ہی نہیں، کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں، اور میرا باپ فلاں ہے۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اگرچہ ہم سے بہت آگے ہیں، مگر انسانیت وشرافت جس چیز کا نام ہے، اس سے وہ عاری اور محروم ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان قوم میں ہزاروں بداعمالیوں کے باوجود اس قسم کی بے غیرتی اور بے حیائی نہیں، جو کفار میں ہے۔ ؎

نفس نفس پہ برکتیں قدم قدم پہ رحمتیں ☆ جہاں جہاں گزر ہوا وہاں وہاں سحر ہوئی

جہاں نہیں ہوا گزر وہاں ہے رات آج تک......

وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ وَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ؕ

ترجمہ: دینِ ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو محض بیوقوف ہو، ہم نے تو اسے دنیا میں بھی برگزیدہ بنایا تھا، اور آخرت میں بھی وہ نیک کاروں سے ہیں ﴿۱۳۰﴾ جب کبھی بھی ان کو ان کے ربّ نے کہا مان لیں، انہوں نے کہا: میں نے ربّ العلمین کی مان لی ﴿۱۳۱﴾ اسی کی وصیت کی ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو، کہ ہمارے بچو! (اولاد) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس دین کو پسند فرمالیا ہے، خبردار تم مسلمان ہی مرنا ﴿۱۳۲﴾

معارف ومنازل

ان آیات کریمہ میں مشرکین اور یہود ونصاریٰ کا پرزور ردّ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کے پیروکار بتاتے تھے، حالانکہ وہ مکمل طور پر مشرک اور دینِ حنیف سے منحرف اور بیگانہ تھے، کیونکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام موحدوں اور فرمانبرداروں کے امام وپیشوا تھے، وہ توحید کو شرک سے ممتاز کرنے والے تھے۔

عمر بھر میں ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، بلکہ ہر مشرک اور ہر قسم کے شرک سے مکمل بیزار رہے، اپنی قوم سے الگ رہے، اور آگ میں ڈالے جانے کو بطیبِ خاطر قبول کیا، وطن چھوڑ کر

ہجرت کی، بلکہ باپ تک کی مخالفت کی، اور صاف اعلان فرمایا، اور کہا: ﴿اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾ [الأنعام: ۷۸] (جس چیز کو تم (اللہ کا) شریک بناتے ہو میں اس سے بیزار ہوں) میں تم سے اور اس چیز سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جسے تم معبود بنا کر شرک کرتے ہو، میں نے تو یکسو ہو کر اپنی تمام تر توجہ اس پاک ذات کی طرف کر دی ہے، جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔ ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ [الأنعام: ۷۹] (میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے تئیں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں)۔

یعنی باپ اور قوم سے فرمایا کہ میں تمہارے معبودوں سے بری ہوں، میں تو اپنے خالق ہی کا گرویدہ ہوں، وہی مجھے راہِ راست دکھائے گا، جب اسے اپنے باپ کے متعلق صحیح علم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے، تو اس سے بیزار ہو گئے، اور اس کے لئے جو استغفار کا وعدہ کیا تھا، اسے ترک فرمایا، اور لاتعلق ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے ہی رجوع کرنے والے اور بردبار تھے۔ ﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ﴾ [التوبة: ۱۱۴] (بیشک ابراہیم بڑی آہیں بھرنے والے، بڑے بردبار تھے)۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَّلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ [النحل: ۱۲۰] (بے شک ابراہیم (لوگوں کے) امام اور خدا کے فرمانبردار تھے، جو ایک طرف کے ہو رہے تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے۔ خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا، اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا۔ اور ہم نے اس کو نیکی عطا کی، اور آخرت میں نیکوکاروں میں سے ہیں۔ پھر ہم نے آپ کو حکم دیا کہ ابراہیم کی ملّت کی پیروی کریں، ایک طرف ہو کر، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے)۔

یہاں بھی یہی ارشاد ہو رہا ہے کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بیوقوف، ناداں اور گمراہ لوگ ہی ملّتِ ابراہیمی کو ترک کر کے دوزخ کا راستہ اختیار کرنے والے ہوتے ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور صراطِ مستقیم کے لئے انتخاب فرمایا تھا، اور بچپن ہی سے انہیں اسی کی توفیق عطا فرمائی تھی۔ خلیل اللہ کا خطاب و اعزاز انہیں اسی بنیاد پر عطا ہوا تھا۔ ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا﴾ [النساء: ۱۲۵] (اور اللہ نے ابراہم کو

خلیل بنالیا)۔ پوری کائنات میں یہ اعزاز صرف انہی کا حصہ رہا۔

پس جوکوئی ان کے نقش قدم پر چل کر ان کی پیروی نہیں کرے گا، تو اس کی نادانی اور بیوقوفی میں کسی کو شک وشبہ نہیں رہے گا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں صالح اور عظیم برگزیدہ لوگوں میں شمار ہوں گے تو ان کی ملت پر چلنے والے لوگ بھی ابدی سعادتوں کے حقدار ہوں گے، جو کہ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لوگ ہیں، اور اس سعادت سے یہود ونصاریٰ اور مشرکین سراسر محروم رہیں گے۔

قرآن حکیم کا واضح اعلان بھی یہی ہے: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَھٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [آل عمران] (ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی، بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے، اور اسی کے فرماں بردار تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ ابراہیم کے ساتھ تعلق کے سب سے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، نیز یہ نبی (آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے ہیں، اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے)۔

جب کبھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ مان لو! وہ جواب دیتے: اے ربّ العٰلمین! میں نے مان لیا، کسی بھی امتحان وابتلاء میں کمزوری نہیں دکھائی، جو بھی ملا، بخوشی وطیب خاطر تسلیم کیا اور کہا:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ☆ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو
سپردم بتو مایۂ خویش را ☆ تو دانی حساب کم وبیش را
جان ز تن بردی ودر جانی ہنوز ☆ درد ہا دادی ودرمانی ہنوز
قیمت خود ہر دو عالم گفتہ ☆ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ع جز بہ تسلیم ورضا کو چارہ......

ملّت سے مراد اسلام، اور کلمہ سے مراد ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہے۔ دیکھئے! کہ ان کے دل میں اسلام کی کس قدر محبت وعزت تھی؟ کہ خود بھی مدۃ العمر اس پر عامل رہے، اور اپنی اولاد کو بھی اس کی وصیت فرمائی۔

دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ﴾ [الزخرف: ۲۸] (اور ابراہیم نے اس (عقیدے) کو ایسی بات بنا دیا جو ان کی اولاد میں باقی رہی)۔ جب تک ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے، اسی ملّت اسلام پر

قائم رہے، اور جب وصال کا وقت آیا، تو ابراہیم علیہ السلام نے سب بیٹوں کو جمع کر کے اسی ملتِ اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی، جن میں حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام وغیرہ سارے شامل رہے، اور پھر اسی طرح حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب علیہ السلام نے وصال کے موقع پر اپنے بیٹوں سے کہا: اے میرے بیٹو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہ دینِ اسلام پسند فرمایا ہے، اس کے سوا اللہ تعالیٰ نے کسی دین کو قبول نہیں کیا ہے۔ پس تم ہرگز نہ مرنا، مگر اس حالت میں کہ تم اسلام پر پختہ اور قائم ہو۔

یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ہرگز یہودیت اور نصرانیت کی وصیت نہیں کی، بلکہ ملّتِ اسلام پر قائم رہنے اور اسی پر مرنے کی وصیت کی۔ تو اہلِ کتاب سے کہا جا رہا ہے کہ تم یہ دعویٰ جو کرتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت کی تھی، اس کی نہ کوئی سند ہے، اور نہ ثبوت، اور نہ ہی کوئی امکان۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک برگزیدہ پیغمبر جو ملّتِ ابراہیم علیہ السلام کی علامت اور داعی ہو، وہ اسلام کو چھوڑ کر اپنی اولاد کو کسی باطل کی وصیت کرے؟ یہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے اور معصوم انبیاء کرام علیہم السلام کی شان کے سراسر خلاف ہے۔ آگے ارشادِ ربانی ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا
نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۞۱۳۳ تِلْكَ
اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞۱۳۴

ترجمہ: کیا (حضرت) یعقوب کے انتقال کے وقت تم لوگ موجود تھے؟ جب انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود (ربِّ ذوالجلال) کی، اور آپ کے باپ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود صرف ایک خدا کی عبادت کریں گے، اور ہم سب اسی ایک خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری پر قائم رہیں گے ۞۱۳۳ یہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی ایک جماعت تھی جو گزر گئی، جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے، اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا، ان کے متعلق تم سے نہیں پوچھا جائے گا ۞۱۳۴

معارف و منازل

حضرت یعقوب علیہ السلام کے سارے بیٹوں نے اقرار کیا کہ ہم صرف ایک معبودِ برحق کی عبادت کریں گے، جو

ہمارے آباء واجداد کا معبودِ برحق ہے، جس کی عبادت ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کیا کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ وحدہ کی الوہیت میں کسی کو شریک نہیں کریں گے، اور ہم اس کی اطاعت گزاری، فرمانبرداری میں مشغول رہا کریں گے۔ جس طرح دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ [آل عمران: ۸۳] زمین وآسمان کی ہر چیز خوشی اور ناخوشی سے تکوینی طور پر اس کی مطیع وفرمانبردار ہے۔

سارے انبیاء علیہم السلام کا دین یہی اسلام رہا ہے، اور تمام انبیاء کرام توحیدِ باری تعالیٰ کے داعی اور علمبردار رہے ہیں، اگر چہ احکامِ شرعی ہر پیغمبر کے الگ الگ اور مختلف رہے ہیں، مگر بنیادی عقائد میں سب ایک اور متفق رہے ہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہے: ''اَلْاَنْبِيَاءُ اَبْنَاءُ عَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ''۔ [بخاري]

قرآن کریم نے صاف اعلان کیا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الأنبياء: ۲۵] (آپ سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے سب کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں! تم سب میری ہی عبادت کرتے رہو)۔ اس مضمون پر بہت ساری قرآنی آیات اور صحیح احادیث بکثرت وارد ہیں۔

پھر فرمایا کہ یہ پاکیزہ جماعت جو گزر چکی، تمہیں ان کی طرف کی نسبت (پیغمبر زادگی) ہرگز نفع نہ دے گی۔ ہر شخص کا عمل صرف اسی کے لئے فائدہ مند ہے، دوسروں کو روزِ قیامت کام نہیں آئے گا، جب تک کہ وہ خود وہ عمل بجا نہ لائے، تم ان کے عمل پر مغرور نہ ہو، اپنے لئے خود عمل کرو۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے: ''جسے اس کے عمل نے پیچھے چھوڑ دیا نسب اس کو آگے نہیں کرے گا''۔ [مشكوة]

فائدہ:

واضح ہو کہ ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں:

(۱) اول اصول اور عقائد، جیسے توحید ورسالت اور قیامت، ان چیزوں میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام متفق علیہ ہیں، ان میں اختلاف ممکن نہیں ہے، اور نہ ان میں نسخ جاری ہوتا ہے۔

(۲) قسم دوم قواعدِ کلیہ شرعیہ کہ جن کی طرف جزئیات اور فروع راجع ہوتے ہیں، اور حکم میں ان کلیات کا لحاظ رہتا ہے، اور انہی قواعدِ کلیہ کا نام ملّت ہے، جس میں اختلاف بہت کم ہوتا ہے۔ ملّتِ محمدی اور ملّتِ ابراہیمی انہی

اصول اور قواعدِ کلیہ کے لحاظ سے موافق اور متحد ہیں۔

(۳) قسم سوئم احکامِ جز ئیہ اور فرعیہ، جس کو شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ زمان اور مکان اور اُمم کے اختلاف سے شریعت کے احکامِ جز ئیہ بدلتے رہے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ [المائدۃ:۴۸] (تم میں سے ہر ایک کے لئے راستہ اور قانون بنایا ہے)۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت تو ایک ہے، اور شریعت ہر ایک کی الگ الگ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ تمام احناف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امام مانتے ہیں، مگر باوجود اس کے امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہم کبھی کبھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلاف بھی کرتے ہیں، مگر قانونِ حنفی سے کسی حال میں خارج نہیں ہیں، اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے قواعدِ مقررہ سے باہر نہیں جاتے، مثلاً قیاسِ جلی یا قیاسِ استحسان اور عمومِ بلوٰی کسی نہ کسی قاعدہ کے تحت میں اس جز ئیہ کو درج کرتے ہیں۔

❀ ❀ ❀

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾

ترجمہ: یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے، تو آپ کہہ دیں، کہ نہیں، بلکہ راہِ حق پر ملتِ ابراہیمی والے لوگ ہیں، اور حضرت ابراہیم مشرک نہیں تھے ﴿۱۳۵﴾

معارف ومنازل

یہودی عالم عبداللہ بن صوریا اعور نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا کہ ہم لوگ اصلی ہدایت پر ہیں، تم ہماری مانو، تو تمہیں بھی ہدایت ملے گی۔ نصرانیوں نے بھی یہی کہا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم تو ابراہیم حنیف علیہ السلام کے متبع ہیں، جو استقامت والے، حج والے، بیت اللہ کی طرف منہ کرنے والے، استطاعت کے وقت حج کو فرض جاننے والے، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے، تمام رسولوں پر بلاتفریق ایمان لانے والے، لا إلٰہ إلّا اللہ کی شہادت دینے والے، ماں، بیٹی، خالہ، پھوپھی کو حرام جاننے والے اور تمام حرام کاریوں سے بچنے والے تھے۔ یہ سب معنی حنیف کے مختلف حضرات نے بیان کئے ہیں۔ [ابن کثیر]

مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا اور امام بھی کہتے ہیں، مگر ان کے طریقے پر چلنے کو ہدایت نہیں کہتے، اور اپنے خود ساختہ اور گمراہانہ عقائد کو ہدایت کہتے ہیں، اور دوسروں کو اس کی طرف دعوت دیتے

ہیں کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ یہودی یا نصرانی بن جاؤ، تو ہدایت پاؤ گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ انہیں یہ جواب دیں کہ ہم ملّتِ ابراہیمی کے پیروکار ہیں، جو کہ حنیف ہیں، ہر باطل سے اعراض کرنے والے، اور حق کے اتباع کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کی عقلوں کو مسخ کیا ہوا ہے، اور ان کی فہم وعقول پر عذاب کا پردہ ڈالا ہوا ہے، ان کو حق اور ملّتِ ابراہیمی کی حنفیت نظر نہیں آتی۔

فائدہ جلیلہ:

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اس سلسلے میں سات جگہ اسلام کا ذکر فرمایا:

(۱) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ۔(۲) اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ۔(۳) اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗ اَسْلِمْ۔(۴) قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔(۵) وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔(۶) وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ۔(۷) لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام ہے۔ گزشتہ امتوں میں جو لوگ اطاعت گزار اور فرمانبردار تھے، ان کی صفت بھی یہی اسلام تھی، مگر امتِ مسلمہ کا نام اور لقب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو عطا کیا گیا۔ پچھلی امتوں میں بھی اسلام لانے والے گزرے ہیں، مگر اسلام ان کا لقب نہ تھا، بلکہ صرف صفت تھا۔ ایک زمانہ میں دینِ حق کا لقب یہودیت رہا، اور ایک زمانہ میں نصرانیت وعیسائیت رہا۔ صفتِ اسلام سب میں مشترک رہی۔ سب اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار تھے، مگر امتِ مسلمہ کا لقب خاص سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو عطا کیا گیا، اور خیرِ امت کا لقب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو عطا ہوا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کے غلام تو سب ہی ہیں، مگر ایک غلام کا نام ہی غلام رکھ دیا جائے، تو صفت اور لقب دونوں جمع ہو جائیں گے۔ صفت بھی غلام اور نام ولقب بھی غلام۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیں کہ سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، مگر کوئی اللہ کا بندہ اپنا نام بھی عبد اللہ اور اللہ کا بندہ رکھے، تا کہ ہر وقت اس کی عبدیت اور غلامی سے لذت حاصل کرتا رہے، تو اس کی شان ہی دوسری ہے۔

یہ مبارک لقب سب سے پہلے ہمارے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تجویز فرمایا، جیسا کہ سورۂ حج میں ہے:

﴿مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ [الحج:۷۸] (تمہارے باپ ابراہیم کی ملت، انہوں نے تمہارا نام رکھا ہے مسلمان)۔ پس اس عظیم الشان لقب کا حق یہ ہے کہ ہم دل وجان سے اللہ تعالیٰ کے مطیع و

فرمانبردار بن جائیں، محض لفظِ مسلم اور لفظِ مؤمن پر قناعت نہ کریں۔ ؎

میم وداو میم ونون تشریف نیست ☆ لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست

(معارف کاندھلوی)

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

ترجمہ: (اے مسلمانو!) تم سب کہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی، اور جو چیز حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب (علیہم السلام)، اور ان کی اولاد پر اتاری گئی، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ، اور عیسیٰ اور دوسرے انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا، ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، اور ہم سب اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے والے، فرمانبردار ہیں ﴿۱۳۶﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیتوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم یہ کہہ دو کہ ہم یہودی اور نصرانی نہیں ہیں، بلکہ ہم ابراہیمی ملّت کے پیروکار ہیں۔ چند رکوع پہلے یہود کو توبیخ وزجر کے طور پر کہا گیا تھا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ [البقرۃ: ۸۵] چنانچہ انہیں بار بار تنبیہ کی گئی تھی کہ بعض حکموں کو ماننا، اور بعض کا انکار کرنا، اسی طرح انبیاء ورُسل علیہم السلام میں سے بعض کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا صریح کفر ہے، جیسے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے، اور نصاریٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں، اور یہ دونوں بشمولِ مشرکینِ عرب جناب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانتے۔ اس طرح کی تفریق بین الانبیاء علیہم السلام صریح کفر اور گمراہی ہے۔

ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ سارے انبیاء علیہم السلام پر ایمان ہو، اور بلاتفریق سب کی تصدیق ہو، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴾[النساء] (جولوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے، اور کہتے ہیں کہ کچھ (رسولوں) پر تو ہم ایمان لاتے ہیں، اور کچھ کا انکار کرتے ہیں، اور (اس طرح) وہ چاہتے ہیں کہ) کفر اور ایمان کے رمیان ایک بیچ کی راہ نکال لیں۔ ایسے لوگ صحیح معنی میں کافر ہیں، اور کافروں کے لئے ہم نے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے)۔

ان کے برخلاف اہلِ ایمان کے لئے یہ پیغامِ ہدایت بھی ہے، اور ان کے ایمان کی تعریف بھی۔

فرمایا:﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾[النساء: ۱۵۲] (اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے، اور ان میں سے کسی میں فرق نہ کیا (یعنی سب کو مانا) ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان (کی نیکیوں) کے صلے عطا فرمائے گا، اور خدا بخشنے والا مہربان ہے)۔

ان آیات کریمہ میں مسلمانوں کو طریقۂ ایمان کی تعلیم و تلقین فرما رہے ہیں کہ تم لوگ اپنے ایمان کو اس طرح ظاہر کر کے اعلان کرو کہ جو کچھ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترا، اس پر تفصیلاً ایمان لائیں، اور جو آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر اترا اس پر بھی اجمالاً ایمان لائیں۔ ان اگلے انبیاء کرام علیہم السلام میں سے بعض کے نام بھی ذکر ہوئے (جیسا کہ آیت کریمہ میں مذکور ہیں) اور باقی انبیاء علیہم السلام کا مجمل ذکر ہوا۔ ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان تفریق نہ کریں، کیونکہ ایک نبی کے انکار سے باقی سب کا انکار لازم آتا ہے، جو صریح کفر اور گمراہی ہے، کمامر۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب تورات کو عبرانی میں پڑھتے تھے، اور عربی میں تفسیر کر کے مسلمانوں کو سناتے تھے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی تصدیق یا تکذیب نہ کرو، یہ کہہ دیا کرو کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کی نازل کردہ کتابوں پر ہمارا ایمان ہے۔ اس بارے میں مزید معلومات کے لئے سورۃ آل عمران آیت ۸۰ تا ۸۸ کا مطالعہ کیا جائے۔

''اَلْاَسْبَاطُ'' کی تشریح:

اسباط حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کو کہتے ہیں، جو بارہ تھے، جن میں سے ہر ایک کی نسل میں بہت سے لوگ ہوئے۔ بنی اسماعیل کو قبائل کہتے تھے، اور بنی اسرائیل کو اسباط کہتے تھے۔

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک پوتے کا نام تھا، جوان

کے بارہ بیٹوں کی اولاد میں سے تھا۔صحیح بخاری میں ہے کہ اسباط سے مراد قبائل ہیں، جو بنی اسرائیل کہلائے۔ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی ہوتے تھے،جن پر وحی نازل ہوتی تھی، جیسے کہ فرمایا:﴿اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ﴾ [المائدة:۲۰] (ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں پیغمبر پیدا کیے)۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا﴾[الأعراف:۱۶۰] (اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر دیا تھا، الگ الگ جماعتیں) سبط دراصل تابع کو کہتے ہیں، یہ بھی ایک دوسرے کے پیچھے ایک تھے۔بعض کہتے ہیں کہ سبط کے معنی درخت کے ہیں، تو یہ لوگ بھی درخت کی شاخوں کی مانند پھیلے ہوئے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کُل انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل میں سے ہی ہوئے ہیں، سوائے دس انبیاء کے(آدم، نوح، ہود، صالح، شعیب، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور حضرت محمد مصطفیٰ صلواۃ اللہ وسلامہ علیہم)

''سبط'' کہتے ہیں اس جماعت اور قبیلہ کو جن کا مورثِ اعلیٰ اوپر جا کر ایک ہو۔یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمیں تورات وانجیل پر ایمان رکھنا ضروری ہے، لیکن عمل کے لئے صرف قرآن وحدیث ہی ہے۔ابن ابی حاتم میں ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: تورات، زبور، انجیل پر ایمان رکھو، لیکن عمل کے لئے قرآن حکیم کافی ہے۔جس سے تمام آسمانی کتابیں (باعتبارِ عمل) منسوخ ہو گئیں۔[ابن کثیر] ''لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَاوَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ''۔ حدیث پر کلام گزر گیا، وہاں دیکھا جائے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ: اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں، اور اگر منہ موڑیں تو خلاف میں رہیں، اللہ تعالیٰ ان سے عنقریب تمہاری کفایت کرے گا، وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے﴿۱۳۷﴾ رنگ دیا اللہ تعالیٰ نے اپنے رنگ میں، اللہ تعالیٰ سے اچھا رنگ کس کا ہوگا؟ ہم تو اسی کی عبادت کرنے والے ہیں﴿۱۳۸﴾

معارف ومنازل

نجات پانے کے لئے شرط پیش فرما رہے ہیں: پہلی شرط تو ایمان ہی ہے۔ دوسری شرط ایمان بھی تمہارے ایمان جیسا۔ یہ کتنی بڑی منقبت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کو لوگوں کے سامنے مثال ونمونہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے؟ اوران کے ایمان کو معیار کا درجہ دیا جارہا ہے کہ کسی کا ایمان اس شرط پر قبول ہوگا کہ آپ رضی اللہ عنہم لوگوں کے ایمان کی طرح خالص سچا اور بے غبار ہو، جس میں اتنی صداقت ہو کہ سارے برگزیدہ پیغمبروں علیہم السلام اوران پر نازل شدہ کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں کوئی ذرّہ بھر تفریق نہ ہو، اور یہ چیز تب ممکن ہوگی جب حسد، بغض وعناد سراسر دلوں سے خارج ہو۔

الحمدللہ! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اسی قسم کے عقائد وخیالات پر مشتمل ہوتا تھا۔ آج ہمارے دور میں ڈیڑھ ہزار سال گزرنے پر بھی امتِ مسلمہ کے اندر یہی عقیدت واحترام جلوہ افروز ہے۔ سارے انبیاء علیہم السلام کا ادب واحترام اوران کے ساتھ حسن عقیدت کے وہ جذبے ہمارے دلوں میں موجود ہیں، جن کا اندازہ نہیں۔

بڑے فخر اور بڑی مسرتوں کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کے بچوں کے نام موسیٰ، عیسیٰ، یحیٰ، زکریا، داؤد، سلیمان، اور بچیوں کے نام مریم، آسیہ، حمنہ، کلثوم، برکتہ آپ کو نظر آتے ہیں، اور قیامت تک آتے رہیں گے۔ برخلاف یہود ونصاریٰ، مغضوب وضالّین قوموں کے، کہ پورے مغرب میں اربوں یہودیوں اور عیسائیوں میں آپ کو ایک شخص ایسا نظر نہیں آئے گا، جس کا نام محمد یا اَحمد ہو، اسی طرح یہود کی پیداوار قوم روافض (شیعوں) میں کہیں بھی عمر، عثمان، ابوبکر نام کا آدمی نظر نہیں آئے گا۔

آیت کریمہ میں خطاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہے، کہ اے ایماندار اصحاب! اگر یہ کفار بھی تم جیسا ایمان لے آئیں، یعنی تمام رسولوں اور کتابوں کو مان لیں، تو ہدایت وکامرانی اور نجات پائیں گے، اور اگر باوجود قیامِ حجت کے پھر بھی اعراض کریں گے، تو یقیناً خلاف میں رہیں گے، اور حق سے دور رہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عداوت ومخالفت سے پریشان نہ ہوں، عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے شر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفایت کرلے گا، اور خود ہی ان سے نمٹ لے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، اسے ہر حال میں پورا ہونا ہے، چنانچہ یہ وعدہ مکمل (پورا) ہوگیا۔ کچھ یہود بنو قریظہ و بنو نضیر اور بنو قینقاع قتل ہوئے۔ کعب بن اشرف اپنے برے انجام کو پہنچا، باقی یہود جلاوطن ہوئے۔ نصاریٰ پر جزیہ مقرر ہوا۔ صنادید قریش غزوۂ بدر میں سارے مارے گئے۔ ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ کا مطلب پورا ہوا۔ الحمدللہ

نافع بن ابی نعیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کسی خلیفہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تلاوت والا قرآن پاک بھیجا گیا، زیاد نے یہ سن کر کہا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو باغیوں نے شہید کیا، اس وقت وہ تلاوت کر رہے تھے، اور یہ قرآن مجید ان کی گود میں تھا، اور آپ رضی اللہ عنہ کا خون ٹھیک ﴿ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ کی آیت پر پڑا تھا، کیا یہ صحیح ہے؟ حضرت نافع نے کہا بالکل ٹھیک ہے! میں نے خود اس آیت پر حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا خون دیکھا تھا۔ قرآن حکیم کا یہی نسخہ آج استنبول ترکی کے عجائب گھر میں شیشے کے خول میں محفوظ ہے۔

"صبغۃ اللہ" کا بیان:

"صبغۃ" کے معنی ہیں: رنگ چڑھانا، صباغ رنگساز کو کہتے ہیں۔ جس طرح عام چیزوں کی زینت اور خوبصورتی کی خاطر رنگساز مختلف قسم کے رنگ چڑھاتے ہیں، اسی طرح مذہب اور دین کا بھی ایک پختہ اور پائیدار رنگ ہوتا ہے۔ علماء کرام نے مختلف اعمال کے مختلف رنگ بتائے ہیں۔ توحید کا رنگ، اتباعِ شریعت کا رنگ، تصوف کا رنگ، علم کا رنگ، تلاوت قرآن کا رنگ اور حج وعمرہ کا رنگ۔ دراصل یہ رنگ ان مختلف اعمال میں انہماک اور پختگی کا روحانی اور معنوی رنگ ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے اپنے دوست کو یوں خطاب کیا: ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ میپوش ☆ من انداز قدت رامی شناسم

یہود ونصاریٰ اپنے بچوں کو ایک خاص مذہبی رنگ لگاتے تھے۔ پھر کہتے تھے کہ یہ بچہ اب پکا یہودی اور نصرانی بن گیا۔ اس کو وہ "اصطباغ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ان کا ایک مذہبی نشان ہوتا تھا۔ دنیا کے دیگر مذاہب ہنود اور سکھوں میں بھی یہی رائج ہے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ان کے تمام رنگوں کو کالعدم قرار دے کر توحید ورسالت اور ایمان والے رنگوں کو سب عارضی رنگوں پر غالب کر دیا۔ جو مذہبی، دینی رنگ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر چڑھائے گا، وہ اتنا پختہ اور پائیدار رہے گا کہ قیامت کے ہولناک دن میں بھی وہ رنگ جگمگاتا ہوا ظاہر ہوگا۔ "غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ"۔ اور ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾۔ [الفتح: ۲۹] سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے روز انہی رنگوں سے اپنی امت کی شناخت کریں گے۔

﴿وَنَحْنُ لَهٗ عَابِدُوْنَ﴾ یہ صرف انہی رنگوں پر دلیل ہے کہ یہ رنگ اخلاص، توحید، اتباعِ شریعت واتباعِ سنت والا رنگ ہوگا فقط۔ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ ترکیب میں فعلِ مقدر کا مفعول مطلق ہے، جیسے کہ سبحانَ اللہ میں ہے۔

اصل عبارت اس طرح ہے صَبَغَنَا اللّٰہُ صِبْغَۃً [بيضاوي، زمخشري، سيوطي] بہتر ترکیب یہی ہے۔اگر چہ علما، کرام اور مفسرین حضرات کے دیگر دو تین اقوال بھی ہیں۔فلیراجع

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَ ھُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ
وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ
الْاَسْبَاطَ کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ
کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ
خَلَتْ ۚ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے: کیا تم ہم سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑتے ہو؟ جو ہمارا اور تمہارا سب کا رب ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، ہم تو اسی کے لئے خلوص کرنے والے ہیں ﴿۱۳۹﴾ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ آپ کہہ دیں کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ؟ اللہ تعالیٰ کے پاس کی شہادت چھپانے والے سے زیادہ ظالم اور کون ہے؟ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ﴿۱۴۰﴾ یہ امت تھی جو گزر چکی، جو انہوں نے کیا ان کے لئے ہے، اور جو تم نے کیا تمہارے لئے ہے، تم ان کے اعمال سے سوال نہ کئے جاؤ گے ﴿۱۴۱﴾

معارف ومنازل

آیات کریمہ کے سیاق وسباق سے یہی روزِ روشن کی طرح ثابت ہورہا ہے کہ: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹] (حقیقی دین صرف دینِ اسلام ہے)۔اہلِ کتاب اور مشرکوں کے جھگڑے کو دفع کرنے کا حکم ربّ العلمین اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو کہو کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کی توحید، اخلاص واطاعت وغیرہ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ وہ صرف ہمارا ہی نہیں، بلکہ تمہارا بھی تو ربّ ہے، ہم پر اور تم پر قابض ومتصرف بھی وہی اکیلا ہے۔ہمارے عمل ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے عمل تمہیں کام آئیں گے۔ہم تم سے اور تمہارے شرک سے بیزار ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ﴾[یونس: ۴۱] یعنی یہ اگر تجھے جھٹلائیں، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیں کہ میرے لئے میرا عمل ہے، اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے۔ تم میرے نیک کام سے اور میں تمہارے برے اعمال سے بیزار ہوں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾[آل عمران: ۲۰] اگر یہ تجھ سے جھگڑا کریں، تو آپ کہہ دیں کہ میں نے اور میرے ماننے والوں نے اپنے منہ اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا: ﴿اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ﴾[الأنعام: ۸۰] (کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ﴾[البقرة: ۲۸۵] (تو نے اسے بھی دیکھا، جو ابراہیم علیہ السلام سے اس کے ربّ کے بارے میں جھگڑنے لگا) پس یہاں ان جھگڑالو لوگوں سے کہا گیا کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے، اور تمہارے اعمال تمہارے لئے، ہم تم سے بیزار، تم ہم سے الگ۔ ہم عبادت اور توجہ میں اخلاص اور یکسوئی کرنے والے لوگ ہیں۔

پھر ان لوگوں کے دعوے کی تردید ہو رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، وہ تو نزولِ تورات وانجیل اور یہودیت ونصرانیت سے ہزاروں سال پہلے گزر چکے ہیں۔ تم اے یہودیو، نصرانیو! کیوں افتراء کرتے ہو؟ کیا تمہارا علم اللہ تعالیٰ سے بڑھ گیا؟ اللہ تعالیٰ نے تو صاف اعلان فرمایا:﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾[آل عمران: ۶۷] (ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، نہ مشرک، بلکہ خالص مسلمان تھے)۔

یہود ونصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کی شہادت کو چھپا کر بڑا ظلم یہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب جو ان کے پاس آئی، اس میں انہوں نے پڑھا کہ حقیقی دین اسلام ہے۔ سید الاوّلین والآخرین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور برحق نبی ورسول ہیں۔ حضرت ابراہیم، اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام یہودیت ونصرانیت سے الگ ہیں، بلکہ یہودیت ونصرانیت کے نام تک سے بھی ناواقف ہیں۔ ان ظالموں نے یہ ساری باتیں چھپائیں، اور ان عظیم ہستیوں کو اپنے باطل ومنگھڑت عقائد میں شامل کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ تنبیہ کی کہ تمہارے سارے اعمال اللہ تعالیٰ پر پوشیدہ نہیں ہیں، اس کا علم تمام جہانوں کی ساری چیزوں پر محیط ہے، وہ روزِ قیامت ہر خیر وشر کا پورا پورا بدلہ دے گا، پھر فرمایا کہ یہ پاکباز

جماعت تو اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکی، تم جب تک ان کے نقش قدم پر نہ چلو، صرف ان کی اولاد میں ہونا تمہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ان کے اعمال میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہوگا، اور تمہاری بداعمالیوں کا ان پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ جو جیسا کرے گا، ویسا بھرے گا۔ جب تم نے ایک نبی اور اس کی کتاب کی تکذیب کی، تو گویا تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ساری کتابوں کی تکذیب کی، تم پر اتنا بڑا وبال آئے گا، جو نہایت خطرناک ہوگا، جبکہ تم نے خلاصۂ کائنات حبیب ربّ العٰلمین امام الانبیاء وسید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تکذیب کی، جن کی ذات وصفات پر اربوں کھربوں صلوٰۃ وسلام ہو، اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی ہوں۔

اَلْجُزْءُ الثَّانِيْ

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: عنقریب لوگوں میں سے بیوقوف ناداں لوگ کہیں گے کہ ان کو کس چیز نے ان کے قبلہ سے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر یہ تھے؟ آپ کہہ دیجئے: اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی راہنمائی کرتا ہے ﴿۱۴۲﴾ اور اسی طریقے سے ہم نے تمہیں ایک افضل امت بنایا ہے، تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو، اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو، اور نہیں بنایا ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ تھے مگر اس لئے تا کہ ہم ظاہر کردیں کہ کون رسول کی تابعداری کرتا ہے، ان لوگوں میں سے جو اپنی ایڑیوں پر پھرتے ہیں، اور بیشک! یہ بات بھاری ہے، مگران لوگوں پر کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کو ضائع کرنے والا نہیں ہے، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر شفیق اور نہایت ہی مہربان ہے ﴿۱۴۳﴾

معارف ومنازل

یہ آیت تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے آئندہ پیش آنے والے طعن اور اعتراض کی پہلے ہی سے خبر دے دی۔ اس آیت کے نزول کے وقت تک قبلہ تبدیل نہیں ہوا تھا، البتہ! تبدیل ہونے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کی خبر دے دی، تا کہ مسلمان یہود کے اعتراض کو سن کر نہ گھبرائیں۔

اکثر مفسرین کا یہی قول ہے، اور اس قول پر آیت کریمہ کے ربط کی تقریر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ گزشتہ آیات اور رکوعات میں یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے اُن اعتراضات کے جوابات دیئے گئے جو وہ کررہے تھے۔ اب اس آیت کریمہ میں اس اعتراض کا جواب بتلاتے ہیں، جو آئندہ چل کر وہ کرنے والے تھے، اور مطلب یہ ہے کہ اب تک تو یہود ونصاریٰ اور مشرکین تم پر وہی اعتراض کرتے تھے، جو بیان ہو چکے۔ اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے

کہ جب تم کوتحویلِ قبلہ کا حکم دیا جائے گا،تو یہ سفیہ اور بیوقوف، ہٹ دھرم لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ کیا دین ہے، جس کا قبلہ بدلتا رہتا ہے؟اور وہ یہ بھی کہیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے سابقہ قبلہ (بیت المقدس) کو کیوں چھوڑ دیا؟

فائدہ:

اس سے پہلے ملت ابراہیمی اور بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بیت اللہ شریف حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہم السلام اوران کی اولاد کا قبلہ رہا۔ قیامِ مکہ مکرمہ کے دوران سرور کائنات ﷺ کا قبلہ بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں ہی تھے۔ بعض مفسرین وعلماء حدیث کہتے ہیں کہ آپ ﷺ مکی زندگی میں حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز ادا فرماتے تھے، اس طرح قبلتین کا بآسانی استقبال ہوتا تھا، اور مکی زندگی میں ہمیشہ آپ ﷺ کا یہی معمول رہا۔ ہجرت کے بعد مدنی زندگی میں ایسا کرنا ممکن نہیں رہا، تو آپ ﷺ نے یہود کی تالیفِ قلوب کی خاطر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ سولہ، سترہ ماہ صرف بیت المقدس کا استقبال فرمایا، کیونکہ آپ ﷺ نے معراج کی رات بیت المقدس کا سفر کیا تھا، اور بیت المقدس بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کا قبلہ بھی رہا ہے۔ اس دوران آپ ﷺ کو ہمیشہ طمع رہا کہ کسی نہ کسی وقت ضرور مجھے کعبۃ اللہ کے استقبال کا حکم ہوگا، جو کہ پورے عالم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ رہا، جیسے ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ آیت کے تحت ذکر ہوگا۔

صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف استقبال کر کے نماز پڑھی۔ آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ آپ ﷺ کا قبلہ خانہ کعبہ ہو، چنانچہ حکم ملنے کے بعد آپ ﷺ نے کعبہ کی طرف منہ کر کے پہلی نماز عصر کی پڑھی، جن لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں سے ایک شخص ایک مسجد کے پاس سے گزرا، وہاں لوگ رکوع میں تھے، اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! میں نے کعبہ کی طرف رخ کر کے سید عالم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ یہ سن کر وہ لوگ اسی حالت میں کعبہ کی طرف گھوم گئے۔ (إلی آخر الحدیث)

اہلِ کتاب نے بیوقوفی اور ضد وعناد کی وجہ سے جب تحویلِ قبلہ پر اعتراض کیا، تو اللہ تعالیٰ نے آیت:
﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ نازل فرمائی۔

جب سرور عالم ﷺ نے سولہ سترہ ماہ بیت المقدس کا استقبال کیا تھا، تو یہودی بہت خوش تھے، اب تحویلِ

قبلہ نے انہیں نہایت پریشانی میں ڈال دیا۔ اور وہ معترض ہوئے، اور بڑا واویلا مچانا شروع کیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ مشرق اور مغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس بارے میں کافی احادیث مروی ہیں کہ آپ ﷺ استقبالِ کعبہ کے ہمیشہ خواستگار رہتے تھے، بالآخر آپ ﷺ کی دعا قبول ہوئی۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ پہلی نماز جو کعبہ کی طرف آپ ﷺ نے ادا کی وہ نمازِ ظہر تھی۔ تطبیق یہ ہے کہ نمازِ ظہر کی ادائیگی قبیلۂ بنی سلمہ کی مسجد میں ہوئی، اور عصر کی نماز مسجد نبوی میں ادا کی گئی۔ وہ اس طرح کہ آپ ﷺ بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے بنی سلمہ تشریف لے گئے تھے، وہاں ظہر کی نماز کے اندر تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا، دو رکعت بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی تھیں، باقی دو رکعت کعبہ کی طرف آپ ﷺ نے منہ کر کے ادا فرمائی، اسی وجہ سے اس مسجد کا نام ''مسجد قبلتین'' مشہور ہوا۔

اب باطل پرست اور کمزور عقیدے والے لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا کر طرح طرح کے اعتراضات شروع کئے۔ اللہ جل جلالہ نے انہیں جواب دیا کہ حکم، تصرف اور ہر قسم کا اختیار اللہ تعالیٰ مالک الملک کا ہے، جدھر منہ کرو، اسی طرف اس کا رُخ ہے۔ بھلائی اسی میں نہیں ہے، بلکہ اصل تو ایمان کی مضبوطی ہے، جو ہر حکم کے ماننے پر مجبور کر دیتی ہے، اور اس میں گویا مؤمنوں کو ادب سکھایا گیا ہے کہ ان کا کام صرف حکم کی تعمیل اور فرمان کی بجا آوری ہے، جدھر انہیں استقبال کا حکم دیا جائے، یہ فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اطاعت کے معنی اللہ تعالیٰ کی حکم برداری کے ہیں۔ اگر وہ ایک دن میں سو مرتبہ ہر طرف گھمائے، تو ہم بغیر حیلہ و حجت کے بخوشی گھوم جائیں گے، ہم اس کے غلام ہیں، ہم اس کے ماتحت ہیں، اس کے فرمانبردار اور اس کے خادم ہیں، جس سمت کا وہ حکم دیں گے ہم سعادت سمجھ کر منہ پھیر لیں گے۔ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ انہیں حضرت خلیل الرحمن علیہ السلام کے قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا جو اسی اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ کے نام پر بنا ہے، اور جسے تمام تر فضیلتیں حاصل ہیں۔

مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ یہودیوں کو ہم سے اس بات پر بڑا حسد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جمعۃ المبارک کا بابرکت دن نصیب فرمایا، اور یہ لوگ اس سے بھٹک گئے، اور اس پر بھی کہ ہمارا قبلہ کعبہ ہے، اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے، اور بڑا حسد ان کو ہماری آمین کہنے پر بھی ہے، جو ہم امام کے پیچھے کہتے ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا کہ اس پسندیدہ قبلہ کی طرف تمہیں متوجہ کرنا اس لئے ہے کہ تم خود بھی پسندیدہ امت ہو، اور تم

دوسری امتوں پر قیامت کے دن گواہ بنو گے، کیونکہ وہ سب تمہاری فضیلت کو مانتے ہیں۔ **وسط** کے معنی یہاں بہتر اور عمدہ کے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ قریش نسب کے اعتبار سے وسط عرب ہیں، اور کہا گیا ہے کہ سرور عالم ﷺ اپنی قوم میں وسط ہیں، یعنی اشرف نسب والے، اور صلوٰۃِ وسطیٰ، یعنی افضل ترنماز جو عصر ہے، جیسے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اور چونکہ تمام امتوں میں یہ امت بہتر افضل اور اعلیٰ ہے، اس لئے اسے شریعت بھی کامل ملی، راستہ بھی بالکل درست ملا، اور دین بھی نہایت واضح دیا گیا، جیسے فرمان ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ [الحج:۷۸] (اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے) اللہ تعالیٰ نے تمہیں چن لیا، اور تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تم ہو، اس نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے، اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی، تا کہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ بنو۔ **الحمدللہ**

مسند احمد میں ہے کہ سرور دو عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کو قیامت کے دن بلایا جائے گا، اور ان سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا تم نے میرا پیغام میرے بندوں کو پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں یا اللہ! پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی امت کو بلایا جائے گا، اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا نوح (علیہ السلام) نے میری باتیں تمہیں پہنچائی تھیں؟ وہ صاف انکار کریں گے، اور کہیں گے: ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ تمہاری امت انکار کرتی ہے، تم گواہ پیش کرو، وہ کہیں گے: ہاں! محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت میری گواہ ہے۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [الآیة] (اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا ہے، تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو) وسط کے معنی عدل کے ہیں، اب تمہیں بلایا جائے گا، اور تم گواہی دو گے، اور میں تم پر گواہی دوں گا۔ یہ حدیث صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

مسند احمد کی دوسری روایت میں ہے کہ ان (امت محمدیہ ﷺ) سے کہا جائے گا کہ تم لوگ تو بعد میں آئے، تمہیں کیسے علم ہوا؟ یہ جواب دیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نبی آئے ﷺ، اور آپ ﷺ نے خبر دی کہ انبیاء علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی اپنی امتوں کو پہنچایا تھا۔ یہی مطلب ہے آیت کریمہ کا۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں **وَسَطاً** بمعنی عدلًا آیا ہے۔

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم میں ہے کہ سرور کونین ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اور میری امت قیامت

کے دن ایک اونچے ٹیلے پر ہوں گے۔ تمام مخلوقات میں نمایاں ہوں گے اور سب کو دیکھ رہے ہوں گے، اس روز تمام خلقت تمنا کرے گی کہ کاش! وہ بھی ہم میں سے ہوتی، جس جس نبی کی قوم نے اپنے نبی کو جھٹلایا ہے، ہم ربّ العلمین کے دربار میں شہادت دیں گے کہ ان تمام انبیاء علیہم السلام نے حقِ رسالت ادا کیا تھا۔ [ابن کثیر]

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب "کتاب الزھد" میں ایک حدیث تخریج کی ہے، جس سے مذکورہ گواہی کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے روز جب سب لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوں گے، اور مقدمہ چلے گا، تو سب سے پہلے اللہ ربّ العزّت اسرافیل علیہ السلام سے پوچھیں گے: کیا تم نے میری امانت ادا کردی؟ اسرافیل علیہ السلام عرض کریں گے کہ ہاں! باری تعالیٰ! میں نے وہ امانت جبرئیل علیہ السلام کو پہنچادی، پھر جبرئیل علیہ السلام کو طلب کر کے ان پوچھا جائے گا کہ کیا اسرافیل علیہ السلام نے میری امانت تم تک پہنچادی؟ وہ اقرار کریں گے: ہاں! اسرافیل علیہ السلام نے وہ امانت مجھ تک پہنچادی۔ چنانچہ اسرافیل علیہ السلام کو چھوڑ دیا جائے گا، اور جبرئیل علیہ السلام سے مزید سوال ہوگا کہ تم نے میری امانت کے ساتھ کیا کیا؟ وہ عرض کریں گے: اے باری تعالیٰ! میں نے تیری امانت تیرے رسولوں علیہم السلام تک پہنچادی۔

اب رسولوں کو طلب کر کے پوچھا جائے گا کہ کیا جبرئیل (علیہ السلام) نے میری امانت تم تک پہنچادی؟ تو رسول (علیہم السلام) بھی عرض کریں گے: ہاں ہمارے ربِ جلیل! جبرئیل علیہ السلام نے تیری امانت ہم تک پہنچادی، چنانچہ جبرئیل علیہ السلام کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اب انبیاء علیہم السلام سے مزید سوال ہوگا کہ تم نے اس امانت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ رسول (علیہ السلام) عرض کریں گے: ہم نے تیرا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچادیا۔ پھر امتوں کو طلب کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا: کیا میرے پیغمبروں نے میری امانت تم تک پہنچادی؟ "فَمِنۡهُمُ الۡمُصَدِّقُ وَمِنۡهُمُ الۡمُكَذِّبُ"۔ بعض امتیں تصدیق کریں گی، اور بعض تکذیب، یعنی انکار کریں گی کہ: ﴿مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِیۡرٍ وَّلَا نَذِیۡرٍ﴾ [المائدة: ۱۹] (ہمارے پاس نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا، اور نہ ڈرانے والا) یعنی ہم تک وہ امانت نہیں پہنچی۔

پس انکار کرنے والی امتوں کے نبیوں علیہم السلام سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس کوئی گواہ ہے کہ واقعی تم نے امانتیں اپنی امتوں تک پہنچادی ہیں؟ گواہ پیش کرو، تو انبیاء علیہم السلام گواہی کے لئے سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا نام پیش کریں گے، تو امت محمدیہ کو طلب کر کے پوچھا جائے گا، تو وہ لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انبیاء علیہم السلام نے آپ کی امانت اپنی اپنی امتوں تک پہنچادی۔ وہ امتیں اس گواہی کا انکار کریں گی کہ باری تعالیٰ! یہ لوگ ہمارے

زمانہ میں نہیں تھے، ہم ان کو بالکل نہیں پہچانتے! پھر یہ ہمارے خلاف کیسے گواہی دے سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ پھر دریافت فرمائے گا: اے امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لوگو! تم ان کی گواہی کیسے دیتے ہو، جبکہ تم تو ان کے زمانے میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے؟ تو لوگ عرض کریں گے: یا اللہ! تو نے ہمارے پاس آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجا، اور اس پر آخری کتاب نازل فرمائی۔ تیرے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تیری آخری کتاب نے بتادیا: ﴿اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ [الجن:۲۸] (کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغام پہنچادیئے ہیں، اور (یوں تو) اس نے ان کی سب چیزوں کو ہر طرف سے قابو کر رکھا ہے) لہٰذا ہم اس یقین کے ساتھ گواہی دیتے ہیں کہ واقعی تیرے انبیاء کرام علیہم السلام نے تیرا پیغام امتوں تک پہنچادیا۔

اس کے بعد اپنی امت کے تزکیہ کے لئے ربّ العزّت عزّ مجدہٗ حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھڑا کرے گا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کا تزکیہ کریں گے، کہ یہ لوگ صحیح برحق گواہی دے رہے ہیں، اسی کے متعلق فرمایا: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ [النساء:۴۱] (بھلا اس دن کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے، اور تم کو ان لوگوں کا حال (بتانے کو) بطورِ گواہ طلب کریں گے)۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا﴾ [الآیة] آگے ایک شبہ کا ازالہ فرماتے ہیں، کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ اس امتِ متوسطہ کاملہ کے لئے مناسب یہی قبلۂ کاملہ ہے، جو کہ وسطِ ارض میں ہے، جسے ''اُمّ الارض، اور اُمّ القریٰ'' کا لقب دیا گیا ہے، اور سارے انبیاء علیہم السلام کا قبلہ بھی ہے، تو پھر اس میں کیا حکمت و مصلحت تھی کہ چند ماہ کے لئے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا گیا، اور پھر اسے منسوخ کر لیا گیا؟

آئندہ اور موجودہ آیت میں اسی کا جواب دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی میں تمہارا وہی قبلہ ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ چلا آرہا تھا، فرمایا: جس قبلہ (بیت المقدس) کی طرف چند ماہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز ادا کرتے رہے، اس کو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصلی قبلہ نہیں بنایا تھا، مگر صرف اس مصلحت کے لئے تاکہ معلوم اور ظاہر ہوجائے کہ کون رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتا ہے، اور کون تصدیق کی بجائے تکذیب اور انکار کرتا ہے؟ اور حق سے پھر جاتا ہے۔

یعنی بجائے کعبۃ اللہ شریف کے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانانِ قریش کا امتحان مقصود تھا کہ کون رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا فرمانبردار ہے، کہ جس قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں، بلا تأمل اسی طرف نماز

پڑھتا ہے؟ اور کون قومی حمیت کی رعایت کرتا ہے؟ اس لئے کہ قریش کعبۃ اللہ کی تعظیم پر فخر کرتے تھے، اور قبلۂ ابراہیمی کی مجاورت اور خدمت پر ناز کرتے تھے، اور بنی اسرائیل کے قبلہ بیت المقدس سے نفرت کرتے تھے۔

اللہ جل جلالہ نے اس قومی حمیت کے امتحان کے لئے بجائے خانہ کعبہ کے بیت المقدس کے استقبال کا حکم دیا، یعنی بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانانِ قریش کا امتحان تھا، اور چونکہ یہ دونوں حکم انسانی نفوس پر شاق اور گراں تھے، اس لئے فرمایا:﴿وَاِنۡ کَانَتۡ لَکَبِیۡرَۃً﴾ [الآیۃ] بیشک! بیت المقدس کا استقبال قریش اور عرب پر بوجہِ اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہونے کے سخت گراں تھا، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا، انہیں مکمل اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نصیب فرمایا، اور اللہ تعالیٰ کے حکموں پر انہیں بغیرِ چون وچرا تعمیل کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے لئے احکامِ الٰہیہ پر چلنا اور سرِ تسلیم خم کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ جدھر بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا، اسی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

اُخص الخواص حضرات اپنے ذوقِ سلیم سے یہ خیال کرتے تھے کہ اگرچہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے افضل ہے، مگر چونکہ حضرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے کمالات کے جامع ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام القبلتین بھی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تمام اقوامِ عالم اور پوری کی پوری خلقت کے لئے ہے، اس لئے یہ لوگ اپنی فطرت اور نورِ فراست سے سمجھتے تھے کہ یہ ضروری ہے کہ کسی بھی وقت استقبالِ کعبہ کی نوبت آئے گی، اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اصل قبلہ کعبہ شریف کی طرف رجوع ہوگا، جو کہ افضل الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے مناسب ہے۔

تحویلِ قبلہ سے متعلق اہلِ کتاب کا ایک اعتراض یہ تھا کہ جو لوگ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے سے پہلے فوت ہو گئے ہیں، انہیں تو کعبہ کی طرف رُخ کرنے اور نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا، وہ بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، لہٰذا اس نئے حکم کی روشنی میں ایسے لوگوں کی نمازوں کی کیا حیثیت ہوگی؟ وہ مقبول ہوں گی یا نہیں؟ اس اعتراض کے جواب میں فرمایا:

﴿وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ ایسے لوگوں کے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ایمان سے مراد نماز ہے، تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی نمازیں ضائع نہیں کرے گا، جو لوگ تحویلِ قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے، ان پر کوئی گناہ نہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھی ہیں، اگر وہ تحویلِ قبلہ کا زمانہ پالیتے، تو بلا حیلہ وحجت کعبہ کا استقبال کرتے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ﴾ (بیشک! اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور بیحد مہربان

ہے)۔ سابقہ لوگوں نے جو نمازیں پڑھی ہیں، وہ اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کے حکم کے مطابق صحیح طریقے سے ادا کی ہیں، لہٰذا ان کی نمازیں مقبول ہیں۔ ان پر کسی قسم کا الزام نہیں ہے۔ اس قسم کا معاملہ شرابیوں کے متعلق سورۂ مائدہ میں آئے گا کہ جن لوگوں نے حرمتِ شراب سے پہلے شراب نوشی کی تھی، اور وہ فوت ہو گئے، یا شہید ہو گئے، ان کا کیا بنے گا؟ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ جس وقت ایک چیز حرام نہیں تھی، اس وقت اس کے استعمال سے کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔ ہاں! کوئی شخص حرمتِ شراب کے حکم کے آجانے کے بعد اسے پیئے گا، تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائے گا۔

ان دونوں باتوں پر تنبیہ کی خاطر ارشاد ہے کہ ربّ العزّت بڑے مہربان اور شفیق ہیں۔ جب وہ سارے گناہوں کو توبہ سے معاف کر سکتا ہے، تو جہاں گناہ ہی نہ ہو، محض خدشہ اور خوف کا معاملہ ہو، وہاں اس کی شفقت اور مہربانیوں کا کیا کہنا!!

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس آیت سے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے والوں کی اُعلیٰ ایمانداری ثابت ہوئی، انہیں دو قبلوں کی طرف نماز پڑھنے کا ثواب ملے گا۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ترجمہ: تحقیق ہم آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف (بار بار) پلٹنا دیکھتے ہیں، پس ہم آپ کو پھیر دیں گے اس قبلے کو جس کو آپ پسند کرتے ہیں، پس اب پھیر دیں آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف، پھر جہاں بھی آپ ہوں پس پھیر دیں اپنے چہروں کو اس کی طرف، اور بیشک! وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی، البتہ! جانتے ہیں کہ یہ حق ہے، ان کے ربّ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے غافل نہیں ہے جن کو یہ کرتے ہیں ﴿۱۴۴﴾

معارف ومنازل

بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی حکمتیں اور وجوہات بکثرت ہیں، گزشتہ مضامین سے بخوبی اندازہ ہو گیا

ہے، چونکہ سرورِ عالم ﷺ کی بعثت قومی نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے، سارے جہانوں کے لئے ہے، اور یہی حیثیت کعبۃ اللہ شریف کی بھی ہے۔ پس آپ ﷺ کا قبلہ وہی ہوگا، جس کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کے پیشرو جدِ اکبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا قبلہ یہی کعبۃ اللہ شریف رہا، اور آپ ﷺ صحیح معنوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہیں، اور ان کے جانشیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ ﷺ سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے امام اور پوری خلقت سے افضل و برگزیدہ ہیں۔

جب مدنی زندگی کے شروع میں آپ ﷺ کو کسی مصلحت کے ساتھ بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا تھا، وہ ایک عارضی امر تھا۔ معراج سے واپسی پر پانچ نمازوں کے اوقات اور طریقۂ ادائیگی کی تعلیم کی خاطر مسلسل دو دن حضرت جبرائیل علیہ السلام نے تشریف لاکر آپ ﷺ کی امامت کی، وہ جگہ ابھی بھی موجود ہے، جس پر سیاہ رنگ کا پتھر نشان کے طور پر لگا ہوا نصب ہے۔ ان دو دن کی دس نمازوں میں آپ ﷺ کا قبلہ کعبۃ اللہ ہی رہا، جہاں بیت المقدس داہنے ہاتھ کی سمت میں واقع ہے، اس کی طرف استقبال کی کوئی وجہ نہیں۔

چونکہ آپ ﷺ سب کے نبی ہیں، اور تمام جہات آپ ﷺ کی نبوت سے مشرف ہیں، اور آپ ﷺ امام القبلتین بھی ہیں، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے آپ ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا، اسی اثناء آپ ﷺ ہر وقت کعبہ کے استقبال کے لئے بیتاب اور خواہشمند رہے۔ بار بار آپ ﷺ نزولِ وحی کی خاطر آسمان کی طرف چہرہ مبارک اور رخ پھیرتے رہے اور نظر مبارک اوپر گھماتے رہتے تھے، حالانکہ آپ ﷺ کی عام عادت آسمان کی طرف دیکھنے کی نہیں ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کی نگاہ مبارک ہمیشہ زمین پر پستی میں دیکھنے کی طرف ہوتی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ ﷺ کی دیرینہ اور روزمرہ کی خواہش کو قبولیت سے نوازا اور آپ ﷺ کو حسبِ خواہش قیامت تک کے لئے استقبالِ کعبہ کا حکم دیا گیا۔ فرمایا:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ﴾ تحقیق ہم آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھتے ہیں، اب مزید دیر نہیں ہوسکتی، ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ﴾ آپ فوری طور پر مسجد الحرام کی طرف اپنا رُخ پھیر لیں، اور امت کو اطلاع کردیں کہ: ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ (اور جہاں بھی ہوں آپ لوگ پھیر دیں اپنے چہروں کو اس کی طرف)۔ بالفرض! اگر کوئی مسلمان بیت المقدس کے پاس، یا مسجدِ اقصیٰ کے اندر ہوگا، اس کو بھی کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کرنے کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔

تاریخ گواہ ہے کہ سینکڑوں سال مسجد اقصیٰ مسلمان امت کی تحویل میں رہی، اور نمازوں میں کعبۃ اللہ کا استقبال ہوتا رہا۔ پھر فرمایا کہ اہلِ کتاب کو یہ سب کچھ معلوم ہے، اور یہ بات ان کی کتابوں میں درج ہے کہ بین الاقوامی قبلہ کعبۃ اللہ ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ملّتِ اسلام کے اصلی وارث حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بھی کعبۃ اللہ ہے، مگر ان ہٹ دھرم لوگوں نے بغض وعناد کی وجہ سے جس طرح ہزاروں احکامِ شریعت کے اندر تحریف کی، اور انہیں چھپالیا، وہاں انہوں نے قبلہ کے متعلق احکامات بھی چھپا کر تبدیل کر لیے، اللہ تعالیٰ ان کے عناد و عداوت کی انہیں روزِ قیامت پوری پوری جزاء دے گا، اور اس کے علمِ محیط سے کوئی ذرّہ نہیں چھپے گا۔

شَطْر کے معنی یہاں جانب اور طرف کے ہیں۔ شَطْر کے معنی نصف اور جزء بھی ہیں، جیسے "اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ"۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے: "اِنِّیْ اَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنُوْا شَطْرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ"۔ مجھے امید ہے کہ جنت میں جانے والے لوگوں کی نصف تعداد تمہاری ہوگی۔ [متفق علیه]

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ
اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ
فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

ترجمہ: اور اگر آپ ان لوگوں کے پاس جن کو کتاب دی گئی ہے ہر قسم کی نشانی بھی لائیں تو وہ پھر بھی آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے، اور آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں، اور نہ ان میں سے بعض، بعض کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے ہیں، اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کا اتباع کیا اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے، تو بیشک آپ اُس وقت ناانصافوں میں سے ہوں گے ﴿۱۴۵﴾ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں، اور بیشک ایک گروہ ان میں البتہ حق کو چھپاتا ہے، اور وہ جانتے ہیں ﴿۱۴۶﴾ حق تیرے ربّ کی طرف سے ہے، پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں ﴿۱۴۷﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

سورۃ البقرہ آیت ۴۰ سے آیت ۱۲۳ تک بنی اسرائیل کے چالیس مفسدات اور خباثتوں کی تفصیلات کا بیان گزر گیا، جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے مغضوب وملعون قرار دیا ہو، اس سے کسی خیر وہدایت کی امید رکھنا عبث ہے۔ اس ملعون قوم نے حضرت حق سبحانہ کی شان میں گستاخی کر کے یہ کہا تھا: ﴿يَدُ اللهِ مَغْلُوْلَةٌ ﴾[المائدة:٦٤] (اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے) یا یہ کہ ﴿اِنَّ اللهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاءُ﴾[آل عمران:١٨١] (اللہ فقیر ہے، اور ہم مالدار ہیں) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بے شمار تکالیف پہنچائیں، جنہیں سن کر دماغ ناکارہ ہوجاتا ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو انہوں نے بلاوجہ قتل کیا۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے چارسو پیغمبروں کے قتل کا قول نقل کیا ہے۔

یہ قوم جب پیغمبر آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم، نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تسلیم کرنے کی منکر ہے، یہ قوم جب صاحب قبلہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں، کعبہ شریف کو قبلہ کیا مانے؟ اس لئے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ (سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم) ان اہلِ کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی (معجزات اور دلائل) بھی لے آئیں، تو اہلِ کتاب آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا ایمان ویقین نہیں، تو آپ کے قبلہ پر کیا اعتماد ہوگا!! اور وہ جس طرح آپ کے قبلہ سے منحرف ہیں، اسی طرح ان کے آپس میں بھی نہیں بنتی، جیسے فرمایا: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾[البقرة:١٣١] (اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی راستے پر نہیں ہیں، اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی راستے پر نہیں ہیں)۔

جس طرح یہ ایک دوسرے کے دین اور نبی کو نہیں مانتے، اسی طرح ایک دوسرے کے قبلہ کو بھی وہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس ہے، اور نصاریٰ کا صخرہ پتھر ہے، اور ہر ایک اپنے قبلہ پر جما ہوا ہے، حالانکہ یہ دونوں بنی اسرائیل (اولاد یعقوب علیہ السلام) ہیں، مگر تعصب اور کفر وعناد میں ایک دوسرے سے آگے آگے ہیں۔ اسی پر فرمایا:

﴿مَاتَبِعُوْاقِبْلَتَكَ وَمَآاَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَابَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾[الآیة]۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں، کیونکہ ان کے قبلہ کا استقبال منسوخ ہوچکا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ ہمیشہ کے لئے ہے، جو کبھی منسوخ نہیں ہوگا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں، عقلاً ونقلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان کے قبلہ کا استقبال محال ہے، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم شرک اور دیگر معاصی سے بری الذمہ، بیزار اور پاک

ہیں، اسی طرح ان کا اتباع سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پاک ہیں، نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدانخواستہ بے انصاف لوگوں میں شامل رہیں گے، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں یہ محال ہے، توان کا اتباع بھی محال ہی ہوگا۔

یہ مسئلہ اسی طرح فرضی ہے، جس طرح ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾[الزمر:۶۵] (اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کا عمل اکارت ہوجائے گا)۔ فرضی چیزیں حقیقی اورنفس الامری نہیں ہوتیں، خارج میں ان کا وجود نہیں ہوتا، محض کسی شرعی حکم کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لئے انہیں ذکر کیا جاتا ہے، اسی لئے فرمایا: بالفرض! اگر آپ نے ان کی خواہشات کا اتباع کیا، یا انہیں راضی کرنے کے لئے ان کی بات مان لی، بعد اس کے کہ آپ کے پاس علمِ قطعی اور یقینی حکم آچکا ہے، تو پھر آپ کے لئے بڑی بے انصافی کی بات ہوگی۔ الحمدللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے انصافی سے جب مکمل پاک ہیں، تو اتباع سے بھی پاک رہیں گے۔

فائدہ جلیلہ:

قبلہ کے معنی سمجھنے کے بعد اب واضح ہو کہ اکثر لوگ احتراما والدین، پیر و مرشد اور استاذ کو بھی قبلہ کہا کرتے ہیں، اور کچھ لوگ اپنے لئے بہت سی دنیوی چیزوں کو قبلہ کا درجہ دے کر ان پر بڑے شوق سے فدا اور قربان ہوتے ہیں، پس مثنوی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ میں درج لوگوں کے مختلف قبلوں کا یہاں بیان ہوجانا فائدہ سے خالی نہیں، فرماتے ہیں:

قبلہ شاہان بود تاج و کمر	☆ بادشاہوں کا قبلہ تاج وتخت اور سنہرا پٹہ ہوتا ہے۔
قبلہ ارباب دنیا سیم و زر	☆ دنیاداروں کا قبلہ سونا چاندی ہے۔
قبلہ صورت پرستان آب و گل	☆ حسن پرست کا قبلہ پانی اور مٹی سے بنا ہوا بت ہے۔
قبلہ معنی شناسان جان و دل	☆ پرہیزگاروں کا قبلہ جان و دل کی صفائی ہے۔
قبلہ زُہاد محراب قبول	☆ عابد و زاہد لوگوں کا قبلہ مسجد اور محراب ہے۔
قبلہ بدسیرتان کار فضول	☆ بے دین لوگوں کا قبلہ بدعملی و بداخلاقی ہے۔
قبلہ تن پروران خواب و خورش	☆ پیٹ کے پجاریوں کا قبلہ تن پروری اور خوراک وخواب ہے۔
قبلہ انسان بدانش پرورش	☆ صحیح معنی میں انسانوں کا قبلہ عقل و دانشمندی ہے۔
قبلہ عاشق وصال بے زوال	☆ عاشق کا قبلہ وہ وصال ہے جس پر زوال کا خطرہ نہیں۔
قبلہ عارف جمال ذوالجلال	☆ بندگان خدا عارفوں کا قبلہ دیدار الٰہی ہے۔

قبلہ اصحاب منصب مال وجاہ ☆ اقتدار کے بھوکوں کا قبلہ مال وجاہ اور کرسی ہے۔

قبلہ اہل سلوک اسباب راہ ☆ ارباب سلوک کا قبلہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے اسباب ہیں۔

قبلہ حرص واہل باشد ہوا ☆ حرص ولالچ کے بندوں کا قبلہ ان کی خواہشات ہیں۔

قبلہ قانع توکل بر خدا ☆ قناعت کرنے والوں کا قبلہ توکل علی اللہ ہے۔

قبلہ ارباب علم قرآن بود ☆ علماء کرام کا قبلہ قرآن کریم ہے۔

قبلہ جاہل ہمہ شیطان بود ☆ جاہلوں کا قبلہ مکمل اتباع شیطان ہے۔

اللہ ربّ العزت سبحانہ نے فرمایا:﴿وَلِكُلٍّ وِّ جْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا ﴾(اور ہر ایک لئے جہت ہے وہ اس کی طرف اپنا رخ کرنے والا ہے) جس کا بیان آنے والا ہے، اسی طرح ہر طبقہ کا قبلہ دوسرے سے الگ ہے۔کوئی اپنے قبلہ کو چھوڑ کر دوسروں کے قبلہ کی اتباع کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہ سارے قبلے انسانوں کے اپنے مقرر کردہ ہیں، انہیں شرعی قبلہ نہیں کہا جاسکتا، شرعی قبلہ وہی ایک کعبہ شریفہ ہی ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوب جانتے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں کہ یہ وہی برحق نبی ہیں، جن کی توریت اور انجیل میں بشارت دی گئی ہے۔ یہ اہلِ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل وصورت، حلیہ، گفتار، رفتار اور اعمالِ صالحہ کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو دیکھ کر انہیں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوتا۔ مگر حسد وعناد کی وجہ سے سب کچھ جاننے کے باوجود تسلیم نہیں کرتے اور تمام حقائق کو چھپا کر لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ان کی زبان پر مہر لگ چکی ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، اور بہت بڑے جلیل القدر صحابہ میں ان کا شمار ہے۔ یہ یہود کے بڑے پایہ کے علماء میں سے تھے۔ ہجرت کے اوّل ایام میں مشرّف باسلام ہوئے۔ ایک روز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم حضرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہو؟ تو جواب دیا: ہاں! بیٹوں سے زیادہ پہچانتے ہیں، بیٹوں میں تو شک ہوسکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو، مگر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ذرّہ برابر بھی شک نہیں ہوسکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل وصورت، قدوقامت، حلیہ اور تمام صفات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلی ملاقات میں، میں نے پہچان لیا، اور اسی مجلس میں اسلام قبول کیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: بیشک! اللہ تعالیٰ کا فرمان برحق ہے، اور شکر ہے کہ آپ کو توفیق حاصل ہوئی۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۫ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۫ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

ترجمہ: اور ہر ایک کے لئے جہت ہے، وہ اس کی طرف اپنا رخ کرنے والا ہے، پس سبقت کرو نیکیوں کی طرف تم جہاں بھی ہو، تم سب کو اللہ تعالیٰ اکٹھا کر کے لائے گا، بیشک! اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۱۴۸﴾ اور جس جگہ بھی آپ کہیں نکلیں پس اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں، اور بیشک! یہ حق ہے آپ کے ربّ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے غافل نہیں ہے، جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۹﴾ اور جہاں بھی آپ نکلیں پس اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں، اور جس جگہ بھی تم ہو (اے اہل ایمان!) پس پھیرو اپنے چہروں کو اس کی طرف تا کہ نہ ہو لوگوں کو تمہارے اوپر الزام اور حجت، مگر وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ان میں سے پس ان سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو اور تا کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿۱۵۰﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں ایک اہم اصولی بات کا تذکرہ ہے کہ قبلہ محض شناخت اور پہچان کے لئے ہے، تا کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جدائی ہو، اور آپس میں مسلمانوں کے مابین اتحاد و یکجہتی قائم ہو، اور مسلمانوں کی توجہ کا ایک ہی مرکز ہو۔ اصل چیز اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں، آسمانی کتابوں اور آخرت پر صحیح معنوں میں ایمان لانا، اور اللہ تعالیٰ کے حکموں پر بغیر حیلہ و حجت عمل پیرا ہونا، اور نیکیوں کی طرف دوڑ لگا کر سبقت کرنا، اور منہیات سے مکمل پرہیز کرنا ہی اصل ایمان ہے۔ قبلہ ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ بہت سارے لوگ قبلہ کو مانتے، اور اس کا استقبال بھی کرتے ہیں، مگر وہ صحیح اسلامی عقائد و اعمال سے کلّی یا جزوی طور پر منحرف ہیں، تو محض قبلہ کی وجہ سے وہ مسلمان نہیں ہو سکتے۔

فرمایا: ہر امت کے لئے ایک جہت ہوتی ہے، جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے، اور اسے اپنے لئے قبلہ

(ذریعۂ شناخت) گردانتی ہے۔ دنیا میں شاید کوئی امت ایسی نہیں ہوگی، جس کی کوئی جہت نہ ہو۔ اب یہ جہت صحیح بھی ہوسکتی ہے، غلط بھی ہوسکتی ہے، اور محرف اور خودساختہ بھی ہوسکتی ہے، تاہم ہر امت کے لئے ایک جہت ضرور مقرر ہے۔ پس جو جہت اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہو، صرف وہی جہت برحق اور ذریعۂ ہدایت ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر مذہب والوں کا ایک قبلہ ہے، لیکن برحق اور سچا قبلہ وہ ہے جس پر مسلمان ہیں۔ حضرت ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہود کا بھی قبلہ ہے، نصرانیوں کا بھی قبلہ ہے، اور مسلمانوں کا بھی قبلہ ہے، لیکن ہدایت والا قبلہ وہی ہے جس پر اے مسلمانو! تم ہو۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ہر وہ قوم جو کعبۃ اللہ کو قبلہ مانتی ہے، اسے چاہئے کہ وہ بھلائیوں میں سبقت کرے، اس لئے کہ قبلہ سے مراد یہ ہے کہ بڑے زور و شور سے حسنات میں سبقت کرنا۔ [ابن کثیر]

اس میں اہلِ کتاب پر گرفت اور تعریض ہے کہ تم صرف قبلہ کی جہت کو دین کہتے ہو، حالانکہ تمام ایمانیات اور حسنات سے جس قوم کا دامن خالی ہو، محض کسی جہت پر مگن رہنا، اور پورے مذہب کو صرف ایک جہت میں منحصر و مقید سمجھنا پرلے درجے کی حماقت اور نادانی ہوگی۔ تمہارے برخلاف مسلمان قوم نے اصل دین کے عقائد و حسنات کو سمجھا، تب ہی تو ہر جہت اور سمت کو اللہ تعالیٰ کے حکم آنے پر قبول کیا، اور کہنے لگے کہ ہمارا فریضہ حکمِ الٰہی کو ماننا اور اس پر چلنا ہے۔ ہم کسی جہت پر ایمان نہیں لائے ہیں، بلکہ ہمارا ایمان اللہ تعالیٰ اور اس کے حکموں پر ہے۔ اگر وہ ایک روز میں سینکڑوں جہات پر توجہ کا حکم جاری فرمائے، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا، جیسے پہلے بیان ہوا۔

اس لئے فرمایا: اصلی اور بنیادی چیز نیکی اور اعمال ہیں، لہٰذا تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو اور ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝﴾ [الواقعة:] (اور جو سبقت لے جانے والے ہیں، وہ تو ہی سبقت لے جانے والے۔ وہی ہیں جو اللہ کے خاص مقرب بندے ہیں)۔ تم قرب اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر زیادہ سے زیادہ حسنات کا ذخیرہ جمع کرو، کیونکہ تم جہاں کہیں بھی ہوں گے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تم سب کو اکٹھا کرے گا، اور پورا پورا محاسبہ ہوگا۔ وہاں کارآمد چیزیں صرف حسنات اور نیکیاں ہوں گی، جیسا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے تم سب کو ایک قبلہ پر جمع فرمایا۔ اسی طرح وہ اس پر بھی قادر ہے کہ قیامت کے روز تمہیں ایک ہی میدان جمع فرمائے، لہٰذا نیکیوں میں سبقت کرو، تاکہ اخروی اجتماع کے دن سرخرو اور کامیاب رہو، بیشک تمہارا جمع کرنے والا ربّ ذوالجلال ہر چیز پر قادر ہے، کوئی چیز اس کے علم و قدرت کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔

﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ﴾اور آپ جس جگہ سے نکلیں اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں، اور بیشک! یہ آپ کے ربّ کی طرف سے حق ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے آگاہ ہے، کسی بھی عمل سے غافل نہیں ہے۔ اس کے بعد تاکید کے ساتھ پھر فرمایا: ﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ﴾ تا ﴿شَطۡرَهٗ﴾

استقبالِ قبلہ کا حکم تین مرتبہ کیوں؟

یہاں ایک ہی مقام پر تین مرتبہ استقبالِ قبلہ کا حکم جو دیا گیا ہے، حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں اس کی زبردست وجوہات بیان فرمائی ہیں، چند مختصر توجیہات پر اکتفاء بہتر ہوگا:

پہلی توجیہ:

پہلا حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو حدودِ حرم کے اندر رہتے ہیں، اور دوسرا حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو حدودِ حرم سے باہر ہیں، جبکہ تیسرا حکم ان تمام مسلمانوں کے لئے ہے جو ملکِ عرب سے باہر ہیں، یعنی ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے۔ اسی خاطر اس تیسرے حکم کو مکرر جمع کے صیغوں میں بیان فرمایا۔

دوسری توجیہ:

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلا حکم اس لئے دیا گیا کہ خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی خواہش تھی، جو بار بار آسمان کی طرف وحی کے انتظار میں نظر اٹھا کر دیکھتے رہتے تھے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور خواہش کی اجابت کا پیغام ہے، اور دوسرا حکم اس لئے دیا گیا کہ سابقہ حکم میں اس کی پیشینگوئی موجود تھی۔ دوسرے حکم میں اس کی تصدیق ہے، تیسرا حکم اس لئے ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو الزام کا موقع نہ ملے۔ جس طرح ارشاد ہے:

﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ﴾ [الآیۃ] مثلاً یہود نے کہا تھا کہ مسلمان ہمارے قبلہ کا استقبال کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اصل دین ہمارا ہی ہے۔ مشرکین نے کہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ سے منحرف ہو گئے ہیں، اور جب استقبالِ کعبہ کا حکم جاری ہوا، تو مشرکین نے دوسرا شوشہ چھوڑ دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آہستہ آہستہ اپنے آباء و اجداد کے دین پر آرہے ہیں۔

تیسری توجیہ:

ممکن ہے کہ شریعت میں پہلا نسخ یہی استقبالِ قبلہ ہی ہو۔ عام طور پر لوگ نسخ کے احکام سے مانوس نہیں تھے، جب یہ نیا حکم جاری ہوا، تو تاکید کے لئے تین مرتبہ مکرر لایا گیا، تاکہ ہر قسم کا شک و شبہ اور چہ میگوئیاں ختم ہوں۔

اس قسم کے مکررات قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر تاکید کی خاطر مذکور ہیں۔ والتفصيل في تفسير كبير للرازي رحمہ اللہ تعالیٰ

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ﴾ (مگر وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ان میں سے) البتہ جو لوگ ظالم ''متعصب'' ہٹ دھرم ہیں، وہ ہر صورت میں الزام تراشی اور حجت بازی پر ڈٹے رہیں گے، کیونکہ ان کا جہل جہلِ مرکب ہے، جو لاعلاج مرض ہے، مشہور مقولہ ہے کہ: ''نہر کے پانی پر بند باندھنا اور اس کو روکنا سہل ہے، مگر متعصب اور ضدی لوگوں کا منہ بند کرنا نہایت مشکل ہے''۔ اسی لئے تو فرمایا کہ آپ لوگ ان کی مخالفت اور الزام تراشیوں سے مت گھبرائیں، اور کسی قسم کا خوف نہ کریں، تمہارا محافظ ونگہبان خود ربّ العٰلمین ہے۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ (یہ اس لئے کہ جو مؤمن ہیں ان کا خدا کارساز ہے اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں)۔ [محمد:۱۱] (یہ اس لئے کہ اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ایمان لایا ہے، اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں ہے)۔ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۳۴] (اور اللہ پسند فرماتا ہے نیکوکاروں کو) وغیرہ۔

اور نہ ان کے شک وشبہ ڈالنے سے تم شک میں پڑو، ان باغیوں کی سرکشی سے کسی قسم کا خوف نہ کرو، صرف اللہ تعالیٰ کے خوف کو اپنے گلے کا سنہرا ہار بنا کر اس کی غلامی پر فخر کرو، کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ع...... دشمن چہ کند چوں مہربان باشد دوست ...... (سعدیؒ)

ہر زمانہ میں مسلمان قوم کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ وہ کسی مخلوق سے نہیں ڈری، صرف اپنے ربّ واحد لاشریک لہٗ کے خوف کو اپنے قلب وجگر کی زینت بنایا، اور اسی پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ ''حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ''۔

﴿وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ﴾ (تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں)۔ جب تمہارا دین کامل ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کامل، بلکہ اکمل تمہیں نصیب ہوا ہے، پھر شریعت بھی کامل، قرآن حکیم بھی کامل، تو قبلہ بھی کامل ہی ہوگا، بلکہ اس آخری امت کو بھی کامل اور خیر امت جو کہا گیا، یہ بھی کامل ہے، ارشاد فرمایا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدة:۳] (آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا، اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں، اور تمہارے لئے اسلام کو بطورِ دین پسند کیا)۔

تمام عبادتوں میں نماز بھی کامل، تو کامل عبادت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس میں جس جہت کے استقبال کا حکم

ہوتا ہے، وہ بھی کامل ہو۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام تمام جہات میں کامل ہے، اس میں ناقص جہت کا تصور نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ دینِ اسلام اکمل ہے، اور ہر نقص و کمی سے پاک ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ
الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

ع ۱۸ ۵

ترجمہ: جس طرح کہ ہم نے تم میں سے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا، جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے، اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اور تمہیں وہ سب کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ پس مجھے یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، اور تم ناشکرے نہ بنو ﴿۱۵۲﴾

معارف ومنازل

شروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اور بناء کعبہ کا تذکرہ ہوا، اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی، اس دعا میں تقریباً انہی پانچوں چیزوں کا بیان تھا، اب اس دعا کی اجابت و قبولیت کا ثمرہ ظاہر ہو رہا ہے، جس میں سابقہ وظائف کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ ساتھ ساتھ متصل آیت ﴿ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ ﴾ فرما کر اتمامِ نعمت کا حصہ استقبالِ کعبہ کے بعد یہاں سے تکمیلِ نعمت کے اہم ترین حصہ کا بیان ہے، جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہے۔ اسی طرح خانہ کعبہ کے افضل ہونے کے ساتھ افضل و برگزیدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور افضل الکتب قرآن کریم اور افضل الوظائف کا بیان بھی لازمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ہم نے قبلہ کے بارے میں تم پر اتمامِ نعمت کیا کہ سب سے افضل قبلہ تمہارے لئے مقرر کیا، اسی طرح ہم نے نبوت و رسالت اور ہدایت (قرآن مجید) کے بارے میں بھی تم پر اس طرح اتمامِ نعمت کیا کہ سب سے افضل، اکمل اور عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عظیم المرتبت کتاب تمہاری ہدایت کے لئے بھیجی، مزید انعام یہ کہ رسول تمہاری قوم میں سے اور تمہاری جنس میں سے بھیجا، اور اس پر تمہاری اپنی زبان، یعنی عربی زبان کی کتاب نازل فرمائی، جو تمہارے لئے دین و دنیا میں باعثِ عزّت و شرف ثابت ہوئی۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی بہت عظیم الشان نعمت کا ذکر ہے کہ اس نے ہم میں ہماری جنس کا ایک عظیم الشان رسول ﷺ مبعوث فرمایا، جو نوعِ بشر کا نجات دہندہ بھی ہیں، اور رحمۃ للعٰلمین بھی، بلکہ اگلی پچھلی پوری انسانیت کے محسن اعظم بھی، حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کا تزکیہ اور تعدیل کرنے والے بھی ہیں۔

دنیا نے انبیاء علیہم السلام و دیگر صلحاء کے بارے میں جو غلط اور بے بنیاد تہمت و بہتان مشہور کیے تھے، آپ ﷺ نے ان ساری من گھڑت داستانوں کو جھوٹ اور افتراء بتا کر مقربانِ الٰہی کو ان تمام بہتانوں سے پاک قرار دیا، اور ان کی حقانیت و تقدّس اور شان و شوکت کو اجاگر فرما کر دنیا والوں پر واضح کیا کہ سارے انبیاء علیہم السلام روحانی آسمان کے درخشندہ ستارے ہیں، اور ہر قسم کے نقائص اور آلائشوں سے پاک ہیں۔

تو یہ بات واضح ہے کہ آپ ﷺ برحق گواہ اور محسن اعظم ہیں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی روشن اور نورانی کتاب کی ہمارے سامنے تلاوت فرماتے ہیں۔ رذیل عادتوں اور نفس کی شرارتوں اور جاہلیت کی رسوم و ناپاکیوں سے ہمیں پاک کرتے ہیں، اور ظلمت کفر و شرک سے نکال کر نورِ توحید و ایمان سے ہمارے سینوں کو منوّر فرماتے ہیں، اور کتاب و حکمت، یعنی قرآن و حدیث کی ہمیں تعلیم دیتے ہیں، اور وہ عجیب و غریب اور مخفی راز ہم پر کھولتے ہیں، جو آج تک ہم پر اور پورے جہاں پر نہیں کھلے تھے۔

پس آپ ﷺ کی بدولت وہ لوگ جن پر صدیوں سے جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، جنہیں صدیوں سے جہالت کی ظلمت نے گھیر رکھا تھا، جن پر مدّتوں سے بھلائی کا نور و پرتو نہیں پڑا تھا، وہ دنیا کی زبردست اور بے مثال علامہ ہستیوں کے معلّم و استاد بن گئے۔ وہ علم میں گہرے، تکلّف میں تھوڑے، دلوں کے پاک اور زبان کے سچے بن گئے، ہزاروں سالوں سے حکمرانی کرنے والے روم و فارس کے بادشاہ و سلاطین کو نظامِ حکمرانی اور طرزِ بادشاہت سکھانے لگے، اور عظیم سلطنتوں کو کلمۂ توحید کی بدولت تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ ایک طرف وہ عابد و زاہد رہے، تو دوسری طرف فاتح و مجاہد رہے۔ مختصر مدت میں آدھی دنیا پر اسلام کا علم لہرا کر دینِ الٰہی کو جہاں کے چاروں محاذوں پر متعارف کرایا۔

دنیا کی حالت کا یہ انقلاب بجائے خود رسول کریم ﷺ کی رسالت کی تصدیق کا ایک شاہد عدل اور بے مثال ثبوت ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [آل عمران: ۶۴] (اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا)۔ اسی طرح ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ [التوبۃ: ۱۲۸] (لوگو!)

تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے)۔ ایسے عظیم الشان اور اولوالعزم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مؤمنوں پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے۔

اس عظیم الشان نعمت کی قدر نہ کرنے والوں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا﴾ [ابراھیم:۲۸] (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا تعالیٰ کے احسان کو ناشکری سے بدل دیا، اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿نِعْمَتَ اللّٰهِ﴾ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ [بخاری] مشرکینِ مکہ نے اس عظیم نعمت کی ناقدری کی، اور اس کے بدلے کفر اور جہنم خریدے (نعوذ باللہ) اسی لئے اس آیت میں بھی اپنی نعمت کا ذکر فرما کر لوگوں کو اپنی یاد اور اپنے شکر کا حکم دیا کہ جس طرح میں نے یہ احسان تم پر کیا، تم بھی میرے ذکر اور میرے شکر سے غافل نہ رہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ربّ العزّت سبحانہ سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ! تیرا شکر کیسے ادا کروں؟ ارشاد ہوتا ہے: ''مجھے یاد کیا کرو، غفلت نہ کرو''۔ اور یہ بات واضح ہے کہ یاد رکھنا شکر ہے، اور بھولنا کفر ہے۔ حسن بصری وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں: جو شخص اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتا ہے، جیسے کہ مذکورہ آیت میں ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے، تو وہ اسے بہت زیادہ دے دیتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ [ابراھیم:۷] (اگر شکر ادا کیا تو میں تم کو اور زیادہ کردوں گا)۔ اور جو ناشکری کرے، تو نعمت سلب ہو جاتی ہے، اور عذاب لازم ہوتا ہے، ناشکری مؤمن کی خصلت نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ذکر اللہ بہت بڑی عبادت ہے۔ قیامت کے روز ذاکرین مشک و عنبر اور کستوری کے ٹیلوں پر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس بندہ سے نہایت محبت کرتے ہیں جس کی زبان اور ہونٹ ہمیشہ ذکر اللہ میں مشغول ہوں، اگرچہ اصلی بنیادی ذکر، ذکر قلبی ہے، مگر چونکہ زبان دل کی ترجمان ہے، جب قلب میں حرارت نہ ہو، تو زبان بھی ساکن رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت ہر مسلمان کو نصیب فرمائے۔ آمین!

ایک حدیث قدسی ہے، فرمایا: جو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے، میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں، اور جو مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے، میں بھی اسے اس سے بہتر جماعت (فرشتوں میں) میں یاد کرتا ہوں، جو شخص ایک بالشت میری طرف بڑھتا ہے، تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں، اے بنی آدم! اگر تو میری طرف ایک

ہاتھ بڑھے گا، تو میں تیری طرف دو ہاتھ بڑھوں گا، اگر تو میری طرف چلتا ہوا آئے گا، تو میں تیری طرف دوڑتا ہوا آؤں گا۔ [بخاري، مسند أحمد]

قولہ تعالیٰ: ﴿يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ [الأحزاب: ۴۲] (اے اہلِ ایمان! خدا تعالیٰ کا بہت ذکر کیا کرو، اور صبح اور شام اس کی پاکی بیان کرتے رہو)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مقام تعلیم اور پیشینگوئی کا مقام تھا، اور یہ مقامِ عمل کا ہے۔ لہٰذا کتاب وحکمت کی تعلیم کی غرض وغایت، یعنی تزکیہ کو پہلے بیان کیا، کیونکہ جب تک مقصود حاصل نہ ہو، عمل کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اور تعلیم اسی وقت مفید ہوگی، جب اس کا مقصد (تزکیہ) حاصل ہوجائے۔ تعلیم مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ مقصود بالذات تزکیہ ہے، جس کا تذکرہ اس مقام پر پہلے کیا ہے۔

ان شاء اللہ یہ عجیب وغریب مسئلہ، اور اس کی حقیقت کا پورا بیان وہاں ہوگا، یہاں صرف چند ضروری اصول جو کہ شخصی اور قومی ترقی وعروج کے لئے لازمی ہیں، ان کا مختصر خاکہ اگلی آیات کے بعد بیان ہوگا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرو، بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۵۳﴾ اور نہ کہو ان لوگوں کو مردہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں مارے گئے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تم نہیں سمجھتے ﴿۱۵۴﴾

معارف ومنازل

آیت ۱۵۲ سے آیت ۱۵۸ تک گویا نبوت کے فرائض ووظائف کا لبِ لباب اور خلاصہ کا بیان ہے۔ تزکیہ والی صفت کا خلاصہ یہ ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کو ہر قسم کے رذائل اور برے عقائد اور بری خصلتوں سے پاک کریں گے۔ اس پاکی اور تزکیہ کی صورت یہ ہوگی کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مکمل پابندی کریں گے، اور اوامرِ الٰہی خواہ کسی بھی شعبہ سے متعلق ہوں، ان کو بڑی تندہی اور محنت سے بجالائیں گے۔ منہیات وخلاف شرع امور خواہ کسی بھی شعبے سے متعلق ہوں، انہیں سراسر ترک کردیں گے۔

یہ ہے تزکیہ کا مختصر خلاصہ۔ اب تزکیہ کے لئے ابتدائی چند اصول بیان ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی ان اصولوں کی مکمل پابندی کرے گا، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے مکمل تزکیہ حاصل نہ ہو۔ البتہ! اگر جزوی طور پر کوئی ان اصولوں پر کاربند رہے گا، تو اسے اسی مقدار میں تزکیہ حاصل رہے گا۔

جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سو فیصد ان اصولوں کو اپنایا تو ان کا تزکیہ معیاری اور ساری امت کے لئے نمونہ بن گیا، انہی کے حق میں وارد ہوا: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کامل تزکیہ شرط ہے، پھر لوگوں کو یہی حکم ہوا کہ تمہارا ایمان اس شرط پر قبول ہوگا، جب تم ان کی طرح اور ان کے طرز پر ایمان لاؤ، فرمایا: ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ یہ تزکیہ ایک اعتبار سے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک معجزہ ہے، کیونکہ اس کا تعلق ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ کے ساتھ ہے۔

جب قرآن حکیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہے، تو یہ اس کا حصہ اور ثمرہ ہے، لہٰذا یہ قیامت تک باقی رہے گا، اور اس کی کمی وبیشی کا تعلق شخصی طور پر یا اجتماعی طور اس کے اصولوں کا تابع ہوگا۔ تزکیہ، تہذیبِ نفس، تہذیبِ اخلاق، تینوں کے معنی تقریباً ایک ہیں۔

تزکیہ اور تہذیب نفس کے اصول:

آیت ۱۵۲ سے ۱۵۸ تک جو اصول بیان ہوئے ہیں، وہ چھ ہیں:

(۱) ذکر اللہ، یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا
(۲) دوسرا اصول: شکر کرنا
(۳) تیسرا اصول: صبر کرنا
(۴) چوتھا اصول: نماز پڑھنا
(۵) پانچواں اصول: دعا
(۶) چھٹا اصول: تعظیم شعائر اللہ تعالیٰ

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ﴾ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض ووظائف بیان فرمائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت جن وانس، نیز پورے جہاں کے لئے مقرر فرمائی، اس کے ساتھ متصل یہ اصول بیان ہوئے، تو یہ اصول ایسے ہیں کہ اگر کوئی غور سے ان کا مطالعہ کرے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمومی اور بین الاقوامی رسالت کی طرح یہ اصول بھی بین الاقوامی ہیں۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں جو ان اصولوں کے تحت مندرج نہ ہو۔ حقوق اللہ وحقوق العباد سارے ان اصولوں میں مندرج ہیں۔

تہذیبِ نفس، تدبیر منزل، تدبیرِ محلہ، تدبیرِ مدن، خلافت اور امامتِ کبریٰ سارے ان اصول پر منطبق

ہیں۔آپ کی ذات گرامی ان اصولوں کا سرچشمہ ہے، اور یہ اصول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے ثمرات اور زینت ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذاکرین وشاکرین کے امام وسربراہ ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازیوں اور صابرین کے مطلقاً پیشوا ہیں، اور دعا کرنے والوں کے بادشاہ وسرتاج ہیں۔شعائر اللہ میں اول نمبر بقول حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات عالی صفات ہے، مگر شعائر اللہ کی تعظیم کا جو حق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا فرمایا وہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ ہے۔فداہ آباءنا و أمھاتنا و أرواحنا

سابقہ آیتوں کے تحت ذکر اور شکر کا مختصر بیان ہوگیا، البتہ! صبر کے متعلق سورۃ بقرہ کی آیت ۴۵ کے تحت کچھ ضروری باتوں کا ذکر ہو چکا ہے، مگر اس مقام کی مناسبت سے چند باتوں کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا اصول صبر ہے۔

صبر کے معنی کسی چیز سے رکنا، یا کسی چیز کو برداشت کرنا، اور اس کے تین درجے ہیں:

درجات صبر:

صبر کے تین درجات ہیں: الصبر علی المصیبة، الصبر علی الطاعة، الصبر عن المعصیة۔

(۱) صبر علی المُصیبة یہ ہے کہ مؤمن پر جب کوئی مصیبت آتی ہے، تو وہ الرضاء بالقضاء کے قانون پر صبر کرتا ہے، اور اس کے جواب میں یہ دعا پڑھتا ہے: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اس سے تعلق باللہ مضبوط ہوجاتا ہے۔سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهِ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا“۔[ترمذي] (اے پروردگار! یقین میں وہ درجہ عطا فرما کہ دنیا کی مصیبتیں آسان ہوجائیں)۔یہی تو صبر کی تعلیم ہے۔

قوله تعالی: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف:۳۵] پس (اے محمد) جس طرح عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں، اسی طرح تم بھی صبر کرو)۔سارے انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی تعبیر صبر ہی ہے۔ایک حدیث میں وارد ہے کہ: ”جس طرح تم لوگ نعمتوں پر خوشی محسوس کرتے ہو، اسی طرح انبیاء علیہم السلام مصیبتوں پر خوشی محسوس کرتے ہیں“۔انبیاء علیہم السلام پر ایسی ایسی مصیبتیں آئیں، جنہیں شاید سخت سے سخت پہاڑ بھی برداشت نہ کرسکیں، اور ریزہ ریزہ ہوجائیں، مگر انہوں نے جو عزم واستقلال کے جبال تھے، ان ساری مصیبتوں کو عزم وحوصلہ کے ساتھ بطیب خاطر برداشت کیا۔وہ سارے صبر ورضاء کے بادشاہ گزرے ہیں، جن کی زندگی صبر سے عبارت ہے، اور بے صبری سے مکمل پاک ہیں، کیونکہ تعلق باللہ کا عنصر جب قوی ہوتا ہے، تو ہر مصیبت سہل ہوجاتی ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ صبر نے انہیں کندن بنایا۔[ابن کثیر]

البتہ! یہ بات ضروری ہے کہ مصیبت کے شروع میں صبر کا مظاہرہ ہو، کسی قسم کی بے صبری اور جزع فزع نہ ہو، اور نہ ہی کوئی شکایت کا حرف زبان پر ہو۔ جب صبر بہت ہی سخت اور مشکل ٹھہرا، تب ہی تو اجر وثواب بے حساب حاصل ہو جائے گا۔ بے صبری کا مظاہرہ کرنے سے مصیبت دور نہیں ہوتی، الٹا نقصان یہ ہو جاتا ہے کہ ثواب ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) الصبر علی الطاعة وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے حکموں کی بطیبِ خاطر بجا آوری، اور تمام طاعات کی ادائیگی پر صبر اور برداشت، ظاہری، باطنی، بدنی، مالی، روحانی ہر قسم اور ہر حکم کی اطاعت پر صبر کرنا، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وعمرہ، اور سب سے کٹھن حکم جہاد فی سبیل اللہ جو بہت ہی مشکل ہے، بجالانا۔ قرآن حکیم نے جب بھی جہاد کا بیان فرمایا، وہاں صبر کا ضرور تذکرہ فرمایا۔

واضح ہو کہ صبر کا بیان قرآن حکیم میں بہتر (۷۲) مقامات پر مذکور ہے۔

(۳) الصبر عن المعصية یہ صبر علی الطاعۃ کا جڑواں بھائی ہے۔ دونوں کا عموم تقریباً یکساں ہے، تمام نفسانی خواہشات اور پوری منہیات ومعاصی سے رکنا صبر کرنا، اجتناب کرنا۔ یہ کام اگرچہ مشکل ہے، مگر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے خاشعین پر آسان ہے، کیونکہ ان کی طبیعت اس طرح بن جاتی ہے کہ شریعت کے سارے حکموں پر چلنا اور عمل کرنا ان کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ علیہ نے ''دنیا سے لاتعلقی (ترکِ محبت دنیا) اور حرص ولالچ سے مکمل بیزاری کو اس مرتبے کے لئے شرط مقرر کیا ہے''۔[إحياء العلوم]

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح روایت ہے: ''اَلصَّبْرُ مِنَ الْاِیْمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ''۔ صبر کا تعلق ایمان کے ساتھ ایسا ہے جیسے سر کا تعلق جسم کے ساتھ ہے۔ اگر جسم سے سر علیحدہ ہو جائے، تو جسم بے کار ہو جاتا ہے، اور اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ: ''لَاۤ اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا صَبْرَ لَهٗ''۔ صبر کے بغیر ایمان ناقص ہے۔

چوتھا اصول نماز ہے۔

توحید وایمان کی اصلی روح یہی نماز ہے، اور یہی معراج المؤمنین ہے۔ تعلق مع اللہ کے جتنے اصول اور دروازے ہیں، وہ سب نماز میں موجود ہیں، اس لئے حدیث پاک میں ارشاد ہے: اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ [مشکوۃ]

سورۂ بقرہ کے شروع میں نماز کے متعلق بڑی قیمتی اور عمدہ باتیں بیان ہو چکی ہیں، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

پانچواں اصول دعا ہے۔

دعا اگرچہ نماز کا ایک اہم حصہ ہے، مگر بعض جزوی خصوصیات کی وجہ سے اسے الگ ذکر کیا، کیونکہ آئندہ آیت: ﴿قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ میں دعا کی تعلیم ہے۔ جب ہم انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں ہر موڑ پر یہی دعا نظر آتی ہے، خاص کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی ادعیہ اور التجائیں قرآن حکیم میں بکثرت موجود ہیں۔

قرآن کریم میں زائد دعاؤں کا بھی تذکرہ ہے۔ ان ہی دعاؤں کا ایک کلیدی حصہ استعانت ہے، یعنی ہر کام میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے معاذ! ہر نماز کے بعد یہ دعا ضرور پڑھو: "اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ"۔[مشکوۃ] کیونکہ کوئی بھی کام دینی ہو یا دنیوی، عبادت ہو، یا عام کام، اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر انجام نہیں پاتا۔ سورۃ الفاتحۃ، دعائے قنوت اور عموماً سارے خطبات نبویہ میں استعانت کا باقاعدگی سے تذکرہ ہے۔ استعانت طلب کرنا ہر مسلمان کے لئے ایسا ضروری ہے جیسے نماز پڑھنا۔ استعانت کے بغیر ایک ادنیٰ عمل بھی سرانجام نہیں پاتا، قدم قدم پر استعانت طلب کرنا لازمی ہے۔

چھٹا اصول تعظیم شعائر اللہ۔

اس کی تفصیل عنقریب صفا و مروہ کے بیان میں آنے والی ہے۔

خلاصة الأصول الستة:

جب کسی قوم میں یہ چھ اصول علیٰ وجہ الاتم موجود ہوں، یعنی ذکر اللہ، شکر، صبر، نماز، دعا اور تعظیم شعائر اللہ، تو اس کا تعلق براہِ راست ربّ العزّت کے ساتھ مضبوط ہوگا، اور اسے ہر قسم کی فلاح و کامیابی حاصل رہے گی۔ مال تو ایک عارضی چیز ہے، اسے جان تک کی قربانی پیش کرنے کا بھی حوصلہ ہاتھ آئے گا، وہ دینِ الٰہی کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کے جذبہ سے سرشار ہو کر میدانِ جہاد میں داخل ہوگا، اور جامِ شہادت نوش کرنے کے بعد دائمی و ابدی اور راحتوں والی حیات کی فضاؤں میں داخل ہو جائے گا، اس لئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ﴾ (اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والے کو مردہ مت کہو) ﴿بَلْ اَحْيَاۗءٌ﴾ (بلکہ وہ زندہ ہیں)۔

دوسرے مقام پر ہے: ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۶۹] (اپنے ربّ کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے)۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی مادی جسمانی حیات تو ختم ہوگئی، مگر انہیں اگلے جہاں کی ابدی راحتوں والی دائمی زندگی حاصل ہوجاتی ہے، اور انہیں انبیاء کرام علیہم السلام جیسی اعلیٰ زندگی نصیب ہوگی۔

شہداء کی زندگی:

شہید اگر چہ ظاہراً مر گیا، اس پر میت کے احکام جاری ہو گئے، لیکن اس کی موت عام لوگوں کی موت کی طرح نہیں ہے، اس کو برزخی زندگی انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح حاصل ہے۔ مرنے کے بعد شہید کی ترقی بدستور قائم رہتی ہے، جس عمل میں اس نے جان دی ہے، اس کا اجر و ثواب برابر جاری رہتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے، تو اس کا عمل ختم ہوجاتا ہے، مگر مجاہد فی سبیل اللہ کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔ [متفق علیه]

حدیث میں ہے کہ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹ میں رکھ دی جاتی ہیں، اور جنت میں جہاں چاہتی ہیں، سیر کرتی رہتی اور اڑتی پھرتی ہیں۔ جنت کے میوے کھاتی رہتی ہیں، اور عرشِ معلیٰ کی قندیلوں میں بڑے اعزاز کے ساتھ آرام کرتی ہیں۔ [متفق علیه] علماء کرام نے اس حدیث کو متواتر کہا ہے۔

اس اعزاز کا بظاہر سبب یہ ہے کہ شہید نے سب سے بڑی قربانی دی، کیونکہ جان کی قربانی ہر قسم کی قربانی سے اعلیٰ اور قیمتی ہے، تو اس عنصری بدن کے بدلہ میں دوسرا عنصری بدن اس کی روح کی سیر و تفریح کے لئے اسے عطا کیا گیا۔ یہ جسم طیوری اس کی روح کے لئے بمنزلہ ایک طیارہ کے ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جو غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے، حضور پرنور نے انہیں الطیار کا لقب دیا۔

تو شہداء کی ارواح "فِيْ حَوَاصِلِ طُيُوْرٍ خُضْرٍ تَسْرَحُوْنَ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ" کے فرمان نبوی کے مطابق جنت میں بڑی خوشیوں اور راحتوں کے ساتھ سیر و تفریح کرتی ہیں، اور اس جسم طیوری کی روح ایک الگ روح ہوتی ہے، اور شہید کی روح الگ ہوتی ہے۔ جسم طیوری کی نشو نما اور تدبیر و تصرف کا شہید کی روح سے کوئی تعلق نہیں، اس کا تعلق پرندہ کی اصل روح سے ہے۔ پرندہ کا جسم اور روح علٰحدہ ہے، اور شہید کی روح علٰحدہ، اور وہ اس میں سوار ہے۔ وہ سبز پرندہ مع اپنے جسم اور اپنی روح کے شہید کی روح کے لئے سواری ہے، جیسے کوئی کسی گھوڑے پر سوار ہو۔

یہ بات اس لئے ہے تاکہ کوئی دہریہ یا غیر مذہب تناسخ پر حمل نہ کرے، کیونکہ تناسخ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ایک جسم کی روح دوسرے جسم میں داخل ہو، جس میں الگ روح کا تصور نہ ہو، یہ گمراہ لوگوں (اہل ہنود) کا مذہب ہے، اسی

بنیاد پر ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ معبود ہوتے ہیں، جو تناسخ کی بنیاد پر ایک دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

شہید کی اقسام:

شہید کی حیاتِ جاودانی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح اس نے بڑی قربانی جان کی دے دی، اسی طرح اس نے صبر کا اعلیٰ معیار قائم کر کے میدانِ کارزار میں ثابت قدمی کا ریکارڈ قائم کیا، فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] (جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا)۔

رحمت عالم سید کائنات کو بکثرت تمنا رہتی تھی کہ مقتول فی سبیل اللہ شہید کے علاوہ میری امت میں دیگر بہت سے اسباب کے ذریعہ موت پانے والوں کو بھی شہادت کا مرتبہ حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ شانہ آپ کی رضامندی کی خاطر آپ ﷺ کی امت کے شہداء کے سلسلہ میں اضافہ فرماتے رہے، اور آپ بار بار بصد خوشی لوگوں کو شہداء کی فہرست بتاتے رہے، چنانچہ ستر سے زائد شہداء جمع ہوئے، لیکن ان سب کا ذکر کسی ایک حدیث میں یکجا نہیں ملتا، متفرق احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، اسی لئے ان سب احادیث کو جمع کرنے کے لئے محققین علماء کرام نے مستقل رسالے تالیف فرمائے ہیں، ان سب رسائل میں عمدہ و جامع رسالہ "أبواب السعادة في أسباب الشهادة" حضرت علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا ہے، جو بسط و تفصیل کے ساتھ تمام احادیث پر مشتمل ہے۔

یہاں اسی رسالہ کے اقتباسات پر اختصاراً اکتفاء کرتے ہیں، جن علماء کرام کو تفصیل کا شوق ہو، تو وہ اسی رسالہ جامعہ کا مطالعہ فرمائیں۔ حضرت علامہؒ نے جو فہرست مرتب کی ہے وہ یہ ہے:

فہرستِ شہداء:

(۱) وہ بے گناہ مقتول جو بلاوجہ قتل ہوا۔ (۲) جو کسی کافر کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر وار خالی جا کر اپنی تلوار کی زد میں آ کر خود قتل ہوا، جیسے غزوۂ خیبر کے موقعہ پر حضرت عامر رضی اللہ عنہ اپنی تلوار کی زد میں آ کر شہید ہوئے۔ (۳) مسلم ممالک کی سرحد پر پہرہ دینے والا شخص اگر وفات پائے تو شہید ہے۔ (۴) جو شخص صدقِ دل سے شہادت کا طالب رہا مگر طبعی موت مر گیا۔ (۵) جو اپنی جان اور مال و عیال کا دفاع کر کے مارا گیا تو شہید ہے۔ (۶) جو شخص اپنی ننگ و عزت بچاتے ہوئے مارا جائے۔ (۷) جس شخص کو زہر دے کر مارا گیا، تو شہید ہے۔ (۸) مظلوم بیگناہ قیدی، اگر قید میں مر گیا، تو شہید ہے۔ (۹) سانپ، بچھو وغیرہ کے ڈسنے سے مرنے والا۔ (۱۰) حاملہ عورت حمل یا ولادت و نفاس میں مر گئی۔ (۱۱) کنواری عفیفہ لڑکی شادی سے پہلے مر گئی۔ (۱۲) چوروں، ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مرنے والا۔ (۱۳) جنگلی جانوروں اور درندوں کا

شکار ہونے والا۔(۱۴) استسقاء کے مرض میں مرنے والا۔(۱۵) پیٹ کی بیماری ہیضہ واسہال کا مریض بھی شہید ہے۔ (۱۶) طاعون (وباء) کے مرض میں مرنے والا۔(۱۷) نمونیہ، ذات الجنب کے مرض میں مرنے والا۔(۱۸) سل ودق کے مرض میں مرنے والا۔(۱۹) سمندری سفر میں قئ اور متلیوں کے مرض میں مرنے والا۔(۲۰) کسی بلند پہاڑ یا سواری یا مکان سے گرنے والا۔(۲۱) آگ میں جل کر ہلاک ہونے والا۔(۲۲) پانی میں غرقاب ہو کر ہلاک ہونے والا۔ (۲۳) کسی چیز کی زوردار ٹکر سے ہلاک ہونے والا۔(۲۴) زلزلہ یا دیوار یا کسی درخت کے نیچے آ کر ہلاک ہونا۔ (۲۵) شدید سخت بخار یا پینڈکس جیسے مہلک مرض میں ہلاک ہونا۔(۲۶) طویل (لمبا) عرصہ بیمار رہنے کے بعد اسی مرض میں ہلاک ہونا۔(۲۷) فالج جیسے بے رحم مرض میں مرنا۔(۲۸) اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور غربت میں مرنا۔(۲۹) حج وعمرہ کے سفر میں وفات پانا۔(۳۰) طلبِ علم کے زمانہ میں طبعی موت مرنا۔(۳۱) جائز حلال تجارت کے سفر میں مرنا۔(۳۲) تدریس وتعلیم کے مشغلہ کے دوران وفات پانا۔(۳۳) تبلیغِ دین کے سلسلہ میں وفات پانا۔ (۳۴) شبِ جمعہ اور روزِ جمعہ کی موت بھی شہادت ہے۔(۳۵) ماہِ رمضان شریف میں وفات پانا۔(۳۶) بیماری میں کثرت استغفار کے بعد وفات پانا۔(۳۷) بیماری میں چالیس مرتبہ ''لاإله إلاأنت سبحٰنک إني کنت من الظٰلمین'' پڑھ کر مرنے والا بھی شہید ہے۔(۳۸) روزانہ ''اللّٰھم بارک لي في الموت وفیما بعدالموت'' ۲۵ مرتبہ پڑھنے والا۔(۳۹) روزانہ رات کے وقت سورۃ یٰسٓ پڑھنے والا۔(۴۰) روزانہ صبح وشام أعوذ باللہ السمیع العلیم ۳ مرتبہ، اور سورۃ حشر کی آخری آیات پڑھنے والا۔(۴۱) مرگی اور صرع کے مرض میں ہلاک ہونا۔ (۴۲) گرمی میں لو لگنے سے ہلاک ہونا۔(۴۳) جو عورت اپنے شوہر کی بے رحمی پر صبر کرے، تو اس کی موت شہادت ہے۔(۴۴) جو شوہر بیوی کے ظلم وستم اور شرارت پر صبر کرے، تو اس کی موت شہادت ہے۔(۴۵) بھوک اور پیاس کی وجہ سے موت شہادت ہے۔(۴۶) جو مؤذن بغیر اُجرت فی سبیل اللہ اذان دیتا رہے، تو اس کی موت شہادت ہے۔ (۴۷) ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے والے کی موت شہادت ہے۔(۴۸) صبح وشام سید الاستغفار پڑھنے والے کی موت شہادت ہے۔(۴۹) ہر وقت باوضو رہنے والے کی موت شہادت ہے۔(۵۰) باوضو سو کر مرنے والا شہید ہے۔ (۵۱) سیلابی پانی میں بہہ کر مرنے والا شہید ہے۔(۵۲) پاکدامن عاشق جو اپنا عشق چھپائے اور غمِ عشق میں مر جائے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے اعمال واحوال ایسے ہیں جن سے شہادت کا رتبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَ
الثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ
رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

ترجمہ: اور البتہ ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کے گھاٹے (کمی) سے، اور آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنائیں ﴿۱۵۵﴾ وہ لوگ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ﴿۱۵۶﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان پر عنایتیں ہیں ان کے ربّ کی طرف سے، اور مہربانی ہے، اور یہی لوگ ہیں ہدایت پانے والے ﴿۱۵۷﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی رفعِ درجات کا وعدہ فرمایا ہے، وہاں آزمائش اور صبر واستقامت کو ضرور لازم قرار دیا ہے۔ کبھی ترقی اور بھلائی سے، اور کبھی تنزّل اور برائی سے، ارشاد فرمایا: ﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ حَتّٰى نَعۡلَمَ الۡمُجَاهِدِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَالصَّابِرِيۡنَ وَنَبۡلُوَ اَخۡبَارَكُمۡ﴾ [محمد: ۳۱] (اور ہم تو لوگوں کو آزمائیں گے تا کہ جو تم میں لڑائی کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں ان کو معلوم کریں۔ اور تمہارے حالات جانچ لیں)۔ ﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ﴾ [البقرة: ۲۱۴] (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (بے آزمائش) بہشت میں جا داخل ہو گے؟) مؤمن لوگ یہ تصور نہ کریں کہ وہ محض کلمہ پڑھ کر بغیر امتحان کے کامیابی حاصل کرلیں گے، یا بغیر امتحان کے وہ جنتوں کے وارث وحقدار بن جائیں گے۔ یہ صرف تمہارے لئے نہیں ہیں، تم سے پہلے جتنی ہستیاں یا اُمتیں گزر چکی ہیں، ان سب کو جانچا گیا ہے، اور انہیں سخت سے سخت آزمائشوں سے گزارا گیا ہے۔ سورۃ عنکبوت کے شروع میں اس کی تفصیل ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

ایمانی ترقی کے جو اصول بیان ہوئے، ان میں صبر کا اہم مقام ہے۔ موجودہ آیات میں اکثر وبیشتر صبر ہی کا بیان ہے، اور خوشخبری کا بھی بیان ہے۔ سرورِ عالم نے فرمایا: يُبۡتَلَى الرَّجُلُ بِقَدۡرِ دِيۡنِهٖ۔ ہر آدمی کے امتحان میں اس کے دین کے اندازے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، اور آدمی کا امتحان اس کے دین کے مرتبے کے مطابق ہوتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں بیان ہوا کہ ان کو بہت سے امتحانوں سے گزرنا پڑا، مگر وہ پیکرِ عزم و

استقلال سارے امتحانات میں سرخرواور کامیاب رہے، جس کے نتیجے میں وہ خلیل اللہ جیسے عظیم منصب پر فائز ہوئے۔

کمزور ایمان والا شخص ادنیٰ امتحان کی استطاعت نہیں رکھتا، پس نتیجۃً بے صبری کی وجہ سے سوائے ناکامی کے کچھ نہیں ہوتا۔ سابقہ آیات میں استعانت کا اسی مقصد کی خاطر تذکرہ ہوا، کہ ہر چھوٹے بڑے آنے والے امتحان میں پاس ہونے کی خاطر اللہ تعالیٰ سبحانہ سے مدد مانگو، اور استعانت طلب کرو، کیونکہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کمزور بھی ہے، اور عجلت پسند وتنگدل بھی ہے، وہ معمولی امتحان سے اور امتحان کیا، بلکہ اس کا نام سن کر گھبرا جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ استعانت حاصل کرو، پھر صبر سے کام لو۔ تیسرے مرحلے پر عزم و پختہ ہمت سے کام لو، ان شاء اللہ کامیابی تمہارے قدموں پر جھک کر آئے گی۔

آیت کریمہ سے یہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہاں لامِ تاکید اور نونِ تاکید دونوں خبر دیتے ہیں کہ ہر حال میں تمہاری آزمائش ہوگی۔ کبھی عمومی آزمائش، کبھی خصوصی، کبھی مذہبی دینی اور کبھی دنیوی اور معاشی آزمائشیں۔ سبحان اللہ! ہر آدمی سر سے لے کر پاؤں تک سینکڑوں مصائب و پریشانیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ قدم قدم پر آزمائشوں کی تیر باری کی زد میں ہے۔ ایک مصیبت دور ہوجاتی ہے تو فوراً دوسری مصیبت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ یہاں مصائب بھی غیر محدود، اور صبر کے مقامات بھی غیر محدود ہیں۔

بہر حال! ایمان ایک عظیم نعمت ہے، اس کی نورانیت سورج کی شعاعوں سے کہیں زیادہ درخشاں ہیں، سورج کی روشنی سے فضاؤں میں نورانیت تو آسکتی ہے، مگر قلوب کی گہرائیوں تک اس کا نور نہیں پہنچ سکتا، جبکہ ایمان کے انوار و برکات سے فضاؤں اور تاریک دلوں میں نورانیت جگمگا اٹھتی ہے، پھر اسی نورانیت کی تابندگی اور پرتَو سے صبر جیسا سخت اور تلخ عمل بھی آسان ہوجاتا ہے۔

تو ارشاد ہوا کہ ہم کسی نہ کسی چیز سے ضرور تمہیں آزمائیں گے، وہ ذرائع اور چیزیں بہت زیادہ ہیں، یہاں بطورِ نمونہ چند ایک کا بیان ہے:

(۱)......پہلی چیز ﴿مِنَ الْخَوْفِ﴾

یعنی تم پر خوف طاری کردیں گے، جس سے تم مصیبت میں مبتلا ہوجاؤ گے، تمہارا سکون درہم برہم ہوگا، اور امن کے لئے ترس جاؤ گے۔

خانہ خراب ہو خوف کا! جس سے بڑے بڑے پہلوان بھی متاثر ہو کر دم بخود ہوجاتے ہیں۔ مولانا رومی

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر جاندار جانور اور متنفّس کی زندگی میں خوف کا مادّہ موجود ہوتا ہے، سوائے تین چیزوں کے کہ ان میں خوف وڈر کا مادّہ نہیں ہوتا، وہ صرف پریشان ہوجاتے ہیں، مگر خوفزدہ نہیں ہوتے۔

۱:...... برگزیدہ انبیاء علیہم السلام۔

۲:...... جنگل کا بادشاہ ببر شیر۔

۳:...... بڑا سانپ، یعنی اژدہا۔ بہرحال خوف ایک ایسی چیز ہے، جس کی موجودگی میں زندگی اور زندگی کا ہر کاروبار ٹھپ ہوکر مفلوج ہوجاتا ہے۔ اس کی موجودگی میں ساری خوشیاں اور ہنسیاں آہوں اور سسکیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں، کھانا پینا اور دانہ پانی جزو بدن نہیں ہوتا۔ ہر قسم کا سکون اور راحت غموں اور پریشانیوں میں بدل جاتا ہے۔ تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت ہر چیز پر آفت آجاتی ہے۔ یہ خوف جو کہ امن کی ضد ہے، دراصل یہ قدرت کی طرف سے آزمائش بھی ہے، اور عذابِ الٰہی بھی۔

یہ درست ہے کہ امن میں آزمائش ضرور ہے، مگر وہ ایک نعمت ہے، جس میں عذاب کا پہلو نہیں ہوتا۔ ربّ العزت سبحانہ نے اہلِ مکہ، قریش پر اس نعمت اس کا احسان جتلا کر ارشاد فرمایا: ﴿اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ (جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا، اور خوف سے امن بخشا)۔ [قریش: ۴]

بیت اللہ شریف کے طفیل اللہ تعالیٰ نے انہیں بھوک سے نجات دلائی اور بڑے امن سے رکھا۔ چاروں طرف بدامنی کا دور دورہ رہا، اور شرارتوں کی آگ بھڑکتی رہی، مگر یہ لوگ ہر قسم کی بدامنی اور خوف سے مامون رہے۔ آج بھی اگر کوئی ڈیڑھ ہزار سال کے بعد دیکھنا چاہے، تو پوری مملکت میں ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ [آل عمران: ۹۷] (جو اس میں داخل ہوا تو محفوظ ہوگا) کے انوار وبرکات بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں ہمارے اسلامی ملکوں میں، شہروں اور قصبوں میں امن وامان کیا نظر آئے، یہاں تو لوگ امن کے نام سے بھی واقف نہیں۔

حدیث میں ارشاد ہے: جب لوگ حدود اللہ کی پاسداری نہیں کریں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں گے، تو اللہ تعالیٰ ان پر بے رحم ظالموں کو مسلّط کردیں گے، جن کے ظلم سے امن تباہ ہوگا۔ آئے دن مصائب جنم لیں گے۔ نمازی لوگ دعائیں کریں گے، تو قبولیت نہیں ہوگی، سمجھدار لوگ دماغی توازن کھو بیٹھیں گے۔ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ۔ [رواہ البیهقي في شعب الإیمان]

خلاصہ یہ ہے کہ یہ خوف، جس سے آدمی کا خون خشک ہوجاتا ہے، یہ عذاب بھی ہے، اور آزمائش بھی۔ کبھی

ملکی ہوتا ہے (جب یہ بیرونی سازش کی سطح پر ہو) کبھی علاقائی، کبھی خاندانی، کبھی شہری اور کبھی شخصی۔ اس کی بہت ساری اقسام ہیں۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وقت اللہ تعالیٰ سے امن وسلامتی اور عافیت کا مطالبہ کیا کرو۔ [متفق علیہ]

(۲)......دوسری چیز ﴿وَالْجُوْعِ﴾

یہ بھوک والی مصیبت کبھی خوف سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے، کیونکہ امن و بے خوفی کے ہوتے ہوئے بھی جب بھوک کا عذاب مسلّط ہوجاتا ہے، تو امن وسلامتی کی لذّت بھی ختم ہوجاتی ہے، کیونکہ زندگی کا انحصار خوراک پر ہے۔ غذا اور خوراک کا حصول انسانی زندگی کا طبعی اور فطری حق ہے۔ زمین کے اوپر رہنے والے لوگوں کو چھوڑ دیجیے! ماں کے پیٹ میں نشوونما پانے والے بچے کی زندگی بھی اسی خوراک پر ہے، صرف انسان نہیں، سمندروں دریاؤں اور نہروں میں اور زمین پر بسنے والی مخلوقات جانور، کیڑے مکوڑے اور ہواؤں میں اڑنے والے پرندے، غرض! یہ کہ ہر جاندار مخلوق کی زندگی کی بقاء کا راز غذا اور خوراک پر منحصر ہے۔

جب خوراک کی فراوانی ہوتی ہے، تو ساری مخلوقات خوشگوار زندگی گزارتی، اور نشوونما پاتی ہیں، اگر غذا کی قلت یا فقدان ہو، یا مہنگائی اور ہوشربا گرانی ہو، تو ساری مخلوقات پر قیامت برپا ہوتی ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور ایذارسانیوں کی پاداش میں عارضی طور پر تنبیہ کی خاطر اہلِ مکہ پر مسلسل چند سال قحط ہوا، لوگ بوسیدہ ہڈیاں تلاش کر کے انہیں پیس کر کے پھانکنے پر مجبور ہوگئے، اور مردار جانوروں کا گوشت اور ہڈیاں کھانے لگے، پھر آپ کی دعا کی برکت سے قحط ختم ہوا، مگر مشرکین اپنے شرک پر بدستور قائم رہے۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے کے سات سالہ قحط کا قرآن حکیم میں تذکرہ ہے۔

اسی قحط کی وجہ سے تو بنی اسرائیل فلسطین کو چھوڑ کر مصر میں آباد ہوئے، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کا خاندان جو بہتر افراد پر مشتمل تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے بلانے پر مصر پہنچے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد وہاں کے حکمران فرعونیوں نے بنی اسرائیل قوم کو غلام بنایا، چار سو سال تک غلام رہے، پھر جب موسیٰ علیہ السلام انہیں غلامی سے نجات دلا کر مصر سے روانہ ہوئے، تو اس وقت بنی اسرائیلی قوم چھ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، تفصیل پہلے گزر چکی۔

جب کوئی جاندار بغیر غذاء وخوراک کے زندہ نہیں رہ سکتا، اور یہ غذاء ہر جاندار کے لئے روحِ حیات سے کم نہیں ہے، تو ارشاد فرمایا کہ: ''بسا اوقات ہم انسانوں اور حیوانوں کی خوراک روک کر کم کرتے ہیں، اور انہیں

بھوک کی بیماری میں مبتلا کر کے آزمائش میں ڈالتے ہیں، یا بطورِ تنبیہ وعذاب، گناہوں اور معاصی کی وجہ سے انہیں سزا دیدیتے ہیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہے۔ ساری خلقت کو غذا مہیا کرتا ہے، کیونکہ وہ رزّاق ہے، اور رزق کے معاملے میں ایمان وکفر کا فرق نہیں کرتے، مگر جب لوگ مسلسل نافرمانیاں کر کے زکوٰۃ وصدقات اور ہر قسم کی ہمدردیوں سے منحرف ہوجاتے ہیں، تو بطورِ تنبیہ وعذاب ان پر قحط سالی، گرانی، اشیاء صرف کی کمی یا فقدان، اور مہنگائی کا عذاب مسلّط فرماتے ہیں۔ دیکھیں سورۃ المطففین کی تفسیر۔

تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی بعض ملکوں میں ایسے قحط مسلط ہوئے جن سے لاکھوں انسان اور بے شمار مال ومویشی ہلاک ہوئے، اس سلسلے میں بنگال کا قحط بہت مشہور ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین

(۳)......تیسری چیز﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ﴾

یعنی مال اور جان کا نقصان۔ انسانی معیشت کا سب سے بڑا ذریعہ یہی مال ہے۔ اگر مال ہے تو سب کچھ ہے، مال نہیں، تو کچھ بھی نہیں، دوسرے درجے میں خاندانی رشتوں اور عزیز واقارب کی کثرت ہے، تو ظاہر ہے کہ اگر رشتہ دار اور قوم وکنبہ اور قبیلے کے لوگ کثیر تعداد میں ہوں، تو ایسے لوگوں کو معزز ومحترم اور محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی کسی درخت کی طرح اکیلا بے یار ومددگار رہوگا، تو غیر محفوظ سمجھا جائے گا۔

تو مطلب یہ ہے کہ کبھی ان کا دونوں چیزوں کی کمی اور نقصان سے امتحان ہوگا۔ مالی نقصان کئی طریقوں سے ہوتا ہے، مثلاً مال چوری ہوگیا، تجارت میں نقصان ہوا، بادشاہ وحاکم یا دوسروں نے اس پر قبضہ کیا، یا مال گم ہوگیا، مویشی ہلاک ہوگئے، گھر بار تباہ ہوا، عزیز واقارب ہلاک ہوئے، سیلاب میں، زلزلہ میں، عمومی آفتوں اور بیماریوں میں، جنگوں اور لڑائیوں میں۔ الغرض! مالی وجانی نقصانات کے بے شمار اسباب ہیں۔ پس صابرین کے لئے ایسے تمام مراحل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت اور اُجر وثواب کا وعدہ ہے۔

(۴)......چوتھی چیز﴿والثَّمَرٰتِ﴾

پھلوں، سبزیوں اور ہر قسم کی زمینی پیداوار اور فصلوں کا نقصان ہے، مثلاً یہ کہ محنت کے باوجود پھل کی پیداوار ناقص ہو، یا باغ ہی تباہ ہوجاتے، یا قیمتِ فروخت میں کمی ہوجائے، یا کسی ناگہانی آفت سے فصل تباہ ہوجائے، وغیرہ۔ بہت سے اسباب کے تحت یہ حوادث پیش آسکتے ہیں۔ یہ سارے حوادث اللہ تعالیٰ کی طرف سے

کڑی اور سخت آزمائش ہیں، پس ان مصیبتوں پر صبر کرنا، اور جزع فزع سے مکمل اجتناب کرنا اصلی کامیابی اور مسلمانوں کے لئے روحانی معراج ہے۔

جو شخص صابر رہتا ہے، اور پورا پورا صبر کا حق ادا کرتا ہے، تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمان ہے: ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ کہ آپ ( ) میرے صابر وشاکر بندوں کو خوشخبری سنادیں کہ انہوں نے میری رضا حاصل کرلی۔ انہوں نے جنت اور دوسری تمام نعمتوں کا استحقاق حاصل کرلیا، اور وہ لوگ یہ ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ وہ لوگ، جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ہم سب اللہ تعالیٰ کے مملوک اور مال ہیں، ہماری جان ا ر ہمارا مال وغیرہ سب اسی کی ملک ہے، جو چاہے لے، اور جو چاہے چھوڑ دے۔ ہم ربّ تعالیٰ کے غلام ہیں۔ غلام کو آقا کے سامنے دم زدن کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اَرحم الراحمین ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے، اس کا کوئی کام مصلحت وحکمت سے خالی نہیں ہے۔ ہم سب باری باری اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے، تو ہمیں وہ سب کچھ مل جائے گا، جو ہم سے لیا گیا تھا، بلکہ اضافے کے ساتھ مل جائے گا۔

ع آنچہ در وہمت نیاید آن دہد

وہ ہمیں وہ وہ نعمتیں عطا فرمائیں گے، جو ہمارے وہم وگمان میں نہ ہوں۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے: اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَعْطٰى وَلَهٗ مَا اَخَذَ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔ پوری کائنات اور اس میں موجود سب کچھ اسی شہنشاہِ حقیقی کی ملک ہے، وہ جب چاہے عطا کرتا ہے، اور جب چاہے اٹھالیتا ہے، زندگی ہو یا مال واولاد ہو، کوئی منصب ہو یا جسم وجان یا اور کچھ وہی سب کا مالک ہے، وہ اپنی ملک میں حکمت ومصلحت کے ساتھ فاعلِ مختار ہے۔ یہ بھی اس کا کرم ہے کہ اپنی ملک اور اپنی چیز اٹھانے پر صبر کرنے والوں کو ایک نہیں، لاکھوں نعمتوں کے ساتھ نوازتا ہے، اور بے حساب بدلہ عنایت کرتا ہے۔

﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ حدیث شریف میں ہے کہ یہ وظیفہ خصوصیت کے ساتھ اس امت کو عطا ہوا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی پر ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ [یوسف: ۸۶] (میں اپنے رنج وغم کی فریاد صرف اللہ سے کرتا ہوں) کہا۔ اِنَّا لِلّٰهِ نہیں کہا، کیونکہ ان کو یہ وظیفہ نہیں دیا گیا تھا۔ [معارف]

سید کائنات نے فرمایا کہ: ''ہر چھوٹی بڑی مصیبت پر یہ پڑھا کرو، اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے، یا تمہیں ٹھوکر لگ جائے، یا چراغ گل کرو، یا اس سے بھی ادنیٰ واردات ہو، تو اس پر بھی ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ پڑھنا چاہیے۔

سرورِ عالم نے یہ بھی فرمایا: جس کسی مسلمان کو کوئی رنج و مصیبت پہنچے، اس پر چاہے جتنا زیادہ وقت گزر جائے، اور پھر کبھی اسے یاد آئے وہ ''اِنَّا لِلّٰهِ'' پڑھے۔ تو مصیبت کے وقت صبر پر جو اجر ملا تھا، وہی اب بھی ملے گا۔ [مسند أحمد]

ابو طلحہ خولانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سید کائنات نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی مسلمان کا بچہ مرجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ملک الموت سے دریافت فرماتے ہیں کہ تو نے جب میرے بندے کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے کلیجے کا ٹکڑا چھین لیا، تو اس کا ردِ عمل کیا رہا؟ ملک الموت کہتے ہیں: یا ربّ! اس بندے نے تیری تعریف اور حمد و ثناء بیان کی، اور اِنَّا لِلّٰهِ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے لئے جنت میں گھر بنالو، اور اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھو۔ اس حدیث کی امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے۔

اس دعا کے ساتھ ایک اور دعا بھی ہے، جسے سرورِ عالم نے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کو سکھایا تھا، جو کہ مجرّب اور تیر بہدف ہے، خاص کر گمشدہ چیزوں کے لئے، وہ یہ ہے: ''اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِیْ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَيْرًا مِّنْهَا''۔ [ابن کثیر]

اس دعا (اِنَّا لِلّٰهِ) کی اتنی بڑی فضیلت ہے کہ پڑھنے والے پر خصوصی اور عمومی دونوں قسم کی نعمتوں، اور بے شمار برکتوں کا نزول ہوتا ہے، کیوں نہیں! آخر اس کے معنی پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صابر بندہ نے بطیبِ خاطر فیصلہ کیا کہ میں اپنے پروردگار کے فیصلے پر دل و جان سے راضی ہوں، اور اس کے ہر فیصلے کو قبول بھی کرتا ہوں۔ حدیث یہی پیغام دیتی ہے۔

سید کائنات نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جائے گا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ناراض ہوگا، تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہو جائے گا۔ ظاہر ہے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو، وہ تباہ ہوگا۔

اب فرماتے ہیں کہ صبر کرنے والے، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے والے لوگوں کا صلہ یہ ہے:

﴿أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾ (یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں)۔سبحان اللہ! نظرِ رحمت وعنایت کی حد نہیں، وہ اس لئے کہ کتاب وسنت میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، مگر مخصوص اور پسندیدہ مسلمانوں پر بھی خصوصی توجہ کی بنیاد پر صلوٰۃ کا اطلاق ہو رہا ہے۔

دوسرے مقام پر بھی ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۴۳] (وہی تو ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے، اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے، اور خدا مومنوں پر مہربان ہے)۔

یہاں عام مؤمنین کے حق میں لفظِ صلوٰۃ استعمال ہوا، جس کے معنی ہوں گے ''خصوصی عنایت''۔ اور رحمت سے مراد عمومی عنایات ہوں گی۔ اس اطلاق کا فلسفہ یہ ہے کہ دراصل صابرین انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہے۔ وہی حضرات سید الصابرین وسادات الصابرین ہیں، لیکن اگر کوئی مؤمن ان کی طرح صابر وشاکر ہو، پھر تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ صبر ورضا انبیاء علیہم السلام کے صبر کا سایہ، ہمرنگ ونمونہ اور مثال ہے، تو اس پر اسی وجہ سے صلوٰۃ کا اطلاق ہوا۔

خلاصہ یہی ہوگا کہ صلوٰۃ سے مراد عنایاتِ خاصہ، اور رحمۃ سے مراد عنایاتِ عامہ ہیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نِعْمَ الْعِدْلَانِ وَنِعْمَ الْعَلَاوَۃُ۔ یعنی اس آیت کریمہ میں تین چیزوں کا وعدہ ہے: صلوٰۃ، رحمت، اور ہدایت۔ اوّل دو جوڑے اور عدیل ہیں۔ یہ دونوں کیا ہی اچھے عدیل اور جوڑے ہیں؟ اور ہدایت ان کے علاوہ ہے، اور زیادتی ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اونٹ پر جب تین چیزوں کا بار لادا جاتا ہے، تو دو چیزوں کو دائیں بائیں جانب رکھا جاتا ہے، تیسری چیز کو ان دونوں کے اوپر رکھتے ہیں، تو اوّل دو کو ''عدلین'' کہتے ہیں، اور تیسری چیز کو ''علاوہ'' کہتے ہیں، جس کا فارسی میں ترجمہ ہوگا: ''سربار''۔ عدلین کے معنی برابر کے ہیں۔ واللہ اعلم

مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ اس دعا کے اوّل حصہ (اِنَّا لِلّٰہِ) میں عقل کی تسلّی ہے، جبکہ دوسرے حصہ (وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) میں طبیعت کی تسلّی ہے۔ اوّل حصہ (اِنَّا لِلّٰہِ) کا اقرار فرض ہے، اور یہ عقلی ہے، کیونکہ عقلِ سلیم یہی کہتی ہے کہ ہر چیز کا مالک اور متصرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دوسرے حصہ کا اقرار مستحب کے درجہ میں ہے کہ آدمی اپنے یا اپنے عزیز وقریب کی موت پر رضامندی کا اقرار واظہار کرے، اور موت کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور وصال کا ذریعہ سمجھے، اور اس پر راضی بھی ہو، کیونکہ دنیا کے جیل خانہ سے نکلنے اور بہشت کے باغوں تک پہنچنے کا واحد ذریعہ یہی موت ہے،

جیسے فرمایا: "تُحفَةُ الْمُؤْمِنِ اَلْمَوْتُ"۔ اسی طرح اَلْمَوْتُ جسرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔ وفی روایة: یُوْصِلُ الْعَبِیْدَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔ واللّٰہ أعلم

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آیت کریمہ میں "خَوْف" سے مراد خوفِ الٰہی ہے، اور "اَلْجُوْع" سے مراد اختیاری بھوک ماہ رمضان کا روزہ ہے۔ ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ﴾ سے مراد زکوٰۃ و صدقات ہیں، اور "الْاَنْفُسِ" سے مراد امراض اور بیماریاں ہیں۔ موت بھی اس میں شامل ہے۔ اور "الثَّمَرٰتِ" سے مراد اولاد ہے، جیسے حدیثِ ترمذی میں بیان ہوا: "ثمرة قلبه" کیونکہ اولاد انسانی زندگی کا پھل ہے۔ یاد رہے! یہ ایک تاویل ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ علیہ نے اسے بیان تو کیا ہے، مگر اس پر قناعت نہیں کی ہے۔ واللہ اعلم

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

ترجمہ: بیشک صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جس شخص نے بیت اللہ شریف کا حج یا عمرہ کیا، اس پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے، اور جس شخص نے خوشی سے نیکی کا کام کیا تو بیشک! اللہ تعالیٰ قدر داں، اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

معارف ومنازل

﴿شَعَآئِر﴾ یا تو "شعیرة"، یا "شعارة" کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: "علامت"۔ قربانی کے اونٹ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے، اور اس کے پہلو اور کوہان پر خنجر سے زخم لگانے کو اِشعار کہتے ہیں، کیونکہ یہ ایک شناختی علامت ہے۔ شعائر اللہ سے مراد شرعی اصطلاح میں وہ مکان اور زمان اور وہ علاماتِ مخصوصہ منفردہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی عبادت وبندگی کے لئے مقرر ہوں، جن سے معبودِ حقیقی جل شانہ کی یاد تازہ ہو، اور یہ چیزیں دینِ حنیف (اسلام) کے ساتھ مخصوص ہوں۔ بعض محققین نے شعائر اللہ کی یہ تعریف کی ہے کہ: "جن سے کفر اور اسلام میں امتیاز پیدا ہو"۔ فقط

مکان کی مثال، جیسے کعبہ مشرفہ، تمام عبادت خانے، یعنی مساجد، عرفات، مزدلفہ، مشعر الحرام منیٰ، رمی جمار،

صفا و مروہ، بیرِ زمزم وغیرہ۔ میرے نزدیک دینی مدارس اور قرآنی مکاتب بھی اس میں شامل ہیں۔ زمان واوقات کی مثال، جیسے اوقاتِ صلوٰۃ، شہرِ رمضان، اَشہرِ حرم، عید الفطر، عید الاضحیٰ، ایامِ حج، جمعۃ المبارک، ایامِ تشریق وغیرہ۔ تیسرے نمبر پر اذان، اوقاتِ خمسہ، اقامتِ صلوٰۃ، نمازِ جماعت، نمازِ جنازہ، نمازِ جمعہ، نمازِ عیدین اور ختنہ وغیرہ۔

ختنہ میں حکمت یہ ہے کہ شیطانی اور نفسانی خواہشات کو ابھارنے، اور جہاں میں اکثر و بیشتر فتنہ و فسادات کا بنیادی عنصر شرمگاہ اور فرج ہے۔ اس پر داغ لگا کر اور مہر لگا کر مرد و زن دونوں کے ختنہ کرنے سے گویا کہ اسے پابند کیا جارہا ہے کہ خبردار! اسے کسی حرام میں ہرگز ملوث نہ کیا جائے، اور خلافِ شرع اسے استعمال نہ کیا جائے۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ پورے جہاں کے بھیانک اور خطرناک مفاسد کی جڑ یہی عضوِ مخصوص ہے، اسی ختنہ کی مہر کے ساتھ اسلام نے اس پر مکمل پابندی عائد کی، جس کی بدولت اسلامی معاشرہ کو شرم و حیاء کی وجہ سے غیر مسلم معاشروں پر برتری اور پاکیزگی حاصل رہی ہے۔

تزکیہ اور تہذیبُ الاخلاق کا چھٹا اصول تعظیمِ شعائر اللہ ہے۔ دراصل دینی امور میں اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ تعظیم کی ضد ہے بے احترامی و بے اعتنائی ہے، اور یہ مطلقاً حرام ہے، بلکہ بعض دفعہ موجب للکفر بھی ہے۔ اسلامی تعلیمات اصول کے درجہ میں ہوں، یا فروع اور جزئیات کے درجہ میں ہوں، ان کی تعظیم اور احترام ہر حال میں ضروری ہے۔ "اَلدِّیْنُ کُلُّہٗ اَدَبٌ"۔ دین دراصل ادب واحترام اور عقیدت و مروّت کا نام ہے۔

شعائر اللہ یا شرائعِ دینیہ ایک ہی بنیاد کے دو متبادل نام ہیں۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ بڑے اور عظیم شعائر اللہ چار ہیں: (۱) رسول اللہ کی ذات عالی صفات۔ (۲) کتاب اللہ۔ (۳) کعبۃ اللہ (سارے جہاں کا قبلہ و کعبہ شریف)۔ (۴) الصلوٰۃ (نماز)۔ شعائر اللہ میں یہ چاروں سب سے افضل ہیں۔

آیت کریمہ میں خصوصیت کے ساتھ صفاء و مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے، اور ان کی تعظیم واحترام کا حکم دیا گیا ہے، اور ان کے طواف کا فرمان جاری ہوا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں: شعائر اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ سبحانہ کی تعظیم کے مترادف ہے، کیونکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سبحانہ کی یادآوری کا ذریعہ ہیں، ان کو بت پرستی یا شرک اس لئے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کی تعظیم ان کی ذوات کی وجہ سے نہیں کرتے، بلکہ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ہی تعظیم ہے، جن کو دیکھ کر

اس کی عظمت اور یاد، دلوں میں موجزن رہتی ہے۔ [حجة الله البالغة]

قرآن حکیم کا اعلان ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتُحِلُّوْا شَعَآئِرَاللّٰهِ وَلَاالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَاالْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ﴾ [المائدة:۲] (مومنو! خدا کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا، اور نہ ادب کے مہینے کی، اور نہ قربانی کے جانوروں کی، اور نہ ان جانوروں کی (جو خدا کی نذر کردیئے گئے ہوں، اور جن کے گلوں میں پٹے بندھے ہوں)۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ [الحج: ۳۰] (یہ ہمارا حکم ہے) جو شخص ان سب چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں، عظمت رکھے تو یہ پروردگار کے نزدیک اس کے حق میں بہتر ہے)۔ ﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَامِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾[الحج:۳۲] (یہ ہمارا حکم) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں، عظمت رکھے، تو یہ (فعل) دلوں کی پرہیز گاری میں سے ہے)۔ وأیضاً: ﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَالَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَاخَيْرٌ﴾[الحج:۳۶] (اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لئے شعائرِ خدا مقرر کیا ہے، ان میں تمہارے لئے فائدے ہیں)۔

صفاومروہ تاریخ کی روشنی میں:

"صفا" اور "صفوان" لغت میں سخت قسم کی چکنی چٹان کو کہتے ہیں، اور مروہ سفید چٹان کو کہتے ہیں، ان دونوں پہاڑوں کے درمیان تقریباً چار سو سے کچھ زائد میٹروں کا فاصلہ ہے۔ صفا کعبہ شریف کے رکنِ اسود (حجر اسود) کی سیدھ میں ہے، جبکہ مروہ حطیم اور رکنِ عراقی کی سیدھ میں ہے۔ صفا بہ نسبتِ مروہ کے کعبہ شریف سے نزدیک ہے، مگر مروہ بہ نسبت صفا کے تین چار گنا دور ہے۔

یہ دونوں کعبہ شریف سے تقریباً مشرقی سمت میں واقع ہیں۔ دونوں پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں ہیں، عام زمین سے تقریباً تیس چالیس گز اونچی ہوتی تھیں، مرورِ زمانہ کے ساتھ انہیں تراش تراش کر نہایت پست اور عام زمین سے معمولی اونچے ٹیلوں کی شکل میں رکھا گیا ہے۔ شروع میں ان کے درمیان میں سیلابی پانی کا نالہ ہوتا تھا، اس پر فرش ڈال کر اسے برابر کردیا گیا ہے، اس وقت کسی نالہ کا نام ونشان تک نہیں۔

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام شیر خوار بچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو اس مقام پر جہاں آج کعبہ شریف ہے، چھوڑ کر خود واپس ملکِ شام روانہ ہوئے تھے۔ ان کے پاس ایک مشکیزہ پانی

اور کچھ کھجوریں چھوڑ گئے تھے۔ چند دن بعد یہ غذائی سامان ختم ہوا، تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی چھاتی میں بچے کے لئے دودھ کی غذا ختم ہو کر رک گئی، اور خود انہیں بھی بھوک اور پیاس نے ستا کر نڈھال کر دیا۔ انہوں نے کسی قافلہ اور انسان کی تلاش میں قریبی پہاڑی (صفا) پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھا، وہاں سے مایوس ہو کر کوہِ مروہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ درمیانی وادی میں دوڑ لگا کر ''مروہ'' پہنچیں۔

اس طرح حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نہایت بے کسی اور بے قراری کے عالم میں خوف و اضطراب کے ساتھ ان پاک پہاڑوں کے درمیان اپنا عفیف اور پاک دامن پھیلا کر اللہ تعالیٰ سبحانہ سے بھیک مانگتی پھرتی رہیں، یہاں تک کہ سات چکر پورے کیے، حتیٰ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آمد اور آب زمزم کے وجود سے آپ رضی اللہ عنہا کے غم، رنج والم سارے دور ہوئے۔

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں بیان کیا ہے کہ صفا اور مروہ کی سعی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی میراث ہے۔ ان سے یہ روایت نقل ہوتی چلی آرہی ہے کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اس سعی کی بنیاد رکھی۔

اُمّ المؤمنین سیدۃ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سرورِ عالم نے ارشاد فرمایا: کعبہ شریف کا طواف تو بجائے خود نماز کی مانند ہے۔ سرورِ عالم نے ارشاد فرمایا: ''اَلطَّوَافُ حَوْلَ الْبَیْتِ مِثْلُ الصَّلٰوۃِ''۔ یعنی کعبۃ اللہ کے گرد طواف کرنا نماز کی مثل ہے، فرق اتنا ہے کہ نماز میں بات کرنا ممنوع ہے، بات کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اور طواف میں بات کرنے سے طواف فاسد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ طواف میں بات کرنا بہتر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی فرق علماء کرام نے بیان کیے ہیں، مثلاً رکوع، سجدہ، قیام، قراءت، التحیات، استقبالِ کعبہ، یہ چیزیں طواف میں نہیں ہوتیں۔

پس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ طواف خشوع، خضوع، دعا اور خاموشی میں نماز کی طرح ہے، یعنی بڑے ادب کے ساتھ، بغیر گفتگو کے طواف پورا کرنا چاہئے۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ طواف کے دوران تلاوت قرآن سے بہتر ادعیہ ماثورہ کا وِرد ہے۔ بعض علماء کرام (سلف وخلف) میں ایسے بھی گزرے ہیں، جو طواف کے دوران پورا قرآن ختم کرتے، اور یہ اس وقت ممکن ہوگا کہ پانچ چھ گھنٹے مسلسل طواف ہو، اور یہ بڑی سعادت ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حج کے لئے آتے، تو صفا و مروہ کے درمیان "لبیک" کہتے ہوئے دوڑتے، اُدھر ربّ العزت سبحانہ کی طرف سے بھی "لَبَّیکَ عَبدِیْ" کی آواز سنتے۔ یہ ہے ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ کا وعدہ اور ثمرہ۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصحابِ باطن اس امت کے بھی اسی طرح کی جوابی آواز سنتے رہے ہیں، اور قیامت تک سنا کریں گے، جیسے کہ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ ؎

کار پاکان را قیاس از خود مگیر ☆ گرچہ در ظاہر نوشتن شیر و شیر

(مثنوی)

اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو "لَبَّیکَ وَسَعْدَیکَ" کہتے ہیں، اور انہیں جواب ملتا ہے: "لَا لَبَّیکَ وَ لَا سَعْدَیکَ وَحَجُّکَ مَرْدُوْدٌ عَلَیکَ"۔ جس طرح ماں باپ اپنے نافرماں بیٹوں کا سلام رد کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو اپنے بدخواہوں کے سلام کو رد کرتے ہیں، اسی طرح بدعقیدہ، بدعمل، حرام خور اور بُرے لوگوں کا لبیک بھی رد ہو جاتا ہے، شیخ عراقی نے کہا: ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند ☆ تو برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

بزمین، جو سجدہ کردم ز زمین فغان برآمد ☆ کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

بہ حجر چو بوسہ دادم ز حجر ندا برآمد ☆ کہ مرا سیاہ کردی تو بوسۂ ریائی

طواف کے لئے لوگوں نے جن جن دعاؤں کا انتخاب کیا ہے، اور بڑی چالاکی اور عجلت سے انہیں رٹ لگا کر پڑھتے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگوں کو منع مت کرو۔ اس طرح کی دعائیں بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتیں، اگرچہ ان کا ثبوت سنت میں نہیں ہے۔ البتہ! یہ ملحوظ ہو کہ دربارِ الٰہی میں شور و شغب اور زور شور سے دعا مانگنا، وہاں کے آداب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ سکوت و خاموشی اور عجز و نیاز والی دعاؤں کی اجابت یقینی ہو جاتی ہے۔ تنہائی میں اگرچہ چیخ چیخ کر دعا بہتر ہے، لیکن یہ طریقہ ہزاروں کے مجمع میں بہتر نہیں ہوتا، کیونکہ دوسروں کی دعاؤں میں خلل پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔

آج کل اگر کوئی شخص سنت کے مطابق طواف کرنا چاہے، تو ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اِلّا ماشاء اللہ، کیونکہ موجودہ زمانہ کے لوگوں میں آدابِ حرم اور آدابِ طواف تقریباً ناپید ہیں۔ اللہ ہی رحم فرمائے۔

صفاومروہ کی سعی ہمارے احناف کے نزدیک واجب ہے، اور ترکِ واجب کا کفارہ ''دم'' ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رکن اور فرض ہے، اس کے ترک سے حج نہیں ہوتا۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ آیت کریمہ کے ظاہر سے معلوم ہورہا ہے کہ صفاومروہ کی سعی کوئی ضروری نہیں! پس اگر کوئی سعی کرلے، تو اس پر گناہ نہیں ہوگا، حالانکہ بات ایسی نہیں ہے، کیونکہ سعی یا تو فرض ہے، جیسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یا واجب ہوگی، جیسے ہمارے احناف کا مذہب ہے۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے صفاء ومروہ پر مشرکین کے دو بت ''اساف اور نائلہ'' رکھے ہوئے تھے۔ لوگ ان کی پوجا کرتے، اور انہی کی عزّت واحترام میں سعی کرتے تھے، خاص کر مدینہ منورہ کے انصار۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہو، اور بتوں کا راج ختم ہوگیا، تو لوگوں کو اشتباہ ہوا کہ اگر ہم اسلام کے بعد ان مقامات کا طواف کریں، تو کہیں سابق رسم ورواج کی وجہ سے شرک میں شامل نہ ہو، اس پر ارشاد ہوا کہ پریشان نہ ہو، تمہارا موجودہ طواف اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہے، اسی شک وشبہ کو دور فرما کر ارشاد ہوا: یہ شعائر اللہ میں داخل ہیں۔ تم ان کی سعی میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرو۔ اب اگر دوڑ لگا کر طواف کروگے، تو یہ بتوں کی تعظیم نہیں ہوگی، بلکہ یہ تعظیم شعائر اللہ کی ہوگی، اور تم پر کسی قسم کا گناہ نہیں لازم آئے گا۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾ فرمایا: اللہ تعالیٰ قدرداں اور علم والا ہے، جو شخص اپنی مرضی اور خوشی سے بطورِ تطوع کوئی ادنیٰ سا عمل انجام دے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کی قدر کریں گے، کہ یہ شخص بغیر التزام و وجوب کے محض اخلاص کی بنیاد پر نیک اعمال کی انجام دہی میں کوشش کرتا اور عمل کرتا ہے، ظاہر ہے کہ لوگ فرائض و واجبات کی تکمیل میں بڑی محنت کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ایسے تطوّع اور قلیل اعمال پر بھی بڑا بے حساب اجر عطا کرتے ہیں، یہ محض اس کی کرم نوازی اور ذرّہ نوازی ہے۔

فائدہ:

حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے نہایت عجز وانکساری کے ساتھ صفاومروہ کے درمیان سعی کی، اور نہایت ذلت و مسکنت کے ساتھ ربّ العزّت سبحانہ کے حضور دامن پھیلایا، اللہ تعالیٰ کے حضور پزیرائی اور شنوائی ہوئی، اور ان کی ساری پریشانیاں دور ہوگئیں، تب تو ربّ العزّت نے ان کی سعی کی قدر کی، اور قیامت تک ان کی سنت کو جاری رکھا۔ اگر مسلمانانِ امت اسی ذلت ومسکنت کے ساتھ سعی کا عمل جاری رکھیں گے، تو ان شاء اللہ ان کی ساری مرادیں پوری

ہوں گی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ
لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ
تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾

ترجمہ: تحقیق وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں جس کو ہم نے واضح باتوں اور ہدایت کے ساتھ اتارا ہے، بعد اس کے کہ ہم نے اسے لوگوں کے لئے کتاب میں بیان کر دیا ہے یہی وہ لوگ ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے، اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں ﴿١٥٩﴾ مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی، اور اپنے آپ کو سنوار لیا، اور انہوں نے بیان کیا پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر میں رجوع کرتا ہوں، اور میں رجوع کرنے والا مہربان ہوں ﴿١٦٠﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں ان لوگوں کے لئے زبردست زجر وتوبیخ اور دھمکی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی باتیں اور شرعی مسائل چھپا لیا کرتے ہیں۔ اہلِ کتاب نے سید کائنات کی نعت چھپالی تھی، جس پر ارشاد ہوا کہ حق باتوں کے چھپانے والے ملعون ہیں، جس طرح اس عالم کے لئے جو لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی باتوں کی تبلیغ کرے، اور پھیلائے ہر چیز استغفار کرتی ہے، یہاں تک کہ دریاؤں کی مچھلیاں اور ہوا کے پرندے اور خشکی کے کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں بھی استغفار کرتی ہیں، اسی طرح ان لوگوں پر جو حق بات کو جانتے ہوئے گونگے اور بہرے بن جاتے ہیں ان پر ہر چیز لعنت بھیجتی ہے، یہی معنی ہیں ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ کے، اور ایسے لوگوں پر فرشتے بھی لعنت کرتے ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے: "مَنْ عَلِمَ عِلْمًا أَوْ سُئِلَ عِلْمًا فَكَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ"۔ [مشکوۃ] یعنی جس شخص سے کسی شرعی امر کی نسبت سے سوال کیا جائے، اور وہ اسے چھپالے، تو اسے قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی، تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ اسی طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے موت سے پہلے اس حدیث کو بیان کر ڈالا، جسے پوشیدہ

رکھنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا، تو صاف ظاہر ہے کہ حق چھپانے والا ملعون ہوگا، اگر توبہ اور تدارک نہ کرے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ میں شریک تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبر میں کافر کی پیشانی پر اس زور سے ہتھوڑا مارا جاتا ہے کہ تمام جانور اس کا دھماکا سنتے ہیں، سوائے جن وانس کے، پھر وہ سب اس پر لعنت بھیجتے ہیں، یہی معنی ہیں لعنت کرنے والوں کی لعنت کے۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "لَاعِنُوْنَ" سے مراد تمام جانور اور تمام جن وانس ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "جب خشک سالی ہوتی ہے، بارش نہیں برستی، تو چوپائے جانور کہتے ہیں: یہ بنی آدم کے گنہگاروں کی شومی ہے۔ اللہ تعالیٰ بنی آدم کے گناہگاروں پر لعنت نازل کرے کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ساری خلقت پر آفت آئی"۔ تو معلوم ہوا کہ نیکوکاروں کے لئے ساری مخلوقات دعا اور استغفار کرتی ہیں، اور ظالموں بدکاروں کے لئے بددعا کرتی اور لعنت بھیجتی ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ لعنت ان لوگوں پر قیامت کے روز بھی ہوتی رہے گی۔ [ابن کثیر]

پھر ان میں سے ان لوگوں کو خاص کرلیا، یعنی وہ لوگ اس لعنت سے مستثنیٰ ہوں گے جنہوں نے اپنی اصلاح کرلی، اور جو حق باتیں چھپائے رکھتے تھے، انہیں کھول کر ظاہر کرلیا، اور اپنے گزشتہ مذموم ارادوں اور کارناموں سے تائب ہوگئے۔ فرمایا تمہارا ربّ توّاب ورحیم ہے، وہ اپنی مہربانی کے ساتھ بہت ہی زیادہ رجوع کرنے والا، اور بکثرت توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اور مر گئے، ایسی حالت میں کہ وہ کفر کرنے والے ہیں، پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور لوگوں کی لعنت ہے، اور سب کی ﴿۱۶۱﴾ اس میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائیگی، اور نہ ان کو مہلت دی جائیگی ﴿۱۶۲﴾

معارف ومنازل

مقصد یہ ہے کہ جو لوگ کفر کی حالت میں مر جائیں گے، وہ ابدی جہنمی ہوں گے، اور دائمی عذاب میں مبتلا

رہیں گے۔﴿أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾[البينة:٦](وہ مخلوقات کے بدترین ہیں)﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾ [المائدة:١٠](وہ جہنم والے ہیں)﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾[العبس:٤٢](وہی ہیں کافراور فاجر) ﴿أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ﴾ [المجادلة:١٩](وہ شیطان کی جماعت ہیں)وغیرہ سے مراد وہ لوگ ہیں، جنہوں نے بالفرض دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہوگا، یا مسکینوں محتاجوں کی کوئی سرپرستی کی ہوگی، کفر کی وجہ سے ان کی نیکیاں کالعدم شمار ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور ساری خلقت کی طرف سے ان پر لعنتوں کے انبار لگ جائیں گے۔ وہ جہنم کے شدید عذابوں میں مبتلا رہیں گے۔کوئی نیکی اور کوئی شفاعت انہیں کام نہیں آئے گی، نہ تو ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی، نہ انہیں کسی قسم کی مہلت حاصل رہے گی، اور نہ ہی وہ کوئی ہمدردی حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ لعنت:

قرآن حکیم اور احادیث میں مختلف لوگوں اور متفرق جماعتوں اور بہت سارے معاصی اور برے اعمال پر لعنت کی گئی ہے، جیسے کہ اس آیت کریمہ میں کتمانِ حق کی وجہ سے حق چھپانے والوں پر، اور کفر وشرک پر مرنے والوں پر زبردست لعنتیں کی گئی ہیں۔ ایک اور مقام پر جھوٹ بولنے والوں پر لعنت آئی ہے:﴿لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ [آل عمران:٦١](اللہ کی لعنت ہو جھوٹوں پر)۔اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والوں پر حدیث میں لعنت آئی ہے، فرمایا: ”اِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَسُبُّوْنَ اَصْحَابِيْ فَقُوْلُوْا لَعْنَةُ اللهِ عَلٰى شَرِّكُمْ“۔اسی طرح چور کے متعلق ارشاد ہے:”لَعَنَ اللهُ السَّارِقَ“(چور پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو)۔اس کے ساتھ والدین کے نافرماں پر بھی لعنت ہو چکی ہے، فرمایا: ”لَعَنَ اللهُ مَنْ سَبَّ وَالِدَيْهِ“(ماں باپ کو گالی دینے والے پر لعنت ہو)۔اسی طرح فرمایا: ”لَعَنَ اللهُ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْاَرْضِ“(مشترک زمین کے نشانات مٹانے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو)۔اسی طرح فرمایا: ”لَعَنَ اللهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللهِ“(غیر اللہ کے تقرّب کے لئے ذبح کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو)۔

اسی طرح قرآن وحدیث میں دیگر بہت سے معاصی اور بہت سارے مجرموں پر لعنت بکثرت ہو چکی ہے۔

اس سلسلے میں مفسرین اور فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ: ہر کسی پر لعنت کرنا درست نہیں ہے، سوائے اس کے کہ جس کا کفر پر مرنا معلوم اور یقینی ہو، جیسے فرعون، ہامان، ابوجہل وغیرہ، یا ان لوگوں پر جنہیں قرآن وحدیث میں علی الاطلاق ملعون قرار دیا گیا ہو، جیسے ابلیس، کفار، مشرکین، منافقین، چور، ڈاکو، زانی اور شرابی وغیرہ۔

کسی مخصوص کافر، مشرک، منافق، شرابی، چور، پر لعنت نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ ایسے مخصوص لوگوں کا خاتمہ

معلوم نہیں ہے، اور نہ ہی کسی معصیت پر کسی کے مصر رہنے کا علم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے لوگ کفر و معاصی سے قبل از موت تائب ہوں۔ اس قسم کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں کہ بڑے سے بڑے کافر مسلمان ہوئے، اور بہت سارے چور ڈاکو وغیرہ آخر عمر میں تائب ہو کر نیک بنے۔ اسی طرح علماء کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی شرارت کی بناء پر حلال جانوروں پر بھی لعنت کرنا درست نہیں ہے، جیسے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جانوروں پر لعنت مت کیا کرو۔ واللہ اعلم

ع۱۹

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

ترجمہ: اور تمہارا معبودِ برحق ایک (اکیلا) ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿۱۶۳﴾

معارف ومنازل

قرآن حکیم کا طرزِ بیان عجیب ناصحانہ اور مبنی بر شفقت ہے کہ جس سے تمام شکوک وشبہات اور الجھنوں سے نجات ملتی ہے۔ قرآن حکیم اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے، تو اس کے اثبات پر باقاعدہ حکیمانہ انداز میں نہایت سنجیدگی سے ایسے مسلّمہ دلائل ذکر کرتا ہے کہ کسی کو انکار کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ لطف یہ کہ وہ دلائل اس قدر مسلّمہ اور بدیہی ہوتے ہیں کہ ہر قسم کے لوگ انہیں سمجھ سکتے ہیں، اور عام فہم ہونے کی وجہ سے ہر شخص انہیں ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور کسی کو جواب دینے یا ردّ کرنے اور اِبطال کی قطعاً ہمت نہیں ہوتی۔

مثلاً یہ کہ یہاں دعویٰ یہ پیش فرمایا کہ تم سب لوگوں کے معبودِ برحق ہونے کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ صرف ایک (اکیلا) ہی معبودِ حقیقی ہے۔ اس کے سوا دوسرا کوئی کسی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہی بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ یہ دونوں اس کی مخصوص ذاتی صفات ہیں، اور موجودہ دعوے پر دلیل بھی ہیں کہ معبود وہ ہوسکتا ہے، جس میں شفقت ورحمت والی صفات ہوں، جس کسی میں یہ صفات موجود نہ ہوں، وہ ہرگز عبادت کا حقدار نہ ہوگا، اور یہ تمہارے نزدیک بھی مسلم ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے یہ صفات کسی غیر میں قطعاً موجود نہیں ہیں۔

دوسرے درجے میں آیت کریمہ ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ میں اس دعوے کے اثبات پر مسلّمہ دس دلائل کا تذکرہ ہے، اور یہ دلائل اتنے واضح اور مسلّم ہیں کہ جنہیں یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ عرب سب نے

تسلیم کیا، جیسے فرمایا: ﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [لقمان:۲۵] (اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ کہہ دیں گے کہ اللہ نے)۔ ان امورِ عشرہ، یعنی دلائلِ عشرہ کا بیان عنقریب آنے والا ہے۔

اس کے علاوہ ان دلائل کے ضمن میں تمہاری بقاء وحیات، اور ہر قسم کی خوشحالی کے اسباب کا بیان بھی ہے، اور تمہارے نظامِ معاش اور کسبِ حلال (رزق وروزی) کا محض تذکرہ ہی نہیں، بلکہ کسبِ معاش کے ذرائع واسباب کی نشاندہی بھی ہے، اور تم سے صاف صاف یہ کہا جارہا ہے کہ ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [النحل:۵۳] (اور جو نعمتیں تم کو میسر ہیں سب اللہ کی طرف سے ہیں)۔ ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [ابراهيم: ۳۴] (اور اگر اللہ کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کرسکو)۔ فرمایا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ [الرحمن:۱۳] (تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتیں کو جھٹلاؤ گے؟)۔

یہ سارا نظام تمہارے لئے ہے۔ یہ بلند وبالا آسمان، یہ شمس وقمر اور ستاروں کا ہلچل، یہ فضاء میں اڑتی ہوئی مخلوقات اور ہوائیں اور بادل، یہ اوپر سے آنے والی بارشیں، یہ کرۂ ارضی اور اس پر لہلہاتے باغات اور پھول، یہ پھل اور میوے، یہ فلک بوس معدنیات سے بھرے ہوئے پہاڑ، یہ حیوانات اور ہر قسم کے جانور، یہ تسخیر شدہ سمندر اور دریا، یہ صاف وشفاف میٹھے پانی اور غلّہ اور دیگر کھیتیاں، الغرض! یہ پوری کائنات، یہ کس کی پیدا کردہ ہے؟ اس عالیشان و بے مثال عالَم اور اس میں لاکھوں نعمتوں کی تخلیق کس کی ہے؟ تمہارے سب کا یہی جواب اور اقرار ہے کہ یہ نظام جس پر لاکھوں سال گزرے، نہ پرانا ہوا، اور نہ ہی اس میں کوئی عیب ورخنہ پیدا ہو، اللہ تعالیٰ کا ہے، اور اسی کی تخلیق ہے۔

کیا آج تک تمہارے معبودانِ باطلہ نے کبھی کسی مچھر، مکھی کی تخلیق کی ہے؟ ہرگز نہیں! تو انصاف اور عقل، نیز ان نعمتوں اور نوازشوں کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تم سارے مل کر بغیر حیلہ وحجت کے، اور بلا کسی چون وچرا کے اس کے آستانۂ رحمت پر سرِ تسلیم خم کرو۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ منعمِ حقیقی اور خالق ہے۔

﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ یہود ونصاریٰ اور دیگر تمام لوگوں سے یہی کہا گیا ہے کہ ہر قسم کی رحمتِ عامہ اور رحمتِ خاصہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ قیامت سے پہلے عمومی رحمتیں سب کے لئے ہیں، قیامت کے بعد خصوصی رحمتوں کے حقدار صرف مسلمان ہی رہیں گے، جنہوں نے توحید اپنائی، رسالت اور قرآن پر ایمان لائے، روزِ قیامت کی تصدیق کی، شعائر اللہ کا احترام کیا، کتمانِ حق سے پرہیز کیا، اور ہر قسم کی

لعنتوں سے محفوظ رہے۔

روزِ قیامت یہ لوگ ابدی سعادتوں کے مالک اور حقدار رہیں گے، پس اگر کسی میں یہ صفات نہ ہوں، اور وہ لعنت کا مستحق بھی ہو، جیسے کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ، تو وہ دائمی و ابدی عذابوں میں رہیں گے، وہ کبھی بے چینی میں، مہلت اور عذاب میں کمی اور تخفیف نہیں پائیں گے، بلکہ ہر مرحلہ ان کے عذاب میں بجائے کمی کے اضافہ ہوتا رہے گا، جیسے فرمایا: ﴿فَذُوۡقُوۡا فَلَنۡ نَّزِيۡدَكُمۡ اِلَّا عَذَابًا﴾ [النباء: ۳۰] (پس چکھتے رہو، ہم تمہارے لئے عذاب ہی بڑھائیں گے)

اِنَّ فِيۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِىۡ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآ بَّةٍ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ: بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے اختلاف میں، اور کشتیوں میں جو لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں، اور جو پانی اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف سے اتارا ہے، جس کے ذریعے زمین کے خشک ہوجانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کیا ہے، اور اس زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں، اور ہواؤں کے پھیرنے میں، اور بادل جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کئے ہوئے ہیں، ان سب چیزوں میں عقلمند لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں ﴿۱۶۴﴾

معارف ومنازل

پہلے کعبۃ اللہ شریف کے مرکزِ ہدایت اور بین الاقوامی قبلہ ہونے کا بیان ہوا، اس کے بعد ملّتِ اسلام کے اہم ترین اصول (ذکرِ الٰہی، شکرِ الٰہی، نماز، دعا، صبر اور تعظیم شعائر اللہ) کا ذکر ہوا، پھر کتاب اللہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ان لوگوں پر لعنت وعذاب کا ذکر کیا، جو حق کو چھپاتے ہیں، آخر میں ان تمام چیزوں کی بنیاد توحید ﴿وَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ کا بیان ہوا۔ آگے توحید کے دلائل کے طور پر دس چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، جو کہ سارے دلائلِ کونیۃ واضحہ ہیں۔ ان دلائل میں جو شخص ضد و تعصب کے گرداب سے نکل کر سنجیدگی سے غور کرے گا، وہ

تصدیق ویقین کی دولت سے مالا مال ہوگا۔تو ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ الی قولہ تعالیٰ:﴿لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ فرماتے ہیں: آسمان کی پیدائش اوراس کی وسیع نیلی چھت، اس میں شمس وقمر کی ضیاء پاشیاں، اور لٹکے ہوئے ان گنت کھربوں ستارے، پھران کا مقررہ وقت پر طلوع وغروب، جن میں آنکھ کے ایک اشارہ اورایک سیکنڈ کے برابر بھی کبھی فرق نہیں ہوتا، ورنہ دائمی نقشے جوطلوع وغروب اوراوقاتِ صلوٰۃ بنائے جاتے ہیں سارے کے سارے بیکار ہوجاتے، مگرایسانہیں ہے، پھران کی گردش اورسفر کے متعین راستے جن سے بال برابر بھی کبھی انحراف نہیں ہوتا، اورزمین کا یہ عریض وطویل کشادہ صحن، اس میں رواں دواں ندیاں اور بہتی ہوئی نہریں، اورتیز سرفتاری کے ساتھ چلتے ہوئے سیلابی ریلے، اور موج مارتے ہوئے مدّوجزر کے ساتھ چلنے والے دریا۔

اسی طرح رات اوردن کی پیہم گردش، ایک دوسرے کے پیچھے مسلسل رفتار، اوران کا گھٹنا بڑھنا، موسموں کی تبدیلی کے ساتھ سرد وگرم رہنا، پھرانقلابی حیثیتوں کے ساتھ طلوع وغروب کی تبدیلی سے مختلف ہونا، کہیں رات، کہیں دن، کہیں طلوع اوردوسرے حصے میں غروب، پھربیکراں سمندروں کی موجوں کے سینوں پرہزاروں مسافروں سے لدی ہوئی، اور لاکھوں ٹن سامان سے بھری ہوئی دیوہیکل پہاڑوں کے برابرکشتیوں، اوربحری جہازوں کا خراماں خراماں پانی پرتیرتے ہوئے گھومتے پھرتے ہوئے آنا جانا، اور ہزاروں میلوں کا سفرمختصرمدت میں طے کرنا۔

اس کے ساتھ فضاء میں مختلف رنگ کے سیاہ وسفید زرد رنگ کے گھنگھور گھٹاؤں بدلیاں (بادل) کا مختلف سمت اورمتفرق جہات سے نمودار ہونا، پھرچشمِ زدن میں پوری فضاء میں چھتریوں کی طرح پھیل جانا، اورزوردار وخوفناک گرج وچمک کے ساتھ برف، اولے، موسلا دھار بارش برسانا، پھرخشک اورمردہ زمین کا اس پانی کواپنے پیٹ میں ذخیرہ کرنا، اوراپنی پیاس بجھانے کی خاطراسے چوسنا، اوردیکھتے دیکھتے پھلوں، پھولوں، گھاس، بوٹیوں، پتوں وغیرہ سے سرسبزوشاداب ہونا، اورطرح طرح کی خوشبوؤں سے مہک اٹھنا، اورلہلہاتے گلاب وچنبلی ودیگر خوشبوؤں سے باغِ ارم کی نظیرپیش کرنا، اسی طرح کرۂ ہوا میں موسم اور ہوا کے ذریعہ اورشرقی وغربی ہواؤں کی جھونکوں سے بادلوں کا اوپرنیچے ہونا، کبھی برسنا اورکبھی ہفتوں مہینوں تک سائبان کی طرح سایہ فگن رہنا، راتوں کی شبنم کے ذریعہ زمین کوتروتازہ رکھنا، اوردرختوں کے زلفوں پردبیزدبیز باریک آب پاشی کرنا۔

پھرلطف یہ کہ یہ سب کچھ انسانوں کے لئے، اوریہ بھی کہ ان بے جان چیزوں کے علاوہ خشکی اورسمندروں کی

گہرائیوں میں اور صحراؤں کی وسعت اور پہنائیوں میں، کبھی زمین کے اوپر، کبھی فضاؤں میں ان گنت و بے شمار حیوانات جانور، چرند پرند، باریک سے باریک، موٹے، دبلے، پتلے چھوٹے بڑے، ہرقسم کے ذوی الارواح جانوروں کی پیدائش، ان کی نشوونماء، اور بودوباش بکثرت فراوانی کے ساتھ۔ ان کی خوراک، غذاء، رزق وروزی کا محیر العقول انتظام وغیرہ، یہ سب کی سب ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو عالم تو جانتے ہوں، اور بے علم نہ جانتے ہوں، یا عقلمند سمجھ سکتے ہوں، اور بے عقل وکم عقل کی سمجھ سے بالاتر ہوں، بلکہ کائنات کی کتاب کا ہر ورق، بلکہ ہر سطر عقلمند وکم عقل کے لئے یکساں طور پر روشنی کا مینار ہے، کیا اچھا کہا شاعر نے: ؎

ففی کل شئی له اٰیة ★ تدلّ علی أنه واحد

مگر لطف یہ کہ اتنا واضح اور ظاہر ہونے کے باوجود اتنا سطحی بھی نہیں کہ اہلِ دانش واصحابِ فکر کے لئے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان نہ ہو، بلکہ انہیں دعوت ہے کہ اپنے نشترِ تحقیق سے ہر ذرّے ذرّے کا دل چیر کر آپریشن کریں، اور دیکھیں کہ ان میں اسرار ورموز، حقائق ومنازل اور قوت وطاقت کے وہ بیکراں سمندر موجزن ہیں، جن کا انہیں تصور تک نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ہر لمحہ مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کا ذکر فرمانے کے بعد قرآن کریم نے بار ہا موقع بموقع "اَفَلَاتَتَفَکَّرُوْنَ، اَفَلَاتَدَبَّرُوْنَ" کے جملے ارشاد فرمائے۔ کیا تم غور نہیں کرتے؟ کیا تم تدبّر نہیں کرتے؟ اور ان چبھتے ہوئے فقروں سے عقل ودانش اور خرد کو للکارا ہے۔

کاش! یہ للکار اور دعوتِ غور وتدبّر ہمارے خفتہ اور مردہ دلوں کو بیدار کردے، اور پژمردہ دلوں میں ابوذر و بلال رضی اللہ عنہما کا جذبہ وحرارت پیدا کردے۔ نہایت مایوسی کے عالم میں گھرے اور سوئے ہوئے قلوب کے لئے کیا یہ پیغام کافی وشافی نہیں جو کہا گیا تھا: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ [البقرة:۲۹] (اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے)۔ مگر یہ روشن اور واضح دلائل ان لوگوں کے لئے کارآمد اور فائدہ مند ہیں، جن کی عقل کی آنکھ بینا ہے۔ جس کے پاس چشمِ بینا نہ ہو، اور اس کا قلب وباطن تاریک ہو، وہ اندھا نابینا اس سے استفادہ نہیں کرسکتا۔

معجزۂ شق القمر کو دیکھ کر مکہ مکرمہ سے دس ہزار کلومیٹر دور مالیمار کا راجہ تو اسلام قبول کرسکتا ہے، مگر جو لوگ میل سے کم فاصلے پر تھے، اور جن کی عقل کی آنکھ نابینا وتاریک تھی، انہیں یہ سعادت نصیب نہ ہوئی، فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاهُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَلَایَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّاخَسَارًا﴾ (اور ہم قرآن (کے ذریعے)

وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے، اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے) [الإسراء: ۸۲] ﴿أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الأعراف: ۱۸۵] (کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں ان پر نظر نہیں کی؟) یہ دس چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان میں تدبر وتفکر کرنے سے مسئلہ توحید نکھر کر ایسا واضح ہو جاتا ہے جس میں کسی قسم کا ادنیٰ شک وشبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ ساتھ ساتھ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر انسانی معاش کا دارومدار بھی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں پر افسوس ہے جو ان دلائلِ قدرت کو دیکھ کر ان میں غور وتدبر نہ کریں۔ [مظهري]

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ ع

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو (اللہ کے) شریک بناتے ہیں، ان سے ایسی محبت کرتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہئے، اور جو ایماندار ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت میں زیادہ شدید ہیں، اور اگر دیکھیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ بیشک ساری قوت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے ﴿۱۶۵﴾ جب کہ بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی، اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے، اور ان کے اسباب منقطع ہو جائیں گے ﴿۱۶۶﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی، کہیں گے کہ کاش اگر ہمارے لئے دنیا میں پلٹنا ممکن ہو تو ہم بھی ان سے بیزاری کا اعلان کریں، جیسا کہ یہ آج ہم سے بیزار ہوئے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ دکھلائے گا ان کو ان کے اعمال حسرت دلانے کے لئے، اور وہ دوزخ کی آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے ﴿۱۶۷﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں فرمایا کہ آسمانی نظام، اور اس میں بے شمار اختلافات، زمینی نظام اور اس کی پیداوار، نیز زمین کی مٹی سے پیدا شدہ اربوں انسانوں کی شکل وصورت اور ہر چیز میں اختلاف، پھر رات دن اور طلوع وغروب وغیرہ میں اختلاف، ہواؤں، بادلوں، سمندروں، بحری جہاز، کشتیوں کا نظام اور اس میں اختلافات یہ سارے دلائلِ توحید عقلمندوں، داناؤں، اہلِ نظر اور غور وفکر کرنے والوں کے لئے آیات ہیں۔ أولو الألباب انہیں نشانیوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور وحدت کا کھوج لگا کر ایمان لاتے ہیں۔

اب ان آئندہ آیات میں حمقاء، بے عقل اور گدھوں سے بدتر انسانوں کا تذکرہ ہے، جو مناظرِ قدرت اور براہینِ توحید سے انحراف کر کے شرک کے مرتکب ہوئے۔ عاجز وناتواں مخلوقات سے نفع ونقصان طلب کیا، اور ضعیفوں کو قوی وقادر اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ برابر، شریک اور ہمسر سمجھا۔ یہ لوگ کتنے بڑے ظالم، بے انصاف اور بے عقل ثابت ہوئے؟ جو خالق ومخلوق میں فرق کرنے سے قاصر ہوئے، وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو گئے۔

گزشتہ آیات کریمہ میں دس دلائلِ توحید کے ساتھ دس انعامات اور احسانات کا بیان بھی ہوا۔ ان احسانات کا تقاضا یہ تھا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانتے، اور خالص اس کی عبادت کرتے، اس سے محبت کا رشتہ جوڑ کر ابدی راحت حاصل کرتے، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا﴾ اور لوگوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ نِدّ کی مذمت پہلے بھی بیان ہو چکی ہے، جیسے کہ فرمایا تھا: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۲] (اللہ تعالیٰ کے مدمقابل شریک نہ بناؤ، اور تم بخوبی جانتے بھی ہو) کہ خالق ومالک، متصرف ورازق صرف وہی ہے، مسبِّبُ الاسباب بھی وہی ذات پاک ہے، لہٰذا دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے کا ہرگز کوئی جواز نہیں ہے۔

فرمایا: جب لوگ غیروں کو اللہ تعالیٰ کے مدمقابل تسلیم کر لیتے ہیں، تو پھر کرتے یہ ہیں:

﴿يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ ان سے اس درجہ کی محبت کرتے ہیں، جس درجہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہئے، اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ یہیں سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے، جب غیر اللہ کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت سے تجاوز کر جاتی ہے، یا اس کے برابر آ جاتی ہے، تو پھر تمام وہ صفات غیر اللہ میں بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے

ساتھ مخصوص ہیں، اور پھر غیر اللہ سے بھی اسی طرح حاجت روائی اور مشکل کشائی کا مطالبہ ہونے لگتا ہے جو کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سبحانہ سے ہونا چاہئے، اس لئے فرمایا کہ بعض بد بخت ناعاقبت اندیش ایسے بھی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، اور پھر ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے ہونی چاہئے۔ فرمایا: شرک کی اس نجاست کے برخلاف:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (اور اہلِ ایمان کا گروہ ایسا ہے جن کے دل میں شدید ترین محبت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے)۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو مدمقابل ٹھہرا کر ان کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں برابر کا شریک ہرگز نہیں بناتے۔ قیامت تو ابھی دور کی بات ہے، قرآن پاک شاہد ہے کہ مشرکین بعض اوقات اپنے باطل معبودوں سے مایوس و ناامید ہو کر سخت مصیبت اور پریشانی آنے پر دنیا میں ہی اپنے معبودوں کی محبت ترک دیتے ہیں۔ جب ان کی کشتی طوفان میں پھنس جاتی ہے، تو قرآن پاک کہتا ہے: ﴿دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [العنکبوت: ۶۵] تو جعلی اور باطل معبودوں کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کو پکارنا شروع کر دیتے ہیں، اور پھر آخرت میں تو بیزاری کا اعلان بھی کر دیں گے، جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔

اس کے برخلاف اہلِ ایمان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، کیونکہ ان کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالذات ہے، اور مخلوقات، مثلاً انبیاء علیہم السلام و صلحاء، والدین، اولاد، بیوی، بھائی اور بہن وغیرہ کے ساتھ ان کی محبت بالتبع ہے، اس لئے کہ محبت محبوب کی عزّت اور کمال کے مطابق ہوتی ہے، اور عزّت اور کمال اور جود و بخشش میں خداوند جل شانہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ وہی منعمِ حقیقی ہے، اس لئے راحت اور شدّت، بیماری اور تندرستی، شادی اور غم کسی حال میں بھی اہلِ ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ سے کم نہیں ہوتی، اور کسی بھی صورت میں زائل بھی نہیں ہوتی، تو جہاں محبت بالذات ہوتی ہے، وہاں اس میں کمی کا امکان نہیں ہوتا۔

بخلاف مخلوقات کے، کہ ان کے ساتھ محبت بالذات نہیں ہوتی، اور ایسی محبت صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے، اور اس کا اندازہ اور مقدار بھی حکمِ الٰہی کے تابع ہوتی ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام و اولیاء کے ساتھ تمہاری محبت کی مقدار یہ ہے، والدین یا دوسروں کے ساتھ یہ انداز، اور اس اندازہ اور مقدار کی پابندی ضروری ہوتی ہے، اس سے تجاوز کرنے کا بندہ کو ہرگز اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ورنہ تو گناہ لازم آئے گا، اور بسا اوقات وہ پسندیدہ اور محمود محبت موجبِ شر ہوگی، اس لئے سید کائنات نے ارشاد فرمایا کہ میری محبت اور تعریف میں اعتدال

پر رہو، مجھے اللہ تعالیٰ کا بندہ اور رسول کہا کرو۔ نصاریٰ نے جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں حد سے بڑھ کر انہیں ابن اللہ اور خدا کا درجہ دیا، اور اس گستاخی پر وہ تباہ ہو گئے، تم میرے بارے میں ان کی طرح مت بنو۔ میں اللہ تعالیٰ کا صرف بندہ اور رسول ہوں۔ [متفق علیه]

ہمارے زمانے میں جس طرح شیعہ حبِ علی کرم اللہ وجہہ وحبِ اہلِ بیت میں بے اعتدالی کی وجہ سے تباہ ہو گئے، اسی طرح اہلِ بدعت وضلالت برائے نام محبانِ نبوت، جو حقیقت میں نبوت کے دشمن ہیں، اتنے تباہ ہو گئے کہ توحید کے بدلے خالص شرک کو خرید لیا ہے۔

محبت کی اقسام:

محبت کی مختلف قسمیں ہیں، جیسے محبتِ طبعی (فطری) محبتِ عقلی، محبتِ شرعی وغیرہ۔ طبعی محبت دراصل غیر اختیاری محبت کا نام ہے، جیسے عاشق کی اپنے معشوق کے ساتھ محبت، خاوند اور بیوی میں محبت، باپ بیٹے اولاد کی محبت، اسی طرح رشتہ داروں اور عزیزوں کی محبت۔ اس قسم کی محبت جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے، اس لئے اس کا نام طبعی اور فطری مقرر ہوا۔ جبکہ عقلی محبت میں عقل کا واسطہ موجود ہے، جیسے کوئی کسی پر احسان کرے، تو عقل اسے مجبور کرتی اور برانگیختہ کرتی ہے کہ وہ اپنے محسن سے ساتھ محبت کرے۔

شرعی محبت وہ ہے جس میں شریعت باعثِ محبت ہو، جیسے قرآن مجید، انبیاء علیہم السلام، صلحاء، نماز اور دیگر احکامِ شریعت سے محبت۔ درحقیقت عقلی اور شرعی محبت ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں، اور جس محبت کو کمالِ ایمان اور رضائے رحمٰن کا سبب بتایا گیا ہے، وہ یہی شرعی محبت ہے، جس کے سامنے طبعی اور عرفی محبت کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور یہ محبت اللہ تعالیٰ منعمِ حقیقی کے ساتھ بالذات ہے، اور باقی مخلوقات کے ساتھ حسبِ حکمِ ربانی بالتبع ہے، اور اس کی کمی وبیشی ہر قسم کا اندازہ ومقدار حکمِ الٰہی کا تابع ہے۔ تفصیل اپنے مقام پر آنے والی ہے، ان شاء اللہ

محبت کے اسباب ودواعی کا بیان:

یوں تو محبت کے اسباب ودواعی بہت سے ہیں، مگر مرکزی اور بنیادی اسباب صرف تین ہیں:

(۱) حسن وجمال (خوبصورتی) (۲) کمالِ عزت وشرافت (۳) احسان وبخشش۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت چونکہ بالذات کے درجہ میں ہے، اور وہ ذات پاک ان تینوں اسباب کا خالق و مالک بھی ہے، اور یہ اسباب اس کی ذات میں علیٰ وجہ الاتم موجود ہیں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ساتھ محبت

بھی علی وجہ الاتم، اَعلیٰ اور کامل ہونی چاہئے، اور جس طرح اس کی ذات واحد ولاشریک ہے، اسی طرح اس کی محبت میں بھی کسی غیر کے اشتراک وشرکت کا کوئی امکان نہیں ہے، یعنی اس کی محبت میں کسی شرک کی گنجائش نہیں ہے، اسی وجہ سے کفار پر زجر وتوبیخ کا نزول ہوا کہ انہوں نے اس محبت میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرایا۔

اس نکتے کی مختصر وضاحت یہ ہے سید کائنات محبوب موجودات نے فرمایا: "اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِنْ نِعَمِهٖ"۔ [ترمذي] اے لوگو! تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرو کہ اس نے تمہیں نعمتیں عطا کی ہیں وہ منعمِ حقیقی ہے۔

تمہارا اپنا وجود اور اس کے علاوہ جتنی بھی چیزیں دنیا میں ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، لہٰذا اس سے محبت کرو (خوب اس کی اطاعت کرو) پھر فرمایا: "وَاَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ اللّٰهِ تَعَالٰی"۔ خدا تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے بھی محبت کرو۔ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھایا، اور اس کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس کا کلام اور اس کی شریعت تم کو دی ہے، اور پھر فرمایا کہ میری وجہ سے میرے اہلِ بیت سے بھی محبت کرو۔

دوسری روایت میں ہے کہ میری وجہ سے میرے اصحاب (رضی اللہ عنہم) سے بھی محبت کرو۔ معلوم ہوا کہ کسی سے محبت کرنے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں: مثلاً اگر کوئی جمال وحسن کی وجہ سے محبت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جمیل بالذات ہیں، لہٰذا اصلی اور ذاتی محبت اسی سے ہونی چاہئے۔ حسن وجمال خود اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں، اسی لئے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اصلی محبت اسی سے ہو۔ محبت کی دوسری وجہ کمال بھی ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کمال بالذات ہے، اور باقی چیزوں میں کمال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، لہٰذا اس لحاظ سے بھی محبت کے لائق ذات خداوندی ہی ہے۔ اسی طرح محبت کی تیسری وجہ احسان وبخشش بھی ہے، اور یہ احسان اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے، جب کسی پر کوئی احسان کرتا ہے، تو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے بڑا احسان کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، لہٰذا مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن سے محبت رکھے، اور بہت رکھے۔

نتیجہ اور خلاصہ یہ ہے کہ محبت کے جتنے اسباب ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں، اسی طرح محبت کے جتنے مواقع اور مقامات ہیں، وہ بھی اس کے حکم وفرمان کے ساتھ وابستہ ہیں، اور محبت کے جو مراتب ودرجات ہیں، وہ بھی اس کے مقرر کردہ ہیں۔ پس لازم یہی ہے کہ ان اسباب اور مواقع، نیز مراتب وغیرہ میں اسی کے احکام پر عمل ہو، اور افراط وتفریط سے بچ کر صرف اعتدال پر عمل ہو۔ اس سلسلے میں کتاب وسنت سے رہبری حاصل کرکے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور غیر اللہ کی محبت ایک سطح پر برابر نہ ہو، ورنہ شرک

لازم آئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہر چیز اور مخلوقات سے اعلیٰ بھی ہے، اور مقدم اور ذاتی بھی۔ واللہ أعلم وباللہ التوفیق وھو المستعان

مراتبِ محبت:

محبت کے مراتب تقریباً دس ہیں، اور یہ سب قلبی کیفیتوں پر مبنی ہیں۔ اگر صحیح معنی میں دل کے حالات اور اس میں موجود جذبات پر غور کیا جائے، تو انسان کی قلبی کیفیتیں اور مدارج اس سے بھی کہیں زیادہ و بے شمار ہیں، اور وہ دس یہ ہیں:

(۱) علاقة (تعلق) جس میں طالب کا قلب محبوب سے متعلق ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل ابتدائی درجہ ہے۔

(۲) إرادة محبوب کی طرف میلان اور طلب کا پیدا ہونا۔

(۳) صبابة دل محبوب کی طرف بے اختیار کھچ کر راغب ہوتا ہے، تھوڑی سی حرارت کے ساتھ۔

(۴) غرام محبت کا دل میں رنگ کی طرح پیوست ہو جانا، کَالدَّائِنِ مَعَ الْمَدْیُوْنِ الْتِزَامًا۔

(۵) وداد یہ مشتق ہے وَدُوْد سے بمعنی اَلْحَبِیْب، اللہ تعالیٰ کی شان ہے، جیسے کہ فرمایا: وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ۔ اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا۔

(۶) شغف وہ محبت جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، جیسے راحیل (زلیخا) کے بارے میں ہے: ﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا﴾ [یوسف:۳۰] (زلیخا کو محبت نے فریفتہ کرلیا)۔

(۷) عشق محبت کا خطرناک حد تک پہنچنا۔ "عشق پیچہ" ایک گھاس کا نام ہے، جو درختوں پر پھیل جاتا ہے۔

(۸) تَیتّم، تَعَبُّد وَتَذَلُّل کے معنی میں ہیں۔ عاشق یتیم کی طرح ذلیل وخوار ہو جاتا ہے، جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

(۹) تعبد یعنی محبوب کا غلام بن جانا، اور اس کے حضور غلاموں کی طرح بے دست وپا اور ذلیل ہو جانا۔ بقول امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ یہ مقام بہت ہی اونچا ہے، اور سید العابدین سید کائنات کی شایان شان ہے، کقولہ تعالیٰ: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ﴾ [الإسراء:۱] (پاکی ہے اس کی جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا)۔ ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا﴾ [البقرة:۲۳] (اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا)۔ ﴿وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ [الجن:۱۹] (اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کی بندگی

کرنے کھڑا ہوا) اسی مرتبہ عبدیت وعبودیت کے طفیل آپ کو مقامِ محمود عطا ہوا۔

(۱۰) خُلّة یہ درجہ نہایت رفیع وبلند ہے، جس پر صرف سید الانبیاء اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام فائز ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دل میں سوائے محبوب کے اور کسی چیز کا تصور وگزر نہ ہو۔ [مدارج السالکین لابن قیم]

الغرض! محبت ایک متلاطم ومواج دریا ہے، جس میں تیراکی اور شناوری کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہر کلمہ گو مسلمان وہاں تک سیر نہیں کرسکتا، یہ چند مخصوص تارک الدنیا لوگوں کا کام ہے، جو ہر چیز کو بھول جاتے ہیں، حتی کہ خود اپنی ذات کو بھی فراموش کرتے ہیں، اور ان کا ہر چھوٹا بڑا عمل اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے، محض چند تسبیحات اور روزے، نوافل اور شب بیداریوں سے یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔ ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ ☆ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(امیر خسرو نظام الدینؒ)

محبت کا معیار اور اس کی شناخت:

محبت دراصل ایک قلبی میلان، خواہش اور تعلق وچاہت کا نام ہے۔ طبعی محبت میں دنیاوی اغراض ومفادات اکثر وبیشتر کارفرما ہوتے ہیں، مگر شرعی محبت میں خلوص کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہر قسم کی اطاعت اس کی رضا کے لئے ہو، جس میں غیر اللہ کا کوئی ذرّہ بھر تصور نہ ہو، ﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [الأعراف: ۲۹] (خالص کرتے ہوئے اللہ کیلئے اپنا عقیدہ) کا بھی یہی مراد ومقصد ہے۔

مگر یہ مسئلہ قدرے پیچیدہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ والی محبت کا معیار کیا ہے؟ اور اس کی جانچ کے لئے کسوٹی کیا ہے؟ عام طور پر تو ہر شخص اس محبت کا مدّعی ہے، اس دعویٰ کے لئے کون سے گواہوں کی ضرورت ہے؟ تاکہ گواہ کے معیار اور کسوٹی کے ذریعے دعویٰ درست اور ثابت ہوجائے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کسی کی محبت کی کسوٹی اطاعت ہے۔ جب اطاعت کا وقت آئے گا، تو صدق و کذب کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ محبت کا دعویدار اپنے محبوبِ حقیقی کی اطاعت کرتا ہے، یا کسی اور کی؟ تو ظاہر ہے کہ جس شخصیت کی اطاعت کرے گا، اس کی محبوب ترین ہستی وہی ہوگی۔ مثال کے طور پر: ایک طرف اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ یہ کام ضرور انجام پائے، اور دوسری طرف والدین، پیر، استاد اور اقرباء واحباب کا حکم ہے کہ یہ کام نہ ہو، یا برعکس، تو وہ شخص ان میں سے کس کو ترجیح دیتا اور قبول کرتا ہے؟ اس مقام پر شرعی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے محبوبِ حقیقی کی

اطاعت کر کے اس کے ساتھ شدید ترین محبت کے دعوے کو سچ کر دکھائے، اور دوسرے فریق کے حکم کو نظر انداز کر کے چھوڑ دے۔

اگر اس نے اللہ تعالیٰ (محبوبِ حقیقی) کا حکم چھوڑ کر دوسرے فریق کے حکم کو ترجیح دی، تو ظاہر ہے کہ اس کا محبوبِ حقیقی سے محبت کا دعویٰ باطل اور جھوٹ قرار پائے گا، اور اس کی شدید ترین محبت اسی فریق سے ثابت ہوگی، جس کی اس نے اطاعت کی، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں جو بھی والدین، آباء واجداد، دوست واحباب اور پیر و استاد، یا برادری کے رسم ورواج کی پیروی کرے گا مشرک ہو جائے گا، کیونکہ اس نے قصداً اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانا، اور عملاً اس کا انکار کیا، اور یہی انکار ہی تو کفر اور شرک ہوا۔ نعوذ باللہ منہ۔

تعصی الالہ وانت تظھر حبہ ★ ھذالعمری فی الفعال بدیع

لو کان حبک صادقالاطعتہ ★ ان المحب لمن یحب مطیع

قسم کھا کر کہتا ہوں یہ عجیب لغو بات ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی محبت کے دعوے دار تو ہو، اور اس کی بات نہیں مانتے ہو۔ اگر تم محبت کے دعوے میں سچے ہوتے، تو اس کی بات ضرور مانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم دعوائے محبت میں جھوٹے ہو، جو محبوب کی بات نہیں مانتے ہو۔

محبوب کی محبت میں مست ایک عاشق کا واقعہ:

انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑے اولوالعزم، راسخ العقیدہ، عزم واستقلال کے امام گزرے ہیں۔ تنہا، اکیلے اور بے سروسامانی کے عالم میں پورے جہاں کے ساتھ ٹکرائے، جہاں انہوں نے خلقِ خدا کو نا مساعد حالات میں نتائج و عواقب سے مستغنی ہو کر بہ نفسِ نفیس توحیدِ الٰہی کا سبق پڑھایا، وہاں انہیں محبتِ الٰہی کا بھی تزکیہ کے ساتھ درس دیا، یہ ہیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام، جن کے کارنامے سابقہ آیتوں میں بیان ہوئے۔

ایک طرف مدّعی الوہیت کرۂ ارضی کا ظالم وجبار اور مطلق العنان حکمران نمرود بن کنعان، جس کے پاس ظاہری اور مادی اسباب وسائل اور ہر شے کا ڈھیر وکثرت ہے۔ پوری قوم بشمولِ آذر اس کے حکم کے ماتحت ہے۔ دوسری طرف صرف اکیلے بے سروسامان ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور ان کی نظر صرف واحد لاشریک لہٗ رب پر ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نمرود کے ساتھ ٹکر لینا تباہ کن اور مہنگا ہے، مگر وہ اس بات پر بھی مطمئن ہیں کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے بالفرض! اللہ جل جلالہ کا حکم چھوڑ کر نمرود کا ساتھ دیں گے، تو وہ ہر قسم کی مراعات اور نوازشوں سے مستفید رہیں

گا، اور شاہی دربار کے مقرّبین میں ان کا شمار ہوگا۔

اب ان کا امتحان ہو رہا ہے۔ اُنہیں اللہ تعالیٰ سے جو کامل محبت حاصل ہے، اس کے تقاضے سامنے آکر اسے جھنجوڑتے ہیں، اور پوری ملّت کے ساتھ مقابلہ کرنے پر اُسے ابھارتے آمادہ کرتے ہیں۔ وہ اپنا فرض پوری قوت کے ساتھ پورا کرنے پر تنِ تنہا میدان کارزار میں اتر کے کہتے ہیں: ع

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم ......

پس وہ نہایت دلیری اور مستعدّی کے ساتھ ایک تباہ کن تاریخی آگ میں ڈالے جانے پر ہنستے ہوئے چھلانگ لگاتے ہیں، فوراً رئیس الملائکۃ تشریف لاکر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں کہ اگر حکم ہو، تو پوری آگ کو نمرود اور اس کی قوم پر پلٹ کر انہیں تباہ کردوں، یا آپ (علیہ السلام) کو اپنے بازو پر بٹھا کر چشمِ زدن میں سدرۃ المنتہیٰ پہنچا دوں! فرشتہ کی پیش کش سن کر وہ پیکرِ صبر و رضا جواب دیتے ہیں کہ خود آئے ہو یا بھیجے گئے ہو؟ عرض کرتا ہے: خود آیا ہوں، فرماتے ہیں: نہیں! آپ چلے جاؤ! محبوبِ حقیقی ملاحظہ فرمارہے ہوں گے، مجھے اس کے دیکھنے کے ساتھ آگ میں ڈالے جانے پر لطف و سرور اور لذّت محسوس ہو رہی ہے۔ میں زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے آگ میں ڈالے جانے پر فخر محسوس کرتا ہوں: ؎

بجرم عشق تو این می کشند غوغا ئیست ☆ تو نیز بر سر بام آ چہ خوش تماشا ئیست

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

بدنصیب لوگوں کا تذکرہ:

بعض بدنصیب لوگ اس محبتِ الٰہی کی آڑ میں اتنے مست نظر آتے ہیں کہ گلزارِ توحید سے خالی ہاتھ نکل کر شرک کی آگ میں کودتے ہوئے ابلیس کی فوج میں بھرتی ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ انبیاء علیہم السلام، اولیاء، شہداء و صالحین، ارواح اور ملائکہ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے برابر قرار دیتے ہیں، اور ان سے زائد از ضرورت ایسی محبت کرتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے، اسی لئے ان کے مزارات، قبور اور یادگاروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، نذر و نیاز پیش کرتے ہیں، جانور ذبح کرتے ہیں، چادر پہناتے ہیں، دیگیں پکاتے ہیں، چراغاں کرتے ہیں، میلے لگاتے ہیں، عرس مناتے ہیں، قبروں پر سجدے اور طواف کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اگر کوئی انہیں ان مشرکانہ رسوم سے منع کرے، اسے وہابی کہتے ہیں، اور نفرت کی نگاہ سے اسے دیکھتے ہیں،

رات دن مرد وزن کا ایک ایسا اختلاط رہتا ہے کہ اللہ کی پناہ! نعوذ باللہ منہا! یہ سراسر شرک ہے، اور توحیدِ الٰہی سے انحراف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات میں، اسی طرح جو محبت اس کے ساتھ مخصوص ہے اس میں کسی بھی غیر اللہ کو شریک کرنا نہایت قبیح اور حرام ہے۔

جو لوگ عوام الناس سے دنیا اور پیسہ بٹورنے کی خاطر اس طرح کے ناجائز کام کراتے ہیں، اور مال جمع کرنے کی خاطر ان کے عقائد خراب کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ، رسول اور قرآن حکیم کے دشمن ہیں۔ اسلام نے کبھی کسی جائز شرعی محبت سے منع نہیں فرمایا۔ انسانوں سے محبت بجائے خود، بلکہ وہ جانوروں پر بھی شفقت اور محبت و رحمدلی کی ترغیب دیتا ہے، مگر ہر طبقہ کے ساتھ محبت کا ضرور کوئی معیار اور اصول وضع فرمایا ہے۔ انہی اصول اور خطوط پر ہمیں پابند فرمایا ہے۔

جب ایک حقیقی بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کی محبت میں، اسی طرح اپنی بیوی اور ماں بہن کی محبت میں زمین و آسمان کا واضح فرق رکھا گیا ہے، جبکہ یہ دونوں مخلوق ہیں۔ خالق و مخلوق کی محبت میں اگر کوئی شخص فرق محسوس نہیں کرے گا، تو یہ سراسر اِلحاد اور زندقہ متصور ہوگا، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ کسی بھی مخلوق (اگرچہ وہ نبی و رسول ہی کیوں نہ ہو) کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ برابر اور ہم وزن نہ رکھے۔

بدقسمتی سے بعض جہّال کے ہاں مخلوقات کی محبت حق تعالیٰ کی محبت سے کہیں زیادہ ہے۔ انہوں نے سرسری عقیدہ یہی رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ایک ماننے کا نام ایمان ہے، جو کہ قطعاً غلط ہے۔ ایمان کے لئے یہ بھی تو شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات میں سے کسی بھی صفت میں کسی ہستی اور برگزیدہ انسان کے اشتراک سے مکمل اجتناب اور پرہیز کیا جائے، اور مافوق الاسباب صفات و امور میں اُسے واحد لاشریک لہٗ مانا جائے۔

سید کائنات نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معیاری اور کامل نہیں ہوگا جب تک تمام مخلوقات سے زیادہ مجھ سے محبت نہ رکھے۔ [بخاری]

اس کے ساتھ یہ بات بھی لازمی ہے کہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام، صالحین، شہداء اور علماء کرام، بلکہ ہر مسلمان سے شرعی و دینی محبت ہو، اور غیر مسلموں، نیز بد اعمال فساق و فجار سے لاتعلقی اور عداوت ہو۔ تو ظاہر ہے کہ یہی چیز حقیقی ایمان کی علامت اور نشانی ہے۔ "اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ"۔ تو درحقیقت یہ حبّ اور بغض اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اور یہی ان کا فرمانِ مبارک ہے۔ مگر ہر طبقہ اور ہر نوع کے ساتھ مخصوص اور الگ خطوط پر ہے۔ ایک

ایسے انداز پر ہے کہ ایک ذیلی طبقہ کی محبت کو بڑھا چڑھا کر اوپر والے طبقے کی محبت و اطاعت کے معیار پر لانے کی اجازت نہیں ہے، اسی طرح اوپر والوں کی محبت و اطاعت کو گھٹا کر نیچے والوں کے برابر رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اس فرق کو خوب سمجھنا چاہیے۔ البتہ! اطاعت اور فرمانبرداری کا تعلق سارے متقی مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہے، وہ صرف صاحبِ شریعت سرورِ عالم کے ساتھ بتمامہٖ کامل و اکمل منہج پر مخصوص ہے، جیسے کہ فرمایا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰] (جو شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی)۔

آپ کی اطاعت بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی اطاعت شمار ہے، یہی حال آپ کی محبت اور اتباع کا بھی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو آپ کے اتباع پر موقوف فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۳۱] (اے محبوب! تم فرمادو کہ لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو، تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ، اللہ تمہیں دوست رکھے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے)۔

اسی طرح آپ کی محبت اللہ تعالیٰ سے محبت ہے، اور آپ سے بغض اور نافرمانی اللہ تعالیٰ سے بغض اور اس کی نافرمانی ہے، چنانچہ یہ اطاعت و فرمانبرداری آپ کے حریم سے باہر صحابہ کرام، خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم، ائمہ عظام، اور آپ کے ورثاء علماءِ حق تک تا قیامِ قیامت منتقل ہوتا رہے گا، اور علماءِ حق متبعینِ سنت ہی آپ کے وارث کہلائیں گے، اور آپ کے محبوب و پسندیدہ اور حقیقی وارث ہوں گے۔ علماءِ سوء اور اصحابِ بدعت کا شمار آپ کے دشمنوں اور بدخواہوں میں ہوگا۔ وہ آپ کے سایہ مبارک اور ظلِ سبحانی سے محروم رہیں گے، اور آپ کے حوضِ کوثر کے ورود سے بھی محروم رہیں گے۔

آپ جب ان کیلئے شفاعت کریں گے تو عرش معلّٰی سے جواب موصول ہوگا: "اَنَّکَ لَاتَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ"۔ [بخاري] آپ ان کے لئے شفاعت نہ کریں، آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے بدعات ایجاد کر کے آپ کے دین کا حلیہ بگاڑ کر تبدیل کیا ہوا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کی سنتوں کو کمتر اور غیر معیاری قرار دے کر ان کی جگہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق خلافِ سنت رسم و رواج اور جاہلیت کے مراسم و بدعات کو رواج دیا، اور اپنے گمراہانہ اور مذموم بدعات پر شریعت کا لیبل لگا کر آپ کی امت کو گمراہ کیا۔ جو کام

آپ نے نہیں کئے، انہوں نے ان بے سروپا رسوم کو آپ کی سنت بتا کر خلقِ خدا کا عقیدہ خراب کیا۔

انہوں نے انگریزوں (یہود ونصاریٰ) سے سالگرہ کی رسم سیکھ کر آپ کی امت کے علماء وصلحاء اور اولیاء کی سالگرہ بنامِ ''عرس مبارک'' ایجاد کیا۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی سے متاثر ہو کر آپ کے یومِ وصال پر خوشیاں منائیں، اپنی گردنوں میں آپ کی مفارقت کی خوشی میں ہار ڈالا۔

البتہ! اتنا فرق ضرور کیا کہ بجائے گوسالہ کے آپ کو اونٹنی قصواء کی قیمتی چادر پہنا کر شہروں کے مختلف گلی کوچوں کا گشت کروایا، کعبۃ اللہ وگنبدِ خضراء کی عکس وصورت سے بازاروں کو خوب روشن رکھا، اور آپ ﷺ کی زبانِ حق ترجمان نے جو فرمایا تھا: مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ۔ (الحدیث) کا خوب مذاق اڑایا۔ اور آپ کے دوسرے ارشاد: ''مَنْ اَحْيَا سُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ''۔ (الحدیث) کو معلول اور خاکش بدہن موضوع قرار دیا۔ آج کس منہ سے حوض پر آ کر آپ ﷺ کے مبارک ہاتھ سے پانی طلب کریں گے؟ کنز العمال نے آپ ﷺ کے فرمان مبارک کے حوالہ سے کہا کہ حوضِ کوثر کے ساقی جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہوں گے۔

پس اس فرقہ کے بھائیوں پر بھی قدغن لگے گا، اور جہنم رسید ہوں گے، جنہوں نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو یا تو خدا مانا تھا، یا پھر انہیں حقیقی پیغمبر کہا تھا، اور حضرت جبریل علیہ السلام کو وحی لانے اور سپرد کرنے میں خائن کہا تھا وغیرہ۔

فائدہ:

سنت کی نسبت سید الانبیاء کی طرف ہے، اور آپ ﷺ کے ہر قول وفعل حتی کہ اشارہ تک کا نام سنت ہے۔ اس کے برعکس بدعت ایک شیطانی عمل ہے، اور اس کی نسبت ابلیس کی طرف ہے، پس یہ دونوں آگ وپانی کی طرح بالکل متضاد ہیں۔ ہر بدعت کے آنے سے اسی کے مناسب وبرابر سنت متروک ہو جاتی ہے، حتی کہ جب بدعات بکثرت عام ہو جاتی ہیں، سنتیں اسی کثرت کے ساتھ معدوم ومتروک ہو جاتی ہیں۔

پس اُمت کے اچھے اعمال ختم ہو کر ان کی جگہ بدعت اور فساد وسرکشی پھیل جاتی ہے، اسی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ جو شخص اُمت میں فساد آنے کے بعد میری مردہ (متروکہ) سنتوں کو زندہ کرے گا، اور انہیں دوبارہ رائج وآباد کرے گا، اسے سو شہیدوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ [ترمذي] اور بدعت کے بارے میں فرمایا کہ جو شخص کسی بدعت کو ایجاد کرے گا، وہ اسلام کو معدوم کرنے کے برابر گنہگار شمار ہوگا، اور یہ شخص میری شفاعت اور حوض کوثر پر وُرود

سے سراسر محروم رہے گا۔

جب معبود و مسجود برحق اور قادر مطلق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام سمیت ساری کی ساری مخلوق عاجز و محتاج ہے، تو اہلِ ایمان کا عمل وطریقہ یہ ہونا چاہئے کہ انہیں شدید ترین محبت حقیقی حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ سے ہو، اور اس میں کبھی کسی مخلوق کا اشتراک نہ ہو، فرمایا:

﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ (اور اگر ظالم لوگ دیکھیں)

﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ (جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے)

﴿ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ ساری طاقت تو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے)

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ﴾ (اور اللہ تعالیٰ سخت گرفت کا بھی مالک ہے)۔

مطلب یہ کہ غیروں کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہم پلہ و برابر گردانںے والوں پر یہ راز قیامت کے روز کھلے گا کہ وہ غلطی میں مبتلا تھے۔ جب یہ ظالم اپنی آنکھوں سے دوزخ کے عذاب کو دیکھ لیں گے کہ آج اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی محبت کام نہیں آسکتی، آج تو ساری طاقتیں اور تمام اختیارات اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں۔ آج وہی قادرِ مطلق مالک یوم الدین ہے، صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ کاش کہ ہم نے دنیا میں اسی کی محبت کو اوّلیت دی ہوتی، اور غیروں کی محبت کو اس کے برابر نہ سمجھا ہوتا، تو آج ہمیں شدید عذاب دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ فرمایا:

﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا﴾ (قیامت کے اس ہولناک دن کو یاد کرو، جب متبوع (جن کی پیروی کی گئی) اپنے پیروکاروں سے بیزار ہو جائیں گے)۔ یعنی وہ لوگ جو دنیا میں مُطاع مانے جاتے تھے، ان کے مطیع ان کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کر لیتے تھے، آج وہی پیر اور پادری اپنے مریدوں کو صاف جواب دیدیں گے کہ نا عاقبت اندیشو! ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرالو؟ یہ بیہودہ کام تو تم اپنی مرضی سے کرتے تھے۔ ہم نے تو تمہیں ہرگز نہیں کہا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنالو! یا مشکل کشا اور حاجت روا بنالو، حتی کہ جب حضرت عیسی علیہ السلام سے بھی سوال ہوگا: ﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ﴾ [المائدة:١١٦] (کہ کیا آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو؟) تو آپ علیہ السلام جواب دیں گے: ﴿قَالَ سُبْحٰنَكَ﴾ (اے ربّ! تیری ذات ہر قسم کے شریکوں سے پاک ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ میں شرک کی ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے؟)۔

غرض یہ کہ سارے مطاع اس روز صاف انکار کردیں گے۔

﴿وَرَأَوُا الْعَذَابَ﴾ (اور عذاب سامنے صاف نظر آئے گا)

﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ﴾ (اور تمام اسبابِ مادی (دوستی، پیری، مریدی) منقطع ہوجائیں گے)

﴿وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا﴾ (اور پیروکار افسوس کا اظہار کر کے کہیں گے:)

﴿لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً﴾ (اگر ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں پلٹنے کی اجازت مل جائے)

﴿فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا﴾ (تو ہم بھی ان راہنماؤں سے اسی طرح بیزار اور لاتعلق ہوجائیں گے، جیسا کہ آج یہ ہم سے بیزار ہو گئے ہیں)۔

یعنی اب ہمیں حقیقتِ حال کا علم ہوگیا ہے، اب اگر ہمیں دنیا میں بھیج دیا جائے، اور یہ متبوعین وہاں ہمیں مل جائیں، تو ہم ان کی بات نہیں مانیں گے، اور ان کی تابعداری نہیں کریں گے۔ اسی طرح قیامت کے روز یہ لوگ اپنے متبوعین کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے، فرمایا: ﴿رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا﴾ [الأحزاب:٦٨] (یا اللہ! ہم نے تو اپنے سرداروں اور بڑوں کا اتباع کیا، اور انہوں نے ہمیں گمراہ کردیا، ہمیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیا، کاش کہ ہم نے تیرے رسولوں کا اتباع کیا ہوتا، ہم نے تو اپنے بڑے بزرگوں کی بات مانی، اے ہمارے مہرباں ربّ! آج انہیں دوگنا عذاب دے، کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے، اور ہمیں بھی گمراہ کیا، اور ان پر بہت بڑی لعنت بھیج اور ملعون بنادے)۔

دوسرے مقام پر یہ ارشاد ہے: ﴿الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ [الزخرف:٦٧] آج کے تمام دوست جنہوں نے غیر شرعی دوستی کی، روزِ قیامت ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، اور لعنت کریں گے، سوائے پرہیزگار لوگوں کے کہ ان کی دوستی اللہ تعالیٰ کی خاطر ہوئی، اور بہتر مقاصد کے لئے ہوئی۔ پس وہ ایک دوسرے کے لئے دوست وخیر خواہ اور شفاعت گزار رہیں گے۔ ان کے علاوہ تمام رشتے، دوستیاں اور قرابتیں کٹ کر ختم ہوجائیں گی۔ تو فرمایا:

﴿كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ﴾ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اُن کے لیے حسرت بنا کر دکھائے گا، لیکن وہاں پر ان سے بیزاری کا اعلان کچھ کام نہ آئے گا، بلکہ ان کے عذاب میں اضافہ ہی ہوگا، انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، اور ان کی ہدایات کا کھلم کھلا مذاق اڑایا، اور ضد وعناد کی بنیاد پر حق کو قبول

نہیں کیا (جیسے ہمارے زمانے کے قبر پرستوں کا حال ہے کہ جب انہیں حق بات کی طرف دعوت ملتی ہے، تو کہنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں)۔

﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ ان کے لئے جہنم سے رہائی کی کوئی صورت نہ ہوگی، اور وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے، کیونکہ انہوں نے غیر اللہ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے برابر قرار دیا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

ترجمہ: اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارے لئے صریح اور کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾ بے شک! شیطان تم کو برائی اور بے حیائی کی باتوں کا حکم دیتا ہے، اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ چیزیں کہو جو تم نہیں جانتے ﴿۱۶۹﴾ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی پیروی کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں: بلکہ ہم اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کسی چیز کو سمجھتے ہوں، اور نہ وہ سیدھی راہ پر ہوں ﴿۱۷۰﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے مشرکین کے عقائدِ شرکیہ کے بطلان کا بیان ہوا، اب ان کے اعمالِ شرکیہ کے بطلان کا بیان اور تردید ہے۔ تفسیر مظہری، ابن جریر، روح المعانی وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عرب کے مختلف قبائل جیسے بنو ثقیف، بنو عامر، بنو خزاعہ اور بنو مدلج وغیرہ کے یہاں سائبہ، بحیرہ، وصیلہ وغیرہ جانور جو بتوں کے لئے نامزد کر لئے جاتے تھے، اور ان کو مشرکین اپنے اوپر حرام جانتے ہوئے ان کے کھانے سے احتراز کرتے تھے، حالانکہ اصل حکم ہر چیز میں اباحت ہے، اور کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا حق صرف ربّ العزّت سبحانہ کو حاصل ہے، اس طرح مشرکین حلال چیزوں کو حرام کر کے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کے مرتکب ہوتے تھے، اس پر یہ آیت ﴿يٰۤاَيُّهَا

النَّاسُ﴾ نازل ہوئی ہے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ آیت ﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا﴾ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی، جن کو سرور عالم نے اسلام اور قرآن مجید کی طرف دعوت دی، تو انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ ہم تو اپنے آباء واجداد کے طریقوں پر عمل پیرا رہیں گے۔

صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ یہ خطاب عام ہے، مشرکینِ عرب اور اہلِ کتاب سب کو شامل ہے، کیونکہ اہلِ کتاب بھی حکمِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے آباء واجداد کی اتباع کے مدّعی ہوتے تھے، جو تحریف کتاب اللہ میں ان کے آباء واجداد نے کی تھی۔ موجودہ اہلِ کتاب اسی پر ڈٹے رہتے تھے، چنانچہ ابن حاتم نے سعید یا عکرمہ کے طریق پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تخریج کی ہے کہ سرور عالم نے جب یہود کو دعوت اسلام پیش کی، تو انہوں نے تقلید آباء کا عذر پیش کیا، چنانچہ رافع بن حرملہ اور مالک بن عوف رحمۃ اللہ علیہم نے کہا: بَلۡ نَتَّبِعُ مَاوَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَاءَنَا لِاَنَّهُمۡ اَعۡرَفُ مِنَّا۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [لباب النقول]

پہلی روایت نظمِ قرآنی سے زیادہ قریب ہے، اور دوسری روایت سنداً زیادہ قوی ہے، اور ممکن ہے کہ آیت دونوں فریق کو شامل ہو، کیونکہ الفاظ عام ہیں، اور مرض بھی عام ہے کمافی المظہری۔

﴿حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اخروی نجات تین چیزوں پر موقوف ہے: (۱) اداءِ فرائض۔ (۲) اتباعِ سنت نبوی ۔ (۳) اَکلِ حلال۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ بنی نوع انسان کو عمومی خطاب ہے، اور ایک قانونِ کلّی وضابطۂ اخلاق کا اعلان ہے کہ انسان احکامِ الٰہی کا مکلّف ہے، اسے کسی طرح قانون شکنی کی اجازت نہیں ہے، وہ ہر طرح (اجتماعی وانفرادی طور پر) قانونِ الٰہی پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مقابلے میں اور اس کے خلاف اسے کسی طرح قانون بنانے کی اجازت نہیں، اور قانونِ الٰہی میں ردّ وبدل اور کسی ترمیم کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ جن اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا، ان کو حرام بتانے کا، اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا ہے، ان کو حلال بتانے یا حلال کرنے کا قطعاً اختیار نہیں ہوگا۔

پس جو کوئی اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اور حرام کردہ چیزوں پر حکمِ الٰہی کے مطابق عمل کرے گا، تو وہ ابدی سعادت کا حقدار ہوگا، اور شریعت پر چلنے والا شمار ہوگا، اس کے برخلاف اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی حلال وحرام کردہ چیزوں

میں حکمِ الٰہی کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے ترمیم وتبدیلی کا مرتکب ہوگا، تو وہ قانون شکنی کی سزا سے نہیں بچ سکے گا، اور شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے ولا ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا باغی اور نافرماں شمار ہوگا، جس کا انجام نہایت ہی برا ہوگا، اور قربِ الٰہی سے سراسر محروم رہے گا، تو خطاب کا مطلب یہ ہوگا کہ: ''اے بنی آدم! زمین میں جو چیزیں موجود ہیں، ان میں سے وہ چیزیں جو شرعاً حلال و پاکیزہ ہیں، ان کو تم کھاؤ، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو اشیاءِ خوردنی تمہارے لئے پیدا کی ہیں، ان میں سے جو چیزیں شریعت نے حلال و پاکیزہ قرار دی ہیں، انہیں حسبِ ضرورت استعمال کیا کرو، اور حلال کو حرام کہنے سے مکمل پرہیز کرو۔

﴿حلالًا طیّبًا﴾ حلال سے مراد وہ چیزیں ہیں کہ نہ تو ذاتی طور پر حرام ہوں (جیسے حرام جانور مردار، غیر مذبوحہ، شراب وغیرہ) اور نہ ہی کسی غیر شرعی طریقے سے حاصل کی گئی ہوں (جیسے رشوت، چوری، جوا، سود وغیرہ) اسلام اللہ تعالیٰ کا پاکیزہ دین ہے، وہ اپنے ماننے والوں کو دونوں باتوں کا حکم دیتا ہے کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ لفظِ حلال حقیقی پاکیزہ چیز کا نام ہے، اور طیّب سے مراد ظاہری پاکیزگی ہے، جو غلیظ، گندی اور بدبودار نہ ہو، یعنی یہ ماٴکولات ظاہری طور پر بھی غلیظ نہ ہوں، تاکہ جسمانی صحت پر برا اثر نہ پڑے، اور باطنی طور پر بھی نجس اور پلید نہ ہوں، تاکہ روحانیت اور باطنی اقدار متاثر نہ ہوں۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے: ''لَایَدْخلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِیَ بَالْحَرَامِ''۔ (وہ شخص جنت سے محروم ہوگا جس کی بدنی پرورش اور نشوونما حرام سے ہوئی ہو)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی عمل بتاؤ جس سے میری دعا قبول ہو، یا میں مستجاب الدعوات بن جاؤں! ارشاد فرمایا: حرام اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرلو، اور یہ بات ذہن نشین رہے کہ ایک لقمہ حرام کھانے سے چالیس دن تک کی نمازیں ضائع ہوجاتی ہیں (قبول نہیں ہوتیں) ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ جس بدن کی پرورش حرام سے ہو، وہ دوزخ کا حقدار ہے۔ [مشکوۃ]

آج کا معاشرہ ایک اعتبار سے بڑا پاکیزہ اور صاف ستھرا نظر آتا ہے، ظاہری صفائی کا بڑا اہتمام ہوتا رہتا ہے، مگر جو چیز موجبِ ہلاکت ہے، اس کا اہتمام نہیں ہوتا۔ حرام وحلال کی کوئی تمیز نہیں ہوتی، بڑے اچھے خاصے، بھلے، دیندار اور نمازی لوگوں کے پاس جب حلّت وحرمت کی تمیز نہیں ہوتی، تو باقی عوام الناس سے کیا گلہ؟ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ خیر القرون کے بعد سب سے پہلے جو فتنہ نمودار ہوگا اور دینی اقدار کی پامالی کا سبب بنے گا، وہ حرام و حلال کی عدم تفریق ہے، کہ لوگ حلال وحرام میں بہت ہی کم فرق محسوس کریں گے، اور لوگ جانوروں کی طرح حلال و

حرام، پاکیزہ اور ناپاک کی تمیز نہیں کریں گے، بس جو ہاتھ میں آیا اٹھایا، اور اس طرح سے مال جمع کر کے بڑے شوق سے کھائیں گے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ شیطان کے قدموں کی اتباع نہ کرو۔ اس کے نقشِ قدم پر مت چلو، کیونکہ وہ تمہارا ازلی دشمن اور بدخواہ ہے۔ وہ ہر لمحہ تمہارے دلوں میں وسوسہ اور برے خیالات پیدا کرتا رہتا ہے، اور تمہیں ہر طرح انفرادی و اجتماعی گناہوں اور بے حیائیوں پر اکساتا رہتا ہے، تمہارے قلوب سے حق و باطل، حلال و حرام کا فرق مٹا کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر برانگیختہ کرتا ہے، ﴿اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [الفاطر:۶] (وہ اپنے گروہ کو اسی لئے بلاتا ہے تا کہ وہ دوزخیوں میں سے ہو جائیں) کہ تم خوب گناہ کرو، اور جہنم کے حقدار بنو۔

اس شاطر و چالاک دشمن نے اللہ تعالیٰ کے حضور بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ قسم کھا کر کہا تھا: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [ص:۸۲] (تیری عزّت کی قسم! میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا)۔ لہٰذا تم لوگ اس کھلم کھلے نافرمان و بے رحم دشمن کے مکروفریب میں نہ آؤ، اور اس کے نقشِ قدم چلنے سے پرہیز کرو۔

﴿اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ﴾ وہ تمہیں ہر موقع و ہر لمحہ امر کرتا ہے، اور تمہیں برائیوں اور بے حیائیوں پر اکساتا رہتا ہے۔ السُّوء عام گناہ، جبکہ اَلْفَحْشَاء سے مراد نفسانی و شہوانی خواہشات ہے۔ اور بعض علماء کرام نے سوء سے مراد وہ گناہ لیا ہے جس کا تعلق قول سے ہو، اور فحشاء سے مراد وہ گناہ لیا ہے، جس کا تعلق فعل سے ہو۔

فرمایا: تمہارا دشمن شیطان یہی چاہتا ہے کہ تم معاصی میں منہمک رہو، اور حق کی طرف آنے کی کوئی کوشش نہ کرو اور ﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کہ تم اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی ایسی منگھڑت اور بے بنیاد باتیں کہا کرو، جو تم نہیں جانتے، اور جن کا وجود ہی نہ ہو، جیسے کہ وہ کہتے تھے: ﴿وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ [الأعراف:۲۸] (اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے، اور اللہ نے بھی ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ کہہ دو کہ خدا تعالیٰ بے حیائی کے کام کرنے کا ہرگز حکم نہیں دیتا)۔

یہ لوگ ہر برائی کے ارتکاب پر بڑی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی سے کہتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع

ہیں، اور یہ سب کچھ اس کے حکم وفرماں پر کررہے ہیں۔ یہ بحیرة، سائبة، وصیلة، حام اور یہ عبادۃ الأصنام سب ﴿وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا﴾ کے تحت ہورہا ہے۔

جواب سنئے! فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء وکذب ہے، یہ اس کی صفت و شان ہرگز نہیں کہ وہ کسی گناہ یا شرک کی اجازت دے، چہ جائیکہ وہ کسی معصیت کا امر کرے۔ یہ تو ممکنات میں سے نہیں ہے۔ تم کفار کتنے نالائق اور جھوٹے ہو؟ بلکہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کسی بھی گناہ پر امر کرنے اور اجازت دینے سے پاک ہے۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کی اتباع کرو، اور اس کے قانون پر چلو، ﴿قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَآءَ نَا﴾ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے، اور ہم ہر طرح سے اپنے بڑوں کے رسم ورواج کی پابندی کریں گے۔ آخر وہ ہمارے باپ دادے کوئی بے شعور وبے عقل تو نہیں تھے، جو غلط رسوم ورواج گھڑ لیے ہوں، بلکہ وہ دانشمند اور ہوشیار لوگ گزرے ہیں، ان کے نقش قدم پر چلنے میں ہماری کامیابی ہے۔

جواب ارشاد فرمایا: ﴿اَوَلَوْ كَانَ آبَاءُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ یہ لوگ کتنے ناداں و احمق ہیں؟ کیونکہ آباء واجداد اگر صحیح راستے پر ہوں، تو ان کے نقشِ قدم پر چلنا تو معقول ہے، لیکن اگر آباء واجداد غلط راستے پر چل رہے ہوں، تو پھر ان کی پیروی کرنا سراسر حماقت اور بیوقوفی کے سوا کچھ بھی نہیں، کیونکہ ''اگر ان کے آباء واجداد نہ تو عقلمند ہوں، اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں، تو کیا پھر بھی یہ لوگ انہی کے راستے پر چلیں گے؟''۔

مطلب یہ ہے کہ نیکی میں پیروی جائز ہے، مگر منکرات میں نہیں، اسی طرح اہلِ حق کی تقلید غیر منصوص چیزوں میں جائز ہے، مگر اہلِ باطل کی تقلید جائز نہیں، اسی طرح عقلمند اور بے عقل لوگوں کا حال سمجھنا چاہئے کہ بے عقل لوگوں کی تقلید کسی بھی صورت مطلقاً جائز نہیں۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ
اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: اوران لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا، اس شخص کی سی ہے جو آواز دیتا ہے اس کو، کہ نہیں سنتا مگر

بلانا اور پکارنا یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے ﴿۱۷۱﴾

معارف ومنازل

یہاں اس آیت کریمہ میں شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے والے مشرکین کی مثال بیان کی ہے، اور یہ مثال خود ان پر اور ان کے معبودانِ باطلہ پر دوطرفہ صادق ہے:

اول یہ کہ کافروں کی مثال اس چرواہے اور جانوروں کے ہانکنے والے کی ہے، جو اپنے جانوروں کو آواز دیتا ہے، جو اس کی چیخ اور پکار کو سنتے تو ہیں، مگر سمجھتے نہیں ہیں، اسی طرح کافر بھی اللہ تعالیٰ کے نبی کی آواز تو سنتے ہیں، مگر جانوروں کی طرح ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

دوم یہ کہ یہ مثال اصنام اور بتوں کو پکارنے کی ہے، کہ مشرک انہیں پکارتے ہیں، مگر وہ بے جان پتھر سنتے سمجھتے کچھ نہیں، وہ پتھر کے تراشیدہ بت نہ دیکھتے ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں اور نہ ہی کوئی حرکت کرتے ہیں۔

ان بتوں کا اثر اور ان کی خاصیت ان کے ماننے والے اور انہیں پکارنے والوں میں علیٰ وجہ الاتم موجود ہے، کہ یہ گمراہ لوگ بہرے گونگے اور اندھے ہیں۔ عقل وشعور سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ظاہری و باطنی جو نعمتیں حواسِ ظاہرہ و باطنہ کی شکل میں عطا کی ہیں، ان بدنصیبوں نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، نہ آنکھوں سے حقائقِ کائنات دیکھتے ہیں، نہ حق کی سماعت کرتے ہیں، نہ حق کا اقرار کرتے ہیں، اور نہ ہی سوچتے اور غور وفکر کرتے ہیں، بس یہ جانوروں سے بھی بدتر و کمتر ہیں۔

❁ ❁ ❁

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو روزی دی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرنے والے ہو ﴿۱۷۲﴾ بیشک! اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام قرار دیا ہے مردار خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو، پس جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی کرنے والا

نہیں ہے، اور نہ زیادتی کرنے والا ہے، پس اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، بیشک! اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے ﴿۱۷۳﴾

معارف ومنازل

پوری نوعِ انسانی کے خطاب کے بعد خاص طور پر مؤمنوں کو خطاب ہے۔عمومی خطاب کا یہ مطلب تھا کہ حلال چیزوں کو حرام نہ کہو، اب کے خصوصی خطاب کا مطلب یہ ہے کہ حرام چیزوں کو حلال مت سمجھو، جس طرح برگزیدہ انبیاءکرام علیہم السلام کو طیبات کھانے کا حکم ہوا، بعینہٖ اسی طرح کا اعزازی خطاب مؤمنوں کو ہورہا ہے، فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴾[المؤمنون:۵۱](اے رسولوں کی جماعت! پاک چیزیں کھاؤ، اور نیک اعمال اختیار کرو، میں تمہارے اعمال سے باخبر ہوں)۔قرآن کریم نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا:﴿یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴾(وہ ایسا ہے جو لوگوں کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور خبیث وناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے)۔[الأعراف:۱۵۷]

حلال کھانے کی برکت، اور حرام کی نحوست:

اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دینِ اسلام جو کہ سراسر خیر وبرکات کا دین ہے، اپنے ماننے والوں کی ایسی تربیت کرتا ہے، جس کی بدولت ہر مسلمان شیشہ اور چاندی کی طرح صاف ہو، اور پاکیزہ جنتوں کا حقدار ہو۔قدم قدم پر طہارت و پاکیزگی کی تعلیم دیتا ہے۔عقائد پاکیزہ، اعمال روشن ومصفّٰی، خوراک طیّب وحلال، معاملات کی صفائی، گفتار وکردار کی پاکیزگی، ہر موقع پر صبر اور تسلیم ورضاء، ہر نعمت پر شکر۔

الغرض! اسلامی تعلیمات اور اعمال پر اگر غور کیا جائے، تو سوائے بھلائی اور پاکیزگی کے کچھ نہیں، جب غیر مسلموں کے حالات کا جائزلیا جائے، تو ایک وحشت اور پیچیدہ نظام سامنے آئے گا، جہاں حلال وحرام کسی چیز کا نام تک نہیں ہوتا۔

گزشتہ آیات میں جس طرح حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے، اسی طرح حلال وطیّب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکرگزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رزیلہ اور افعالِ مذمومہ پیدا ہوتے ہیں، تقویٰ اور عبادت کا ذوق جاتا رہتا ہے، دعا قبول نہیں ہوتی، ایک وحشت اور بہیمیت پیدا ہوجاتی ہے، اسی طرح پاکیزہ اور حلال کھانے سے باطن میں ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رزیلہ سے نفرت اور افعالِ مذمومہ سے ایک قسم کی بیزاری پیدا ہوجاتی ہے۔اخلاقِ حمیدہ سے محبت اور افعالِ فاضلہ کی طرف رغبت اور شوق پیدا ہوکر عبادات میں

لذت محسوس ہوجاتی ہے۔ عبادات مرغوب اور معاصی مبغوض بن جاتے ہیں، اور دعائیں قبول ہوجاتی ہیں۔

حضرت رسالت مآب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے لوگ پریشان، طویل السفر، تھکے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا کرتے ہیں، اور یاربّ یاربّ! پکارتے ہیں، مگر کھانا، پینا ان کا حرام، غذاء اور لباس ان کا حرام، ان حالات میں کہاں ان کی دعا قبول ہوسکتی ہے؟ [ابن کثیر]

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ﴾ "اِنَّمَا" حصر کے لئے آتا ہے، تو آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں۔ اس آیت میں تو لفظ "اِنَّمَا" سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے: ﴿قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ مَیۡتَةً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ﴾ [الأنعام: ۱۴۵] (کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں، ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا، بجز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو، یا بہتا لہو یا سور کا گوشت ہو)۔

اس میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلان کر دیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے، جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسری آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمت ماسویٰ کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہے کہ یہاں مطلق حلال وحرام کا بیان نہیں ہے، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حلّت وحرمت کا بیان ہے، جن کے بارے میں مشرکینِ مکّہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے۔

پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکینِ مکہ حرام سمجھتے تھے، یا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے۔

اس کی مخالفت اور تردید کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، جن سے تم اجتناب نہیں کرتے، اور جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال ہیں، ان سے تم پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں ہے، بلکہ اضافی ہے، مشرکانہ عقائد کے بالمقابل آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ چار چیزیں یہ ہیں: (۱) میتة، (۲) دم، (۳) لحمِ خنزیر، (۴) وہ جانور جن پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیثِ صحیحہ میں آئی ہیں، جن کو ملانے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسبِ ذیل ہیں، قدرے تفصیل کے ساتھ:

☆......میتة: جس کو عموماً مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے، جس کے حلال ہونے کے لئے شرعاً ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر، یا چھت سے گر کر مر جائے، یا کسی دوسری طرح چوٹ لگا کر مار دیا جائے، تو وہ مردار اور حرام ہے، لیکن قرآن کریم کی دوسری آیت: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ﴾ [المائدة:۹۶] (تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے سمندر کا شکار) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں ہے، وہ بغیر ذبح کے حلال ہے، اس بناء پر احادیثِ صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میتة سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کہا گیا ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے: ایک مچھلی، دوسرے ٹڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے: ایک جگر، دوسرا الطحال (تلّی)۔ [ابن کثیر، از احمد، ابن ماجہ، دارقطنی وغیرہ]

صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، سور اور بتوں کی بیع کو حرام فرما دیا۔ کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مردار جانور کی چربی کا کیا حکم ہے؟ لوگ کشتیوں کو اسی سے مالش کرتے ہیں، کھالوں میں اسی کا روغن لگاتے ہیں، اور اس کی روشنی سے (چراغوں وغیرہ کی صورت میں) فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب حرام ہیں۔ [مظهري]

حضرت ابوواقد لیثی سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زندہ جانور سے جدا کیا ہوا (کاٹا ہوا) گوشت مردار ہے۔ [ترمذي، أبوداؤد]

فائدہ:

ہمارے علماء کرام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مردار کی خرید و فروخت، اور اس کی قیمت کا کھانا، اور اس کی چربی اور کھال سے بغیر دباغت کے نفع اٹھانا، جملہ امور ناجائز ہیں۔ [مظهري]

مسئلہ:

جس طرح مردار (میتة) کا گوشت حرام ہے، اسی طرح تمام دیگر ناپاک چیزوں کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کا کھانا، فروخت کر کے اس کے بدلے کوئی چیز یا پیسہ وصول کرنا، سب حرام ہیں، حتیٰ کہ قصد و ارادہ سے بلّی اور کتوں کو کھلانا بھی ممنوع ہے۔ البتہ! ایسی جگہ رکھ دیں جہاں بلّی اور کتے خود کھالیں۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے درسِ عبرت اور

باعثِ گرفت ہے، جو حرام سے پرہیز نہیں کرتے۔ [أحکام القرآن]

مسئلہ:

جس طرح مسلمان ممالک میں لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ، بکری، گائے، بھینس پالنے اور مالداری کا سلسلہ عام ہے، اور وہ ان جانوروں کو شرعی قواعد کے مطابق ذبح کرتے ہیں، انہیں استعمال کرکے کھاتے ہیں، ان کی چربی، کھال، پشم، ہڈی وغیرہ سے فوائد حاصل کرتے ہیں، یہ سب حلال اور صحیح ہے، حتی کہ فارمی مرغیوں کو بھی ذبح کرتے اور پیک کرکے مختلف علاقوں میں بھیج دیتے ہیں۔ اسی طرح ان حلال جانوروں کی چربی سے صابن تیار کرتے ہیں، کیونکہ چربی کے بغیر صابن نہیں بنتا۔ اس کا جزء اعظم چربی ہی ہوتا ہے۔

بعض اسلامی ملکوں میں جیسے حجاز، یمن، مشرق وسطیٰ، امارات خلیجی ممالک وغیرہ میں یورپ و دیگر مغربی ملکوں کی ہر قسم کے کھانے کی چیزیں پیک شدہ ملتی ہیں، خصوصاً گوشت، جن پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ: ''اسلامی طریقہ پر ذبح کیا ہوا گوشت ہے''، مگر تحقیق کرنے پر پتہ چلا ہے کہ سب کچھ مشین کے ذریعہ ذبح ہوتا ہے۔ مشین پر ''بسم اللہ أکبر'' لکھا ہوا ہوتا ہے، لہٰذا یہ غیر مسلم ممالک کا درآمد کیا ہوا گوشت میتہ کے حکم میں ہے، اور اس کا کھانا جائز نہیں ہے، اسی طرح وہاں سے آئے ہوئے صابن اور خشک دودھ کا بھی یہی حکم ہے۔

تعجب ہے کہ بعض مسلمان ایسی چیزوں سے قطعاً اجتناب نہیں کرتے، اور یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ اسلام میں ہر قسم کی عمومی آزادی ہے، کسی تنگ نظری کی گنجائش نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یورپ میں ایک ایک فارم میں لاکھوں سور ہوتے ہیں۔ امریکہ میں ایک فارم میں دو لاکھ سے زائد سور پالے جاتے ہیں۔ یہ فارم پندرہ سے بیس کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہوتا ہے، اور یورپ والوں کی عادت ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء میں (خصوصاً وہ اشیاء جنہیں وہ مسلمان ممالک کو برآمد کرتے ہیں) ضرور اس قسم کی ناپاک چیزوں کا اختلاط کرتے رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ عادت بعض ایرانی کمپنیوں میں بھی رائج ہے، لہٰذا متقی و پرہیزگار مسلمانوں کو چاہئے کہ غذائی اشیاء کے معاملے میں محتاط رہیں، اور حتی الامکان پرہیز کریں، حتی کہ یورپی صابن، شیمپو و دیگر اشیاء سے بھی اجتناب کریں، مشینی ذبیحہ کی حرمت پر علماء کرام نے اجماع کیا ہوا ہے۔

☆......دم: دوسری چیز خون ہے، یہاں مطلقاً مذکور ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت میں مقید ہے، فرمایا: ﴿اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ﴾ پس مطلق مقید پر محمول ہے، اور حرمت کا تعلق دمِ

مسفوح (بہنے والے خون) ہی کے ساتھ ہے۔ یہ خون اگر وقت گزرنے پر منجمد ہوگیا، تب بھی حرام ہے، بخلاف خونِ بستہ کے، جو خلقۃً منجمد ہے، وہ حلال ہی رہے گا، جیسے جگر، تلّی اور گردہ۔ البتہ! جو خون جانور کے گوشت پر ہے، وہ ناپاک وحرام نہیں ہے، وہ دمِ مسفوح کا حصہ نہیں، وہ گوشت کا حصہ ہے، جس کے ساتھ جانور کی زندگی کا تعلق ہے۔

عرب میں مشرکین کے ہاں یہ دمِ مسفوح کھانے کا اچھا خاصا رواج ہوتا تھا۔ وہ جانور کو کاٹتے وقت گلے کا خون برتن میں لے کر جمع کرتے، پھر اس کے رودوں کو صاف کر کے اس میں بھر دیتے، اور جما کر ہانڈی میں پکاتے اور بڑی رغبت کے ساتھ اسے کھاتے۔ یہ مسئلہ جانور کے خون سے متعلق ہے، چونکہ جانور ایک مال ہے، اس کی بیع وشرا بھی جائز ہے، اور اس کے اعضاء سے انتفاع بھی جائز ہے، اور شرعاً حلال مال کا یہی حکم ہے۔ البتہ! انسان اور انسانی خون کی بیع وشرا جو آج کل ہر جگہ رائج ہے، پھر ایک انسان کے خون، گردہ، دل، جگر، آنکھیں وغیرہ کا دوسرے انسانوں کے بدن میں آپریشن کے ذریعہ پیوند کاری، اس کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں یہ واضح ہو کہ انسان اشرف المخلوقات اور قابلِ احترام ہستی ہے۔ یہ کوئی مال نہیں ہے کہ اسے کاروبار بنا کر فروخت کیا جائے، اور دیگر اشیاء کی طرح تجارت کا ذریعہ بنایا جائے۔ جب یہ انسان مال نہیں ہے، تو اسے بیچنا، خریدنا، عورت کے حقِ مہر میں دینا، عید قربانی کرنا، خون دیت میں دینا، سب ممنوع ہے۔

پس یہی حکم اس کے اعضاء واجزاء کا بھی ہے کہ انہیں فروخت کرنا، اور خریدنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ البتہ! نہایت اضطراری حالت میں علماء کرام نے ایک شخص کے خون کو بذریعۂ انجکشن ودیگر ذرائع سے مریض کے بدن میں منتقل کرنے کی اجازت دی ہے۔ اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کو خطرہ ہو، اور کوئی دوسری دوا جان بچانے کے لئے مؤثر نہ ہو، یا موجود ہی نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظنِ غالب ہو۔ یہ ایک اضطراری کیفیت ہے، جس کی رو سے مضطر آدمی کے لئے جان بچانے کی خاطر مردار کھانے کی بھی اجازت ہے۔ البتہ! بغیر حالت اضطراری کے ایسا کرنا جائز نہیں ہوتا۔

اور جو لوگ اس انسانی خون کو کاروبار کا ذریعہ بنا کر عام حالات میں انسانی اعضاء اور انسانی خون کی خرید وفروخت کرتے ہیں، یہ ہرگز جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت فرمائے۔ آمین

☆ ......﴿اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ﴾ : تیسری چیز جو حرام کی گئی ہے، وہ خنزیر کا گوشت ہے۔ جانوروں میں سب سے زیادہ بدترین اور نہایت ناپاک جانور سور ہے، جیسے انسانوں میں بدترین ناپاک ونجس کفار ومشرکین ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر قربان! ایک ناپاک کا دوسرے ناپاک کے ساتھ گہرا تعلق رکھا ہے، کہ انہیں سوائے خنزیر کے کسی دوسرے حلال جانور کے ساتھ کوئی تعلق ہے، اور نہ چاہت۔ ﴿اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ﴾ [النور:۲۶] (گندی چیزیں گندے لوگوں کے لئے ہیں) کے مطابق منکرینِ توحید ورسالت ہر قسم کی پاکیزہ غذاؤں سے متنفر اور محروم ہیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں اگرچہ "لحم" کا لفظ مذکور ہے، مگر حرمت کا تعلق خنزیر کے تمام اعضاء واجزاء کے ساتھ اسی طرح ہے، جس طرح اس کے گوشت کے ساتھ۔ یعنی گوشت، کھال، بال، ہڈی، پٹھے، خون، پسینہ تک سب حرام ہیں، اور عام حرمتوں سے اشد ہے۔ اسی کا نام ہے "نجس العین"۔ لہٰذا اگر کوئی خنزیر کو ذبح کرکے ہزار مرتبہ "بسم اللہ اللہ اکبر" پڑھے گا، بے سود اور غیر مفید ہوگا، چونکہ خنزیر کے بارے میں یہ مشہور اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ تمام جانوروں میں سب سے بے غیرت اور بے حیاء ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی ماں بہن بیٹی کے ساتھ جفتی کرتا ہے۔ یہی اثر اس کے گوشت میں ہے، جسے بڑی رغبت کے ساتھ نصاریٰ کھاتے ہیں، جو کہ جانوروں، کتوں اور گدھوں کی طرح بے غیرت اور بے حیاء وبے شرم ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور لعنت ہو۔

☆......﴿وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾: چوتھی چیز جس کو آیت کریمہ میں حرام قرار دیا گیا ہے، وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں:

اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرّب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقتِ ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق وباجماعِ امت حرام ہے، اور یہ جانور میتۃ ہے۔ اس کے کسی جز سے انتفاع جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ صورت آیت ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا مدلولِ صریح ہے، جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرّب الیٰ غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرّب الیٰ غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقتِ ذبح اس پر نام اللہ تعالیٰ ہی کا لیا جائے، جیسے بہت سے ناواقف اور بے علم مسلمان بزرگوں، پیروں، پیغمبروں، مرشدوں کے نام پر ان کی خوشنودی ورضامندی حاصل کرنے کے لئے بکرے، گائے، اونٹ، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر اللہ تعالیٰ کا نام ہی پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاقِ فقہاء حرام ہے، اور مذبوحہ جانور مردار ہے، مگر تخریجِ دلیل میں کچھ اختلاف ہے۔

بعض حضرات مفسرین وفقہاء نے اس کو بھی ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا مدلولِ صریح قرار دیا ہے، جیسا

کہ حواشی بیضاوی میں ہے: ”فَكُلُّ مَانُوْدِیَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسمِ اللهِ فَهوَ حَرَامٌ وَاِنْ ذُبِحَ بِاسْمِ اللهِ تَعَالٰی حَيْثُ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ اَنَّ مُسلِمًا ذَبَحَ ذَبِيحَةً وَقَصَدَ بِذَبْحِهِ التَّقَرُّبَ اِلٰی غَيْرِ اللهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَ ذَبِيحَتُهٗ ذَبِيحَةُ مُرْتَدٍّ“۔ یعنی ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا، وہ حرام ہے، اگرچہ بوقتِ ذبح اللہ تعالیٰ ہی کا نام لیا ہو، اس لئے کہ مفسرین اور علماء اور فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرّب کے لئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے، تو وہ مرتد (دین سے خارج) ہو جائے گا۔ اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا، اور یہ واضح ہے کہ غیر مسلم کا ذبیحہ حرام ہے، تو یہ بھی حرام ہی ہوگا۔

درمختار کتاب الذبائح میں ہے: ”ذُبِحَ لِقُدُوْمِ الْاَمِيْرِ وَنَحْوِهٖ كَوَاحِدٍ مِنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِاَنَّهٗ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ وَلَوْ ذُكِرَ اسْمُ اللهِ وَاَقَرَّهُ الشَّامِیُّ علیہ الرحمۃ“۔ [شامي، كتاب الذبائح]

بعض حضرات نے اس صورت کو ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ﴾ کا مدلولِ صریح تو نہیں بنایا، کیونکہ وہ بحیثیتِ عربیت تکلّف سے خالی نہیں ہے، مگر بوجہِ اشتراکِ علّت، یعنی تقرّب الیٰ غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ﴾ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے۔ یہی وجہ بعض علماء کے ہاں پسندیدہ ہے، نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ﴾ [المائدة:۳] (اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے، اور یہ بھی کہ پاسوں سے قسمت معلوم کرو)۔

”نُصُب“ ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ: ”وہ جانور جس کو معبودانِ باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے“۔ اس سے پہلے ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ﴾ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿مَآ اُهِلَّ﴾ کا مدلولِ صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ﴿ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ اس کے بالمقابل آیا ہے، جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے۔ اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں، جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرّب کے لئے، مگر بوقتِ ذبح اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہے۔ [حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ]

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، ان کی عبارت یہ ہے: ”وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالصِّيَاحِ بِاسْمِ الْمَقْصُوْدِ بِالذَّبِيحَةِ وَغَلَبَ ذٰلِكَ فِي اسْتِعْمَالِهِمْ حَتّٰى عُبِّرَ بِهٖ عَنِ النِّيَّةِ الَّتِیْ هِیَ عِلَّةُ التَّحْرِيْمِ“۔ [قرطبي]

عرب کی عادت تھی کہ جس کے لئے ذبح کرنا مقصود ہوتا، ذبح کرنے کے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے، اور یہ رواج ان میں عام تھا، یہاں تک کہ اس آیت میں تقرّب الیٰ غیر اللہ کو جو کہ اصل علّتِ تحریم ہے، اِہلال

کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو حضرات: حضرت علی مرتضیٰ ،اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں ''فرزدق'' شاعر کے باپ حضرت غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کے نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی ﴿ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو قبول کیا۔ اسی طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ یحیٰ بن یحیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی، جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے اُمّ المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے، یہ لوگ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ وتحفہ ہمارے پاس بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اَمَّا مَاذُبِحَ لِذَالِكَ الْيَوْمِ فَلَاتَاكُلُوْا وَلٰكِنْ كُلُوْا مِنْ اَشْجَارِهِمْ۔ (جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا ہو، وہ نہ کھاؤ، لیکن ان کے درختوں کے پھل وغیرہ کھاؤ، یعنی کھا سکتے ہو)۔ [قرطبي]

الغرض! یہ صورتِ ثانیہ جس میں نیت تو تقرّب الیٰ غیر اللہ کی ہو، مگر ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے۔ اول تو اشتراکِ علّت، یعنی نیتِ تقرّب الیٰ غیر اللہ کی وجہ سے ﴿ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ کے حکم میں ہے، دوم یہ کہ آیت ﴿ وَمَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ﴾ کا بھی مدلول ہے، اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کا کان کاٹ کر، یا کوئی دوسری علامت (داغ وغیرہ) لگا کر تقرّب الیٰ غیر اللہ اور تعظیم لغیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں، اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں۔ یہ جانور ﴿مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ اور ﴿وَمَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ﴾ دونوں میں داخل نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کہا جاتا ہے۔

ان کا حکم یہ ہے کہ یہ فعل تو بنصِ قرآن کریم حرام ہے، اور خالص شرک ہے، جیسا کہ آیت: ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَاسَآئِبَةٍ وَّلَاوَصِيْلَةٍ وَّلَاحَامٍ ﴾ [المائدة:۱۰۳] میں اِن شاء اللہ تعالیٰ آئے گا، مگر ان کے اس حرام عمل سے، اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے

عقیدۂ باطلہ کی تائید وتقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے، مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کے ملک سے خارج نہیں ہوا، بلکہ اسی کا مملوک ہے، اگر چہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میرے ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہوگیا، شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، اور وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔[معارف القرآن]

چوتھی صورت نذر لغیر اللہ حرام اور صریح شرک ہے:

اس چوتھی صورت کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ بھی ہے، نقد رقم، کپڑے، چادر، مٹھائی، چاول، دیگچی، حلوا، پھل، کھانا وغیرہ۔ ہندو لوگ ایسی تمام چیزوں کو اپنے بتوں، دیوتاؤں پر، اور جاہل و مشرک نام نہاد مسلمان، بزرگوں، پیروں، سیدوں کے مزرات پر چڑھاتے ہیں، اور اپنی مرادوں اور دیگر بہت سی حاجتوں کے پورا ہونے کے لئے یہ بہت سارے کام انجام دیتے ہیں، جن کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بت اور مزارات اور اولیاءِ کرام ہم سے راضی ہوکر ہمارے مسائل حل کریں گے، اور ہماری حاجتیں پوری کریں گے۔ اولاد، رزق و روزی، خوشحالی، مال وتجارت، تندرستی وعافیت، عزّت وحرمت اور کرسی واقتدار وغیرہ ساری حاجتیں پوری کریں گے۔

یہ سب شرک اور حرام ہے۔ فقہاء وعلماء کرام نے اشتراکِ علّت تقرّب إلی غیر اللہ کی وجہ سے ﴿مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کے حکم میں داخل قرار دے کر حرام کہا ہے، اور ایسی چیزوں کے کھانے پینے، اور اس قسم کے عقیدوں کو باطل، مردار، ناپاک اور حرام قرار دیا ہے۔ گیارہویں، بارہویں اور محرم کی دسویں تاریخوں کے تمام مأکولات ومشروبات مشکوک ومکروہ نہیں، بلکہ خالص حرام اور ناجائز ہیں، لہٰذا موحد، دیندار، متقی اور تابعِ شریعت مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسی چیزوں سے کلّی اجتناب کریں۔

* * *

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ
فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل کیا ہے، اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت خریدتے ہیں، یہی لوگ جو نہیں کھاتے (بھرتے) اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۱۷۴ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو، اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خریدا ہے، یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں۱۷۵ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے، اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا البتہ وہ ضد وعناد میں دور جا پڑے ہیں۱۷۶

معارف ومنازل

یعنی جو یہود ونصاریٰ اور خاص کران کے علماء، جناب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کو (جو تورات وانجیل میں ہیں) چھپاتے ہیں، اور اس کے بدلے حقیر وقلیل مفاد لوگوں سے سمیٹتے رہتے ہیں۔ فانی دنیا کے بدلے اپنی ابدی اخروی زندگی برباد کررہے ہیں، اور ہدایت ومغفرت کے بدلے ضلالت وگمراہی اور ابدی عذاب خرید رہے ہیں، تو ایسے ناعاقبت اندیش محض ضد وعناد اور لالچ کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی اور ساری مخلوقات کی لعنت کے مستحق وحقدار ہورہے ہیں، جیسا کہ سورۃ بقرۃ آیت ۱۵۹ کے تحت بیان ہوا جو کہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ [البقرة: ۱۵۹] (جو لوگ ہمارے حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرضِ فاسد سے) چھپاتے ہیں، باوجود یہ کہ ہم نے ان لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کردیا ہے۔ ایسوں پر خدا اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں)۔

اس مذکورہ آیت کریمہ میں دوبارہ اسی مضمونِ سابق کے دہرانے کے دو ہی مطلب ہوسکتے ہیں: اول یہ کہ اس جیسے مضامین کو بار بار بیان کرنے کا مقصد تنبیہ وتوبیخ ہوتی ہے، تاکہ لوگ سبق سیکھیں، اور عبرت حاصل کریں۔ دوسرا یہ کہ یہاں متصلاً حرام وحلال کے مسائل بیان ہوئے، یعنی میتة، دم، لحم خنزیر، وما أهل به لغير الله ان کے علاوہ چند حلال چیزیں، جنہیں مشرکین نے اپنے اوپر حرام کیا تھا، اس کے متصل دوبارہ اہلِ کتاب کو کتمانِ حق پر تنبیہ کی جارہی ہے، کیونکہ جس طرح انہوں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کو چھپایا۔ اسی طرح تورات وانجیل میں بیان کردہ حلال وحرام کے مسائل کو بھی چھپایا۔

توارت وانجیل میں صاف صراحت کے ساتھ سور (خنزیر) کی حرمت کا شدومد کے ساتھ بیان ہے، مگر انہوں نے اس کو چھپا کر خنزیر کی حلّت اور طہارت کو بیان کرنے کی کوشش کی، اوراحکامِ الٰہی میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔انہوں نے محض اپنی برتری ثابت کرنے، اور حقیر وذلیل مالی منفعت کی خاطر اپنے لئے لعنت وغضبِ الٰہی کو خریدا، اور ہدایت کو ضلالت کے ساتھ، مغفرت کو عذاب کے ساتھ تبادلہ کر کے راندۂ درگاہ اور لعنتی ہوئے۔آخرت کی رسوائی تو ظاہر ہے، لیکن دنیا میں بھی لوگوں پر علماءِ یہود کا مکر کھل گیا، رفتہ رفتہ وہ چھپے ہوئے حقائق لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتے گئے۔

علاوہ ازیں! خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ عادات نے لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق پر آمادہ کردیا، اور ان کی وہ جماعت جس کے ہاتھ سے نکل جانے کے ڈرنے انہیں کلام اللہ چھپانے پر آمادہ کیا تھا، بالآخر ہاتھ سے جاتی رہی۔ان لوگوں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرلی، اور ایمان لے آئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل کر ان حق چھپانے والوں سے قتال کیا، اور نہیں خوار وذلیل کر کے حرمِ مدینہ سے باہر جلاوطن کر کے ہر قسم کے ساز وسامان سے محروم کردیا۔

قرآن کریم میں ان کی ایسی حرکتیں جگہ جگہ بیان کی گئیں ہیں، یہاں بھی فرمایا کہ یہ مال جو اللہ تعالیٰ کی باتوں کو چھپا کر تم کماتے ہو، اور کتمانِ حق کے بدلے جو تحائف وشکرانے لوگوں سے سمیٹتے رہتے ہو، یہ دراصل آگ کے انگارے ہیں، جنہیں تم پیٹ میں بھر رہے ہو۔جس طرح یتیم کا مال کھانے والے اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں، تم بھی اسی طرح جہنم کی آگ سے اپنے پیٹ بھر رہے ہو۔

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن بات چیت بھی نہیں کرے گا، اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا، بلکہ دردناک عذابوں میں مبتلا رہیں گے، اس لئے کہ ان کے اس کرتوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر نازل ہوا ہے، ان سے رحمت کی نظر ہٹ گئی ہے، اور یہ ستائش اور تعریف کے قابل نہ رہے، بلکہ وہ سزایاب ہوں گے، اور وہاں تلملاتے ہی رہیں گے۔

حدیث شریف میں ہے کہ: ''تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ بات چیت نہیں کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا، اور نہ انہیں پاک کرے گا، ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا: بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ، متکبر فقیر''۔[مشکوٰۃ]

پھر فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی، انہیں چاہیے تھا کہ توارت وانجیل کی باتیں عوام تک

پہنچاتے، لیکن اس کے بدلے انہوں نے وہ باتیں چھپالیں، اور خود بھی کفر پر راضی رہے، اور پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عظیم الشان قرآن کی تکذیب کی، پس اظہارِ حق پر جونعمتیں اور مغفرتیں انہیں ملنے والی تھیں، ان کے بدلے نقمتیں، زحمتیں اور عذاب اپنے سر لے لیا۔

پھر فرمایا: وہ ایسے دردناک عذاب میں ہوں گے کہ دیکھنے والا ششدر رہ جائے، اور یہ بھی معنی ہیں کہ انہیں آگ کے عذاب کی برداشت پر کس چیز نے آمادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مشغول ہوگئے؟ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس عذاب کے مستحق یوں ہوئے کہ انہوں نے اللہ پاک کی باتوں کو ہنسی مذاق اور کھیل سمجھا، اور جو کتاب حق کو ظاہر کرنے اور باطل کو ختم کرنے کے لئے اتری تھی، انہوں نے اس کی مخالفت کی، اور ظاہر کرنے کی باتیں چھپائیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمنی سے دور کی گمراہی میں جا پڑے، جہاں سے کسی قسم کی واپسی ممکن نہ ہو، ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ [الحج:۱۱] (نقصان اٹھایا دنیا اور آخرت کا، یہ واضح نقصان ہے)۔

مقامِ حیرت ہے اور مقامِ حسرت بھی کہ آج مسلمان اپنے گرد و پیش کے حالات پر سنجیدگی سے غور نہیں کررہے! یہود و نصاریٰ آسمانی نظام سے غداری کر کے مبغوض وملعون ہوئے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ [المائدة: ۷۸] (جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، اور حد سے تجاوز کرتے تھے)۔

اہلِ کتاب کے جرائم اگرچہ بے شمار ہیں، جنہیں کوئی گن نہیں سکتا، مگر زیرِ نظر آیت کریمہ میں صرف کتمانِ حق اور اِعراض عن الحق کے جرم پر ان کو وعید سنائی جارہی ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جو قوم خدائی احکام سے اعراض کرے، اور اس کے مذہبی پیشوا اپنے نفس کی خواہشات اور دنیوی اغراض ومفادات کی خاطر قانونی دفعات کو چھپائے، اور حلت وحرمت کے مسائل بیان کرنے سے اعراض کرے، تو یقینی طور پر وہ قوم عذابِ الٰہی کی گرفت میں آکر ہمیشہ کے لئے ذلیل وخوار ہوجائے گی۔

اسلام آفاقی دین ہے، قرآن حکیم آفاقی صحیفۂ رحمت ہے، وہ پورے عالم کے لئے ہے، اور سارے جہاں کو خطاب کرتا ہے، وہ اگر کسی خاص قوم کی کسی خاص عمل پر تنقید و مذمّت کرتا ہے، تو یہ عمل اور اس کی مذمت قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے ہوتی ہے، مثلاً اگر کتمانِ حق نے اہلِ کتاب کو ملعون اور مبغوض بنایا، تو کیا ہم مسلمان اس

سے مستثنیٰ رہیں گے؟ ہرگز نہیں!

جب تورات وانجیل کے احکام چھپانا جرم ہے، توقرآن حکیم کے احکام چھپانا اس سے کہیں زیادہ بڑا جرم ہوگا۔ اور ظاہر بات ہے اگر کوئی ایک بدعت کو رائج کرے گا تو اس کے ساتھ لازمًا ایک سنت کا ضیاع ہوگا، اسی طرح قرآنی احکام کے چھپانے سے مسائلِ توحید چھپانے سے لازمًا مشرکانہ اور شرکیہ اعمال کا صدر وظہور، بلکہ عروج ہوگا۔
اگر علماء کرام توحید کے مسائل کو چھپائے بغیر کھول کر بیان کریں توقبر پرستی، بدعات، نذر لغیر اللہ وغیرہ جرائم آہستہ آہستہ خود بخود دم توڑ دیں گے، اور شرکیہ اعمال ختم ہو کر توحید عام ہوجائے گی۔

آج اگر ہمارے معاشرے اور ہمارے ملکوں میں توحید ناپید ہے، اور شرک کی جڑیں گہری اور مضبوط ہیں، تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے بعض علماء نے کتمانِ حق کے مرتکب ہوکر شرکیہ اعمال کی سرپرستی کی، اور دنیوی اغراض ومقاصد کے شکار ہوئے، کیونکہ توحید پر چلنے اور عمل کرنے سے دنیوی مفادات اور ہر قسم کے مالی مراعات بند ہوجاتے ہیں، جبکہ شرک وبدعات کی سرپرستی سے خوب دکانداری ہوجاتی ہے، مالی مراعات میں روز بروز اضافہ بھی ہوتا ہے، اور شہرت بھی حاصل ہوتی ہے۔

تاریخِ اقوامِ عالم ہمارے سامنے ہے، کسی بھی قوم نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کا نہ استقبال کیا، اور نہ ہی ان کو سچا اور برگزیدہ کہا۔ آج انبیاء علیہم السلام کے حقیقی وارث علماء کرام کے ساتھ لوگوں کا وہی سلوک ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوتا رہا۔ البتہ توحید پر کلہاڑی کی ضرب لگانے والے، اور رسومِ شرک وجاہلیت کی سرپرستی کرنے والے علماء کی اتنی آؤ بھگت، خوشامدی اور پذیرائی ہے جس کی کوئی حد اور اندازہ نہیں ہے۔

سید، پیر، فقیر، ملنگوں پر اور گنڈے، تعویذات پر پورا معاشرہ فداء اور قربان ہے۔ ایک ایک تعویذ کا ہدیہ و شکرانہ لاکھوں میں ہے۔ حق اور توحید کو چھپانے والے وہ عجیب وغریب بدعات جاری کررہے ہیں، جنہیں دیکھ کر اور سنکر ابلیس پر دل کا دورہ پڑتا ہے کہ یہ ہُنر مجھے کیوں یاد نہیں آیا؟ لوگوں سے شکرانے لے کر ایسے غلط اور بے سروپا فتوے جاری کررہے ہیں، جنہیں چاروں اماموں نے نہیں سنا، اور نہ ہی ان کے خیال میں آیا، اور یہ بات بھی نہیں کہ یہ تعویذ فروش جاہل اور علم سے نابلد ہیں، بلکہ بڑے بڑے علماء حدیث وتفسیر اور علومِ عربیہ کے ماہرین بھی بلعم بن باعورا کے نقشِ قدم پر رواں دواں ہیں۔

شاید! انہوں نے سوچا ہوگا کہ چندروز عیش کرکے آخر عمر میں توبہ کریں گے، "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ" کے

معنی یہ ہرگز نہیں کہ زندگی لہو ولعب اور اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی نافرمانی میں گزارو، اور نیت توبہ کی کرو۔ مزارات پر شب وروز مرد وزن، بچوں بوڑھوں کا ہجوم رہتا ہے، نذرانے اور شکرانے دھڑا دھڑ وصول کررہے ہیں، نہ رکوع کی کمی، نہ سجدوں کی کمی، آہ وفغان ہے کہ حضرت جی مہربانی فرمائیے!! پھر ایک فہرست بیان کرکے حضرت جی کے سپرد کرتے ہیں، کہیں تبرکات کا راج ہے تو کہیں بہشتی دروازہ لگا ہوا ہے، جس سے گزرنے پر جنت کا وعدہ ہے، اور اس کی ایک بھاری فیس ہے۔

ایک جگہ تو ایک مالدار شخص سے ستر ہزار روپیہ فیس لی گئی کہ تمہارے سارے خاندان کے لئے یہ کافی ہے۔ گیارہویں کی بدعت، میلاد، محرم، تیجے، دسویں، اکیسویں کا ختم!! پہلے ایصالِ ثواب کا رواج موت کے بعد تھا، مگر اب تو یہ کہا جارہا ہے کہ پتہ نہیں مرنے کے بعد ورثاء یہ کام انجام دیں گے یا نہیں، لہٰذا بہتر ہے کہ آپ اپنی زندگی میں چالیس ہزار روپیہ حضرت جی کے حوالے کرو، اور سیدھا بہشت کا رخ کرو۔ سبحان اللہ!

اس امت مسلمہ کو تو ربّ العزّت نے پاکیزہ بنایا تھا، یہ سارے برے اعمال اہلِ کتاب کے اندر رائج تھے، لیکن سید کائنات ﷺ نے پیشنگوئی فرمائی کہ جو بیماریاں بنی اسرائیل میں پائی جاتی تھیں، اے میری امت کے لوگو! تم میں بھی وہی بیماریاں عود کر آئیں گی، تم قدم قدم پر بنی اسرائیل کی نقالی کروگے، اور ان کے نقش قدم پر چلوگے "حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ"۔ [ترمذي] جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے، اسی طرح تمہارے اعمال اور تمہارا معاشرہ یہود ونصاریٰ کے مطابق، اوران کے معاشرہ کی نقل ہوگا۔ یہود ونصاریٰ کے فتنے، فسادات، شرارت، گوسالہ پرستی اور دیگر چالیس بیماریوں پر آیت ۴۰ سے آیت ۱۲۳ تک مکمل کلام گزر چکا، وہاں دیکھا جائے۔

اس قسم کے پیر، گدی نشین اور علماءِ سوء قرآن حکیم میں لفظی تحریف سے تو قاصر ہیں، البتہ معنوی تحریف کے ذریعے قرآن وحدیث میں محض دنیوی مقاصد کی خاطر، اور امراء وسلاطین کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے غلط بے بنیاد فتاویٰ جاری کرتے ہیں۔ ہر شخص دیکھتا اور سنتا ہے کہ کوئی وزیر، حاکم، سرمایہ دار اس قماش کے لوگوں سے کبھی متنفر نہیں ہوتے، بلکہ پکے عقیدت مند ہی ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ بڑے لوگ علماءِ حق کے ہمیشہ مخالف رہتے ہیں۔ کبھی بھی علماءِ حق کے فتوؤں اور فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے۔ مگر گدی نشینوں کو اپنا راہنما تسلیم کرتے ہیں، ان کی درگاہوں پر حاضری دیتے ہیں، نذر ونیاز پیش کرتے ہیں، اور وہ لوگ بھی شاہی درباروں پر حاضری دے کر حاکموں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اور اپنے عزیز ورشتہ داروں کے لئے عہدے اور ملازمتیں حاصل کرتے ہیں۔

یاد رکھیں! ایسے لوگوں کا حشر قیامت کے روز یہود و نصاریٰ کے احبار اور رہبانوں کے ساتھ ہوگا، اور یہ حزب الشیاطین کہلائیں گے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ: نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو، بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر، اور قیامت کے دن پر، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر، اور سب کتابوں پر، اور اللہ تعالیٰ کے سب (نبیوں) رسولوں پر، اور دیا اس نے مال اس کی محبت پر قرابتداروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، اور مسافروں کو، اور محتاجوں کو، اور گردنوں کے چھڑانے میں، اور اس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کرتا رہا، اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں جبکہ عہد کرتے ہیں، اور سختی اور تکلیف میں صبر کرنے والے ہیں، اور لڑائی کے وقت بھی یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں ﴿۱۷۷﴾

معارف و منازل

یہاں پہنچ کر سورۂ بقرہ تقریباً نصف ہوجاتی ہے۔ ابتداءِ سورت سے یہاں تک زیادہ تر خطاب امتِ دعوت کو تھا (یہود و نصاریٰ، مشرکین، کفار وغیرہ کو) آئندہ نصف میں آخر تک امتِ اجابت کو خطاب ہے، اور اختتامِ سورت تک اکثر و بیشتر شرعی مسائل کا بیان ہوگا۔

یہ آیت کریمہ قرآن حکیم کی جامع ترین آیت ہے، جس میں اصولِ خمسہ کے علاوہ ایمان والوں کی اٹھارہ صفات کا بیان ہے۔ عقائد، اعمال، عباداتِ بدنیہ، عباداتِ مالیہ، مبدأ و معاد، فرائض، مستحبات، حقوق اللہ و حقوق العباد اور مکارمِ اخلاق وغیرہ، بہت سی چیزوں کا بیان ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں باب أمور الایمان قائم کر کے

اسی آیت کریمہ کی تخریج وبیان کرتے ہیں۔

ماقبل کے ساتھ ربط:

اس آیت کریمہ کا ماقبل کے ساتھ مختصر ربط یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کا تعلق سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ سے لے کر آیت ۱٦۳ تک کے تمام مضامین کے ساتھ ہے۔ اہلِ کتاب تمام اعمالِ خیر اور نیکیوں کو صرف اس بات میں منحصر جانتے تھے کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرنے سے سب کچھ حاصل ہوجائے گا، مزید کسی عمل کی حاجت نہیں ہے (مشرق سے مراد نصاریٰ کا قبلہ، اور مغرب یہود کا قبلہ ہوتا تھا، یا مشرق ومغرب سے مراد عام جہات ہوں، یعنی کسی جہت کے استقبال میں دینِ الٰہی کو منحصر سمجھنا نادانی، اور جہالت کے سوا کچھ نہیں، جیسے یہود سمجھتے تھے) اسی طرح مشرکینِ مکہ بھی اس غرور وغلط فہمی کے شکار رہے کہ کعبۃ اللہ ہمارا قبلہ ہے، اور ہم لوگ کعبہ شریف کے خدام ونگہباں ہیں، لہٰذا ہمیں کسی دوسرے عمل کی حاجت نہیں ہے۔

اس آیت کریمہ میں دونوں تنگ نظر بے عقل قوموں کی تردید ہے کہ تمہارا نظریہ سراسر غلط ہے کہ اعتقاداتِ صحیحہ اور اعمالِ خیر اور صفاتِ حسنہ کو ترک کردینا، انہیں غیر ضروری جاننا، صرف جہتِ قبلہ کو اہمیت دینا، اسے تمام اعمالِ خیر سے بہتر جاننا، اور اسی پر قناعت کر کے ساری نیکیوں سے خالی دامن رہنا سوائے حماقت ونادانی کے اور کچھ نہیں ہے، کیونکہ استقبالِ قبلہ (جہتِ مشرق ومغرب) کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔

یہ ایک فرعی مسئلہ ہے، جسے تم لوگوں نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر بنیادی مسئلہ بنادیا، بلکہ اصل نیکی جو بنیادی بھی ہے، اور اہم وضروری بھی، نیز سبب فوز وفلاح ومغفرت بھی ہے، وہ ہے **ایمان باللہ تعالیٰ و الیوم الآخر و الملئکۃ و النبیین و الکتب،** جس سے یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ مکہ کوسوں دور اور محروم ہیں۔ وہ لاکھوں بار استقبالِ جہت کرلیں، جب تک وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور دوسرے امورِ خیر بجانہیں لائیں گے، انہیں ذرہ بھر فائدہ نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی وہ نجات حاصل کرسکیں گے، اور یہ مسلّم ہے کہ کسی شخص کو نظامِ الٰہی میں خودساختہ تشریح کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے، کہ وہ اصولی باتوں سے منحرف ہو، اور غیر ضروری امور کو اصولی باتوں پر فوقیت دے، اور اس سے اپنی خواہشات کے مطابق مسائل وضع کرے۔

فائدہ:

اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) پر بے شمار انعامات، اور اس پر ان کی پیہم نالائقیوں کی طویل اور لمبی داستان

سنا کر یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اس منصب کی اہلیت تم نے کھودی ہے، اس لئے تمہیں معزول کر کے امامتِ کبریٰ حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کے لائق وقابل فرزند سید کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کردی گئی ہے، اب وہی قیامت تک اس کا حق ادا کریں گے۔ جب تک بنی اسرائیل میں امامت رہی، بیت المقدس قبلۂ حق اور مرکزِ دعوت و ارشاد رہا، خود سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان بھی اسی کو قبلہ بنا کر ایک مدت تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ لیکن جب بنی اسرائیل معزول کر دیئے گئے، تو اب بیت المقدس کا قبلہ ہونا بھی منسوخ ہو گیا، لہٰذا منسوخ شدہ قبلہ پر جمے رہنا، اور تمام اعمالِ خیر سے گریز کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے، سوائے ضد وہٹ دھرمی کے، اور یہی ضد وعناد اور حق کا انکار یہود کا طرۂ امتیاز اور علامت وشناخت ہے۔

ابواب البِرّ کے اصولِ خمسہ، اور صفاتِ حمیدہ کا بیان:

اس آیت کریمہ کا شمار جوامع الکلم میں ہے، جس میں اعتقادیات (ایمانیات) عبادات، معاملات اور اخلاقیات کو اجمالاً اصولی انداز پر بیان کیا گیا ہے، پھر اختتامِ سورت تک اس اجمال کی تفصیلات کو بڑے پیارے اور دلکش انداز میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح گویا یہ آیت کریمہ نچوڑ ہے اسلامی احکام کا، اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہے: ”مَنْ عَمِلَ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ“۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ﴾ نیکی اس میں منحصر نہیں کہ مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کر لیا جائے ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ بلکہ اصل نیکی جو ذریعۂ نجات، اور موجبِ سعادت ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ ربّ العزت کی ذات وصفات پر ایمان لایا جائے، اور جمیع مافوق الاسباب امور میں اسے متصرف اور بلا شرکتِ غیر فاعل و مختار سمجھا جائے۔ اسی طرح روزِ قیامت پر، اور اس میں واقع ہونے والے سارے امور پر عقیدہ جما کر ایمان لایا جائے۔ تیسرے درجہ میں فرشتوں پر ایمان لانا، چوتھے درجہ میں آسمانی کتابوں پر، جو مشہور کتابیں ہیں، وہ چار ہیں: تورات، انجیل، زبور اور قرآن حکیم۔

ایمان کا تعلق سب کے ساتھ ہے، عمل صرف قرآن حکیم کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح جو صحیفے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئے ہیں، بلاتفریق سب پر اجمالاً ایمان لانا فرض ہے۔ پانچویں نمبر پر ایمان بالانبیاء علیہم السلام حسب ارشاد: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ بلاتفریق سارے انبیاء ورُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا، سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور سب سے آخری نبی سید کائنات خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

قرآن حکیم میں پچیس انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نام متفرق سورتوں میں مذکور ہیں۔احادیث میں چند دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں کی تصریح بھی ہے۔انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد اسی طرح رسولوں کی مجموعی تعداد کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار والی روایت کو محدّثین نے اور خاص کر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا ہے، لہٰذا فیصلہ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام، اسی طرح فرشتوں اور دیگر امورِ آخرت وغیرہ پر اجمالی ایمان کافی ہے،تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد نیکی، یعنی بِرّ کے باقی اجزاء کا بیان ہے، جن کا تعلق تہذیبِ نفس کے ساتھ ہے، یا بدن و جوارح کے ساتھ، یا مال کے ساتھ ہے، ارشاد ہے:﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾۔یعنی محبوب مال کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا کی خاطر خرچ کر کے دے دینا۔سب سے پہلے ﴿ذَوِی الْقُرْبٰى﴾ کو دینا، کیونکہ رشتہ کی وجہ سے دوسروں پر ان کا حق مقدم ہے، اور اس میں دہرے ثواب کا وعدہ بھی ہے۔دوسری مدّ ﴿وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ﴾ یتیموں اور مسکینوں کی حاجت برآری کتنا بڑا ثواب ہے؟ اور یہ ثواب شاید ہر شخص کے نصیب میں نہ ہو، مگر جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے، اور اس کو توفیق دے۔ بقول علماء کرام یہ صفت انبیاء کرام علیہم السلام کی ہے، ان کے بعد پسندیدہ لوگوں کو منتقل ہوئی۔سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيْمِ كَهَاتَيْنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ اَشَارَ بِالسَّبَابَةِ وَ الْوُسْطٰى''۔ یتیموں کی سرپرستی کرنے والا روزِ قیامت مجھ سے اتنا قریب رہے گا جیسے یہ دو انگلیاں، جیسی شہادت کی انگلی درمیانی انگلی سے قریب ہے۔[ترمذي]

چوتھی مدّ ﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ عام طور اس کا ترجمہ کرتے ہیں ''مسافر''، پس مسافر کے معنی میں حجاج، طلباء اور مجاہد وغیرہ، سب داخل ہیں۔پانچویں مدّ ﴿وَالسَّآئِلِيْنَ﴾ سائل سے مراد ''مانگنے والا''، پس ہر طرح کا محتاج مراد ہے، اس میں پیشہ ور سائل شامل نہیں ہیں، کیونکہ وہ محتاج نہیں ہیں، بھیک مانگنا ان کی عادت بن گئی ہے۔ ایسے گداگروں کو کچھ دینا بہتر نہیں ہوتا۔چھٹی مدّ ﴿وَفِى الرِّقَابِ﴾، غلاموں اور باندیوں پر خرچ کرنا، تاکہ وہ اپنی گردن خلاصی اور آزادی پر صرف کریں، ﴿وَفِى الرِّقَابِ﴾ کے معنی یہ بھی ہیں کہ قیدیوں کو دشمن کی قید سے خلاصی دلانا مال خرچ کر کے ان کی جان چھڑانا۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔

بعض علماء کے نزدیک یہ معنی بھی ہیں کہ کسی مقروض کی گردن کو قرض کے بوجھ اور قید سے خلاصی دلانا، یہ بھی ایک بہت بڑی نیکی ہے۔اس کے بعد ارشاد ہے:﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ﴾ نماز مثال ہے بدنی عبادات

کی، اورزکوٰۃ مفروضہ مالی عبادت کی، گویا سابقہ مدات سے نفلی انفاق مراد ہوا، اورزکوٰۃ سے فرضی عبادات، کیونکہ حدیث پاک میں بروایت ابوسعید خدری وفاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہما وارد ہے: ''اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکوٰۃِ''۔ [ترمذي] اسی طرح دوسرے مقام پر قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ﴾ [الذاریات: ۱۹] (اوران کے مال میں مانگنے والے اورنہ مانگنے والے (دونوں) کا حق ہوتا تھا)۔

قرآن مجید میں زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ بتیس (۳۲) مقامات پر ایک جگہ اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ ان مقامات میں سے ایک یہی آیت ہے، حالانکہ نماز کی فرضیت مکی زندگی میں ہے، اورزکوٰۃ مدینہ منورہ میں سنہ ۲ ھجری میں فرض ہوئی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ دونوں جڑواں عبادات ہیں، ایک بدنی، دوم مالی۔

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ جب کوئی عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے روزِ ازل جو عہد کیا تھا، اس کو پورا کرتے ہیں، اور جب قسم کھاتے ہیں، تو اس کو پورا کرتے ہیں، اور جب کوئی منت مانتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں، ایسے ہی جب مخلوق سے عہد کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں، مثلاً جب وعدہ کرتے ہیں تو اس کو وفا کرتے ہیں۔

قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ [الإسراء: ۳۴] (اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی)۔ کیونکہ بدعہدی گناہ ہے، اوراس کا شمار علاماتِ نفاق میں ہے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی علامتیں (خصلتیں) تین ہیں: (۱) جھوٹ بولنا۔ (۲) بدعہدی وعدہ خلافی کرنا۔ (۳) امانت میں خیانت کرنا۔ [متفق علیه] مسلم کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ اگرچہ وہ روزہ نماز کا پابند ہو، اوراپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔

فائدہ:

پہلے ﴿الْمُوْفُوْنَ﴾ ذکر کیا، اس کے متصل یہاں ''الصَّابِرُوْنَ'' نہیں فرمایا، بلکہ ﴿الصّٰبِرِيْنَ﴾ فرمایا۔ حضرات مفسرین اور خلیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ منصوب علی المدح ہے، اوریہاں فعلِ مدح مقدر ہے، اور ﴿الصّٰبِرِيْنَ﴾ اس کا مفعول ہے، تقدیرِ عبارت یہ ہے: ''اَمْدَحُ الصَّابِرِيْنَ بِمَزِيْدِ الْبِرِّ'' یعنی مدح کرتا ہوں صابرین کی زیادتی نیکی کے ساتھ۔ گویا صابرین تمام لوگوں میں زیادہ تعریف کے حقدار ہوئے، کیونکہ صبر ایک ایسا عمل اور قوت ہے، جس کے ذریعے یہ سارے مذکورہ پسندیدہ اعمال آسان ہوجاتے ہیں، کیونکہ صبر کے معنی ہیں: نفس کو

قابو میں رکھنا، اور برائیوں سے بچانا''۔ اگر غور کیا جائے، تو تمام باطنی اخلاقِ فاضلہ کی اصل روح صبر ہی ہے، اسی صبر کے ذریعہ تمام کمالات اور روحانی اقدار حاصل ہوجاتے ہیں، اور سارے اخلاقِ رزیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

﴿فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ﴾ "بأساء" تنگی اور فقر کو کہتے ہیں، "ضراء" سے مراد مرض و بیماری۔ اور بأس کے معنی ہیں: حرب و میدانِ جنگ، جہاں صبر قدرے مشکل اور سخت ہوتا ہے۔ پہلے روایت گزر چکی کہ اسلامی سرحد پر پہرہ دینے والے، اور میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والے دونوں کے لئے شہادت کا رتبہ ثابت ہے، اگرچہ اپنی موت آپ مرجائیں۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ یہی لوگ سچے ہیں، راست باز، نیک گفتار و نیک کردار، اور اصحاب البرّ ہیں۔ پس جس کا یہ حال ہوگا، وہی متقی و پرہیز گار ہی ہوگا، ہر گناہ سے پاک ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ
بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ
إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے اوپر قصاص فرض قرار دیا گیا ہے، مقتولوں میں، آزاد کے بدلے میں آزاد آدمی، غلام کے بدلے میں غلام، عورت کے بدلے میں عورت، پس جس کو معاف کیا گیا اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، پس دستور کے مطابق پیچھے لگنا ہے، اور اس کی طرف سے نیکی کے ساتھ ادا کرنا ہے، یہ تمہارے ربّ کی طرف سے تخفیف ہے، اور مہربانی ہے، پس جس شخص نے اس کے بعد تعدّی کی اس کے لئے عذابِ الیم ہے۔ اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے، اے عقل مندو، تاکہ تم متقی بن جاؤ ﴿١٧٩﴾

معارف ومنازل

یہاں سے ابواب البرّ کی جزئیات کا بیان شروع ہورہا ہے، اور یہ اس کی پہلی دفعہ ہے، جس میں انسانی جان کی قدر و قیمت کا بیان ہے۔

قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے قصاص کو ایک تماشا بنایا تھا۔ کچھ انسانوں کی قیمت اتنی اونچی ہوتی تھی کہ پورا معاشرہ اس کی قیمت ادا نہیں کرسکتا تھا، اور کچھ لوگ اس طرح نکمے اور گرے ہوئے سمجھے جاتے تھے کہ بھیڑ بکریوں سے بھی کمتر سمجھے جاتے تھے، کہیں نسب وحسب، کہیں رنگ ونسل کی، کہیں سیاہ وسفید، کہیں مال ودولت، قبائل وخاندان، الغرض اونچ نیچ کی تفریق اتنی عام تھی جس سے معاشرہ نہایت تاریک تھا، اور عدل ومساوات کا نام ونشان نہ تھا، بلکہ مساوات کے نام سے لوگ واقف ہی نہ تھے، اگر نامور، مالدار اور بڑے خاندان کا آدمی قتل ہوجاتا، تو مقتول کے عوض قاتل کے خاندان کے سوتک لوگ مارے جاتے۔ پھر بھی ان کی پیاس اور طلب جاری رہتی۔ اگر عام آدمی مارا جاتا، تو اس کے عوض چند معدود دراہم دے کر سرخ آنکھوں کے ذریعے اس کے ورثاء کی اشک شوئی کیجاتی۔ بسا اوقات بڑے قبیلے کے چرواہے کے عوض دوسرے نچلے قبیلے کے سرداروں کو مارا جاتا، اور قاتل ہزار دفعہ ان کے سامنے آجاتا کوئی اس سے تعرض نہ کرتا۔

وہ معاشرہ اتنا گندا اور بھیانک ہوتا تھا، جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کا نزول ایسے وقت میں ہوا، جب تمام عالمِ انسانیت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، اور اس کے نزول کے وقت مدینہ طیبہ کے دونوں بڑے قبائل (اوس اور خزرج) اسی جہالت کی تاریکی میں چھ سو سال سے جکڑے ہوئے اور ڈوبے ہوئے تھے، مگر ایمان اور صداقت، صحبت ورفاقت نبوت نے چھ سو سالہ عداوتوں، بغض وعناد، سرکشی، قومی ونسلی تفرقوں اور عدمِ مساوات کے غرور وگھمنڈوں پر پانی پھیر دیا، اور ان میں وہ محبت ورفاقت، اور وہ تاریخی مساوات قائم کی، جس پر فرشتوں کو رشک آیا۔ مؤرخین نے جواہرات کے قلم اور سونے کے پانی سے لکھ کر قیامت تک تاریخ کے اوراق کی زینت بنا کر رقم کیا، اور یہ قصاص وبرابری اور تمام انسانوں کے چھوٹے، بڑے، عرب وعجم، سیاہ وسفید میں ایسا جاری فرمایا کہ سارے لوگوں کی جانوں کی قیمت ایک برابر قرار پائی۔ حاکم ومحکوم، غریب وامیر، مرد وعورت، خاندان وغلام ایک ہوگئے۔ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز ☆ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے ☆ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کیا اس قانونِ قصاص اور ضابطۂ مساوات اور نظامِ عدل وانصاف کی نظیر کوئی قوم، کوئی نظریہ، کوئی معاشرہ پیش کرسکتا ہے؟ روس، چین، جاپان، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور بھارت کوئی بھی اس نظام کا کوئی بدل، یا اس

کے برابر کا نظام پیش کر کے لا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! خدائی تخلیق ہو یا خدائی نظام ہو، سارا جہاں اس کی ادنیٰ مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال سے پوری کائنات کے بلغاء، شعراء، دانشوروں کو چیلنج دیا جا رہا ہے کہ قرآن حکیم کی سب سے چھوٹی سورت ''سورت کوثر'' جیسی سورت پیش کرو! ساڑھے چھ ارب کی آبادی اس چیلنج کے قبول کرنے سے قاصر اور عاجز ہے، اور قیامت تک عاجز ہی رہیں گے، ان شاء اللہ۔

مگر یہ بات نہایت ناقابلِ برداشت ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی مساوات پر تنقید کرنے والے، یعنی سرمایہ دار اور سوشلسٹ نظام کے دعویدار دہریے وغیرہ نے نسل و رنگ، کالے، گورے، سیاہ و سفید اونچ و نیچ کی وہ بھیانک تفریق اپنائی کہ جاہلیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے، اور اس کو مات دی، اور انسانیت کش، حیا سوز، برائے نام مساوات کا وہ ناپاک قانون نافذ کیا، جس سے انسانیت اور شرافت کی گردن جھک گئی۔

اس قوم کی شہرت اتنی ہے کہ وہاں ایک ہزار ٹاپ کے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں ہیں، وہاں کا عوام ۹۵ فیصد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، پھر جہالت اس کی قابلِ دید ہے، کہ کتوں اور انسانوں میں تو مساوات ہے، مگر سفید چمڑی اور سیاہ چمڑی والے انسانوں میں مساوات کا نام و نشان نہیں، حالانکہ یہ لوگ ہر قسم کی شرافت و تہذیب کے مدعی بھی ہیں۔

ع کہ برعکس نہند نام زنگی کافور......

جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے شیطان لعین کی طرح مبغوض و مغضوب اور ملعون قرار دیا ہو، اور ان کے عظیم الشان پیغمبروں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد و سلیمان علیہم السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے ان پر لعنت کی ہو، پس ایسی قوموں سے کسی خیر یا شرافت و تہذیب کی امید رکھنا سراسر حماقت ہے، یہ وہ خبیث لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر تنقید کرنے سے بھی نہیں شرمائے، اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن حکیم اور احکامِ الٰہی پر تنقید و ناروا تبصرہ کرنا، یہ ان کی اصلی فطرت ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ

آیت کریمہ کا مطلب اور تفسیر:

قصاص کے معنی: برابری اور مماثلت کے ہیں، یعنی قانونِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ ایک انسان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے، جو اس نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ﴾ [المائدة:۴۵] (نفس کے بدلے میں نفس، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، ناک کے عوض ناک، اور دیگر زخموں میں

برابری (علیٰ ہٰذا القیاس)۔

﴿الْقَتْلٰی﴾ جمع ہے قتیل بمعنی مقتول کے، چونکہ یہاں قتلِ عمد کا قصاص بیان کیا گیا ہے، لہٰذا اوّل اس کی وضاحت ہوگی۔ قتلِ عمد اس کو کہتے ہیں جس میں قاتل قصداً وارادۃً کسی شخص کو کسی آہنی ہتھیار سے، یا کسی ایسی چیز سے جس سے گوشت کٹ کر خون بہہ جائے، مار ڈالے۔

اس آیت میں اس قسم کے قتل کا قصاص مذکور ہے۔ رہا قتل خطا و دیگر احکام، ان کی تفصیل سورۃ النساء آیت ۹۲ اور سورۃ المائدہ آیت ۴۵ میں ان شاء اللہ بیان ہوگی۔

زمانۂ جاہلیت میں بڑے لوگوں پر قصاص معاف تھا، صرف معمولی رقم دے کر مقتول کے وارثوں کو خاموش کیا جاتا تھا۔ ایک طرف تو یہ تھا کہ نچلے طبقے کے آدمیوں کی جان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ دوسری طرف کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مقتول کے وارث بجائے اصلی قاتل کے اس کے کسی بے گناہ عزیز کو قتل کر ڈالتے تھے، اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ اپنے کم درجے کے مقتول کے عوض میں چن چن کر بڑے لوگوں کو، اور کبھی ایک مقتول کے عوض دسیوں، بیسیوں لوگ مارے جاتے تھے۔ لیکن اسلام دینِ الٰہی ہے، جو ایک عادلانہ، منصفانہ شریعت لے کر آیا تھا، اس نے ان تمام غلطیوں اور ناانصافیوں کی اصلاح کر دی، اور اس سلسلے میں تمام ظالمانہ اور بے رحمانہ رسم ورواج کو مٹا کر خلقِ خدا پر انوار وبرکات والا منصفانہ اقدار کا اجراء فرما کر پوری انسانیت کی راہنمائی فرمائی، اور قصاص کا مکمل قانون دنیا کے سامنے پیش کیا۔

چنانچہ اس آیت کا نزول بھی ایسے موقع پر ہوا، جبکہ دو قبیلوں میں باہمی نزاع تھا، اور مقتولین کا قبیلہ بڑے لوگوں کا تھا، وہ انتقام کے لئے یہ مطالبہ کرتا تھا کہ ہم اپنے غلام کے بدلے میں دوسرے قبیلے کے آزاد آدمی کو قتل کریں گے، اور لونڈی کے بدلے میں آزاد عورت کو قتل کریں گے، کیونکہ ہم مال اور قوت میں اونچے ہیں، بہر حال ان لوگوں نے اپنا فیصلہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا، اس پر ان آیتوں کا نزول ہوا، اور قانونِ قصاص کا اجرا ہوگیا، جس کی چند ضروری وضاحتی جزئیات یہ ہیں:

(١) مقتول کے ورثاء کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قاتل سے قصاص کا مطالبہ کریں۔

(٢) مقتول کے ورثاء اگر قاتل کو معاف کریں تو کر سکتے ہیں۔

(٣) مقتول کے ورثاء اگر قصاص کے بجائے دیت پر صلح کر لیں، تو انہیں اختیار حاصل ہے۔

(۴) مقتول کے ورثاء میں دیت کا مال اسی طرح تقسیم ہوگا جس طرح باقی ترکہ، یعنی اس کی بیوی کے لئے ربع اور ثمن میں سے ایک ضرور ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دیت، یعنی خون بہا لیا گیا، تو یہ مال ان وارثوں میں بحسابِ وراثت تقسیم ہوگا، یعنی میراث کے قواعد پر۔

(۵) مقتول کے ورثاء میں سے اگر کوئی اپنا حقِ قصاص معاف کرے گا، تو سب کا حقِ قصاص معاف ہوجائے گا، کیونکہ قتل میں تجزّی نہیں ہوتی۔ البتہ! دیت میں ان کا حق باقی رہے گا۔

(۶) اگر مقتول کے ورثاء قصاص یا دیت یا معافی پر فیصلہ کریں، تو حکومت ان کے فیصلے کو رد نہیں کرسکتی۔ البتہ! اگر مقتول کا کوئی وارث نہ ہو، پھر حکومت کو ہر قسم کے فیصلے کا اختیار ہوگا۔

(۷) شرعی دیت سو اونٹ، یا ایک ہزار دینار، یا دس ہزار درہم (ہمارے زمانہ کے حساب سے دس ہزار درہم ۳۶ سیر، ۳۶ تولہ ۸ ماشہ چاندی کے برابر ہے) مقرر ہے، زیادتی جائز نہیں ہے۔ البتہ! اگر ورثاء مقتول بجائے قصاص کے دیت پر صلح کرلیں، تو زیادتی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

(۸) آیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عورت کے قاتل مرد سے، یا غلام کے قاتل آزاد شخص سے، یا ایک شخص کے بہت سارے قاتلوں سے قصاص نہیں لیا جائے گا، کیونکہ دوسرے مقام پر تصریح ہے کہ ﴿اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ [المائدة:۴۵] (جان کے بدلے جان ہے)۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کمسن لڑکی کے قاتل یہودی مرد سے قصاص لیا۔ [بخاري] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہوگیا۔

(۹) قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاء مقتول کا ہے، مگر باجماعِ امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں، بلکہ یہ حق حاکم اور اس کے نائب کو ہے کہ وہ امن قائم کرنے، اور حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے یہ کام سرانجام دیں۔

(۱۰) اگر ماں باپ میں سے کوئی اپنی اولاد کو عمداً قتل کردے، یا مالک اپنے غلام یا لونڈی کو عمداً قتل کرے، تو قصاص سے مستثنیٰ رہیں گے، صرف دیت ہی کا فیصلہ ہوگا، احتراماً۔ واللہ اعلم

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ﴾ مقتول کا جو حقیقی بھائی ہے، وہ قاتل کا بھی دینی بھائی ہی ہے، اسی وجہ سے فرمایا کہ قاتل کو اس کے بھائی کی جانب سے کچھ معاف کردیا جائے، تو یہاں طالبِ قصاص کو بھائی فرمایا، یہ اس لئے کہ مسلمان گناہِ کبیرہ سے کافر نہیں ہوتا، اور اخوتِ اسلامی قتلِ عمد کے باوجود زائل نہیں ہوتی۔ کلمہ شَيْءٌ کا مطلب

یہ ہے کہ اگر ورثاء میں کسی کا حصہ بہت کم ہو، اور وہ معاف کردے، تو قاتل قصاص سے بچ جائے گا، اور دیت واجب ہوجائے گی۔

﴿فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ پس بصورت دیت، یعنی دیت کی صورت میں ہر دو فریق کو ہدایت کی جارہی ہے کہ عدل وانصاف اور رواداری کو ملحوظ رکھیں۔ مقتول کے ورثاء سختی اور درشتی یا بداخلاقی کا مظاہرہ نہ کریں، بلکہ نرمی سے طلب کریں، اور قاتل والا فریق ٹال مٹول اور خواہ مخواہ دیت کی ادائیگی میں حیلہ وحجت سے کام نہ لے۔ دونوں فریق احسان پر عمل کرکے کوئی الجھن پیدا نہ کریں۔

﴿ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾ یہ قصاص کے قانون میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے تخفیف بھی ہے، اور رحمت بھی۔ گزشتہ امتوں میں صرف قصاص اور عفو کا حکم تھا، جبکہ تمہارے لئے ایک تیسرا درجہ، یعنی قصاص کے بدلے میں دیت کی منظوری ہوگئی۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ پس جو شخص اس تخفیف اور رحمت کے بعد حد سے تجاوز کرے، پس اس کے لئے عذاب الیم ہے۔ مثلاً معافی یا دیت لینے کے بعد جب قاتل مطمئن ہوجائے، تو اس کو قتل کردے، یا قاتل دیت کا وعدہ کرکے فرار ہوجائے، تو ایسے شخص کے لئے دردناک عذاب ہے۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔ اگر تم قاتل سے قصاص نہیں لوگے، تو بہت سے بے گناہ جانوں کو خطرہ میں ڈالوگے۔ قصاص کی صورت میں مجال نہیں کہ آئندہ کوئی کسی کو قتل کرنے کی جرأت کرے۔ تمہارا معاشرہ امن کا گہوارہ بن جائے گا، اسی میں تمہارے لئے حیات اور زندگی ہے۔ آج بھی سعودیہ میں یہی حیات کی کیفیت ہے۔ پورے ملک میں سال بھر بمشکل چار پانچ قتل ہوتے ہیں، جبکہ ہمارے ملک میں سالانہ تین ہزار سے زائد قتل کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہر قسم کے امن وسلامتی کا پیغام ہے، جبکہ یورپ کے کالے قوانین میں انسانیت کی تذلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کاش! مسلمان غیروں کی تقلید کی بجائے اپنے دینِ الٰہی کا پاس رکھتے۔

بعض مفسرین نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ ایک جان لینے سے بہت سی جانیں محفوظ ہوجاتی ہیں، یعنی قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے، لیکن بہت سی جانیں محفوظ ہوجاتی ہیں، قاتل گناہ سے پاک ہوا، اور عذابِ دوزخ سے رہائی پائی (القصاص کفارة) اور ابدی حیات اس کو حاصل ہوئی، اور مقتول اگرچہ مارا گیا، لیکن

جب اس کا عوض و بدلہ لے لیا گیا، تو اس کا مرنا رایگاں نہیں گیا۔ وہ شہادت سے سرفراز ہو کر مرا، اس کے وارثوں کے لئے یہ باعثِ عزّت وشرف ہوا، اور قصاص لے لینے سے وارثوں کا دل ٹھنڈا ہوا، غم و پریشانی دور ہو کر انہیں اطمینان و سکون مل گیا۔ آئندہ کے لئے کشت وخون کا سلسلہ بند ہو گیا۔ پس یہ پورے معاشرے کے لئے باعثِ حیات بن گیا۔

فائدہ:

﴿فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کا بعض مفسرین حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مدّعی کو شرعی احکام کی پیروی اور اتباع لازم ہے۔ وہ کوئی غیر شرعی مطالبہ نہ کرے، مثلاً اگر وہ یہ کہے کہ میں قصاص سے اس شرط پر دست بردار ہوتا ہوں کہ قاتل مجھے اپنی بہن یا بیٹی دیدے، جیسے بعض جاہل اور بے دین قوموں میں اس کا رواج ہے، ایسا کرنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ آزاد عورت مال نہیں ہے، خون بہا میں عورت کی شرط چاروں اماموں کے مذہب میں حرام ہے، اور ایک بے گناہ عورت کی تذلیل ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان کی تذلیل اور خرید وفروخت سے سختی کے ساتھ منع فرمایا، اور اسے حرام قرار دیا۔ خوب سمجھ لیں

❁ ❁ ❁

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَا
اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ
جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨٢﴾ ع

ترجمہ: فرض کی گئی ہے تمہارے اوپر (وصیت) جس وقت کہ آئے تم میں سے کسی کے پاس موت، اگر اس نے مال چھوڑا ہے تو وصیت والدین کے حق میں، اور قرابتداروں کے حق میں دستور کے مطابق، یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر ﴿١٨٠﴾ پس جس شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اسے سننے کے بعد، بیشک اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اس کو تبدیل کرتے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿١٨١﴾ پس جس نے خوف محسوس کیا وصیت کرنے والے کی طرف مائل ہونے کا یا گناہ کا، پس اس نے ان کے درمیان صلح کرادی، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے ﴿١٨٢﴾

معارف ومنازل

أبواب البرّ میں سے حکمِ دوم وصیت ہے، آیت کریمہ میں اس کا بیان ہے۔ وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿يُوصِيكُمُ اللهُ فِيٓ اَوۡلَادِكُمۡ﴾ [النساء:۱۱] (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں)۔ ﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حُسۡنًا﴾ [العنکبوت:۸] (اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے اس کے ماں باپ کے ساتھ اچھے سلوک کا)۔ دونوں جگہ وصیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، مگر عرف میں وصیت اس چیز کو کہتے ہیں جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو، اور یہ انسانی عمل ہے۔

''الخیر'' کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَيۡرِ لَشَدِيۡدٌ﴾ [العادیات:۸] (اور بیشک وہ مال کی محبت میں بہت پکا ہے)۔ اس مقام پر باتفاقِ مفسرین خیر سے مراد مال ہی ہے۔

شروع اسلام میں جب تک میراث کے حصے کتاب وسنت میں مقرر نہیں ہوئے تھے، تو یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لئے جتنا مناسب سمجھے، وصیت کردے، اتنا تو ان لوگوں کا حق تھا، باقی جو کچھ رہتا، وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت کریمہ میں یہی حکم مذکور ہے۔

مگر آیتِ میراث کے نزول کے بعد اس آیت کریمہ کا حکم منسوخ ہوگیا، البتہ تلاوت باقی ہے۔

آیت مبارکہ میں مذکور حکم کے اجزاء:

اس آیت کریمہ میں مرنے والے پر جو وصیت کرنا فرض اور لازم کیا گیا ہے، اس حکم کے تین اجزاء ہیں:

(۱)...... ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حصے مقرر نہیں ہیں۔ ان کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔

(۲)...... دوسرا یہ کہ ایسے رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔

(۳)...... تیسرا یہ کہ ایک تہائی (ثلث) مال سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تو اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ کے نزدیک آیتِ میراث سے منسوخ ہوگیا۔ علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بتصحیح حاکم وغیرہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیت

میراث نے منسوخ کردیا، یعنی ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾ [النساء:۷] (مردوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیتِ میراث نے ان لوگوں کے حق میں وصیت کو منسوخ کردیا، جن کا میراث میں حصہ مقرر ہے، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ مقرر نہیں ہے، ان کے لئے حکمِ وصیت اب بھی باقی ہے۔ [قرطبي، جصاص]

لیکن باجماعِ امت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، ان کے لئے مرنے والے پر وصیت کرنا کوئی فرض ولازم نہیں، اس لئے فرضیتِ وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی۔ البتہ! وہ مستحب بشرطِ ضرورت رہ جائے گی۔ [قرطبي، جصاص]

دوسرا حکمِ وصیت کا فرض ہونا، یہ بھی باجماعِ امت منسوخ ہے، اور ناسخ اس کے لئے وہ حدیثِ متواتر ہے جس کا اعلان سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے فرمایا: "اِنَّ اللهَ اَعْطٰى لِكُلِّ ذِى حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ"۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ۔ اسی حدیث میں براویتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ الفاظ بھی منقول ہیں: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ تُجِيزَهُ الْوَرَثَةُ۔ [جصاص]

اس لئے حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وارث کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ ہاں! اگر دوسرے ورثہ راضی ہوں، اور اس وصیت کی اجازت دے دیں، تو جائز ہے۔

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے منقول ہے، اور فقہاءِ امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے یہ حدیث بحکمِ متواتر ہے، جس سے آیتِ قرآنی کا نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ بات علماءِ امت میں متفق علیہ ہے کہ جب کوئی حکم سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی یقینی طور پر معلوم ہوجائے، جیسے خبرِ متواتر ومشہور وغیرہ میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکمِ قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے، اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیتِ قرآنی کا منسوخ ہوجانا کوئی محلِ شبہ نہیں۔ پھر

فرمایا کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اس کا اعلان فرمانا، اور اس پر اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اجماعِ امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث ان حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے، ورنہ شک وشبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیتِ قرآنی کے حکم کو چھوڑ کر اس حدیث پر اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ تہائی سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں ہے، یہ باتفاقِ امت اب بھی باقی ہے۔ ہاں! وارثوں کی رضامندی اور اجازت سے ایک تہائی سے زائد کی، بلکہ پورے مال کی بھی وصیت جائز اور قابلِ قبول ہے۔ البتہ! مستحسن نہیں ہے، جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، جنہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کُل مال کی وصیت سے منع فرمایا تھا۔ [بخاري]

مسئلہ:

کسی شخص کے ذمہ اگر لوگوں کے حقوق ہوں، یا اس پر کسی کا قرض ہو، یا کسی کی امانت، یا عاریت کا مال وغیرہ ہو، تو ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے اس پر وصیت کرنا فرض ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جس شخص کے ذمہ حقوق ہوں (حقوق اللہ یا حقوق العباد) اس پر بغیر وصیت تین راتیں نہیں گزرنی چاہئیں، اس کو چاہئے کہ دستاویز کی شکل میں وصیت نامہ لکھ کر اپنے پاس رکھے، جس میں تمام حقوق کی تفصیل درج ہو، یا زبانی طور پر لوگوں کو بتائے، کوئی غفلت ولاپرواہی نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری نیکیاں دوسروں کے حقوق کی نذر ہوں۔ اللہ تعالیٰ ایسے خسارے سے ہمیں بچائے۔ آمین

مسئلہ:

اگر کوئی اپنی زندگی میں تبرّع کے طور پر کوئی وصیت کرے، یا لکھ دے، پھر کسی وجہ سے اُسے منسوخ کر کے ختم کرے، یا اس میں کوئی تبدیلی کر دے، تو سب کچھ جائز ہے، اور اسے اختیار حاصل ہے۔ واللہ اعلم

وصیت کے بارے میں ایک ضروری وضاحت:

وصیت ایک پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے، اکثر لوگ اس وصیت کے معاملہ میں ٹھوکریں کھا کر قصداً یا جذباتی طور پر، یا جہالت و بے علمی کی وجہ سے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ مسلمان مرنے سے پہلے اس سلسلے میں علماء کرام سے مسئلہ دریافت کریں۔ شرعی فتویٰ کی رُو سے وصیت کا مرحلہ انجام دیں۔ اندھا دھند، بغیر پوچھے کوئی

وصیت نہ کریں، کیونکہ وصیت کی بہت سی قسمیں ہیں، مثلاً کبھی وصیت شرعاً نا قابلِ قبول ہوتی ہے، جیسے عام طور پر لوگ نافرماں بیٹوں کے حق میں یہ وصیت کرتے ہیں کہ انہیں اپنی جائیداد سے محروم کرتے ہیں، جوکہ سراسر ظلم اور غلط ہے، اور کبیرہ گناہ ہے۔

وارث بننا ایک غیر اختیاری چیز ہے، اور ورثاء کے لئے جو حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے، اسے کوئی منسوخ نہیں کرسکتا، وہ فرمانبرداری ونافرمانی پر موقوف نہیں ہے۔ اولاد کی برائی کا صلہ کسی اور طریقے پر دیا جاسکتا ہے، مگر وراثت سے انہیں ہرگز محروم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا حق ہے، ایسی صورت میں جب بے انصافی اور میلان کا خطرہ ہو، جسے جَنَفًا سے تعبیر فرمایا کہ اگر کوئی شخص درمیان میں آکر فریقین میں مصالحت کرائے، تو موجبِ اجر وثواب ہوگا، اور مصالحت کنندہ پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اسی طرح وصیت کی تبدیلی اور اسے چھپا کر خیانت کا ارتکاب کرنا ہرگز جائز نہیں، بلکہ اسے کھول کر من وعن بیان کرنا، اگرچہ نقصان سے خالی نہ ہو، یہ عینِ تقویٰ ہے، اور مسلمانوں کے شایان شان بھی ہے۔

بسا اوقات وصیت جائز ہوتی ہے، بسا اوقات مستحب، اور بعض صورتوں میں فرض وواجب ہوتی ہے، جیسے کسی کے ذمہ قضائی نماز، روزے ہوں، یا اس کے ذمہ چند سالوں کی زکوٰۃ وفطرانہ، نذر وکفارہ وغیرہ ہوں، تو ایسی چیزوں کے بارے میں وصیت فرض ہوگی۔ بسا اوقات وصیت حرام اور ناجائز ہوتی ہے، جیسے کوئی نذر بغیر اللہ، یا کسی قبر پر، یا کسی مزار پر جانور ذبح کرنے کی وصیت کرے، یا مٹھائی تقسیم کرنے، یا چادر چڑھانے کی وصیت کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وصیت سے پہلے علماء کرام سے تفصیلات معلوم کرکے وصیت کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ ایک آدمی اگر کوئی گناہ کر بیٹھے، پھر زندگی میں توبہ کرکے پشیمان ہوجائے، تو تدارک ہوجائے گا، مگر مرنے والا اگر وصیت کرنے میں غلطی کرکے گناہ کا ارتکاب کرے گا، تو اس کے لئے توبہ اور تدارک ممکن نہیں ہوگا، لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔ واللہ ولي التوفيق

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ آدمی ستر سال نیک لوگوں جیسے عمل کرتا ہے، اور وصیت ظلم وبے انصافی سے کرتا ہے، اور ظلم پر خاتمہ ہونے کی وجہ سے جہنمی بن جاتا ہے۔ اور بعض لوگ ستر برس تک بداعمالیاں کرتے رہتے ہیں، لیکن وصیت میں عدل وانصاف کرتے ہیں، آخری عمل ان کا نیک ہوتا ہے، اور وہ جنتی بن جاتے ہیں، پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ﴾ [البقرة:

۲۲۹] (یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو)۔[ابن کثیر]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ﴿۱۸۳﴾ چند گنے ہوئے دن ہیں، پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو، پس دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنی ہے، اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں ایک مسکین کا طعام فدیہ ہے، پس جو شخص خوشی سے نیکی کرے گا وہ اس کے لئے بہتر ہے، اور اگر تم روزے رکھو، تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر سمجھ رکھتے ہو ﴿۱۸۴﴾

معارف ومنازل

ابواب البِرّ کے بنیادی اور اصولی رکن روزہ کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اُمت کے ایمانداروں کو مخاطب کر کے انہیں حکم دے رہا ہے کہ روزہ تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے، لہٰذا تم روزے رکھو۔ روزہ کے معنی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی بجا آوری کی خالص نیت کے ساتھ کھانے پینے اور جماع سے رک جانے کے ہیں۔ طلوعِ فجر سے غروبِ شمس تک، روزہ شریف کا فائدہ یہ ہے کہ روزہ کی بدولت نفسِ انسان پاک وصاف اور طیب وطاہر ہو جاتی ہے۔ آدمی شیطانی اور نفسانی برائیوں سے پاک ہو کر متقی بن جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس حکم کے ساتھ تم لوگ تنہا نہیں ہو، بلکہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی یہ حکم جاری اور نافذ رہا، لہٰذا تم اس میں تنہائی محسوس نہ کرو، جس طرح نماز، زکوٰۃ اور دوسری عبادتوں سے کوئی شریعت مستثنیٰ نہیں رہی، اسی طرح روزوں کی فرضیت بھی تمام شریعتوں میں عام اور یکساں رہی ہے، اور یہ ایک قسم کی تسلی اور حوصلہ افزائی ہے کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں۔ طبعی بات ہے کہ مشقت میں جب بہت سے لوگ مبتلا ہوں، تو وہ سہل ہو جاتی ہے، "اَلْبَلِيَّةُ اِذَا عَمَّتْ سَهُلَتْ"۔

﴿عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ میں عموم ہے، اور یہ عموم حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سید کائنات صلی اللہ

علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہے، اس لئے کہ انسان اور جنات کی تخلیق عبادت کے لئے ہے، پس یہ عبادت و بندگی اپنے عموم کے ساتھ ہر قرن، ہر زمانہ اور ہر امت کو مشتمل و محیط ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی امت میں یہ طاعات اور عبادات نہ ہوں؟ بلکہ حصہ بقدر جثہ ہی سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ گزشتہ امتوں کے لوگ عمر کے لحاظ سے اور بدنی ساخت کے اعتبار سے، نیز دل ودماغ وغیرہ کے لحاظ سے مضبوط و پختہ گزرے ہیں، انہیں اعمالِ شاقہ اور سخت مشقتوں کے ساتھ آزمایا گیا ہے۔ (یہود کے روزے چالیس روز کے، اور نصاریٰ کے پچاس روز مقرر ہوئے، جبکہ ہمارے ۲۹ اور تیس روز مقرر ہوئے) بخلاف ہماری اس آخری امت کے، کہ ہماری عمریں نہایت مختصر ہیں۔ بدنی جثہ و بدنی ساخت بھی کمزور، اور دماغ و قلب کے لحاظ سے ضعیف ہیں۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے شب معراج کے موقع پر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی کہا تھا کہ ربّ العزّت سبحانہ کے پاس جاکر تخفیف کا مطالبہ کریں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لوگ بدنی اعتبار سے بھی کمزور ہیں، اور دل ودماغ کے لحاظ سے بھی ضعیف ہیں، وہ پچاس نمازوں کو پابندی کے ساتھ ادا نہیں کرسکیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کی کمزوری دیکھی، تو احکام میں بھی آسانی فرمائی، تو اس امت کے احکام اور ان کی شریعت میں جتنی نرمی اور آسانی ہے، کسی بھی امت میں اتنی آسانی نہیں ہوئی ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ گزشتہ امتوں پر مالِ غنیمت حرام تھا، اللہ تعالیٰ نے ہماری کمزوری دیکھ کر ہمارے لئے مال غنیمت کو حلال فرمایا۔ [صحيح بخاري]

ماہِ رمضان کا روزہ ایک اعتبار سے صبر علیٰ الطاعات کی اعلیٰ مثال ہے، انسان تکمیل خواہشات کا بڑا عادی ہے۔ بچپن سے کھانے پینے پر جی رہا ہے، وہ کہاں برداشت کرسکتا ہے کہ اسے صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رکھا جائے؟ مگر چونکہ وہ ایک اعتبار سے عبادت گزار اور فرمانبردار بھی ہے، اور اسے مراتبِ صبر پر سے گزرنا بھی ہے، تو روزہ رکھنے اور صبر کرنے پر اسے آزمایا جارہا ہے، کیونکہ دین کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے، جس پر انہیں لٹایا جارہا ہو، بلکہ خاردار کانٹوں کی چارپائی ہے، جس پر لیٹ کر صبر کا پیمانہ ہاتھ میں لے کر تمام مرغوبات سے کنارہ کشی اختیار کرنی ہے، تب ہی انہیں ترغیب ہوتی ہے کہ تمہارے ہر عمل کا اجر وثواب دس گنا زیادہ عطا ہوگا، مگر روزہ صرف اور صرف میرے لئے ہے، لہٰذا اس کی جزاء میں ہی ہوں، اور میں اپنی شان کے مطابق روزہ داروں کو بے حساب اجر وثواب عطا کروں گا۔ [ترمذي]

حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، عطاء، قتادہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کا فرمان

ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے ہر مہینہ میں تین روزوں کا حکم تھا، پھر سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے اس کو بدل دیا گیا، اوران پر اس مبارک مہینہ ماہِ رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پچھلی امتوں پر بھی ایک کامل مہینہ کے روزے فرض تھے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ رمضان کے روزے تم سے پچھلی امتوں پر فرض تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ پچھلی امتوں کو یہ حکم تھا کہ جب وہ عشاء کی نماز ادا کرلیں اور سو جائیں، توان پر کھانا پینا عورتوں سے مباشرت کرنا، حرام ہوجاتا تھا۔

یہ بات واضح ہو کہ ہمارے روزوں کی تشبیہ گزشتہ اقوام کے روزوں کے ساتھ محض فرضیت میں ہے، کیفیت و کمیت اور مقدار میں نہیں ہے، کسی صحیح حدیث میں نہیں ہے۔ البتہ! کچھ تاریخی حوالوں سے پتہ چلا ہے کہ یہود کے روزوں کی گنتی (تعداد) چالیس، روزا اور نصاریٰ کے پچاس روز بتائے گئے ہیں۔ واللہ اعلم

﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا﴾ اگر تم میں سے کوئی شخص ماہِ رمضان میں بیمار ہو، یا سفر شرعی میں ہو، تو اس پر مشقت ہے نہیں ہے، اسے اختیار ہے، چاہے روزہ رکھے، چاہے افطار کرے، اور اقامت وتندرستی کے بعد جب عذر ختم ہو تو قضا کرلے۔ اسی طرح حاملہ عورت ومرضعہ (دودھ پلانے والی) اگر انہیں اپنی جان پر، یا بچے کے لئے خطرہ ونقصان کا اندیشہ ہو، تو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی، بعد میں مناسب وقت پر قضا کرلیں۔ قضاء میں تسلسل اور لگاتار رکھنے کی کوئی قید نہیں ہے، بلکہ صرف وہ تعداد اور گنتی پوری کرلے، اگر مسافر کا اسی سفر میں اور مریض کا اسی مرض میں انتقال ہوا، تو روزے معاف ہوجائیں گے۔

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ یعنی جو لوگ مریض ومسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں، یعنی روزہ رکھنے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا، یا شوق نہیں ہوتا، توان کے لئے بھی گنجائش ہے کہ بجائے روزہ رکھنے کے روزے کا فدیہ دے دیں۔ یہ ابتداء اسلام میں اختیاری امر تھا، جو منسوخ ہوگیا، اب کسی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ البتہ! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ شیخ فانی کے لئے ہے۔

اس جملہ ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ کی علماء کرام سے تین تفسیریں منقول ہیں: پہلی تفسیر یہ ہے کہ یہ حکم ابتداءِ اسلام میں تھا، جیسے ابھی گزرا، یعنی کوئی چاہے روزہ رکھے، چاہے فدیہ دے، دونوں باتوں میں اختیار ہے۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہوا، اور ﴿فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ یہ ناسخ ہے۔ [روح المعاني، مظهري، ابن كثير، معارف]

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہاں "لا" محذوف ہے، یعنی ﴿لَا يُطِيْقُوْنَهٗ﴾۔ [مظهري، معالم]

تیسری تفسیر یہ ہے کہ یہاں بابِ افعال کا ہمزہ سلب کے لئے ہے، لا مقدر نہیں، مطلب وہی ہوگا۔ [روح]

بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمۂ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ نازل ہوئی تو ہمیں اختیار دے دیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزہ رکھے، جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة:١٨٥] (تم میں جو بھی یہ مہینہ پائے تو اس میں روزے رکھے) نازل ہوئی، تو یہ اختیار ختم ہوکر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہوگیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتداء اسلام میں تغیرات ہوئے۔ (ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے تینوں کی تفصیل لکھی ہے) اور روزے کے معاملے میں بھی تین تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں:

(١) کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے، تو ہر مہینے میں تین روزے، اور ایک روزہ یوم عاشورا (دسویں محرم) کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہوگئی، جیسے کہ فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾۔

(٢) تو یہ حکم تھا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ روزہ رکھے یا فدیہ دے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے۔ پھر دوسری آیت: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة:١٨٥] (تم میں جو بھی یہ مہینہ پائے تو اس میں روزے رکھے) کے نزول کے بعد تندرست طاقتور لوگوں پر روزہ رکھنا فرض ہوا، اور کمزور ناتوانوں کیلئے وہ فدیہ والا حکم باقی رہا۔

(٣) تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سوگیا، تو دوسرا روزہ شروع ہوگیا، کھانا پینا وغیرہ سب پر پابندی عائد ہوگئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ضعف وناتوانی پر رحم فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ [البقرة:١٨٧] (تمہارے لئے حلال کردیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں اپنی بیویوں سے جماع کرلو)۔ ربّ العزت سبحانہ نے اگلے دن صبح صادق تک کھانے پینے (سحری) وغیرہ کی رخصت دے کر بڑا اکرم فرمایا، جس کی بدولت بہت سے مسائل حل ہوئے، اور روزہ رکھنا بڑا آسان ہوگیا، اور اس سحری کو سراسر

برکت قرار دیدیا گیا۔ [متفق علیه]

فدیہ کی مقدار، اور متعلقہ مسائل:

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم، یا اس کی قیمت ہے۔ نصف صاع مروجہ سیر اسی (۸۰) تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دوسیر ہوتے ہیں۔ بازار سے قیمت معلوم کر کے مستحق غریب کو تملیک کر کے دے دیں، اسی طرح تمام روزوں کا حساب لگائیں۔ البتہ! مدرسہ و مسجد میں کسی خدمت کے عوض نہ ہو، اگر کسی کو فدیہ دینے کی استطاعت نہ ہو، تو صرف استغفار کر کے یہ نیت کرے کہ جب بھی وسعت و استطاعت ہوگی سب سے پہلے فدیہ ادا کروں گا۔ [بیان القرآن]

مسئلہ:

ایک روزہ کے فدیہ کو متعدد لوگوں میں تقسیم کرنا، یا چند روزوں کا فدیہ ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں ہے، جیسا کہ شامی نے بحوالۂ بحر از قنیہ نقل کیا ہے۔ اور بیان القرآن میں اسی کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے۔ البتہ امداد الفتاویٰ میں ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ کئی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک شخص کو نہ دے، لیکن دینے میں گنجائش بھی ہے، [معارف القرآن]

❁ ❁ ❁

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۱۸۵

ترجمہ: رمضان کا مہینہ وہ ہے جس کے اندر قرآن نازل کیا گیا ہے، وہ قرآن جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے، اور ہدایت کی واضح اور روشن دلیلیں ہیں، اور فیصلہ کرنے والی بات ہے، پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں حاضر ہو جائے، پس اس کو اس کا روزہ رکھنا چاہئے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو پس دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنی ہے،

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے، اور تمہارے ساتھ دشواری کا ارادہ نہیں کرتا، اور تا کہ تم گنتی پوری کرو، اور تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو، جیسا کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے، اور تا کہ تم شکر گزار بن جاؤ۱۸۵

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں پچھلی مجمل آیت کریمہ کا بیان بھی ہے، اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت اور اس میں نازل شدہ قرآن حکیم کی فضیلت، اور عالمگیر فوائد وہدایات کا بیان بھی ہے۔ پچھلی آیت میں مَعۡدُوۡدٰت چند گنتی کے ایام مجمل بیان ہوئے۔ شہر رمضان کے الفاظ نے اس کی تفصیل بتادی کہ وہ پورے رمضان کے ۲۹ یا ۳۰ ایام ہیں۔

فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اس مہینہ کو وحی اور آسمانی کتابوں کے نزول کیلئے منتخب فرمایا۔ سورۃ القدر میں بھی اسی کی تصریح ہے کہ قرآن حکیم کا نزول رمضان شریف میں ہوا ہے۔ حضرت واثلۃ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ کو نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان میں، اور قرآن کریم چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ [مسند أحمد]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی۔ [ابن کثیر]

حدیث مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے، اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری حضرات انبیاء علیہم السلام پر نازل کر دی گئی ہیں، اور قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے بیت العزت میں اتارا گیا، جو کہ پہلے آسمان پر واقع ہے، پھر وہاں سے ۲۳ سال کے عرصہ میں وقفہ وقفہ کے ساتھ حسب ضرورت حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارا گیا۔ حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے دو نعمتیں سب سے بڑی ہیں: ایک سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مسعود۔ دوم قرآن حکیم۔ کتابیں دنیا میں لاکھوں ہیں، مگر قرآن حکیم کوئی اور چیز ہے۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن کریم نازل ہوا، قرآن کریم کی اپنی تصریح کے مطابق لیلۃ القدر والی رات تھی، فرمایا: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ [القدر: ۱] (ہم نے قرآن کو اتارا ہے لیلۃ القدر کو)۔ مذکور الصدر حدیث میں اس کو چوبیس رمضان کی شب بتلایا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چوبیسویں رمضان کی رات شب قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث قرآنی آیت کے مطابق ہو جاتی ہے، اگر یہ مطابقت تسلیم نہ ہو، تو پھر وہی

قول معتبر مانا جائے گا، جس میں تصریح ہے کہ شبِ قدر پورے رمضان میں دائر رہتی ہے، کبھی ۲۱ کبھی ۲۲ علیٰ ہٰذا القیاس پوری تفصیل سورۃ القدر کے فوائد میں دیکھیں۔

بہر حال! رمضان المبارک کو قرآن حکیم کے ساتھ بطور یادگار خصوصی تعلق ہے، اسی وجہ سے حکم ہے کہ اس مہینہ میں زیادہ سے زیادہ قرآن حکیم کی تلاوت کا اہتمام کیا جائے، اور نمازِ تراویح میں حتی المقدور ختم قرآن کا التزام اور انتظام کیا جائے۔ علماء سلف کا یہ عام معمول رہا کہ رمضان المبارک میں اکسٹھ (۶۱) مرتبہ ختم قرآن کا التزام ہو۔ ہر رات کو ایک ختم، اور دن کو بھی ایک ختم۔ یہ کل ساٹھ ختم ہوئے، اور ایک ختم پورے رمضان میں صلوٰۃ التراویح کے اندر، پس یہ اکسٹھ ختمِ قرآن ہوئے۔

علماء امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن حکیم کے علاوہ باقی جو بھی کلام، یا اَوراد اور وظائف ہیں، انہیں بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا، مگر صرف کلام اللہ ہی ایک ایسا کلام ہے جسے سمجھ کر یا بے سمجھے ہر طرح پڑھنے سے فائدہ ہی فائدہ اور ثواب ہی ثواب ہے۔ ہر حرف کے عوض دس نیکیوں کا وعدہ ہے، اس لئے ارشاد ہوا:

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یہ لوگوں کے لئے سراسر سامانِ ہدایت ہے، بلکہ مزید برآں ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ کہ اس میں ہدایت کے واضح دلائل (انفسی اور آفاقی) موجود ہیں، اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن باتیں بھی ہیں۔ یہ قرآن پاک کسی بات کو ادھورا مہمل نہیں چھوڑتا، بلکہ حق و باطل کے درمیان لکیر کھینچ کر خوب امتیاز کرتا ہے کہ یہ حق ہے، اور یہ باطل ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ [الأنفال: ۴۲] (تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے، وہ واضح دلائل و ہدایات کے بعد ہلاک ہو) ﴿وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ (اور جو زندہ رہنا چاہتا ہے، وہ واضح ہدایات کے بعد ان کی روشنی میں زندہ ہو)۔

مطلب یہ کہ کسی بھی انسان کے لئے عذر و بہانہ باقی نہ رہے، کہ اسے حق و باطل کی پہچان نہ ہو سکی، گویا قرآن پاک ہدایت بھی ہے، اور فرقان بھی ہے، اس لئے حکم ہوا کہ رمضان کی تراویح میں اسے ختم کریں، اور تمام مسلمانان ملّت کو اس کی برکات سے استفادہ کا اہتمام کرنا چاہئے، اور پورے رمضان میں ہر مسلمان کے کان سے کم از کم ایک دفعہ قرآن پاک گزر جائے، یہ کتنی بڑی سعادت ہوگی؟

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں۔ لفظ شَهِدَ شہود سے مشتق ہے، جس کے معنی حضور، یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں،

اور الشھر کے معنی مہینہ کے ہیں۔دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ۱۹۴] (حرمت کا مہینہ حرمت کے مہینے کے عوض)۔اسی طرح ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا﴾ [التوبة:۳۶] (بیشک مہینوں کی گنتی اللہ کے ہاں بارہ مہینے ہے)۔ماہِ رمضان سال بھر کے بارہ مہینوں کا سردار ہے،تو اس جملے کے معنی یہ ہوگئے کہ تم میں سے جو شخص ماہِ رمضان میں حاضر،یعنی موجود ہو،اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔روزے کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے،اس جملے نے منسوخ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم قرار دیا ہے،جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

ماہِ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ماہِ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی شرعی صلاحیت موجود ہو،یعنی مسلمان،عاقل،بالغ،مقیم اور حیض ونفاس سے پاک ہو۔

اس لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گزر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں، جیسے کافر،نابالغ،مجنون،تو یہ لوگ اس حکمِ شرعی کے مخاطب ہی نہیں،اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے،اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہے،مگر کسی عذر کی وجہ سے مجبور ہوگئے،جیسے حیض ونفاس والی عورت،یا مریض اور مسافر،تو انہوں نے ایک حیثیت سے ماہِ رمضان کو بحیثیتِ صلاحیت پالیا،اس لئے آیت کا حکم ان کے حق میں ثابت ہوگیا،مگر وقتی عذر کے سبب اس وقت ان پر روزہ معاف ہے۔البتہ! زوالِ عذر کے بعد ان پر قضا لازم ہے،اس کی تفصیل عنقریب آنے والی ہے۔

مسئلہ:

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہِ رمضان کا بحالتِ صلاحیت پالینا شرط ہے،اس لئے جس نے پورا رمضان پالیا،اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہوگئے،اور جس نے کچھ کم پایا،اس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہوئے،جتنے دن رمضان کے پائے،اس لئے وسطِ رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا،یا نابالغ بالغ ہوا،اس پر صرف آئندہ کے روزے لازم ہوں گے،گذشتہ ایام کی قضا لازم نہیں ہوگی۔ البتہ! مجنون اگر ہوش میں آئے تو صلاحیت (اسلام وبلوغ) کی وجہ سے گزشتہ ایام کی قضاء بھی اس پر لازم ہوجائے گی،یہی حکم حائضہ کا بھی ہے،اور مسافر کی اقامت و مریض کی تندرستی کا بھی کہ گزشتہ ایام کی قضاء اور آئندہ کی اداء دونوں ضروری لازمی ہوجائیں گی۔

مسئلہ:

جن ملکوں میں رات دن طویل کئی مہینوں کے ہوتے ہیں، مثلاً ایک رات چھ ماہ کی ہوتی ہے، اور چھ ماہ کا ایک ہی دن ہوتا ہے، پورا سال ایک رات ایک دن کا ہوتا ہے۔ یہ قطب شمالی کے آخری حصے میں ہوتا ہے۔ وہاں ﴿شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ کا وجود ہی نہیں، تو بظاہر ماہِ رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، تو اس کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ان لوگوں پر روزے فرض نہ ہوں۔ اسی طرح پنج گانہ نمازیں بھی، کیونکہ وہاں نہ ظہر ہے، نہ عصر اور نہ مغرب وعشاء اور فجر۔ فقہاءِ حنفیہ میں سے امام حلوانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام قبالی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار (حساب) سے نمازوں کا حکم عائد ہوگا، وہ اندازہ لگا کر نمازیں ادا کریں، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہوجاتی ہے، وہاں نمازِ عشاء فرض ہی نہیں، وقت نہ ہونے کی وجہ سے۔ [شامي]

اس کا مقتضی یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا ایک دن ہے، وہاں چھ مہینے میں صرف ایک دن کی پانچ نمازیں ہوں گی، اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہیں ہوں گے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔ [معارف القرآن]

﴿وَمَن كَانَ مَرِيضًا﴾ [الآیة] اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ بحالتِ مرض اور سفر روزہ نہ رکھیں۔ تندرستی اور اقامت کے بعد قضاء کرلیں۔

یہ حکم پہلے بھی بیان ہوا، مگر دوبارہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ حکم محکم اور ابدی ہے، فدیہ کی طرح منسوخ نہیں ہے۔ ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ﴾ اللہ تعالیٰ از راہِ کرم وعنایت تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے، کیونکہ تمام دینی امور اور احکام میں آسانی اور سہولتوں کا سلسلہ جاری ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ کسی قسم کی دشواری کا ارادہ نہیں کرتا۔ پس آپ لوگ گنتی پوری کرلو، اور فوت شدہ روزوں کی قضاء کرلو، جو سہولتیں تمہیں حاصل ہوئیں، ان پر شکر بجالاؤ، اور خوب اللہ تعالیٰ کی بزرگی و برتری بیان کرو۔ اختتامِ رمضان پر تکبیرات پڑھ لو۔ عجز و بندگی کے آداب پورے کرو، یہی تقویٰ ہے، جو موجبِ شکر و سپاس ہے۔ الحمد للہ رب العلمین

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

ترجمہ: اور جب میرے بندے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے میرے بارے میں پوچھتے ہیں، پس میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے، پس چاہئے کہ یہ لوگ میرا حکم مانیں، اور چاہئے کہ یہ مجھ پر یقین رکھیں، تاکہ یہ صحیح راہ پا جائیں ﴿١٨٦﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی تکبیر اور ثناء کا بیان تھا، اس آیت میں دعا کا بیان ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قربِ الٰہی کی روحِ رواں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور دعا ہے، نیز یہ بات بھی ظاہر وواضح ہے کہ جس طرح رمضان کا قرآن کے ساتھ خصوصی تعلق ہے، اسی طرح دعا بھی ماہِ رمضان کا ثمرہ ونتیجہ ہے، اور ماہِ رمضان درحقیقت قبولیتِ دعا کا مہینہ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ روزہ دار کی دعا خاص کر بوقتِ افطار غیر روزہ دار کی دعا سے زیادہ قبول ہوجاتی ہے۔ یہ بات بہت سی حدیثوں میں مذکور ہے، اس لئے روزے کے ساتھ دعا کا ذکر فرما کر اس کی ترغیب اور اس کی اجابت کا وعدہ کیا گیا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرَةٍ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ۔ [أبو داؤد طيالسي بروايۃ عبداللہ بن عمر، ابن کثیر] اسی روایت پر عمل کرتے ہوئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعا کیا کرتے تھے۔

بعض حضرات نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ہم اللہ تعالیٰ کو کیسے پکاریں؟ أَقَرِيبٌ فَنُنَاجِيهِ أَمْ بَعِيدٌ فَنُنَادِيهِ؟ کیا وہ ہم سے قریب ہے یا بعید؟ اگر قریب ہے تو اس کے ساتھ سرگوشی سے مناجات کریں، اور اگر وہ دور ہے، تو زور سے پکاریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ﴾ جب میرے بندے میرے بارے میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کریں، تو میں ان کے بالکل قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہوں، جب وہ دعا کرتا ہے، اور مجھے پکارتا ہے۔

دعا ایک عظیم روحانی عمل ہے، جب اسے ماہِ رمضان کے انوار وبرکات اور روحانی اعمال کے ساتھ وابستگی حاصل ہو، تو سونے پر سہاگہ کے بمصداق تمام فضاؤں کو چیرتے ہوئے عرشِ معلیٰ کے کنگروں تک اس کی رسائی ہوتی

ہے، اور قریب و نزدیک کے مدارج کو طے کرتے ہوئے حضور کے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ رمضان شریف میں جہاں فرائض کا مقام ستر گنا بڑھ جاتا ہے، اور نوافل فرائض کے مقام تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اور عام اعمال کی قدر و قیمت اور شرف و منزلت بڑھ جاتی ہے۔

ترمذی شریف میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، فرماتے ہیں: تَسْبِيحَةٌ فِیْ رَمَضَانَ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ تَسْبِيحَةٍ فِيْمَا سِوَاهُ۔ رمضان المبارک میں اخلاص کے ساتھ ادا کی گئی ایک تسبیح غیر رمضان کی ایک ہزار تسبیح سے بڑھ جاتی ہے۔ گویا کہ یہ مہینہ تکمیلِ روحانیت کے لئے موسم بہار کا درجہ رکھتا ہے۔ جنت کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں، اور جہنم کے سارے ابواب بند ہو جاتے ہیں۔ شیاطین سمندروں اور دریاؤں میں زنجیروں سے باندھے جاتے ہیں، تو اجابتِ دعا میں کسی قسم کی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ ان شاء اللہ! بڑی عجلت میں دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔

البتہ! دعا کی قبولیت کے ضمن میں دو باتیں نہایت اہم ہیں: ایک یہ کہ اَکلِ حلال، اور صدقِ مقال کے زیور کا طوق گلے میں ہو، کیونکہ ایک حرام لقمہ کھانے سے آدمی چالیس سال پیچھے چلا جاتا ہے، اور چالیس روز تک کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ دعا کرتے وقت محض کلمات دعا کی تک بندی اور تلفظ نہ ہو، بلکہ پوری توجہ اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ ہو۔ اگر یہ دونوں شرائط موجود ہوں، تو قبولیت یقینی ہے، کیونکہ ربّ العزّت سننے اور جاننے کے ساتھ کریم بھی ہے، اور حیادار بھی۔ حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ مجھے اپنے بندے کے ہاتھ خالی لوٹانے سے حیاء آتی ہے، خاص کر وہ لوگ جن کے بال سفید ہوں۔

دعا کی قبولیت کو زمان و مکان کے ساتھ بھی بڑا تعلق ہے، اسی کے ساتھ اس میں ادعیہ مأثورہ کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ ذاکرین اور دعا و استغفار کرنے والے بندوں کو پسند فرماتے ہیں، اور انہیں اپنے قرب تک رسائی نصیب کرتے ہیں۔

﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ پس چاہئے کہ وہ (دعا مانگنے والے) میرے حکم کی تعمیل کریں، اور چاہئے کہ وہ مجھ پر یقین رکھیں، یعنی مجھ پر ایمان کامل رکھیں، تاکہ وہ صحیح راہ پائیں، اور اہل بن جائیں، کیونکہ نااہل بندہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کی شنوائی ہو، اور اس کی دعا کو شرفِ قبولیت حاصل ہو، کیونکہ الدعا هو العبادة۔ الدعا مخ العبادة۔ پس تو اس کے لئے وہی شرائط ہیں، جو حقیقی عبادت کے لئے ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں ''فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

قربِ خداوندی کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً خدا تعالیٰ باعتبارِ ذات قریب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات میں کوئی ایک ذرّہ بھی ایسا نہیں جس کا قیام اور بقاء خدا تعالیٰ کے وجود کے بغیر حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ کی صفت قیومیت کی وجہ سے ہر چیز کو وجود حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ وجود اور ذات کے اعتبار سے قریب ہے۔

قربِ خداوندی اور اس کے اسباب ومنافی خطرات کا بیان:

علم اور قدرت کے لحاظ سے بھی خدا تعالیٰ قریب ہے، کیونکہ اس کے علم، ارادے اور تاثیر کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ محبت اور حمایت وحفاظت کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ اسی طرح تجلی، انوار وبرکات کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے، تو اُدھر سے اس کے قلب ودماغ پر تجلی پڑتی ہے، اور سرور وانبساط حاصل ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا شرح صدر حاصل ہوجاتا ہے کہ تمام ملک وملکوت کا نظام اور نظارہ سامنے ہوجاتا ہے۔ یہ مرتبہ اُخص الخواص کا ہوتا ہے۔ اسی طرح عبدیت کے رابطہ کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ قریب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو براہِ راست بارگاہِ خداوندی سے قرب حاصل ہے۔ دوسروں کو ان کی وساطت اور وسیلہ سے ہوتا ہے۔

اگر ہم ذرا غور کریں! تو مطلب بآسانی معلوم ہوگا کہ ایک شخص کا رابطہ اپنے والدین کے ساتھ بھی ہے، اور اپنے بچوں اور بھائی بہنوں کے ساتھ بھی ہے۔ تیسرے درجے میں اپنے ملازم اور خدمتگاروں کے ساتھ بھی ہے۔ چوتھے درجے میں پڑوس ہمسایہ اور شہر والوں کے ساتھ بھی ہے۔ یہ سارے مراتب ودرجات قرب کے ہیں، مگر ہر ایک کا مقام الگ ہے۔ اسی طرح قربِ تکوینی ایزدی تمام مخلوقات کو حاصل ہے، اور یہی قرب ان کی حیات وبقاء اور ہر قسم کے نشوونما کا ذریعہ ہے، مگر مراتبِ قرب میں آسمانوں زمینوں کا فرق ہے۔

پس جس طرح قرب کے حصول کے درجات مختلف ہیں، تو اسی طرح قرب کے زوال اور اس کی ضد جو کہ بُعد ودوری ہے، اس کے بھی مختلف درجات ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ درجاتِ قرب کے سارے اسبابِ طاعات، عبادات، ایمانیات اور حسنِ معاملات اور اتباعِ حق کے ثمرات ہیں، اور درجاتِ بعد کے اسبابِ معصیات، خطیآت، قبحِ اعمال اور عدمِ اتباعِ حق کے مذموم وقبیح ثمرات ہیں۔ خوب سمجھو!

☆ ☆ ☆

دعا کی قبولیت، اوراس کی شرائط:

جس طرح روزمرہ چیزوں کے لئے شرائط وآداب مقرر ہوتے ہیں، اسی طرح دعا جو عبادتوں کا مغز وخلاصہ ہے، اور انبیاء کرام علیہم السلام وعباداللہ الصالحین کا پسندیدہ وبرگزیدہ روحانی عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے ربّ العزّت کے ساتھ جو رشتہ جوڑا ہے، وہ اِطاعت وفرمانبرداری، اور کثرتِ دعوات کی بدولت ہے، جیسے شیرخوار بچہ کو جب بھی بھوک لگتی ہے، تو رو رو کر مہربان والدہ کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، اور مہربان والدہ اس کی خبرگیری کے ساتھ اس کی مدد کرتی ہے۔ اس اثناء میں اگر ماں اسے دور پھینک کر کچھ بے اعتنائی کرتی ہے، تو وہ بچہ چمٹ کر اس کی گود میں آ گرتا ہے۔ یہی سلسلہ نیک بندوں کا اپنے ربّ عزّوجل کے ساتھ شب وروز جاری رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب دعا کا ترانہ اپنے بندوں کو بخشا، اور ازراہِ شفقت وکرم دعاؤں کی قبولیت کا وعدہ فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ﴾[الغافر:۶۰] (تمہارے ربّ نے کہا کہ مجھے بلاؤ، میں تمہیں جواب دوں گا)۔ نیک بندوں کی دعاؤں کی اجابت بجائے خود!! اپنے دشمن عزازیل کی درخواست کو بھی اپنے کرم سے شرفِ قبولیت عطا فرما کر کہا: ﴿قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ﴾[ص:۸۰] (اے ابلیس! تیری درخواست منظور ہے، جاؤ! قیامت تک کی مہلت تمہیں حاصل ہے)۔

پس نیک بندوں کی دعاؤں کی اجابت وقبولیت میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ البتہ! دعاؤں کی قبولیت کے لئے جو شرائط وآداب مقرر ہیں، انہیں پورا کرنا اور بجالانا نہایت اہم اور ضروری ہے، کیونکہ دعا میں کبھی داعی کے اعمال وحسنات اور تقویٰ کا پہلو سببِ اجابت ہوتا ہے، اگر یہی دعا کسی برے، بے عمل، فاسق اور جابر کے لئے ہو، تو اجابت نہیں ہوتی، کیونکہ مدعولہٗ، یعنی جس کے لئے دعا مانگی گئی، وہ اس دعا کا حقدار وسزاوار نہیں ہے۔

کبھی داعی ومدعولہٗ دونوں نیک، متقی اور حقدار ہوتے ہیں، مگر جس چیز کا مطالبہ ہو رہا ہے، وہ ان کی شان اور استحقاق کا نہیں، کہ انسان جو مانگے اسے وہ چیز فوراً مل جائے، بلکہ کسی چیز کا حاصل ہونا، تو حکمتِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے، اور بعض اوقات انسانی ذہن بچوں والی حرکات کر بیٹھتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز طلب کرتا ہے، جو اس کی حکمت کے مطابق انسان کے لئے بہتر نہیں ہوتی، اور اس میں سراسر نقصان ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ ازراہِ کرم وہ چیز عطا نہیں کرتا، اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ میری دعا کی اجابت نہیں ہوئی، حالانکہ اس چیز کا نہ ملنا اللہ تعالیٰ کی حکمت ومصلحت کے تحت، اور ﴿ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّھُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ﴾[البقرة:۲۱۶] (ممکن ہے کہ کس چیز کو تم برا

سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو) کے بمصداق اس کی خیرخواہی اور فائدہ میں ہوتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بچہ اصرار کرے کہ آگ کا انگارہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے، مگر کون عقلمند ہوگا جو بچے کی یہ خواہش پوری کرے گا؟ اسی طرح ربّ العزّت ہماری دعائیں ضرور قبول کرتا ہے، مگر اپنی حکمت ومصلحت کے مطابق۔

دعا کی تین صورتیں:

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ أرواحنا) نے قبولیتِ دعا کی تین صورتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) جب دعا مصلحتِ خداوندی کے مطابق ہو، تو وہ فوراً قبول کرلی جاتی ہے، اور مطلوبہ چیز مل جاتی ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ مطلوبہ شئ تو بندہ کو نہیں ملتی، مگر اس دعا کی برکت سے بندہ پر نازل ہونے والی کوئی مصیبت ٹال دی جاتی ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ أرواحنا) نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ کی دعا نکلتی ہے، تو وہ آنے والی مصیبت کے ساتھ ٹکراتی ہے، اور اسے نیچے نہیں آنے دیتی ہے، حتی کہ صورِ اسرافیل پھونکا جائے۔

(۳) تیسری صورت قبولیت کی یہ ہے کہ اسے دعا کرنے والے کے لئے ذخیرہ آخرت بنا کر محفوظ کیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن دعا گو کو جب پتہ چلے گا کہ دعاؤں کے کتنے ذخیرے اس کے لئے موجود ہیں؟ اس دن وہ خواہش کرے گا کہ کاش دنیا میں اس کی کوئی دعا ہی قبول نہ ہوتی، اور وہ سب کی سب اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہی بن جاتی۔ حدیث میں آتا ہے جو شخص مجھ کو عیش وآرام میں پکارتا ہے میں مصیبت کے وقت اس کی دعا کو قبول کرلیتا ہوں، اور جو بندہ عیش وآرام میں مجھ سے دور رہتا ہے، تو میں مصیبت کے وقت اس کی دعا قبول کرنے میں تاخیر کرتا ہوں۔ [مشکوۃ]

قبولیتِ دعا کی مختصراً چند شرائط یہ ہیں:

(۱)...... دعا کرنے والا حلال کھانے والا ہو۔ (۲)...... دعا کسی قطعِ رحمی اور گناہ کے لئے نہ ہو۔ (۳)...... دعا کسی وقتی جذبہ کے تحت نہ ہو۔ (۴)...... دعا کسی بے گناہ اور نیک انسان کے خلاف نہ ہو۔ (۵)...... دعا میں عجلت اور تیزی نہ ہو۔ (۶)...... دعا سے پہلے استغفار وتوبہ ہو۔ (۷)...... دعا کے شروع میں حمد وثناء ہو۔ (۸)...... دعا کے اول وآخر میں درود کا التزام ہو۔ (۹)...... اوقات وساعاتِ اجابت میں دعا ہو۔ (۱۰)...... دعا مانگنے کی جگہ پاک وصاف ہو۔ (۱۱)...... دعا میں دعواتِ ماثورہ کی رعایت ہو۔ (۱۲)...... دعا خفی ہو، اور تصنع سے پرہیز ہو۔ (۱۳)...... دعا میں خشوع وخضوع اور حضورِ قلبی ہو۔ (۱۴)...... قبولیتِ دعا کا پختہ یقین ہو۔ (۱۵)...... دعا سے پہلے مالی صدقہ ہو، یا دو

رکعت نمازِ حاجت پڑھنا۔ (۱۶)...... دعا سنت کے مطابق ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ہو۔ (۱۷)...... دعا میں آسمان کی طرف نگاہ نہ ہو۔ (۱۸)...... دعا میں بدن، لباس، مکان سب کی طہارت ہو۔ (۱۹)...... دعا میں استقبالِ کعبہ شریف ہو۔ (۲۰)...... کلماتِ دعا کا بار بار تکرار ہو۔ (۲۱)...... دعا میں وقفہ وقفہ کے ساتھ آمین کہنے کا التزام ہو۔ (۲۲)...... دعا میں کسی غیر ممکن چیز کی طلب نہ ہو۔ (۲۳)...... دعا میں اسماء حسنیٰ اور انبیاء علیہم السلام و صالحین، نیز دیگر اعمالِ خیر کا توسل ہو۔ (۲۴)...... دعا میں رونے کی شکل وصورت اختیار کرنے کا التزام ہو۔

❁ ❁ ❁

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ
عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ
وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي
الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷

ترجمہ: حلال قرار دیا گیا ہے تمہارے لئے روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنا، وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں، اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو، اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر رجوع فرمایا ہے مہربانی کے ساتھ، اور تم کو معاف کر دیا ہے، پس اب عورتوں سے مباشرت کرو، اور تلاش کرو وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے، اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید دھاگا، سیاہ دھاگے سے فجر سے، پھر پورا کرو روزہ کو رات تک، اور نہ ملو عورتوں سے اس حال میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھنے والے ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدیں ہیں، پس ان کے قریب نہ جاؤ، اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ متقی بن جائیں ۝۱۸۷

معارف ومنازل

☆...... ابواب البرّ کا چوتھا حکم ﴿اُحِلَّ لَكُمْ﴾ سے بیان کیا جا رہا ہے، یعنی رمضان شریف کی راتوں میں مباشرت وغیرہ کی اجازت ہے، اور سابقہ پابندی منسوخ وموقوف ہے۔ اس کے ساتھ ﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ

عٰكِفُوْنَ ﴾ سے ابواب البِرّ کا پانچواں حکم اعتکاف اوراس کے مسائل کا بیان ہے۔

ابتداء اسلام میں، یعنی ۲ سنہ جب ماہِ رمضان کا روزہ فرض ہوا، مغرب کے بعد سونے سے پہلے کھانے پینے اور عورتوں سے مباشرت کی اجازت تھی، لیکن عشاء اور سو جانے کے بعد دوسرا روزہ شروع ہو جاتا تھا، اور کھانے پینے، مباشرت وغیرہ پر بندش ہو جاتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک روز عشاء کے بعد گھر گئے، اور مباشرت میں مشغول ہو گئے۔ صبح سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنے اس فعل پر ندامت اور معذرت کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معذرت کے ساتھ دیگر بعض حضرات نے بھی معذرت شروع کی، اور اپنی بے صبری کا اظہا کیا۔

دوسری بات یہ پیش آئی کہ ایک شخص (قیس بن صرمہ انصاری رضی اللہ عنہ) دن بھر روزے سے رہے، تھکے ہوئے شام کو جب گھر آئے، گھر میں کھانا نہیں تھا، اس کی بیوی نے ہمسایہ کے گھر سے کچھ لے کر آئی، تو وہ سو گئے تھے، جب آنکھ کھلی، تو ممانعت کی وجہ سے نہ کھا سکے، اس طرح روزہ پر روزہ رکھا، اور دوپہر کے بعد ضعف وکمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ جب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ہوئی، تو یہ آیتیں نازل ہوئیں، اور سابقہ ممانعت موقوف ہو گئی۔

بعض روایات میں ہے کہ یہود کے روزوں میں بھی یہی ممانعت رائج تھی۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو اسی طرح کا حکم دے دیا، جس کو مختصر عرصہ کے بعد قرآن حکیم نے اس آیت سے منسوخ فرمایا، جس طرح استقبالِ بیت المقدس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے ساتھ مشروع ہوا تھا، پھر قرآنی آیت سے منسوخ ہو کر کعبہ شریف کے استقبال کا حکم ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ سنت کے ذریعے جو احکام ثابت ہوں، قرآن کریم کے ذریعہ ان کو منسوخ کیا جا سکتا ہے، کمامرّ۔

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآىِٕكُمْ ؕ﴾ (حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے عورتوں کے ساتھ مباشرت، اور اختلاط کو) یہ کنایہ ہے جماع سے رمضان کی راتوں میں۔ پھر فرمایا یہ عورتیں تمہارے لئے لباس کی مانند ہیں، اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس کے ہو، گویا ان دو جملوں میں پوری ازدواجی زندگی کا فلسفہ بیان فرمایا۔ سب سے بہتر اور خیر کا لباس تقویٰ ہے۔ یہ تقویٰ ازدواجی زندگی کا لبِ لباب اور ثمرہ ہے، اسی لئے نکاح کو نصف ایمان کا درجہ دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان لباس کے بغیر ایک ساعت گزارہ نہیں کر سکتا، اس کی شرافت وحیاء لباس ہی سے قائم ہے۔ بعینہٖ میاں بیوی کا یہی حال ہے۔

تیسری وجہ لباس میں زینت ونام آوری چھپی ہوئی ہے، یہی حال زوجین کا بھی ہے۔ ؎

زن خوب وفرمانبرو پارسا ☆ کند مرد درویش را بادشاہ

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح لباس میں پردہ پوشی ہوتی ہے، اسی طرح شدتِ اختلاط کے باوجود زوجین ایک دوسرے کی خوب پردہ پوشی کرتے ہیں، وغیرہ۔ فرمایا:

﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ کو تمہاری خیانتوں اور بے اعتدالیوں کا پورا علم ہے کہ تم لوگ رمضان کی راتوں میں ممانعت کے باوجود عورتوں کے ساتھ اختلاط رکھتے تھے، اور چھپ کر مباشرت کیا کرتے تھے، جیسے کہ ایک شخص عشاء کے بعد جب گھر آیا، تو بیوی سے مباشرت کا مطالبہ کیا، بیوی نے کہا کہ میں تھوڑی دیر سو کر اٹھی ہوں، لہٰذا مجھے معاف کریں، خاوند نے کہا کہ میں تو نہیں سویا، میرے لئے گنجائش ہے۔ پس اس نے مباشرت کرلی، اور پشیمان ہوئے، اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔

پس انہی واقعات کو قرآن حکیم نے خیانت سے تعبیر فرما کر عام معافی کا اعلان کیا، اور آئندہ کے لئے عام اجازت کا پروانہ جاری فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شفقت اور مہربانی ہے۔ اگر یہ حکم جاری نہ ہوتا، تو قیامت تک یہ خیانتیں جاری رہتیں، اور متقیوں کا تقویٰ وعمل خیانتوں کی نذر ہوجاتے، اور لاکھوں مسلمان بے صبری کی وجہ سے رمضان المبارک کے فوائد وبرکات سے محروم ہوجاتے۔ پھر فرمایا:

﴿ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ (جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھا ہے اُسے تلاش کرو) مطلب یہ کہ مباشرت کا مقصد طلبِ اولاد ہونا چاہئے، نہ کہ محض جنسی خواہشات کی تکمیل، اور نکاح کا اصلی مقصد بھی نسل کی ترقی اور اس کی بقاء ہے، نہ کہ کچھ اور۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تَنَاكَحُوا تَوَالَدُوا فَاِنِّیْ اُبَاهِیْ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَوْ بِسِقْطٍ دوسری روایت میں تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ۔ [مشکوۃ] جس خاندان کی عورتوں میں زیادہ بچوں کی پیدائش کا رجحان ہے، اسی خاندان کی عورتوں سے افزائشِ نسل کی خاطر شادیاں کرو، کیونکہ تکثیرِ امت کا یہی سبب اصلی ہے۔ جب نکاح کا مقصدِ اصلی افزائشِ نسل ہے، تو اسی بنیاد پر متعہ حرام ہوا، اور زنا پر پابندی عائد ہوئی۔ متعہ اور زنا ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں، وہاں نہ نسب ثابت ہوتا ہے، نہ وراثت، بلکہ انسانی شرافت بے حیائی کے کنویں میں گر کر غرق ہوجاتی ہے، اور لاکھوں بچے بچیاں حرامی پیدا ہو کر پورے معاشرے کے لئے زہرِ قاتل ثابت ہوتے ہیں۔

روافض ہوں یا یورپی عیسائی حرامی بچے پیدا کر کے انسانی شرافت کا خانہ خراب کر دیا ہے، وہاں شرافت صرف ایک چیز کا نام ہے کہ بدفعلی بالجبر نہ ہو، یہ گناہ ہے، اس کے علاوہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ روزمرہ نوجوان ماں بہنوں کی عصمت دری میں مصروف رہتے ہیں۔

برطانیہ جب برصغیر پر قابض ہوا، تو یہاں کی حیاوشرافت پر وہ ظلم وستم روا رکھا، جس کی نظیر نہیں۔ تمام شہروں، بستیوں میں قانونی زنا خانے بنام ''چکلہ'' قائم کیے۔ ہمارے پاکستان کے اکثر وبیشتر شہروں میں یہ لعنتی چکلے موجود تھے۔ کروڑوں رحمتیں ہوں جنرل ضیاء الحق شہید پر، جنہوں نے اس لعنت سے ارض مقدس کو ہمیشہ کے لئے پاک کیا، اور لاکھوں مسلمانوں کی شرافتِ ایمانی کا تحفظ کیا۔ لہٰذا نکاح کا مقصد نسلِ انسانی کی حلال طریقہ سے بقاء ہے، نہ کہ کچھ اور۔

مزید فرمایا: ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ ﴾ [الآیة] اب کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ طلوعِ فجر تک سب کچھ مباح اور جائز ہے۔ طلوعِ فجر کی تعبیر اس طرح فرمائی کہ صاف ظاہر ہو جائے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے، سفید دھاگے سے مراد طلوعِ فجر ہے، جورات کے دھاگے، یعنی تاریکی کے اختتام پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں افراط وتفریط سے بچا کر اعتدال کی تعلیم دینا مقصود ہے، یعنی نہ تو بے فکری سے اس طرح کھاتے پیتے رہو کہ صبح کے یقینی ہونے کے بعد بھی سلسلہ جاری رکھو، اور نہ اتنا وہم وتردّد کرو کہ رات ہی کو صبح سمجھ کر کھانا پینا چھوڑ دو، جیسے کہ اکثر لوگ صبحِ کاذب دیکھ کر کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ صبحِ صادق کا انتظار کر کے اس کو حدِ فاصل تسلیم کر کے اس کی آمد پر کھانا پینا ترک کریں، اور روزے کی نیت کر کے شام، یعنی غروبِ شمس تک ہر قسم کے اُکل وشرب وغیرہ سے پرہیز کرو۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے، سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان تمہیں کھانے پینے سے منع نہ کرے، کیونکہ وہ رات کو تمہیں اٹھانے کے لئے اذان دیتا ہے۔ البتہ! حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی اذان صبح کی اذان ہے، اُسے سن کر ہر قسم کے کھانے پینے سے رک جاؤ۔ [بخاري]

بہر حال! امساک اور افطار دونوں میں بیداری ہو۔ غفلت بہتر نہیں، احتیاط ضروری ہے، یہاں تک کہ صبحِ صادق ہونے کے ایک منٹ بعد کھانے سے بھی روزہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح غروب سے ایک منٹ پہلے کھانے پینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا اور قضاء واجب ہوتی ہے۔ تو احتیاط لازم ہے، تا کہ ہر قسم کے نقصان سے حفاظت ہو۔

آج کے زمانہ میں ترقی کا دور دورہ ہے۔ عام وخاص لوگوں کے پاس گھڑیاں موجود ہوتی ہیں، پھر افطاری

اورسحری کے نقشے چھپواکرگلی کوچوں شہروں دیہاتوں میں تقسیم کرتے ہیں، لہٰذا چنداں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

☆......ابواب البرّ کا پانچواں حکم اعتکاف ہے۔ اعتکاف سنت مؤکدہ علیٰ وجہ الکفایہ ہے۔ ایک شخص کے اعتکاف میں بیٹھنے سے پوری آبادی کی گلوخلاصی ہوجاتی ہے۔ سید کائنات ﷺ بڑی پابندی کے ساتھ اس سنت کو ادا فرماتے رہے۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد اُمہات المؤمنین نے اس سنت کو زندہ رکھ کرمثال قائم کردی۔

اعتکاف کے لئے ایسی مسجد کا ہونا، جہاں باقاعدہ اوقاتِ خمسہ کے لئے اذان ہو، اور نماز باجماعت کا پورا اہتمام بھی ہو، ضروری ہے، تاکہ معتکف کو دوسری کسی مسجد میں نماز کے لئے نہ جانا پڑے۔ البتہ! اعتکاف کے لئے جامع مسجد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسی صورت میں معتکف کو اداءِ جمعہ کے لئے کسی جامع مسجد میں جانے کی اجازت ہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد اپنی اعتکاف والی مسجد میں فوراً آنا لازمی ہے۔

عورتوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے گھروں میں کوئی خاص جگہ متعین کرکے اعتکاف میں بیٹھیں۔ فتنہ وفساد سے بچنے کا سہل طریقہ یہی ہے۔ بعض اسلامی ملکوں میں عورتوں کے لئے مسجدوں میں الگ جگہ برائے عام نماز و اعتکاف مخصوص ہے، جہاں مردوں کی کوئی آمدورفت اور گزر نہیں ہوتا، پردہ کا خصوصی انتظام بھی ہوتا ہے۔ ماہِ رمضان میں بکثرت عورتیں وہاں اعتکاف کرتی ہیں۔ لہٰذا علماء کرام نے اس کے جواز پر فتویٰ شائع کرکے لوگوں کو مطمئن کیا ہوا ہے۔ واللہ اعلم

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ (یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدیں ہیں) جن کی حفاظت ہر مسلمان پرفرض ہے، اور حدود سے تجاوز کرنا قطعاً جائز نہیں۔ دراصل اسلام اللہ تعالیٰ کا وہ پاکیزہ دین ہے، جس میں ہر محاذ پر، خواہ عقائد ہوں یا عبادات، طاعات ہوں یا معاملات۔ انفرادی زندگی کے مسائل ہوں یا اجتماعی، ہر شعبۂ حیات کے لئے کتاب وسنت کی تعلیمات وہدایات ہیں۔ کوئی معمولی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق ہدایات جاری نہ ہوں۔ پھر اسلام دینِ الٰہی ہے، ہر قسم کے افراط وتفریط سے پاک ہے۔ صراطِ مستقیم اعتدال کا نام ہے، اسی پر حدود اللہ ہیں۔ ان حدود کی پاسداری اور حفاظت ایمانِ کامل کی علامت ہے، جس کا نام ہے ''اتباعِ حق''۔ اور حدود واحکام کی خلاف ورزی اور تعدی کا نام ہے ''اتباعِ نفس وشیطان''، اور یہ نفاق وفسق کی علامت ہے۔

توفرمایا: ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ دوسرے مقام پرارشاد ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ [البقرۃ: ۲۲۹] یعنی حدود اللہ سے تجاوز بھی نہ کرو، اور انہیں توڑنے کی جرأت بھی نہ کرو، بالکل اعتدال پر صراطِ مستقیم

پر چل کر اَلۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ [التوبة: ۱۱۲] (اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اور مؤمنوں کو خوشخبری سناؤ) کی جماعت میں شامل ہو جاؤ، خوب بشارت حاصل کرو۔ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی اور ہدایت کی خاطر اپنی آیتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے، تا کہ لوگ ان پر چل کر متقی بن جائیں، اور راہِ نجات حاصل کریں، ہر قسم کے نقصان سے بچ جائیں، آخرت کے عذاب اور ابدی بربادی سے نجات پائیں، اور ابدی سعادت حاصل کریں۔

❁ ❁ ❁

وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَى الۡحُـکَّامِ
لِتَاۡكُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۝۱۸۸ ع

ترجمہ: اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال اپنے درمیان باطل اور ناحق طریقے سے، اور نہ پہنچاؤ مالوں کو حاکموں تک تا کہ تم، لوگوں کے مالوں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھاؤ، اور تم جانتے ہو۱۸۸

معارف ومنازل

☆......ابواب البِرّ کا یہ چھٹا حکم ہے کہ ہر قسم کے حرام اور غیر شرعی لین دین سے مکمل اجتناب کرو، اور اُکلِ حلال، نیز حلال کمائی کو ذریعۂ معاش بنا کر اللہ تعالیٰ کے حکموں کی اسی طرح پیروی کرو، جس طرح تم نے ماہِ صیام میں کی تھی۔ اسی مناسبت سے روزے کے بیان کے متصل بعد اُکلِ حلال کا بیان شروع فرمایا۔ ارشاد ہے کہ روزے کا اعلیٰ مقصد اور اس سخت ریاضت کا پھل یہ ہے کہ تم روزہ رکھ کر متقی بن جاؤ، اور پاکبازی اور طہارت کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو۔ روزے کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ اُکل وشرب و جماع سے پرہیز کرو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ تمام اخلاقِ رزیلہ اور اعمالِ بد سے انسان مکمل طور پر دست کش ہو جائے۔

تم پیاس سے تڑپ رہے ہو۔ تم بھوک سے بیتاب ہو۔ تمہیں سوائے ربّ العزّت کے کوئی دیکھ بھی نہیں رہا۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی، لذیز کھانے اور ہر طرح کے خوشذائقہ پھل پاس رکھے ہوئے ہیں، لیکن تم ہاتھ بڑھانا تو کجا! آنکھ اٹھا کر اُدھر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ تمہارے ربّ تعالیٰ کا یہ حکم ہے۔ اب جب حلال چیزیں تم نے اپنے ربّ تعالیٰ کے حکم سے ترک کر دیں، تو وہ چیزیں جن کو تمہارے ربّ تعالیٰ نے ہمیشہ کے

لئے حرام کردیا ہے (چوری، خیانت، حرام مال، رشوت، اور حرام کمائی وحرام خوری، بددیانتی وغیرہ) اگر یہ مراقبہ پختہ ہوجائے تو کیا تم ان کا ارتکاب کرسکتے ہو؟ ہرگز نہیں! کیونکہ مہینہ بھر کی اس مشق کا مقصد یہی ہے کہ تم سال کے باقی گیارہ مہینے بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے یونہی گزاردو۔ جولوگ روزہ تو رکھ لیتے ہیں، مگر مالِ حرام اور حرام وناجائز لین دین، بددیانتی سے باز نہیں آتے، تو وہ وعیدِ شدید اور عذابِ الیم کے مستحق ہوں گے، اور ان کا روزہ بھی ضائع اور بے مقصد ہوجائے گا۔ اس لئے روزے کے بعد متصل حکم ہوا: ﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ [الآية] اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ)۔

شانِ نزول:

یہ آیت کریمہ ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبدان حضرمی رضی اللہ عنہ اور حضرت امرؤالقیس کندی رضی اللہ عنہ کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا۔ مدّعی حضرت عبدان رضی اللہ عنہ کے پاس اثباتِ حق کے لئے دو گواہ نہ تھے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ ضابطہ مدّعیٰ علیہ حضرت امرؤالقیس رضی اللہ عنہ سے حلف لینا چاہا، اور انہوں نے قسم کھانے کا ارادہ بھی کیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آیت کریمہ کی بطورِ نصیحت تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ [آل عمران:۷۷] (وہ لوگ جو اللہ کے وعدے اور اپنی قسموں کے ذریعے خرید لیتے ہیں تھوڑا سا مال۔۔۔۔) جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر نہایت سخت وعید ہے، تو حضرت امرؤالقیس رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی، تو بیتاب ہو کر قسم کھانے کو ترک کردیا، اور زمین سے دست بردار ہوگئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت کریمہ میں ابواب البرّ کے ضمن میں اسلامی نظامِ معاشیات کا ایک ہمہ گیر اہم مسئلہ کا بیان ہو رہا ہے کہ تم لوگ ناجائز، غیر شرعی طریقے سے کسی کا مال مت کھاؤ۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: من أخذ مال غيره لا على وجه اذن الشرع فقد أكل بالباطل۔ یعنی وہ شخص جس نے ایسے طریقے سے مال حاصل کیا، جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی، تو اس نے باطل ذریعہ سے کھایا۔ فيدخل فيه القمار والخداع والغصوب وحجد الحقوق و مالا تطيب به نفس مالكه۔ [قرطبي] اس میں جوا، دھوکہ دہی، زبردستی چھین لینا، کسی کے حقوق کا انکار اور وہ مال جسے اس کے مالک نے خوشی سے نہیں دیا، یہ سب اَکلِ باطل میں شامل ہیں، اور کھانے والے لايدخل الجنة جسد غذي بالحرام کی وعید میں شامل ہیں۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح بھی کی ہے: ''ومن الأكل بالباطل أن يقضي القاضي لک وأنت تعلم أنک مبطل فالحرام لا يصير حلالاً بقضاء القاضي''۔ [قرطبي]

اگر کوئی شخص رشوت دے کر یا جھوٹی قسم کھا کر، یا جھوٹی گواہیاں دلوا کر اپنے حق میں فیصلہ کرا لے، تو قاضی کا فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔

اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَ اَنْتُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَنْ یَکُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیَ لَهٗ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَضَیْتُ لَهٗ بِشَیْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِیْهِ فَلَا یَاْخُذَنَّهٗ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ۔ [متفق عليه] یعنی میں ایک انسان ہوں (میں عالم الغیب نہیں ہوں) اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، ممکن ہے تم میں سے ایک فریق زیادہ چرب لسان ہو (بولنے میں تیز اور ماہر ہو) اور میں اس سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں، تو یاد رکھو! کہ حقیقتِ حال تو صاحبِ معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے، اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہے، تو اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا، وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا۔

تو سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مغالطے کی وجہ سے کوئی فیصلہ کردے، جس میں ایک شخص کا کوئی حق کسی دوسرے شخص کو ناجائز مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلے کی وجہ سے وہ اس کے لئے ہرگز حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہے، اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا۔

الغرض! عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام، یا کسی حرام کو حلال نہیں بنا سکتا۔ اگر کوئی شخص دھوکہ، فریب، مکر، جھوٹی گواہی یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعۂ عدالت لے لے، اور قاضی کو دھوکہ دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرالے، تو اس کا وبال اسی کی گردن پر رہے گا، اور روزِ محشر اس کا حساب اسی نے دینا ہوگا۔ پس اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب، اور حضرت حق علیم و خبیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے، جیسے صحابیٔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یعنی حضرت امرؤ القیس رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ سے متاثر ہو کر متنازعہ زمین، حضرت عبدان رضی اللہ عنہ مدعی کے لئے چھوڑ کر دعویٰ سے دستبردار ہوئے۔ [ترمذي]

اگر ہمارا باہمی لین دین (بیع و شرا و دیگر مالی معاملات) قرآن حکیم کے اس حکم اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس واضح ارشاد گرامی (حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا) کے مطابق ہو جائے، اور ہم لوگ مسلمان ہوتے ہوئے قرآن حکیم کے

فیصلوں پر قناعت کریں، اور روزِ قیامت احکم الحاکمین کی عدالت میں پیشی کا ذرّا تصور کریں، تو ہماری تمام تر مقدمہ بازیاں ختم ہو جائیں گی۔ ان مقدمات کی پیروی پر بے تحاشا مال دولت پانی کی طرح جو بہا کر ضائع کر رہے ہیں، ان پیسوں سے متنازعہ زمین اور جائیداد سے دس گنا بڑی زمین خریدی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ بعض مقدمات کا تین چار پشتوں تک فیصلہ نہیں ہوتا۔

یہ سب کچھ مغربی قوانین (جنہیں کالا قانون کہنا مناسب و برحق ہے) کی کارستانی ہے۔ اس کے علاوہ ان مقدمہ بازیوں سے ہزاروں رشتے ناطے ختم ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ جنگ وجدال، قتل وغارت کی نوبت آتی ہے۔ محبت واخلاص کی جگہ دشمنی اور عداوتیں جنم لیتی ہیں۔ اگر ہم قرآن کریم کو اپنا حکم تسلیم کرلیں، تو اسلامی معاشرہ جنت نظیر بن جائے گا، اور تمام معاشرتی خرابیاں دور ہو کر سارا ماحول پاکیزہ، درخشاں اور خوشگوار بن جائے گا۔ کاش! قرآن کو ماننے والا، سینے سے لگانے والا مسلمان اس پر عمل کرنے کی اہمیت کا کچھ احساس بھی کرے، اور عمل نہ کرنے کے نقصانات کا اندازہ لگا کر اپنی آخرت کو تباہی سے بچائے۔

چونکہ اکثر لوگ جیسا کہ ہمارے زمانے کا رجحان اور عام پیشہ ورانہ ہتھکنڈہ ہے کہ دوسروں کے مال پر قبضہ جمانا، انہیں بے دخل کرنا، اور ناجائز طریقے سے ان کی جائیداد کو اپنے نام کرانا اس کا ایک مروج اور مؤثر طریقہ یہ ایجاد ہوا ہے کہ جھوٹی گواہی، جھوٹی دستاویزات، جھوٹی قسم اور رشوت کے بل بوتے پر جھوٹے مقدمات قائم کرنا، اور بڑی بڑی رقم رشوت میں دے کر عدالتوں اور پنچائیتوں کے ذریعے اپنے حق میں فیصلہ کرانا، اور جہنم کی آگ کا شعلہ اپنے لئے منظور کرانا وغیرہ، تو اسی کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

[الآیة] یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ گناہ کے طریقہ پر، جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس مال میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے، اور تم مقدمہ بنانے اور دوسروں کے اموال کو اپنے نام پر کرنے میں جھوٹے ہو، اور روزِ قیامت ساتوں زمینیں طوق بنا کر تمہارے گلے میں ڈالی جائیں گی۔ [بخاری]

کسبِ حلال کی اہمیت و برکت:

بکثرت آیات وروایات میں حلال کمائی کی تعلیم دی گئی ہے، اور فضیلت و برکت بیان ہوئی ہے، اور حرام

سے پرہیز کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَاتَزُ الُ قَدَمَاعَبْدٍيَوْ مَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْئَالَ عَنْ اَرْبَعٍ عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اِكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَعَنْ عِلْمِهٖ مَاذَاعَمِلَ فِيْهِ۔ [الترغيب، البيهقي، عن معاذبن جبل] یعنی محشر میں کوئی آدمی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکے گا، جب تک وہ ان چار پانچ باتوں کے سوال ہونے پر جواب نہیں دے گا۔ ایک یہ کہ اپنی عمر کس کام میں صرف کی؟ دوسرے یہ کہ اپنی جوانی کس چیز میں لگائی۔ تیسری یہ کہ مال کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ چوتھی یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک اور کتنا عمل کیا؟

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے حلال کھایا، اور سنت کے مطابق عمل کیا، اور کسی کو نہیں ستایا، وہ جنت میں جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! عام طور پر ہماری حالت تو ایسی ہی ہے، اور اکثر مسلمان ان باتوں کے پابند ہوں گے۔ [ترمذي]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اندر اگر یہ چار خصلتیں موجود ہوں اور تمہیں دنیا میں اور کچھ بھی حاصل نہ ہو، تب بھی کافی ہے۔ ایک امانت کی حفاظت، دوسری سچ بولنا، تیسری حسنِ ظن، چوتھی حلال کھانے کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی: یارسول اللہ! میرے لئے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنادے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنا کھانا حلال اور پاک بنالو، تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے، اور قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے، انسان جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے، تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کے بدن کا گوشت حرام مال سے بنا ہے، اس کے لئے جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔ [مشکوٰۃ]

اس حدیث سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ حرام کھانے والا شخص ہر خیر سے محروم رہتا ہے، اور زندگی بھر اس کا کوئی عمل (نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر و تسبیحات، تبلیغ و تلاوت قرآن وغیرہ) قبول نہیں ہوتا، کیونکہ ایک لقمہ حرام سے جب چالیس روز کے اعمال ضائع ہوئے، تو دوسرے لقمہ سے دوسرے چالیس روز کے اعمال ضائع ہوجائیں گے، اس طرح حسبِ عادت لقموں کا سلسلہ بھی جاری رہے گا، اور چالیس دنوں کا سلسلہ اس پر مرتب ہوتا رہے گا، جو پوری زندگی پر مرتب ہوکر پوری زندگی کے اعمالِ خیر کو ناکارہ بنائے گا۔ عمل جب قبول ہوتا ہے، تو شرعی اصطلاح میں اسے

کارآمد کہتے ہیں، جبکہ غیر مقبول عمل کا شمار ناکارہ چیزوں میں ہوتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ: لوگ آپ سے نئے چاندوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے: یہ اوقات ہیں لوگوں کے لئے، اور حج کے لئے، اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ، لیکن نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اور گھروں میں تم ان کے دروازوں سے آؤ، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۱۸۹﴾

معارف ومنازل

ابواب البِرّ کا سلسلہ جاری ہے، یہاں چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا بیان، اور اس کی حکمت اور منافع کی تشریح ہے۔ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا تعلق جس طرح ماہِ رمضان کے ساتھ وابستہ ہے، اسی طرح بیع وشراء، قرض کی ادائیگی اور دوسرے بے شمار معاملات کے ساتھ بھی ہے، اور فریضۂ حج کی ادائیگی، اور اَشہرُ الحج کا تعین بھی اسی چاند کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے، ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ﴾ امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک خاص شان ہے کہ انہوں نے بہ سببِ عظمت اور کثرتِ ادب کے اپنے پیشوا سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوالات بہت کم کیے ہیں، بخلاف پچھلی اُمتوں کے، جنہوں نے انبیاء علیہم السلام سے بکثرت سوالات کیے، اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوالات، جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، کُل چودہ سوالات ہیں، جن میں سے ایک سوال ابھی اوپر گزرا ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ﴾ اور دوسرا سوال یہی ہے: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ اور ان کے بعد سورۂ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں مذکور ہیں۔

"اَهِلَّةٌ" ہلال کی جمع ہے۔ ہلال پہلے دن کے چاند کو کہتے ہیں، جب وہ جسم میں چھوٹا ہوتا ہے، پھر جب بڑھنے لگتا ہے، تو اس کا نام قمر ہو جاتا ہے، اور پھر جب چودھویں تاریخ کو بالکل پورا ہوتا ہے، تو اسے "بدر" کہتے ہیں، اور آخر ماہ میں اُسے "محاق" کہتے ہیں۔

"مَوَاقِیْت" جمع ہے میقات کی، یہ اسم آلہ ہے، یعنی شناختِ اوقات کا آلہ، اور میقات کسی کام کے لئے مقرر وقت کو کہتے ہیں، اور کبھی مکان کو کہتے ہیں، جیسے: مواقیت الحج وغیرہ۔

آیت مذکورہ میں ابواب البِرّ کے ساتویں حکم، اور لَیْسَ الْبِرُّ میں آٹھویں حکم کا بیان ہو رہا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے متعلق سوال کیا، کہ اس کی صورت سورج سے مختلف ہے۔ آفتاب میں کمی بیشی نہیں ہوتی، پھر چاند ایسا کیوں نہیں؟ یہ سوال حقیقت میں چاند کے بارے میں ہے، یا اس کی کمی بیشی کی حکمت و مصلحت کے بارے میں ہے، مگر جواب میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال حکمت کے بارے میں ہو، تو جواب سوال کے مطابق ہے۔

اگر سوال کمی بیشی کی حقیقت کے بارے میں ہو، جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان سے بعید ہے، تو پھر جواب میں بجائے حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرامِ سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں ہے، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے۔ پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے اور بڑھنے، چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کونسے مصالح اور فوائد وابستہ ہیں؟ اس لئے جواب میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہارے مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں، وہ یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا، اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہو جائے گا، گویا یہ جواب حکیمانہ اسلوب پر ہے کہ جواب کے ساتھ سوال کی بھی اصلاح کر دی گئی، کہ تمہارا سوال حقیقت کے بارے میں موزون نہیں ہے، بلکہ حکمت و مصلحت کے متعلق ہونا چاہئے۔

شمسی اور قمری حساب کا فرق:

سورۂ یونس کی آیت: ﴿ وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ﴾ [یونس:۵] (اور مقرر کیں اس کے لئے منزلیں تاکہ تم پہچانو گنتی برسوں کی اور حساب) سے چاند کا فائدہ یہی معلوم ہوا کہ اس کے ذریعہ

تاریخ، مہینے اور سال کا حساب معلوم ہو سکے، مگر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت: ﴿فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ﴾[الاسراء:۱۲] (پھر مٹادیا رات کا، اور بنادیا دن کا نمونہ دیکھنے کو، تاکہ تلاش کرو فضل اپنے ربّ کا، اور تاکہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب) سے معلوم ہوا کہ سورج کے ذریعے بھی مہینے اور سال کا حساب لگایا جاسکتا ہے، مگر چاند کے لئے قرآن حکیم نے جو الفاظ استعمال کئے، ان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسلام میں چاند ہی کا حساب مقرر ہے، خاص طور پر ان عبادات میں، جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہو، مثلاً رمضان، لیلۃ القدر، اعتکاف عاشورہ، عیدین، شب برأت، حج وغیرہ، ان سب میں احکام کا تعلق چاند سے ہے، اگرچہ ان چیزوں کی تعیین آفتابی حساب سے بھی ہوسکتی ہے، لیکن چاند کا حساب جس قدر آسان ہے، آفتابی حساب میں وہ بات نہیں ہے۔ ان پڑھ دیہاتی جنگلوں، جزیروں اور پہاڑوں میں رہنے والے، جنگلی، شہری، عالم، جاہل، غرض ہر آنکھ رکھنے والا چاند کو دیکھ کر آسانی سے معلوم کرسکتا ہے، بخلاف شمسی حساب کے، وہ آلاتِ رصدیہ اور قواعدِ ریاضیہ کا محتاج ہے۔

دنیا کی تمام قوموں میں مذہبی وغیر مذہبی ضروریات ومعاملات میں دو ہی قسم کے حساب رائج ہیں، ایک شمسی، دوسرا قمری۔ شمسی حساب میں طلوع وغروب کے اعتبار سے کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، روزانہ یکساں صورت رہتی ہے۔ دن بھر بھی یکساں صورت رہتی ہے۔ کوئی شخص سورج دیکھ کر نہیں بتلاسکتا کہ آج فلاں تاریخ ہے۔ سورج کے مطالع ومغارب میں اس قدر دقیق اور معمولی فرق ہے کہ سوائے ماہرینِ ریاضی اور ہیئت کے ہر آدمی نہیں جان سکتا۔ رہ گیا سورج گرہن! اول تو وہ دائمی نہیں ہوتا، اور پھر ہر جگہ نہیں ہوتا، اس لئے عوام الناس کو اس میں سہولت نہیں ہے۔ البتہ! قمری حساب میں یہ ساری سہولتیں موجود ہیں، روزانہ کی کمی بیشی، مطالع کا اختلاف، پھر ہر مہینہ ایک مقررہ طریق پر نظامِ عمل متعین ہے، اور مشاہدہ اس پر گواہ بھی ہے۔

بعض شرعی احکام میں قمری حساب ضروری ہے:

قرآن حکیم کے الفاظ: ﴿ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام نے قمری حساب کو اپنایا ہے۔ قمری نظام عام اور سہل بھی ہے، اور اصالۃً احکام کا مدار بھی اس پر ہے۔ ان شرعی احکام میں تو قمری حساب لازم اور فرض ہے۔ شمسی حساب سے ان کا تعلق جائز ہی نہیں۔ قمری حساب گویا اسلامی شعار ہے۔ البتہ! خرید وفروخت، رہن، اجارہ اور اِعارہ وغیرہ، معاملات میں اگرچہ شمسی نظام کی اجازت ہے، لیکن آسان اور پسندیدہ

قمری حساب ہی ہے۔

بہر حال! چونکہ بہت سے احکام کا مدار قمری حساب پر ہے، اور خیر القرون اور اس کے بعد صدیوں تک عالم اسلام اپنے تمام امورِ مملکت اور دیگر تمام تر معاملات میں اسی قمری حساب پر کار بند رہا ہے، بلکہ یہ کہنا حق بجانب ہے کہ ایک ہزار ہجری تک تمام مملکتی اور عوامی امور کے بارے میں شمسی حساب سے لوگ واقف تک نہیں تھے۔ عالمِ اسلام کی تمام مملکتوں اور ریاستوں میں سارا نظام قمری حساب پر رواں دواں رہا، تو اسی نکتہ کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ قمری حساب کا انضباط اور اسے محفوظ رکھنا فرضِ کفایہ سے کم نہیں ہے، حتی کہ ہم تاریخی، علمی، ادبی اور مذہبی کتابوں کا جب مطالعہ کرتے ہیں، تو وہاں یہ لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ یہ کام شمسی حساب کے تحت ہوا، بلکہ یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اسلامی مہینوں کے تحت ہوا، گویا قمری حساب اسلامی حساب کا دوسرا نام ہی رہا۔

آج ہمارے ملکوں میں بھی عموماً یہ بات نہایت مشہور ہے کہ جنتریوں، کلینڈروں وغیرہ کے متعلق یہی کہتے رہتے ہیں۔ انگریزی سال، انگریزی مہینے، انگریزی سنہ، انگریزی حساب۔ اسی طرح اسلامی سنہ، اسلامی مہینے اور اسلامی سال وغیرہ، یہ تواتر والی شہرت اسی بات کی غماز ہے کہ قمری حساب اسلامی ہی ہے۔

پس مسلمانوں کی قومی اور ملّی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص قومی اور مذہبی شعار کو مضبوطی سے اپنائیں، اور اپنا ملی شعار چھوڑ کر اگر دوسروں کی اقتداء وتقلید پر زندگی گزاریں، تو یہ ایک صدمہ سے کم نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمارے برصغیر کے ممالکِ اسلامیہ کا کردار قابلِ گرفت اور تباہ کن ہے۔

البتہ! عربی ممالک نے بحمدہٖ تعالیٰ چنداں اس تباہ کن نظام کو نہیں اپنایا۔ ان کے تمام نجی اور عوامی کاروبار و دیگر شہری اُمور میں مکمل اسلامی، قمری نظام کا دور دورہ ہے، اور اسی پر سب کچھ چل رہا ہے، حتی کہ سارا دفتری نظام بھی اسی اسلامی شعار پر قائم وگامزن ہے، اور ان کا عدالتی نظام، فوجداری اور دیوانی مقدمات اگرچہ اسلامی نہیں، مگر ایک معتد بہ حد تک اسلامی نظام سے متصادم بھی نہیں۔ اس کے برعکس بدقسمتی سے ہمارے ملک کا سارا نظام یہود ونصاریٰ کا ہے، اور پورا معاشرہ غیر اسلامی ہے۔

ہمارے اربابِ عقد وحل تو ویسے بھی اللہ تعالیٰ کے نظام پر راضی نہیں ہیں۔ وہ ہر قیمت پر مغربی نظام کے دلدادہ، داعی اور اسلامی نظام سے متنفر اور باغی ہیں، اچھے خاصے پڑھے لکھے مدعیانِ علم وشرافت بھی غیر اسلامی جمہوریت کے داعی اور اس پر فداء ہیں۔

جمہوریت کیا ہے؟ انصاف وشرافت کا جنازہ، اور اسلامی قوانین کی نفی ہے۔ جسے مغرب نے مسلمان قوم پر مسلط کیا ہوا ہے، جس میں انسانوں کو گنا جاتا ہے، تولا نہیں جاتا۔ ایک فاسق وفاجر کو وہی حیثیت حاصل ہے، جو ایک مایہ ناز متقی پرہیزگار کی ہے، گویا کہ شریف وخسیس کی کوئی تمیز نہیں۔ حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کار باش ☆ کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

ہم جب اسلام اور اسلامی نظام کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں، تو قرآن وسنت اور سیرت مطہرہ سے ہمیں یہ ہدایت ملتی ہے کہ اسلام میں ادنیٰ بدعت، یا انسانوں کے بنائے ہوئے معمولی رسم ورواج کی کوئی گنجائش اور اجازت نہیں ملتی، اور کسی ادنیٰ عمل یا غلط راستہ اختیار کرنے پر قرآن کریم فوراً اصلاحی عمل جاری فرما کر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا﴾ [الآية] اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ (احرام کی حالت میں) گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ)۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ بحالتِ احرام (حج وعمرہ) گھر کے دروازے سے آنا جانا برا سمجھا جاتا تھا، اور اگر کوئی شخص دروازے سے آتا تو لوگ اُسے فاجر کہتے، اس کی جگہ لوگ گھر کے پیچھے سے، یا اوپر چھت سے گھروں میں آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اول تو یہ برائی یا بھلائی کی کوئی بات نہیں، جسے لوگوں نے اپنے ذہن سے اختراع کرکے ایک جائز کام کو ناجائز قرار دیا، اور اس کو عبادت کا درجہ دے کر لوگوں کو گمراہ کیا، یہ کوئی بھلائی اور نیکی نہیں ہے۔ بھلائی اور نیکی تقویٰ میں ہے۔ تم لوگ متقی بن جاؤ، اور بلا خوف وخطر گھروں کے دروازوں سے آجایا کرو، اور اس خیالی ثواب کے لئے خود کو مشقتوں میں مت ڈالو۔ اصل نیکی، تقویٰ اور اطاعت اسلام میں ہے، اسے اپنے اندر پیدا کرو، اور قرآن وسنت پر سختی سے عمل پیرا رہو۔

مطلب واضح ہے کہ جب ایک ادنیٰ غیر شرعی عمل کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے، تو پورے معاشرہ کو غیر اسلامی بنانے کی کیا گنجائش ہوگی؟ پس جو لوگ اسلام کے زرّین اصولوں سے منحرف ہو کر یہود ونصاریٰ کی نقالی پر فخر محسوس کرتے ہیں، وہ بہر صورت خدا تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باغی ہوں گے۔

فائدہ:

چاند کے متعلق سوال اور گھروں کے دروازے چھوڑ کر پیچھے سے آنا، یہ دونوں چیزیں حج کے مسائل سے

وابستہ تھے، اس لئے دونوں ایک جگہ پر بیان ہوئے۔

دوسرا یہ کہ جس طرح چاند کی حقیقت کے بارے میں سوال نامناسب اور بے محل ہے، اسی طرح گھروں کے پیچھے سے آمدورفت بھی نامناسب و بے محل ہے۔ یہ ہے دونوں باتوں میں ربطہ ومناسبت۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی جائز کام کو ناجائز قرار دینا، یا برعکس، یہ بدعت اور خلافِ عقل ونقل ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔ اسی طرح کسی مباح اور اختیاری چیز کو واجب وسنت کا درجہ دے کر ضروری قرار دینا بھی بدعت اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کسی بھی دینی حکم میں ترمیم اور ردّ وبدل کی اجازت نہیں ہے۔ اس مسئلے کی تفصیل سورۃ الانعام میں ان شاءاللہ آنے والی ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۱۹۰﴾
وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ
مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۚ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ
فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكٰفِرِينَ ﴿۱۹۱﴾ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقَاتِلُوهُمْ
حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ ۖ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِينَ ﴿۱۹۳﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو۔ بیشک! اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ﴿۱۹۰﴾ اور انہیں جہاں بھی پاؤ قتل کرو، اور ان کو نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے، اور فتنہ مار ڈالنے سے زیادہ سخت ہے، اور مسجد حرام کے پاس ان سے مت لڑو یہاں تک کہ وہ خود تم سے اس میں لڑیں ﴿۱۹۱﴾ اور اگر وہ باز آجائیں، پس بیشک! اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے ﴿۱۹۲﴾ اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہوجائے۔ پس اگر یہ باز آجائیں پس نہیں زیادتی مگر ان لوگوں پر جو زیادتی (ظلم) کرنے والے ہیں ﴿۱۹۳﴾

شانِ نزول:

مکی زندگی میں مسلمانوں کی قلت اور بہت سی دیگر وجوہات کی بناء پر جہاد وقتال کی بالاتفاق ممانعت رہی،

اور مسلسل صبر، درگزر اور برداشت کرنے کا حکم ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ اسی مضمون پر قرآنی آیتوں کا نزول ہوتا رہا۔ جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی نوبت آئی، اور بفضلہٖ تعالیٰ مدینہ دار الاسلام بن گیا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قدم جم گئے، ان کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگیا، تو کفار سے جہاد کا حکم نازل ہوگیا۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کے مطابق سب سے پہلے ﴿وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا﴾ کا نزول ہوا۔ اسی قول پر اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین کا اتفاق ہے۔ مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات نے کہا کہ سب سے پہلی آیتِ قتال جو نازل ہوئی، وہ سورۃ حج کی آیت: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا﴾ [الحج: ۳۹] ہے۔ مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مذکورہ آیت بھی ابتدائی آیاتِ قتال میں سے ہو، اس طرح دونوں باتوں میں ایک قسم کی تطبیق ہوجائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ یہ آیات حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئیں۔

مکہ مکرمہ سے نو میل کے فاصلے پر یہ مقام ہے۔ آج کل اس کا نام ''شمیسی'' ہے۔ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ سنہ ۶ ہجری ماہِ ذی القعدہ میں چودہ پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف عمرہ کے ارادہ سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، اور میقات ذو الحلیفہ سے احرام باندھ کر ہدایا کے اونٹوں کی تقلید واشعار کرکے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو کفارِ قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ بند کیا، اور آگے جانے نہیں دیا۔ حدیبیہ حرم شریف کے حدود سے باہر ہے، وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیام فرمایا، اور دونوں طرف سے پیغامات کا تبادلہ ہوا، اور کافی جدوجہد، ردوقدح کے بعد صلح ہوگئی، اور یہ طے پایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اب واپس مدینہ منورہ جائیں، اور آئندہ سال اسی تعداد کے لوگوں کے ساتھ بغیر اسلحہ کے صرف تین روز کے قیام کے ارادہ سے عمرہ کے لئے آسکتے ہیں۔

اسی مقام پر مشہور تاریخی صلح نامہ مرتب ہوا، جس کو ''سورۃ الفتح'' میں فتح مبین قرار دیا گیا ہے، اور یہی صلح نامہ فتحِ مکہ کا پیش خیمہ اور سبب ثابت ہوا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر عمرہ کی ادائیگی کے وہاں سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ ایک سال گزرنے پر حسبِ معاہدہ وقرارداد ۷ھ کو ماہ ذی القعدہ میں مدینہ منورہ سے پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بارادۂ عمرہ (عمرۃ القضاء) مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ خوف دامن گیر ہوا، اور دلوں میں خلجان وشکوک پیدا ہوئے کہ مشرکوں کے عہد وپیمان پر کوئی اعتبار نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ

عہد شکنی پر اتر آئیں اور ہماری مزاحمت کریں، اور کوئی بہانہ بنا کر ہمارے ساتھ قتال پر آمادہ ہو جائیں، تو ہمارے لئے مشکلات پیدا ہوں گی۔ اگر حسبِ معاہدہ ہم لوگ سکوت اختیار کریں گے، تو ہر طرح سے ہمارا جانی نقصان ہوگا، اور اگر لڑائی چھڑنے پر قتال کریں گے، تو اُشہرِ حرم اور حرمِ کعبہ کی بے احترامی لازم آئے گی، اور حدودِ حرم و اُشہرِ حرم دونوں کی پامالی ہمارے لئے سنگین مسئلہ ہوگا۔

ان کے دلوں کی تسلی اور خلجان دور کرنے کی خاطر آیاتِ کریمہ کا نزول ہوا، اور پریشانیوں کے چھائے ہوئے بادل صاف ہو گئے۔ پوری فضاء صاف ہو کر ان کے سارے غم و غصے مٹ گئے۔ ارشاد ہوا کہ بے فکر رہو:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ جو لوگ تمہارے ساتھ لڑتے ہیں، تم اللہ تعالیٰ کے لئے ان کے ساتھ نبرد آزما ہو کر خوب جنگ و قتال کرو، اور تعدّی و زیادتی سے باز رہو۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کو قتل نہ کرو، اور کسی کا مثلہ بھی نہ کرو۔

معارف و منازل

☆......ابواب البرّ میں سے نویں حکم کا بیان ہو رہا ہے، یعنی قتال فی سبیل اللہ، جہاد فی سبیل اللہ، اسلام کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے، جسے اسلام کے لئے بمنزلۂ اونٹ کے کوہاں کا درجہ دیا گیا ہے۔ فرمایا: "وذروة سنامه الجهاد"۔ (الحدیث) مسلمانوں کے مسئلۂ جہاد پر یہود و نصاریٰ اور ان کے کاسہ لیس بے دین لوگ بڑے اعتراض کرتے ہیں، کہ لوگوں کو تلوار کے ذریعہ مرعوب کر کے اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ تاہم اگر تعصب و عناد چھوڑ کر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے، تو پتہ چلے گا کہ جہاد کا حکم فطرت کے عین مطابق ہے، بلکہ بعض اوقات یہ لازم ہو جاتا ہے۔ جب دنیا میں ہر طرف فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے، کسی کی جان و مال محفوظ نہ رہے، لوگوں کی عصمتوں اور شرافت پر ہر طرف سے ڈاکہ پڑ جائے، تو پھر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

اگر محلّہ کے کسی مکان، دکان، مارکیٹ، فیکٹری میں آگ لگ جاتی ہے، تو اس کو بجھانا پورے محلّے والوں کا فرض بنتا ہے، تاکہ یہ مکان بچ جائے، اور اس کی آگ باقی محلّہ کے گھروں تک پھیل کر پوری آبادی کو خاکستر نہ بنائے۔ جہاد کی یہی مثال اور فلسفہ ہے۔ اگر دنیا کے متمدن لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ضرور ہونی چاہئے، تو پھر انہیں فلسفۂ جہاد کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ جہاد کے بغیر ظلم و ستم کی

بیخ کنی ہرگز ممکن نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں شرک وکفر اور فساد پھیلانے والے لوگوں کی مثال مہلک اور خطرناک پھوڑے سے دی ہے، فرماتے ہیں: جس طرح انسانی جسم کی حفاظت کے لئے جسم کے گلے سڑے حصے کو کاٹ دینا بہتر ہے، یا جس طرح کسی پھوڑے کا آپریشن کرنا مریض کی صحت اور زندہ رہنے کے لئے ضروری ہوتا ہے، اسی طرح پورے معاشرہ کی حفاظت کی خاطر کسی ناپسندیدہ عنصر کے خلاف قتال و جہاد بھی ضروری ہوتا ہے، اور ایسے عناصر کو معاشرے سے کاٹ پھینکنا ہی معاشرے کے مفاد میں ہوتا ہے، لہٰذا اسلام نے دونوں قسم کے جہاد کی اجازت دی ہے، (یعنی دفاعی جہاد اور اقدامی جہاد) کہ مسلمان دفاعی جنگ بھی لڑسکتا ہے، اور بوقتِ ضرورت حملے میں پہل بھی کرسکتا ہے۔

مغربی دنیا اور ان کے نام نہاد حلیف، جو اسلامی جہاد کو دہشت گردی کے نام سے آئے دن مسلمانوں پر اعتراض کرتے رہتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام اور مسلمان اپنے وطن اور خطہ سے ہزاروں میل دور جاکر (یورپی اقوام کی طرح) کسی قوم پر حملہ آور نہیں ہوئے، اور جو لوگ اسلامی مجاہدین پر فساد پھیلانے کا الزام لگارہے ہیں، وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ یہ کون ہیں جو محض اپنے مذموم توسیع پسندانہ خواہشات اور عزائم کی خاطر دس پندرہ ہزار میل دور سے چل کر نہتے اور بے گناہ عوام پر بم برسارہے ہیں؟ اور اسے انصاف و ہمدردی کا نام دے کر شہروں اور آبادیوں کو کھنڈرات میں تبدیل کررہے ہیں؟ اور نہایت بیدردی اور درندگی کے ساتھ عوام کا قتل عام کررہے ہیں؟

اسلامی جہاد پر انگلی اٹھانے والے نام نہاد متمدّن امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں کا حال ملاحظہ فرمائیں، اور اندازہ لگائیں کہ صرف دنیا کی خاطر لڑی جانے والی جنگ میں لاکھوں بیگناہ جانوں کو قتل کردیتے ہیں، ہسپتالوں، سکولوں، کالجوں، مسجدوں، مدرسوں اور شادی بیاہ کے اجتماعات پر بمباری کرکے لاکھوں ہزاروں انسانوں کو ابدی نیند سلاکر پرواہ تک نہیں کرتے۔ دوسری جنگ عظیم میں سات کروڑ کے قریب بے گناہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے، اور پہلی جنگ میں تین کروڑ کے قریب لوگ تلف ہوئے، اور مالی نقصانات اتنے بکثرت ہوئے کہ شاید پوری متمدّن دنیا کو بیس سال تک کافی ہوتا۔ اندھادھند بمباریوں سے لگ بھگ بیس کروڑ لوگ زخمی ہوئے، نابینا ہوئے، اپاہج بنے، معذور ہوئے۔ فصلیں تباہ ہوئیں، ہزاروں شہروں کے نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ آخر یہ کونسی تہذیب تھی؟ اور کونسا تمدن تھا؟

پس جو غیر مسلم اقوام، یا نام نہاد حاشیہ بردار، یہود ونصاریٰ کے غلام، جو مسلمانوں کے جہاد پر طنز وتشنیع سے

نہیں تھکتے، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک سو کے قریب مغازی ودیگر جنگوں میں مسلمانوں کے صرف ڈیڑھ سو کے قریب غازیوں نے جامِ شہادت نوش کیا ہے، اور صرف ایک ہزار چالیس کے قریب مختلف کفار ومشرکین مارے گئے ہیں۔

اس پوری تاریخ میں کسی ایک عورت کی بھی عصمت دری اور چادر و چار دیواری کی بے احترامی نہیں ہوئی، اور نہ ہی کوئی معصوم بچہ مارا گیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان ایک سو کے قریب جنگوں کی ابتداء مسلمانوں نے نہیں کی ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ مسلمان اپنے دفاع میں جنگوں میں حصہ دار اور شریک ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی بستی مدینہ طیبہ سے سینکڑوں میل باہر جا کر کبھی جنگ کی ابتداء نہیں کی۔

آپ جغرافیائی حیثیت سے اندازہ لگائیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مشہور پہلی تین جنگیں کہاں لڑی گئیں؟ پہلی جنگ بدر کے مقام پر ہوئی، جو مدینہ کے قرب وجوار میں واقع ہے، اور مکہ مکرمہ سے سینکڑوں میل دور ہے۔ یہاں حملہ آور مشرکین تھے، جنہوں نے کافی دور سے آ کر مسلمانوں کو ان کے گھروں کے نزدیک للکارا، پس مسلمانوں نے اپنے دفاع میں نہتے، غیر مسلح اور بے سروسامانی کے عالم میں ان کا مقابلہ کیا، اور کامیاب رہے۔ **الحمد للہ**

پھر دوسری جنگ ''اُحد'' کے میدان میں ہوئی، جو مدینہ سے ۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے، جہاں حملہ آور دشمن چار سو میل کا فاصلہ طے کر کے آیا۔ خوب مسلح ہونے کے ساتھ ساتھ تعداد ونفری میں بھی زیادہ تھا۔ مسلمان اپنے دفاع میں لڑتے رہے، اور ستر کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ آخر میں فتحمند ہوئے، حملہ آور دشمن بے حوصلگی کے عالم میں بھاگ گیا۔ اور تیسری بڑی جنگ خندق ہے، اس میں بھی کفار چار سو میل کا سفر طے کر کے حملہ آور ہوئے، اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کی۔ اس دفعہ ان کا لشکر کوئی پندرہ ہزار کے قریب تھا۔ مسلمانوں کا لشکر تین ہزار نہتے بے سروسامان لوگوں پر مشتمل تھا، اور وہ دفاعی پوزیشن میں رہے۔

پس مسلمانوں پر یہ الزام کیسے اور کس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دینِ اسلام کو تلوار کے ذریعہ پھیلایا ہے؟ یہ ایسا ناروا اور غیر فطری الزام ہے، جسے کوئی ثابت نہیں کر سکتا، اور نہ ہی تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت ہے۔ اگر اسلام شرق وغرب، جنوب وشمال میں پھیلا ہے، اور عام ہوا ہے، تو حسنِ اخلاق اور کردار کی برکت سے، نہ کہ تلوار اور جنگوں سے۔ آج دنیا کا آخری مشرقی ملک انڈونیشیا اور ملائیشیا، جہاں ۹۸ فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے، کوئی شخص قیامت تک یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ وہاں مسلمان غازیوں اور مسلمان فاتحین کا کوئی فوجی دستہ پہنچا، اور جہاد کیا، یا کسی کو تلوار کے زور پر دائرۂ اسلام میں داخل کیا، بلکہ یہ سارے مسلمانوں کے اعمال، گفتار و کردار اور حسنِ اخلاق کو دیکھ کر

متاثر ہوئے، اور خیمۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

﴿فَلَا تَعْتَدُوْا﴾ کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم خود اپنی طرف سے عہد شکنی کر کے ان کے قتل میں پہل نہ کرو، کیونکہ عہد شکنی ایک اعتداء ہے۔ اسی طرح جو لوگ میدانِ جنگ میں نہیں آتے، اور لڑنے کے قابل بھی نہیں، انہیں قتل سے مستثنیٰ قرار دے کر نہ مارو۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک جنگ کے دوران رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ایک عورت مری پڑی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ناراض ہوئے، اور "نَهٰى عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ" عورتوں اور بچوں کے قتل کو اعتداء بتا کر لوگوں کو اس سے منع فرمایا۔

کہاں ہیں یورپ کے درندے؟ جو جہاد کو دہشت گردی کہتے ہیں، اور لاکھوں بے گناہ شہریوں کو بیدردی سے قتل کرتے ہیں۔ کیمیاوی ہتھیاروں سے ہنستے کھیلتے، عورتوں اور بچوں کو ابدی موت کی نیند سلا دیتے ہیں، اور کوئی شرمندگی وندامت بھی محسوس نہیں کرتے؟ انہیں سوچنا چاہیئے کہ ربّ العزّت أرحم الراحمین بھی کریم ہے، جو سو سالہ شرک و کفر، ظلم و زیاتیوں سے درگزر فرما کر پوری زندگی کے جرائم کی معافی کا پیغام دے رہے ہیں، اسی طرح دینِ اسلام، جو کہ سراسر رحمتوں کی خوشخبری کا پیغام ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجسم رحمۃ للعٰلمین ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء و جانشین خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم جہادی دستوں کو جب روانہ کرتے ہیں، تو انہیں سختی سے ہدایات دیتے ہیں کہ اندھا دھند جنگ شروع نہ کرو، پہلے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو، اگر نہیں مانتے، تو جنگ شروع کرو، مگر حیوانات پر رحم کرو، فصلوں، کھیتوں اور باغوں کو تباہ نہ کرو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور راہبوں کو قتل نہ کرو۔ اگر کوئی کافر تمہارے ساتھ لڑ کر تمہارے بازو پر تلوار سے وار کرے، اور تمہارے قیمتی ہاتھ کو کاٹ کر تن سے جدا کر دے، اور اسی وقت کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرے، تو اسے معاف کر دو، اور اپنے ہاتھ کے عوض اس کا ہاتھ کاٹنے سے باز رہو، انتقام مت لو۔

مفسرین کرام نے ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا﴾ کا ایک مطلب یہ بیان کیا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر جہاد کرو۔ تمہارا مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہو۔ مالِ غنیمت کی خاطر، عصبیت، قومیت، وطنیت، لسانیت اور دادِ شجاعت و بہادری وغیرہ کسی دنیوی غرض و مقصد کے لئے جہاد نہ کرو، کیونکہ جہاد پاکیزہ ہے، تو اسے کسی بدنیتی اور ناپاک دنیوی غرض کے ساتھ ملوث نہ کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (بیشک! اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) آگے اصولِ

جہاد پر تنبیہ کرتے ہیں، فرمایا: ﴿وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ﴾ یعنی جن لوگوں سے تمہیں جہاد کرنے کی اجازت دی گئی ہے، انہیں جہاں کہیں پاؤ، تو انہیں مارو، قتل کرو۔

﴿وَاَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ اَخۡرَجُوۡكُمۡ﴾ اور تم انہیں اس بستی سے نکالو، جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔ انہی مشرکوں نے تمہیں مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا تھا اور وہاں سے تمہیں نکالا تھا اور تمہارے ساتھ بے رحمانہ سلوک کر کے تمہیں تمہارے آباء واجداد کے وطن سے بیدخل کیا تھا، وہ اس کے مستحق ہیں کہ آج آپ انہیں وہاں سے نکالو۔

انہوں نے محض یہ نہیں کہ تمہیں نکالا، بلکہ اپنے خالق و مالک کے ساتھ شرک وکفر کے ذریعہ بغاوت بھی کی، اور مکہ مکرمہ جیسے امن کے گہوارے شہر میں فتنہ وفساد پھیلایا، ﴿وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ﴾ [البقرة:١٩١] (اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین ہے)۔ ان کا فتنہ تو قتل سے بھی سخت اور بھاری ہے۔ فتنہ سے مراد کفر وشرک کا غلبہ، ظلم وزیادتی، بدنظمی اور بداعتقادی ہے۔ اگر یہ لوگ ان وجوہات کی بناء پر ایمان کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں، تو یہ قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔

البتہ! ربّ العزّت سبحانہ کی طرف سے جو اصول وضع ہوئے، انہیں تحفظ دیدو، اور ﴿وَلَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ انہیں سرچشمۂ امن وہدایت مسجد حرام کے پاس قتل نہ کرو، یہی مسجد حرام کے تقدس کا احترام تمہارے شایان شاں ہے۔ ﴿حَتّٰى يُقٰتِلُوۡكُمۡ فِيۡهِ﴾ یہاں تک کہ وہ خود تمہارے ساتھ مسجد حرام میں جنگ کریں۔ ﴿فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ﴾ اگر وہ تم سے لڑائی کریں، تو تم بھی ان سے قتال وجہاد کرو۔

مطلب یہ ہے کہ مسجد حرام کی عظمت وحرمت کا خیال نہ کریں۔ وہ اگر تمہارے ساتھ حدودِ حرم میں جنگ شروع کریں، تو پھر تمہیں دفاع کا پورا حق ہے۔ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دے دو، تمہارے اوپر مسجد حرام کی بے حرمتی کا گناہ نہیں ہوگا، اور سارا گناہ اور وبال ان پر ہوگا، کہ انہوں نے مسجد حرام کی بے حرمتی کر کے جنگ کی ابتداء کی۔

﴿كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ کفار کا یہی بدلہ ہے۔ ﴿فَاِنِ انۡتَهَوۡا﴾ اگر یہ لڑائی سے باز آجائیں، اور صلح کرلیں، یا ایمان قبول کر کے اپنے ماضی کے ہفوات اور لغزشوں سے تائب ہوجائیں، تو رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔ ان کے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے، اور انعامات سے نوازے جائیں گے۔

این درگہے مادر گہے نومیدی نیست ☆ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴾ (بیشک! اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے) ان کے تمام سابقہ

گناہوں کو معاف فرمائیں گے۔

اب آگے جہاد کی حکمت وفلسفہ کا بیان ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ ان کے ساتھ جنگ کرو، تاکہ کوئی فتنہ، کفر وشرک باقی نہ رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاد کا مقصد کسی شخص کے ضمیر کی آزادی کو سلب کرنا نہیں، اور نہ ہی جہاد اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا جائے، بلکہ جہاد تو محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ شرارت پسندوں کی شرارت اور فساد سے لوگوں کی آزادی اور خودمختاری کو محفوظ رکھا جائے، اور دینِ الٰہی اسلامی پروگرام کی اشاعت وترویج میں جو لوگ رکاوٹ پیدا کریں، ان کو سزا دی جائے، اور فساد پھیلانے سے روکا جائے۔ ان سے لڑکر ان کو شکست دی جائے، انہیں بے دست وپا کر کے محکوم بنایا جائے، اور اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرنے میں کسی شخص کو رخنہ اندازی اور مقاومت کا موقع نہ دیا جائے۔ اس سے زیادہ جہاد کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

یہ ہے جہاد کا فلسفہ وحکمت، کہ ہر قسم کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور اگر کوئی دینِ اسلام میں داخل ہونا چاہے تو اسے کوئی روکنے والا نہ ہو، وہ بلا خوف وخطر دینِ حنیف کو قبول کر سکے۔

فرمایا: ﴿فَاِنِ انْتَهَوْا﴾ اگر یہ کفار اس قسم کی فتنہ انگیزی سے باز آجائیں، دین کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہ کریں، اور کوئی زیادتی نہ کریں ﴿فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ تو ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ البتہ! جو ظالم ہوگا، اس کے خلاف جہاد کیا جائے گا، تاکہ دنیا میں عدل وانصاف کو قائم کیا جاسکے، اور فتنہ وفساد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کیا جاسکے۔

تنبیہ:

شروع میں یہ بیان ہوا کہ جہاد اسلامی ایک بہت بابرکت عمل ہے، جس کو اسلام کی سربلندی اور اس کی خوشحالی وبقاء کی خاطر ربّ العزّت سبحانہ نے لازم قرار دیا۔ یہ جہاد اونٹ کے کوہان کی طرح اسلام کی زینت ہے، جب تک یہ باقی ہے، تو سمجھو کہ اسلام کی شوکت باقی ہے، اور جہاد کا عمل قیامِ قیامت تک باقی رہے گا۔ مسلمان حضرت مہدی علیہ السلام کی معیت میں دجالِ اکبر ابوالیہود والنصاریٰ کے خلاف جہاد کریں گے۔

جہاد کی عظمت وبرکت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ سارا یورپ جس کا اس وقت پورے عالم پر بشمولِ فضاء وہوا پر کنٹرول ہے، جہاد کا نام سنکر پانی پانی ہوکر برف کی طرح پگھل جاتا ہے۔ وہ تمام تباہ کن زمینی، فضائی اور

برّی بحری سازوسامان کے باوجود چند پیادہ پا، نہتے، بھوکے، پیاسے، ننگے اور بے سروسامان لوگوں سے اس طرح خوفزدہ و پریشان ہے، جس طرح بھاری بھرکم پانچ ٹن وزن کا مست ہاتھی ایک چھوٹی سی چیونٹی سے کانپ رہا ہوتا ہے، اور اسے اپنی موت وتباہی کا پیغام سمجھ کر پسینے میں غرق ہوجاتا ہے۔ امریکہ ہو یا اس کے اتحادی، دنیا کی کسی طاقت سے اتنے خوفزدہ نہیں ہوتے جتنے جہاد سے ہوتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا اور برحق ہے کہ آخری فتح مجاہدین کی ہوگی، باذن اللہ۔

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ
بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ
اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛۚ وَاَحۡسِنُوۡا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۹۵﴾

ترجمہ: حرمت کا مہینہ حرمت کے مہینے کے مقابل ہے، اور تمام حرمتوں کا بدلہ ہے، پس جس شخص نے تم پر زیادتی کی تم بھی اس پر زیادتی کرسکتے ہو، جیسے اس نے زیادتی کی ہے تم پر، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو، اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اور احسان کرو، بیشک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ میں سے دسواں حکم بیان ہو رہا ہے۔ پہلے جانوں کی قربانی کا حکم بیان ہوا، اب مال قربان کرنے کا بیان ہے کہ جس طرح جہاد میں جان کی قربانی کا حکم ہے، اسی طرح دوسرا رکن انفاق فی سبیل اللہ کا بھی حکم ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنۡجِيۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ؕ ﴾ [الصف] (اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کو پتہ دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلادے؟ (وہ یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اپنے مال ودولت اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہترین بات ہے، اگر تم سمجھو)۔

اس تجارت کی تفصیل دوسرے مقام پر یوں بیان فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ﴾ [التوبۃ:۱۱۱] (خدا نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اوران کے مال خرید لیے ہیں (اوراس کے) عوض ان کے لیے بہشت (تیار کی) ہے۔ یہ لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں، تو مارتے بھی ہیں،اور مارے بھی جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے)۔

اُشہرحرم چار ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، اور رجب۔ مشرکینِ مکہ اس عقیدے پر قبل از اسلام پابندی کے ساتھ قائم رہے کہ ملّتِ ابراہیم علیہ السلام کے اصل وارث ہم ہی ہیں، اس سلسلے میں اُشہرحرم اورحرمِ مکہ مکرمہ کا ان کے اندر بڑے احترام کا جذبہ موجود رہا۔ اُشہرحرم کے شروع ہوتے ہی وہ ہر قسم کے جنگ وقتال اور ڈاکہ زنی وغیرہ پر پابندی عائد کرتے تھے۔ غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں نے سب کچھ برداشت کیا، اور جب وہ آئندہ سال ذوالقعدہ کے مہینے میں عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لائے، تو انہیں شبہ اور تردّد پیدا ہوا کہ کہیں کفارِ مکہ اُشہرحرم کی بے احترامی اور نقضِ عہد کر کے ہمارے ساتھ جنگ نہ کریں، اگر ایسا معاملہ پیش آیا، تو ہمارا ردِعمل کیا ہوگا؟ ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے تردّد کو حل فرما کر جواب دے دیا کہ اُشہرحرم کا احترام یک طرفہ نہیں ہے، بلکہ دونوں طرف سے اس کا اظہار ہونا چاہئے۔

پس اگر کفارِ مکہ بے احترامی پر اتر آئے، تو تم بھی اپنے دفاع میں آزاد ہو، انہیں پوری قوت کے ساتھ جواب دے دو، ترکی بہ ترکی ان کے ساتھ لڑ کر اپنا دفاع کرو۔ تم ہر گناہ سے پاک رہو، اور سارا وبال ان کے کھاتے میں ڈال دو، کیونکہ جب وہ اُشہرحرم اور کعبہ شریف کے احترام کا خیال نہیں رکھیں گے، اور بے احترامی پر ڈٹے رہیں گے، تو زیادتی ان کی طرف سے ہوگی، اور تم حق بجانب اور معذور سمجھے جاؤ گے، تو ان کی زیادتی کا جواب زیادتی سے دو۔

البتہ! تم لوگ اسلام اور قرآن کے ماننے والے ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو، یعنی بیگناہ، معذور، بوڑھے، عورتوں اور بچوں کے قتل سے باز رہو، جیسے پہلے بیان ہوا، تو فرمایا:

﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ حرمت والا مہینہ (مسلمانوں کے اعتبار سے) حرمت والے مہینے (جو کافروں کے اعتبار سے) کے مقابل ہے۔

﴿وَالْحُرُمٰتُ﴾ (دونوں فریق کے لحاظ سے) ﴿قِصَاصٌ﴾ برابر مساوی اور مقابل ہیں۔ یہ برابری اس

وقت ممکن ہوگی، جب دونوں فریق اپنا حصہ برابر ادا کریں۔ اگر کفار نے برابری کے حصے کو ترک کیا، تو برابری متحقق اور ثابت نہیں ہوئی، پس مسلمانوں کو اپنے دفاع میں پورا پورا لڑنے کا حق حاصل رہے گا۔

اس آیت کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ حرمت والا مہینہ تم کو کفار کے ساتھ قتال کرنے سے مانع ہوسکتا ہے، بشرطیکہ کہ اس حرمت والے مہینے کے سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ حرمتیں تو عوض و معاوضہ کی چیزیں ہیں، تو جو تمہارے ساتھ حرمتوں کا لحاظ کرے، تو تم بھی کرو، اور جو حرمتوں کی رعایت نہ کرے، اور تم پر زیادتی کرے، تو تم بھی ان پر زیادتی کر کے اپنا دفاع کرو۔

بعض حضرات نے یہ معنی کئے ہیں: ''اے مسلمانو! اگر مشرکین ماہِ حرم کی حرمت کی پرواہ نہ کریں، اور تم سے قتال کریں، تو تم بھی قتال کرو، کیونکہ یہ ان کے کرتوت کا بدلہ ہے۔ [مظہری]

خلاصہ یہ ہے کہ تم قتال کی ابتداء بھی نہ کرو، اور حد سے تجاوز بھی نہ کرو۔ لیکن اگر وہ قتال کریں تو اپنے دفاع میں قتال کرو۔ یہ ان کے قتال کا بدلہ ہوجائے گا، جس کا گناہ تم پر نہیں ہوگا۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ جو کوئی تم پر زیادتی کرے، تو تم بھی اس پر اسی طرح زیادتی کرو، جس طرح اس نے تم پر کی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ﴾۔ [النحل:۱۲۶] (اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی تھی۔ اور اگر صبر ہی کر لو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت بہتر ہے)۔

اللہ! اللہ! کتنی بلند و پر حکمت حکیمانہ تعلیم ہے، جس کی نظیر اقوامِ عالم میں کوئی نہیں پیش کرسکتا۔ یہ کیا قانون ہے، جو سراسر دشمن پروری اور ذرّہ نوازی پر مبنی ہے۔ دور افتادہ سفر طے کر کے تھکے ہوئے مسافروں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر بدلہ لینا ہے، تو پھر انہیں اسی قدر ایذاء پہنچاؤ، جس قدر انہوں نے تمہیں پہنچائی ہے، ان سے زیادتی نہ کرو، اور اگر ان کی تعدی کے عوض میں معاف کردو، تو تمہیں بڑا اجر بھی ملے گا، اور تمہاری شان کا تقاضا بھی پورا ہوجائے گا، کیونکہ تم ﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران:۱۱۰] ہو۔ روزِ قیامت تمہارا لقب حمادون ہوگا۔

سبحان اللہ! یہ کرم نوازی! یہ دشمن پروری! یہ رحمت و شفقت! جو عقل و سوچ سے بھی نہایت بلند و بالا ہے۔ کیا یہودیت، نصرانیت، صابئیت، مجوسیت ہندومت، بدھ مت، یا اور کوئی مذہب اس کی مثال پیش کرسکتا ہے؟ جو لوگ

بے گناہ انسانوں پر مسلسل بم برسا رہے ہیں، انہوں نے کبھی دشمنوں پر عفو اور درگزر کا کوئی دقیقہ آزمایا ہے؟ کھربوں صلوٰۃ وسلام ہو، اس پیکرِ رحمت وہدایت کی ذرّہ نوازی اور دشمن پروری پر، جنہوں نے ظلمتوں کو مٹا کر سارے عالم کو عدل وانصاف سے بھر دیا۔ صلی اللہ علیہ وٰالہٖ وصحبہٖ وأمتہٖ وسلّم

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو) کیونکہ یہی تمہارا اصلی سرمایہ ہے، تاکہ تمہارے پروردگار کی قانون شکنی نہ ہو۔ اگر تم اسی قانون پر کاربند رہو، تو پھر تمہیں خوشخبری ہو کہ: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (جان لو کہ تمہارا رب تمہارے متقیوں کے ساتھ ہے)۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ [محمد:۱۱] (یہ اس لئے کہ جو مؤمن ہیں ان کا خدا کارساز ہے، اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں)۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)۔

پھر جب تمہاری بقاء، جہاں کی بقاء ہے، تو اپنی بقاء وخوشحالی کا تحفظ بھی کرو۔ وہ اس طرح فرمایا: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو) ابواب البرّ کا دسواں حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ (جہاد میں) جس طرح جان کی بازی لگاتے ہو، اسی طرح مال کی بازی لگا کر خوب مال خرچ کرو، جس میں تمہاری بقاء ہے، اور اسی میں ہر قسم کی ہلاکت وتباہی سے تحفظ ونجات بھی ہے۔

شانِ نزول:

اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری (خالد بن زید) رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا قصہ اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دے دیا، اور حامی بکثرت ہوگئے، تو ہم میں سے بعض لوگوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی کی، اور کہنے لگے کہ اب تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دے دیا (تو ہمیں مزید جہاد کی ضرورت نہیں) اور اس زمانۂ جہاد وقتال میں ہمارے جو بہت سارے مال ومتاع جو خرچ وتباہ ہوئے، آؤ! آئندہ ان کا تدارک کریں، اور ضائع شدہ اموال کو پھر سے دوبارہ حاصل کریں۔ مطلب یہ تھا کہ جہاد کو ترک کر کے مال جمع کرنے میں وقت صرف کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿تَهْلُكَةٌ﴾ سے مراد مال کی اصلاح، اور تدارکِ نقصان، اور ترکِ جہاد ہے۔ [مظہری بحوالہ ابن حبان وحاکم]

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد پھر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے کبھی جہاد کو ترک نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، حتی کہ شہید ہو کر قسطنطنیہ، یعنی موجودہ استنبول (ترکی)

کے شہر پناہ کے نیچے مدفون ہوئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مر گیا، اور اس نے جہاد نہ کیا، اور نہ اس کے دل میں کبھی جہاد کا خیال آیا، تو وہ نفاق کی ایک شاخ لے کر مرا۔ [مظہری]

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس، حذیفہ رضی اللہ عنہم، حسن بصری، قتادہ، عکرمہ، اور عطاء رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ یہ آیت بخل، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ عمومی معنی بھی ہیں کہ کسی بھی برے عمل کے ذریعہ خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہ امر نہایت واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق المال فی سبیل اللہ بسلسلہ جہاد دونوں اسلام کی ترقی وخوشحالی اور مسلمانوں کی بقاء وعزّت کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

ایک دوسری آیت میں کفار کے ساتھ جہاد کرنے کے ساتھ سامانِ جہاد و دیگر ضروری اسباب کی فراہمی اور تیاری کا حکم ہے، فرمایا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ [الأنفال: ٦٠] (اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو، کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں (اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے، اور خدا جانتا ہے) پر ہیبت بیٹھی رہے گی)۔

یہ چیز کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام کی ترقی وعروج، اور چار دانگِ عالم میں اس کی اشاعت و ابلاغ صرف اور صرف جہاد سے ہوا۔ حجازِ مقدس سے لے کر افریقہ، اندلس، کشمیر، کاشغر، چین اور جزائر بلقان تک، نیز عظیم بڑی سلطنتوں روم وفارس کی فتوحات تک، سب کچھ جہاد کے طفیل ہوا، اور نصف دنیا تک فتوحات جہاد ہی کے ذریعہ طے پائیں۔ جب ہر طرف سے مال وسرمایہ کثرت کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، تو فریضۂ جہاد متروک ہوا، اور مسلمانوں میں فقر و جفاکشی کی بجائے رفاہیت وعیاشی پیدا ہوئی۔ مال کی فراوانی نے انہیں ایک طرف بخل و کنجوسی پر آمادہ کیا، دوسری طرف بنگلے اور اونچے اونچے محلات کا رجحان بڑھ گیا، اسی کے ساتھ، جوا، شرط، قمار بازی، شراب نوشی و دیگر بہت سارے مخرّبِ اخلاق پیچیدہ مسائل ہر قسم کے دینی واسلامی اعمال کے زوال کا باعث بنے۔

اندلس کے امراء نے اپنے محلات کا پلستر، سونے اور چاندی کے پانی سے کروا کر حد کر دی، خلافتِ اسلامیہ کا پردہ چاک کر کے بنو عباس نے پوری اسلامی خلافت کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا۔ حکام وامراء کے گھروں میں سینکڑوں لونڈیوں کا رقص ہوتا رہا۔ دشمنوں کو چاروں طرف سے طمع پیدا ہوا، اور وہ ہر طرف سے حملہ آور ہوئے۔ جہاد کی اقدامی پوزیشن تو دور کی بات ہے، دفاعی پوزیشن بھی مفقود تھی۔ قیصر وکسریٰ کو تہہ وبالا کرنے والے مجاہدین کے

جانشین اور وارث دنیوی عیاشیوں میں اس طرح گم ہو چکے تھے کہ انہیں جہاد کا نام تک یاد نہیں تھا۔ دشمنوں نے بغیر کسی جنگ کے، اور کسی مزاحمت کے بغیر اسلامی ملکوں پر قبضہ کیا، اور لاکھوں مسلمانوں کے پاکیزہ خون کے ساتھ ہولی کھیلی، اور لاکھوں اسلامی دینی کتب خانوں کو یا تو جلا کر خاکستر کر دیا، یا دجلہ وفرات کے دریا پر مذہبی کتابوں کا پل بنایا، جس سے تین چار ماہ تک دریا کتابوں کی سیاہی سے رنگین بہتا رہا۔

ادھر بغداد کا سقوط، ادھر اندلس وغرناطہ کا سقوط، ادھر نظریۂ جہاد کے سقوط کے المیہ نے ہماری صفوں کو تہہ وبالا کر کے وہ تباہی مچادی، جسے قیامت تک نہیں بھول سکتے۔ ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کا زوال شروع ہوا۔ دہلی کے سقوط کے بعد سمرقند وبخارا ہاتھ سے نکلے، پھر دوبارہ بغداد پر تباہی آئی۔ سوڈان تقسیم ہوا، اور انڈونیشیا پر زوال آیا، پھر لیبیا اور تیونس کی باری آئی۔ اب شام وافغانستان کا مسئلہ جاری ہے، دیکھو کیا ہوگا! پورے جہاں کا سرمایہ مسلمان قوم کے پاس ہے، مگر عیاشیوں کا وہ عروج ہے کہ ایک ایک شیخ کے شکار پر اربوں کھربوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ ہر شیخ کی بیویوں اور سرمایہ کی نہ حد ہے، نہ حساب۔ اونٹوں، گھوڑوں کی ریس پر اربوں ریال صرف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سب کچھ ہو رہا ہے، جسے یمن کے بادشاہ شداد نے بھی نہ دیکھا نہ سنا۔ فإنا للہ وإنا إلیہ راجعون

قرآن کریم پر اگر مسلمان قوم کا عمل مسلسل جاری ہوتا، تو یہ اندوہناک ایام دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ ہم نے نہ جہاد کیا، نہ جہادی اسباب تیار کئے۔ ایک ایک گولی اور بندوق کے لئے یورپ کے دست نگر ومحتاج ہیں۔ عرب اسرائیل جنگ میں یورپ نے عربوں کو ناکارہ اسلحہ دے کر گیارہ ملکوں کی فوجیوں کو مروایا، اور اسرائیل کو جتوا کر بیت المقدس ان کے حوالہ کیا۔ قرآن حکیم پر اگر ہمارا عمل ہوتا تو کوئی بستی، شہر، صوبہ اور ملک ہمارے تصرف اور ہاتھ سے ہرگز نہ نکلتا، کیونکہ ربّ العزّت کا وعدہ ہمارے ساتھ ہمارے حق میں ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] (اور (دیکھو!) بے دل نہ ہونا، اور نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مؤمن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے)۔

اسی طرح ﴿ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾ [محمد (صلى الله عليه وسلم):۷] (اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا، اور تم کو ثابت قدم رکھے گا)۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری نبض پر ہاتھ رکھ کر تشخیص فرمائی، اور خبردار کیا کہ: "حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ" کی بیماری سے بچو، مگر ہم کہاں سنتے، اور یقین کرتے ہیں؟ نام کا مسلمان ہمیشہ ڈوبتا ہے، کام کا

سلامت رہتا ہے۔

دنیا میں سینکڑوں یہودی، نصرانی، ہندو، بدھ مت، سکھ اور دیگر ہزاروں تنظیمیں ہیں۔ اربوں کھربوں روپے اپنے مفادات کے تحفظ میں، اور ہمارے اسلامی شعائر اور مذہبی روایات و دینی اقدار کے خلاف پانی کی طرح خرچ کر رہی ہیں، اسی کے بل بوتے پر تو ہمارے پورے معاشرے پر ان کا کنٹرول ہے۔ اس کے برعکس ہمارے تاجروں، سرمایہ کاروں، کارخانہ داروں کا سرمایہ ان کی ذاتی عیاشیوں پر خرچ ہو رہا ہے۔ نہ کوئی جہادی تنظیم ہے، نہ کوئی عمومی خیراتی ادارہ، نہ دینی مدرسوں، خانقاہوں اور مسجدوں کی کوئی سرپرستی۔ سرپرستی تو کجا، بلکہ ارباب حل وعقد ان مذہبی اداروں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔ آئے دن ان کے خلاف نئے نئے ابلیسی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ اللّٰھُمَّ اجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَاشْغَلْھُمْ بِاَبْدَانِھِمْ اٰمین

﴿وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ خالص عمل کرو، حسنِ سیرت، حسنِ گفتار، حسنِ کردار، حسنِ اعمال پر کاربند رہو، اور مستحقین غرباء و مساکین، رشتہ داروں، عزیزوں اور مجاہدین کے ساتھ ہر ممکن بھلائی اور احسان کرو۔ بیشک! ربّ الاحسان وخالق الاحسان جل شانہ محسنین اور بھلائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ عبادات اور معاملات سب میں احسان پسندیدہ عمل ہے۔ عبادات میں "تعبد اللہ کأنک تراہ فإن لم تکن تراہ فإنہ یراک"، معاملات میں یہ کہ جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، تو دوسروں کے لئے بھی پسند کرو، اور جس چیز کو اپنے لئے برا جانتے ہو، تو دوسروں کے لئے بھی برا سمجھو، یعنی سب کا خیر خواہ بنو، اور بدخواہی سے پرہیز کرو۔

۞ ۞ ۞

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ
حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ
اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٚ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ
لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ
لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع

ترجمہ: اور پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے، پھر اگر تم روک دیئے گئے، تو جو میسر ہو قربانی کرو، اور

اپنے سروں کو نہ منڈواؤ، یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو، یا اس کے سر میں تکلیف ہو، پس فدیہ ہے روزے سے، یا صدقہ ہے یا قربانی ہے، پس جب تم امن کی حالت میں ہو، تو پھر جس شخص نے فائدہ اٹھایا عمرہ کا حج کے ساتھ، پس جو میسر ہو، قربانی سے اگر کوئی شخص قربانی کا جانور نہ پائے، پس وہ تین دن کے روزے حج کے ایام میں رکھے، اور سات روزے جب تم واپس لوٹو۔ یہ دس روزے پورے ہیں، یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جس کا گھر بار مسجد حرام کے پاس نہ ہو، اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور جان لو کہ اللہ تعالے سخت سزا دینے والا ہے ﴿۱۹۶﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البِرّ کے بیان کا سلسلہ چل رہا ہے، ان میں گیارہواں حکم فریضۂ حج کا ہے۔ حج کا تعلق چونکہ مکہ مکرمہ اور کعبۃ اللہ سے ہے، اس لئے اس کے متعلقہ کچھ مسائل تو قبلہ کے بیان میں ضمنی طور پر سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۵ سے ۱۲۸ تک ﴿وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ سے شروع ہو کر ﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ تک مذکور ہوئے، پھر بحثِ قبلہ کے اختتام پر ایک آیت ۱۵۸ ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَةَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ میں صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے، اب آیت ۱۹۶ سے آیت نمبر ۲۰۳ تک ﴿وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ﴾ سے شروع ہو کر ﴿فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ يَوۡمَيۡنِ﴾ تک ۸ آیات مسلسل حج وعمرہ کے احکام ومسائل سے متعلق ہیں۔

لفظِ حج بفتح الحاء اور بکسر الحاء دونوں طرح استعمال ہوا ہے، بفتح الحاء کی مثال یہی آیت کریمہ ہے، اور بکسر الحاء کی مثال ﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ ﴾ [آل عمران:۹۷] والی آیت کریمہ ہے۔ حج کے لغوی معنی کسی معظم اور بڑی چیز کی طرف قصد وارادہ کرنے کے ہیں۔ اور اصطلاحِ شریعت میں مخصوص زمانہ میں مخصوص افعال کے ساتھ مخصوص مکان (کعبہ) کا قصد وارادہ کرنا ہے۔

حج کی فرضیت، اور اس کی تاریخ اور حکم:

حج کی فرضیت کتاب، سنت اور اجماعِ امت تینوں سے ثابت ہے۔

کتاب اللہ: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا﴾ [آل عمران:۹۷] (لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر کے تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے)۔ ان کے علاوہ

دیگر بہت سی آیات اور سنتِ مطہرہ، جیسے: "بُنِیَ الْإِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ... الحدیث"۔ اس کے علاوہ دیگر بے شمار احادیثِ صحیحہ متواترہ سے حج کی فرضیت ثابت ہے، اور اجماعِ امت تو ظاہر ہے، عہدِ رسالت سے لے کر آج تک سارے مسلمانوں کا حج کی فرضیت اور حج کی تاریخ پر اتفاق چلا آرہا ہے۔ اور سن کے بارے میں صاحب بذل المجہود نے متعدد اقوال ذکر کئے ہیں: (۱) ۹ھ (۲) ۵ھ (۳) ۶ھ (۴) ہجرت سے پہلے۔

بہر حال! پہلا قول راجح اور بے غبار ہے، کیونکہ فرضیتِ حج کے لئے قدرت علی الاداء، اور امن دونوں شرط ہیں۔ جب آٹھ ہجری سے پہلے مکہ مکرمہ فتح ہی نہیں ہوا، تو فرضیتِ حج کے کیا معنی؟ ۶ھ ذوالقعدہ، اور ۷ھ ذوالقعدہ میں عمرہ حدیبیہ اور عمرۃ القضاء کی حقیقت سب کے سامنے ہے، تو فرضیتِ حج بدونِ قدرت کے اس کے کیا معنی ہوں گے؟

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ نے شرح نقایہ میں لکھا ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱۰ھ میں فریضۂ حج ادا کیا ہے، جسے عام طور پر حجۃ الوداع کہتے ہیں، اور یہی مشہور وصحیح بھی ہے۔ ۹ھ میں جب حج فرض ہوا، تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت میں لوگوں نے حج کیا۔ [متفق علیہ]

حج غیر مکرر فرض ہے، کیونکہ اس کا سبب بیت اللہ شریف ہے، جو کہ غیر مکرر ہے، اس میں تعدد نہیں ہے، بلکہ ایک ہی ہے، اور یہ معلوم ہے کہ سبب اگر مکرر نہ ہو تو مسبب بھی مکرر نہیں ہوتا۔ [ہدایہ]

یہی وجہ ہے کہ زندگی میں ہزاروں بار استطاعت کے باوجود حج ایک ہی مرتبہ فرض ہے، حتی کہ مکہ مکرمہ کے باشندوں پر بھی باوجود استطاعت وعدمِ تکلیف کے حج کی فرضیت میں تکرار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بکثرت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ حج کی فرضیت پوری زندگی میں ایک مرتبہ ہے۔ حج باجماعِ امت اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک عظیم بنیادی رکن ہے، اس کی فرضیت کے لئے شرائط یہ ہیں:

(۱) اسلام۔ (۲) حریت۔ (۳) بلوغ۔ (۴) عقل۔ (۵) تندرستی۔ (۶) امن وسلامتی طریق۔
(۷) زادِ راہ پر قدرت، یعنی اتنا مال ہو کہ واپسی تک تمام عیال کے نان ونفقہ سے فاضل ہو۔ یہ شرائط وجوب کے ہیں۔
شرائطِ اداء ان کے علاوہ ہیں۔

رہا حجِ اصغر، تو وہ عمرہ کا نام ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ وہ سنت ہے، تمام سال اس کی ادائیگی کے لئے ہے۔ البتہ! حج کے پانچ دنوں میں عمرہ مکروہ ہے۔ باقی تمام سال جائز ہے۔ تو ارشاد ہوا: اے مسلمانو! ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَ

﴿الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ (اور پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے) اَتِمُّوْا کے معنی یہ ہیں کہ جس نے حج وعمرہ شروع کیا ہو، تو اس کو پورا کرنا چاہئے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابتداءً حج وعمرہ کرنا مراد ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی بھی عبادت کے شروع کرنے سے اس کو مکمل کرنا ضروری ہوتا ہے، یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

ثمرۂ اختلاف یہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حج وعمرہ دونوں واجب ہیں (یعنی فرض ہیں) اور حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عمرہ سنت ہے، اور حج فرض ہے، لقولہ تعالیٰ: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ [آل عمران: ۹۷] (اور لوگوں پر اللہ کا حق (فرض) ہے کہ بیت اللہ کا حج کریں)۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے حج وعمرہ پورا کرو، یعنی شروع کر کے ناتمام نہ چھوڑو۔ ان کے ارکان وشرائط میں بھی کسی قسم کی کمی اور فروگزاشت نہ کرو۔ نیت بھی اس کے لئے کرو، اور نیت میں اخلاص کو مدِ نظر رکھو۔

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ إحصار کے معنی رکنے، اور بندش کے ہیں۔ یعنی اگر احرام باندھنے کے بعد راستہ میں روکے جاؤ، خواہ بہ سببِ مرض کے یا بہ سببِ کسی دشمن کے، جیسا کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بمقامِ حدیبیہ مکہ مکرمہ کے مشرکین نے روک لیا، اور آگے عمرہ ادا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی طرح یا کوئی اور سبب پیش آئے، جیسا کہ دریائی سفر میں کشتی والوں کو پیش آتا ہے۔ ان صورتوں میں ایک قربانی (بکری، گائے، اونٹ) جو میسر آئے، کعبہ شریف کو بھیج دو، جب یقین ہوجائے کہ قربانی وہاں پہنچ کر ذبح ہوگئی، تو احرام کھول دو، اور آئندہ قضاء کا پروگرام بنا کر قضا کرلو۔ احرام کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ حلق یا قصر کر کے چادر اتار دو، اور لباس زیبِ تن کر کے اپنے وطن واپس روانہ ہوجاؤ، جیسے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامِ حدیبیہ سے واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور مقامِ حدیبیہ میں ستر اونٹ قربانی کر کے احرام کھول دیا۔

حضرت امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ قربانی کو اسی مقام پر ذبح کرے، جہاں روکا گیا ہے، اور احرام کھول دے، کیونکہ مَحِلّ کے معنی ان کے نزدیک یہی ہیں، اور وہ حدیبیہ کو حرم سے خارج مانتے ہیں۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں مَحِلّ سے مراد مکان ہے، اور وہ حرم ہے، اور وہ حدیبیہ کو حرم کا حصہ سمجھتے ہیں۔

پس آیت کریمہ: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ کا مطلب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ محصر، یعنی جس کو روکا گیا ہے، وہ قربانی دیدے، اور مکہ کو روانہ کرے، اور جب وہ یہ جانے کہ قربانی وہاں پہنچ کر ذبح ہوچکی ہے، تو

احرام کھول دے۔ اگر قیمت بھیج دے جس سے کوئی اور شخص وہاں قربانی کا جانور خرید کر ذبح کرے، تو بھی صحیح ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اِحصار کے مقام پر قربانی کرنا درست ہے۔ حرم میں بھیجنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے محصر کی مجبوری کا لحاظ کرتے ہوئے آسانی کر دی، جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے حرم کا پاس رکھ کر آسانی کا فتویٰ نہیں دیا، چنانچہ احناف رحمہم اللہ کے مذہب پر بسا اوقات عمل ممکن بھی نہیں ہوسکتا، جیسے کہ ظاہر ہے۔

اِحصار کے علاوہ احرام کے اندر سر منڈانا:

ممنوعاتِ احرام میں سے ایک یہ ہے کہ حالتِ احرام میں بال کٹوانا، سر منڈانا قطعاً ممنوع ہے۔ البتہ! جو شخص افعالِ حج و عمرہ کی ادائیگی پر قادر ہے، مگر بحالتِ احرام کسی مرض و مجبوری کی وجہ سے سر کے بال منڈانے یا کٹوانے پر مجبور ہے، تو اس کے متعلق ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْبِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ﴾ کہ اگر کسی بیماری کی وجہ سر یا بدن کے کسی دوسرے حصے کے بال منڈانے کی مجبوری ہو، یا سر میں جوئیں پیدا ہو کر پریشان کر رہی ہوں، تو ایسی صورت میں بال منڈانا بقدرِ ضرورت جائز ہے، مگر اس کا فدیہ واجب ہے، اور وہ یہ ہے کہ تین روزے رکھے، یا صدقہ دے، یا قربانی کرے۔ قربانی کے لئے تو حدودِ حرم کی جگہ متعین ہے۔ روزہ اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں ہے۔ ہر جگہ ادا کر سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے صوم و صدقہ کو اجمالاً بیان فرمایا، مگر حدیث نے اس کی تفصیل بتا دی۔

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو یہی جوؤں کا عارضہ پیش آیا۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں سر منڈانے کی اجازت دے دی، اور فرمایا کہ تمہاری مرضی تین دن روزے رکھو، یا بکرا ذبح کر دو، یا چھ مساکین کو فی کس آدھا صاع گندم بطورِ صدقہ دے دو۔ [بخاري] آدھا صاع ہمارے اسی تولے، سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہے۔ اگر اس کی قیمت دی، تو بھی درست ہے۔ یہ آیت کریمہ اسی موقع پر نازل ہوئی۔ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آیت کا نزول میرے بارے میں ہے، مگر یہ حکم سب کے لئے ہے۔ [بخاري]

حج کی اقسامِ ثلاثہ اور ان کے احکام:

اسلام سے پہلے اہلِ جاہلیت کا خیال تھا کہ اَشہرِ حج میں عمرہ کرنا اَفجر الفجور، یعنی سخت گناہ ہے۔ اس آیت کریمہ میں ان کے اس خانہ ساز عقیدہ کی تردید ہے، فرمایا: ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ [الآية]

مشرکین کی اصلاح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ حدودِ میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے حج وعمرہ دونوں کو اَشہرِ حج میں جمع کرنا ممنوع ہے، کیونکہ ان کو اَشہرِ حج کے بعد دوبارہ عمرہ کے لئے آنا، اور سفر کرنا چنداں مشکل نہیں ہے، لیکن حدودِ میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے حج وعمرہ کو جمع کرنا جائز ہے، کیونکہ باہر سے آنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہزاروں میلوں کی مسافت طے کر کے آتے ہیں، اور دور دراز ملکوں سے عمرہ کے لئے انہیں مستقل سفر کرنا نہایت تکلیف دہ اور مشکل ہے، اس لئے انہیں حج میں عمرہ کرنے کی اجازت ہوگی، وہ پہلے عمرہ کرلیں، اور فارغ ہوکر احرام کھول دیں، حلال ہوجائیں، پھر یوم الترویہ کو حج کا احرام مکہ سے باندھ کر منیٰ وعرفات کے لئے روانہ ہوجائیں، اور حج تمتع پورا کرلیں۔

حجِ قران:

اَشہرِ حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ میقات ہی سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے، اس کو فقہاء ومحدثین کی اصطلاح میں ''حج قران'' کہتے ہیں۔ اس صورت میں عمرہ کا احرام آخر تک رہتا ہے، اور یوم النحر کو جمرۃ العقبہ کے عمل اور قربانی وحلق کے بعد حج وعمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ کھلتا ہے۔

حجِ تمتع:

دوسرا یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ لے۔ حج کا نام تک نہ لے، اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال، یعنی طواف وسعی ادا کر کے احرام کھول دے، اور لباس پہن کر حلال رہے۔ پھر آٹھویں ذوالحجہ کو اپنے مکان یا مسجد حرام سے صرف حج کا احرام باندھ کر منیٰ، عرفات، مزدلفہ روانہ ہوجائے، اس کو اصطلاحِ فقہاء میں ''حج تمتع'' کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیت: ﴿فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ﴾ قران اور تمتع دونوں کو شامل ہے، باعتبارِ عمومی معنی کے، کہ حج وعمرہ دونوں کا فائدہ اور نفع حاصل کیا گیا۔

پس قِران اور تمتع دونوں سے فائدہ اٹھانے والوں پر شکرانہ کا دم، یعنی قربانی واجب ہے، جس کا نام ہے: ''دمِ تمتع، یا دمِ قِران''۔ بکری، گائے اونٹ جو بھی میسر ہو صحیح ہے، لیکن اگر متمتع اور قِران والا مسکین ہو، اور قربانی پر اسے قدرت نہ ہو، تو قربانی کے بدلہ دس (۱۰) دن کا روزہ رکھے، وہ اس طرح کہ تین روزے تو ایامِ حج کے اندر ہی رکھے، یعنی نویں ذوالحجہ یوم عرفات تک پورے کر دے، باقی سات روزے فراغتِ حج کے بعد اپنی مرضی سے مکہ میں رکھے، یا واپسی پر اپنے گھر میں رکھے۔ ہاں! اگر تین روزے ایامِ حج میں نہ رکھ سکے، تو پھر دم متعین ہوجائے گا، جب

بھی قدرت ہو، مگر حدودِ حرم دم کے لئے متعین ہے۔

حج اِفراد:

ان دو کے علاوہ حج کی ایک قسم کا نام ''حج اِفراد'' ہے۔ وہ یہ ہے کہ میقات سے صرف حج ہی کا احرام باندھ لیا، مکہ مکرمہ پہنچ کر طوافِ قدوم اور سعی کر لے، پھر اسی احرام کے ساتھ رہے۔ قارن کی طرح آٹھویں ذی الحجہ کو اسی احرام کے ساتھ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ روانہ ہو، حتی کہ یوم النحر جمرہ عقبہ کو کنکر مار کر بغیر قربانی حلق کرے، اور احرام اتار لے، اس پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔

میقاتِ حج وعمرہ:

میقات مکہ مکرمہ کے حدودِ حرم سے باہر چاروں طرف، مشرق، مغرب، جنوب اور شمال کی جہتوں میں وہ معین مقامات ہیں، جنہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نشاندہی پر مقرر فرمایا۔ یہ تمام اطراف مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔

☆ مدینہ والوں کے لئے ''ذو الحليفه''۔ ☆ شام وفلسطین اور مصر والوں کے لئے ''جحفة''۔ ☆ عراق اور ایران والوں کے لئے ''ذات عرق''۔ ☆ نجد، بحرین اور امارات والوں کے لئے ''قرن المنازل''۔ ☆ پاکستان اور یمن والوں کے لئے ''يلملم'' ہے۔

چاروں اطراف کے مواقیت سے لے کر حدودِ حرم تک کے علاقے کو ''حل'' کہتے ہیں، اور حل کے بعد کی سرزمین کا نام ''حرم'' ہے، جو کہ نہایت بابرکت اور قابلِ احترام ہے۔

میقات سے باہر کے لوگ جب میقات کو پہنچتے ہیں، تو ان کو حج یا عمرہ کا احرام باندھنا لازم ہے، وہ بغیر احرام اگر میقات سے اندر حل میں جائیں، تو ان پر دم واجب ہو جائے گا۔ البتہ! جو لوگ عمرہ وحج کے بغیر کاروبار یا کسی اور مقصد کے لئے میقات سے اندر حل اور حرم کے حدود میں جانا چاہیں، تو ان پر احرام لازم نہیں ہے۔ احرام کی تخصیص حج اور عمرہ والوں کے لئے ہے۔ واللہ اعلم

نصیحت:

پوری زندگی فرض حج کی ادائیگی پر قربان کردو، جب مکہ پہنچو، تو تمام دنیوی خواہشات کو ترک کردو، پتہ نہیں زندگی میں دوبارہ یہ سعادت نصیب ہوگی یا نہیں۔ نہایت ادب واحترام کے ساتھ شب وروز طواف اور دیگر عبادات

میں دلجمعی سے منہمک رہو۔ حج وعمرہ کے مسائل خوب یاد کرو۔ اپنے اس روحانی سفر کو قیمتی بناؤ۔ دنیوی خیالات کو ترک کر کے ان کی جگہ اخروی خیالات کے مطالعہ پر وقت صرف کرو، اگر وہاں ایک نیکی کی قیمت ایک لاکھ ہے، تو گناہوں کا بھی یہی حساب ہے۔ خوب سمجھ لو!

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا
جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ
التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا
مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠
وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا
مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

ترجمہ: حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں، پس جس شخص نے حج کو لازم کیا ان مہینوں میں پس عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا جائز نہیں ہے، اور نہ گناہ کی بات اور نہ جھگڑا کرنا حج میں، اور جو کچھ کرو تم نیکی سے اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے، اور توشہ بنا لو، بیشک بہترین توشہ تقویٰ ہے، اور مجھ ہی سے ڈرو اے عقلمندو! ﴿۱۹۷﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ تم اپنے ربّ کا فضل تلاش کرو، جب تم عرفات سے واپس پلٹو، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو، مشعر حرام کے پاس، اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے، اور اس سے پہلے تم گمراہوں میں تھے ﴿۱۹۸﴾ پھر تم بھی پلٹو، جہاں سے دوسرے لوگ پلٹ کر آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہو، بیشک! اللہ تعالیٰ شانہ بہت بخشش کرنے والا نہایت مہربان ہے ﴿۱۹۹﴾

معارف ومنازل

خدائے بزرگ وبرتر واحد لاشریک لہٗ نے صرف اسلام کو اپنا دین بتایا، اور اسی کو اپنے لئے منتخب فرمایا۔ اسلام کے علاوہ تمام ادیان باطل بھی ہیں، اور ان پر عمل کرنا بغاوت وسرکشی بھی ہے۔ پھر ربّ العزّت سبحانہ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرما کر ان کے مبارک ہاتھوں سے اسلام کی بنیاد کے ساتھ مرکزِ اسلام کعبۃ اللہ شریف کی بھی بنیاد

رکھوائی۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اسلام کے بانی، اور کعبۃ اللہ کے معمار و بانی کہلائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر ربّ العزّت کی بارگاہ میں درخواست پیش کی، اور خوب دعا کی کہ: اے ہمارے پروردگار! جس طرح دینِ اسلام عظیم ہے، اسی طرح کعبہ کو بھی عظمت عطا فرما! ربّ العزّت نے ان کی دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔

دوسرے مرحلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی: اے ہمارے پروردگار! اسلام اور کعبہ کی عظمتوں کی آبیاری اور تحفظ کے لئے میری اولاد میں ایک ایسا برگزیدہ عظیم پیغمبر مبعوث فرما، جو سارے انبیاء علیہم السلام اور ساری مخلوقات سے عظیم و برتر ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول ہوئی، اور سید کائنات، محبوب ربّ العٰلمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عظمتوں کے ساتھ تشریف لائے۔ حضرت باری تعالیٰ نے عالمی نبوت کے ساتھ پوری کائنات کی ہدایت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ختمِ نبوت کا تاج رکھا، اور عالمی اخوّت و محبت کے لئے تین عظیم مراکز قائم فرمائے:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ (۲) کتاب اللہ۔ (۳) کعبۃ اللہ۔

یہ تینوں قیامت تک پوری کائنات کے لئے مقتداء اور مرکز رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمۃ للعلمین" کا لقب عطا فرمایا، اور کلام اللہ کو "ذکر للعلمین" کے لقب سے یاد فرمایا، جبکہ بیت اللہ کو "ھدیً للعلمین" کے لقب سے یاد فرمایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عالمگیر اخوت و محبت، انسانیت کے لئے بصورتِ عمل سامنے آئی۔ کلام اللہ سے عالمگیر ہدایت بصورتِ قانون جہاں میں پھیلی، اور بیت اللہ سے عالمگیر اخوت و مساوات بصورتِ حج اُبھری، اور قیامت تک عام ہوئی۔

عالمگیر اخوت و مساوات اور ہمدردیوں کا مرکز:

حج عالمِ اسلام کی معرفت و شناخت، بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت، بین الاقوامی ہمدردی، بین الاقوامی تعاون کا ایک بے مثال اور عظیم المرتبت، دلکش و دل گداز نمونہ ہے، جس میں مرکز بھی ایک، ترانہ بھی ایک، سوز و گداز بھی ایک، محبت بھی ایک، لباس و احرام بھی ایک، عمل بھی ایک، فکر بھی ایک، وضع و ہیئت بھی ایک، رُخ بھی ایک، اور انسانیت بھی ایک۔ پھر رنگ و نسل، قومیت و لسانیت، شکل و صورت اور قد و قامت کے اختلاف کے باوجود خیالات و جذبات اور غرض و غایت بھی ایک۔ اس بین الاقوامی اور بے مثال اجتماع میں اونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت و انحطاط، ذلت و حقارت وغیرہ کا بیخ تک مارا ہوا منظر سامنے ہوتا ہے۔

پس جو قومیں اخوت و ہمدردی، مساوات و بھائی چارگی کی لفظی اور بے مقصد رٹ لگا رہی ہیں، وہ اسلام کے تینوں مرکزوں کے دیئے ہوئے نمونہ مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں، اور اپنے جھوٹے اور نمائشی دعووں سے باز آجائیں، اور اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں، اور لفاظی سے باز آجائیں۔ پھر یہ تینوں مراکز کچھ ایسے نہیں ہیں کہ جنہیں تخلیقِ کائنات میں ثانویت کا درجہ حاصل ہو، بلکہ انہیں پوری کائنات میں اوّلیت کا مقام حاصل ہے۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أول ماخلق الله نوري"۔[الحديث] اسی طرح قرآن حکیم کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ زمین وآسمان کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے سورۃ طٰہٰ اور یٰسٓ کی اللہ تعالیٰ نے تلاوت فرمائی۔ [مشكوة بحواله دارمي]

کعبۃ اللہ شریف کے بارے میں قرآن حکیم کا اعلان:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا﴾ [آل عمران:۹۶] (پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا، وہی ہے جو مکے میں ہے، بابرکت ہے)۔ شریعتِ اسلام نے کعبہ کو اوّل تو سارے انسانوں کا قبلہ قرار دیا، چنانچہ آثار وروایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی نبی دنیا میں ایسا نہیں گزرا کہ جس نے اس قبلہ کا طواف نہ کیا ہو، اور ظاہر ہے کہ جب سارے انبیاء علیہم السلام اس بیتِ خداوندی کی عظمت اور اس سے عشق ومحبت کرتے آئے ہیں، اور اسے اپنا قبلہ تسلیم کر چکے ہیں، تو قدرتی طور پر ان کے ماننے والی قوموں کا قبلہ بھی یہی بیت اللہ شریف ہی ثابت ہوتا ہے۔ اسی نکتے کے تحت ارشاد ہے کہ: ﴿وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾، کعبہ کی حیثیت کو "لِلنَّاسِ" بتا کر اس کی نفی ہوگئی کہ وضع للعرب یا للعجم اس کی حیثیت ہو، اور ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ بھی اسی کی غمازی کرتی ہے کہ یہ مقدس کعبہ ساری خلقت کے لئے ہدایت ہے، اور سب کا قبلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا اجتماع عالمی اور ہمہ گیر ہے، امیر وغریب، بادشاہ، رعایا، خواص وعوام، کالے گورے، عربی عجمی، عالم وجاہل، نیک وبد، صالح وطالح، متقی وفاسق، مرد وعورت، شاہ وگدا، عرفات کے بابرکت میدان میں ایک ہی لباس، ایک ہی کفن میں ننگے سر، ننگے پاؤں یکساں اور فقیرانہ انداز سے اس میدان میں جمع ہوں، احرام باندھے ہوئے ہوں، لاکھوں کی تعداد میں ہوں، ایک ہی ترانہ سب کی زبان پر جاری ہو، وضع وہیئت سب مشترک، اور ایک ہی رخ کا استقبال پروانوں کی طرح گھوم رہے ہوں، جان نثاری کی پیش کش کے ساتھ توبہ واستغفار کے ساتھ ماضی پر ندامت ہو، اور مستقبل پر دیانت وتقویٰ کا عہد وپیمان ہو۔

یہ منظر قابلِ رشک اور نہایت قابلِ دید ہے۔ صبح سے مغرب وعشاء تک اِلحاح وزاری کی گونج میں ایسا لگتا ہے کہ اس پورے مجمع کو ایک گمشدہ، بچھڑے ہوئے کسی محبوب ومطلوب اور دلدار کی تلاش ہے۔ دوسری طرف جود وسخا کا وہ بے پایاں سمندر ٹھاٹیں مارتا ہوا اپنی موجوں کے ساتھ بڑی سرعت و بے نیازی کے ساتھ موجزن ہے کہ ہزاروں پیر وجوان ہاتھوں میں کھانے پینے کی عمدہ خوراک وغذا کی چیزیں لے کر بے تابی سے آواز لگا کر خوراک تقسیم کررہے ہیں۔ گاڑیاں کنٹینر وغیرہ خوراک لے کر پہنچ رہے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں سرد پانی سے لبالب بھری ہوئی بوتلیں تقسیم ہورہی ہیں۔ بلا امتیاز، بدونِ معرفت وشناخت، دسترخوان بچھے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو کھلا پلا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ سارا جہاں آج بے مثال دریا دلی کے ساتھ سخاوت وبخشش کا نظارہ کررہا ہے۔

یہ کیا ہے، اور کون ہے؟ یہ کس کی فرمائش ہے؟ سمجھ سے سب کچھ بالاتر ہے! لگتا ہے کہ پچاس لاکھ سے زائد نفوس کی ضیافت ہورہی ہے، اور میزبان ربّ العزت ہی کی ذات اقدس ہے، جس واحد ولاشریک لہٗ نے چودہ سو سال پہلے ضیافت کا اہتمام کیا تھا، جب کہ اسی میدان میں چمکدار ستاروں اور نورانی چہروں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کا خوبصورت ہالہ بنا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بیچ میں چودہویں کا عظیم روشن ومنور چاند سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ أرواحنا) قصویٰ اونٹنی پر سوار ہوکر خطبہ حج ارشاد فرمارہے تھے۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ سن کر تڑپ تڑپ کر محظوظ ہورہے تھے، اور بیہوشی، بے خودی ومحبت کے عالم میں رو رو کر عہد کررہے تھے۔ اسی اثناء میں رئیس الملائکہ حضرت جبریل علیہ السلام ستر ہزار نورانی فرشتوں کی فوج کے ساتھ نزول فرمارہے تھے، اور تکمیلِ دین وقبولیتِ حج کا پیغام لے کر کہہ رہے تھے: ﴿ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا﴾ [المائدة:۳] (آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا، اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں)۔ جس دینِ حق کی ابتداء أول ما خلق الله نوري سے ہوئی تھی، آج اس کی تکمیل ہوگئی۔ الحمد للہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عظیم تاریخی خطبہ اتنا جامع اور بے مثال تھا کہ سمندروں کے برابر علوم ومعارف پر مشتمل تھا، جسے سن کر جان نثاروں پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی تقدیر بدل گئی۔ اس خطبہ کا ایک فقرہ یہ تھا، فرمایا: ''اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ''۔ اسے سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ناقابلِ تسخیر عزم وحوصلہ پیدا ہوا، اور انہوں نے عہد کیا کہ ہم ہر ممکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کا حق ضرور ادا کریں گے۔

اس خطبے سے اکیاسی دن بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملاأعلیٰ کی جانب روانہ ہوئے، پھر (أسد الغابة) مدینہ طیبہ کے

جنگل کے شیر اسباب و متاعِ دنیا اور تمام عیش و عشرتوں، بیوی بچوں سے مستغنی ہوکر بے سروسامانی کے عالم میں دنیا کے چاروں طرف پھیل گئے، اور ہر محاذ پر جہادی معرکوں میں دادِ شجاعت لیتے رہے، یہاں تک کہ مختصر اور قلیل مدت میں نصف معمورہ پر چھاگئے۔ دنیا کی عظیم طاقتوں (قیصر و کسریٰ) کے ساتھ نبرد آزما ہوئے۔ دو ہزار سالہ قدیم سلطنتوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے گئے۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم أجمعین

زمانۂ حج، اور حج کے مہینے:

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ﴾ حج کے مہینے معلوم ہیں: شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔ یہ تینوں حج کے مہینے ہیں، چونکہ ذوالحجہ کے صرف پہلے دس دن ہیں، اور دراصل حج کی ادائیگی انہیں میں ہوتی ہے، تو ذوالحجہ کا پورا مہینہ مجازاً حج کا مہینہ شمار ہوا۔ اگر کوئی میقات سے پہلے احرام باندھے، تو بلا کراہت جائز ہے، مگر شوال سے پہلے حج کا احرام مختلف فیہ ہے، احنافؒ کے مذہب میں جائز مع الکراہۃ ہے، اس سے حج ادا ہوگا، مگر کراہت کے ساتھ۔ دیگر ائمہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، اور حج ادا بھی نہیں ہوگا۔

حج کے فرائض:

افعالِ حج کے تین فرائض ہیں:

☆ اوّل احرام۔ ☆ دوم وقوفِ عرفہ۔ ☆ سوئم طوافِ زیارت۔

پہلا فرض احرام ہے، جو کہ شروع شوال سے ہے۔ درمیانی رکن وقوف عرفہ ہے۔ نویں ذی الحجہ کو ظہر کے بعد سے شبِ عید کے اختتام تک (فجر تک)۔ اسلامی تاریخوں میں رات مقدّم ہوتی ہے دن سے، مگر یہاں معاملہ برعکس ہے، دن پہلے ہے رات مؤخر۔ یہ صرف شبِ عرفہ کی خصوصیت ہے۔ آخری رکن طواف زیارت ہے، جو یوم النحر سے پورے سال تک اس کا وقت ہے۔ ایامِ تشریق میں ضروری ہے، لیکن اگر ایامِ تشریق کے بعد ادا کیا جائے، تو تاخیر کی وجہ سے دم واجب ہوجائے گا، حج صحیح رہے گا۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾۔ یہاں ممنوعاتِ احرام میں سے تین کا بیان ہے۔ احرام حج کا ہو یا عمرہ کا، یہ تینوں چیزیں دونوں کے لئے نقصان دہ ہیں۔ جس طرح نماز میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ بہت سی چیزیں ممنوع ہوجاتی ہیں۔ بعض چیزوں سے نماز باطل ہوجاتی ہے، بعض چیزوں سے فاسد، اور چند چیزوں سے نماز مکروہ ہوجاتی ہے، اسی طرح احرام کا بھی یہی حکم ہے کہ ممنوعاتِ احرام بعض مفسد

للحج ہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے ارتکاب سے یا تو دم لازم آتا ہے، یا صدقہ وغیرہ۔

اس مقام پر پہلی چیز ''رَفَثَ'' ہے۔ رَفث کے معنی میں بہت عموم ہے، معمولی بے پردگی سے لے کر جماع تک سارے مراتب کو شامل ہے۔

''فُسُوقَ'' ''فسق'' منافقت وکفر اور عام معاصی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، یہاں مراد معاصی ہیں۔ گناہ اگر چہ عام اوقات میں بھی ناجائز ہے، مگر احرام کا معاملہ بہت نازک ہے۔ جب احرام میں خوشبو جیسی حلال اور پسندیدہ چیزیں حرام ہوجاتی ہیں، تو معاصی وگناہ بطریقِ اولیٰ حرام ہوں گے۔ یاد رہے کہ بہت ساری چیزوں کی حرمت مخصوص حالات میں، مثلاً نماز میں، یا روزہ میں، یا احرام میں ہے۔ یہ ان عبادات کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس میں حق تعالیٰ کی عظیم حکمتوں کا دخل ہے، تاکہ بندہ یکسوئی اور توجہ کے ساتھ احکامِ الٰہی کو بجالائے، اور نفسانی خواطر اور دیگر ہر قسم کی خواہشات سے دور رہے۔ بقولِ اصحابِ تصوف ''ملکیت کے ساتھ اشتغال ہو، اور بہیمیت سے دوری ہو''۔

﴿وَلَا جِدَالَ﴾ لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، بدزبانی وغیرہ۔ عام طور پر حج کا سفر پریشان کن ہوتا ہے، اور بدنی تھکاوٹوں کے علاوہ بیماری، بھوک، پیاس اور دیگر پریشانیاں لاحق ہوجاتی ہیں۔ پھر نفس وشیطان کی شرارت ان کے علاوہ ہے، تو غصہ وغضب کا مادّہ ابھر آتا ہے، جس کے سبب لوگ بے خودی میں ساتھیوں کے ساتھ، اور عام لوگوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے شروع کرتے ہیں، جس سے حج اگر چہ فاسد نہیں ہوتا، مگر حجِ مبرور کی فضیلت ضائع ہوجاتی ہے، اور سارا عمل بے روح وبے جان ہوجاتا ہے۔

اسی طرح ان تین ممنوعاتِ احرام کے علاوہ دیگر ممنوعات سے بھی پرہیز لازمی ہے، مثلاً شکار کھیلنا، بال اور ناخن تراشنا، خوشبو استعمال کرنا، سلے ہوئے کپڑے پہننا، جوتا بوٹ پہننا، سر چھپانا، اور چہرہ چھپانا وغیرہ۔ البتہ! عورت کے لئے سر چھپانے، اور سلے ہوئے کپڑے ممنوع نہیں ہیں۔

بہرحال! جب جائز چیزیں احرام میں ممنوع ہیں، تو جو چیزیں پہلے سے ناجائز ہیں، وہ بطریقِ اولیٰ ممنوع ہیں۔ مزید مسائلِ حج کتبِ فقہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

سرورِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مَنْ حَجَّ لِلّٰہِ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ کَیَوْمِ وَلَدَتْہُ اُمُّہٗ''۔ جس شخص نے حج کیا، اور اس نے دورانِ حج بیوی کے ساتھ بے حجابی نہیں کی، اور نہ کسی قسم کی نافرمانی کی، تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہوگا، گویا آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا، یعنی آج ہی ماں نے اس کو جنا۔ اس قسم کے حج کو ''حجِ

مبرور'' کہا جاتا ہے، اور یہ آج کل ہمارے زمانے میں بہت نادر اور نایاب ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ

گزشتہ ابواب البِرّ کے ضمن میں حدیث گزر چکی کہ ایک حرام کا لقمہ کھانے سے چالیس روز تک عبادتیں قبول نہیں ہوتیں۔ آج کے زمانے میں یہ چیز نایاب نہ سہی، مشکل ضرور ہے۔ وہ لوگ نہایت کم تعداد میں ہوں گے، جن کا رزق سو فیصد حلال ہو۔ حج کے پیسوں میں حرام تو درکنار! مشکوک مال بھی کارآمد نہیں، یہی اصلی وجہ ہے کہ حج ایک بہت بڑی انقلابی عبادت ہونے کے باوجود لوگوں کی زندگی میں انقلاب نہیں لاسکتا، لاکھوں میں شاید کوئی حاجی دستیاب ہو، جس کی زندگی میں تبدیلی آئی ہو، اور حجِ مبرور یا حج کی قبولیت کی واحد نشانی یہی ہے کہ اعمال میں انقلاب پیدا ہو۔ اگر حج سے واپسی پر وہی پرانے کرتوت اور برے اعمال برقرار رہے، تو حاجی کے حج کا خدا حافظ۔

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ برند ☆ چوں بیارند ہنوز خر باشد

مطلب یہ ہے کہ جانوروں کو مکہ لے جانے سے جانور وہی پرانا جانور رہے گا، تو اس میں اور بے عمل حاجی میں کیا فرق؟ بلکہ الٹا نقصان ہوگا، کیونکہ روزِ قیامت حجرِ اسود ایسے لوگوں کے خلاف گواہی دے گا، جس سے وہ عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ جو لوگ مشکوک اور حرام مال سے حج کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان، اور بیت اللہ کی توہین کرنے والوں میں شمار ہوں گے۔

سرکاری ملازمین کے حج کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ:

سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے ۴ فیصد رقم ماہوار کٹ جاتی ہے، جسے ''بینوولیٹ فنڈ'' کہتے ہیں، اور ملازمین کو سرکاری حج کروانے کے لیے یہی رقم خرچ کی جاتی ہے، جو کہ ملازمین کی اپنی جمع شدہ رقم ہے، اور اس کی تین شرائط ہیں:

(۱) سرکاری ملازم کی کم از کم مدّتِ ملازمت دس سال ہو۔ (۲) حج کے اوقات میں حج کرنے کی درخواست جمع کروائی ہو۔ (۳) قرعہ اندازی میں اس کا نام نکل آیا ہو۔

اس کا اصول یہ ہے کہ ہر حکومتی ادارہ اپنے ملازمین میں قرعہ اندازی کروا کر صرف دس ملازمین کو سالانہ حج کرواتا ہے، اور سالانہ جن جن ملازموں کا نام قرعہ اندازی میں نکل آتا ہے، وہ آئندہ کبھی بھی قرعہ اندازی میں شامل نہیں ہوسکتے۔ یہ وزیر و مشیر صاحبان، جو اپنے ساتھ درجنوں بیسیوں اور سینکڑوں پارٹی شیدائیوں کو حج اور عمرہ کرواتے

ہیں، جن کا خرچہ کروڑوں میں ہوتا ہے، اوروہ ساری رقم بیت المال اور سرکاری خزانے سے نکالی جاتی ہے، جو سراسر عوام کا حق ہے، اس حج کو آپ حجِ مبرور کے مقابلے میں حجِ وبال کہہ سکتے ہیں۔ سرکاری ملازمین مملکت کے خرچ پر حکومت کے پیسوں پر حج کرنے جاتے ہیں، توان کا کوئی حج نہیں ہوتا، چاہیئے کہ وہ حج کے بجائے خود اپنے ایمان کے لئے دعا مانگیں۔

کیا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی بڑی ہستی ہوسکتی ہے جو بیت المال کے پیسوں پر حج کرنے کو حرام سمجھتے تھے؟ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف سے قرض لے کر حج ادا کرتے تھے۔

جب سے مسلمانوں نے حلال وحرام کا فرق نظرانداز کیا، توتھوک کے حساب سے مصیبتیں اور پریشانیاں آنے لگیں، جس کی سزا مسلمان قوم بھگت رہی ہے، اور یہ کتنا برا ہوگا کہ سرکاری پیسوں سے حج کرنے والے کے خلاف روزِ قیامت کعبۃ اللہ اور حجر اسود بھی گواہی دیں، تو کیا کھویا، اور کیا پایا؟ کچھ نہیں پایا، سب کچھ کھو دیا، عوام کے پیسوں سے حج وعمرہ کرنے کے اتنے نقصانات ہیں، جن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جو نیک کام کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہوتا ہے، کیونکہ ہر غلام اور خادم کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کارگزاری اور خدمت گزاری کا علم اس کے آقا کو حاصل ہوجائے، تاکہ وہ غلام اور خادم انعام واکرام کا مستحق ہو، اس لئے ارشاد فرمایا کہ تم جو اطاعت گزاری اور خدمت وکارِ خیر انجام دیتے ہو، ان سب سے ہم باخبر اور واقف ہوتے ہیں، اور اسی پر جزا دیتے ہیں۔

حضرت امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ یمنی لوگوں کا حال یہ تھا کہ حج کا موسم آتا، تو بے سروسامانی کی حالت میں چل دیتے، نہ کوئی سامان لئے، نہ کوئی درہم ودنانیر، بس ایک چادر کندھے پر ڈال کر حج کے لئے روانہ ہوجاتے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم متوکّل علیٰ اللہ ہیں۔ پھر یہ کیفیت ہوتی کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتے، ہر جگہ دستِ سوال دراز کرتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرضیتِ حج کے لئے زادِ راہ اور استطاعت کی شرط لگائی ہے۔ اگر کسی کے پاس استطاعت نہ ہو، تو وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر دعا کرے، جب اللہ تعالیٰ نے مال دے دیا، تو پھر حج کا سفر کرے۔ اس طرح کا حج صحیح نہیں ہوگا کہ اسباب ووسائل کے بغیر گھر سے نکلو، اور حرام کا ارتکاب کرو، کیونکہ سوال کرنا حرام اور ناجائز ہے، سوائے شدید مجبوری اور پریشانی کے، لہٰذا توکّل کا بہانہ بنا کر بغیر مال کے حج کے سفر پر نکلنا ہرگز جائز نہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ شوق وعشقِ حج ہر مسلمان کے دل میں موجزن ہوتا ہے، مگر بغیر توفیقِ مالی کے حج فرض نہیں ہے۔ محض کسی عبادت کے شوق وجذبہ کو بہانہ بنا کر گھر سے نکلنا، اور بھیک مانگ کر اپنا عمل نامہ سیاہ کرنا، اور خلقِ خدا پر بوجھ بننا، نہ تو دین ہے، اور نہ ہی کوئی دانشمندی، جبکہ یہ عبادت صرف اپنی ذات تک مخصوص ہو۔ البتہ کسی عام دینی خدمت کی بجا آوری کے لئے اگر کوئی سوال کرے، اور لوگوں سے چندہ مانگے، تو الگ بات ہے، جیسے کسی مدرسہ یا کسی مسجد، یا جہادی کوئی مہم ہو، یا عمومی عوامی پریشانی ہو، جیسے زلزلہ زدگان، اور سیلاب زدگان کے لئے سوال کرنا، رفاہِ عامہ کا کوئی مسئلہ درپیش ہو، تو بھیک مانگنا اور دستِ سوال دراز کرنا جائز ہوگا، کیونکہ یہ اضطراری معاملہ ہے۔

تو ارشاد فرمایا: ﴿وَتَزَوَّدُوْ افَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ زادِراہ لے کر چلو، بیشک بہترین توشہ تقویٰ ہے۔ توشہ کا انتظام کر کے حج کے لئے روانہ ہو جاؤ، اور تقویٰ کے ذرائع کو پامال کر کے بھیک نہ مانگو۔ مسببُ الاسباب سبحانہ نے تمام دینی اور دنیوی امور کے لئے جو وسائل واسباب وضع کئے ہیں، انہیں بروئے کار لا کر کام شروع کرو، پھر نتیجہ اور انجام کی تکمیل وپختگی کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو، اور اسی پر بھروسہ واعتماد کرو، اسی کا نام ہے توکل۔

سید کائنات ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا، آپ ﷺ نے پوچھا: تمہاری سواری کیا ہے؟ کہنے لگا: اونٹ ہے، فرمایا: وہ کہاں چھوڑا؟ کہنے لگا: اللہ تعالیٰ کے توکل پر فلاں میدان میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ فرمایا: یہ توکل نہیں ہے، تعطّل اور غفلت ہے، جاؤ، اپنے اونٹ کے زانو کورسی سے باندھ لو، پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے میرے پاس آؤ۔ اسباب کو نظر انداز نہ کرو۔

گفت پیغمبر بآواز بلند ☆ بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

(مثنوی)

مطلب یہ ہے کہ حج ہو، یا عام حالات اسلام میں گداگری حرام ہے، اور انسانی شرافت کی پیشانی پر بدنما داغ ہے۔ سید عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے ترکِ سوال پر بیعت لی تھی۔ پس وہ لوگ اس طرح پرہیزگار ہوئے کہ مجلس میں کسی سے پانی نہیں مانگتے، خود اٹھ کر مشکیزہ کے پاس جاتے تھے۔ بازار میں چلتے ہوئے چابک گر جاتا، تو خود گھوڑے سے اتر کر اٹھا لیتے۔ کسی راہگیر سے چابک اٹھا کر دینے کا مطالبہ نہیں کرتے۔ حدیث میں فرمایا کہ قیامت کے روز گداگر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوگا، تو اس کے چہرے پر گوشت کچھ بھی نہ ہوگا، نہایت بری شکل وصورت میں ہوگا۔ [مشکوۃ]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چوری، ڈاکہ، خیانت کی طرح گداگری بھی مضر پیشہ ہے، چاہئے کہ مسلمان اس سے مکمل اجتناب کریں۔

اس لئے اولوالالباب کو خطاب فرما کر انہیں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ گداگری تقویٰ کے خلاف ہے، اور یہ پیشہ نادانوں اور بے عقلوں کا ہے۔ عقلمند اور متقی انسان ہر ممکن سوال و گداگری سے پرہیز کرتا ہے، اور اسے شرافت کے خلاف سمجھتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں لوگ حج کے موقع پر منیٰ میں میلہ لگا کر مال و مویشی، اور ہر قسم کے سامان کا تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ جب اسلام اور دینِ الٰہی کا زرین دور آیا۔ لوگ دھڑا دھڑ فتحِ مکہ کے بعد اسلام میں داخل ہو گئے، اور جب حج کا موسم آیا، تو انہیں جاہلیت کا زمانہ یاد آیا، تو انہیں تردّد پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خرید و فروخت کرنے سے ہماری عبادت میں فرق آ جائے، اور حج کی قبولیت مشکوک ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ اس بات میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے ربّ کا فضل تلاش کرو، کیونکہ تجارت اور لین دین کے ذریعہ حصولِ رزق، اللہ تعالیٰ کا فضل ہی تو ہے، تو اس کی اجازت دی جارہی ہے۔ البتہ! اجازت دینے اور حوصلہ افزائی میں فرق واضح ہے، یعنی بہتر تو یہی ہے کہ دورانِ حج تجارت سے پرہیز کیا جائے، مگر بصورتِ ضرورت اس کی اجازت دی جارہی ہے، کہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل تصور کرو۔ دنیا کو دین کا تابع بناؤ، تاکہ دین والا رنگ دنیا میں پیدا ہو۔

اگر مقصدِ اصلی حج ہو اور تجارت ضمناً ہو، تو یہ اللہ کا فضل شمار ہوگا۔ اگر نیت و ارادہ میں دونوں کی حیثیت مساوی ہو، تو بھی سراسر نقصان ہوگا، کیونکہ نتیجہ اَخس و اَرزل کا تابع ہوتا ہے، اور یہ باعثِ محرومی ہوگا، کیونکہ اخلاص مفقود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اجازت ملنے کے باوجود متقی حضرات نے ہر ممکن اجتناب کا حکم صادر کیا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ فتویٰ کی رُو سے جائز ہے، اور تقویٰ کی رُو سے بہتر نہیں کہ آدمی سفرِ حج میں دنیوی کاروبار کرے۔

﴿فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ﴾ عرفات کا وسیع و عریض میدان ہے۔ عرفات مکہ مکرمہ سے تقریباً نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ میدان تین اطراف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے وسط میں جبلِ رحمت نامی پہاڑ ہے، جس کے دامن میں مختلف سائز کی بڑی بڑی پتھریلی چٹانیں ہیں، جہاں حجۃ الوداع کے موقع پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغرب تک وقوف فرمایا تھا، اور ساتھ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: ”وَقَفۡتُ هٰهُنَا وَ كُلُّ عَرَفَةٍ مَوۡقِفٌ“۔ یعنی میں نے

یہاں وقوف کیا، مگر سارا عرفات موقف ہے، جہاں وقوف ممکن ہو، بلا خوف وخطر وقوف کیا جائے، سوائے بطن عرنہ کے جو مسجدِ نمرہ کی پچھلی طرف ہے۔ عرفات کے ساتھ وادی نعمان متصل واقع ہے، جہاں عہدِ الست کا ازلی عہد و پیمان واقع ہوا تھا، اور اسی مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق عمل میں آئی تھی۔ وقوفِ عرفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے حج کا رکن چلا آ رہا ہے۔

میدانِ عرفات کا وقوف حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلْحَجُّ الْعَرَفَةُ۔ حج دراصل نام ہی وقوفِ عرفات کا ہے، لہٰذا جو شخص نو ذوالحجہ کو زوال سے لے کر دس تاریخ کی صبح صادق طلوع ہونے تک ایک لحہ کے لئے بھی میدانِ عرفات پہنچ گیا، تو اس نے حج کو پالیا، اور جو شخص ان اوقات میں وہاں نہیں پہنچ سکا، وہ حج سے محروم رہا۔ اسے اگلے سال قضاء کرنا ہوگا، کیونکہ وقوفِ عرفہ کا کوئی بدل نہیں ہے۔ حج کے دیگر ارکان کے لئے کسی نہ کسی بدل، دم، صدقہ وغیرہ کے ذریعہ تدارک ہوسکتا ہے، مگر وقوفِ عرفہ ایسا رکن ہے جس کی کوئی تلافی اور تدارک نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وقوفِ عرفات حج کی روح ہے، اسی لئے وقوفِ عرفات کے لئے احرام شرط ہے۔ پس اگر کوئی بغیر احرام کے وقوف کرے، تو اس کا حج نہیں ہوگا، بخلاف طوافِ زیارت کے کہ وہ بھی حج کا رکن ہے، مگر اس میں احرام شرط نہیں ہے۔ رہا احرام، تو وہ حج کے لئے ایسا لازمی شرط ہے، جیسے نماز کے لئے وضو۔

"عرفات" جمع ہے عرفہ کی، عرفات کے معنی پہچان کے ہیں۔ بعض مفسرین کے ہاں عرفات کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ارضِ ہند میں اتارا گیا۔ حضرت حواء کو جدہ کے مقام پر، پھر جدائی کے رنج والم سہنے کے بعد وہ دونوں مقامِ عرفات میں ایک دوسرے سے ملے، اور شناخت ہوگئی، تو اس مقام کا نام عرفات ہوا۔ پھر وہاں سے چل کر انہوں نے رات کو مزدلفہ میں قیام کیا، اس لئے اس کا نام مزدلفہ ہوگیا۔ واللہ اعلم

اسی طرح عَرَف وَمَعْرُوْف نیکی کو بھی کہتے ہیں، نیز عَرَف خوشبو کے معنی میں بھی ہے کما في الحدیثِ "لَا یَجِدُ عَرَفَ الْجَنَّةِ"۔ یعنی بے انصاف اور ظالم حاکم جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا، وہ خوشبو جو ہزاروں میلوں تک اس کی مہک پہنچتی ہے۔ اسی طرح گھوڑے کی گردن کے بالوں کو بھی عَرَف کہتے ہیں۔ تو مشہور معنی شناخت اور پہچان کے ہیں۔

یہاں حجاج جب وقوف کرتے ہیں، تو یہاں کا اجتماع اپنی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے تاریخی بھی ہے، اور اہلِ دانش وصاحب ضمیر لوگوں کے لئے باعثِ عبرت اور موجبِ یقین بھی ہے، اور یہی چیز حجاج کے لئے معرفتِ الٰہی کا

حقیقی سبب ہوتا ہے، جو لوگ کسی چیز کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، اور حقائقِ اشیاء کی تہہ میں رسائی حاصل کرنے کے عادی ہوتے ہیں، تو وہ تدبر و فکر کے ذریعہ تمام دینی اقدار کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ یہ مجمع عام اور یہ میدان انہیں لازماً مجبور اور متوجہ کرتا ہے کہ یہ کیسی خلقت ہے؟ کہاں کہاں سے کشاں کشاں، کیسے اور کس طرح یہاں آکر جمع ہوئی؟ ایک نظریہ، ایک لباس، ایک جیسے خیالات اور ہم آہنگی، ایک جذبہ، ایک تڑپ اور ایک ترانہ وگفتار۔

یہ عجیب منظر کھینچ کھینچ کر قلوب کو ایک مدّعا، ایک مطلوب، ایک مقصود کے گرد جمع کرکے پروانوں کی طرح گرویدہ بنا دیتا ہے۔ وہ ہستی اور وہ مطلوب کتنا عظیم ہوگا، جو اس میدان کے پچاس ساٹھ لاکھ اشخاص بیک آواز صرف اسی کا نام لے کر گڑگڑا رہے ہیں؟ اور اپنا سب کچھ فراموش کرکے صرف اسی ایک ہستی کو پکار رہے ہیں، تو اسی کو معرفت اور عرفات کے نام سے موسوم کیا گیا، تو مطلب واضح ہوا کہ میدانِ عرفات اور اس کا وقوف معرفتِ الٰہی ہی کا نام ہے۔

اسی وجہ سے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان جس قدر عرفات کے دن ذلیل اور خوار و پریشان ہوتا ہے اور کسی دن نہیں ہوتا، وہ مسلسل اپنے سر پر مٹی ڈال کر افسوس کرتا ہے، کیونکہ اَرحم الراحمین سبحانہ کی مغفرتوں کے سمندر کو ٹھاٹیں مارتا ہوا دیکھ کر اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس بارانِ رحم وکرم کو ابلیس اپنی آنکھوں سے خود مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔

الغرض! سارے دن کے وقوف کے بعد غروبِ شمس کے بعد حجاج کرام اس عظیم و بابرکت میدان کو خیر باد کہتے ہوئے مزدلفہ شریف کی طرف روانگی اختیار کرتے ہیں، اسی کے متعلق ارشاد ہے:

﴿فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ﴾ (پس جب تم عرفات سے واپس پلٹو تو اللہ کو یاد کرو مشعرِ حرم کے پاس)۔ پھر جب تم عرفات سے مغرب کی نماز پڑھے بغیر واپس پلٹو، واپسی کی بات اس لئے کہ حجاج یومِ عرفہ کو منیٰ سے براستہ مزدلفہ میدانِ عرفات پہنچے تھے، اب غروب کے بعد اسی راستہ پر مزدلفہ روانہ ہوں گے۔ راستے میں نمازِ مغرب پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، مزدلفہ پہنچ کر مغرب وعشاء جمعِ تاخیر کے ساتھ ادا کریں گے، جیسے میدانِ عرفات میں ظہر وعصر کو جمعِ تقدیم کے ساتھ ادا کر چکے۔ ان دونوں نمازوں کو جمع کرکے پڑھنے کا حکم انہی مقاماتِ مقدسہ کے ساتھ مخصوص ہے، اور وہ بھی صرف ایامِ حج میں۔

مزدلفہ پہنچ کر مغرب وعشاء دونوں نمازوں کی ادائیگی کے بعد رات کو مزدلفہ میں قیام کرنا ہے۔ قرآن کریم نے ﴿عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ﴾ کہہ کر بتا دیا کہ جہاں حرمت والی نشانیاں ہیں، وہاں خوب اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اور رات بھر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہو۔ علماء کرام نے فرمایا کہ یہ رات لیلۃ القدر کے ساتھ شرف وکرامت اور ثواب میں

برابر ہے، سارے جہاں کے لئے نہیں، صرف وہاں حاضر حجاج کرام کے لئے صبح کی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے وقوف کرنا واجب ہے۔

طلوعِ شمس سے پہلے وہاں سے روانہ ہوکر منیٰ شریف میں "جمرة العقبة" کی رمی کر کے تلبیہ ختم کر کے قربانی اور حلق سے فارغ ہوکر احرام اتارنا ہے، اور طواف زیارت کے لئے اہتمام کرنا ہے، بتوفیق اللہ وعونہ

﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔﴿لِاَنَّهٗ هَدٰىكُمْ﴾ اس لئے کہ اس نے تمہیں ہدایت بخشی ہے۔ ایمان وہدایت کی دولت سے نوازا ہے، جبکہ اس سے پہلے تم لوگ مشرک وگمراہ تھے۔ اس معنی کے اعتبار سے "كَمَا" کا کلمہ تعلیلیہ ہوگا۔ دوسرا معنی تشبیہ کے ہیں، تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت اور رہنمائی عطا کی ہے۔

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت وہدایات کے مطابق اعمال اختیار کرو، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقوں کی روشنی میں ذکرِ الٰہی بجالاؤ، اپنی طرف سے نئے نئے طریقے ایجاد نہ کرو، اور خود ساختہ بدعات اختیار نہ کرو، جس کی وجہ سے فیوض وبرکات اور ثواب سے محروم رہو۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ اور شان یہ ہے کہ اس سے پہلے تم گمراہوں میں تھے، اور شرک وکفر جیسی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ربّ العزّت سبحانہ نے کرم کیا، برحق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث فرمایا، انہوں نے تمہیں ظلمتوں سے نکال کر ہدایت کی روشنائی اور چراغ دکھایا۔ مناسکِ حج اور ذکرِ الٰہی کے طور وطریقے بتا کر تمہاری رہنمائی فرمائی، پس تم اس کی رہنمائی پر چل کر اللہ کا ذکر بجالاؤ۔

﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ پھر تم وہیں سے واپس پلٹ کر چلو، جہاں سے عام لوگ پلٹ کر آتے ہیں۔ یعنی عرفات سے چلو، جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام چلے تھے، اور سارے ان کی اقتداء کر کے عرفات تک جاتے تھے، پھر وہاں سے پلٹ کر مزدلفہ آتے تھے، لہٰذا پورے عرب کی اقتداء کرو، نہ کہ قریش اور اس کے اتحادیوں کی، جو عرفات تک نہیں جاتے ہیں، اور مزدلفہ سے واپس لوٹ کر منی آجاتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ قریش، اور اس کے اتحادی بنوخزاعہ اور بنو کنانہ کے لوگ عرفات تک نہیں جاتے تھے، ایک رات مزدلفہ میں قیام کر کے یوم النحر کو وہاں سے منیٰ میں آتے تھے، اس کی بنیادی وجوہات دو ہیں: ایک یہ کہ وہ اپنے آپ کو مکہ وکعبہ کا مجاور اور خادم سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم حدودِ حرم سے باہر عرفات تک نہیں جائیں گے،

کیونکہ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ غرور و کبر کی وجہ سے یہ نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا حج ہماری طرح ہو، پس ضروری ہے کہ ہمیں کوئی امتیازی خصوصیت حاصل ہو، وہ عام غریبوں کے ساتھ مل کر حج کرنے سے گریز کرتے تھے، اوراس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے فرمایا کہ تم لوگ عوام الناس کی طرح حج کرو، اور وہاں سے پلٹ کر چلو، جہاں سے عوام الناس چلتے ہیں۔ قریش کی طرح مزدلفہ سے پلٹ کر مت جاؤ، اور کسی کبر و غرور والے نظریہ کے لوگوں کی اتباع نہ کرو، اور اپنی ماضی پر ندامت اختیار کرو، اور خوب توبہ کرو۔ بیشک! اللہ تعالیٰ معافی مانگنے والوں، اور توبہ کرنے والوں پر بہت بخشش کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

بعض مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ النَّاس سے مراد عام لوگ نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور آپ علیہ السلام کے لئے جمع کا صیغہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پوری امت قرار دیا ہے، ارشاد ہے: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ﴾ [النحل: ۱۲۰] (بیشک ابراہیم امت تھے، اللہ کے لئے فرمانبردار یکسو تھے)۔ آپ علیہ السلام مجموعۂ امت کے قائم مقام ہیں۔ تمام امت کے خواص و کمالات آپ علیہ السلام میں پائے جاتے تھے، مشہور شاعر نے کہا:

لیس علی اللہ بمستنکر ★ أن یجمع العالم في واحد

(یعنی اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لئے کوئی مشکل نہیں، نہایت آسان ہے کہ ایک فرد میں پوری امت کے خواص رکھ دے)

بہر حال! اس فرمان کے ذریعہ قومِ قریش کے تفاخر و غرور کی نفی گئی، جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے دعوے کے باوجود آپ علیہ السلام کے طرزِ عمل کو بہ سببِ غرور ترک کر کے عرفات جانے سے منکر رہے، اور دوسرے عرب سے اختلاط نہیں کیا، تاکہ ان کی امتیازی شان برقرار رہے، حالانکہ حج جیسی عبادت کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس میں امیر و غریب، حاکم و محکوم، سیاہ و سفید ایک ہی لباس اور وضع و قطع میں برابر ہوتے ہیں۔ کہیں امتیازی خصوصیت کا کوئی تصور تک نہیں ہوتا۔

آخر میں ایک ایسے عظیم عمل کا حکم دیا، جو کہ ربّ العزّت کی رضا و خوشنودی، اور اس کے رحم و کرم کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، یعنی عجز و نیاز اور توبہ و استغفار۔ وہ انسان کتنا سعادتمند و خوش قسمت ہوگا، جو صبح و شام تعلق مع اللہ کا دامن اپنے ہاتھ میں تھامے رکھے گا؟

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بے مثال معصومیت کے باوجود ہر مجلس میں امت کی تعلیم اور رہنمائی کی خاطر سو مرتبہ

صدق واخلاصِ قلبی کے ساتھ استغفار فرماتے تھے۔ارشاد فرمایا: "كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ"۔ اسی طرح فرمایا: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهُ"۔ مجلس کے اختتام پر جوشخص استغفار کرے، اوردرج ذیل کلمات کہے، اس مجلس کی تمام خطائیں معاف ہوجائیں گی ۔ سبحنک اللّٰھمّ وبحمدک لاإله إلاأنت استغفرک و أتوب إليک۔[فتح الباري] علماء کرام فرماتے ہیں کہ دوچیزیں کبھی مسترد نہیں ہوتی ہیں: ایک استغفاروتوبہ۔دوم درود شریف۔اللّٰھمّ اغفر لناولجميع المومنين والمومنات والمسلمين والمسلمات۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

ترجمہ: جب تم ارکانِ حج کو پورا کر چکے، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ تم یاد کرتے ہوا پنے باپ دادا کو، بلکہ اس سے بھی زیادہ، پس لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! دے دے ہم کو اس دنیا کی زندگی میں، اوران کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے﴿۲۰۰﴾ اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دیدے، اور آخرت میں بھلائی دیدے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا﴿۲۰۱﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے حصہ ہے اس سے جوانہوں نے کمائی کی ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے﴿۲۰۲﴾

معارف ومنازل

مرحلہ وار مناسک حج کا سلسلہ جاری ہے۔عرفات کے وقوف کے بعد مزدلفہ میں شب باشی، اور صبح کی نماز کے بعد مختصر وقوف کے بعد منیٰ شریف کی طرف روانگی ہوگی۔منیٰ پہنچے پر "جمرة العقبه" کو سات کنکریوں سے مارنے کی بعد قربانی، اوراس کے بعد حلق وقصر کا مرحلہ ہوگا۔پھر احرام کھول کراپنی مرضی سے پہلے یادوسرے یا تیسرے دن تک "طواف زیارت" اور "سعی بین الصفاوالمروۃ" ادا کرنا ضروری ہے۔

طواف زیارت میں مزید تاخیر کرنے پردم واجب ہوجائے گا۔طواف زیارت سے حج مکمل ہوگا،صرف

ایک ہی واجب باقی رہے گا، یعنی طواف الوادع اور یہ حائضہ عورت کے لئے معاف ہے۔ عورتوں کو بال کٹوانا حرام ہے، صرف بالوں کے سرے سے ایک انگل موٹائی کے برابر کٹوانا کافی ہے۔ اب منی میں تین رات کا قیام کر کے واپس مکہ مکرمہ چلا جائے۔ ان تین دنوں میں تینوں جمرات کی رمی واجب ہے۔ آج کل منیٰ چونکہ شہر مکہ کا حصہ ہے، لہٰذا علماء کرام کا فتویٰ ہے کہ منیٰ میں رات کا قیام اختیاری ہے، کیونکہ منیٰ اور مکہ دونوں ایک شمار ہوئے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ منیٰ میں میلہ لگاتے تھے، اور ہر قسم کی خرید و فروخت کے علاوہ مختلف قبائل جمع ہو کر شعر و شاعری کرتے تھے۔ مالدار لوگ شاعروں کو نذرانے دے کر اپنی تعریف اور مخالفین کے ہجو میں قصیدے لکھواتے تھے، اور اپنے اپنے خاندان کی مدح سرائی کرتے، اور طرح طرح کی خوبیاں بیان کرتے، اپنے آباء واجداد اور بڑوں کے فرضی کارنامے دہراتے، اور ان فرضی باتوں میں وقت ضائع کر کے وہاں سے روانہ ہوتے۔

اس آیت کریمہ میں ان رسومِ جاہلیت کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہمل خاندانی فخر و غرور کی ممانعت فرمائی کہ یہ قیمتی اوقات چاہئے کہ ذکر اللہ اور دیگر طاعات و عبادات میں صرف ہوں، جس سے رضاء الٰہی کے ساتھ حج اور مناسک حج کی عظمت و برتری جلوہ گر ہو، تم جس شوق و جذبے سے اپنے آباء واجداد اور دیگر قومی بڑوں کی تعریف اور مدح سرائی کرتے ہو، اس کو چھوڑ کر اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں لگ جاؤ، جس کے فضل و کرم سے تم کفر کے اندھیروں سے نکل کر ایمان اور تقویٰ و طہارت کی روشنی میں داخل ہوئے۔

تم سارے ایک باپ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، اور وہ مٹی سے پیدا ہوئے، کسی عربی کو عجمی پر، کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقوی کے، ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳] (بیشک تم سے اللہ کے ہاں سب سے معزز تم میں سے زیادہ تقویٰ دار ہے)۔ تم میں فضیلت کا مدار صرف تقویٰ ہی ہے، اور یہاں کثرت کے ساتھ ذکر اللہ تقویٰ ہی کا حصہ ہے۔ اگر کوئی فخر کرنا چاہے، تو ذکر اللہ پر کرے، نہ کہ آباء و اجداد پر۔ تمہارے لئے کچھ اور نہیں، یہی ذکر اللہ ہی کار آمد ہے، کیونکہ میلہ بازی اور خرید و فروخت کی منڈی اور آباء و اجداد پر فخر یہ سارے رسومِ جاہلیت اور دنیا داری کی باتیں ہیں۔ پس جو کوئی دنیا اور اس کی نیرنگیوں کا طالب رہے گا، تو وہ آخرت کی آسائشوں سے محروم رہے گا، اور اسے آخرت میں سوائے کفِ افسوس ملنے کے کچھ بھی نصیب نہیں ہوگا۔

اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ یہ کتنی حماقت اور

نادانی ہے کہ اپنے بارے میں بھی بخل کیا جائے؟ سبحان اللہ! جس واحد لاشریک لہٗ کے ہاتھوں میں دنیا وآخرت دونوں ہوں، اور وہ تمہیں دونوں کی بخشش کی دعوت بھی دے رہا ہو، وہ دونوں کے دینے پر پیش کش بھی کر رہا ہو، اور قادر بھی ہو، پھر تم بخل اور کنجوسی کر کے اس سے صرف ایک (دنیا) مانگ رہے ہو، اور آخرت چھوڑ رہے ہو!! دوسری حماقت یہ کہ ادنیٰ اور فانی تو مانگ رہے ہو، اور جو دائمی، باقی اور اعلیٰ ہے (آخرت) اسے چھوڑ رہے ہو، حالانکہ اس کے خزانوں سے تمہیں دونوں کی پیشکش ہو رہی ہے۔

جو لوگ دنیا کو مقصدِ اصلی بنا کر گمراہ ہوئے، وہ بہر حال قابلِ مذمت اور محرومِ سعادت رہے، مگر صدمہ کی بات یہ ہے کہ مسلمان بھی ان کے نقش قدم پر چلنے لگے ہیں۔ اگر کوئی دنیا کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنائے، تو چنداں قابلِ ملامت نہیں ہے، لیکن اگر کوئی سیڑھی دین کی لگا کر اس کے ذریعہ دنیا تک رسائی کی کوشش کرے، تو یہ صدمہ اور افسوس کی بات ہوگی۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ کچھ لوگ سیر وسیاحت کے لئے حج پر جائیں گے، دوسرے لوگ وہ ہوں گے، جو بھیک مانگنے کی خاطر حج پر جائیں گے، اور کچھ لوگ تجارت کی غرض سے حج کریں گے، اور بعض لوگ قرآن حکیم کو ذریعۂ معاش بنا کر اس کی بدولت اپنا پیٹ پالیں گے، اور کچھ لوگ محض دنیا کی خاطر علم حاصل کریں گے۔[رسالہ علامات قیامت برجندی] اگر غور سے دیکھا جائے، تو آج ہمارے پورے معاشرے کا یہی حال ہے۔

اس آیت کریمہ کا ماقبل کے ساتھ یہی ربط ہے جو واضح ہوا، جن مسلمانوں کو تھوڑی بہت عبادت کی توفیق ہوتی ہے، یا مقامات مقدسہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوتی ہے، یا علماء ومشائخ اور بزرگوں کی خدمت میں باریاب ہوتے، اور دعائیں کرتے کراتے ہیں، اور مشائخ کے حضور بیعت کے لئے آتے ہیں، تبلیغی اجتماعات اور اجتماعی دعاؤں کی مجلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ظاہری نیت وارادہ دین وشریعت ہی ہو، مگر مخفی مقاصد تجارت، زراعت، ملازمت کا فروغ اور مال ودولت میں ترقی اور برکت ہوتی ہے، وہ بہت سے وظائف بھی پڑھتے ہیں، مگر سب میں پیش نظر یہی دنیا کی ترقی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے پاس ہزاروں متشرع اور دوسرے لوگوں کو آتے ہوئے دیکھا، اور تجربہ کیا ہے کہ ظاہری چیز دین اور باطنی پوشیدہ مقصد دنیا کی ترقی اور مال کی فراوانی کا عنصر موجود ہوتا ہے، تو کیا یہ دنیا پرستی نہیں ہے؟

یہ لوگ علماء، مشائخ، سادات اور اصحابِ طریقت لوگوں سے وابستہ بھی رہتے ہیں، مگران کی ساری دوڑ دھوپ کا حاصل یہی ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی بدولت دنیاوی آفات اور پریشانیوں سے محفوظ رہیں، مال واولاد میں برکت ہو، کاروبار میں ترقی ہو، ملازمت میں ترقی ہو۔ ان میں سے ایک شخص دس پندرہ سال سے مسلسل پیر صاحب، شیخ صاحب کی درگاہ پر صبح شام حاضر رہتا ہے، آج اگر کوئی اسے گوش گزار کردے کہ میں فلاں پیر کے پاس گیا تھا، اس نے میرے لئے دعا کی، تو میرا کام ہوگیا، بس سنتے ہی یہ شخص اپنے پیر کو چھوڑ کر وہاں روانہ ہوجائے گا، حالانکہ وہ اپنے پیر کے پاس بارہ پندرہ سال سے دین سیکھنے کے بہانے موجود رہا۔ آج اسے دنیا کی ترقی کا سرسری حال جب معلوم ہوا، تو دین کو خدا حافظ کر کے دنیا کے پیچھے بھاگ گیا، اور یہ چیز روزانہ کا مشاہدہ ہے۔ تو کیا ایسے مسلمانوں کے لئے اس آیت کریمہ میں کوئی رہنمائی اور روشنی ہے؟ انہیں اپنے قلوب وضمیر کو ٹٹول کر انصاف کرنا چاہئے کہ کیا واقعی وہ دیندار ہیں؟ یا دنیادار؟ کسی عارف کا قول ہے:

ظاہرش دین ست وباطن مال وزر ☆ از برون عشق ست وباطن گاو خر

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (الآیۃ) یہ دعا نہایت جامع دعا ہے، جس میں دین ودنیا، دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی کا ذکر ہے، اسی لئے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بکثرت یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ [بخاري]

کعبہ شریف کا طواف کرتے وقت اس جامع دعا کو، نیز دیگر خصوصی اوقات اور پانچوں فرض نمازوں کے بعد اس دعا کو کثرت کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔

بعض لوگ ﴿فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ہماری محبوبہ دنیا کو "حسنہ" کہا۔ بادشاہ نے مجنون سے کہا: تم پاگل ہو، جو لیلیٰ پر فریفتہ ہو، حالانکہ لیلیٰ کوئی خوبصورت نہیں، عام عورتوں کی طرح ہے۔ مجنون نے کہا: بادشاہ سلامت! تم نے لیلیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا، مجنون کی نگاہوں سے نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کے طالب اس آیت کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری محبوبہ لیلیٰ (دنیا) کو "حسنہ" فرمایا، سو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں "حسنة" آتنا کا مفعول بہ ہے، اور "فِي الدُّنْيَا" جار مجرور متعلق ہے، اور "حسنة" مفعول بہ صفت ہے، اس کی موصوف محذوف ہے: أَيْ حَالَةً حَسَنَةً أَوْ حَيَاةً حَسَنَةً۔ یہاں "آتنا" میں مطلوب حیاۃِ حسنہ، یا حالتِ حسنہ ہے، نہ کہ دنیا، کیونکہ "دنیا" مفعول فیہ ہے، اور وہ مطلوب نہیں

ہے، بلکہ مطلوب وہ حالت ہے جو کہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں کو شامل ہو۔

پس دنیا کی حسنات میں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت وتندرستی ،علم وعمل کی توفیق، رزق وروزی کی برکت، عبادات وطاعات اور تمام نیکیوں کی توفیق، علمِ نافع ،عملِ صالح، اخلاقِ حمیدہ، عزّت ووجاہت، یہ سارے امور مراد ہیں۔ آخرت کی حسنات، جنت، رضائے مولیٰ، حساب وکتاب کی آسانی ودیگر تمام اخروی مقاصد کی تکمیل وغیرہ، تو مطلوب ومقصود تمام حسنات ہوئیں، نہ کہ دنیا، جسے قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ نے ملعون قرار دیا ہے۔ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلدُّنیَا مَلْعُوْنٌ وَمَلْعُوْنٌ مَافِیْھَااِلَّاذِکْرَاللهِ وَمَاوَالَاہ۔[مشکوۃ] دنیا اور اس کی چیزیں ملعون ہیں، سوائے ذکر اللہ اور اس کے ہم پلہ حسنات۔

اس کے علاوہ دنیا کی مذمت میں سینکڑوں احادیث مروی ہیں، اور تمام آسمانی کتب اور صحیفے اس کی مذمت میں رطب اللسان ہیں۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم اس سلسلے میں قابلِ مطالعہ ہے، اور دنیا کی مذمت وذلت پر پوری امت کا اجماع بھی ہے۔ سید کائنات ﷺ نے دنیا کو مردار وناپاک فرمایا، اور اس کی مذمت کی۔[مشکوۃ]

فائدہ:

حسنۃ کا لفظ کسی خاص معنی میں نہیں ہے، یہ اپنے موصوف کا تابع ہے، اور موصوف ہی سے اس میں تخصیص کے معنی پیدا ہوں گے۔ پس جو شخص اپنے کسی خاص مقصد کے لئے اگر دعا کرے تو حسنہ کے ساتھ اپنے مطلوب کی نیت کرے، مثلاً علم، عمل، اولاد، شادی، حلال روزی وغیرہ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ: ﴿فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً﴾ سے مراد بیوی، اور ﴿فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ سے جنتی حور ہے، یہ توجیہ صرف ایک معنی کے لئے ہے، اس سے باقی معانی کی نفی مقصود نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ ایک صحابی کی عیادت کو تشریف لے گئے، جو سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے کچھ اللہ تعالیٰ سے مانگا ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں، یارسول اللہ! میں یہ دعا کیا کرتا ہوں: "اَللّٰھُمَّ مَاکُنْتَ مُعَاقِبِیْ بِہٖ فِی الْاٰخِرَةِ فَعَجِّلْهُ فِی الدُّنْیَا"۔[مشکوۃ] (یا اللہ! جو سزا تو نے میرے لئے آخرت میں تجویز کی ہے، وہ مجھ کو دنیا ہی میں دیدے)، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ سبحان اللہ! آپ کو اس کی طاقت اور برداشت کہاں ہے؟ تو نے اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کیوں نہیں مانگی: "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس نے یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے

اس کو شفاء عطا فرمائی۔

ابن ماجہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابی السائب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکنِ یمانی اور حجر اسود کے درمیان گزرتے تھے، تو یہی دعا پڑھتے تھے۔ ابن مردویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ میں کسی رکن پر نہیں گزرا، مگر میں نے وہاں ایک فرشتے کو دیکھا، جو لوگوں کی دعاؤں پر آمین کہتا تھا، سو تم کو جب بھی دونوں رکنوں کے درمیان گزرنا ہو، تو یہ دعا کیا کرو: "رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ستر فرشتوں کا ذکر ہے، جو حجر اسود اور رکنِ یمانی کے درمیان مقرر ہیں، اور دعا پڑھنے والوں کی دعا پر آمین کہتے رہتے ہیں۔ [قرطبي]

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ کے دو معنی کئے گئے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنی کمائی میں سے حصہ ملنے والا ہے، یعنی حج کے مناسک کی ادئیگی کا اجر و ثواب اور مغفرت۔ دوسرا یہ کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنی دعاؤں میں سے حصہ ملنے والا ہے، یعنی وہ جو کچھ مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول کر کے ان کی مقصد برآری کرتے ہیں۔

﴿سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں جلدی حساب لینے پر قادر ہے۔ یا یہ مطلب ہوگا کہ اگر چاہے تو جلدی محاسبہ کرے، ادھر حساب شروع ادھر ختم۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی معنی منقول ہے۔ واللہ اعلم

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳

ترجمہ: اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو، پھر جو کوئی منیٰ سے جلدی کر کے دو ہی دن میں چلا گیا، تو اس پر بھی گناہ نہیں، اور جس نے دو دن سے تاخیر کی، تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ سب باتیں اس شخص کے لئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ تم سب اسی کے روبرو جمع کئے جاؤ گے ۝۲۰۳

معارف و منازل

مزدلفہ سے واپسی پر منیٰ میں قیام کرنے کا حکم ہے، یہاں دس تاریخ کی صبح کو پہنچتے ہیں۔ منیٰ میں بالترتیب

تین جمرات ہیں: جمرۂ اولیٰ، جمرۂ وسطیٰ، جمرۂ عقبہ۔ یہ آخری جمرہ منیٰ سے مکہ کی طرف واقع ہے۔ دسویں تاریخ کو تو صرف جمرۂ عقبہ کی رمی ہوتی ہے، باقی گیارہ اور بارہ تاریخ کو ہوتی ہیں، اگر کوئی ٹھہرے تو تیرہ تاریخ کو بھی تینوں جمروں کی رمی لازمی ہے۔

جمرۂ عقبہ کی رمی کا وقت طلوعِ صبح صادق کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے۔ ہر کنکری مارتے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا مستحب ہے۔ گیارہ اور بارہ کو تینوں جمروں کی رمی کی جاتی ہے، اور ان تاریخوں میں رمی کا وقت زوالِ شمس کے بعد شروع ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی تیرہ تاریخ کو ٹھہرے تو اس دن بھی رمی کرنا ضروری ہوجاتا ہے، مگر حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تیرہویں کی صبح صادق کے بعد رمی کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ افضل یہی ہے کہ تیرہویں کو بھی زوال کے بعد رمی کی جائے۔ آیت کریمہ میں انہی تینوں دنوں کی طرف اشارہ ہے، اور اختیار ہے کہ بارہویں کو تینوں جمروں کی رمی کر کے مکہ شریف چلے آؤ، اور اگر چاہو تو تیرہ کو رمی کر کے مکہ شریف چلے آؤ۔

خلاصہ یہ کہ منیٰ میں بجائے آباء واجداد کی منقبت بیان کرنے کے اور میلہ وخرید فروخت اور کاروبار کے اللہ تعالیٰ کا ذکر بکثرت کرو، اور اس کے احسانات کا شکر بجالاؤ۔ صرف دنیا کے طالب نہ بنو، بلکہ دونوں جہانوں کی سعادت وکامیابی کے طلبگار بنو، اور اللہ تعالیٰ سے حسناتِ دارین طلب کرو۔ اب آگے اسی قسم کے دو شخصوں کا ذکر فرماتے ہیں: ایک بدترین منافق ہے، اور دوسرا مخلص مسلمان ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الۡاَرۡضِ لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا وَيُهۡلِكَ الۡحَرۡثَ وَالنَّسۡلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الۡفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کی بات آپ کو تعجب میں ڈالتی ہے، اور وہ اس چیز پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے، جو اس کے دل میں ہے، حالانکہ وہ شخص بہت بڑا جھگڑالو ہے ﴿۲۰۴﴾ اور جب یہ شخص پیٹھ پھیر کر چلتا ہے، تو زمین میں کوشش کرتا ہے، تاکہ اس میں فساد برپا کیا جائے، اور ہلاک کرتا ہے کھیتی کو اور نسل (مویشیوں) کو، اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۰۵﴾ اور جب اس شخص سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تو پکڑتا ہے اس کو غرور گناہ کے ساتھ، پس اس کیلئے جہنم کافی ہے، اور البتہ وہ بہت برا ٹھکانا ہے ﴿۲۰۶﴾

معارف ومنازل

اوپر کی آیتوں میں دعا مانگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں بیان ہوئیں: ایک کافر جو کہ منکر آخرت ہے، اس لئے وہ صرف دنیا مانگتا ہے۔ دوسرا وہ مسلمان جو کہ آخرت پر یقین رکھتا ہے، اور اسے اپنی آخری منزل سمجھتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہے، اگلی آیت میں پہلے منکرِ آخرت، منافق کی چالبازی کا بیان ہے، اس کے بعد مخلصین مؤمنین کا تذکرہ ہے۔

اخنس بن شریق بڑا چالباز، فصیح و بلیغ اور رطب اللسان منافق تھا۔ غزوۂ اُحد میں اسی منافق نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول کے ساتھ مل کر شرارت کی تھی، اور بہت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے انہیں آدھے راستے سے واپس کیا تھا۔ یہ شخص اکثر اوقات سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر نہایت سنجیدگی، چرب لسانی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے ایمان و یقین کا اظہار کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر کٹ مرنے کا دعویٰ کرتا تھا، اور قسمیں کھا کر اپنی خدمات کی پیشکش کرتا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس سے اٹھ کر چلا جاتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اور ملّتِ اسلام و مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کر کے طرح طرح کا فتنہ و فساد برپا کرتا تھا۔

کئی دفعہ چوری چھپکے چند مسلمانوں کے مال و مویشیوں کے پاؤں کاٹ کر تلف کرتا رہا، اور ان کے درختوں کو کاٹ کر اور فصلوں کو ضائع کرتا رہا۔ جب لوگ اسے ایسا کرنے پر ملامت کرتے تو اس کا کبر و غرور اور گھمنڈ مزید تیز ہو جاتا۔ یہ آیتیں اسی منافق کے بارے میں نازل ہوئیں۔ ارشاد ہوا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ﴾ اور لوگوں میں بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ جن کی باتیں اور گفتگو جو محض دنیوی زندگی کی غرض اور مقصد کے لئے ہوتی ہے، یہ باتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دلکش اور خوش کن معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی قسمیں کھا کھا کر، اور اپنے مافی الضمیر پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یقین دلاتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و اطاعت کا اظہار کرتا ہے، حالانکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرنے والوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاصمت رکھنے والوں میں سب سے زیادہ شدید الخصومۃ اور بڑا جھگڑالو ہے، اور جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس سے پیٹھ پھیر کر جاتا ہے، تو وہ اس غرض سے دوڑ دھوپ کرتا پھرتا ہے اور خوب کوشش کرتا ہے، اور اس قسم کی تدابیر اختیار کرتا ہے کہ شہر میں کوئی فساد برپا کرے۔ لوگوں کی کھیتیوں کو تباہ کر دے، مویشیوں کو ہلاک کر دے۔

یہ بات سب پر واضح ہے کہ کسی قسم کا فساد اچھا نہیں ہے، مگر اس طرح کا فساد بہت زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قسم کی تباہ کاری اور فساد کو پسند نہیں کرتا، اور کسی کو فساد پھیلانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اور جب اس منافق کو بطورِ نصیحت کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تو اس کا گھمنڈ اور غرور اور نخوت اس کو اور زیادہ گناہ و فساد پر ابھارتی، اور آمادہ کرتی ہے۔ ﴿فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ﴾ لہٰذا ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہی ہے، اور جہنم بہت بدتر اور برا ٹھکانا ہے۔

بعض مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ عام ہے، اور قیامِ قیامت تک اس قسم کے تمام منافقوں کو شامل ہے، کیونکہ ایسے لوگ قیامت تک آتے رہیں گے، جو ظاہراً ایمان کا اظہار کریں گے، اور باطن میں نفاق و کفر چھپائے رکھیں گے، خوب جھوٹ بولیں گے، اور قسمیں کھا کر اپنے جھوٹ کو سچ کرنے کی کوشش کریں گے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَبْغَضُ الرِّجَالِ اِلَی اللّٰہِ الْاَلَدُّ الْخَصِمُ۔ [بخاري] اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ مبغوض وہ انسان ہے، جو بڑا جھگڑالو اور مقدمہ باز ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سب سے بُرا مبغوض انسان وہ ہے، جو نصیحت قبول نہ کرے، اور جب اسے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تو وہ الٹا نصیحت کرنے والے سے کہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور نصیحت قبول نہ کرے۔

❀ ❀ ❀

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾﴾

ترجمہ: اور بعض لوگ وہ ہیں جو اپنی جانوں کو بیچتے ہیں (قربان) کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت ہی شفقت کرنے والا ہے ﴿۲۰۷﴾

معارف ومنازل

یہ مثال ان لوگوں کی ہے، جن کی آخری منزل قیامت، اور رضائے الٰہی ہے، اور وہ اس کے حصول کے لئے جان تک کی قربانی دینے سے نہیں ہچکچاتے، اور وہ دونوں جہانوں کی کامیابی کے طلبگار ہیں۔

شراء کے معنی خریدنا اور بیچنا، یہ دونوں معنوں کے لئے آتا ہے۔ مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے، آپ رضی اللہ عنہ کا شمار سابقین اوّلین میں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نہایت بڑے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے شہادت سے پہلے

وصیت کی کہ میری نمازِ جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ پڑھائیں گے، حالانکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے علاوہ سارے عشرہ مبشرہ موجود تھے، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کا جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے پڑھایا۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت پر روانہ ہوئے، تو مشرکین مکہ نے آپ رضی اللہ عنہ کا راستہ روک لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کمان کو درست کیا، ترکش سے تیر نکالے، اور فرمانے لگے: اے قریش! تم مجھ سے واقف ہو کہ میں تیرانداز ہوں، جب تک میرے پاس ایک بھی تیر ہے، تم میرے قریب نہیں آسکتے، اور تلوار بھی میرے پاس موجود ہے، میں تمہارا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا، بہتر یہ ہے کہ تم میرا راستہ نہ روکو، میرا اتنا مال فلاں جگہ موجود ہے، جاکے وہ لے لو، تمہارے لئے مباح کرتا ہوں۔ چنانچہ مشرکین نے اس پر اکتفاء کرتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ جب مدینہ پہنچے، تو رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابویحییٰ! تیری تجارت نفع مند ہے۔ وہ لوگ نہ مال کی پرواکرتے تھے نہ جان کی، انہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب تھی کہ کسی طرح ایمان بچ جائے۔ یہی وہ لوگ تھے، جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اپنی جان تک کو بیچتے تھے۔

ابتداءِ اسلام میں لوگوں نے اتنی بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں، جنہیں شاید پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے۔ ہر طرح جان و مال کی قربانی دے کر اصحابُ الاخدود کی طرح ایمان بچایا، فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے شفقت کرنے والا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا میں قربانی دیتے ہیں، جان و مال، بیوی بچے، ملک وطن، شہر و بستی سب کی قربانی دے کر ہجرت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں وہ مقام و رتبہ عطا کرتے ہیں، جو ہفت اقلیم کے بادشاہ کو نصیب نہ ہو۔ یہ بھی تو اس کی شفقت اور کرم ہے کہ کسی کو اپنی رضا کے لئے تیار کرے، اور تکلیفوں کی بھٹی میں ڈال کر خالص سونے کی طرح تمام آلائشوں سے صاف کر کے اپنے قرب و رضا تک پہنچا دے۔

جو لوگ اپنی جان و مال علم، استعداد اور ہر طرح کا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [العنکبوت: ٦٩] (جو لوگ ہمارے لئے تکلیفیں اٹھاتے ہیں، ہم انہیں اپنے راستے بتائیں گے، اور بیشک اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے)۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر تکلیفوں کو برداشت کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ انہیں سہولتوں اور راحتوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

امام اہلسنت حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، تو انہیں اس وقت کے صلحاء و اتقیا نے خواب میں

دیکھا، پوچھا: بتایئے امام صاحب کیا ہوا؟ کہنے لگے: غَفَرَلِیْ وَقَرَّبَنِیْ وَاَبَاحَ لِیَ النَّظَرَ الٰی وَجْهِهِ الْکَرِیْمِ۔ (حاشیہ نبراس شرح عقائد)۔ یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مقام ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا معراج تو اس سے بھی کئی درجہ اونچا ہے، وہاں تک کسی کی پرواز ورسائی ممکن نہیں، اوران کی تکالیف بھی مثالی ہیں۔ مثلاً حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اسلام میں سب سے پہلی شہیدہ ہیں۔ ایک عورت ذات ہوتے ہوئے اتنی بڑی قربانی دی، جس کی نظیر نہیں، اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیئے! عمار رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوئے، والد یاسر رضی اللہ عنہ اوروالدہ سمیہ رضی اللہ عنہا بھی شہید ہوئے۔ ظالم ابوجہل نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی دونوں ٹانگیں مختلف اونٹوں سے باندھ کرمخالف سمتوں میں چلادیا، اور بے رحمی سے انہیں شہید کیا۔ توکیا یہ مقام حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا بنت مزاحم کے مقام کے ساتھ برابر نہیں؟ ؎

خونے نکردہ ایم وکسے رانہ کشتہ ایم ☆ جرم ہمین کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

کیا یہ قربانی حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی قربانی کے ساتھ برابر ہے؟ اور جب نہیں، تو اس خاتون کا کیا مقام ہوگا؟ وہ مقام نہایت ہی اونچا ہوگا، جسے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے علاوہ کوئی نہیں پاسکے گا۔ رضي الله عنهم أجمعين

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

ع

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارے لئے کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ پس اگر تم پھسل گئے بعد اس کے تمہارے پاس واضح باتیں آگئی ہیں، پس جان لو کہ بیشک! اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾ یہ لوگ نہیں انتظار کررہے، مگر اس بات کا کہ آئے اللہ تعالیٰ ان کے پاس، آئے بادلوں کے سائبانوں میں اور فرشتے بھی، اور فیصلہ کردیا جائے معاملے کا، اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے سب کام ﴿۲۱۰﴾

☆ ☆ ☆

معارف ومنازل

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور چند دیگر حضرات جو پہلے موسوی شریعت پر تھے، جب انہوں نے صدقِ دل سے اسلام قبول کیا، تو انہیں اپنے اجتہاد کے مطابق یہ خیال پیدا ہوا کہ ہفتے کا دن شریعت موسوی میں معظم تھا، اونٹ کا دودھ اور گوشت دونوں حرام تھے، (تفصیل آل عمران میں دیکھیں) تو شریعتِ اسلام میں ہفتے کا دن اگرچہ معظم نہیں ہے، مگر اس کی بے تعظیمی بھی واجب نہیں، اسی طرح اونٹ کے گوشت اور دودھ کا استعمال جائز ہے، فرض نہیں ہے، اگر ہم بدستور روزِ ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں، اور اونٹ کا گوشت باوجودِ حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کردیں، تو شریعتِ موسوی کی رعایت ہوجائے گی، اور شریعتِ محمدیہ کے خلاف بھی نہ ہوگا۔ تو اس دورخی اور ذاتی اجتہاد کی اصلاح کی خاطر ان آیات کا نزول ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام جامع اور کامل شریعت ہے، جو حکم اثبات یا نفی کے ساتھ اسلام میں ہو، خواہ گزشتہ ادیان میں اس کے متعلق کوئی شرعی حکم ہو، یا نہ ہو، اسلام ایسے تمام عقائد واعمال کی نفی کرتا ہے، جو اس کے احکام کے ساتھ متصادم ہوں، اور یہ ایک شیطانی لغزش ہے کہ کسی اسلامی حکم کے ساتھ منسوخ شدہ دینِ موسوی کے حکم کا جوڑ لگا کر یہ کہا جائے کہ اس پر چلنے میں اسلامی احکام کی خلاف ورزی نہیں ہوگی، لہٰذا تمہیں حکم دیا جارہا ہے کہ پورا پورا اسلام میں داخل ہوجاؤ، اور یہ نہ ہو کہ ایک قدم اسلام میں، دوسرا کسی اور شریعت میں، بس ایک ہی شریعت قابلِ عمل ہے، جو اسلام ہے، فقط۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ (اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ) "اَلسِّلْمُ" اس مقام پر سین کے زیر کے ساتھ، اور سورۃ الانفال میں ﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ سین کے زبر کے ساتھ، دونوں کے معنی ہیں: "صلح، انقیاد اور اطاعت"۔ یعنی اسلام جو کہ صلح وآشتی، اطاعت وانقیاد اور سلامتی کا دین ہے۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ [بخاري] اسی کے ساتھ فرمایا: وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَاءِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ۔ [ترمذي أحمد] مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی ایذاء) سے دوسرے مسلمان سلامت ہوں، اور مؤمن وہ ہے (یعنی صادق) جس سے لوگ اپنی جان، اپنے مال کو مامون ومحفوظ سمجھیں، یعنی اس کی صداقت ودیانت کی وجہ سے لوگوں کا اس پر اعتماد ہو، اور اس کی عدالت و

تقویٰ اس طرح نمایاں ہو کہ کسی کو اس سے اپنے مال وجان، عزّت وآبرو کے بارے میں کسی نقصان وزیادتی کا خوف وخطرہ لاحق نہ ہو۔

تو ارشاد ہے کہ: ''تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ''۔ یہود ونصاریٰ کی طرح نہ بنو، جنہوں نے اپنے دینی اقدار کو پارہ پارہ کر کے مذہب کی شکل وصورت کو تبدیل کیا، اور شریعت کے پورے حُلیے کو بگاڑ دیا۔ عقائد تک بنیادی چیزوں کو مذہب سے نکال دیا۔ بعض انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے، دیگر پیغمبروں علیہم السلام کی تکذیب کی، اپنی خواہشات کو بنیاد بنا کر چند احکام پر ایمان لائے، اور جو احکام ان کی خواہشات سے متصادم ہوئے، ان کی تکذیب کی۔ انہی کرتوت وبداعمالیوں، استہزاء بالانبیاء وقتلِ انبیاء علیہم السلام اور تکذیبِ آیات اللہ تعالیٰ کی وجہ سے مبغوض ومردود اور ملعون قرار پائے، اور ہزاروں کی تعداد میں بقولِ بعض مؤرخین کے ڈیڑھ لاکھ کے قریب بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ ہوئے۔ اب جو ان کے بقایا ہیں، وہ ہمارے سردار رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتِ دعوت میں شمولیت کی وجہ سے محفوظ رہے، اور رہتے ہیں، ورنہ ان کا حال بھی وہی ہوتا جو ان کے اسلاف کا رہا۔

اندازہ لگائیں کہ مالکانِ باغ کی نیت میں فتور وکمی آنے سے راتوں رات باغ پر مصیبت آئی، اور وہ جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوا، ابھی حال یہ ہے کہ اس امت کے لاکھوں باغوں کے مالکان زکوٰۃ سے منکر ہیں، مگر عذاب نہیں آتا، یہی اس امت کی برتری کی علامت وخاصیت ہے۔ واللہ اعلم

اسلام کی حقانیت اور جامعیت:

پہلی بات اسلام کی حقانیت: وہ ایک بدیہی امر ہے، جس کے لئے کسی منطقی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ پوری کائنات اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہے، اور اسے ایک بے مثال اور منظم تدبیر کے ساتھ چلاتے رہے ہیں، مجال نہیں کہ اس مربوط ومحکم نظام میں کوئی رخنہ یا عیب پیدا ہو، یا کوئی علوی یا سفلی مخلوق اپنی جگہ اور مدار سے سرک کر نظامِ عالم میں تعطل یا خلل پیدا کر دے۔ جس طرح مادی دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم ومنشاء کے مطابق رواں دواں ہے، اس میں کوئی انسانی طاقت نہ مزاحمت کر سکتی ہے، نہ ہی کوئی فطور پیدا کر سکتی ہے، اور نہ ہی مداخلت، بالکل اسی طرح کائنات کے روحانی نظام کا سلسلہ جو کہ تخلیقِ عالم کے ساتھ جاری ہے، جسے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ اسی طرح مربوط ومنظم رکھا گیا جس طرح مادی دنیا کے نظام کو رکھا گیا۔

پوری کائنات کی خالق ومالک اور مدبّر ومتصرف حق تعالیٰ شانہ کی ذات پاک ہے، پھر کائنات کے ہر آخری

گوشہ تک اس کی صفتِ ربوبیت وقیومیت کارفرما ہے، اور جہاں جہاں تک اس کی ربوبیت کارفرما ہے (جس پر قولہ تعالیٰ: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ دلیل ہے) وہاں وہاں تک شمعِ رسالت کی برکتوں اورانوار کی رسائی بھی ہے، ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبياء:۱۰۷] اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم کو تمام جہاں کے لئے رحمت (بنا کر) بھیجا ہے)۔

اسلام دراصل سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ رحمت کا نام، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہے۔ صرف اسی کو اللہ تعالیٰ کے حقیقی اور برحق دین ہونے کا عظیم شرف وفضیلت حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کی طرح پورے عالم پر محیط وحاوی ہے۔ کائنات کی ہر چیز کو قرآن حکیم کی کسوٹی پر اگر پرکھا جائے، تو کائنات کا کوئی ادنیٰ ذرّہ بھی اسلام کے انوار وبرکات سے باہر اور خالی نہیں ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا وہ جامع ضابطۂ حیات اور مکمل دستورِ زندگی ہے، جس کی وسعتوں اور پہنائیوں تک سوائے اولوالعزم ہستیوں کے کسی اور کی رسائی ممکن نہیں۔ اسی لئے علماء اسلام نے واضح کر کے فرمایا کہ جو کچھ مادی کائنات میں ہے وہی سب کچھ اسلامی ضابطۂ حیات میں ہے، عقائد، طاعات، عبادات، معاشیات، معاملات، سیاسیات، دیوانیات، فوجداری تعزیرات، حدود، تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، اخلاقیات، علاج وغیرہ، تمام کے تمام کا حل اور مکمل رہنمائی اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہے۔

الغرض! زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں، جسے اسلام نے نظرانداز کیا ہو، اور اس کے متعلق واضح اور روشن ہدایات پیش نہ کیے ہوں، پھر یہ اسلامی ہدایات اتنے واضح اور عالمگیر ہیں کہ ان میں کسی بھی ابہام کا شائبہ تک نہیں، اور اتنے بابرکت قوانین وضابطوں کی کسی بھی پیوندکاری کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اگر انہیں پرکھ کر جانچا جائے، تو وہ ایسے بے عیب اور پاکیزہ کامل ومکمل معلوم ہوں گے، جس طرح کائنات کی علویات اور اوپر کی چیزیں ہیں۔ اگر آج تک کوئی شخص سورج میں کسی عیب ونقص کی نشاندہی نہ کرسکا ہے، تو اسلامی نظامِ حیات اور قانونِ شریعت میں بھی کسی عیب یا نقص کی نشاندہی نہیں کرسکے گا، کیونکہ منبع ومرکز سورج اور اسلام کا ایک ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضد وعناد تعصب وہٹ دھرمی جیسی بیماریوں کا علاج نہیں ہے۔

ہم مسلمان قوم پورے عالم کو چیلنج کر کے کہتے ہیں کہ اگر تم نہیں مانتے، اور تسلیم کرنے سے قاصر ہو، تو اسلامی نظام جیسا مبنی برانصاف، اور فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا نظام لاؤ، اور پیش کرو، تمہیں جرأت نہیں، اور یہ تمہارے بس سے باہر ہے۔ تم سارے ایک چھوٹی سی قرآنی سورت کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہے، تو اس سمندر

جتنے نظام کے پیش کرنے پر کیسے تمہیں قدرت ہوگی؟ قیامِ قیامت تک عاجز رہو گے، اور کفر وعناد کے سوا تمہاری قسمت میں کچھ بھی نہ ہوگا۔

تو ارشاد فرمایا کہ تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اس حکم کے دو معنی ہیں: اول یہ کہ لفظ "کَافَّةً" اگر "اُدْخُلُوْا" کی ضمیر سے حال ہے، تو معنی یہ ہوں گے کہ تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یہ نہ ہو کہ بعض اعضاء سے اطاعت، اور بعض سے بغاوت اور بے عملی، یا ظاہر میں اطاعت اور باطن میں بغاوت پوشیدہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کَافَّة کو اَلسِّلْمُ سے حال بنایا جائے، تو معنی یہ ہوں گے کہ اسلام کی مکمل اطاعت کرو، اور مجموعہ احکام کو مانو۔ یہود و نصاریٰ کی طرح نہ بنو ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ [البقرة:۸۵] (کیا تم ایمان لاتے ہو بعض کتاب پر، اور انکار کرتے ہو بعض کا؟) کانٹ چھانٹ مت کرو، خواہشات پر مت چلو۔ چند ایک آسان اعمال پر قناعت کر کے باقی مشکل اعمال سے جان خلاصی نہ کرو۔

عملی نفاق تو اسی کو کہتے ہیں اس سے پرہیز کرو، چونکہ اسلام مکمل دستورِ حیات ہے، تو عقائد، عبادات، طاعات اخلاقیات، معاشیات، معاشرات، تجارت، زراعت صنعت، سیاست وغیرہ کوئی بھی شعبہ ہو، اسلامی روشنی اور اتباعِ کتاب وسنت سے خالی نہ ہو۔

دونوں صورتوں کا ماحصل تقریباً یہی ہے کہ احکامِ اسلام خواہ وہ کسی بھی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں، اعضائے ظاہری سے متعلق ہوں، یا اعضائے باطنی (قلب ودماغ) سے متعلق ہوں، جب تک ان سب احکام کو سچے دل اور شوق سے قبول نہیں کرو گے، مسلمان اور دیندار کہلانے کے مستحق نہیں رہو گے۔ ایک پاؤں اسلام میں، دوسرا پاؤں اسلام سے باہر، کسی غیر کے نظریات وخیالات میں سوائے فریب ومکاری اور خیانت کے کچھ نہیں۔ اسلام میں کسی غیر اسلامی عمل یا خیالات کی پیوندکاری سراسر حرام ہے۔

اگر کوئی شخص پورا پورا اسلام کے خیمہ میں داخل ہوگا، تو اسلام اسے تمام دیگر مذاہب سے بے نیاز کر دے گا، اور یہ ستم ظریفی اور ظلم وزیادتی نہیں تو اور کیا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی حکومت میں رہتے ہوئے غیر اللہ، یعنی غیر خدا کے احکام پر عمل کر رہا ہو؟ یہ ناقابل معافی جرم اور قانونِ الٰہی سے سراسر انحراف اور بغاوت شمار ہوگی، جس طرح ہمارے زمانے کے اکثر وبیشتر لوگ اسی غلط فہمی یا بے دینی کے شکار ہیں، وہ اسلام کو صرف چند عبادات، مسجد، نماز، روزہ، تسبیح و تہلیل تک محدود رکھنے میں مطمئن ہیں، معاشیات، معاملات، اخلاقیات، سیاسیات اور دیگر معاشرتی اعمال وحقوق سے

سراسر بے خبر رہتے ہیں، یا انہیں اہمیت ہی نہیں دیتے۔

بہت سارے لوگ پابند صوم وصلوٰۃ شکل وصورت، داڑھی، لباس وغیرہ کے اعتبار سے ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن جب ان کے ساتھ لین دین پیسے وغیرہ کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے، تو بالکل ناقابلِ اعتبار اور دیانت سے خالی معلوم ہوتے ہیں۔ بس وہ اپنی شکل وصورت اور تسبیح پر غرّہ رہتے ہیں، بقول حضرت امام غزالی رحمہ اللہ انہوں نے اسلامی اعمال کا دریا اور سمندر نہیں دیکھا، جیسے مینڈک نے محدود پانی دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ہم بھی دریا کے جانور ہیں۔ ماشاءاللہ!

کاش! مسلمان اسلام اور اسلام کے ہمہ گیر بین الاقوامی زرّین اصولوں پر کاربند ہوتے، اور اعمالِ حسنہ و سیئہ میں امتیاز کر کے یہود ونصاریٰ اور یہود وہنود کے اعمالِ بد کا اسلامی معاشرہ میں پیوند لگا کر اسلام کو بدنام نہ کرتے۔ ہم ہزاروں اسلامی اعمال سے ناواقفی کی بناء پر منحرف ہیں، اور ان کی جگہ دیگر باطل مذاہب کے اعمال میں غرق ہیں۔ لاحول ولاقوۃ إلاباللہ

ساتویں آٹھویں صدی تک سلاطین، وزراء، امراء وغیرہ علماء کرام ومشائخ کے مشوروں اور فتووں پر اکثر و بیشتر عمل پیرا رہے، اور دونوں طبقے اسلام کی سربلندی اور اعمال کی اشاعت پر متفق رہے، اور انہوں نے یہ حد بندی بھی کی کہ اسلام کی کوئی چیز یا عقیدہ وعمل چھوٹنے نہ پائے، اور غیر اسلامی کوئی چیز اسلام میں گھسنے نہ پائے۔ الحمدللہ! یہ دونوں طبقے اپنے مساعی اور جدوجہد میں ایک حد تک کامیاب رہے۔ اُس وقت یورپ اور اس کے ہمنوا دیگر باطل پرست، مثلاً ہندو، بدھ، صابی، مجوسی وغیرہ پسماندہ تھے۔ بقول شیخ الاسلام مولانا سید شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ یورپ والے مسلمانوں کے دست نگر اور محتاج تھے، وہ ایک ماچس بنانے پر بھی قدرت نہیں رکھتے تھے۔

یورپ کا عروج اور مسلمانوں کی پستی اور زوال اس دن سے شروع ہوا، جب ہسپانیہ، اندلس، غرناطہ قرطبہ وغیرہ پر یورپ کا قبضہ ہوا، اور مسلمانوں کے آٹھ سوسالہ اقتدار کا سورج غروب ہوا۔ مسلمانوں کے بے شمار مال و دولت یورپ کے ہاتھ لگ گئے، اور لاکھوں اسلامی، تاریخی، جغرافی، علمی، ادبی وسائنسی کتب یورپ منتقل ہوگئیں، اور یورپی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ وہاں سے یورپ نے اپنی ترقی کے دور کا آغاز کیا، اور پورے افق پر چھا گیا، اور اپنے عزائمِ مذمومہ کے ساتھ مختلف مملکتوں تک رسائی حاصل کی۔ اپنی توسیع پسندی کو بامِ عروج تک پہنچایا، اور آئے دن بڑھتا رہا، پھیلتا رہا، حتی کہ برصغیر جیسے علاقوں تک اس کی رسائی ہوئی۔

یورپ سیاست، حرفت، ایجاد، عیاری، مکاری میں پہلے نمبر پر ہے۔ ان فنون میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اسی طرح اسلام دشمنی میں بھی اس کا ہمسر نہیں۔ ہندوؤں کا ساتھ دیا، مسلمانوں کو ذلیل کیا، رضاخانیت، بریلویت، قادیانیت، نیچریت وغیرہ باطل عقائد کی بنیاد رکھ کر اپنی سرپرستی میں انہیں تحفظ دیا، اور خوب ترقی کی راہ فراہم کی۔ برصغیر میں قبر پرستی شرک، عرس اور تین سو سے زائد مختلف قسم کی بدعات کی ایجاد کروائی، اور انہیں ترقی دی۔ یہ المناک تاریخ اتنی وسیع اور جانگسل ہے کہ اس کے اوراق کے مطالعے سے کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔

بدعات ورسومات کے نقصانات:

معلوم ہونا چاہئے کہ بدعات کو دین سمجھنا ایک شیطانی چرخہ ہے، جو کسی حد پر رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کا نقصان عام گناہوں کے نقصان سے سوگنا زیادہ ہے، جس طرح بدعات کا ضرر زیادہ ہے، اسی طرح ان کی سزا بھی بہت زیادہ ہے، کیونکہ گناہگار جب گناہ کو گناہ نہیں، بلکہ نیکی سمجھ کر کر رہا ہے، تو وہ اس سے کیسے باز آسکتا ہے؟ اور کیسے توبہ کرسکتا ہے؟ اس سے توبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دین سے توبہ کرے، اس لئے بدعتی کو بہ سببِ جہلِ مرکب کے توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا رشتہ منافقوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے، کہ باطل پر ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے، اور ساری عمر اسی گرداب میں پھنسا رہتا ہے۔ امام اہلسنت حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ نے لکھا ہے کہ بدعتی شخص کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، اور اس کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ **نعوذ باللہ منہ**

دوسری سب سے بڑی قباحت بدعت میں یہ ہے کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی ہوتی ہے، کیونکہ زبانِ حال سے گویا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ دین میں نبی سے یہ کمی رہ گئی تھی، جس کو ہم پورا کر رہے ہیں۔ تو یہ ایک اعتبار سے دعویٰ نبوت ہے، اور در پردہ حضرت حق سبحانہ پر بہتان اور الزام ہے کہ اس نے اس چیز کو دین کا حصہ کیوں نہیں بنایا، جس کو ہم دین بنا کر اس کمی کو پورا کر رہے ہیں۔ ان حالات میں بدعات سے نکلنا اور تائب ہونا کیسے نصیب ہوسکتا ہے؟ پہلے ادوار میں لوگ اگر کسی بدعت یا شرک میں مبتلا ہوتے تھے، تو وہ اکثر و بیشتر جزئی مسائل میں جہالت اور بے علمی کی وجہ سے دھوکا کھاتے، یہ کوئی مستقل مذہب نہیں ہوتا تھا، اور نہ ہی شد و مد سے اس کی تبلیغ و ترویج ہوتی تھی۔

اب وہ صورت حال نہیں رہی۔ اب تو یہ مستقل مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کے بانی مبانی اور ائمہ و مقتداء بہت ہی زور و شور سے موسوم ہوئے۔ مستقل کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں، اور قرآن وحدیث میں وہ وہ تحریفات

کررہے ہیں کہ جنہیں یہود ونصاریٰ نے خواب میں بھی نہیں دیکھا، اوران کے وہم وخیال میں بھی نہیں آئے۔اب یہ مذہب جہالت کے دلدل سے نکل کرضد وعناد اور بغض وہٹ دھرمی کی سرحد پار کر چکا ہے۔شرک کے وہ وہ رنگ و صورت کھل کر معاشرہ کا حصہ بن چکے، جنہیں مکہ ومدینہ کے مشرک اور منافق بھی نہ سمجھ سکے۔تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص جس درجہ میں بھی بدعات میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اتنا ہی برکاتِ سنت اور قربِ نبوت وانوارِ شریعت سے محروم رہتا ہے۔ پس نام نہاد صوفی اور بدعتی پیرومرشد اس سے عبرت سیکھیں، اور مقدس مساجد وخانقاہوں کی بے احترامی نہ کریں، اور یہ باور کریں کہ سنتوں کے موجد سید کائنات ﷺ کی ذات اقدس ہے، اور شرک وبدعات ورسومات کا بانی وموجد ابلیسِ لعین، اوراس کے حواری ہیں۔قرآن وحدیث کے صفائی چشموں میں کس چیز کی کمی ہے کہ انہیں چھوڑ کر، یا محض اپنے پیٹ پالنے کی خاطر احکامِ شریعت میں ردوبدل یا کمی بیشی کر کے حُبِ رسول (ﷺ) وحبِ اعمال کا بہانہ بنا کر شریعتِ مطہرہ میں ترمیم کرتے ہیں؟

یہ کتنی دیدہ دلیری اور منافقانہ جرأت ہے کہ اصلی سنتوں کو چھوڑ کر ان کی جگہ شرک وبدعات کو ترویج دے دیں؟ یہ محبت وعشق نہیں ہے، یہ شریعت پر استہزاء اور صاحبِ شریعت سے کھلم کھلی بغاوت ہے، اور صاحبِ شریعت ہی نے اس قسم کے اعمال اوران کی سرپرستی کو اسلام کے گرانے اور ڈھانے کے مترادف قرار دے کر فرمایا: جو شخص صاحبِ بدعت کا احترام کرے گا، تو وہ اسلام کے ڈھانے میں اس کا معاون ومددگار شمار ہوگا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام کا ڈھانے والا ابلیس کا کارندہ اور ملعون ومردود ہی ہوگا۔

یہ واضح تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر میں فرنگیوں کی آمد سے پہلے اہل علم کی سرپرستی میں کسی قسم کے شرک و بدعات کا نام ونشان تک نہیں تھا۔اسلام میں ایسے ایسے برگزیدہ علماء پیدا ہوئے، جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر ہزار جلدوں میں لکھی، اور حدیث وسنن کو پندرہ سو جلدوں میں مرتب کیا، مگر انہیں اس بے نظیر وبے مثال علم کے باوجود یہ خیال میں نہیں آیا کہ میت کو دفن کرتے وقت اس کی قبر پر اذان دی جائے، کیونکہ انہوں نے اس چیز کو سنتِ مطہرہ میں نہیں پایا تھا، مگر فرنگیوں کے نمک خور وفادار علماء سوء کو ڈیڑھ ہزار سال بعد یہ مسئلہ یاد آیا، جس طرح انہوں نے فرنگیوں کے کہنے اور فرمائش پر برٹش گورنمنٹ کو اسلامی مملکت قرار دیا تھا۔

انہوں نے ہی حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ (إظهار الكرب بأن هندوستان دار الحرب) کو مسترد کیا تھا، جس میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرنگیوں کی گورنمنٹ کو غیر اسلامی کہا تھا، اور برصغیر کے اقتدار کو دارالحرب

ثابت کیا تھا۔ مگران علماء سوء نے انگریزوں کو خوش کرنے کی خاطر ”إعلام الأعلام بأن هندوستان دار الإسلام“ کتاب لکھی، اورانہیں خوش کیا۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ یہ دارالاسلام ہے، فرنگیوں کے خلاف جہاد ہرگز جائز نہیں، جہاد ایک بغاوت ہے۔ قرآن کریم کی سینکڑوں آیات کے انکار کے مترادف فتویٰ کھلم کھلا شریعت اور صاحب شریعت سے عداوت ودشمنی نہیں تو کیا ہے؟

زمن بر صوفی وملا سلامے ☆ کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شان در حیرت انداخت ☆ خدا و جبرئیل ومصطفےٰ را (اقبالؒ)

اس قسم کے ناصحانہ اور مخلصانہ اور عقید تمندانہ اشعار کو بہانہ بنا کر اس فرقہ کے مولویوں نے علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ لگایا، اورانہیں کافر کہا۔ دیکھو! تجانب اہلسنت نامی کتاب۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ یہ لوگ محض اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اوراس کے فرشتے ان کے پاس بادلوں کے سائے میں آئیں۔ یہ مضمون نہایت اہم بھی ہے، اور إتمام الحجة على الكافرين پر واضح دلیل بھی ہے۔ اس بات کو قرآن حکیم نے متعدد سورتوں کی متعدد آیات میں مختلف الفاظ میں ذکر فرمایا ہے، مثلاً سورة الأنعام، سورة الفرقان، سورة الزمر، سورة محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی جو حد تھی، وہ پوری ہو چکی۔ انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے، شریعتیں اتریں، آسمانی کتابیں آئیں، حتی کہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب نور مبین قرآن حکیم کو لے کر تشریف لائے، مگر تب بھی یہ لوگ نہیں مانتے، اور ایمان قبول نہیں کرتے، تو شاید یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جو چیز قیامت کے روز ظاہر ہونے والی ہے، وہ آج ہی ظاہر ہو جائے، بادلوں کے سائبانوں میں نزولِ اجلال تو قیامت کے روز ہوگا۔

جب واحد الجبار جل شانہ خود نزولِ اجلال فرمائیں گے، اور سائبان جو ہوں گے وہ آگ، نور اور پانی کے ہوں گے۔ ستر ہزار حجاب میں ربّ العزّت نزولِ اجلال فرمائیں گے، اور ارد گرد چاروں طرف سے فرشتے تسبیح پڑھ رہے ہوں گے، اس وقت عدالت قائم ہوگی، اور ربّ العزّت ہر ایک کا فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ منکرینِ اسلام چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے۔ بھلا قبل از وقت یہ کیسے ممکن ہے؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ [المرسلات: ۵۰] (تو قرآن کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟) یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری

کتاب ہے، اس کے آجانے کے بعد یہ لوگ اور کونسی کتاب کے منتظر ہیں جس پر یہ ایمان لائیں گے؟

ربّ العلمین کے آخری پیغمبر رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لا چکے۔ اب ان منکرین کی رہنمائی کے لئے اور کونسا نبی آئے گا، جس کا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں؟ اب کوئی شریعت، کوئی کتاب، کوئی پروگرام نہیں، جو کہ باقی ہو، اور جس کا انتظار کیا جائے۔ اس دن جب یہ نزولِ اِجلال ہوگا، اس دن جو لوگ ایمان لائیں گے، وہ اضطراری ایمان نہ قبول ہوگا اور نہ ہی فائدہ مند۔ اگر تمہیں ایمان لانا ہے تو آج ہی اختیار وجذبے کے تحت ایمان قبول کرو۔ اس روز نہ کوئی ایمان قبول ہوگا، اور نہ کوئی توبہ ومعذرت، اور جس چیز کو تم آج دیکھنا چاہتے ہو، یہ تمہاری غلطی اور حماقت ہی ہے، کیونکہ وہ چیز تمہارے لئے تباہ کن ہے، نہ کہ فائدہ مند۔

خلاصہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ شانہ کا بادلوں کے سائبانوں میں نزولِ اِجلال تو قیامت کے روز ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی تجلی ستر ہزار حجاب کے اندر ظاہر ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز درہم برہم، تہ وبالا اور نیست ونابود ہو جائے گی، بے انتہا سخت غیظ وغضب کا ظہور ہوگا، جیسے کہ حدیث شفاعت میں اس بے انتہا غضب کا تذکرہ ہے، تو ﴿وَقُضِيَ الْأَمْرُ﴾ ہر فیصلہ صادر ہوگا، مگر یاد رکھو! ﴿وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ﴾ تمام کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اس کا قانون پختہ اور اٹل ہے، اس کا مقرر کردہ ہر کام اپنے وقت پر ہوگا، اور یہ دنیوی مہلت تمہارے لئے ایک رحمت ہے، اس کو لہو ولعب میں ضائع نہ کرو۔ قیامت کے فیصلے سے پہلے اپنے لئے فیصلہ کا استحقاق حاصل کرو۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ زندگی، تندرستی، مال، جوانی، صحت، فراغت وغیرہ چیزوں کو غنیمت سمجھو، اور کچھ نیک اور فائدہ مند کام انجام دے دو، یہ چیزیں کارآمد ہیں، انہیں ضائع ہونے سے بچاؤ۔

فائدہ:

رہا یہ واقعہ کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ اور فرشتے بادلوں کے سائبانوں میں جلوہ افروز ہوں گے، یہ مضمون قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر مختلف سورتوں میں مذکور ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سبحانہ کا بادلوں کے سائبانوں میں آنا متشابہات میں سے ہے، جس کے متعلق جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین اور تمام اسلاف امت رحمۃ اللہ علیہم کا فیصلہ یہ ہے کہ ان مضامین پر پختہ ایمان لانا ضروری ہے، اور کیفیت کے تتبع وتلاش کی فکر میں نہ پڑے، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات وغیرہ کی حقیقت معلوم کرنا ہمارے دائرۂ عقل وفہم سے باہر ہے، اور ہماری فہم اس کی کیفیت معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی، وہاں دیکھ لیا جائے۔